مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد پنجم

تنقیدِ شعرالعجم مع ضمائم

مرتبہ

مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقیِ ادب

کلب روڈ - لاہور

مقالاتِ حافظ محمود شیرانی

جلد پنجم

تنقیدِ شعر العجم مع ضمائم

مرتبہ

مظہر محمود شیرانی

مجلسِ ترقیِ ادب

کلب روڈ — لاہور

طبع اول : اپریل ۱۹۷۰ء

تعداد ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب ، لاہور
طابع : سید اظہارالحسن رضوی
مطبع : مطبع عالیہ ۵/۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

فہرست مضامین

ضمائم

عرضِ مرتب

تنقید شعرالعجم پہلی بار کتابی صورت میں ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے شائع ہوئی تھی - اس اشاعت کا پیش کلام خود حافظ صاحب مرحوم نے لکھا تھا جو موجودہ اشاعت میں بھی شامل کر دیا گیا ہے - اب ۲۷ برس کا عرصہ گزرنے کے بعد مجلس ترقی ادب کی جانب سے مقالات حافظ محمود شیرانی کے سلسلے میں یہ کتاب مقالات کی پانچویں جلد کے طور پر شائع کی جا رہی ہے -

موجودہ اشاعت میں چند اضافے بھی کیے گئے ہیں - مثلاً حواشی میں جدید ایرانی محققین کی تحقیقات کے نتائج سے بعض اقتباسات اور حوالے درج کر دیئے گئے ہیں - ایسے اکثر حوالے حافظ صاحب کی تحقیقات کے نتائج پر صاد کرتے ہیں ، بعض جگہ تازہ انکشافات کے حامل ہیں اور کہیں کہیں ایرانی نقادوں کے محو نالۂ جرس کارواں ہونے کا پتہ دیتے ہیں -

بعد میں طبع ہونے والے دواوین سے مقابلے کے نتیجے میں شعرا کے کلام کے متن کا اختلاف بھی پاورق میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے -

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم کے عمر خیام پر مضمون کو کتاب کے آخر میں ضمیمے کی شکل دے دی گئی ہے - اس کے علاوہ فارسی ادب کی تاریخ کے موضوع پر حافظ صاحب کے بعض مضامین بھی بطور ضمائم اضافہ کر دیے گئے ہیں - ہمیں امید ہے کہ ان اضافوں سے فارسی زبان کے طالب علموں اور فارسی ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ''تنقید شعرالعجم'' کی افادیت میں اضافہ ہو جائے گا -

مرتب

پیش کلام

'تنقید شعرالعجم' جسے اب کتابی صورت میں طبع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ، اکتوبر ۱۹۲۲ع سے جنوری ۱۹۲۷ع تک انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے 'اردو' (اورنگ آباد) میں قسط وار نکل چکی تھی ۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس کی طباعت کے واسطے احباب کے تقاضے ہوتے رہے لیکن راقم کو اپنے فرائضِ منصبی سے اس قدر فرصت میسر نہ ہوئی کہ اس کی طرف توجہ کی جاتی ۔ اب یہ اقساط نظرثانی کے بعد کتابی صورت میں یک جا کردی گئی ہیں ۔ کمال اسماعیل پر تنقید کا مسودہ پرانے کاغذات میں سے نکل آیا ، اس کو بھی اضافہ کر دیا گیا ہے ۔

گزشتہ چند سال سے ایران میں ادبِ قدیم کا دور احیا ہوا ۔ پرانے اساتذہ سے متعلق ایرانیوں کی تحقیقات بھی 'تنقید' کے اکثر نتائج سے ہم نوا ہے ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ راقم نے تنقید میں جو طریقہ اختیار کیا تھا ، بالکل صحیح تھا ۔

میں نہایت وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ تنقید ھٰذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں ۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح و حالات لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت و درستی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں ۔ میں ان بزرگوں کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کرتا جو شعرالعجم کو حسن و عشق کا صحیفہ کہہ کر اس کے

تاریخی پہلو کی اہمیت کو گھٹانا اور تنقید کی ضرورت کو اس سے مٹانا چاہتے ہیں ۔

'تنقید' میرے لیے ایک علمی مشغلے کا سامان تھی اور میں اس میں پوری دل‌چسپی لیتا رہا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی نے اسے ایم ۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا ہے تو مجھے بڑا رنج ہوا اور میں نے تنقید کا سلسلہ ختم کر دیا ۔

تنقید کے دوران میں میں نے نہ صرف تخریبی پہلو پر نظر رکھی ہے بلکہ حسبِ اجازتِ وقت تعمیری کام بھی کیا ہے ۔ یوں تو ہر شاعر کے حال میں کم و بیش اس کا پرتو موجود ہے لیکن انوری ، نظامی اور عطار کے تذکرے میں بہت نمایاں ہے ۔

اس تنقید کا مقصد ناظرین کے واسطے ہر قسم کی اطلاع فراہم کرنا نہیں بلکہ شعر العجم کے نظری مواقع پر روشنی ڈالنا ہے ۔ یہی نقطۂ نظر خیام کے حالات میں بھی کار فرما ہے جو میرے فاضل دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم ۔ اے ، پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے قلم کا نتیجہ ہے ۔ ڈاکٹر صاحب بحالاتِ موجودہ اپنے مضمون کی طباعت کے حق میں نہ تھے، لیکن یہ اطلاع مجھ کو ایسے وقت ملی جب کہ تمام کتاب لکھی جا کر مطبع میں پہنچ چکی تھی ۔ مجھے ان کی خواہش کی تعمیل نہ کرنے کا افسوس ہے ۔

محمود شیرانی

تنقید شعرالعجم

علامہ شبلی مرحوم زمانۂ حال کے اُن چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا ۔ ان کی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بنا کر چمکایا ہے ۔

مرحوم کا شمار اُن خوش نصیب مصنفین میں کیا جا سکتا ہے جن کے فرزندانِ روحانی نے اُن کے دورانِ حیات میں قرار واقعی قدر و منزلت حاصل کر لی ہے ، جس کے حقیقت میں وہ مستحق ہیں ۔

مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فن تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہو چکا تھا ، اردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا ۔ ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست اور قابل قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی ۔

تاریخ میں اُن کی وسعتِ معلومات کا اندازہ مرحوم کی اُن متعدد اور مختلف الموضوع تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے جو اردو ادبیات کی چیدہ اور منتخب کتابوں میں مانی جاتی ہیں ۔

فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے شعرالعجم تصنیف کی ۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ، شعرالعجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے ۔ ملک نے بھی اس کی قدر کرنے میں حوصلے سے کام لیا ؛ چناں چہ اس وقت تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔

ذیل کی سطور میں میرا روے سخن اسی کتاب کی طرف ہے اور صرف ان بیانات سے بحث کی جائے گی جن کے متعلق مجھے مولانا شبلی سے بعض تاریخی یا تنقیدی وجوہ پر اختلاف ہے ۔ میرا تبصرہ ممکن ہے کہ آیندہ بھی جاری رہے ، سر دست اس کی پہلی جلد کا مطالعہ شروع کرتا ہوں ۔ شعرالعجم کے نام سے جہاں جہاں حوالے دیے گئے ہیں وہ اسی جلد سے تصور کیے جائیں ۔ اس کتاب کا جو نسخہ میرے زیرنظر ہے وہ مطبع فیض عام ، علی گڑھ (۱۹۰۹ع) کا مطبوعہ ہے ۔

شعرالعجم کے مطالعے کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں ۔ رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آ جاتا ہے ، بشرطیکہ دل چسپ ہو ، حوالۂ قلم کر دیتے ہیں ۔ بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جا کر خود ہی تردید کر جاتے ہیں ۔ پہلے کچھ رائے قائم کی ، بعد میں جا کر کوئی اور نظریہ قائم کر لیا ۔ ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں لیکن شعراے عجم کے حالات میں اُن کے طاقت ور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں ۔ اس خاص دائرے میں اُن کی معلوماتِ تاریخی نہایت محدود ہے ، اور نہ تمام سلسلۂ شعرا ، ان کے دواوین اور مآثر پر کافی عبور ہے ۔ سنہ و تاریخ جو فن تاریخ کا ایک شان دار اور وقیع پہلو ہے ، اس پر اول تو پوری توجہ نہیں کی اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں ۔ بعض متاخرین کو متقدمین کا پہلو نشین بنا دیا ، اور بعض متقدمین کو متاخرین کا ہم بزم کردیا ہے ۔

بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعرالعجم میں قابل عزت جگہ پائی ہے ۔ عام اغلاط جنھیں تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصنیف میں دہرا کر ہماری ادبیات میں عام طور پر زبان زد کردیا ہے ، شعرالعجم کے صفحات پر بھی موجود ہیں ۔ ایک شاعر کے ابیات دوسرے شاعر

کے نام سے بھی بعض اوقات درج ہوئے ہیں ۔ اکثر اوقات ایک مورخ یا محقق کو اپنے اجتہاد کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن مولانا نے ضروری مواقع پر بھی اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔ جب کسی واقعے کی نسبت دو مختلف روایتیں آ گئی ہیں ، شبلی اس خوش خلق حاکم کی طرح جو مدعی اور مدعاعلیہ دونوں کے خوش کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف ہے ، ”تم بھی سچے اور تم بھی سچے“ کہہ کر بغیر کسی جرح و تعدیل کے آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایات بڑے بوڑھوں کی باقیات الصالحات ہیں ۔ ان کے متعلق رد و قدح کرنا یا ان کو غلط ثابت کرنا ہماری شانِ اخلاق کے خلاف ہے :

کی توانم دید زاهد جام صهبا بشکند
می پرد رنگم حبابی گر بدریا بشکند

کتابت کی غلطیاں ایک اچھی تعداد میں موجود ہیں ، اگرچہ فرماتے ہیں :

”خفیف غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے ، اس لیے موٹی موٹی غلطیاں لکھ دی ہیں ۔“ (صفحہ ۲ ، ۳ ، آخر کتاب)

اس عذر اور آخر میں غلط نامے کے باوجود کتاب میں موٹی موٹی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں ۔

جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کی دسترس میں آ سکیں انھیں پر قناعت کی ، زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس حصہ شعرالعجم کے لیے (جو اس مضمون کے دوران میں میرے زیر نظر ہے) 'مجمع الفصحا' اور 'تذکرۂ دولت شاہ' پر زیادہ اعتماد کیا ہے ۔ ان تصنیفات میں ہر قسم کا رطب و یابس نظر آتا ہے ۔ میرے خیال میں 'لباب الالباب' محمد عوفی ، 'بزم آرا' یا 'مخزن الغرائب' زیادہ مفید ہوتیں ۔ پچھلی دونوں کتابوں سے مولانا واقف نہیں معلوم ہوتے ۔ البتہ 'لباب الالباب'

کا نام فہرست کتب میں سب سے اول ہے ، جیسے 'لب اللباب' عوفی یزدی (کذا) کے نام سے یاد کیا ہے ۔ (شعرالعجم ، صفحہ ۴) لیکن مولانا کی فہرست میں اس کا ادخال زیادہ تر ایک اعزازی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ آخر جلد میں غالباً انھیں اعتراف ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری ۔ فرماتے ہیں :

"لب اللباب عوفی کی پہلی جلد کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ[1] کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا ۔"

(صفحہ ۲ ، آخر جلد اول)

اس سے میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک لباب الالباب مولانا کی نظرافروز نہیں ہوئی تھی ؛ پھر فہرست میں اس کے شامل کیے جانے کے کیا معنی ؟

میں دیکھتا ہوں کہ فہرست میں ابوالفضل بیہقی کی 'تاریخ آلِ غزنین' کا نام بھی درج ہے جس کے ساتھ یہ نوٹ ہے :

''مصنف مسعود بن سلطان محمد (کذا) غزنوی کے زمانے میں تھا ؛ ضمناً شعرائے عصر کا تذکرہ کیا ہے ۔" (صفحہ ۴)

اب جو شخص تاریخ بیہقی سے واقف ہے وہ جان سکتا ہے کہ مصنف نے شعرائے عصر کے ذکر کرنے میں خاص التزام سے کام نہیں لیا ۔ چند فقرے ابوحنیفہ اسکاف ، زینتی علوی اور مسعود رازی کے ایک ایک واقعے کے متعلق اتفاقیہ حوالۂ قلم کر دیے ہیں ۔ لیکن مولانا نے ان سے کچھ استفادہ نہیں کیا اور نہ ذیلِ کتاب میں کہیں حوالہ دیا ۔ اس لیے لباب کی طرح اس کتاب کا نام بھی محض آرائش و نمائش کے لیے داخل کر لیا گیا ہے ۔

دیکھا جاتا ہے کہ فہرست میں پروفیسر براؤن کی 'تاریخ ادبیات

---

۱ ۔ لباب الالباب محمد عوفی ۱۹۰۶ع میں پروفیسر براؤن نے شائع کی ، اور شعرالعجم ۱۹۰۹ع میں طبع ہوئی ۔ (حاشیۂ مصنف)

ایران[1] ' کا نام درج نہیں ہوا حالانکہ براؤن کے اثرات میں علامہ نے خواجہ زادہ عباس مروزی سے متعلق جسے ابوالعباس لکھا گیا ہے اور جو اکثر محققین کے نزدیک فارسی شاعری کا آدم[2] ہے ، فرمایا ہے :

''ابوالعباس مروزی کے اشعار ، جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا ، اگر روایتاً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک اتفاقیہ تفریحِ خاطر تھی جو سلسلہ تاریخ کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی -"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱٦)

عباس مروزی کے وہ اشعار حسبِ ذیل ہیں :

ای رسانیده بدولت فرق خود تا فرقدین
گسترانیده به جود و فضل در عالم یدین
مر خلافت را تو شایسته چو مردم دیده را
دین یزدان را تو بایسته چو رخ را هردو عین

کس برین منوال پیش از من چنین شعری نگفت
مر زبان پارسی را هست تا این نوع بین
لیک ازان گفتم من این مدحت ترا تا این لغت
گیرد از مدح و ثنای حضرت تو زیب و زین

---

۱ - براؤن کی تاریخ اس موضوع پر سب سے اعلیٰ تصنیف ہے جو میری نظر سے گزری ہے - مولانا شبلی نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے - ہمارے زمانے کی اس بہترین تصنیف کے لیے شبلی کی رائے قابلِ دید ہے ، فرماتے ہیں :

''بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا ؛ نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے -''

[مکاتیب شبلی ، حصہ دوم ، صفحہ ۲۴۲ ، مطبع معارف ۱۹۱۷ع]

(حاشیہ مصنف)

۲ - فارسی شاعری کے آغاز سے متعلق ملاحظہ فرمائیے اسی جلد کا ضمیمہ نمبر ۱ بہ عنوان 'فارسی شاعری اور اس کی قدامت' - (مرتب)

ان اشعار کے متعلق مولانا اس لیے متشکک ہیں کہ کازیمیرسکی (Kazimirski) اور پروفیسر براؤن ان کو تسلیم نہیں کرتے لیکن صفحہ ۱۸ پر مولانا اپنے گزشتہ بیانات فراموش کرکے فرماتے ہیں :

"اتنے سے سہارے پر کہ مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا تھا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہوگیا تھا ، عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا اور مامون الرشید نے اس کے صلے میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیے ۔"

(صفحہ ۱۸ ، شعر العجم)

اس روایت کا پہلا ناقل محمد عوفی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ صرف ایک ہزار دینار صلے میں دیے گئے ، سالانہ کا ذکر نہیں کرتا ۔ جب یہ واقعہ علامہ کے نزدیک روایتاً ثابت نہیں تو اس کے استعمال کی زحمت کیوں گوارا کی ؟ آگے چل کر فرماتے ہیں :

"اس سے پہلے اگر برائے نام کچھ پتا چلتا ہے تو ابوحفص حکیم سغدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا ۔"

(صفحہ ۱۸ ، شعرالعجم)

ابو حفص بن احوص سغدی ، سغد سمرقند کا رہنے والا ، فن موسیقی میں استاد کامل تھا ۔ ابونصر فارابی نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ موسیقار سے ملتا جلتا ایک ساز جس کا نام 'شہرود' تھا اس نے ایجاد کیا ۔ فارابی نے اس ساز کی شکل اپنی تصنیف میں بیان کی ہے ۔ ابوحفص بہ‌قول صاحب 'خزانۂ عامرہ' و صاحب 'المعجم فی معاییر اشعار العجم'، سنہ ۳۰۰ ھ میں گزرا ہے ۔ ابو حفص فارسی فرہنگ نگاروں کا ابوالبشر مانا جا سکتا ہے ۔ اس کی

---

۱ ۔ المعجم میں شمس قیس رازی کا بیان ہے :

" و بعضی میگویند کہ اول شعر پارسی ابو حفص حکیم بن احوص سغدی گفتہ است از سغد سمرقند و او در صناعت موسیقی دستی تمام داشتہ است ۔ ابو نصر فارابی در کتاب خویش ذکر او آوردہ است و

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فرہنگ کا ذکر فرہنگ جہانگیری' میں آتا ہے -

رباعی کی نسبت مجھے علامہ شبلی سے اختلاف ہے - صفاریہ خاندان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانے میں ہوئی - یعقوب صفار کا ایک کم‌سن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا ، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا ، بچے کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا : غلطان غلطان همی رود تا لبِ گو

یعقوب بھی موجود تھا ؛ اس کو بچے کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا ، لیکن چوں کہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے ، شعرا کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے - انھوں نے کہا ہزج ہے ، پھر تین مصرعے اور لگا کر رباعی کر دیا اور دوبیتی نام رکھا - مدت تک یہی نام رہا ، پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے - لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی دوبیتی کہتے ہیں جس سے اہل عرب کی دیانت کا اندازہ ہوتا ہے -"

(شعر العجم ، صفحہ ۲۱ و ۲۲)

یہ قصہ غالباً مولانا نے دولت شاہ سمرقندی سے نقل کیا ہے -

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

صورت آلتی موسیقاری نام آن شہرود کہ بعد از ابو حفص ہیچ کس آنرا در عمل نتوانست آورد برکشیدہ و می‌گوید او در سنۂ ثلث‌مائۃ ہجری بودہ است -"

(المعجم فی معاییر اشعارالعجم ، صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱ ، طبع طہران)
(مرتب)

۱ - 'فرہنگ جہانگیری' کے علاوہ 'مجمع‌الفرس' میں سروری بھی ابو حفص کی فرہنگ کا تذکرہ 'رسالۂ ابو حفص' کے نام سے کرتا ہے اور اس سے چند حوالے بھی دیتا ہے - (مرتب)

لیکن یہ یاد رہے کہ دولت شاہ سمرقندی ایک نہایت ضعیف راوی ہے۔ اس سے بہتر اطلاع قدر بلگرامی نے 'قواعد العروض' میں دی ہے۔

المعجم فی معاییر اشعار العجم میں شمس‌الدین محمد بن قیس، جو ساتویں صدی ہجری کے ربع اول کے مصنف ہیں، لکھتے ہیں کہ متقدمین شعرائے عجم میں ایک شاعر نے (میرا خیال ہے کہ وہ رودکی تھا) اخرم اور اخرب کے اجتماع سے نیا وزن نکالا جس کو وزن رباعی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا مقبول وزن ہے کہ طبائع سلیم اکثر اس کی شائق ہیں۔ اس کے استخراج کا باعث یہ کہا جاتا ہے کہ ایک روز عید کے دن غزنین کی تفرج گاہ میں وہ گردش کر رہا تھا، اس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے کھیل میں مشغول ہیں اور ان کے گرد تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شاعر بھی وہاں جا کر کھڑا ہوگیا۔ ان میں سے ایک لڑکا، جس کی عمر دس پندرہ سال سے زائد نہ ہوگی، اخروٹوں سے کھیل رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اخروٹ گڑھے سے باہر گرا اور پھر رجعت کرتا ہوا گڑھے میں جا گرا۔ لڑکا حسین و جمیل ہونے کے علاوہ طبیعت میں موزونیت بھی رکھتا تھا اور اپنی مقفلی اور مسجع گفتگو سے حاضرین کو محظوظ کر رہا تھا۔ اخروٹ کو گڑھے کی طرف رواں دیکھ کر بولا: غلطان غلطان همی رود تا لب گو

شاعر نے اس کلمے سے ایک مقبول وزن معلوم کرلیا اور عروضی اصول اس پر استعمال کرکے ترانہ نام رکھا اور بحر ہزج کی فروع میں شامل کر لیا۔ (المعجم، صفحہ ۸۸ - ۸۹)

لیکن میں اس روایت کا بھی پابند نہیں ہو سکتا، اگرچہ میں نے مولانا کے نظریے کی تردید کے لیے اس کو درج کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظم کی وہ صنف خاص جس کو ہم رباعی کہنے کے عادی ہیں، کوئی شخصی ایجاد نہیں بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا، رائج تھی۔ اس کے وزن عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔

قدما ہزج کے مربعات میں ان کا شمار کرتے تھے ۔ تعداد میں وہ چار شعر ہوتے تھے اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ متاخرین نے اس میں یہ ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا ، جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی اور چار قافیوں کے بجائے صرف تین قافیے ضروری سمجھے گئے اور مصرع سوم خصی رکھا گیا ۔

قدیم چہار بیتی کا کوئی نمونہ اس وقت موجود نہیں لیکن سمجھانے کے لیے اس قدر کافی ہوگا : ع

یکبارہ چنین جاهل و خونخوارہ مباش

ہمارے نزدیک یہ ایک مصرع مانا جاتا ہے ، قدما کے نزدیک پورا شعر تھا جس کو غالباً وہ یوں لکھتے تھے :

یک بارہ چنین جا　　　　هل و خونخوارہ مباش

جاہل کی 'ہ' شامل مصرع اول ہے اس لیے یہ ایک معقد شعر ہے جس کی تقطیع ہے مفعول مفاعیل ، مفاعیل فعول ۔ یا مثلاً متقدمین کا یہ شعرِ معقد :

دانی کہ دل از تو نہ　　　　شود سیر مرا

متاخرین نے اس شعر کو بھی ایک مصرع مانا اور یوں لکھا : ع

دانی کہ دل از تو نشود سیر مرا

جب ہزج اخرب یا اخرم میں ایسے چار شعر جمع ہو گئے اور آخر میں قافیہ پایا گیا ، قدما نے چہاربیتی نام رکھ لیا ۔ لیکن متاخرین نے ان چار اشعار کو چار مصرعے شمار کیا ، اس لیے چہاربیتی کا نام دوبیتی رکھ دیا ۔ محقق طوسی اس کے متعلق مربعات ہزج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"و آنچہ ازین وزنہا مانند یک مصراع مثمن است متاخران استعمال کمتر کنند و قدما بر آن شعر بسیار گفتہ اند و ایشان ہر مصراع را قافیہ آوردہ اند و آنرا بیتی می‌شمردہ مانند رجز مشطور یا بیت ہای معقد از اشعار تازیان کہ آنرا منتصفی معین نباشد ۔

و بدین سبب ترانه را قدما چهار بیت می گرفته اند و آنرا چهاربیتی خوانده و به تازی رباعی و در هر چهار قافیه آوردن لازم می شمرده‌اند ۔ اما به نزدیک متاخران چون مربعات این اوزان مستعمل نیست این اوزان متروک است و هر بیتی را ازین ابیات مصراعی می شمرند و رباعی را دو بیتی می خوانند و مصراع سوم را خصی می خوانند و قافیه شرط نمی نهند ۔"
(معیار الاشعار)

[اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے :
(مربعات کے) ان اوزان میں سے ایسے وزن ، جو ایک مصرع مثمن کے مانند ہیں ، متاخرین میں غیر مستعمل ہیں ۔ قدما نے ان اوزان میں کثرت سے اشعار لکھے ہیں ۔ وہ ہر مصرع (یعنی شعر مربع) کے آخر میں قافیہ لائے ہیں اور اس کو ایک بیت شمار کرتے ہیں ، رجز مشطور یا عربوں کے معقد اشعار کی طرح جن کا نصف معین نہیں ہوتا ۔ اسی لیے قدما ترانہ کو چار بیت مانتے تھے اور اس کو چار بیتی کے نام سے یاد کرتے تھے اور عربی میں رباعی کہتے ، اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھتے تھے ۔ لیکن متاخرین میں چوں کہ ان کے مربع اوزان استعمال میں نہیں آ رہے ، یہ اوزان متروک ہوچکے ہیں ۔ وہ اب ان اشعار کے ہر بیت کو ایک مصرع مانتے ہیں اور رباعی کو دو بیتی کہتے ہیں ۔ اور تیسرے مصرع کو خصی رکھتے ہیں اور اس میں قافیے کی شرط ضروری نہیں سمجھتے]
چہاربیتی کا سب سے قدیم نمونہ مجھ کو ابوشکور کے ہاں ملتا ہے جس کا 'آفرین نامہ' (شاہنامہ کی بحر میں ایک مثنوی) بقول عوفی ۳۳۶ھ میں ختم ہوا تھا ۔ ابو شکور کی رباعی کی موجودہ شکل یہ ہے :

رباعی

ای گشته من از غمِ فراوان تو پست
شد قامت من ز دردِ هجرانِ تو شست

ای شستہ من از فریب دستان تو دست
خود هیچ کسی بسیرت و شان تو هست

(لباب الالباب ، عوفی)

لیکن اگر چہار بیتی کی شکل میں لکھا جائے تو اس کی صورت حسب ذیل ہوگی :

ای گشتہ من از غم	فراوان تو پست
شد قامت من ز در	د هجران تو شست
ای شستہ من از فری	ب دستان تو دست
خود هیچ کسی بسی	رت و شان تو هست

اب یہ چہار بیتی کی بہت اچھی مثال ہے ۔ اس کے چاروں ابیات میں قافیہ ہے اور آخری تینوں شعر معقد ہیں ۔ متقدمین میں جس طرح رودکی اور شہید غزل کے لیے مشہور ہیں اسی طرح ابوطلب ترانے کے لیے مشہور ہے ۔ فرخی :

بیت

از دلآرامی و نغزی چون غزل های شہید
و ز دلآویزی و خوبی چون ترانہ بو طلب

غزنویوں کے عہد تک چہاربیتی کا رواج رہا ، بعد میں دوبیتی زیادہ رائج ہوئی[1] ۔

---

۱ ۔ محترم فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی قابل قدر تصنیف ''خیام'' میں جو ۱۹۳۳ع میں شائع ہوئی ہے ، رباعی کے تعلق میں میرے بعض بیانات کی تردید کی ہے اور نئے نظریے سپرد قلم کیے ہیں ۔ تنقید کے ضمن میں ان کا اندراج نامناسب تھا ؛ اس لیے میں نے سید صاحب کے اعتراضات اور اپنے جوابات کو ایک علیحدہ ضمیمے میں داخل کر کے کتاب کے آخر میں درج کر دیا ہے ، ناظرین وہاں دیکھ لیں ۔ (حاشیہ مصنف)

ملاحظہ ہو ضمیمہ ۲ متعلق رباعی بہجواب مولانا سید سلیمان ندوی ۔ (مرتب)

شہید بلخی

قدما کے حالات میں تاریخ نے زیادہ تر بخل و امساک سے کام لیا ہے۔ اس لیے آن قرون کے مشاہیر رجال کے حالات ہم تک بہت قلت کے ساتھ پہنچے ہیں۔ لیکن جو کچھ پہنچے ہیں مورخ کا فرض ہے کہ سب کو جمع کر کے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ علامہ شبلی نے بعض موقعوں پر محض سطحی معلومات پر اکتفا کی ہے۔ مثال میں شہید کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر صفحات ۲۷ و ۵۳ میں کیا ہے لیکن اس کے حالات کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی، نہ اس کی وجاہت کو کماحقہ ظاہر کیا۔ ابوالحسن شہید بن الحسین بلخی اپنے عہد کا نہایت زبردست فلسفی اور حکیم تھا۔ اس کے مناظرات مشہور محمد بن زکریا الرازی سے ہوئے ہیں۔ رازی نے اس کے جواب میں بعض رسائل بھی لکھے ہیں۔ فن شعر اس کے کمالات کا ایک کم تر پایہ ہے لیکن اس میدان میں بھی وہ رودکی کا ہم‌سر شمار کیا جاتا ہے[1]۔ محمد عوفی رودکی پر اس کے تقدم کا معترف ہے۔ فرخی نے ایک سے زیادہ موقع پر اس کے نام کو

---

۱ - رودکی نے شہید بلخی کی وفات پر اس کا مرثیہ بھی لکھا تھا جس کے چھ شعر ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم نے مختلف منابع سے جمع کر کے رودکی پر اپنی قابل قدر کتاب میں درج کیے ہیں۔ ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

کاروان شہید رفت از پیش　　و آن ما رفته گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم　　وز شمار خرد هزاران بیش

(محیط زندگی و احوال و اشعار رودکی، طبع دوم، طهران، صفحہ ۵۰۴ مرتب)

شہرت دی ہے :

شاعرانت چو رودکی و شہید　　مطربانت چو سرکش و سرکب

دقیقی اور منوچہری نے بھی اس کے نام کو رودکی کے نام کے ساتھ ضم کیا ہے ۔ منوچہری :

از حکیمان خراسان کو شہید و رودکی
بو شکور بلخی و بوالفتح بستی ہکذی

وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا ۔ ابو محمد عبداللہ کافی زوزنی نے اپنی کتاب 'حماسۃالظرفا' میں شہید کے بعض عربی اشعار درج کیے ہیں جن میں سے 'لباب‌الالباب' میں عوفی نے تین شعر نقل کیے ہیں ۔ ابن‌ندیم[1] ، یاقوت[2] اور ابومنصور الثعالبی[3] سب اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ فلسفۂ اخلاق اور الم‌پرستی شہید کی شاعری کے امتیازی جوہر ہیں ۔

اب میں رودکی کے حالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو 'کتاب‌الفہرست' صفحہ ۱۶۴ و ۱۸۴ ، طبع قاہرہ(مرتب)

۲ ۔ ملاحظہ ہو 'معجم‌البلدان' جلد ۳ ، صفحہ ۱۸۳ ، طبع قاہرہ ۔(مرتب)

۳ ۔ ملاحظہ ہو 'یتیمۃالدہر' جلد ۴ ، صفحہ ۲۱ ، طبع دمشق ۔ (مرتب)

رودکی

یہ مشہور آفاق شاعر آدم الشعرا مانا جاتا ہے ، اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ نے اس کے واقعات قلم‌بند کرنے میں زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام لیا ہوگا اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے تو ایسا ہی خیال گزرتا ہے ۔ لیکن میں ناظرین کو آغاز داستان ہی میں اطلاع دیے دیتا ہوں کہ شعرالعجم میں رودکی کا افسانہ ایک دل فریب اور دل کش سراب کے منظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ بقول انشاء : ع

بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

مولانا لکھنے بیٹھے تھے رودکی کی داستان لیکن درمیان میں ان کے سمندِ قلم نے اس قدر بدلگامیاں کیں کہ منزل مقصود سے بھٹک کر کہیں کے کہیں جا نکلے اور حقیقی رودکی کے دھوکے میں ایک خیالی اور سیمیائی رودکی کے باغ کی سیر میں مصروف ہو گئے ۔

شعرالعجم میں رودکی کا نام محمد یا جعفر (صفحہ ۲۸) دیا ہے جس میں پہلا غلط اور دوسرا صحیح ہے ۔ انساب‌السمعانی[1] میں اس کا پورا نام یوں درج ہے : ''اُستاد ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمان ابن آدم السمرقندی ۔'' (صفحہ ۲۶۲)

---

۱ ۔ ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم بھی اس معاملے میں 'انساب السمعانی' ہی کی صحت کے قائل ہیں ، چنانچہ :

''اما البتہ درست ترین گفتہ از حیث قدامت ماخذ و اعتبار کتاب گفتارسمعانیست در کتاب الانساب کہ نام و نسب او را چنین تصریح میکند : 'ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمان بن آدم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

مولانا شبلی فرماتے ہیں :

"رودک نخشب کے ضلع میں ، جس کو نسف بھی کہتے ہیں ، ایک گاؤں کا نام ہے ؛ رودکی اسی گاؤں کی طرف منسوب ہے ۔"
(شعرالعجم ، صفحہ ۲۸)

'انساب السمعانی' (مطبوعۂ یورپ ، صفحہ ۲۶۲) میں رودک ایک ناحیہ کا نام ہے [1] جس کا صدر مقام سمرقند سے دو فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے ، رودکی اسی کی طرف منسوب ہے ۔

رودکی کی نابینائی کے ذکر میں فرماتے ہیں :

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

الرودکی الشاعر السمرقندی ۔ عزالدین ابن الاثیر و احمد علی منینی کہ در کتاب اللباب و کتاب الفتح الوهبی در بارۂ رودکی بحث کردہ اند و هر دو مطلب را از سمعانی گرفته اند نیز نام و نسب رودکی را چنان کہ گذشت آوردہ اند ۔''
(محیط زندگی و احوال و اشعار رودکی ، چاپ دوم ، طهران ، ۱۳۴۱ شمسی ، صفحہ ۲۹۶) ۔ (مرتب)

۱ ۔ سمعانی کی عربی عبارت کا فارسی ترجمہ یہ ہے :
''رودکی نسبت برودک است و آن ناحیتیست در سمرقند و قریہ ایست کہ آنرا بنج گویند و این قریہ قطب رودک و دو فرسنگ تا سمرقند ست ۔'' (صفحہ ۳۰۰ ، طبع قاہرہ)

استاد سعید نفیسی مرحوم سنہ ۱۳۳۹ شمسی (م ۶۱-۱۹۶۰ عیسوی) میں تاجیکستان تشریف لے گئے اور رودکی کے مولد کی تحقیق کی ۔ فرماتے ہیں :

''روز دوشنبہ ۳۱ ۔ امرداد ماہ از استالین آباد از راہ سمرقند بشہر پنج کنت کہ نزدیک ترین شہر امروز بزادگاہ رودکیست رفتم ، در شمال پنج کنت درۂ بسیار خرم با صفاییست کہ پنج رود کوچک درآن میریزند و در پایان درہ بیکدیگر می‌پیوندند و برود زر افشان‌ می ریزند ۔ بہمین جہت این ناحیہ را پنج رودک مینامند و ہنگامی کہ رودکی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

"یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۱۲۸)
بعض یوروپین محققین مثلاً ڈاکٹر ایتھے وغیرہم نے اس کی نابینائی سے قطعاً انکار کیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رودکی کی نابینائی کے متعلق ہمارے پاس قریب قریب ہم‌عصر شہادتیں موجود ہیں۔ مثلاً دقیقی اس کی بے بصارتی کی طرف تلمیح کرتا ہوا کہتا ہے:

استاد شہید زندہ بایستی   و آن شاعر کور چشم باطن بین

اور ابو زراعہ المعمری الجرجانی کہتا ہے:

ابیات

اگر بدولت با رودکی نمی‌مانم
عجب مکن سخن از رودکی نہ کم دانم
اگر بکوری چشم او بیافت گیتی را
ز بہر گیتی من کور بود نتوانم
ہزار یک زان کو یافت از عطای ملوک
بمن دھی سخن آید ہزار چندانم

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

درآنجا بجہان آمدہ است ہمین نام‌را داشتہ است۔ بہمین جہت وی رودکی تخلص کردہ است۔"
(احوال رودکی ، بار دوم ، صفحہ ۲۹۴)

سمعانی کے دیے ہوئے لفظ 'بنج' کی بابت فرماتے ہیں:

"و پیداست کہ سمعانی کلمۂ پنج فارسی را کہ ادریسی باملای قدیم بنج نوشتہ است درس نخواندہ است۔"
(احوال رودکی ، بار دوم ، صفحہ ۲۹۸) (مرتب)

لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ مادر زاد نابینا[1] نہیں تھا بلکہ جیسا کہ منینی نے شرح یمینی (صفحہ ۵۲ ، جلد اول ، مطبوعہ مصر ۱۲۸٦ھ) میں شارح نجاتی کی سند پر لکھا ہے اور نجاتی رشیدی کے سعد نامے کے حوالے سے کہتا ہے کہ آخر عمر میں رودکی کی آنکھوں

---

۱ - رودکی کے مادر زاد نابینا ہونے کی روایت سب سے پہلے ابو حیان توحیدی نے بیان کی ہے ، اس کے بعد محمد عوفی اپنی کتاب 'لباب الالباب' میں بیان کرتا ہے ۔ بعد ازاں مولانا جامی نے 'بہارستان' میں ، امین احمد رازی نے 'ہفت اقلیم' میں اور رضا قلی خان ہدایت نے 'مجمع الفصحا' میں عوفی کی پیروی کی ہے ۔ فی زماننا مشہور ایرانی فاضل استاد بدیع الزمان فروزانفر اس روایت کے تسلیم کرنے والوں میں سر فہرست ہیں ۔ مجلہ دانشکدۂ ادبیات کے رودکی نمبر (بابت ماہ مارچ و جون ۱۹۵۹ع) کے ایک مضمون بہ عنوان ''شعر و شاعری رودکی'' کے ضمن میں فرماتے ہیں :

''. . . . . استاد رودکی بدون ہیچ گونہ شک کور مادر زاد بودہ و ہرگز جہان و صور حسی را بچشم ظاہر مشاہدہ ننمودہ است ۔ و این مطلب امروز برای بندہ مسلم است و درآن ہیچگونہ شک ندارم ۔'' (صفحہ ۱۰۳)

انھوں نے اپنے بیان کے ثبوت میں عربی شاعر بشار بن برد کی مثال پیش کی ہے جو مادر زاد نابینا تھا ، لیکن اس کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو ایک بینا شخص ہی کہہ سکتا ہے ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ رودکی کے آخر عمر میں نابینا ہونے کے جو دلائل ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم نے پیش کیے ہیں ، نہایت وزنی ہیں ۔ وہ اس معاملے میں ابوحیان توحیدی کی سی قدیم شہادت کو بھی تسلیم نہیں کرتے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

''این نکتہ را کہ رودکی کور مادر زاد بودہ است . . . با آنکہ درست نیست و با قرائن دیگر تطبیق نمی کند شگفتست کہ ابوحیان توحیدی کہ تقریباً تا ہفتاد سال پس از مرگ رودکی زیستہ است ، نیز مکرر کردہ است ۔ ازین جا برمی آید کہ این

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

میں سلائی پھروا دی گئی تھی ۔ کتاب کلیلہ و دمنہ جیسا کہ فردوسی کے بیان سے آیندہ معلوم ہوگا ، رودکی نے نابینائی کے زمانے میں لکھی تھی ۔ اس کتاب کے متعلق مولانا فرماتے ہیں :

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

نکتۂ نادرست از زمانهای قدیم و نزدیک بعصر رودکی دربارۂ او رواج داشته است ۔''

(مجلہ دانشکدۂ ادبیات ، شمارۂ مخصوص رودکی ، صفحہ ۲۲-۲۳)

اپنی قابل قدر کتاب 'احوال و اشعار رودکی' میں شاعر کے بہت سے اشعار سے استنباط کرنے کے بعد رقم طراز ہیں :

''با این همه دلایل مرا مسلم است که رودکی کور مادر زاد نبوده و تنها در پایان عمر کور شده است ، چنانکه شیخ منینی در شرح تاریخ یمینی گوید 'در پایان عمر چشمش میل کشیده شد . . . . میل کشیدن چشم را دو سبب بوده است : نخست برای دفع علتی وده است که بر چشم روی میدهد و آن عبارتست از تیرگی چشم و پرده ای که بر روی چشم کشیده میشود . . . سبب دوم میل کشیدن آن بود که اگر میخواستند کسی را بکیفری یا بخشم و ستیزه کور کنند آهنی بر چشم او میکشیدند و وی را نابینا میساختند . . . درین باب میتوان انگاشت که چون رودکی با ابوالفضل بلعمی وزیر بسیار نزدیک بوده است و این وزیر بسال ۳۲۶ معزول شده و جیهانی بجای او نشسته است نزدیکان و دوستان وی نیز مورد خشم نصر بن احمد واقع شده باشند و از آن جمله رودکی بوده است که بدین جهت یا جهاتی دیگر دیدگان او را میل کشیده و او را دور کرده باشند و اینکه در پایان عمر در پنج رودک زادگاه خویش بوده و در آنجا مرده و مدفون گشته ، نیز موید این حدیث است که پس از بلعمی او را از دربار رانده باشند و این که در آخر عمر بیاد جوانی خویش و گذشت ایام خود بیانی سوزناک و شورانگیز دارد ۔ شاید بسبب همین مصایب و کور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

"لیکن خاندانِ سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لیے ۔ چنانچہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ کی نظم کی خدمت دی اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم عطا کیے ۔ عنصری ایک قصیدے میں کہتا ہے :

چہل ہزار درم رودکی ز مہترِ خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹ و ۳۰)

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

شدن و راندہ‌گشتن از دربار نصر بن احمد بودہ باشد ۔ در ہر حال آنچہ مسلمست این است کہ رودکی کور مادر زاد نبودہ و در پایان عمر کور شدہ است و این کہ دقیقی در اشارت نسبت بوی گوید :

استاد شہید زندہ بایستی
و آن شاعر تیرہ چشم روشن بین

و ناصر خسرو بپیروی ہمین بیت دقیقی گفتہ است :

اشعار زہد و پند بسی گفتست
آن تیرہ چشم شاعر روشن بین

. . . بالا ترین دلیل بر این کہ رودکی را در پایان زندگی کور کردہ‌اند اینست کہ در ۱۳۳۶ کہ در تاجیکستان در نزدیکی شہر پنج کنت در ناحیۂ رودک و در روستای پنج رودک در شمال سمرقند در گورستان کہنہ ای کہ ابو سعد ادریسی در تاریخ سمرقند گور رودکی را در آنجا نشان دادہ است پس از کاوش جایگاہ قبر وی را یافتند و در آنجا استخوان وی از زیر خاک بیرون آمد ۔ درکاسۂ چشم وی و از جمجمہ اش اثر سوختگی و برخورد با جسم گداختہ ای پیدا شد و مسلم شد کہ وقتی جسم گداختہ ای در چشمان وی فرو بردہ اند و آنچہ نجاتی گفتہ بود کہ چشم وی را میل کشیدہ اند ثابت شد ۔"

[محیط زندگی و احوال و اشعار رودکی ، صفحہ ۹-۳۰۸ ، طبع دوم]
(مرتب)

ولہ : "نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے ۔" (شعر العجم ، صفحہ ۲۶)

اس عبارت میں علامہ شبلی کو دو مغالطے پیش آئے ہیں ؛ شعر بالا میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے عجیب عجیب اصلاحیں دی ہیں ۔ مفتاح التواریخ میں صاحب ہفت اقلیم کی سند پر یوں لکھا ہے :

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ و دمنہ

مرآت الخیال میں مطلع بنا لیا گیا ہے :

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت ز نظم آوری بکشور خویش[1]

لیکن قصائد عنصری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل شعر یوں تھا :

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
بیافتہ است بتوزیع ازین در و آن در
شگفتش آمد و شادی فزود وکبر گرفت
زروی فخر بگفت این بشعر خویش اندر[2]

یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں کہ ان قصاید میں عنصری والا مصرع 'بیافتہ است بتوزیع'[3] الخ صحیح ہے یا مولانا کا مصرع جس میں

۱ ۔ صفحہ ۲۱ ، طبع بمبئی ، آقا محمد شیرازی ۔ (حاشیہ مصنف)
۲ ۔ دیوان عنصری ، صفحہ ۶۶ بمبئی ۱۳۲۰ھ طبع آقا محمد اردکانی ۔
(حاشیہ مصنف)
۳ ۔ عنصری کا دیوان ڈاکٹر یحیئی قریب نے مرتب کرکے ۱۳۴۱ شمسی (م ۳-۱۹۶۲ع) میں طہران سے شائع کیا ہے ۔ اس میں صفحہ ۱۰۷ پر یہ مصرع اسی طرح درج ہے جس طرح حافظ صاحب نے بیان فرمایا ہے یعنی : ع

بیافتہ است بتوزیع ازین در و آن در

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کلیلہ کا ذکر آتا ہے[1] - ازرق نے جو ابوالفوارس طغان شاہ بن الپ ارسلان محمد بن چغری بیگ داؤد سلجوق کا مداح ہے ، اتفاقیہ اس واقعے کا ذکر ایک قصیدے میں کیا ہے ۔ عنصری کا شعرِ بالا اس کے ذہن میں ہے اور لکھتا ہے :

حدیث میرِ خراسان و قصۂ توزیع[2]   بگفت رودکی از روی فخر در اشعار
بدآنچہ دادہ بد او را ہزار دیناری   بناوجوب بہم کردہ از صغار و کبار

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح عنصری کے ہاں اسی طرح ازرق کے ہاں کلیلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں شاعر توزیع لکھ رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انعام کلیلہ کے صلے میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر ۔ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہے تو خود رودکی کا شعر جو غالباً اس قصے کا بانی مبانی ہے ، نقل کیا جا سکتا ہے و ھو ھٰذا :

بداد میر خراسانش چل ھزار درم
درو فزونی یک پنج میر ما کان بود[3]

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

پروفیسر سعید نفیسی ''احوال و اشعار رودکی'' کے صفحہ ۲۱۲ پر بھی اسی طرح لکھتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں :

''مصرع دوم بیت اول را در بعض نسخ چنین ضبط کردہ اند :

'عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

و البتہ بدین شکل سست تر از آن روایت دیگر ست ۔'' (مرتب)

۱ - مولانا نے یہ مطلب غالباً 'خزانۂ عامرہ' سے لیا ہے جہاں آزاد بلگرامی رقم طراز ہیں :— ''بفرمودۂ او کتاب کلیلہ و دمنہ بنظم آورد و چہل ہزار درم صلہ برگرفت ۔'' 'او' کا مرجع نصر بن احمد سامانی ہے ۔ (مرتب)

۲ - قسمت کردن بر جمعی برای دیگری و پراگندہ کردن ۔ (حاشیۂ مصنف)

۳ - شعر العجم صفحہ ۳۶ ، ۱۹۰۹ع - (حاشیۂ مصنف)

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ رودکی خود بھی کلیلہ کے قصے کی تائید نہیں کرتا ۔

کلیلہ کی نظم کے سلسلے میں فردوسی ابوالفضل بلعمی (المتوفیٰ ۳۲۹ھ) وزیر امیر نصر (المتوفی ۳۳۱ھ) کا نام پیش کرتا ہے ۔ میں فردوسی کے اشعار بجنسہٖ نقل کرتا ہوں :

کلیلہ بتازی شد از پہلوی — بدینسان کہ اکنون ہمی بشنوی
بتازی ہمی‌بود تا گاہ نصر — بدانگہ کہ شد در جہان شاہ نصر
گرانمایہ بوالفضل دستور اوی — کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی و دری — بگفتند و کوتاہ شد داوری
ازین پس بدو رسم و رای آمدش — بد و بر خرد رہنمای آمدش
ہمی‌خواستی آشکار و نہان — کزو یادگاری بود در جہان
گزارندہ را پیش بنشاندند — ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بہ پیوست گویا پراگندہ را — بسفت این چنین در آگندہ را
ہر آن کو سخن داند آرائش‌ست — چو ابلہ بود جای بخشایش ست
حدیث پراگندہ بپراگند — چو پیوستہ شد مغز جان آگند

(شاہ نامہ ، جلد چہارم ، صفحہ ۳۵ ، ۱۲۷۵ھ بمبئی)

اس طرح آل سامان کی علمی فتوحات کے زریں کارناموں میں سے جس پر مولانا شبلی ان کے اس قدر مداح معلوم ہوتے ہیں ، ایک کارنامہ بالکل نکل گیا ۔ یعنی کلیلہ کی نظم امیر نصر کی فرمائش سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے روشن خیال وزیر ابوالفضل بلعمی کے حکم سے ۔ اُسی کی فرمائش سے وہ ابن المقنع کے عربی ترجمے سے فارسی نثر کے قالب میں آئی اور اسی کے ارشاد سے رودکی نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا ۔

بلعم دیار روم میں ایک شہر کا نام ہے جہاں قبیلۂ بنوتمیم کی ایک شاخ آباد ہوگئی تھی ۔ اس نسبت کی بنا پر ابوالفضل بلعمی

کہلایا[1] ۔ وہ اپنے زمانے کا بے نظیر شخص تھا ۔ علم و فضل ، عقل و تدبر میں لاثانی تھا[2] ناصر خسرو اس کے لیے کہتا ہے :

بوالفضل بلعمی بتوانی شدن بفضل
گر نیستی بہ نسبت ابوالفضل بلعمی

اس کی وفات صفر کی دسویں شب ۳۲۹ھ میں واقع ہوئی ۔ ابوالفضل کی مدح میں ان قرون میں رودکی کا ایک قصیدہ[3] بہت مشہور تھا جس کا ایک شعر حکیم سوزنی نے صدر جہاں شمس محمد بن عمر بن عبدالعزیز مازہ کی تعریف[4] میں یوں تضمین کیا ہے :

در مدح تو بصورت تضمین ادا کنم
یک بیت رودکی را در حق بلعمی

---

۱ ۔ سمعانی لکھتا ہے :
''البلعمی ، بفتح بای کہ یک نقطہ دارد و سکون لام و فتح عین مہملہ و درپایان آن میم ، نسبتست بسوی ابوالفضل محمد بن عبداللہ بن عبدالرحمان بن عبداللہ بن عیسیٰ بن رجاء بن معبد بن علوان بن زیاد بن غالب بن قیس بن المنذر بن حرب بن حسان بن ہشام بن مغیث بن الحرب بن زید مناۃ بن تمیم بلعمی تمیمی۔ ابن ماکولا گوید کہ رجاء بن معبد بربلعم کہ شہری از دیار روم است استیلا یافت ۔ ہنگامیکہ مسلمہ بن عبدالملک بدانجا رفت و در آنجا ماند و باز ماندگان وی درآنجا بسیار شدند و فرزندان وی را بد انجا نسبت دادند۔'' (مرتب)

۲ ۔ انساب السمعانی طبع یورپ ۔ (حاشیۂ مصنف)

۳ ۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے :

تا خوی ابر گل رخ تو کردہ شبنمی
شبنم شدست سوختہ چون اشک ماتمی

(مرتب)

۴ ۔ جس کا مطلع ہے :

صدر جہان رسید بہ شادی و خرمی
در دوستان فزونی و از دشمنان کمی

(مرتب)

صدر جہان جہان ہمہ تاریک شب شد است
از بہر ما سپیدۂ صادق ہمی دمی

معروفی نے غالباً رودکی کے اسی قصیدے سے ایک مصرع یوں باندھا ہے :

از رودکی شنیدم سلطان شاعران
''کاندر جہان بکس مگرو جز بفاطمی''

قولہ :

”رودکی نہایت پُرگو تھا ۔ رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے ۔ چناں‌چہ کہتا ہے :

شعر او را برشمردم سیزدہ رہ صد ہزار
ہم فزون تر آید ار چونانکہ باید بشمری

میں نے اس کے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھہرے اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں گے ۔''
(شعر العجم ، صفحہ ۳۲)

یہ ترجمہ صریحاً اعتراض سے خالی نہیں ۔ تیرہ مرتبہ ایک چیز گنی جاچکی ہے لیکن ابھی اس کا اچھی طرح گنا جانا باقی ہے ۔ بظاہر شاعر کا مطلب تیرہ لاکھ[1] ہے ۔

رودکی کی غزلوں کی مثال میں علامہ شبلی نے یہ ابیات انتخاب کیے ہیں :

---

۱ ۔ پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :
''سیزدہ رہ صد ہزار میشود ہزار ہزار (یک ملیون) وسیصد ہزار بیت ، برخی عقیدہ دارند کہ مراد رشیدی از :
شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار
اینست کہ سیزدہ بار شعر او را شمردم صد ہزار بیت بود و این درست نیست زیرا دلیل ندارد کہ سیزدہ بار شعر او را شمرہ باشد ۔''
(احوال و اشعار رودکی ، بار دوم ، صفحہ ۳۲۰) ۔ (مرتب)

ای جان من از آرزوی روی تو پژمان[1]
بنمای یکی روی و ببخشای برین جان
دشوار نمائی رخ و دشوار دهی بوس
آسان بربائی دل و آسان ببری جان
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار
نزدیک تو دشواری من باشد آسان

(شعر العجم ، صفحہ ۳۷)

یہ ابیات اصل میں قطران تبریزی[2] کے ایک قصیدے کی تشبیب سے لیے گئے ہیں جو امیر ابو نصر مملان کی مدح میں ہے ۔ ثبوت میں اسی قصیدے کا یہ شعر کافی ہے :

---

۱ ۔ دیوان قطران مطبوعہ تبریز (صفحہ ۲۵۷) میں بجائے 'پژمان' 'پیچان' درج ہے ۔ (مرتب)

۲ ۔ در حقیقت مولانا کے پیش‌نظر وہ دیوان تھا جسے ڈینسن راس ''دیوان مجعول رودکی'' کہتا ہے اور جس کے متعلق حافظ صاحب نے آیندہ صفحات میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ۔ اسی دیوان کی بابت پروفیسر سعید نفیسی رقم طراز ہیں :

''درمیان نسخہ ہای خطی دواوین شعرای ایران کتاب کوچکی حاوی نزدیک ہزار بیت در ایران و خارج از ایران متداولست کہ بنام 'دیوان رودکی' معروفست و نسخ متعدد از آن ہست ۔ خاور شناس انگلیسی دینسن راس در مقالتی کہ دربارۂ شعر رودکی نوشتہ و دربارۂ این کتاب بحث کردہ آن را 'دیوان مجعول رودکی' اصطلاح کردہ است وچون این اصطلاح بجاست من نیز از آن پیروی کردم ۔ این کتاب را گویا در اواخر قرن دہم و اوایل قرن یازدہم جعل کردہ اند زیر درمیان مآخذی کہ در گرد آوردن اشعار رودکی بدست بود قدیم ترین کتاب کہ درآن اشعار قطران را بنام رودکی آوردہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سردار بزرگان ملک عالم بو نصر   سالار امیران ملک گیتی مملان[1]
پانچویں قرن ہجریہ کے ربع دوم میں آذربائیجان میں ایک خاندان

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
باشند فرہنگ جہانگیریست کہ بسال ۱۰۰۵ تالیف شدہ و از آن پس تا زمان ما در بیشتر کتابہا اشعار قطران را کم و بیش بنام رودکی آوردہ اند و آن کتابہا بہ ترتیب قدامت بدین گونہ است : فرہنگ جہانگیری تالیف در ۱۰۰۵ ، عرفات العاشقین تالیف در ۱۰۲۳ ، مجمع الفرس سروری تالیف در ۱۰۲۸ ، نظم گزیدہ محمد صادق تبریزی تالیف در ۱۰۳۶ ، فرہنگ رشیدی تالیف در ۱۰۶۴ ، سفینۂ خوش‌گو تالیف در ۱۱۳۷ ، ریاض‌الشعرا تالیف در ۱۱۶۱ ، آتش کدہ کہ مولف آن تا ۱۱۹۵ مسغول تالیف آن بودہ است ، خلاصۃ الافکار تالیف در ۱۲۰۶ ، فرہنگ انجمن آرای ناصری (طبع ۱۲۸۸) ، مجمع‌الفصحا تالیف در ۱۲۸۴ ، مقالۂ دکتر ہرمان اتہ (طبع در ۱۲۹۱) دیوان چاپ طہران (طبع در ۱۳۱۵) ، شعر العجم تالیف در ۱۳۲۴ - ۱۳۲۵ ، نمونۂ ادبیات تاجیک تالیف در ۱۹۲۵ میلادی و سہ سفینہ‌ای کہ از قرن یازدہم ببعد تحریر کردہ اند ۔ ازینجا پیداست کہ پیش از قرن یازدہم ثبت اشعار قطران بنام رودکی متداول نبودہ است و چون ہفت کتاب ازین کتابہا کہ این نسبت بخطا را روا داشتہ‌اند ہر ہفت را در ہندوستان تالیف کردہ اند ۔ ظن غالب آنست کہ این خطا نخست از مؤلفین ہندی سرزدہ است و شاید نسخۂ دیوان مجعول رودکی را در ہند جعل کردہ باشند و مجموعہ ای از اشعار قطران ترتیب دادہ اند و بنام دیوان رودکی معمول داشتہ اند و سپس دیگران بعضی اشعار رودکی را کہ در کتب متداول زمان خود یافتہ‌اند بر آن افزودہ و دیوان رودکی چاپ طہران را فراہم کردہ اند کہ در سال ۱۳۱۵ بطبع رسیدہ است ۔ در دیوان مجعول رودکی چندین قصیدہ و قطعہ از اشعار قطران تبریزی ثبتست کہ باہمہ ابیات آنہا و یا برخی از آنہا را بنام رودکی درین دیوان مجعول ثبت کردہ اند ۔''
(احوال و اشعار رودکی ، بار دوم ، صفحہ ۴۶۸) ۔   (مرتب)

۱ - دیوان رودکی ، صفحہ ۵۶ ، طبع ایران ۱۳۱۵ھ ۔   (حاشیۂ مصنف)

جو غالباً کرکوے کہلاتا تھا ، حکمران تھا ۔ حکیم قطران تبریزی العضدی اس خاندان کے دو افراد کا مداح رہا ہے ۔ پہلا یہی ابونصر جس کا پورا نام ابو نصر محمد بن مسعود بن مملان ہے جو خود بھی مملان کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ قطران کے اکثر قصائد اس کی مدح میں ہیں ۔ یہ ابو نصر غالباً ۴۳۴ھ اور ۴۳۸ھ کے درمیان کسی وقت فوت ہوتا ہے ۔ جب سلجوقیوں نے ایران پر اپنا اقتدار قایم کر لیا ، یہ خاندان ان کا مطیع ہوگیا ۔

قصیدے کی تشبیب کے اشعار غزل کی مثال میں پیش کرنا شبلیانہ اجتہاد مانا جا سکتا ہے ۔ غزل کی دوسری مثال میں مولانا نے یہ ابیات انتخاب کیے ہیں :

"مشوش است دلم از کرشمۂ سلمیٰ
چنانکہ خاطر مجنون ز طرۂ لیلیٰ
چو گل شکر دهیم درد دل شود تسکین
چو ترش روی شوی وارهانی از صفریٰ
بپردہ نرگس تو آب جادوی بابل
کشادہ غنچۂ تو باب معجز عیسیٰ[1]"

(شعر العجم ، صفحہ ۳۷)

ان اشعار کو میں نہیں سمجھ سکتا رودکی سے کیا علاقہ ہوسکتا ہے[2] ۔ ایسی صاف و شستہ اور ہموار زبان ، اس کی ترکیبوں

---

۱ ۔ دیوان رودکی ، صفحہ ۱۰۳ ، طبع طہران ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ ۔ ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم نے بھی یہ اشعار رودکی کے نام پر اپنی فاضلانہ کتاب میں درج کر دیے ہیں ۔ ان کے ہاں دوسرے شعر کے بعد یہ شعر ملتا ہے :

بغنچۂ تو شکر خندہ نشتۂ بادہ   بسنبل تو در گوش مہرۂ افعی

اور چوتھے یعنی آخری شعر میں بجائے عیسیٰ موسیٰ دیا گیا ہے ۔ (صفحہ ۵۱۰) انھوں نے ان اشعار کے مآخذ کے طور پر چھ نام لکھے ہیں یعنی :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کی کثرت اور اضافات تشبیہی پر لحاظ کرتے ہوئے رودکی کی زبان نہیں ہو سکتی - باب معجز عیسیٰ ، آب جادوے بابل ، طرۂ لیلی اور کرشمۂ سلمٰی ، ایسی ترکیبیں ہیں جو رودکی کے عہد میں قطعاً غیر مستعمل ہیں - ممکن ہے کہ بعض تذکروں میں یہ اشعار رودکی کے نام پر مرقوم ہوں لیکن ایک محقق کا یہ فرض ہے کہ دوسروں کے آرا پر ہی اعتماد نہ کرے بلکہ اپنے اجتہاد سے بھی کام لے -

رودکی اگرچہ غزلیات کے لیے مشہور ہے ، لیکن افسوس سے کہا جاتا ہے کہ آج وہ کبریت احمر کی طرح نایاب ہیں - ذیل میں ایک مطلع اور خمریہ غزل رودکی کی پیش ہیں - مطلع :

کس فرستاد بشب آن بت عیار مرا
که مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا[1]

غزل

می آرد شرف آدمی پدید آزاده ترا از درم خرید
می آزاده پدید آرد از بد اصل فراوان هنراست اندرین نبید

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

۲ - مجمع الفصحا -

۳ - شعر العجم -

۴ - سفینۂ اشعار ، مملوکہ عباس اقبال خان مرحوم -

۵ - تذکرۂ عرفات العاشقین -

۶ - آثار ابو عبداللہ رودکی ، طبع استالین آباد ، ۱۹۵۸ع - (مرتب)

۱ - پروفیسر نفیسی کے ہاں اس کے ساتھ ایک شعر اور دیا گیا ہے - نیز مطلع میں بجائے 'بشب' 'بسر' ہے - شعر یہ ہے :

وین فژده بپرز بهر تو مرا خوارگرفت
برهاناد ازو ایزد جبار مرا (صفحہ ۴۹۲) -

(مرتب)

هرآنگہ کہ‌خوری سی‌خوش‌آنگہ است　　خاصہ چو گل و یاسمن دمیذ
بسا حصن بلندا کہ می کشاد　　بسا کرۂ نوزین کہ بشکنیذ
بسا دون بخیلا کہ می بخورد　　کریمی بجہان در پراگنیذ[1]

رودکی کے قصائد کی نسبت فرماتے ہیں :

''قصیدے کا جو طریقہ رودکی نے قایم کیا آج تک قایم ہے ، یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ ، پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز ، جود و سخا ، عدل و انصاف ، شجاعت و دلیری کا ذکر ، پھر دعائیہ ۔ صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جس کو ترصیع کہتے ہیں ۔ یعنی دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ لاتے ہیں ، مثلاً عرفی :

رماد را شرر قہر او کند شنجرف
جماد را اثر لطف او کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے ۔''
(شعر العجم ، صفحہ ۳۸)

یہ ایک ایسا بیان ہے جس کا ثابت کیا جانا ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قریب قریب دشوار ہے ، اس لیے کہ آج ہمارے پاس رودکی کا کوئی کامل قصیدہ موجود نہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ قصائد میں اس کا کیا ڈھنگ تھا ۔ تشبیب رائج تھی یا نہیں ، گریز کا دستور مروج تھا یا نہیں ، صنعت ترصیع کی نسبت البتہ کہا جا سکتا ہے کہ رودکی کے ایام میں اس کی رواج پذیری عام نہیں تھی اگرچہ نامعلوم بھی نہیں تھی ۔ فرمایا ہے :

''قصیدے میں اگرچہ صرف مداحی ہی مداحی ہوتی ہے لیکن رودکی نے جا بجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں :

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم از شمس قیس رازی ۔ (مرتب)

از بنفشه مرزها گسترده دیباها بچین
وز شگوفه شاخها بربسته درّ شاهوار
با هوای اوست گفتی هرچه در گیتی نسیم
بر زمین اوست گفتی هر چه در عالم بهار
ازمیان جوی آن آبی روان همچون گلاب
شاخهای گل شگفته بر کنار جوئبار
بود هر جا بهر نزهت گاه بار و نقل و مل
گلستان در گلستان و میوه اندر میوه زار

(شعر العجم ، صفحہ ۳۸ و ۳۹)

جس طرح حضرت اسحاقؑ نے حضرت عیصؑ کے دھوکے میں حضرت یعقوبؑ کو دعا دی تھی، یہاں یہی حالت مولانا کی ہے - وہ رودکی کے تصور میں قطران تبریزی کے باغ کی آبیاری میں مصروف ہوگئے ہیں - مولانا شبلی نے یہ ابیات قطران کے اس قصیدے سے لیے ہیں جو ابو منصور وھسودان کی مدح میں ہے ، جیسا کہ اسی قصیدے[1] کے اس شعر سے ظاہر ہے :

افتخار دھر ابو منصور وھسودان کہ[2] ہست
بندگانش را بمیران صد ہزاران افتخار

ابو منصور وھسودان جو ابونصر مملان کا جانشین ہے ، آذربائیجان کا بادشاہ تھا - ناصر خسرو علوی بلخی جب ۴۳۸ھ میں تبریز پہنچا ہے تو آذربائیجان کا بادشاہ ان ایام میں یہی ابو منصور تھا جس کا پورا نام سفرنامے میں یوں دیا گیا ہے : "الامیراجل سیف‌الدولہ

---

۱ - یہ قصیدہ دیوان قطران تبریزی مطبوعہ تبریز (۱۳۳۳ شمسی) کے صفحہ ۱۵۴ - ۱۵۵ پر موجود ہے - مطلع ہے :

شد ز فر ماہ فروردین جہان فردوس وار
باغ ها دیبا سلب شد ، شاخها مرجان سوار (مرتب)

۲ - دیوان رودکی صفحہ ۲۶ میں "مقصود آنکہ" بجائے "وھسودان کہ" لکھا گیا ہے جو غلط ہے - (حاشیہ مصنف)

و شرف الملۃ ابومنصور وهسودان محمد بن مولی امیرالمومنین ۔"
(سفر نامۂ ناصر خسرو ، مؤلفہ مولانا حالی ، صفحہ ۳۷)
مثال دوم میں یہ اشعار دیے گئے ہیں :

کوه دیگر گوی سیمین گشت و زرین شد چمن
آب دیگر باره روشن گشت و تیره شد هوا
گشت خامش فاختہ تا شد چمن پرداختہ
گشت بلبل بی‌نوا تا بوستان شد بی‌نوا
نار چون بر حقهٔ زرین نگینهای عتیق
سیب چون بر چهرهٔ سیمین نشانهای بکا
باد سرد آمد چو آه عاشقان هنگام صبح
بانگ زاغ آمد چو از معشوق پیغام جفا

(شعر العجم ، صفحہ ۲۹)
یہ اشعار قطران کے اُس قصیدے سے لیے گئے ہیں جس کا مطلع ہے :

تا دل من در هوای لیکوان شد آشنا
از سرشک دیده ام گردون نماید بس شنا[1]

فرہنگ رشیدی میں یہ مطلع البتہ رودکی کی طرف منسوب ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کا مالک قطران تبریزی ہے۔اور ابو نصر مملان کی تعریف میں ہے ۔ چناں‌چہ یہ شعر :

خسرو صافی نسب بو نصر مملان آنکہ هست
جسم او صافی ز هر عیبی چو جان مصطفیٰ[2]

معرکۂ جنگ کی مثال میں شعرالعجم میں رودکی کے نام پر یہ اشعار درج ہیں :

---

۱ ۔ تبریز کے مطبوعہ دیوان میں دوسرا مصرع یوں درج ہے :
در سرشک دیده ام کرد این دل خونین شنا
ملاحظہ ہو دیوان قطران ، طبع تبریز ، ۱۳۳۳ شمسی ، صفحہ ۹-۱۱
(مرتب)

۲ ۔ دیوان رودکی ، صفحہ ۳ ، طبع ایران ۔ (حاشیۂ مصنف)

بدانگهی کہ دو لشکر بروی یک دیگر
گران کنند رکاب و سبک کنند عنان
ز گرد اسپان تیرہ شود رخ خورشید
ز بانگ مردان خیرہ شود دل کیوان
یکی کشیدہ سنان و یکی کشادہ حسام
یکی کشادہ کمند و یکی کشیدہ کمان

(شعر العجم ، صفحہ ۳۹)

یہ ابیات قطران کی یادگار ہیں ۔ قصیدے کا مطلع[1] ہے :

من آن کشیدم و آن دیدم از غم ہجران
کہ ہیچ آدمی نیست دیدہ در دوران[2]

یہ قصیدہ بھی ابو نصر مملان کی مدح میں ہے ، چناں‌چہ یہ شعر :

مقام نصرتہا ناصر ولی بو نصر
چراغ لشکر و خورشید مملکت مملان

اسی قصیدے میں ابونصر کی ان لڑائیوں کا بھی ذکر آتا ہے جو اس نے اردبیل اور دارسور میں لڑی ہیں :

وغاش را پس پیکار اردبیل دلیل
نبردش را بس پیکار دارمور عیان

ابونصر کے ہاتھوں امیرموغان کی شکست کا ذکر بھی اسی قصیدے میں آتا ہے ۔ اس کے بعد علامہ یوں رقم طراز ہیں :

”قصیدے کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے ، یعنی تشبیب کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے ؛ یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے ۔ رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں ۔ مثلاً ایک قصیدے میں خزاں کا حال

---

۱ ۔ دیکھیے دیوان قطران ، طبع تبریز ، صفحہ ۳۲۷ - ۳۳۰ (مرتب)
۲ ۔ دیوان رودکی ، صفحہ ۵۰ ، ۱۳۱۵ھ (حاشیۂ مصنف)

لکھتے لکھتے کہتا ہے :

باد خوارزمی کنار باغ پر دینار کرد
چون کنار زائران را کرد دست بادشا"

(شعر العجم ، صفحہ ۳۹)

میں نہیں کہہ سکتا کہ رودکی کے مخلص ایسے ہی برجستہ ہوتے تھے ، جس کے شبلی مدعی ہیں ، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ رودکی کے محاسن شاعری کا یہ خوب صورت موتی ، یعنی شعر بالا ، اصل میں قطران کی ملک ہے جیسا کہ بعد میں آنے والے شعر ''خسرو صافی نسب بو نصر مملان آنکہ هست'' الخ سے ظاہر ہوتا ہے اور جس کو میں اوپر نقل کر چکا ہوں ۔ اسی گریز کی دوسری مثال میں فرمایا ہے :

''مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے :

یار من گفتا بهشت ست ای شگفت این باغ نیست
گفتم این باغیست خرم چون بهشت کردگار
آن بهشت ناپدید است این بهشت استی عیان
این به نقد است آن به نسیه آن نهان این آشکار
آن مکافات نماز است این مکافات مدیح
آن عطای کردگار است این عطای شهریار

(شعرالعجم ، صفحہ ۴۰)

یہ شعر اسی قصیدے کے ہیں جو ابومنصور وهسودان کی تعریف میں ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے ۔ اس کے بعد فرماتے ہیں :

"بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جس کی تقلید کسی نے نہیں کی ۔ مثلاً ایک قصیدہ تینتیس شعروں کا کہا ہے جس میں صرف مطلع ہی مطلع ہیں ؛ پہلا مطلع یہ ہے :

ندانی درد هجر ای بت مرا زان زارگردانی
دگر زارم لگردانی بداغ هجر گر دانی"

(شعرالعجم ، صفحہ ۴۰)

قبلہ مولانا ، قطرانی قصائد کے طلسم‌زار میں کچھ ایسے پھنسے ہیں

کہ مخلصی کی صورت اب تک ممکن نہیں ہوئی - یہ چونتیس مطلع کا قصیدہ[1] حسب معمول ابونصر مملان کی تعریف میں ہے ؛ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں :

کہ نو آثار طوفانی و نو بنیاد بطلانی
نہ موج بحر عمّانی نہ کف میر مملانی
ابونصر آنکہ یزدانش بہ نصرت داد ارزانی
ازو دولت گرانی یافت وز وی گوہر ارزانی[2]

موسم بہار کے ذکر میں مولانا نے یہ اشعار بھی رودکی کے نام پر درج کیے ہیں :

ہر آنچہ بست میان ارم بہم شداد
ہر آنچہ کرد بہ زیر زمین نہان قارون
سرشک ابر پراگندہ کرد در بستان
نسیم باد پدیدار کرد در ہامون

(شعرالعجم ، صفحہ ۴۲)

اس قصیدے کا مطلع ہے :

منم غلام خداوند زلف غالیہ گون
کہ ہست چون دل من زلف او نوان ونگون[3]

اسی قصیدے میں ذیل کا شعر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قطران کی ملک اور ابونصر مملان کی مدح میں ہے :

مکان نصرت و اقبال میر ابونصر آن
کہ ہست طالع او جفت طالع میمون[4]

---

۱ - دیکھیے دیوان قطران ، مطبوعہ تبریز ، صفحہ ۴۰۰-۴۰۲ - (مرتب)
۲ - دیوان رودکی ، صفحہ ۸۷ - (حاشیۂ مصنف)
۳ - دیوان قطران ، طبع تبریز صفحہ ۳۳۱-۳۳۲ - (مرتب)
۴ - دیوان رودکی ، صفحہ ۶۱ - (حاشیۂ مصنف)

موسم بہار کے ذکر میں آیندہ یہ اشعار مذکور ہیں :

مہ نیسان شبیخون کرد اکنون بر مہ کانون
کہ گردون گشت ازو پرگردوصحرا گشت ازو پرخون
اگر خواہی نشان خون نگہ کن لالہ بر صحرا
اگر خواہی نشان گرد بنگر ابر بر گردون

(شعرالعجم ، صفحہ ۴۲)

یہ قصیدہ بھی قطران[1] کے تبرکات میں شمار ہونا چاہیے جو غالباً کسی وزیر ابوالفتح کی مدح میں مرقوم ہوا ہے ۔ چنانچہ شعر ذیل :

چراغ فتح بوالفتح آنکہ یزدان کرد پنداری
بدنلش از جان نوشروان دلش از فہم افلاطون[2]

رودکی کے کلام کے اصلی نمونے وہی ہیں جو لغات اسدی ، تاریخ ابوالفضل بیہقی ، لباب الالباب محمد عوفی ، المعجم فی معایر اشعارالعجم ، معیارالاشعار ، حدائق السحر ، فرہنگ جہانگیری و رشیدی میں ملتے ہیں ۔ تذکروں میں جو اشعار اس کی طرف منسوب ہیں وہ اس میں شک نہیں رودکی سے بہت کم علاقہ رکھتے ہیں ۔ اس کی وفات کے متعلق علامہ شبلی فرماتے ہیں :

”رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی ۔ اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے ۔“ (شعرالعجم ، صفحہ ۴۴)

اس عبارت میں مولانا کو دو سہو لاحق ہوئے ۔ پہلا رودکی کی تاریخ وفات کے متعلق ہے ۔ مولانا ایک با کمال اور بالغ النظر مورخ ہیں ، اس امر کا سب کو اعتراف ہے ، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تاریخ و سنہ جو تاریخی معلومات کا ایک نہایت وقیع اور اہم حصہ ہے ، اول تو اس کا وہ بہت کم ذکر کرتے ہیں اور اتفاقیہ اگر ذکر کر بھی دیا تو اکثر حالات میں غلط لکھتے ہیں ۔ اس تاریخ کے متعلق

---

۱ ۔ دیکھیے دیوان قطران ، صفحہ ۳۲۳ - ۳۲۴ ۔ (مرتب)
۲ ۔ دیوان رودکی ، صفحہ ٦٦ ۔ (حاشیہ مصنف)

مجھ کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ امیر نصر ۳۰۱ھ میں آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوتا ہے۔ اس کے جلوس کے تین سال بعد اگر رودکی انتقال کرتا ہے تو اس کی شہرت، نصر کے ہاں رسائی اور مدح گوئی، سفر ہرات وغیرہ کے لیے جہاں بقول نظامی پورے چار سال نصر نے گزارے ہیں اور اس واقعے کے خود علامہ بھی معترف ہیں (شعرالعجم، صفحہ ۳۰) کافی وقت نہیں ملتا، اس لیے یہ تاریخ ناقابل اعتبار ہے۔ انساب السمعانی میں اس کی وفات ۳۲۹ھ دی گئی ہے جو بالکل صحیح ہے[1]۔

یہ 'دیوان رودکی' رودکی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اگرچہ ایک قصیدہ[2] اور بعض قطعات رودکی کے بھی اس میں شامل ہیں۔[3]

۱۔ پروفیسر سعید نفیسی، رودکی کے سال وفات پر طویل بحث کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ:

"آنچہ بجز ۳۲۹ باشد نادرست و نارواست و تاریخ رحلت رودکی باصح اقوال سال ۳۲۹ بوده است، چنانکہ سمعانی در کتاب الانساب گوید: "در رودک بہ سال ۳۲۹ درگذشت۔"

شیخ منینی درشرح تاریخ یمینی و ابن الاثیر درکتاب اللباب همین گفتہ را پیروی کرده اند۔" (احوال و اشعار رودکی، بار دوم، صفحہ ۵۲۱)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی اسی تاریخ سے متفق ہیں:

"وفات رودکی را هدایت بہ سال ۳۰۴ نوشتہ و معلوم نیست این اشتباه از کجا برای او پیدا شده است، زیرا رودکی شهید را کہ در سال ۳۲۵ درگذشتہ مرثیت گفت۔ سمعانی در الانساب تصریح کرده است کہ رودکی بسال ۳۲۹ هجری در مولد خود یعنی قریۂ بنج درگذشت و همانجا بخاک سپرده شد۔"

(تاریخ ادبیات در ایران، چاپ سوم، ۱۳۳۸، صفحہ ۳۷۴) (مرتب)

۲۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

مادر می را بکرد باید قربان بچۂ او را گرفت و کرد بزندان

یہ قصیدہ تاریخ سیستان مرتبۂ ملک الشعرا بہار میں بھی (صفحہ ۳۱۷-۳۲۳)

(بقیہ حاشیہ نمبر ۲ اور ۳ اگلے صفحے پر)

اس کا نام اگر دیوان قطران تبریزی ہوتا تو موزوں تھا ۔ دیوان کے تمام قصائد قطران کے قلم سے نکلے ہیں ۔

قطران ، الحکیم شرف‌الزمان قطران العضدی تبریزی[1]۔ شمال مغرب ایران میں پانچویں صدی کے ربع اول کے اختتام پر شعرا کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا جس نے مشرق ایرانی شاعری کے مقابلے میں اپنے لیے نئے نئے میدان تلاش کیے ۔ سامانی اور غزنوی شعرا کا مایۂ بساط زیادہ‌تر واقعہ نگاری اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسن بیان کے ذریعے دل‌کش بنا دینا تھا ۔ ان کے استعارے اور تشبیہیں اکثر موجود اشیا سے تعلق رکھتی تھیں ۔ شعر میں فارسیت غالب تھی اور ان کے مبالغے نزاکت سے خالی تھے ۔ اس شاعری کے مقابلے میں نئے گروہ نے شعر کا دار و مدار زیادہ تر تصنع اور صنعت پر رکھا ۔ وہمی اور غیر محسوس تشابیہ و استعارات کام میں لائے ۔ مضمون بندی میں تکلف اور نزاکت سے کام لیا ۔ عربیت کو غیر ضروری فروغ دیا ۔ مبالغہ ، تجنیس اور ترکیب آرائی کو شعر کا اصلی زیور سمجھا ۔ ان میں سب سے مقدم منوچہری دامغانی ہے ، قطران تبریزی اور اسدی طوسی اس کے مقلد ہیں ۔ اس گروہ کے آخری تاج دار نظامی گنجوی ہیں ۔ ان شعرا کے ہاں شاعری گویا خوبصورت الفاظ کے جمع کردینے کا نام ہے ۔ تجنیس قطران کی شاعری کا اساسی جوہر تھی ۔ روحی واوالجی حکیم قطران کا معتقد معلوم ہوتا ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے :

مطلع و مقطعِ قصاید را سیوم فرخی و قطرانم

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

منقول ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ ۔ ان میں اکثر قطعے ایسے ہیں جو تاریخ ابوالفضل بیہقی میں رودکی کے نام لکھے گئے ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)

۱ ۔ ملاحظہ ہو لباب‌الالباب عوفی ، طبع لیڈن ، جلد دوم ، صفحہ ۲۱۴ ۔ (مرتب)

ایک قصیدے میں جو دیوان میں موجود ہے اور جس کا مطلع ہے :

بود محال ترا . داشتن امید محال
بہ‌عالمی کہ‌نباشد همیشہ بر یک حال[1]

شہر تبریز میں زلزلہ آنے کا ذکر ہے ۔ قطران جو انسانی زندگی کے واقعات سے اثر پذیری کو ایک قسم کا ابتذال سمجھ کر کبھی ان کی طرف توجہ مبذول کرنے کا روادار نہیں ، اس موقع پر کسی قدر حقیقت اور واقعیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے ۔ زلزلے کا واقعہ ایک عالمگیر تباہی تھی ، جس میں چالیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے ۔ اس واقعے نے اس کے قلب کو گداز کر دیا ہے ۔ اس کا دل درد سے بھر آیا ہے ۔ شہر کی تباہی اور مرنے والوں کے ماتم میں ذیل کے اشعار اس کے قلم سے تراوش پاتے ہیں :

نبود شہر در آفاق خوشتر از تبریز
بایمنی و بمال و بہ نیکوی و جمال

ز نا و نوش همہ خلق بود نوشا نوش
ز خلق و مال همہ شہر بود مالامال

در او بکام دل خویش هر کسی مشغول
امیر و بندہ و سالار و فاضل و مفضال

یکی بخدمت ایزد یکی بخدمت خلق
یکی بجستن نام و یکی بجستن مال

یکی بخواستن جام بر سماع غزل
یکی بتاختن یوز بر شکار غزال

بروز بودن با مطربان شیرین گوی
بشب غنودن با نیکوان مشکین خال

---

۱ - ملاحظہ ہو دیوان قطران ، طبع ۱۳۳۳ شمسی ، صفحہ ۲۰۸ - ۲۱۱ -
(مرتب)

بکار خویش همی کرد هر کسی تدبیر
بمال خویش همی داشت هر کسی آمال

به نیم چندان کز دل کسی برآرد قیل
به نیم چندان کز لب تنی برآرد قال

خدا بمردم تبریز برفکند فنا
چنان به نعمت این شهر برگماشت زوال

فراز گشت نشیب و نشیب گشت فراز
رمال گشت رماد[1] و رماد گشت رمال

دریده گشت زمین و خمیده گشت نبات
دمنده گشت بحار و رونده گشت جبال

بسا سرای که بامش همی شدی[2] بفلک
بسا درخت که شاخش همی بسود هلال

ازان درخت نمانده کنون مگر آثار
و زان سرای نمانده کنون مگر اطلال

کسی که رسته شد از مویه گشته بود چو موی
کسی که جسته شد از ناله گشته بود چو نال

یکی نبود که گفتی بدیگری که مموی
یکی نبود که گفتی بدیگری که منال

همی ز دیده بدیدم چو روز رستاخیز
ز پیش رایت مهدی و فتنهٔ دجال

کمال دور کناد ایزد از جمال جهان
کمی رسد بجمالی کجا گرفت کمال[3]

۱ - طبع تبریز میں 'جبال' بجائے 'رماد' - (مرتب)
۲ - طبع تبریز میں 'بسود' بجائے 'شدی' (مرتب)
۳ - دیوان رودکیؒ، صفحہ ۳۶ - ۳۷، طبع ایران (حاشیۂ مصنف)

زلزلہ شب پنج شنبہ سترہ ربیع الاول ۴۳۴ھ کو ایام مسترقہ میں نماز عشا کے بعد آیا تھا ۔ شہر کا ایک حصہ بالکل تباہ ہوگیا تھا اور دوسرا سالم رہا ۔ ان ایام میں آذربائیجان کا بادشاہ ابو نصر مملان تھا ۔ حکیم ناصر خسرو بلخی تبریز میں ۴۳۸ھ میں پہنچتا ہے ۔ قطران بھی اس سے ملنے آیا تھا ۔ حکیم موصوف کہتا ہے :

"در تبریز قطران نام شاعری را دیدم ۔ شعری نیک می گفت اما زبان فارسی نیکو نمی دانست ۔ پیش من آمد ، دیوان منجیک و دیوان دقیقی بیاورد و پیش من بخواند و ہر معنی کہ او را مشکل بود از من پرسید ۔ با او بگفتم و شرح آن بنوشت و اشعار خود بر من خواند ۔" (سفر نامہ ، صفحہ ۳۷)

بقول شاہد صادق[1] ، قطران ۴۶۵ھ میں وفات پاتا ہے[2] ۔

میرے خیال میں مذکورۂ بالا بیانات کافی شہادت ہیں اس امر کی کہ موجودہ دیوان رودکی کا نہیں ہے بلکہ حکیم قطران تبریزی کا ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے اس معاملے میں مولانا محمد حسین آزاد نیز دیباچہ نگار دیوان رودکی کے بیانات پر اعتماد نہیں کیا ، اور اپنے

---

۱ ۔ مصنفہ محمد صادق صاحب 'صبح صادق' ۔ (حاشیہ' مصنف)

۲ ۔ جدید تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قطران اس سنہ کے بعد تک زندہ تھا ۔ چناں چہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں :

"وفات قطران را چہار صد و شصت و پنج نوشتہ‌اند ولی از روی قراین بیشتر عمر کردہ ۔"

(تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۱۵۵)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کا بھی یہی خیال ہے :

"وفات قطران را ہدایت بسال ۴۶۵ نوشتہ است ولی از دیوان او شواہدی بدست میاید کہ حیات او را بعد ازین سال ہم معلوم می دارد ۔"

(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم ، صفحہ ۴۲۳) (مرتب)

اجتہاد پر بھروسا کرکے اس فاحش غلطی کے مرتکب ہوئے ۔ اگرچہ آزاد نے سخن‌دان فارس میں اور دیباچہ نگار نے دیباچۂ دیوان میں کافی ہوشیار کر دیا تھا[1] ۔ آزاد گو ''تحقیق کے میدان کا مرد نہ ہو'' یہاں اس نے گپ نہیں ہانکی تھی[2] ۔

ذیل میں رودکی کا ایک مرثیہ جو اس کے کسی معاصر نے لکھا ہے ، نقل کیا جاتا ہے :

رودکی رفت و ماند حکمت اوی
می بریزد نریزد از می بوی
شاعرت کو کنون کہ شاعر رفت
نبود نیز جاودانہ چنوی
خون گشت آب چشم از غمِ اوی
ز اندھش موم گشت آھن و روی
نالۂ من نگر شگفت مدار
سو بہ سو زار زار نالہ بروی

---

۱ ۔ رضا قلی خان ہدایت بھی ''مجمع الفصحا' میں اس طرف توجہ مبذول کراتے ہیں ۔ اشعار رودکی کے ذیل میں لکھتے ہیں :

'' . . . چون دیوان حکیم قطران پدید آمد بیشتر آنہا در آن دیوان یافتہ شد و بعد از تحقیق و تدقیق آشکار آمد کہ آن اشعار کہ بنام حکیم مشہورست ہم از قطرانست و چون قطران نیکو شعر گفتہ و دیوانش معروف نبودہ و در مدائح وی نام ابو نصر اندرست گمان کردہ اند کہ نصر بن احمد ست و شاعر رود کیست ۔ پس از آن کہ در تواریخ و آثار دقتی رفت پیدا آمد کہ حکیم رودکی صد و اند سال قبل از قطران بودہ و این اشعار معروف بنام وی از قطرانست الا قلیلی کہ در آن نیز شبہ است ۔ ''

(مجمع الفصحا ، جلد اول ، صفحہ ۲۳۷) (مرتب)

۲ ۔ دیکھو مکاتیب شبلی ، صفحہ ۲۴۴ ، مطبوعہ معارف ۱۹۱۷ع ۔ (حاشیۂ مصنف)

چند جوئی چنو نیابی باز
از چنو دست در زمانہ بشوی[1]

قبلہ شبلی فرماتے ہیں :

"تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا ، وہ رودکی تھا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۸)

رودکی کا پہلا صاحب دیوان ہونا تمام اسناد کے نزدیک مسلم ہے لیکن بقول نظامی عروضی حنظلہ بادغیسی المتوفی ۲۱۹ھ اس شرف کا زیادہ مستوجب ہے ۔ رودکی کے زمانے میں خود رودکی کے اپنے نیز اس کے معاصرین کے کلام کو مشاہدہ کرنے سے پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کا وہ زمانہ ، جیسا کہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے ، ابجدی زمانہ نہیں تھا بلکہ اس نے قرار واقعی ترقی کر کے تمام ایسے ضروری اور خصوصی خط و خال پیدا کر لیے تھے جن کی رو سے دنیا کی اور زبانوں کی شاعری سے سہولت کے ساتھ تمیز ہو سکتی تھی ۔ اس میں وہ تمام جوہر مشاہدے میں آتے ہیں جو مقامی آب و ہوا اور ایران نژاد طبائع کی نمایاں خصوصیت ہیں ۔ قومی روایات نیز ملکی آب و ہوا کے اثرات نے اس کے عروضی اوزان ، تشبیہات ، استعارات اور تلمیحات پر اپنا رنگ جما دیا ہے ۔ علاوہ بریں فن شعر نے رودکی کے ایام میں وہ عمومیت حاصل کر لی تھی کہ شعرا کثرت[2] سے

---

۱ ۔ دیکھیے المعجم ، صفحہ ۲۲۴ ۔ (مرتب)

۲ ۔ منوچہری دامغانی بعض شعرائے سامانی کی طرف تلمیح کرتے ہوئے کہتا ہے :

در خراسان بو شعیب و بوذر آن ترک کشی
وان صبور پارسی وان رودکی چنگزن
وان دو گرگانی و دو رازی و دو ولوالجی
سہ سرخسی و سہ کاندر سغد بودی ممتحن*

(* اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

موجود تھے ۔ ان ایام میں صاحب تصنیف ہونا معمولی بات تھی ۔ ابوالحسن شہید بلخی ، خواجہ مرادی، ابو موسیٰ فرالاوی ، ابوطاہر خسروانی ، ابو العباس فضل الربنجنی ، ابو طاہر الطیب المصعبی ، ابوالمؤید بلخی ، طبان مرغزی ، دقیقی وغیرہ اس زمانے کے مشاہیر اساتذہ سے ہیں اور ان میں اکثر بلکہ یوں کہیے قریب قریب تمام صاحب تصانیف گزرے ہیں' اور تمام اصناف نظم پر طبع آزمائی کرتے ہیں ۔ اقسام شعر اور عروض فارسی نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی تھی ۔ رودکی کی کلیلہ و دمنہ ، ابو شکور کا آفرین نامہ

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

از بخارا پنج و پنج از مرو پنج از بلخ باز
هفت نیشاپوری و سه طوسی و سه بوالحسن

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شعرا ان ایام میں کثرت سے موجود تھے ۔
(حاشیۂ مصنف)

* ۔ دیوان منوچہری مرتبہ محمد دبیر سیاق ، طبع طہران ، ۱۳۲۴ شمسی (صفحہ ۶۶) میں ''مستکن'' اور اسی صفحے پر حاشیے میں ''معتکن'' (تصحیح آقای فروزانفر) ۔ (مرتب)

۱ - پروفیسر سعید نفیسی بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں :
''البته کسانیکه گویند رودکی نخستین شاعر زبان پارسی بوده بخطا رفته‌اند . . . . اما اینکه رودکی اول شاعر پارسی باشد که دیوان شعر ازو مانده است این نیز پذیرفتنی نیست ، چه نظامی عروضی در چهار مقاله گوید که عبدالله بن احمد خجستانی دیوان حنظلۂ بادغیسی را خوانده بود . . . . و البته طبیعیست هر شاعری در هر زمان شعری بگوید یا خود و یا دیگران اشعار او را گرد آورند و دیوانی فراهم سازند ، منتهی دیوان بعضی میماند و دیوان بعضی نمیماند چنانکه نه دیوان حنظلۂ بادغیسی مانده است و نه دیوان رودکی - پس رودکی نه نخستین شاعر زبان پارسی بوده و نه نخستین شاعری که دیوان گذاشته باشد ـ''

(احوال و اشعار رودکی ، بار سوم ، صفحه ۵۱۳) (مرتب)

۳۳۳ھ ابوالمؤید بلخی کی مثنوی یوسف زلیخا اور شاہ نامہ‌ٔ بزرگ (فارسی نثر میں تاریخ عجم پر ایک مبسوط تصنیف تھی) دقیقی کا دیوان اور اس کی داستان گشتاسپ و ارجاسپ جن میں آخرالذکر کے سوا آج سب مفقود ہیں ، نمایاں حجت ہیں اس امر کی کہ رودکی کے دور میں صاحب تصنیف ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی ۔ جب اسدی طوسی اپنی لغت فرس پانچویں قرن کے ربع سوم میں لکھنے بیٹھا ہے تو الفاظ کا استعمال بتانے کے لیے اساتذہ کا کلام نقل کرتا ہے ۔ ان میں اکثر سامانی دور کے شعرا شامل ہیں ۔ اب تا وقتیکہ اس کے پاس ان شعرا کے قصائد اور دواوین موجود نہ ہوتے وہ اپنی لغت تیار نہیں کر سکتا تھا ۔

رودکی کی شہرت راقم کے خیال میں اس لحاظ سے نہیں کہ وہ پہلا صاحب دیوان ہے بلکہ اس کے وجوہ کچھ اور ہیں ؛ اول تو وہ ایسی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے کہ خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوتا اپنی شہرت کا سکہ معاصرین اور اخلاف کے دلوں پر ضرور جماتا ۔ دوسرے وہ ایک بے نظیر شاعر تھا ۔ ابو سعد الادریسی اسے اول درجے کا شاعر مانتا ہے ۔ ابوالفضل بلعمی عرب اور عجم میں لاثانی کہتا ہے[1] اور منوچہری خراسان کے چار مشہور حکما میں اس کا شمار کرتا ہے ۔

میرے نزدیک رودکی کی دائمی شہرت کا باعث یہ امر ہے کہ شاہی دربار کے چار ارکان اساسی یعنی دبیر ، شاعر ، طبیب اور منجم میں شاعر کو سلاطین کی درگاہ میں پہلا روشناس کرنے والا شخص رودکی ہے ۔ فارسی میں قصیدہ نگاری ، جو بارگاہ سلاطین میں شاعر کی رسائی کا بدیہی نتیجہ ہے ، رودکی سے شروع ہوتی ہے اور اسی بنا پر رودکی آدم الشعرا اور سلطان الشعرا مانا جاتا ہے ۔

رودکی کا فارسی زبان پر کیا احسان ہے ؟ اس سوال کا جواب

---

۱ ۔ انساب السمعانی ، صفحہ ۲۶۲ ، طبع یورپ ۔ (حاشیہ‌ٔ مصنف)

ہم اپنی موجودہ معلومات کی روشنی میں کچھ نہیں دے سکتے ۔ اس کا سارا کلام ضائع ہو گیا ہے[1] ۔ لیکن ایک امر قابل ذکر ہے : اس کو فارسی زبان پر غیر معمولی عبور تھا ، کیوں کہ اب تک ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود دیکھا جاتا ہے کہ ہماری کتب لغات مشکل اور مندرس الفاظ کی تشریح کے وقت رودکی کا کلام بطور سند پیش کرتی ہیں ۔

رودکی کے ہاں خواہ غزل ہو یا قطعہ ، حقیقت نگاری سب سے نمایاں وصف ہے ۔ جو واقعات اس پر گزرتے ہیں نظم میں کہہ سناتا ہے ، اس سے بحث نہیں کہ ایسا کرنے میں خود اس کا پردہ فاش ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ مطلع ملاحظہ ہو :

کس فرستاد بشب آن بت عیار مرا
کہ مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا[2]

اب یہ تلمیح ہے اس کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف جو خیالی نہیں ہے اور حقیقت میں اس پر گزرا ہے ۔ وہ حقیقت میں زندہ دل اور عشرت دوست تھا ۔ اس کی زندگی فارغ البالی ، خوش‌حالی اور ثروت کے آغوش میں بسر ہوئی ہے ۔ حیات انسانی کی الم‌ناک حقیقت کا ذکر اس کے ہاں کم ہے ۔ زندگی اس کے لیے گل و گلزار ہے ، راحت و شادمانی اور بے فکر زندگی کی تلقین اس کے ہاں عام ہے ۔ وله :

---

۱ ۔ پروفیسر سعید نفیسی مرحوم نے اپنی قابل قدر کتاب ''محیط زندگی و احوال و اشعار رودکی'' میں رودکی کا کلام تمام ذرائع سے حاصل کرکے یک‌جا کر دیا ہے ۔ اس میں شاعر کے اکثر نا مکمل قصائد و قطعات ، رباعیات ، بعض مختلف الاوزان مثنویوں کے اشعار اور متفرق ابیات شامل ہیں ۔ ان اشعار کی کل تعداد ۱۰۴۷ ہے ۔ تاہم ان میں ایک خاصی تعداد ایسے اشعار کی ہے جو دوسرے شعرا سے بھی منسوب کیے جاتے ہیں ۔ (مرتب)

۲ ۔ ملاحظہ ہو لغت فرس اسدی ، حدائق السحر و ترجمان البلاغہ محمد بن عمر رادویانی مطبوعہ استنبول ۱۹۴۹ع ۔ (مرتب)

خور بشادی روزگار نوبہار   میگسار اندر تکوک شاهوار

نظیر اکبر آبادی کے ساتھ ''چکھ ڈال مال و دھن کو'' اس کا بھی مقولہ ہے ۔ چناں چہ کہتا ہے :

با خردمند بی‌وفا بود این بخت
خویشتن خویش را بکوش تو یک لخت
بخور و بده که پر پشیمان نبود
هر که بخورد و بداد ازان که بلفخت[1]

عمر خیام کی طرح اس کی نصیحت بھی یہی تھی کہ موت کے آنے سے قبل تم دنیا کی نعمتوں سے حظ حاصل کر لو :

توشۂ جانِ خویش ازو بردار
پیش کایدت مرگ پا آکیش

دنیا کا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ مردہ زندہ نہیں ہوتا ، اور زندہ کی آخری آرام گاہ گورستان ہے :

مرده نشود زنده زنده بستودان شد
آئین جهان چونین تا گردون گردان شد

دنیا کی بے مہری اور بے وفائی شعرائے فارس کی عام تلقین ہے ۔ فردوسی اور نظامی اس کی تکرار سے کبھی نہیں تھکتے ۔ رودکی ان خیالات کو سب سے پہلے اشاعت دینے والا ہے :

مهر مفگن برین سرای سپنج   کین جهان پاک بازیِ نیرنج
نیک او را فسانه واری شد   بد او را کمرت سخت بتنج

دنیا محبت کے قابل نہیں ۔ اس سے نیکی کی توقع محض ایک افسانہ ہے، البتہ بدی اس سے سرزد ہوتی رہتی ہے ، اس لیے اس کی بدیوں کے لیے کمربستہ رہ ۔ تیری زندگی کا مقصد دنیا سے بے پروائی اور شاد کامی کا استحصال ہونا چاہیے :

---

۱ ۔ پروفیسر سعید نفیسی کے ہاں دوسرا شعر یوں درج ہے :
خود خور و خود ده کجا نبود پشیمان
هر که بداد و بخورد از آنچه که بلفخت   (مرتب)

ولہ : ازو بی اندھی بگزین و شادی با تن آسانی
به تیمار جہان دل را چرا باید که بخسانی

اپنے ملک اور زمانے کے عام رواج کے مطابق رودکی شراب خوری کا عادی تھا ۔ اس کو صاف اعتراف ہے ۔ وہ کہتا ہے شراب پینا ہر وقت اچھا ہے لیکن فصل گل میں خاص لطف رکھتا ہے :

هر آنکه که خوری می خوش آنکه است
خاصه چو گل و یاسمن دمید

جب لالہ کھل جائے ، تم بھی پیالہ ہاتھ میں لے لو :

شگفت لاله تو زیغال بشگفان که همی
ز پیش لاله بکف برنهاده به زیغال

اس کی شاعری کا ایک امتیازی جوہر ، جو اس کو فارسی شعرائے قدیم و جدید سے ممیز کرتا ہے یہ ہے ، کہ اس کا معشوق اور مخاطب ہمیشہ صنف نازک سے تعلق رکھتا ہے ۔ ایک مقام پر کسی شاہد برقع پوش کو خطاب کرکے کہتا ہے :

گر تو برداری ازدو لاله حجیب   بحجاب اندرون شود خورشید

کبھی وہ کنیزک نیکو کا ذکر کرتا ہے اور کبھی ترک نار پستان کا :

بسا کنیزک نیکو که میل داشت بدو
بشب زیارت او نزد جمله پنهان بود
همی خرید و همی ریخت بی‌شمار درم
به شهر هر که یکی ترک نار پستان بود

ایک موقع پر یار مہرباں کی یاد اس کے دل میں گدگدی لیتی ہے :

بوی جوی مولیان آید همی   یاد یار مهربان آید همی

رودکی کی شاعری اپنے گرد و پیش کے گزرنے والے واقعات سے غیر متعلق نہیں بلکہ اس کے ہاں ان میں پوری پوری دل چسپی کا اظہار کیا گیا ہے ۔ دوستوں کی وفات پر ماتم ، ملک کی فتح پر خوشی ؛ الغرض اس قسم کے واقعات بھی اس کے ہاں ملتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کی شاعری نا آشنا مزاج نہیں ہے جس کو انسانی

واقعات اور زندگی کی وابستگیوں سے کوئی واسطہ نہ ہو ۔

عمر کے آخری دور میں اس کو سرعت ، آلام اور تلخیوں سے پالا پڑا ہے جس کی جھلک اس کے اشعار میں موجود ہے ۔ اس کا ایک قطعہ جس میں اس نے اپنے بڑھاپے اور گزشتہ عظمت کی ماتم داری کی ہے ، سخندانِ فارس اور شعرالعجم میں موجود ہے ۔ یہاں میں ایک مختصر سی اسی قسم کی نظم پر کفایت کرتا ہوں :

بسا کہ مست درین خانہ بودم و شادان
چنان کہ جاہِ من افزون بد از امیر و ملوک
کنون ھمانم و خانہ ھمان و شعر ھمان
مرا نگوی کز چہ شدہ است شادی سوگ

رودکی نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں ۔ کلیلہ و دمنہ کے علاوہ اسی وزن میں اس نے کوئی اور مثنوی بھی لکھی ہے[1] جس میں کلیلہ و دمنہ کی طرح چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی ہوں گی ، مثلاً یہ اشعار :

گفت ھنگامی یکی شہزادہ بود گوھری و ہر ھنر آزادہ بود
[illegible] برون استاد غوشت بود فربی و کلان بسیار گوشت
(لغات اسدی)

[1] [illegible] نفیسی مرحوم نے رودکی کے بحر رمل میں لکھے ہوئے کل ۱۱۵ شعر دیے ہیں ۔ ان کے متعلق ان کا خیال بھی یہی ہے کہ یہ دو یا تین مختلف مثنویوں سے تعلق رکھتے ہیں ، چنان چہ :

''درمیان ۱۱۵ بیی کہ بدین وزنست و شاید از سندباد نامہ ہم باشد ، دو بیت را مولف فرہنگ جہانگیری ضبط کردہ و در صدر آن می نویسد : ''از مثنوی 'دوران آفتاب' رودکیست ۔'' پس ازین قرار رودکی دو منظومہ بدین وزن داشتہ ، یکی منظومہ کلیلہ و دمنہ و دیگر منظومہ ای باسم دوران آفتاب ۔ ''

(صفحہ ۴۳۲ - ۴۳۳)

اور آگے چل کر لکھتے ہیں : (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دیگر

آن کرنج و شکرش برداشت پاک
وندر آن دستار آن زن بست خاک

پس زن از دکان فرود آمد چو باد
آن فلرزنگش بدست اندر نهاد

شوی بکشاد آن فلرزش خاک دید
کرد زن را بانگ و گفتش کای پلید[1]

بحر متقارب[2] کے علاوہ بحر ہزج[3] میں بھی کوئی مثنوی اس نے یادگار چھوڑی ہے۔ مثال :

براہ اندر همی شد راہ شاهی
رسید او تا بنزد بادشاهی

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

''اگر دوران آفتاب را نام منظومہ کلیلہ و دمنہ و منظومہ سند باد نامہ ندانیم و منظومہ سومی بپنداریم نتیجہ این می شود کہ آن چہ از اشعار مثنوی بہ بحر رمل از رودکی ماندہ است از آن و از کلیلہ و دمنہ و سندباد نامہ است کہ هر سہ را بہ یک وزن سرودہ بودہ است۔'' (احوال و اشعار رودکی ، صفحہ ۴۳۵) (مرتب)

۱ - فرهنگ جہانگیری ، صفحہ ۱۵ ، نول کشور۔ (حاشیہ مصنف)

۲ - اس مثنوی کی بابت ڈاکٹر نفیسی لکھتے ہیں :

''مثنوی دیگر مثمن مقصور از بحر متقارب بدین وزن و هنر :

چوگشت آن پریروی بیمار غنج

فعولن فعولن فعولن فعول ، کہ از آن ۳۲ بیت بدست آمدہ است۔''

(صفحہ ۴۳۳) (مرتب)

۳ - ''مثنوی دیگر مسدس مقصور از بحر هزج بدین وزن :

بهشت آیین سرای را بپرداخت

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل ، کہ از آن ۹ بیت فراهم است۔''

(صفحہ ۴۳۴) (مرتب)

بحر خفیف[1] میں بھی ایک مثنوی اس نے لکھی ہے :

دور تر از قرین و خویش و تبار
نسری ساخت بر سرِ کوهسار

رودکی کے زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ فنِ عروض پوری ترقی کر چکا تھا ۔ اکثر فارسی بحور اور اوزان میں اس کے ہاں ابیات پائے جاتے ہیں ۔ اوزان میں اس کے دور کے بعد جو اضافہ ہوا نہایت حقیر ہے اور یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اوزان ذیل سے جو اس کے عہد کے بعد ترویج پاتے ہیں ، رودکی نا واقف تھا ۔ مثلاً مضارع کا یہ وزن : ع

ای رایت رفیعت بنیاد نظم عالم

اور منسرح کا یہ وزن : ع

عشق بهین گوهریست گوهر دل کان او

اور رجز کا یہ وزن : ع

چشمۂ خضر ساز آب از لب جام‌گوهری

علیٰ ہٰذا رمل کا یہ وزن : ع

صفتی است حسن او را کہ بوهم درنیاید

اور مقتضب کا یہ وزن : ع

امشب آتشین روی گرم ژلد خوانیهاست

---

۱ ۔ مثنوی دیگر اصلم مسبغ از بحر خفیف بدین وزن :
"گرچہ نامردمست آن ناکس
فاعلاتن مفاع لن فع لان ، کہ ازان ۱۷ بیت بدستست ۔"
(صفحہ ۴۳۳)

مذکورہ بالا مثنویوں کے علاوہ پروفیسر سعید نفیسی تین اور مثنویوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے دو کے دو دو اور ایک کے تین شعران کے ہاتھ لگے ہیں ۔ (مرتب)

دقیقی

اس شاعر کے متعلق بھی بعض امور میں مجھ کو مولانا سے اختلاف ہے۔ تمہید میں فرماتے ہیں :

"دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے۔ ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی، لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی۔ دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا ؛ اس نے یہ خدمت قبول کی اور کم و بیش بیس ہزار شعر لکھے۔ بعضوں کا بیان ہے کہ صرف ایک ہزار شعر تھے جو آج شاہنامے میں شامل ہیں۔"

(شعرالعجم، صفحہ ۵۴)

دقیقی کا اصلی نام ابومنصور محمد بن احمد ہے۔ وہ بخاری نہیں ہے بلکہ طوسی۔ (لباب، جلد دوم، صفحہ ۱۱)

دقیقی کے اشعار کی تعداد کے متعلق یہاں ہمارے سامنے دو روایتیں ہیں۔ ایک کی رو سے اس نے بیس ہزار ابیات لکھے، دوسری روایت کی رو سے ایک ہزار۔ جب ایک مورخ کے سامنے دو روایتیں موجود ہیں تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ کم سے کم اس امر کی تحقیق کرلے کہ ان میں کون سی روایت معتبر ہے۔ ان روایات کے قدیمی رواۃ میرے خیال میں محمد عوفی اور فردوسی ہیں۔ عوفی ساتویں صدی ہجری کا مصنف ہے جب کہ فردوسی دقیقی کا قریب قریب معاصر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فردوسی اس معاملۂ خاص میں عوفی کے مقابلے میں زیادہ صحیح معلومات دے سکتا ہے کیوں کہ دقیقی کا ہم عصر اور ہم وطن ہونے کے علاوہ

اس کے حالات میں دل چسپی بھی لیتا ہے ۔ فردوسی نے دقیقی کا ذکر کرتے ہوئے ایک چھوڑ دو مقام پر اپنا بیان دوہرایا ہے ۔ ایک جگہ کہا ہے :

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتی ہزار
بگفت و سرآمد ورا روزگار[1]

دوسرے موقع پر خود دقیقی کی زبان سے کہا ہے :

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتی ہزار
بگفتم سرآمد مرا روزگار[2]

فردوسی کی اس تکرار کے باوجود اس موقعے پر ، مولانا اگرچہ دونوں روایتیں نقل کرتے ہیں لیکن کوئی تنقیدی فیصلہ نہیں دیتے ۔

ان روایات کے متعلق 'ہفت اقلیم' کا حوالہ دیا ہے مگر اس کی اصل عبارت یہ ہے :

"دقیقی بقول اقل بیست ہزار و بقول اکثر ہزار بیت از داستان گشتاسپ در سلک نظم انتظام دادہ بردست غلامی کشتہ گردید ۔"

جو صاحب ہفت اقلیم کا مقصد تھا ، شبلی نے بالکل اس کے برعکس لکھا اور ضعیف روایت کو فروغ دیا ۔

نوح بن منصور کا دقیقی شاعر کو شاہنامے کی خدمت پر مامور کرنا جس کے مولانا مدعی ہیں ، اگرچہ ایک مقبولہ روایت ہے لیکن میں تسلیم نہیں کرتا ۔ اس کے متعلق آیندہ لکھا جائے گا ۔

قولہ: "دقیقی کا ایک خوش رو غلام تھا جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی لیکن افسوس ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا ۔ غلام نہایت غیور تھا ، اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۴۶)

میں اس واقعے کو صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن تاریخی واقعات میں علامہ شبلی نے اپنی طرف سے جو رنگ آمیزی کی ہے اس کے لیے

---

۱ - شاہنامہ ، صفحہ ۳ ، جلد اول ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ ھ (حاشیۂ مصنف)
۲ - ابتدائی جلد سوم ، شاہنامہ (حاشیۂ مصنف)

یہ عبارت اچھی مثال ہے ۔ اس واقعے کے متعلق سب سے قدیم بیان فردوسی کا ہے جو حسب ذیل ہے اور خود مولانا بھی اس کو نقل کرتے ہیں :

جوانیش را خوی بد یار بود ابا بد همیشه به پیکار بود
یکایک ازو بخت برگشته شد بدست یکی بنده برگشته شد

دیباچۂ قدیم میں کسی قدر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے ، لکھا ہے :

"دقیقی مردی بود که غلامان را دوست می‌داشت ۔ چون از شاهنامه یک چندی بنظم آورد اتفاق چنان افتاد که غلامی ترک در آن دو سه روز خریده بود باوی لابه می‌کرد و آن غلام کاردی بر شکم دقیقی زد و بدان زخم او را هلاک کرد و این شاهنامه نا تمام بماند ۔"

مولانا نے اپنی طرف سے جو جدت آفرینی کی وہ یہ ہے کہ وہ غلام خوش رو تھا ۔ دقیقی کو اس سے عاشقانہ محبت تھی اور اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا ۔ اب یہ تاریخ نہیں رہی ناول نویسی ہوگئی ۔

قولہ : "دقیقی کے زمانے تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہوگئی تھی ۔ عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں لیکن عربی الفاظ فارسی سے زیادہ ہیں ۔ رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب قریب ہے ۔ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے ، وہ دقیقی ہی ہے ۔ اس کے سینکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ ، عربی کا ایک لفظ نہیں آتا ۔ " (شعرالعجم ، صفحہ ۵۰)

میں شبلی کے اس کلیے کی تائید نہیں کر سکتا کہ دقیقی کے زمانے تک فارسی میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ گویا ایک نئی زبان بن گئی تھی ۔ یہ ادعا تاریخ اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے ۔ اگر یہ دعویٰ سلجوق دور کے لیے کیا جاتا تو صحیح

مانا جاتا ۔ زبان کا قانون بالکل مختلف ہے ۔ وہ کسی شخص کی ملکیت نہیں کہ اس کی تنہا کوشش اس میں انقلاب پیدا کر سکے ۔ ہر دور کی زبان مختلف ہوتی ہے اور ہر شاعر اپنے عہد میں زبانِ وقت کے تتبع کے لیے ، اگر اس کو شہرت حاصل کرنا ہے ، مجبور ہے ۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان رائجُ الوقت اور ٹکسالی ہو ۔ کیا آج کسی شاعر کے لیے ولی کے عہد کی زبان میں شعر کہہ کر شہرت حاصل کرنا ممکن ہے ؟ میرا جواب یہی ہے کہ نا ممکن ہے ۔ لیکن دقیقی کے بارے میں صورت واقعہ بالکل مختلف ہے کیونکہ رودکی ، شہید ، فرالاوی ، ابو شکور ، خسروانی ، دقیقی وغیرہ کی زبان میں کوئی فرق نہیں ۔ سب اپنے اپنے وقت کی بولیاں بول رہے ہیں ۔ اس عہد میں عربی اور فارسی زبانیں الگ تھلگ تھیں ۔ عربی الفاظ جو ایک محدود تناسب میں رائجُ ہو کر قبولیت عام کا خلعت حاصل کر چکے تھے ، ہر شاعر کے ہاں ملتے ہیں ۔ ان میں دقیقی بھی شامل ہے ۔ یہ الفاظ زیادہ تر قطعہ ، غزل اور قصیدے میں ملتے ہیں ، اس لیے کہ قافیے کی ضرورت سے عربی ذخیرے کی خوشہ چینی اکثر کی جاتی تھی۔ مثنوی میں اس قسم کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی ، اسی لیے وہ ان کے اثر سے پاک ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے دقیقی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا بلکہ قاعدہ ۔ چناں چہ تمثیلاً دقیقی کے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں جو شبلی نے بھی درج کیے ہیں :

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دھد
آری دھد و لیک بعمری دگر دھد
من عمر خویشتن بصبوری گزاشتم
عمری دگر بباید تا صبر بر دھد

(شعرالعجم ، صفحہ ۵۲)

ذیل میں دقیقی کی ایک غزل اسی غرض سے سپرد قلم کی جاتی ہے :

کاشکی اندر جہان شب نیستی — تا مرا ھجران آن لب نیستی
زخم عقرب نیستی بر جان من — گر ورا زلف معقرب نیستی

ور نبودی کوکبش در زیر لب مونسم تا روز کوکب نیستی
ور مرکب نیستی از نیکوئی جانم از عشقش مرکب نیستی
ور مرا بی یار باید زیستن زندگانی کاش یارب نیستی

عباس مروزی کے اشعار میں عربی الفاظ کی کثرت اس بنا پر ہے کہ متاخرین نے ان کو اصلاح دے کر اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ یہ اشعار میں اپنے مضمون کی ابتدا میں درج کر آیا ہوں۔ عوفی کے عہد سے پیشتر کا نسخہ اگر دستیاب ہو جائے تو ہم معلوم کر سکیں گے کہ ان میں اور آن میں بہت تفاوت ہوگا۔ بلکہ وزن بھی مختلف ہوگا کیونکہ عباس کے عہد میں فارسی زبان میں رمل مثمن میں اشعار لکھے جانا قرین قیاس نہیں۔ صدیوں کے گزر جانے اور ہزاروں زبانوں پر آنے سے ایک شعر یا قطعے کی حیثیت بہت کچھ بدل جاتی ہے. دوسرے ہر وقت کے زبان داں قدیم کہاوتوں اور ضرب الامثال کو اپنے عہد کی زبان میں رائج الوقت مذاق کے مطابق نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاعر کے اصلی الفاظ کے ابقا کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ یا اشعار اپنی ہیئت بدلتے بدلتے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے لیے میں بہرام گور کا شعر پیش کرتا ہوں۔ دولت شاہ اس کو ذیل کی شکل میں لکھتا ہے :

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یله
نام بہرام ترا و پدرت بوجبله

مصرع آخر بہرام کی معشوقہ دلآرام کی طرف منسوب ہے۔ محمد عوفی لباب الالباب میں یوں لکھتا ہے :

منم آن شیر گله منم آن پیل یله
نام من بہرام گور و کنیتم بو جبله

ظاہر ہے کہ دولت شاہ کے شعر سے اس شعر کا وزن مختلف ہے لیکن درر غرر ثعالبی میں (بقول میرزا محمد بن عبدالوہاب) ابن خردادبہ کی سند پر یوں مرقوم ہے :

منم آن شیر شلہ (ژلہ ۔ ن) منم آن ببر یلہ
منم آن بہرام گور منم آن بو جبلہ

اور وزن کی مشکلات راہنمائی کرتی ہیں کہ شعر بالا اصل میں ایک شعر نہیں ہے بلکہ دو شعر ہیں ۔

اگرچہ مولانا اپنی گزشتہ بالا عبارت میں دقیقی کے عہد میں عربی فارسی زبانوں کے اختلاط کے قائل ہیں اور دقیقی کو اس اختلاط کا دور کرنے والا اور فارسی زبان کو اس کی آمیزش سے پاک کرنے والا کہہ رہے ہیں لیکن ذیل میں اپنے نظریے کی تردید میں خود ہی ساعی ہیں اور فرماتے ہیں :

"فردوسی کے زمانے تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی ، چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی ، البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا ، عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہوتی جاتی تھیں ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۳۰۴)

میں ان دونوں بیانات کا تخالف اور تضاد ظاہر کیے بغیر آگے بڑھتا ہوں ۔ دقیقی کی غزلوں کی نسبت ارشاد ہوتا ہے :

"اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے بالکل نئی بات ہے ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۵۲)

فارسی میں موجودہ شاعری عربی کی تقلید میں رائج ہوئی ہے ۔ عربی میں دو اقسام نظم زیادہ رائج تھیں ؛ قصیدہ یا قطعہ ۔ ان میں سے صنف اول نے فارسی میں زیادہ رواج پایا ۔قصیدےاورقطعےمیں بہلحاظ شکل ظاہر کوئی فرق نہیں ۔ اصلی فرق جو ان میں ہے مضمون کی حیثیت سے ہے ۔ عربی تقلید میں خیالات کا تسلسل اس وقت کی ہر صنف نظم میں عام طور پر موجود ہے ۔ اس لیے دقیقی کی غزلوں میں تسلسل کی موجودگی موجب استعجاب نہیں ہونی چاہیے ۔ رودکی کی ایک خمریہ غزل اس سے قبل مرقوم ہو چکی ہے ، ناظرین دیکھیں گے کہ اس میں تسلسل قائم ہے ۔

قولہ : ''آج جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں ، فارسی میں غالباً سب سے پہلے اسی نے اس کی بنیاد قائم کی ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۵۲)

ہر قوم کی شاعری کی ، جب وہ اپنے سفر حیات کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے ، یہی حالت ہوتی ہے ۔ یہ دور فارسی شاعری کا ابتدائی دور ہے ۔ طبیعتوں میں سادگی تھی ، زبان میں وسعت اور خیالات میں اوج نہیں تھا ۔ رنگینی اور تکلف نا معلوم تھے ۔ متاخرین کی موشگافی اور نزاکت‌آفرینی میٹھی نیند سو رہی تھی ۔ اس لیے بدیہی تھا کہ اس عہد کے شعرا زیادہ تر حقیقت نگاری سے کام لیتے ، اور یہ بات اس عہد کے ہر شاعر میں پائی جاتی ہے ۔ دقیقی بہر حال اس معاملے میں کسی اختراع کا فخر نہیں رکھتا ۔

ہمارے زمانے میں دقیقی کو جو اہمیت دی جاتی ہے اس کی داستان گشتاسپ و ارجاسپ کی بدولت ہے ، لیکن ان ایام میں وہ اپنے دیوان کی وجہ سے زیادہ مشہور تھا ۔ ناصر خسرو کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب دیوان تھا اور قطران تبریزی نے ناصر خسرو سے اس دیوان کی بعض مشکلات حل کی تھیں ۔ جب آذربائیجان میں قطران جیسے پائے کا شاعر دیوانِ دقیقی اپنے مطالعے میں رکھے تو ظاہر ہے کہ دقیقی ایک نہایت غیر معمولی شاعر مانا جاتا ہوگا ۔ ادھر لغت فرس اسدی پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رودکی کے بعد جس شاعر کا کلام اس میں کثرت سے نقل کیا گیا ہے وہ دقیقی ہے ۔ غزنوی دور تک اس کے ہم مشربوں میں اس کی یاد تازہ تھی ۔ فرخی کہتا ہے :

ناطرازیده مدیح تو دقیقی برگزشت
ز آفرین تو دل آگنده چنان کز دانہ نار
تا بوقت این زمانہ مرو را مدت نماند
زین سبب گر بنگری زامروز تا روزشار

هر گیاهی کز سر گور دقیقی بردمد
گر بپرسی ز آفرین تو سخن گوید هزار

اور غضایری کہتا ہے :

بشعر یاد کند روزگار برمکیان
دقیقی آن گہ کاشفتہ شد برو احوال
سحاق ابن براهیم را چہ بہرہ رسد
ز جود برمک و آن شعر قافیہ بزوال
بیک دو بیت ندانم چہ فضل داد بدو
فسانہ باک ندارد محال را ز محال

فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فن قصیدہ میں دقیقی بہتر مانا گیا تھا (شاہ نامہ) :

ستایندۂ شہریاران بدی | بمدح افسر نامداران بدی

اس کا کوئی قصیدہ[۱] ہم تک نہیں پہنچا لیکن ذیل میں اس کا ایک نفیس قطعہ ، جس میں شاعر نے ملک گیروں اور فاتحوں کے ضروری اوصاف اور لوازمات گنائے ہیں ، تاریخ بیہقی سے لے کر نقل کیا جاتا ہے :

ز دو چیز کردند مر مملکت را | یکی پرنیانی یکی زعفرانی
یکی زر نام ملک برنوشتہ | دگر آهن آبدادہ یمانی
کرا بویۂ وصلت ملک خیزد | یکی جنبشی بایدش آسمانی
زبانی سخن‌گوی و دستی کشادہ | دلی همش کینہ همش مهربانی
کہ ملکت شکاریست کورا نگیرد | عقاب پرندہ نہ شیر ژیانی
دو چیز است کورا بہ بند اندر آرد | یکی تیغ هندی دگر زر کانی
بہ شمشیر باید گرفتن مر او را | بہ دینار بستنش پای ار توانی
کرا بخت و شمشیر و دینار باشد | بہ بالا تن نیزہ پشت کیانی

---

۱ - دقیقی کے بعض قصائد ، غزلیں ، قطعے اور متفرق اشعار لباب‌الالباب ، مجمع الفصحا ، تاریخ بیہقی ، ترجمان البلاغت ، حدائق‌السحر ، المعجم ، اور لغت فرس اسدی وغیرہ میں ملتے ہیں ۔ (مرتب)

خرد باید آنجا و جود و شجاعت فلک مملکت کی دهد رائگانی
(صفحہ ۴۲۸-۴۲۹ ، طبع کلکتہ)

چند اشعار لغت فرس اسدی سے منقول ہیں :

(۱) مہرگان آمد جشن ملک افریدونا
آن کجا گاؤ نکو بودش برمایونا

(۲) اکنون شکفتہ بینی از ترک تا یمن
یک چندگاہ زیر پی آھوان سمن

(۳) جمال گوہر آگینت چو زرین قبلۂ ترسا
کمر بمیان زر اندر چنان چون زر بود رخشا

(۴) یکی صمصام فرعون‌کش عدوخواری چو اژدرھا
کہ ہرگز سیر نبود وی ز مغز و از دل اعدا

(۵) بر افروز آذری ایدون کہ تیغش بگذرد ازبون
فروغش از بر گردون کند اجسام را اخگر

ان اشعار سے اول تو فردوسی کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ دقیقی قصیدہ نگاری میں استاد تھا ، دوسرے اس خیال کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ایرانی شعرائے متقدم قصیدے کے میدان میں برخلاف مثنوی کے قافیے یا شکوہ الفاظ کی غرض سے عربی الفاظ مستعار لیتے رہے ہیں -

قولہ : "سامانی خاندان ابتدا سے اس بات کا خواہش‌مند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جائے - لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم‌الشان تاریخی سلسلہ شعر کے قالب میں آ جائے -"

(شعرالعجم ، صفحہ ۴۵)

یہ خیال اصل میں 'ہفت اقلیم' سے ماخوذ ہے اور نہ 'ہفت اقلیم' سے پیشتر اس کا سراغ چلتا ہے - امین احمد کی اصل عبارت یہ ہے :

"کہ چون اکلیل سلطنت خراسان و توران بفرق آل سامان مکلل گردید ، خواستند کہ احوال سلاطین عجم را در سلک نظم انتظام دهند - چون در آن وقت مرتبۂ نظم عالی نگشتہ بود و این

شیوہ چندانی شیوع نہ پزیرفتہ ، ہرآئینہ از حیّز قوة بفعل نمی آمد ۔'' (ورق ۷ ۰ ۵ ، مخطوطہ مملوکہ پروفیسر آذر)

قولہ : ''نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا تو پایہ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے ۔ ان میں دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا . . . جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلاکر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی ۔ دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا ، اس نے یہ خدمت قبول کی ۔'' (شعرالعجم ، صفحہ ۴۵)

سب سے قدیم روایت دقیقی کے شاہنامہ نظم کرنے کے متعلق فردوسی کے ہاں ملتی ہے جو یہ ہے :

چو از دفتر این داستانہا بسی همی خواند خواننده بر ہر کسی
جہان دل نہاده برین داستان ہمان بخردان و ہمہ راستان
جوانی بیامد کشاده زبان سخن گوی وخوش طبع وروشن روان
بنظم آرم این نامہ را گفت من ازو شادمان شد دل انجمن

چونکہ شاہنامے کی داستانوں کا ہر محفل اور مجلس میں قصہ خوانوں کی بدولت چرچا رہتا تھا ، دقیقی نے ان کی عام ہردلعزیزی دیکھ کر ان کی نظم کا ارادہ کر لیا ۔ اس تجویز کو پسند عام کا خلعت ملا ۔

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی مولانا شبلی کے اس عقیدے کی ، کہ سامانی خاندان ابتدا سے شاہنامے کی نظم کا خواہاں تھا ، تائید نہیں کرتا اور نہ اس دعوے کی تصدیق کرتا کہ دقیقی نے شاہنامہ نوح بن منصور (۳۶۵ھ ، ۳۸۷ھ) کے حکم سے شروع کیا تھا ۔ نوح نے دقیقی کو اس کام پر اگر واقعے میں مامور کیا تھا تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ فردوسی اس واقعے کے اخفا کی کوشش کرتا جب کہ یہ امر بھی قرین عقل ہے کہ اس کے اظہار سے سلطان محمود کے دربار میں خود فردوسی کی اپنی تصنیف کی قرار واقعی قدر کیے جانے کی توقع ہوسکتی تھی ۔ لیکن نوح بن منصور کی شاہنامے کے بارے میں دل چسپی کے سوال کا فیصلہ کرنے سے پیشتر

یہ امر مقدم معلوم ہوتا ہے کہ دقیقی کا زمانہ تحقیق کر لیا جائے۔ (۱) محمد عوفی اس کو ابو صالح منصور بن نصر (کذا) (۳۵۰ھ و ۳۶۵ھ) اور نوح بن منصور (۳۶۵ھ ، ۳۸۷ھ) کے عہد کا شاعر مانتا ہے۔ دقیقی کے ایک تیسرے ممدوح کا نام ابو سعید محمد مظفر محتاج چغانی دیا ہے۔ عوفی اس قدر اور اضافہ کرتا ہے کہ امیر ابوالحسن علی بن الیاس الآغاجی (والیِ کرمان ۳۱۷ھ و ۳۵۴ھ المتوفی ۳۵۶ھ) اور دقیقی معاصر ہیں۔ ابو سعید محمد مظفر محتاج چغانی کے زمانے سے ہم ناواقف ہیں۔

ایک امیر ابوالمظفر چغانی چوں کہ فرخی کا بھی ممدوح ہے اس لیے مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کا خیال ہے کہ فرخی اور دقیقی کا ممدوح ایک ہی شخص ہے جس کا پورا نام مرزائے موصوف یہ بتاتے ہیں: "فخرالدولہ ابوالمظفر احمد بن محمد چغانی۔" (چہار مقالہ ، صفحہ ۱۶۵ ، مطبوعہ یورپ) لیکن فرخی کے ممدوح کا نام ، جیسا کہ آنے والے ابیات سے واضح ہوتا ہے ، فخرالدولہ ابوالمظفر بن احمد محمد چغانی ہے۔ فرخی کے اشعار یہ ہیں :

فخر دولت بوالمظفر شاہ با پیوستگان
شادمان و شاد خوار و کامران و کامگار

تا نقش کرد بر سر ہر نقش برنوشت
مدح ابوالمظفر شاہ جہانیان
بن احمد محمد شاہ جہان پناہ
آن شہریار کشور گیر و جہان ستان

ایک ابوالمظفر محمد بن احمد والیِ چغانیاں کا ذکر تاریخ عتبی میں فایق کے حالات کے ذیل میں ملتا ہے۔ جب ابوالمظفر طاہر بن فضل اس ابوالمظفر کو شکست دے کر چغانیان چھین لیتا ہے تو وہ اعانت کی امید میں فائق کے پاس آتا ہے۔ فائق فوج سے اس کی امداد کرتا ہے۔ لیکن اسی اثنا میں طاہر بن فضل بلخ پر حملہ‌آور

ہو کر (۳۷۷ھ میں بقول عوفی) مارا جاتا ہے - میرے خیال میں عتبی کا ابوالمظفر محمد بن احمد والیِ چغانیان اور فرخی کا فخرالدولہ ابوالمظفر بن احمد محمد والی چغانیان ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں - فرخی نے اس کا نام بہ ضرورت شعر اس کی ولدیت کے بعد لکھ دیا ہے -

دقیقی اپنے ممدوح کا نام ایک شعر میں جو لغات اسدی میں ملتا ہے یوں بیان کرتا ہے:

ابو سعد آن کہ از گیتی برو بربستہ شد دلہا
مظفر آن کہ شمشیرش ببردا ز دشمنان پروا

اب صورت یہ قائم ہوگئی ہے کہ علامہ قزوینی کا (أ) فخرالدولہ ابوالمظفر احمد بن محمد ہے - فرخی کا (ب) ابوالمظفر بن‌احمد محمد ہے اور عتبی کا (ج) ابو المظفر محمد بن احمد ہے (د) عوفی کا ابو سعید محمد (بن) مظفر (بن) محتاج چغانی ہے اور دقیقی کا (ہ) ابوسعد مظفر ہے -

الف اور ب ایک شخص نہیں اس لیے فرخی اور دقیقی معاصر نہیں ہو سکتے - (ہ) اور (د) میں غالباً باپ بیٹے کا تعلق معلوم ہوتا

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی نے خاندان چغانی کے جو نام گنوائے ہیں ان سے شجرۂ ذیل ترتیب پاتا ہے:

محتاج
|
ابو سعد مظفر
|
ابوبکر محمد (م ۳۲۹ھ)
|
ابو علی احمد (م ۳۴۴ھ) — ابوالعباس فضل

ابو علی احمد: ابو نصر (علی) — ابوالمظفر عبداللہ — ابو منصور (محمد)

ابوالعباس فضل: ابوالمظفر طاہر (ابو یحییٰ) — ابو محمد عباس

ابو منصور (محمد)
|
فخرالدولہ ابوالمظفر احمد

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہے - عوفی نے باپ بیٹے کے ناموں میں تخلیط کی ہے - دقیقی جب کہ باپ کا مداح ہے ، عوفی نے بیٹے کا خیال کیا - یا یہ کہ وہ بالکل مختلف شخص ہوں - بہرحال تاریخ میں ان دونوں اسما کی سراغ رسی نہیں ہوسکتی - چغانی خاندان میں ابو بکر محمد بن مظفر کا پتا لگتا ہے جو ۳۲۱ھ میں سپہ سالار خراسان تھا - عوفی کے پیش کردہ نام میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ کُنیتوں میں اختلاف ہے - اگر ان دونوں شخصوں کو ایک مانا جاتا ہے تو ابو سعد مظفر جس کا نام دقیقی اپنے شعر میں بیان کرتا ہے ، ابوبکر کا باپ تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ محض قیاس ہے -

---

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

استاد سعید نفیسی مرحوم کا خیال یہ تھا کہ فخرالدولہ ابوالمظفر احمد چغانی ، دقیقی ، فرخی اور منجیک ترمذی تینوں کا ممدوح رہا ہے - چنانچہ :

''ظاہراً ابو منصور بن ابو علی احمد را محمد نام بودہ است و او را پسری بودہ است فخرالدولہ ابوالمظفر احمد بن محمد بن ابو علی احمد بن ابوبکر محمد بن ابوسعد مظفر بن محتاج کہ دقیقی و منجیک و فرخی ہر سہ او را مدح کردہ اند -''

(احوال و اشعار رودکی ، بار اول ، جلد سوم ، ضمایم و تعلیقات ، صفحہ ۱۲۶۳)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی اپنی 'تاریخ ادبیات در ایران' میں اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں - چنانچہ دقیقی کے ممدوحین کے نام درج کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''۳ - امیر فخرالدولہ احمد بن محمد از آل محتاج امیر چغانیان کہ ممدوح منجیک و فرخی و خود مردی شاعر و شعر شناس بودہ است دقیقی در خدمت آل محتاج تقرب و حرمت وافر داشت و صلاحیت جزیل میگرفت امیر معزی درین باب گوید :

فرخندہ بود بر متنبی بساط سیف — چونانکہ بر حکیم دقیقی چغانیان

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۲) سابق میں تمام اسناد کا خیال تھا کہ شاہنامہ فردوسی نے ۳۸۷ھ میں سلطان محمود غزنوی کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا تھا اور دقیقی چوں کہ اکثر مورخین کے نزدیک ۳۶۵ھ میں شاہنامے پر قلم اٹھاتا ہے ، اس لیے دونوں شاعروں کی معاصرت کا سوال پیش نہیں آیا ۔ لیکن اب جب کہ یہ نظریہ شاہنامے کی شہادت سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور ابیات :

سی و پنج سال از سرای سپنج　　بسی رنج بردم بامید گنج

اور

چو برباد دادند رنج مرا　　نبد حاصلی سی و پنج مرا

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

و فرخی در قصیدۂ کہ مدح ابوالمظفر درآن آمدہ است ، ذکر دقیقی و مدح او را ازین امیر نمودہ است :

تاطرازندہ مدیح تو دقیقی درگذشت
ز آفرین تو دل آگندہ چنان کز دانہ نار
تا بوقت این زمانہ مرو را مدت نماند
زین سبب گر هنگری ز امروز تا روز شمار
هر نباتی کز سر گور دقیقی بردمد
گر بپرسی ز آفرین تو سخن گوید ہزار

(تاریخ ادبیات در ایران ، صفحہ ۳۱۱)

دو شعر پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ پہلے مصرع کی صحیح صورت یہ ہے :

تا طرازیدہ مدیح تو دقیقی در گذشت

یعنی اے امیر ! تیری مدح کی آرزو لیے دقیقی دنیا سے رخصت ہوگیا اور اس کا دل ان ارمانوں سے یوں بھربور تھا جیسے دانوں سے انار ، کیونکہ اس وقت تک وہ زندہ نہ رہ سکا اس لیے اس کی قبر سے اگنے والی گھاس قیامت تک تیری تعریف میں رطب اللسان رہے گی ۔

(نیز دیکھیے ضمیمہ ۳ بعنوان ''دقیقی'')

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(یہ ابیات خاتمۂ شاہنامہ میں ۴۰۰ھ میں لکھے گئے ہیں) جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود فردوسی ۳۶۵ھ میں اس کام پر مصروف تھا ۔ اب یا تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ دونوں شاعر معاصر تھے اور دونوں نے ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی سال میں شاہنامے پر قلم اٹھایا ۔ لیکن یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جس کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ۔ یا دقیقی کا تقدم مان لیا جائے جس کی تائید فردوسی کے بیان سے ہوتی ہے ۔ وہ عام طور پر اس کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جن کا صریحی مفہوم یہی ہے کہ دقیقی اس سے اقدم تھا ۔ فردوسی اس کو شاہنامے کا پہلا معمار تسلیم کرتا ہے اور اپنا رہبر اور رہنما بھی مانتا ہے :

هم او بود گوینده را راهبر

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ دقیقی اور فرخی دونوں اسی ابوالمظفر احمد بن محمد کے مدح سرا تھے ۔ یہ مانا کہ دقیقی خاندان چغانیان کا پرانا نمک خوار تھا ۔ چنانچہ ابو سعد مظفر بن محتاج چغانی کی تعریف میں اس کے مدحیہ اشعار معلوم ہیں ۔ اب شجرۂ چغانیان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ابوالمظفر احمد بن محمد ، ابو سعد مظفر کے پوتے کا پوتا ہے ۔ اسی دوری کے پیش نظر بعض ایرانی نقادوں نے ابو سعد مظفر کی مدح بھی ابوالمظفر احمد بن محمد کے کھاتے میں ڈال دی ۔ چنانچہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا دقیقی کے ممدوحین میں چوتھا نام امیر ابو سعد مظفر کا درج کرنے کے بعد آقای تقی زادہ کے ایک مضمون کے حوالے سے فرماتے ہیں :

"ظاهراً او نیز از اُمرای چغانی بوده و حتّی بعض او را همان ابوالمظفر احمد بن محمد یا محمد بن محمد پنداشته اند ۔"

(تاریخ ادبیات در ایران ، صفحہ ۴۱۲)

اگر 'پنداشتن' کی گنجائش ہے تو اس کا صحیح استعمال یوں ممکن ہے کہ دقیقی کو ابوالمظفر احمد بن محمد کا مادح سمجھنے کی بجائے اس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فردوسی کے پاس دقیقی کے شاہنامے کی جو نقل تھی اپنی اصل سے دور ہو جانے کی بنا پر کثرت سے غلط تھی - شاہنامہ :

بہ نقل اندرون سست گشتش سخن   ازو نو نہ شد روزگار کہن

یعنی بوجہ کثرت نقول اس کے کلام میں اغلاط واقع ہوگئی تھیں -

(۳) سلطان محمود کے نام فردوسی شاہنامہ معنون کرتے ہوئے گویا ہے کہ میں بیس سال قبل سے اس کتاب پر مشغول تھا لیکن قدردان سرپرست اور مربی کے نہ ملنے کی وجہ سے ہمیشہ افسردہ خاطر اور غمگین رہا - خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا :

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

کے دادا ابو علی احمد بن محمد (م ۳۴۴ھ) کا مدح سرا سمجھا جائے (جس کی کنیت ممکن ہے ابوالمظفر بھی ہو ، جو چغانیوں میں بڑی مقبول تھی) جس کے بڑے لڑکے ابو نصر علی کی جوان مرگی پر دقیقی نے مرثیہ بھی لکھا تھا جس کے دو شعر تاریخ بیہقی کے باعث باقی رہ گئے ، یعنی :

دریغا میر بو نصرا دریغا   کہ بس شادی ندیدی از جوانی
و لیکن راد مردان جہان دار   چنین باشند کوتہ زندگانی

ڈاکٹر صفا ابونصر کو دقیقی کا پانچواں ممدوح لکھتے ہیں اور مندرجہ بالا دو شعر درج کرنے کے بعد پروفیسر نفیسی کے حوالے سے لکھتے ہیں : ''و این میر بو نصر ، امیر ابو نصر بن ابو علی احمد چغانی است -'' (صفحہ ۳۱۲)

اسی ابوعلی احمد بن محمد کے دور میں بقول صاحب 'صبح صادق' دقیقی فوت ہو جاتا ہے - ممکن ہے کہ ابو علی احمد کے پوتے ابوالمظفر احمد بن محمد کے 'چھٹپنے میں دقیقی نے :

شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

قسم کی کوئی تعریف کر دی ہو - لیکن اشعار بالا : ناطرازیدہ مدیح تو ......الخ سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ دقیقی بھی فرخی کے ساتھ ساتھ ابوالمظفر احمد کی مدح سرائی کرتا رہا ہے -

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

نہ دیدم سرافراز بخشندۂ — بگاه کیان بر درخشندۂ
همم این سخن بر دل آسان نبود — جز از خامشی هیچ درمان نبود
یکی باغ دیدم سراسر درخت — نشستنگہ مردم نیک بخت
بجای نبد ایچ پیدا ورش — جز از نام شاهی نبد افسرش
کہ اندر خور باغ بایستمی — اگر نیک بودی بشایستمی
سخن را نگہ داشتم سال بیست — بدان تا سزاوار این گنج کیست[1]

اس سے میرا مقصد اسی قدر ہے کہ اگر نوح بن منصور کو واقعے میں شاہ نامے سے کوئی دلچسپی تھی اور دقیقی کو اس کی نظم کی خدمت سپرد کی تھی ، تو فردوسی کے لیے یہ معاملہ نہایت آسان تھا ۔ وہ دقیقی کی آنکھ بند ہوتے ہی سیدھا بخارا کا رخ کرتا اور اپنا جوہرِ کمال دکھا کر دقیقی کا منصب اپنے لیے حاصل کرتا اور بیس سال تک گوشۂ گم نامی میں سلطان محمود غزنوی کی تاج پوشی تک نہ پڑا رہتا ۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ نوح کو شاہ نامے کے معاملے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی ؟

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

ڈاکٹر صفا نے فرخی کے ان اشعار کے علاوہ چہار مقالے سے بھی ایک ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے ، چنانچہ :

''و باز در چہارمقالہ آمده است کہ خواجہ عمید اسعد کد خدای ابوالمظفر هنگام معرفی فرخی بآن امیر چنین گفتہ بود :

''ای خداوند ترا شاعری آورده ام کہ تا دقیقی روی در نقاب خاک کشیده است ، کس مثل او ندیده است ۔''

(تاریخ ادبیات در ایران ، صفحہ ۴۱۱ ، ۴۱۲)

اب ابو المظفر احمد اپنے دادا پردادا کے دور کے شاعر دقیقی کے رتبے سے ناواقف محض تو نہیں سمجھا جا سکتا ۔ لیکن اس اقتباس سے یہ ثبوت کہاں بہم پہنچتا ہے کہ دقیقی خود ابوالمظفر احمد کا درباری شاعر رہ چکا ہے ۔ (مرتب)

۱ ۔ شاہنامۂ فردوسی ، صفحہ ۱۲ ، جلد سوم ، ۱۲۷۵ھ ۔
(حاشیۂ مصنف)

(۴) نوح بن منصور ۳۶۵ھ میں جب تخت نشین ہوا، نہایت کم سن تھا اور سلطنت کے امور کا کفیل سامانیوں کا مدبر وزیر ابوالحسن عتبی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک کم عمر بادشاہ، جو سلطنت کے معاملات میں نام کے سوا کوئی دخل نہ رکھتا ہو، علمی امور میں ایسے ذوق کا اظہار نہیں کر سکتا جو علم دوستوں میں بھی عمر کی پختگی اور سنجیدگیِ مذاق پر منحصر ہے۔

(۵) ۳۶۵ھ دقیقی کا سال وفات[1] بھی دیا جاتا ہے، اسی سال نوح بن منصور تخت نشین ہوتا ہے۔ اس لیے نوح کی فرمائش کرنے، دقیقی کا اس کے لیے ذخیرہ جمع کرنے تیار ہونے اور ہزار شعر لکھنے کے لیے بہت کم وقفہ ملتا ہے۔

ان امور پر نظر کرتے ہوئے میں اس رائے پر قائم ہوتا ہوں

۱۔ پروفیسر براؤن کی 'تاریخ ادبیات ایران'، جلد اول صفحہ ۳۷۲۔ (حاشیۂ مصنف)

جدید ایرانی نقاد دقیقی کا سال وفات ۳۶۷ھ تا ۳۶۹ھ تصور کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دقیقی کو نوح ابن منصور (۳۶۵—۳۸۷ھ) کا مدح سرا تسلیم کر رہے ہیں جو حافظ صاحب کے نزدیک محل نظر ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں:

"این واقعہ محققاً پیش از سال ۳۷۰-۳۷۱ھ اتفاق افتاد۔ زیرا چنانکہ در شرح احوال فردوسی خواھم دید، استاد طوس درحدود سال ۳۷۰ یا ۳۷۱ بہ نظم شاہ نامۂ ابو منصوری شروع کرد و درین ھنگام چنان کہ از سخنان فردوسی بر می آید دقیقی کشتہ شدہ بود۔ و فردوسی بر آن بود کہ کار نا تمام وی را تمام کند۔ از طرف دیگر می دانیم کہ دقیقی نوح بن منصور را مدح گفتہ است و بنا برین در سال ۳۶۵ زندہ بود و باز میدانیم کہ نظم شاہ نامہ بامر ہمیں نوح بن منصور صورت گرفت و بنا برین بحکم عقل باید قتل دقیقی را در حدود سالہای ۳۶۷—۳۶۹ھ تصور کرد۔"

(تاریخ ادبیات در ایران، طبع سوم، صفحہ ۴۱۱، جلد اول)۔ مرتب

کہ نہ نوح نے فرمائش کی اور نہ دقیقی نے ۳۶۵ھ میں شاہ نامہ شروع کیا ۔ چوں کہ انھی ایام میں فردوسی کو اپنے شاہ نامے پر مصروف دیکھا جاتا ہے ۔ اس لیے ضروری ہوا کہ دقیقی کا زمانہ نوح کے عہد سے اوپر کی طرف سرکایا جائے ۔ اس غرض سے یہ دلائل ناظرین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں :

(٦) دقیقی کا ایک قطعہ ہے :

امام فنون سخن بود ، ور	کرا رودکی گفتہ باشد مدیح
چو خرما بود بردہ سوی ہجر	دقیقی مدیح آورد نزد او

اس قطعے سے ، جو رودکی کے حالات میں لباب الالباب صفحہ ٦ میں درج ہے ، پایا جاتا ہے کہ رودکی اور دقیقی ایک ہی شخص کے مدح سرا رہ چکے ہیں ۔ اس لیے ضروری ہے کہ دقیقی اور رودکی ہم عصر ہوں ۔ اگر ہم عصر نہ ہوں تو زیادہ تقدم اور تاخر ان میں نہ ہو ۔ عتبی نے اپنی تاریخ میں رودکی ، دقیقی اور خسروانی کا نام اس طرح لیا ہے کہ گویا وہ ایک ہی زمانے میں تھے ۔

(۷) دیباچۂ قدیم شاہ نامہ دقیقی کو نصر بن احمد ۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ کے عہد کا شاعر مانتا ہے ۔ دیباچے کی اصل عبارت یہ ہے :

"و این شاہ نامہ بروزگار نصر بن احمد ابوالفضل بلعمی دقیقی (را) کہ شاعر او بود فرمودہ بود کہ بنظم آورد ۔"

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ؛ ایک یہ کہ دقیقی اور رودکی معاصر ہیں ، دوسرے یہ کہ شاہ نامہ ابوالفضل بلعمی کے حکم سے دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا ۔ اس طرح سے سامانیوں کی علمی فتوحات کی فہرست سے یہ کارنامہ بھی ، جس کے لیے مولانا شبلی ان کے ثناخواں معلوم ہوتے ہیں ، خارج ہوا جاتا ہے ۔

(۸) امیر نصر بن احمد کا جانشین امیر نوح بن نصر (۳۳۱ھ اور ۳۴۳ھ) ہے ۔ چوں کہ تذکرہ نگار دقیقی کو نوح بن منصور (۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ) کا شاعر مانتے ہیں ، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ نوح اوّل کو نوحِ ثانی میں خبط کر رہے ہیں ۔ بدقسمت نوح ثانی ایک امر میں

ضرور خوش قسمت رہا ہے ؛ وہ یہ کہ اخلاف نے اس کے اسلاف کے اکثر کارنامے اس کی طرف منتقل کر دیے ہیں ۔

(۹) دقیقی کی ایک تاریخ وفات ۳۴۱ھ مجھ کو دو ذرائع سے ملتی ہے ؛ 'پہلی شاہد صادق' مصنفہٗ محمد صادق صاحب ِصبح صادق ، دوسرے 'سخن دان فارس' محمد حسین آزاد ۔ ان دونوں کتابوں میں یہی تاریخ وفات ملتی ہے اور مجھ کو اس تاریخ کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ۔

ابو شکور بلخی

ابو شکور بلخی کے لیے مولانا فرماتے ہیں :

"۳۳۶ھ میں تھا ؛ اس کا کلام بہت کم ملتا ہے ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۵۴)

۳۳۶ھ محمد عوفی نے ابوشکور کی مثنوی 'آفرین نامہ' کی تاریخِ اختتام دی ہے[1] لیکن 'لغتِ فرس' میں ابوشکور کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۳۳۳ھ میں لکھی گئی تھی ۔ چناں چہ یہ شعر :

چنین داستان کس نگفت از فہال
ابر سی صد و سی و سہ[2] بود سال

---

۱ ۔ لباب‌الالباب ، جلد دوم ، صفحہ ۲۱ ۔ (مرتب)

۲ ۔ پروفیسر سعید نفیسی کے ہاں اس مصرعے میں 'سہ' کی جگہ 'شش' دیا گیا ہے (دیکھیے احوال و اشعار رودکی ، بار اول ، جلد سوم ، صفحہ ۱۲۳۷) لیکن ڈاکٹر ذبیح‌اللہ صفا لکھتے ہیں :

''بنا بروایت عوفی آفرین نامہ در سال ۳۳۶ بپایان رسید اما در یکی از ابیات ابو شکور بسال ۳۳۳ اشارہ میشود بدین نحو :

مر این داستان کش بگفت از خیال
ابر سیصد و سی و سہ بود سال

و بعید نیست کہ این بیت ہم از آفرین نامہ او باشد.........
میتوان چنین پنداشت کہ آفرین نامہ در سال ۳۳۳ھ شروع شدہ و بسال ۳۳۶ تمام گردیدہ است ۔''

(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد اول ، صفحہ ۴۰۵) (مرتب)

ابوشکور کے اشعار لغت فرس ، فرہنگ جہانگیری ، لباب الالباب اور المعجم فی معاییر اشعارالعجم میں ملتے ہیں . . . فی زماننا سب سے قدیم رباعی جس شاعر کی ملتی ہے وہ ابو شکور ہے۔

عمارہ مروزی

عمارہ مروزی کے لیے ارشاد ہوا ہے :

"مرو کا رہنے والا تھا ، ۳۶۵ھ میں انتقال کیا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۵۵)

اس کا پورا نام ابو منصور عمارہ بن محمد المروزی ہے اور آل سامان اور آل ناصر کے عہد میں گزرا ہے ۔ عوفی نے سلطان محمود غزنوی (۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ) کی مدح میں عمارہ کے یہ ابیات نقل کیے ہیں :

از کفّ شاہ نور بود بر جبین خور
جودش مرا سہیل نمود است بر جبین
گر بر کران دجلہ کسی نام او برد
آب انگبین ناب شود گل گل انگبین

ظاہر ہے کہ عمارہ کو سلطان کی مدح سرائی کے لیے اس کی مفروضہ وفات سے کم از کم تیئیس چوبیس سال بعد تک زندہ رہنا چاہیے[1] ۔

---

۱ - رضا قلی خان ہدایت نے 'مجمع الفصحا' میں عمارہ کا سال وفات ۳۶۰ھ لکھا ہے ۔ اس کی تردید کرتے ہوئے پروفیسر سعید نفیسی مرحوم ، عباس اقبال خان مرحوم کے ایک مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"......و لیز یقینست کہ وی تا زمان یمین الدولہ محمود غزنوی زندہ بودہ است ۔"

(احوال و اشعار رودکی ، طبع سوم ، صفحہ ۳۶۰)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کہتے ہیں کہ عمارہ نے امیر ابو ابراہیم اسماعیل

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دیگر شعرا

مولانا فرماتے ہیں :

"ان شعرا کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوش گو اور خوش فکر تھے ، مثلاً اعجمی ، طخاری ، ابوالعباس زنجی ، جوئباری ، ابوالمثل بخاری ، طلحہ وغیرہ ۔ لیکن چوں کہ ان کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لیے ہم ان کے نام قلم انداز کرتے ہیں ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۵۶)

جن شعرا کے نام عبارتِ بالا میں ذکر ہوئے ہیں ان میں بعض صورتیں ایسی مسخ ہو گئی ہیں کہ ان کی شناخت بالکل دشوار ہو گئی ہے ۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی ہستیاں قائم ہو گئی ہیں ۔ مثلاً ان ناموں کی فہرست میں سب سے پہلا اعجمی ہے ۔ میں اس اعجمی شاعر کی تلاش میں اتنا ہی حیران و پریشان ہوا جتنا میرے ایک انگریز فارسی خواں دوست ہاتف شاعر کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے . . . ان کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ ہاتف کسی شاعر کا نام ہے ۔ "ہاتف گفت" اور "ہاتف ندا کرد" بار بار قطعات تاریخ میں پڑھ چکے تھے ۔ ہاتف ان کے نزدیک ایک بڑا مشہور شاعر تھا جس کو فن تاریخ گوئی میں کمال تھا ۔ بڑی تلاش کے بعد دو ایک ہاتف شاعر ان کو مل گئے ۔ لیکن انھیں اپنا نہایت مشہور اور تاریخ گوئی میں

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

بن نوح بن منصور سامانی کی تعریف میں جس کا لقب "المنتصر" تھا ، شعر کہے ہیں ۔ نیز سلطان محمود غزنوی کی مدح بھی کی ہے :

"ازین کہ عمارہ در رثاء منتصر و مدح محمود سخن گفتہ معلوم میشود بعد از سال ۳۹۵ و شاید تا حدود اوایل قرن پنجم میزیستہ است لیکن چنان کہ خواهیم دید در اواخر ایام ابو سعید ابو الخیر (۳۵۷—۴۴۰) در قید حیات نبود ۔ بنابرین قول هدایت کہ وفات او را در ۳۶۰ دانستہ باطلست ۔"

(تاریخ ادبیات در ایران ، بار سوم ، جلد اول ، صفحہ ۴۵۳) (مرتب)

یدطولیٰ رکھنے والا شاعر ہاتف نہیں ملا ۔

بے سود کوشش اور جستجو کے بعد میں اس نتیجے پر آیا ہوں کہ اعجمی شاعر عنقا کا ہم‌نام ہے ۔ اگر تاریخ کے میدان میں قیاس دوڑانے کی اجازت ہو سکتی ہے تو میں کہوں گا کہ مولانا شبلی نے اعجمی کے پردے میں آغاچی کی مٹی پلید کی ہے ۔ اس شاعر کا پورا نام امیرالحسن علی بن الیاس الاغاچی البخاری[1] ہے ۔ وہ نصر سامانی کے عہد سے والی کرمان[2] تھا ۔ سینتیس سال کی حکومت کے بعد لشکر

---

۱ ۔ مولانا نے اعجمی کا نام یقیناً رضا قلی خان ہدایت کی مجمع الفصحا سے لیا ہوگا جیسا کہ سعید نفیسی مرحوم رقم طراز ہیں :

”امیر ابوالحسن علی بن الیاس بخارائی معروف باغاجی یا آغجی و این کلمہ را درکتب فارسی اغاجی و آغاجی و آغاچی و آغچی و اغجی و اغاچی و آغجی و آغجی و حتی بخطا اعاجی ہم ضبط کردہ اند و صاحب مجمع الفصحا تحریفی دیگر روا داشتہ یک جا آغاجی بخارائی و جای دیگر ابوالحسن اعجمی کردہ و دو نفر دانستہ است ۔“

(احوال و اشعار ردوکی ، بار سوم ، صفحہ ۳۰۴) (مرتب)

۲ ۔ پروفیسر سعید نفیسی لکھتے ہیں :

”تذکرہ نویسان درحق وی قایل شدہ‌اند کہ در زمان سامانیان حکمرانی و امارت کرمان داشت ۔ ولی در کتب تاریخ چنین امیری مرکرمان را نام نبردہ اند و ظن غالب آنست کہ وی را کہ ابوالحسن علی بن الیاس نام داشتہ با ابو علی محمد بن الیاس سغدی سمرقندی کہ در سال ۳۱۵ بر کرمان استیلا یافت و از سرہنگان آل سامان بود اشتباہ کردہ اند ۔ زیراکہ حمداللہ مستوفی در تاریخ گزیدہ نام ابو علی محمد بن الیاس را بخطا علی بن الیاس ضبط کردہ و تذکرہ نویسان این اسم محرف را ابوالحسن علی بن الیاس اعجمی شاعر دانستہ اند.... بگمانم این امیر ابوالحسن علی بن الیاس آغاچی بخارایی (بخاری) کہ در دربار سامانیان پایگاہ بسیار بلندی داشتہ و از امیران بشمار میرفتہ است برادر امیر ابو علی محمد بن الیاس بودہ است کہ از ۳۲۲ تا ۳۵۶ از جانب سامانیان حکمرانی کرمان را داشتہ و در ۳۵۷ در گذشتہ‌است ۔

(احوال و اشعار رودکی ، صفحہ ۳۰۴ - ۳۵۵) (مرتب)

نے اس کے مظالم سے تنگ آ کر اس کے فرزند الیسع کو امیر بنا لیا۔ ابوالحسن بخارا جا کر ۳۵۶ھ میں وفات پاتا ہے۔ آل الیاس کا بانی یہی شخص ہے۔ اس کے فارسی اشعار کا دیوان بقول ثعالبی (تتمۃ الیتیمہ) نہایت معروف تھا۔ عوفی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ لغات اسدی میں اس کا ایک شعر ملتا ہے۔ لیکن اس کا نام ابوعلی الیاس دیا گیا ہے۔ جس طرح کہ تاریخ گزیدہ اور سیاست نامہ میں۔

تیسرا نام ابوالعباس زنجی ہے۔ اس کا پورا نام ابوالعباس فضل بن عباس الربنجنی[1] ہے۔ ربنجن (بفتح را و کسر با و سکون نون و فتح جیم و سکون نون) سغد سمرقند میں ایک شہر کا نام ہے۔ ربنجنی بڑے پایے کا شاعر ہے اور رودکی اور ابوشکور کا ہم عصر۔ نصر بن احمد سامانی (۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ) کی وفات اور اس کے جانشین نوح بن نصر (۳۳۱ھ و ۳۴۳ھ) کے جلوس سلطنت کی تہنیت میں کہتا ہے:

پادشاهی گذشت خوب نژاد　　پادشاهی نشست فرخ زاد
زان گذشته زمانیان غمگین　　زین نشسته جهانیان دل شاد
بنگر اکنون بچشم عقل و بگو　　هر چه بر ما ز ایزد آمد داد
گر چراغی ز پیش ما برداشت　　باز شمعی بجای او بنهاد[2]

یہ اشعار اس قرن اور قرنِ ما بعد میں بہت مشہور رہے ہیں۔ فرخی شاعر نے ایک قصیدے میں جو سلطان محمود کی وفات ۴۲۱ھ اور امیر محمد کی تاج پوشی پر لکھا ہے، ان اشعار کو یوں تضمین کیا ہے:

---

۱ - مولانا نے ربنجنی کا غلط نام بھی 'مجمع الفصحا' سے لیا ہے جہاں 'زنجی' درج ہے۔ ملاحظہ ہو مجمع الفصحا، جلد اول، صفحہ ۲۳۷ و ۳۸۱۔ (مرتب)

۲ - عوفی نے ربنجنی کے اس قصیدے کے پانچ شعر نقل کیے ہیں۔ آخری شعر یہ ہے:

ور زحل نحس خویش پیدا کرد　　مشتری نیز داد خویش بداد

(ملاحظہ ہو لباب الالباب، جلد ۲، صفحہ ۹) (مرتب)

شمع داریم و شمع پیش نہیم — گر بکشت آن چراغ مارا باد
گر برفت آن ملک ز ما بگذاشت — بادشاهی کریم و پاک نژاد
سخت خوب آمد این دو[1] بیت مرا — کہ شنیدم ز شاعری آستاد
پادشاهی گذشت پاک نژاد — پادشاهی نشست فرخ زاد
بر گذشتہ همہ جہان غمگین — بر نشستہ همہ جہان دل شاد

ابوالفضل بیہقی کے ہاں یہی ابیات ایک مرتبہ اور سلطان فرخ‌زاد کی وفات اور سلطان ابراہیم غزنوی کی تخت نشینی کے موقع پر ایک قطعے میں تضمین ہوئے ہیں ، و ہو ھذا :

پادشاهی برفت فرخ زاد[2] — پادشاهی نشست حور نژاد
از برفتہ همہ جہان غمگین — وز نشستہ همہ جہان دل شاد
گر چراغی ز پیش ما برداشت — باز شمعی بجای آن بنہاد
یافت چون شہر یار ابراهیم — هر کہ گم کرد شاہ فرخ زاد

دوسرا نام طخاری ہے - میں اس کی تلاش میں نا کامیاب رہا - چہار مقالہ میں ایک طحاوی البتہ ملتا ہے لیکن شعرالعجم میں دو مقام پر اس کو طخاری[3] لکھا ہے - (دیکھو صفحہ ۲۶ ، شعرالعجم)

---

۱ - ''در نسخ معمول دیوان فرخی 'دو' بجای 'سہ' آمده لیکن با مراجعہ بابیات بعد معلوم میشود 'سہ' درست است -''
(حاشیہ صفحہ ۳۹۶ ، تاریخ ادبیات در ایران ، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا)
تیسرا شعر یہ ہے :
گر چراغی زما گرفت جہان — باز شمعی بہ پیش ما بنہاد (مرتب)

۲ - تاریخ بیہقی طبع کلکتہ (صفحہ ۳۶۸) اور طبع طہران ، مرتبہ ڈاکٹر غنی و ڈاکٹر فیاض (صفحہ ۳۷۸) میں بجائے 'فرخ زاد' 'پاک سرشت' ملتا ہے - (مرتب)

۳ - پروفیسر سعید نفیسی مرحوم کے نزدیک طخاری درست تر ہے - فرماتے ہیں :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پانچواں نام طلحہ ہے - میں نہیں سمجھ سکتا کہ شعرائے سامانیہ میں اس کو کیوں شمار کیا گیا - طلحہ اس دور کے شاعروں سے دو صدی بعد گزرا ہے - اس کا عہد آل سلجوق کے عہد میں محسوب ہونا چاہیے - اس شاعر کا ذکر لباب الالباب میں آتا ہے اور عوفی نے اس کا پورا نام یوں دیا ہے : "الاجل شہاب الدین ابوالحسن طلحہ المروزی -" طلحہ نے اپنے دوست حکیم محمود ابن علی السمائی المروزی کا مرثیہ بھی لکھا ہے -

---

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

''اسم این شاعر بدو صورت ضبط شده است : در چهار مقالہ (چنانکہ گذشت) و در فرہنگ اسدی طخاوی و در مجمع الفصحا در دو موضع طخاری و در نسخۂ کامل فرہنگ سروری نیز طخاری ثبت آمده - قطعاً شکل دوم اصح است زیرا کہ 'طخاران' ناحیتی بوده است در خراسان و ظاہراً از توابع مرو و نیز 'تخارستان' ایالت معروف خراسان را در کتابہای عرب 'طخارستان' نیز ضبط کرده اند و البتہ 'طخاری' نسبتست بطخاران یا طخارستان ولی طخاوی مناسبت با نام شاعری پارسی زبان ندارد زیرا کہ طخاوی نسبتست بسوی طخا در شمال مصر صعید و در مغرب نیل و ہیچ جہت نیست کہ شاعری پارسی زبان آنہم در دربار پادشاہان سامانی کہ مہد ایرانیان و زبان پارسی بوده است از مردم مصر بوده باشد و بہمین جہت اسم و نسبت این شاعر قطعاً طخاری بوده و در چہار مقالہ و فرہنگ اسدی شاید در نسخہ برداری تحریفی رفتہ باشد -''

(احوال و اشعار رودکی ، بار سوم ، صفحہ ۳۵۶) - (مرتب)

دورِ غزنویہ

شبلی فرماتے ہیں :

''عبدالملک کے بعد جب اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا تو الپتگین خراسان کو چھوڑ کر غزنین چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس تک حکومت کر کے وفات پائی ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق قایم مقام ہوا لیکن چند روز کے بعد مر گیا ۔ الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا ۔ اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحاق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۵۶ ، ۵۷)

ان بیانات میں دو ایک باتیں قابل غور ہیں ؛ الپتگین کا غزنین آ کر سولہ سال حکومت کرنا معتبر تاریخی روایات کے خلاف ہے ۔ حمد اللہ مستوفی اور اس کا مقلد فرشتہ اس بارے میں سند نہیں مانے جا سکتے ۔ اصل یہ ہے کہ الپتگین غزنین آنے کے آٹھ ماہ بعد ۳۵۲ھ میں وفات پاتا ہے ، ۳۵۴ھ میں اس کا فرزند اور جانشین ابواسحاق فوت ہوتا ہے ۔ بلکاتگین[1] امیر بنا لیا جاتا ہے ، جس کے عہد میں

---

۱ ۔ بلکاتگین کا سکہ ضرب ۳۵۹ھ پیٹرو گراڈ (روس) میں موجود ہے ۔ پروفیسر براؤن اس کو ابو اسحاق کا بھائی اور الپتگین کا فرزند کہتے ہیں ۔ (تاریخ ادبیات ایران ، جلد اول صفحہ ۳۷۲) بلکاتگین کا ذکر جامع الحکایات محمد عوفی ، طبقات ناصری ، شاہد صادق اور منتخب التواریخ حسن بن محمد بن خاکی شیرازی میں ملتا ہے ۔ آخری دونوں اسناد کی رو سے بلکاتگین ۳۶۲ھ میں مارا جاتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

ترقی کر کے سبکتگین بڑے عہدے پر پہنچتا ہے ۔ بلکاتگین کے ساتویں سال میں سلطان محمود کی ولادت ہوتی ہے ۔ بلکاتگین کے مارے جانے کے بعد امیر پیری انتخاب کیا جاتا ہے لیکن بہت جلد بعد معزول ہو کر ۳۶۶ھ میں سبکتگین امیر تسلیم کر لیا جاتا ہے ۔ فرماتے ہیں :

''سبکتگین پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا اور جے پال کو بار بار سخت شکستیں دیں ۔ سامانی دربار سے اس کو ناصرالدین کا خطاب ملا ۔ ۳۸۳ھ میں وفات پائی ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا ، بلخ میں تخت نشین ہوا ۔ محمود غزنین میں تھا ۔ اس نے بھائی کو لکھا کہ آپ بلخ میں حکومت کیجیے لیکن غزنین میرے قبضے میں رہنے دیجیے ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۵۷)

سبکتگین اور جے پال کے درمیان صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی ۔ سبکتگین کی وفات ۳۸۳ھ میں ہرگز نہیں ہوئی بلکہ باجماعِ مورخین اس کے چار سال بعد یعنی شعبان ۳۸۷ھ میں ۔ باپ کی وفات کے وقت محمود نیشاپور میں تھا، نہ غزنین میں ۔ محمود اگر اس وقت غزنین میں ہوتا یا غزنین پر اس کا قبضہ ہوتا تو بھائیوں میں جنگ کی نوبت نہ آتی ، کیوں کہ محمود اور اسماعیل کے درمیان غزنین متنازعہ فیہ تھا ۔ محمود غزنین کا طالب تھا جو اُس وقت اسماعیل کے قبضے میں تھا اور وہ اس کے معاوضے میں بلخ یا نیشاپور اسماعیل کو دے رہا تھا ۔ اسماعیل کو یہ تقسیم پسند نہ تھی ۔ محمود نے اول امن کے ذرائع استعمال کیے جو برادرانہ خطوط اور نصیحت و فہمائش کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے ۔ ابو الحارث فریغونی والیِ گوزگان بھی اس معاملے میں واسطہ بنا ۔ اس نے بھائیوں میں بالمشافہ ملاقات کی تجویز کی ۔ اسماعیل نے اس کو بھی مسترد کردیا ۔ محمود ہرات و بست کے راستے غزنین کے قریب آ گیا ۔ آخر اسماعیل اور محمود میں

جنگ ہوئی اور اسماعیل ہزیمت کھا کر غزنین کے قلعے میں پناہ گزیں ہوا۔ محمود نے پُر امن ذرائع سے قلعۂ غزنین (بہ قول بدایونی چھ ماہ بعد) اسماعیل[1] سے لے لیا۔

سلطان محمود کے علمی کارناموں کے ذکر میں فرماتے ہیں :

"غزنین میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قایم کیا تھا، جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا، جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے۔" (شعرالعجم، صفحہ ۵۸)

یہ روایت فرشتہ کے نام سے منقول ہے لیکن فرشتے کی اصل عبارت یہ ہے :

و در جوار آن مسجد مدرسہ بنا نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود۔"
(فرشتہ، صفحہ ۳۰، نول کشور)

میں نے جب مولانا کا یہ بیان دیکھا تو نہایت محظوظ ہوا کہ یہ عجائب خانے اور چڑیا گھر جن کو ہم مغربی بدعت سمجھا کرتے ہیں ہمارے اسلاف کی ایجاد نکلے۔ لیکن فرشتہ نے میری تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ خدا جانے قبلہ مولانا نے یہ نکتہ آفرینی کیوں کی ؟

اسی کتاب خانے اور سلطان کی علم دوستی کے متعلق کتاب 'بحرالفوائد' میں، جو منتصفِ قرن ششم ہجری کی فارسی زبان میں ایک تصنیف ہے اور ملک شام میں اتابک ابی سعید ارسلان آبہ بن آق سنقر کے لیے لکھی گئی تھی، روایت ذیل مرقوم ہے :

"سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مرادهای جہان در جہان یافتم مگر یک آرزو دفترها خواندن و خبر های گذشتگان دانستن پس فرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چون شب در آمدی علما را جمع کر دی تا میخواندندی۔"

۱۔ تاریخ یمینی از عتبی۔ (حاشیۂ مصنف)

۲۔ اسماعیل کے دو درہم راقم کے مجموعۂ مسکوکات میں موجود ہیں۔ (حاشیۂ مصنف)

شعرا کے حق میں محمود کی شاہانہ فیاضیوں کے ذکر میں فرماتے ہیں :

''ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنین میں آیا اور شعرا نے دربار عام میں قصائد پیش کیے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عنایت کیے ۔'' (شعر العجم ، صفحہ ۵۸)

مولانا نے یہ واقعہ سلطان محمود کی طرف منسوب کیا ہے ۔ اگر فرزند کی فیاضیاں باپ کے جود و کرم کی فہرست میں شمار کرنا غلطی میں داخل ہیں تو بیان بالا قطعی غلط ہے ۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ محمود فیاض نہیں تھا بلکہ یہ مراد ہے کہ اس کا فرزند سلطان مسعود بھی جود و سخا میں اپنے باپ سے کم نہیں تھا ۔ چنانچہ یہ واقعہ سلطان مسعود سے تعلق رکھتا ہے ، نہ سلطان محمود سے ۔

سلطان محمود ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ کو پنج شنبہ کے روز ظہر کے وقت انتقال کرتا ہے اور یہ انعام بروز دو شنبہ ۲۷ یا ۲۸ رمضان سنہ ۴۲۲ھ کو جشن مہرگاں مناتے وقت سلطان مسعود غزنین میں عطا کرتا ہے ۔ اس انعام بخشی کے وقت نہ محمود زندہ تھا اور نہ مسعود شہزادہ ۔ اس کے متعلق بیہقی کے الفاظ ہیں : " شاعران را کہ بیگانہ تر بودند بیست ہزار درم فرمود و علوی زینتی را پنجاہ ہزار درم بر پیلی بخانۂ او بردند و عنصری را ہزار دینار بدادند ۔''

(بیہقی ، صفحہ ۳۳۳ ، طبع کلکتہ)

لیکن یہ پہلی بار انعام بخشیاں سلطان محمود کی بدعات حسنہ سے تصور ہونی چاہئیں ۔ اگرچہ میں اپنے قول کی تائید میں تاریخی براہین پیش نہیں کر سکتا ، کیونکہ محمود کی تاریخیں سوائے ایک آدھ کے برباد ہو گئی ہیں ۔ اگر آج ہمارے پاس تاج الفتوح ، مقامات ابو نصر مشکانی ، تاریخ محمودی از ابوالفضل بیہقی ، تاریخ ملا محمد غزنوی اور تاریخ محمود وراق موجود ہوتیں تو ہم محمود کی فیاضی، سرپرستیِ علوم و

فنون اور قدردانیِ شعرا کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہو سکتے ۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محمود ہاتھی بھربھر کے انعامات دینے کا عادی تھا ۔ ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں محمود کے ایسے ہاتھیوں کا ذکر آتا ہے ۔ نظامی فرماتے ہیں :

مرا پیل بار از تو مقصود نیست
کہ پیل تو چون پیل محمود نیست

غضائری ایک موقع پر کہتا ہے :

امید دارم کین بار صد هزار تمام
بمن بیارد بر پای پیل بر فیال

امیر معزی :

ز بہر نام اگر شاہ زاولی محمود
بہ پیل وار بہ شاعر همی شیانی داد
کنون کجاست بیا گو بہ جود شاہ نگر
کہ جود او بہ صلہ گنج شایگانی داد

شیخ عطار :

چہ آن گر فیل وارش کم نہ ارزید
بر شاعر فقاعی هم نہ ارزید
زهی همت کہ شاعر داشت آن گاہ
کنون بنگر کہ چون برگشت از راہ

سلطان محمود شعرا پر چار لاکھ دینار سالانہ صرف کیا کرتا تھا ۔ ہر نئے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دی جاتی تھی ۔ وہ شاعروں کو دیکھ کر مسرور ہوتا تھا ۔ فرخی کہتا ہے :

تو از دیدار مادح هم چنان شادان شوی شاها
کہ هرگز نیم ازان وامق نگشت از دیدن عذرا
طواف شاعران بینم بگرد قصر تو دائم
همانا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

غضائری کو انعام میں ایک ہزار دینار عطا ہوئے ۔ اسی اثنا

میں باتوں باتوں میں غزال پر کوئی لطیفہ ہو گیا ، سلطان نے شاعر سے اس لطیفے پر غزل کی فرمائش کی ۔ غضائری نے فی البدیہہ تعمیل رشاد کی ۔ محمود نے اصلی انعام میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر دیا ۔ اغضائری :

هزار بود هزار دگر ملک بفزود
بیک غزل که ز من خواست بر لطیفه غزال

'فرشتہ' کہتا ہے کہ غضائری کو اس قصیدے کے صلے میں جس کا مطلع ہے :

اگر مراد بجاه اندر است و جاه بمال
مرا ببین که ببینی جمال را به کمال

چودہ ہزار درم صلے میں عطا ہوئے تھے ۔

سلطان نے ایک مرتبہ کسی نووارد شاعر کو تین ہزار موتی انعام میں دیے ۔ چنانچہ عنصری اس واقعے کا ذکر یوں کرتا ہے :

بیک عطا سه هزار از گهر به شاعر داد
کزان خزینه گهی زرد چهره گه لاغر
نه شاعریکه قدیمش ز رنج خدمت بود
نه نیز هیچ بدرگاه او گرفته گذر
ازین سبب در عالیش مجمع شعرا ست
اگر بود بسفر شاه یا بود بحضر

(دیوان عنصری ، صفحہ ٦٦ ، بمبئی ، ۱۳۱۰ھ)

محمود شاعر دوست اور شعر پرست ہونے کے علاوہ خود بھی ایک اعلیٰ پائے کا شاعر تھا ۔ 'بزم آرا' میں عنصری کی بیاض سے ، جو خود عنصری کے قلم کی لکھی ہوئی تھی ، محمود کی یہ غزل مرقوم ہے :

من گرد دل خویش هوای تو تنیدم
با مهر تو پیوستم و از خویش بریدم

دیگر ز بتان چون تو ندیدم ز پی آنک
بت نیست بجای کہ من آنجا برسیذم
با من بخچیذ آن کہ چو او کس نہ گرفتم
نگرفت سر زلف تو هرچند خچیذم
چون زلف شدم دست وچو بت خانہ شدم روی
چون زلف تو کاویذم و چون روی تو دیذم
گفتم کہ یکی بندہ خریدم بدرم من
نی نی غلط است اینکہ خداوند خریذم

محمد عوفی نے شاہی شعرا میں دوسرے نمبر پر اس کا ذکر کیا ہے ۔ گلستان نامی ایک کنیز تھی ، سلطان کو اس کنیز سے دلی محبت تھی ۔ جب اس کا انتقال ہوا ، محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا :

تا تو ای ماہ زیر خاک شدی — خاک را بر سپہر فضل آمد
دل جزع کرد گفتم ای دل صبر — این قضا از خدای عدل آمد
آدم از خاک بود خاکی شد — ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

سلطان محمود نے اپنی وفات سے قریب زمانے میں یہ نہایت مشہور قطعہ لکھا تھا جو متاخر تذکرہ نویسوں نے اوروں کی طرف منسوب کر دیا :

ز بیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشای
جہان مسخر من شد چو تن مسخر رای
گہی بعز و بدولت ہمی نشستم شاد
گہی ز حرص ہمی رفتمی ز جای بجای
بسی تفاخر کردم کہ من کسی ہستم
کنون برابر بینم ہمی امیر و گدای
اگر دو کلۂ بوسیدہ بر کشی ز دو گور
سر امیر کہ داند ز کلۂ گرای[1]

---

۱ - سر تراش و دلاک و حجام و بندہ مقابل آزاد ۔ (حاشیۂ مصنف)

هزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست
بسی مصاف شکستم بیک فشردن پای
چو مرگ تاختن آورد هیچ سود نکرد
بقا بقای خدایست و ملک ملک خدای

سلطان محمود کی ادبی اور علمی سرپرستی کے ذکر میں شبلی فرماتے ہیں :

”اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا لیکن اس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے ۔“ (شعرالعجم ، صفحہ ۵۹)

یہ عقیدہ کہ محمود نے فردوسی سے شاہ نامہ لکھوایا ، جتنا عام ہے اتنا ہی غلط ہے اور نہ مولانا اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ فردوسی کے حالات میں معترف ہیں ۔ چناں چہ ایک چھوڑ دو مقام پر فرماتے ہیں :

”کیا عجیب بات ہے کہ جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے ، اسی قدر اکثر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے ۔ عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچ کر اس کے حکم سے شاہ نامہ لکھنا شروع کیا ۔ اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے ۔“
(شعرالعجم ، صفحہ ۱۱۲)

ایک اور موقع پر فرمایا ہے :

”عام خیال یہ ہے کہ شاہ نامہ سلطان محمود کی فرمائش سے لکھا گیا لیکن یہ بھی محض غلط ہے ۔ فردوسی نے خود سبب تصنیف لکھا ہے ۔“ (شعر العجم ، صفحہ ۱۱۳)

اس قسم کے تخالف اور تضاد شعرالعجم کے بد نما خط و خال ہیں ۔ محمودی دور کے شعرا کے ذکر میں ارشاد فرماتے ہیں :

”اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور بدائع اور صنائع فارسی پر ایک کتاب لکھی ۔“ (شعر العجم ، صفحہ ۵۹)

اسدی طوسی نے البتہ فارسی لغات میں ایک رسالہ لکھا ہے لیکن سلطان محمود غزنوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ نہ وہ محمود کا معاصر ہے اور نہ اس کا شاعر۔ اسدی اگرچہ طوسی ہے لیکن اس کا اکثر حصۂ عمر زیادہ تر شمال و مغرب ایران میں گزرا ہے۔ ۴۵۸ھ میں امیر ابودلف والی اران کے لیے اسدی نے اپنا 'گرشاسب نامہ' تصنیف کیا۔ چونکہ مشرق ایران کے مقابلے میں ان اطراف میں فارسی زبان کم سمجھی جاتی تھی اس لیے بلخی، ماوراءالنہری اور خراسانی لغات جمع کر کے لغت فرس تیار کی۔

پال ہورن کا خیال ہے کہ اسدی نے یہ کتاب اپنے آخر حصۂ عمر میں تالیف کی، اگرچہ اس کی تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی۔ محمود ۴۲۱ھ میں وفات پاتا ہے، گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوتا ہے۔ لغت فرس اس کے بھی بعد لکھی جاتی ہے اس لیے سلطان کی طرف اس کا منسوب کیا جانا میرے نزدیک ایک حیرت خیز امر ہے۔ اسدی کی طرف صنائع و بدائع کی کتاب تصنیف کیے جانے کا قصہ میری نظر سے نہیں گزرا اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کی ہستی بھی ایسی ہی ثابت ہو جیسے 'ہاتف' شاعر کا وجود۔

بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ علامہ شبلی کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں، بعد میں ایک واقعہ ایسا بیان کر دیتے ہیں جس سے پہلے واقعے کی تردید ہوجاتی ہے اور ناظر اسی شش و پنج میں رہ جاتا ہے کہ ان متضاد بیانات میں سے کس بیان پر اعتماد کرے۔ اس قسم کی دو ایک مثالیں اوپر گزر چکی ہیں، ایک تازہ مثال یہاں گزارش ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارہ تھے، یہ ہیں: عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضاری[1]

۱۔ اس شاعر کا نام شبلی عام طور پر غضاری لکھتے ہیں لیکن محمد عوفی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فرخی ، منوچہری ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۶۰)

دوسرے موقع پر ارشاد کیا ہے :

"محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے جن میں فرخی ، عسجدی ، غضاری ، منوچہری جیسے قادرالکلام بھی شامل ہیں ۔"

(شعر العجم ، صفحہ ۶۱)

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ دو مقام پر منوچہری محمود کے شعرا اور ندما میں داخل ہے ، لیکن منوچہری کے حالات میں فرماتے ہیں :

"لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں ، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا ہے اور اس لیے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا تھا ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۱۸۷)

ایک محقق کا اولین فرض یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کرے اس کی پوری پوری تحقیق اور تفتیش کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرے اور ہمیشہ کے لیے اسی پر قائم ہو جائے ، اور اگر آیندہ بھی اس کے اظہار کی ضرورت ہو تو وہی بیان کرے . یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو رطب و یابس ملا قبول کر لیا ۔ نہ اس امر کا خیال رکھا کہ یہ بیان پہلے بیان کے خلاف جاتا ہے یا آیندہ بیان کے مخالف ہوتا ہے ۔ میں دیکھتا ہوں کہ مولانا کی تحقیق کا یہ پہلو نہایت کمزور ہے ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

صاف اس کو غضائری لکھتا ہے ۔ اس سے بھی قدیم سند کی ضرورت ہو تو عنصری کا یہ شعر موجود ہے :

ایا غضائری ای شاعری کہ در دل تو
بجز تو ہر کہ بود جملہ ناقصند و نکال

(دیوان عنصری ، صفحہ ۸۶ ، ۱۳۲۰ھ ، طبع آقا محمد اردکانی) ایک موقع پر مسعود سعد سلمان نے ع : "چون لطف شاہ ماضی بر شاعر غضاری" بضرورت شعر لکھا ہے جو مستثنیات میں شمار ہونا چاہیے ۔

(حاشیہ مصنف)

جو پہلی روایت ان کے سامنے آتی ہے اسی کو نہایت فیاض دلی کے ساتھ تسلیم کر لینے کو مستعد ہیں ۔ مثلاً عنصری کے ذکر میں فرماتے ہیں :

ایک دفعہ سلطان نے فصد لی ، رودکی نے برجستہ کہا :

آمد آن رگ زن مسیح پرست نیش الماس گون گرفتہ بدست
طشت زرین و آبدستان خواست بازوے شہریار را بربست
نیش بگرفت و گفت عز علیک این چنین دست را کہ یارد خست
سر فرو برد و بوسہ برداد وز سمن شاخ ارغوان برجست

(شعرالعجم ، صفحہ ٦٣)

یہ اشعار اصل میں حکیم شہاب‌الدین شاہ علی ابی رجا الغزنوی کے ہیں ۔ شبلی نے انھیں عنصری کے نام لکھا[1] لیکن حضرت کاتب نے عنصری کی بجائے رودکی کا نام پسند کیا ۔ چنانچہ اس غلطی نے ایک ایسی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی ہے جس کا جواب یہ شعر ہو سکتا ہے :

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا
الا یاایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

ابو رجا ، سلطان بہرام (۵۱۱ھ و ۵۴۷ھ) کے عہد کا شاعر ہے اور اس قطعے میں اس نے بہرام شاہ کے فصد لینے کا ایک واقعہ نظم کیا ہے ؛ جو یہ ہے کہ بادشاہ کو ایک مرتبہ فصد کھلوانے کی ضرورت پیش آئی ۔ اتفاق سے عیسائی فصاد جو آیا ، حسین اور سادہ رو تھا ۔ اس نے فصد کھولی اور خون بہنا شروع ہوا ۔ بادشاہ نے مذاق میں کہیں اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ ڈال دیا ۔ اس نے برا مانا اور

---

۱ ۔ ڈاکٹر یحییٰ قریب نے بھی اپنے مرتبہ دیوان عنصری میں قصائد کے اختتام پر ''در فصد ممدوح گوید'' کے عنوان سے یہ اشعار درج کردیے ہیں ۔ ملاحظہ ہو دیوان عنصری ، صفحہ ۱۸۱ ، مطبوعہ طہران ، سنہ ۱۳۴۱ شمسی ۔ (مرتب)

غصے کے لہجے میں کہا : ”ادھر ادھر ہاتھ کیوں مارتے ہو ، خاموش بیٹھو ۔“ بہرام شاہ نے معذرت میں کہا ”تم جانتے ہو ، فصد کے وقت ہاتھ میں لٹو رکھنے کا رواج ہے ، تمھاری زنخداں جو بالکل گوے سیمیں کے مشابہ ہے ، میں نے لٹو سمجھ کر ہاتھ میں لی تھی ۔“ مولانا نے اس قطعے کو ادھورا لکھ کر سارا لطف غارت کر دیا ۔

ابو رجا کا قطعہ یہ ہے :

آمد آن کودک مسیح پرست — نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشت زرین و آبدستان خواست — بازوے شہر یار عالم بست
نیش بگرفت و گفت عز علیہ — این چنین دست را کہ یارد خست
سر فرو برد و بوسہ داد برو — وز سر نوک نیش خون بر جست
این عجب بین کہ دیدہ بود بچشم — کز سمن شاخ ارغوان بر جست
بود فصاد ہمچو ماہ تمام — ذقن سادہ اش گرفت بدست
گفت فصاد این روا نبود — دست ہر سو زدن چو مردم مست
شاہ گفتا غلط نہ کردستم — ور غلط کردہ ام جوابم ہست
شرط باشد بوقت کردن فصد — گوی سیمین گرفتن اندر دست

جب ایک واقعہ دو مختلف شخصوں کی طرف منسوب ہوتا ہے ، مولانا بغیر کسی تلاش اور تفحص کے وہ قصہ دونوں کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں ۔ ایسا کرنے میں اگرچہ مولانا نے اپنے اعتقاد کی وسیع المشربی کا ثبوت دے دیا ، لیکن تنقید کے اہم فرائض قضا کر دیے ۔ اس قسم کی ایک مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے ۔ فرماتے ہیں :

”ایک دفعہ محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر پڑا اور خفیف سا زخم آیا ۔ عنصری نے فی البدیہ کہا :

شاہا ! ادبی کن فلک بدخو را — کاسیب رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن — ور اسپ غلط کرد بمن بخش او را

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے ؛ ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اس کو بخش دیجیے ۔ دوسرے یہ کہ اگر غلط رو ہے تو مجھے دے ڈالیے ۔ محمود نے اس حسن طلب کے صلے میں گھوڑا عنصری کو دے دیا ۔ عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی :

رفتم بر اسپ تا نزارش بکشم
گفتا کہ نخست بشنو این عذر خوشم
نی گاو زمینم کہ جہان برگیرم
نی چرخ چہارسم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا ۔ گھوڑے نے کہا کہ پہلے میرا عذر سن لیجیے ؛ کچھ میں گاو زمین تو نہیں ہوں کہ عالم کا بار اٹھا لوں ، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لیے پھروں ۔" (شعر العجم ، صفحہ ۶۴)

مولانا کی خوش اعتقادی قابل رشک ہو جاتی ہے جب یہ قصہ سلطان سنجر اور امیر معزی کی طرف بھی ذیل کے الفاظ میں منسوب ہوتا ہے ۔ فرماتے ہیں :

"ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا ۔ اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی اور سنجر گھوڑے سے گر گیا ۔ معزی نے برجستہ یہ رباعی پڑھی :

شاہا ! ادبی کن فلک بدخو را
کو چشم رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا کرد بہ چوگانش زن
ور اسپ خطا کرد بہ من بخش او را

یعنی اے بادشاہ ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجیے، اس نے آپ کو نظر لگا دی ۔ اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اس کو ماریے اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالے فرمائیے ۔ اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے ۔ سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا ۔

معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی :

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم
گفتا کہ نخست بشنو این عذر خوشم
نی گاو زمینم کہ جہاں برگیرم
نی چرخ چہارمین کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی ۔ اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سن لیجیے ؛ میں کچھ گاؤ زمین تو نہیں کہ عالم کا بار اٹھا لوں ، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لیے پھروں ۔ مطلب یہ ہے کہ سلطان سنجر کا بار اٹھانا گاو زمین اور آفتاب (آسمان[1]) کا کام ہے ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۲۱۱)

"خطای بزرگان گرفتن خطا است" ہمارے پرانے معتقدات سے ہے لیکن افسوس ہے کہ انھیں غلط اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہے کہ آج ہماری تاریخیں رطب و یابس ، غث و سمین اور دروغ و راست کا مجموعہ بن رہی ہیں ۔ ہماری جرح و تعدیل کے پرانے ہتھیار پڑے پڑے زنگ آلود ہوگئے لیکن اس خوش اعتقادی کا روسیاہ جس نے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہے ۔ اس قسم کے موضوعات سے شبلی نے اگرچہ عنصری کی رونق محفل خوب کر دی لیکن قصۂ بالا کا اصلی موضوع میرے خیال میں امیر معزی ہے ۔

---

۱ ۔ خط ہلالی میں لفظ 'آسمان' میرا اضافہ ہے ۔ 'آفتاب' غلط معلوم ہوتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

فرّخی

"شعرالعجم" میں فرخی کے باپ کا نام 'قلوع[1]' (صفحہ ۳۷) دیا گیا ہے ، حالانکہ چہار مقالہ اور لباب میں صاف 'جولوغ' مرقوم ہے ۔ اس شاعر کے حالات شبلی نے ، جیسا کہ صفحہ ۷۷ کے ایک حاشیے میں کہا ہے ، چہار مقالۂ نظامی عروضی سے لیے ہیں ۔ فرماتے ہیں : ''گویا میں نے اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے ۔" اگرچہ وہ لفظی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ بعض مقامات پر تصرفات بھی کیے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

"ابوالمظفر چغانی اس زمانے میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا اور نہایت فیاض طبع اور قدردان سخن تھا ۔"

(شعر العجم ، صفحہ ۳۷)

چہارمقالہ میں ابوالمظفر چغانی کا البتہ ذکر ہے لیکن یہ خیال کہ آن ایام میں وہ سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا ، کہیں ظاہر نہیں کیا ۔ نہ چہار مقالہ میں ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم یہ عبارت ہو سکے ۔ ابوالمظفر چغانی کا سلطان کی طرف سے گورنر بلخ مقرر کیا جانا ایک غلط بیان ہے ۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں بیان کیا ہے :

"فرخی مادح امیر کبیر ابوالمظفر بن امیر ناصرالدین ست کہ در روزگار سلطان محمود سبکتگین والی بلخ بود ۔"

(تذکرۂ دولت شاہ ، مطبوعہ یورپ ، صفحہ ۵۵)

---

۱ - مولانا نے یہ نام ''آتش کدہ'' اور ''مجمع الفصحا'' سے لیا ہے جہاں بالترتیب آذر اور ہدایت فرخی کے باپ کا نام 'قلوع' ہی لکھ رہے ہیں ۔ (مرتب)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ابوالمظفر چغانی والیِ چغانیاں اور ابوالمظفر نصر برادر سلطان محمود کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے۔ چغانیہ ماوراء النہر میں ایک ولایت کا نام ہے اور فرخی کے ممدوح کا نام ابو المظفر بن احمد محمد والیِ چغانیاں ہے، جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے:

تا نقش کرد بر سر ھر لقش برلوشت
مدح ابوالمظفر شاہ جہالیان
بن احمد محمد شاہ جہان پناہ
آن شہریار کشور گیر و جہان ستان

"تاریخ یمینی" میں اس کو ابوالمظفر محمد بن احمد لکھا گیا ہے۔ فرخی غالباً بہ ضرورت شعر اس کا نام ولدیت کے بعد لایا ہے۔ چغانی خاندان چغانیہ میں امیرنصر متوفی ۳۳۱ھ کے عہد سے حکمران رہا ہے، سامانیوں کے دور میں سامانیوں کا برائے نام مطیع تھا۔ غزنویوں کے عہد میں یہ خاندان برقرار اور برسر حکومت رہا۔ آل غزنہ سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ چنانچہ ابوالقاسم والیِ چغانیاں سلطان مسعود غزنوی کا داماد تھا، جیسا کہ بیہقی (صفحہ ٦١٣) سے معلوم ہوتا ہے۔ فرخی اپنے ممدوح ابوالمظفر کا ذکر ایک آزاد اور مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے کرتا ہے جس کو کبھی خسرو، کبھی شہریار اور کبھی بادشاہ کے القاب سے یاد کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ بلخ کے گورنر کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

قولہ: "فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی۔ شاعری کی قدردانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے۔ اس لیے اس کو خیال ہوا کہ اس ذریعے سے یہ مشکل حل ہو گی۔" (شعرالعجم، صفحہ ۴۳)

یہ عبارت نظامی عروضی کے چہار مقالے میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

قولہ: "فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، تھک کر چور ہو گیا اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا۔ صبح دن

چڑھے آٹھا۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۷٦)

فقرات بالا کے درمیان نظامی کے ہاں یہ عبارت ہے :

"آخرالامر رباطی ویران برکنار لشکر گاہ پدید آمد ، کرگان در آن رباط شدند ، فرخی بغایت ماندہ شدہ بود ، در دھلیز رباط دستار زیر سر نہاد و حالی در خواب شد از غایت مستی و ماندگی ۔ کرگان را شمردند چہل و دو سر بودند ۔ رفتند و احوال با امیر بگفتند ۔ امیر بسیار بخندید و شگفتیہا نمود و گفت مردی مقبل ست کار او بالا گیرد ، او را وکرگان را نگاہ دارید وچون او بیدار شود مرا بیدار کنید ، مثال پادشاہ را امتثال کردند ۔ دیگر روز بطلوع آفتاب فرخی برخاست ۔"

(چہار مقالہ ، صفحہ ۴۰)

باوجود ایسی قطع و برید کے جس کی کچھ مثالیں اوپر گزری ہیں ، مولانا مدعی ہیں کہ میں نے چہارمقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے ۔

قولہ : "ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا ، فرخی کا نہایت قدردان تھا اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا ۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا ، یہاں تک کہ فرخی کا دربار (میں آنا) بند کر دیا ۔ فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے ، بالآخر سلطان صاف ہوگیا اور فرخی بدستور دربار میں جانے آنے لگا ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۷۸)

یہاں شبلی نے مجمع الفصحا کی روایت کو فروغ دے کر فرخی کو سلطان کا رقیب بنایا ہے ۔ اگر مولانا قصائد فرخی کو ذرا زحمت گوارا فرما کر غور سے مطالعہ فرماتے تو ان کو علم ہو جاتا کہ یہ روایت بالکل ضعیف ہے ۔ صرف ایک قصیدہ ہے جس میں شبہ کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے ، باقی تہمت ہے اور قیاس آرائی ۔ نہ لباب الالباب اور چہار مقالہ میں فرخی اور ایاز کی محبت کا قصہ آتا ہے ۔

قولہ : "اس زمانے کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے کہ

شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے اس میں علانیہ ایاز کے حسن و معشوق کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا ۔ فرخی ایک قصیدے میں لکھتا ہے :

امیر جنگجو ایتاز اویماق
دل و بازوی خسرو روز پیکار
زنان پارسا از شوق گردند
بہ کابین کردنی او را خریدار
نہ بر خیرہ بدو دل داد محمود
دل محمود را بازی مپندار
جز او در پیش سلطان نیز کس بود
جز او سلطان غلامان داشت بسیار
اگر چون میر یک تن بود آنجا
نہ چندین بد مر او را گرم بازار

(شعرالعجم ، صفحہ ۷۸)

یہ نکتہ شبلیانہ ندرت آفرینی کی مثال ہے ۔ اس معاملہ خاص میں مولانا مجمع الفصحا وغیرہ کے رہین منت نہیں ہیں بلکہ اپنے ذاتی اجتہاد کے ۔ علانیہ ایاز کی حسن و معشوق کا ذکر تو کجا محمود ایسا جابر بادشاہ تھا کہ اپنے غلاموں کی طرف کسی کو پوری نگاہ بھر کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا ۔ ابو الفضل بیہقی نے اس قسم کا ایک واقعہ اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

ایک روز سلطان کے ہاں باغ فیروزی میں مجلس شراب تھی ، امیر یوسف برادر محمود بھی موجود تھا ۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور غلام دو دو مل کر نوبت بہ نوبت ساقی گری کر رہے تھے ۔ ان میں طغرل کی باری بھی آئی ۔ طغرل اس روز قبائے سرخ پہنے تھا ۔ امیر یوسف پر شراب کا پورا اثر ہو چکا تھا ۔ یوسف کی جب طغرل پر نظر پڑی ، دیر تک ٹکٹکی باندھے محویت کے عالم میں دیکھتا رہا ۔ سلطان کو بھائی کی

یہ حرکت نا گوار گزری اور کہنے لگا کہ باوا جان نے مرتے وقت عبداللہ دبیر کی معرفت پیغام بھیجا تھا ۔ میں بیہقی کے الفاظ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں :

''محمود را از پیغام من بگوی کہ مرا دل بہ یوسف مشغول است ، وی را بتو سپردم ، باید کہ وی را بہ خوی خویش بر آری و چون فرزندان خویش عزیز داری و ماتا این غایت دانی کہ براستای تو چند نیکویی فرمودہایم و پنداشتیم کہ با ادب برآمدۂ و نیستی چنان کہ ما پنداشتیم در مجلس شراب در غلامان ما چرا نگاہ می کنی و ترا خوش آید کہ هیچ کس در مجلس شراب در غلامان تو نگرد و چشمت از دیر باز برین طغرل بماندہ است و اگر حرمت روان پدرم نبودی ترا مالشی سخت تمام رسیدی ـ این یک بار عفو کردم و این غلام را بہ تو بخشیدم کہ مارا چنو بسیار ست ـ هوشیار باش تا بار دیگر چنو سہو نیفتد کہ با محمود چنین بازیہا نہ رود ـ یوسف متحیر گشت و بر پای خاست و زمین بوسہ داد و گفت توبہ کردم و نیز چنین خطا نیفتد ـ امیر گفت بنشین ، بنشست و آن حدیث فرا برید ـ''

(بیہقی ، صفحہ ۳۰۶ ، طبع کلکتہ)

اس سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شعرا کے لیے محمود کے مدحیہ قصائد میں ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر قریب قریب دشوار تھا ـ فرخی کے جو اشعار انھوں نے اپنے استدلال میں لکھے ہیں ، ان سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ دیوان فرخی ان کی نظر سے نہیں گزرا کیوں کہ یہ قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ہے بلکہ خود ایاز کی تعریف میں ، اور اس وقت لکھا گیا جب محمود دنیا سے انتقال کر چکا ہے اور سلطان مسعود اپنی تخت نشینی کے بعد ایاز کو اس کے حسن خدمات کے صلے میں ، جن کی تفصیل بھی اسی قصیدے میں درج ہے ، ایک گراں بہا انعام دیتا ہے ـ قصیدے کا مطلع ہے :

غم نا دیدن آن ماہ دیدار
مرا در خوابگہ ریزد ہمی خوار

اور گریز کے وقت شاعر گویا ہے :

ز دل برداشت خواہم بار اندہ چو نزد میر سید یافتم بار
امیر جنگجوی ایاز اویماق دل و بازوی خسرو روز پیکار

اس کے بعد شاعر سلطان مسعود بن محمود کی فیاضی ایاز کی خدمت کے صلے میں یوں بیان کرتا ہے :

خداوند جہان مسعود محمود کہ او را زر ہمی بخشد بخروار
جز او را از ہمہ میران کرا داد بیک بخشش چہل خروار دینار
نہ‌دادندیش چندین بیہدہ زرا[1] بہ چندین و بصد چندین سزاوار
بجای قدر میر و حشمت[2] شاہ تو این را خوار دار و اندک انگار
بجای برد خواہد خسرو او را کہ سالاران بدو گردند سالار
بدو بخشد چو مال خطۂ بست خراج خطۂ مکران و قصدار
کجا گردد فراموش آنچہ او کرد ز بہر خدمت شاہ جہان دار
میان لشکر عاصی نگہداشت وفا و عہد آن خورشید احرار
بروز روشن از غزنین برون رفت ہمی زد با جہانی تا شب تار
نماز شام را چندان کہ خواندند کہ‌دشت‌از کشتہا شد پشتہ‌ہموار[3]
گروہی را ازان شیران جنگی بکشت و مابقی را داد زنہار
جزاوہرگزکہ کردست این‌بہ گیتی بخوان شہنامہ و تاریخ احرار[4]

---

١ - دیوان فرخی بہ تصحیح علی عبدالرسولی مطبوعہ ١٣١١ شمسی و دیوان فرخی مرتبہ محمد دبیر سیاق مطبوعہ ١٣٣٥ شمسی میں یہ مصرع اس طرح درج ہے :

نہ‌دادندیش چندین گر نبودی (مرتب)

٢ - دیوان فرخی مطبوعہ ١٣١١ شمسی و ١٣٣٥ میں ''ہمت ـ'' (مرتب)

٣ - فرخی کے مذکورہ بالا دیوانوں میں :

کہ دشت از کشتہ شد باپشتہ ہموار (مرتب)

٤ - مذکورہ بالا دیوان ہاے فرخی میں :

بخوان شاہنامہ و تاریخ و اخبار (مرتب)

خدایا ناصر او باش و از قدر سر رایاتش از خورشید بگذار

فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں اس کا تعلق کس زمانے سے ہوا ہے۔ اس غرض کے لیے سب سے صحیح اطلاع اس کے دیوان سے مل سکتی ہے؛ میں ناظرین کی معیت میں دیوان کا مطالعہ ذیل میں شروع کرتا ہوں۔ ضمناً بعض واقعاتِ تاریخِ معاصر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

فرخی کے ہاں اسماے ذیل کی مدح میں قصائد ملتے ہیں:

(۱) سلطان محمود غزنوی (۲) عضدالدولہ ابو یعقوب یوسف بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود (۳) ابو احمد محمد بن سلطان محمود (۴) سلطان مسعود شہید بن سلطان محمود (۵) خواجۂ بزرگ شمس الکفاۃ احمد بن حسن میمندی (۶) خواجہ سید اسعد[1] (۷) خواجہ ابوالفتح علی بن الفضل[2] (۸) خواجہ سید ابوبکر حصیری (۹) خواجہ منصور بن حسن (۱۰) ابوالفتح عبدالرزاق بن احمد (۱۱) عمید منصور ابوالحسن (۱۲) ایاز اویماق (۱۳) ابوبکر عبداللہ بن یوسف[3] (۱۴) خواجہ ابو سہل دبیر (۱۵) خواجہ عمید سید ابو احمد تمیمی (۱۶) خواجہ سید ابو سہل عمر کدخدای

---

۱ - غالباً خواجہ عمید (ابو منصور) سید اسعد کدخدای امیر ابو المظفر والی چغانیان مراد ہے۔ (مرتب)

۲ - شاید مراد ہے وزیر زادہ ابوالحسن، حجاج، علی بن ابو العباس الفضل بن احمد اسفرائنی جس کی مدح میں فرخی کے پانچ قصیدے اور ایک ترجیع بند ملتا ہے۔ (مرتب)

۳ - معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۸ اور نمبر ۱۳ ایک ہی شخص ہے۔ کیونکہ خواجہ ابوبکر سیستانی معروف بہ حصیری کا نام بھی عبداللہ بن یوسف تھا۔ (مرتب)

عضد الدولہ[1] (۱۷) خواجہ سید بو سہل عراق وکیل (۱۸) خواجہ بو سہل رئیس الرؤسا احمد بن حسن[2] (۱۹) فخر الدولہ ابو المظفر محمد بن احمد چغانی[3] ۔

اس فہرست میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امیر نصر بن ناصر الدین ، سپہ سالار خراسان اور خواجہ ابو العباس فضل بن احمد اسفرائنی (۳۸۸ھ و ۴۰۰ھ) وزیر اول سلطان محمود ، المتوفی ۴۰۳ھ کا نام داخل نہیں[4] ۔ ان جلیل القدر اشخاص کے نام کی فرخی کے

۱ ۔ قیاس کہتا ہے کہ نمبر ۱۴ اور نمبر ۱۶ دونوں سے ایک ہی شخصیت یعنی خواجہ ابوسہل دبیر عبداللہ بن احمد کدخدای عضد الدولہ یوسف بن سبکتگین مراد ہے ۔
ایک قصیدے میں ، جسے علی عبدالرسولی نے غلطی سے خواجہ ابوسہل زوزنی کی مدح میں سمجھ لیا تھا ، اور آقای محمد دبیر سیاق نے اس کو خواجہ ابوسہل دبیر عبداللہ بن احمد بن لکشن کی مدح تسلیم کیا ہے ، یہ شعر ملتا ہے ۔

کدخدای ملک هفت اقلیم خواجہ سید ابو سہل عمر
(صفحہ ۱۸۴)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ابو سہل دبیر کا نام عمر تھا ۔ (مرتب)

۲ ۔ حمدوی یا حمدونی ۔ (مرتب)

۳ ۔ فرخی کے ممدوحین میں ان ناموں کے علاوہ حسنک وزیر ، عمید الملک ابو بکر علی بن حسن تہستانی اور بعض مقابلتاً کم معروف امرا کے نام بھی ملتے ہیں ۔ (مرتب)

۴ ۔ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین سپہ سالار خراسان کی مدح میں فرخی کا ایک قصیدہ بمطلع :

چو زر شدند رزان ، از چہ ؟ از نهیب خزان
بکینہ گشت خزان با کہ ؟ باستاک رزان

آقای محمد دبیر سیاق نے اپنے مرتبہ دیوان فرخی میں (صفحہ ۲۹۸ پر)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ممدوحین میں عدم شمولیت ایک قابل تعجب امر ہے ۔ فہرست میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جو پانچویں قرن کے آغاز کے بعد محمود کے ہاں رسوخ اور شہرت حاصل کرتے ہیں ۔ مثلاً امیر یوسف ، امیر محمد اور مسعود چوتھی صدی کے اختتام پر کسی شمار و قطار میں نہ تھے ۔ ۴۰۱ھ میں امیر یوسف سترہ سال کا تھا اور امیر محمد اور مسعود چودہ چودہ سال کے ۔ ۴۰۸ھ میں امیر محمد والیِ گوزگانان اور امیر مسعود والیِ ہرات (بقول فرشتہ) بنائے جاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ شعرا اس سنہ کے بعد ان کی مدح سرائی کرنے لگے ہیں ۔

قصائد فرخی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق زیادہ تر امیر یوسف ابن ناصر الدین امیر ابو احمد محمد اور خود سلطان محمود سے رہا ہے ، لیکن اول الذکر امیر یوسف سے اس کو خاص تعلق تھا ۔ بلکہ غزنین کی آمد پر سلطانی دربار میں رسائی حاصل کرنے سے قبل امیر یوسف کے دربار سے واسطہ پیدا کر لیتا ہے ۔ اس وقت تک وہ بالکل گم نام اور اجنبی تھا ۔ چنانچہ فرخی :

چو تشنہ گشتہ و گم بودہ مردمی بودم
بہ‌طمع آب روان گرم گاہ سوی سراب
مرا تفضل تو آب داد و راہ نمود
ببوستانی خوشتر ز روزگار شباب[1]

امیر یوسف کی فیاضیوں نے اسے جلد خوش حال کر دیا ۔ فرخی :

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

درج کیا ہے ۔ علی عبدالرسولی کے مرتبہ دیوان میں یہ قصیدہ بعنوان :
”در صفت خزان و مدح امیر یوسف برادر سلطان محمود گوید “
مندرج ہے جو صریحاً غلط ہے ۔ جیسا کہ قصیدے کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے :

سپاهدار خراسان ابوالمظفر نصر
امیر عالم عادل برادر سلطان (مرتب)

۱ ۔ دیوان فرخی، مرتبہ محمد دبیرسیاقی، طبع طہران ، ۱۳۳۵ شمسی صفحہ ۱۲ ۔ (مرتب)

شکر تو بر من فراوان واجب است ای شهریار
از فراوانی ندانم گفت شکرت کین کدام
چیست نیکوتر ز جاه از تو رسیدستم بجاه
چیست شیرین تر ز کام از تو رسیدستم بہ‌کام[1]

ابھی مدح سرائی کا تعلق قایم نہیں ہوا تھا کہ امیر نے غالباً اس کا ذکر سن کر خلعت بھیجا۔ فرخی :

شاعران را ملکان خواستہ آنگاہ دهند
کہ بدیشان همی آرند مدیحی چو گہر[2]
او مرا خلعت و دینار بوقتی فرمود
کہ مرا مدحت او گشتہ نبود اندر سر

اس سے ظاہر ہے کہ امیر یوسف نے خواہش کرکے فرخی کو اپنے ہاں بلوایا۔

امیر نے ایک مرتبہ گینڈا کمند سے پکڑا ، اس کے لیے فرخی کہتا ہے :

جز تو کی بست کرگ[3] را بکمند
ای ترا میر کرگ گیر لقب

امیر یوسف اپنے اسراف کی وجہ سے تنگ دست رہتا تھا ؛ اس کے متعلق شاعر کہتا ہے :

مرا غم آید اگرچہ مرا دلی ست فراخ
ز مال دادن و بخشیدن بدان کردار

---

۱ - صفحہ ۲۳۷ ، دیوان فرخی ، طبع ۱۳۳۵ شمسی - (مرتب)

۲ - دیوان فرخی ، مرتبہ محمد دبیرسیاقی (صفحہ ۱۳۶) و مرتبہ علی عبدالرسولی (صفحہ ۱۳۸) میں :

کہ بدیشان بطرازند مدیحی چو درر (مرتب)

۳ - دیوان فرخی مرتبہ دبیر سیاقی (صفحہ ۱۴) و مرتبہ علی عبدالرسولی (صفحہ ۱۵) میں :

جز تو نگرفت کرگ را بکمند (مرتب)

چنان ملک را باید کہ باشدی ہر روز
خزانہ پر درم و پر سلیح و پر دینار
چو خرج خویش فزون تر ہمی ز دخل کند
ز زر و سیم خزانہ تہی بود ناچار[1]

ایک قصیدے میں امیر کے حاجب طغرل کی کتخدائی کا ذکر آتا ہے جو امیر یوسف نے نہایت دھوم دھام سے کی تھی :

از پی حاجب طغرل کہ ز شاہان جہان
حاجبی نیست چنو ہیچ کسی را دیگر
بہ پسند دل خویش او را درخواست زنی
ز تباری کہ ستودہ است باصل و بگہر
ہرچہ شایست بکرد وانچہ بایست بداد
کار او کرد تمام و شغل او برد بسر
آن چہ او کرد بہ‌تزویج یکی بندۂ خویش
نکند ہیچ شہی از پی تزویج پسر
آن نہالیٔ کہ درین خدمت حاجب بنشاند
سر بعیوق برآورد بخندید ز بر
خدمت میر بدل کرد ہمی تا از دل
خدمت او کند امروز ہر آن کو برتر
خدمتش بود پسندیدہ بہ‌نزدیک امیر
لاجرم میر کلہ داد مر او را و کمر[2]

طغرل ظرافت اور لیاقت میں بے مثل تھا ۔ ترکستان سے ارسلان خاتون نے سلطان محمود کے پاس ہدیے میں بھیجا تھا ۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا گیا ہے ، سلطان نے امیر یوسف کو دے دیا ۔ یوسف نے اپنے فرزندوں کی طرح اس کی پرورش کی ۔ جب جوان

---

۱ ۔ صفحہ ۱۳۷ ، دیوان فرخی ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی ۔ (مرتب)
۲ ۔ صفحہ ۱۳۲ ، دیوان فرخی ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی ۔ (مرتب)

ہوگیا ، ایک نامی گھرانے میں اس کی شادی کر دی ۔ اس عروسی کے متعلق بیہقی کہتا ہے :

"بڑے غیر ضروری تکلف اور تیاریاں کی گئی تھیں جن کو سمجھ دار لوگوں نے ناپسند کیا [۱]۔"

فرخی کا دوسرا ممدوح امیر محمد ہے ۔ امیر محمد معلوم ہوتا ہے اپنے خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور قدر دانِ علم تھا ۔ متعدد کتابیں اسے ازبر تھیں ۔ فرخی کئی موقعوں پر اس قسم کی تلمیحیں کرتا ہے ، چناں‌چہ :

قطب معالی[۲] ملک محمد محمود ناصر علم[۳] و معین مات و مختار
آن کہ ز دعوی فزون نماید معنی وآن کہ ز گفتار بیش دارد کردار
جود و سخارا ازو فزون شدہ‌قدرت[۴] علم و ادب را بدو فروختہ بازار
اہل ادب را بزرگ دارد و نشگفت این ز بزرگیش بس بزرگ مپندار
قدر گہر جز گہر شناس نداند اہل ادب را ادیب داند مقدار

چشم بدان دور باد زان شہ کان شہ
سخت ادب پرورست و علم خریدار[۵]

دیگر

پدر از ملک زمین بیشترین یافتہ بہر
پسر از کتب جہان بیشترین کردہ زبر[۶]

۱ - "و در عقد نکاح و عروسی وی تکلفہای بی محل نمود ، چنانکہ‌گروہی از خردمندان پسند نداشتند ۔"
(تاریخ بیہقی ، صفحہ ۲۵۳ ، طبع طہران) (مرتب)

۲ - دیوان ہای فرخی مرتبہ علی عبدالرسولی و مرتبہ محمد دبیر سیاق میں "معالی ۔" (مرتب)

۳ - دیوان ہای محولہ بالا میں "دین ۔" (مرتب)

۴ - مذکورہ بالا دیوانوں میں "قوت ۔" (مرتب)

۵ - صفحہ ۹۳ ، دیوان فرخی ، مرتبہ دبیر سیاق و صفحہ ۹۵ ، مرتبہ علی عبدالرسولی ۔ (مرتب)

۶ - صفحہ ۱۲۱ ، دیوان فرخی ، مرتبہ محمد دبیر سیاق ۔ (مرتب)

دیگر

چون بسا بر[1] سر زبان دارد
فقہ و تفسیر و مسند و اخبار

تیسرا شخص جس سے ہمارے شاعر کو دل چسپی رہی ہے ، خود سلطان محمود ہے - فرخی کے ہاں محمود کی زندگی کے واقعات کے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان میں سب سے قدیم فتحِ قنوج و کالنجر ہے - دو قصیدوں میں حملۂ سومنات کا ذکر آتا ہے - دو قصیدوں میں مختصراً فتحِ رے کا ذکر ہے ، جو محمود کے آخری دورانِ عمر کا کارنامہ ہے - مہمِ قنوج سے پیشتر کے کارناموں کا فرخی کے ہاں کوئی ذکر نہیں ، اس لیے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر سلطان کے دربار میں ۴۰۹ھ سے پیشتر ، جو مہمِ قنوج کا سال ہے ، آتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس سنہ کے واقعات اس کے ہاں ملتے ہیں اور قبل کے واقعات نہیں ملتے - یہی وجہ ہے کہ سلطان کے بھائی امیر نصر اور وزیر سابق فضل بن احمد کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا ، کیوں کہ اس کے آنے کے وقت یہ دونوں جلیل المرتبہ اشخاص غزنین میں موجود نہ تھے - فضل بن احمد ۴۰۳ھ میں ہلاک ہوتا ہے - امیر نصر اگرچہ ۴۱۲ھ میں وفات پاتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر اوقات غزنین سے باہر سیستان و خراسان میں رہے ہیں - امیر نصر کے بعد امیر یوسف سپہ سالار خراسان بنایا جاتا ہے -

فتحِ سومنات ۴۱۶ھ ، جس میں فرخی بھی شامل تھا ، سلطان محمود کے نمایاں کارناموں میں سے ہے - شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے دل میں دو آرزوئیں بے حد گدگدی لیتی رہی ہیں : پہلی زیارتِ کعبہ ، دوسری فتحِ سومنات :

---

۱ - دیوان فرخی ، مرتبہ علی عبدالرسولی (صفحہ ۱۲۵) میں 'نسیم از' بجائے 'بسابر' اور حاشیے میں 'سخن بر' - (مرتب)

خدایگان را اندر جهان دو حاجت بود
همیشہ این دو همی خواست ز ایزد داور
یکی کہ جایگہ حج هندوان بکند
دگر کہ حج کند و بوسہ بر دهد بحجر
یکی ازان دو مراد بزرگ حاصل کرد
دگر بعون خدای بزرگ کردہ شمر[۱]

ولہ :

توفیق دہ او را و ببر تا بکند حج
چون کرد بہ شادی و بہ پیروزی بازآر[۲]

معلوم ہوتا ہے کہ سومنات نے سلطانؒ کی توجہ کسی غیر تاریخی روایت کی بنا پر اپنی طرف اور بھی جذب کر لی تھی - وہ روایت یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں تین زبردست بُت تھے : عزیٰ ، لات اور منات ؛ عزیٰ اور لات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں برباد کر دیے گئے۔ لیکن منات کو کافر چرا کر ہندوستان لے آئے - سومنات اور منات کے ناموں میں اشتراک یا سہم کی پیچیدہ دشواریوں نے اس روایت کو سلطان کے دربار میں بہت کچھ فروغ دے دیا۔ اسی روایت کے زیر اثر صاحبِ طبقاتِ ناصری سومنات کا نام منات ظاہر کرتا ہے ، اور فرخی :

ملک همی بہ تبہ کردن منات شتافت
شتاب او همہ از بہر دین بود اکثر[۳]

---

۱ - صفحہ ۱۷ ، دیوان فرخی ، مرتبہ دبیر سیاق - (مرتب)
۲ - صفحہ ۸۲ ، دیوان فرخی ، مرتبہ دبیر سیاق - (مرتب)
۳ - دیوان‌های فرخی مرتبہ علی عبدالرسولی (صفحہ ۱۷) و مرتبہ دبیرسیاق (صفحہ ۶۹) میں یہ مصرع یوں درج ہے :

”شتاب او هم از نیروی بودہ بود مگر“

اور دونوں کے حاشیے میں ”بودو بود اکثر ـ“ (مرتب)

منات و لات و عزیٰ در مکہ سہ بُت بودند
ز دست برد بت آرای آن زمان آزر
ہمہ جہان ہمی آن ہر سہ را پرستیدند
جز آن کسی کہ برو بود از خدای نظر
دو زان پیمبر بشکست و ہر دو را آنروز
فگندہ بود ستان پیش کعبہ پای سپر
منات را ز میان کافران بدزدیدند
بکشور دگر انداختند ازان کشور
بجایگاہی کز روزگار آدم باز
بہ آن زمین نہ نشست و نہ رفت جز کافر
ز بہر آن بت بتخانہ‌ای بنا کردند
بصد ہزار تماثیل و صد ہزار صور
بہ‌بتکدہ در بت را خزانۂ کردند
در آن خزانہ بہ صندوق ہای پیل گہر
گہر خریدند او را ز شہرہا چندان
کہ سیر گشت ز گوہر فروش گوہر خر
برابر سر بت کلہ‌ای فروہشتند
نگار کار بیاقوت و بافتہ بگہر[۱]
بزرگ پختہ یکی جرد ساختند او را
چو کوہ ، آتش و گوہر برو بجای شرر
خراج مملکتی تاج و افسرش بود است
کمینہ چیز وی آن تاج بود و آن افسر
پس آنکہ آنرا کردند سومنات لقب
لقب کہ دید کہ نام اندر و بود مضمر
خبر فگندند اندر جہان کہ از دریا
بُتی برآمد زین گونہ و بدین پیکر

---

۱ ـ محولہ بالا دیوان ہای فرخی میں 'درر' ـ (مرتب)

مدبر همه خلق ست و کردگار جهان
ضیاء دهندهٔ شمس است و نور بخش قمر
بعلم این بود اندر جهان صلاح و فساد
بحکم این بود اندر جهان قضا و قدر
گروه دیگر گفتند ، نی که این بت را
بر آسمان برین بود جایگاه و مقر
کسی نیاورد این را بدین مقام که این
ز آسمان بخودی خود آمده است ایدر
بدین بگوید روز و بدین بگوید شب
بدین بگوید بحر و بدین بگوید بر
چو این ز دریا سر بر زد و بخشک آمد
سجود کردند این را همه نبات و شجر
به شیر خویش مر این را بشست گاو وکنون
بدین تقریب خواند گاوْ را مادر
ز بهر سنگی چندین هزار خلق خدای
بقول دیو فروهشته بر خطر لنگر
فریضه هر روز آن سنگ را بشستندی
بآب گنگ و بشیر و بزعفران و شکر
ز بهر شستن آن بت ز گنگ هر روزی
دو جام آب رسیدی فزون ز ده ساغر
از آب گنگ چه گویم که چند فرسنگ ست
بسومنات بدان جایگاه زلت و شرا

۱ - متذکرہ بالا دیوان‌های فرخی میں اس شعر کے بعد یہ دو شعر ملتے ہیں :
که گرفتن خور صد هزار کودک و مرد
بدو شدندی فریاد خواه و پوزش گر
ز کافران که شدندی بسومنات به حج
همی گسسته نگشتی بره نفر ز نفر (مرتب)

خدای خوانند آن سنگ را همی شمنان
چه بیهده سخن ست این که خاک شان بر سر
برآن[1] نیت که مر آن را بمکه باز برند
بکند و اینک تاما همی برد همبر[2]

فرخی سلطان کے اور سفروں میں بھی ہمراہ رہا ہے :

شنیده ام که همیشه چنان بدی دریا
که بر دو منزل از آواش گوش گردد کر
همی نماید نوبت همی نماید شور[3]
همی برآید موجش برابر محور
سه بار با تو بدریای بیکرانه شدم
نه موج دیدم و نی هیبت و نه شور و شر

سلطان محمود کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت گھمسان کے معرکوں میں فوجوں کا دل بڑھانے کے لیے خود سب سے آگے بڑھتا تھا ۔ چنانچہ فرخی :

---

۱ ۔ محولہ بالا دیوانوں میں اس شعر سے قبل مندرجہ ذیل شعر ملتا ہے :

خدای حکم چنان کرده بود کان بت را
زجای برکند آن شهریار دین پرور

(مرتب)

۲ - یہ ستائیس اشعار اور ان سے قبل کے تین اور آئندہ تین شعر فرخی کے اس مشہور قصیدے سے لیے گئے ہیں جس کا مطلع ہے :

فسانه گشت وکهن شد حدیث اسکندر
سخن نو آر که نو را حلاوتیست دگر

پونے دو سو اشعار کا یہ قصیدہ دیوان فرخی ، مرتبہ علی عبد الرسولی میں صفحہ ۶۷ — ۷۶ اور دیوان فرخی مرتبہ محمد دبیر سیاقی میں صفحہ ۶۶ — ۷۳ پر ملتا ہے ۔ (مرتب)

۳ ۔ مذکورہ بالا دیوانوں میں یہ مصرع اس طرح ملتا ہے :

" همی نماید هیبت ، همی فزاید شور " (مرتب)

من ملک محمود را دیدستم اندر روز[1] جنگ
پیش لشکر خویشتن کرده سپر هنگام کار

فرخی کے قول سے معلوم ہوتا ہے، محمود کے قبضے میں ہاتھیوں کی سب سے زائد تعداد اس کے آخرِ زمانۂ حیات میں سترہ سو پچاس تھی :

بغرض گاہ تو لشکر چنان کہ باز نمود[2]
ہزار و ہفتصد و اند پیل بد بشمار

دیگر :

گفت آن ہزار و ہفصد[3] و پنجاہ کوہ کیست
گفتم ہزار و ہفصد[4] و پنجاہ پیل شاہ

کابل میں جب پندرہ شوال ۴۲۲ھ کو سلطان مسعود آیا اور ہاتھیوں کا جائزہ لیا گیا تو اس وقت سولہ سو ستر ہاتھی عمدہ حالت میں موجود تھے - اس تعداد میں بیمار اور لاغر جانور شریک نہ تھے -

فرخی کا اپنا بیان ہے کہ وہ سلطان محمود کے انعامات کی بدولت ایک امیرانہ اور آسودہ زندگی بسر کر رہا ہے - وہ کہتا ہے :

از فضل خداوند و خداوندیِ سلطان
امروزِ من از دی بہ و امسال من از پار
با ضیعت آبادم[5] و با خانۂ آباد
با نعمت بسیارم و با آلت بسیار
ہم با گلۂ اسپم و ہم با رمۂ میش
ہم با صنمِ چینم و ہم با بتِ تاتار

---

۱ - دیوان ہای محولہ بالا میں "چند -" (مرتب)
۲ - اوپر ذکر کیے گئے دیوان ہای فرخی میں "پار نبود -" (مرتب)
۳ - دیوان‌ہای مذکورہ بالا میں " ہفتصد و اند -" (مرتب)
۴ - دیوان ہای مذکورہ بالا میں "ہفتصد و اند -" (مرتب)
۵ - مذکورہ بالا دیوانوں میں "بسیارم -" (مرتب)

ساز سفرم هست و نوای حضرم هست
اسپان سبک پای و ستوران گزین کار[1]
از ساز مرا خیمه چو کاشانهٔ مانی
وز فرش مرا خانه چو بت خانهٔ فرخار
میران و بزرگان جهان را حسد آید
زین نعمت و زین آلت و زین کار و زین بار
محسود بزرگان شدم از خدمت محمود
خدمت گر محمود چنین باشد هموار[2]

سلطان مسعود کے عہد میں خواجۂ بزرگ احمد بن حسن میمندی کو خطاب کر کے کہتا ہے :

من بنده را که خدمت من بست ساله است
از بهر[3] خدمت تو پدید آمده یسار

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخی کو غزنین کے دربار سے تعلق پیدا کیے اس وقت تک تقریباً بیس سال ہو چکے تھے ۔ خواجہ احمد حسن میمندی ۴۲۴ھ میں وفات پاتے ہیں ۔ اس حساب سے فرخی ۴۰۴ھ میں یا اس کے قریب زمانے میں آیا ہے ۔

خواجہ ابوبکر حصیری فقیہ سے ، جو سلطان محمود کے ندیموں میں ایک امیر کبیر تھا ، فرخی کو بوجہ ہم وطنی خاص رابطہ رہا ہے ۔ اس کے مدحیہ قصیدے میں اپنی پچاس سالہ عمر کا بھی ذکر کرتا ہے :

۱ ۔ دیوانہای محولہ بالا میں :
" اسبان سبکبار و ستوران گرانبار " (مرتب)

۲ ۔ صفحہ ۸۱ ، دیوان مرتبہ محمد دبیر سیاقی ، و صفحہ ۸۲-۸۳ ، مرتبہ علی عبد الرسولی ۔ (مرتب)

۳ ۔ " فر ۔ " (مرتب)

خدمت او کن و مخدوم شو و شاد بزی
من ازین گونہ مگر دیدم سالی پنجاہ

حصیری کا زیادہ عروج محمود کے اواخر ایام میں ہوا ۔ غالباً یہ قصیدہ بھی اسی زمانے کا ہے ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فرخی ۳۷۰ھ سے کچھ پہلے پیدا ہوا تھا ۔

فردوسی

فردوسی کے حالات کے لیے ہمارے پاس قدیم و جدید متعدد ذرائع موجود ہیں لیکن جو زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، حسب ذیل ہیں :

۱۔ شاهنامہ : اس کتاب میں بعض موقعوں پر شاعر کے حالات مل جاتے ہیں ۔

۲۔ دیباچہٴ قدیم شاهنامہ : اس دیباچے کی تاریخ تحریر سے ہم ناواقف ہیں ۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ وہ فردوسی سے دو ایک صدی بعد لکھا گیا ہے ، لیکن اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں ۔

۳۔ نظامی عروضی نے منتصفِ قرنِ ششم میں اپنا چہار مقالہ لکھا ۔ اس میں فردوسی کے حالات بھی مختصراً ملتے ہیں ۔

برخلاف دیگر مشاہیر کے ، فردوسی کے حالات کے متعلق ہر وقت اور ہر زمانے میں تلاش و جستجو رہی اور ہر عصر میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا ۔ اس لحاظ سے فردوسی خوش نصیب کہلائے جانے کا مستحق ہے ، لیکن ایک نقص یہ واقع ہوگیا کہ جہاں دیگر مشاہیر کے حالات سرے سے ملتے ہی نہیں ، وہاں فردوسی کے متعلق واقعات کا ایک انبار موجود ہوگیا ۔ ہر قسم کی روایات ، جھوٹی سچی باتوں ، تاریخ اور افسانے نے ہمارے شاعر کے سوانح کو اپنی جولانیوں کا میدان بنا لیا ۔ اس لیے فردوسی کے واقعہ‌نگار کو اگر کوئی اصلی شکایت ہے تو واقعات کی قلت اور غیرحاضری کے باعث سے نہیں ہے ، بلکہ ان کی افراط اور کثرت تنوع کی بنا پر ، کیونکہ متخالف اور متناقض روایات کا سلسلہ اس کو بےحد پریشان کرتا ہے اور وہ شبلی کے ہم‌زبان ہو کر بول اٹھتا ہے : ”ان متناقض روایتوں میں سے کس پر

اعتبار کیا جائے۔" اس لیے اس کا فرض ہے کہ جب وہ فردوسی کے حالات لکھے تو صحیح کو باطل سے ، حقیقت کو مجاز سے اور تاریخ کو افسانے سے تمیز کرنے کے لیے متقدمین میں سے کوئی نہ کوئی بدرقہ ساتھ لے لے ، تن تنہا اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے میں بھٹک جانے کا احتمال ہے ۔

ان دشواریوں کا احساس کرکے پروفیسر برون نے فردوسی کے حالات لکھتے وقت اپنے لیے دو رہبر تجویز کر لیے؛ پہلا نظامی عروضی سمرقندی اور دوسرا دولت شاہ جو اواخر قرن نہم ہجری کا مصنف ہے۔ صورت حالات میں برون کا انتخاب قریب قریب مناسب اور موزوں تھا لیکن جب برون کی 'تاریخ ادبیات ایران' علامہ شبلی کی نظر سے گزری تو ایک بےمحل اور غیرضروری خفگی کا اظہار فرمایا ۔ ایک خط میں ، جو اپنے دوست مہدی حسن کے نام گیارہ اپریل ۱۹۰۷ع کو لکھا تھا ، فرماتے ہیں :

"بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ برون کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا ۔ نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے ۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سنا ، خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں ۔ مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعہ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارس کے کلام کے برابر نہیں ۔ میں مع سود اور ہرجے کے آپ سے دام لوں گا ۔ لاحول ولا قوۃ اِلا باللہ ۔ شبلی ، گیارہ اپریل ۱۹۰۷ع"

(جلد دوم ، مکاتیب شبلی ، صفحہ ۲۴۲ ، معارف پریس علی گڑھ)

یورپ کے نہایت مشہور فاضل اور مستند مستشرق کی نسبت ، جس نے اپنی تمام عمر فارسی ادبیات ایران کی خدمت میں وقف کر دی اور اپنی تصنیفات اور تالیفات سے تمام فارسی خواں دنیا کو رہین منت

کر دیا ہے ، جس کی فضیلت اور علم کے تمام ایرانی قائل ہیں ، ہندوستان کے معروف ادیب کی یہ رائے پڑھ کر میں ایک سناٹے میں آ گیا ۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ رائے کن مقولوں پر محمول کی جائے ۔ شبلی عالمِ بے بدل سہی لیکن ان کی یہ تنگ چشمی اور کوتاہ نظری ہمیشہ افسوس کے ساتھ یاد کیے جانے کے قابل ہے ۔

اگر 'تاریخ ادبیاتِ ایران' سوقیانہ اور عامیانہ ٹھہری تو میں نہیں کہہ سکتا کہ 'شعرالعجم' کو پھر کون سی صف میں جگہ ملے گی ۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی رائے میں واقعیت اسی درجے تک موجود ہے جس درجے تک ایک شاندار شاعرانہ مبالغے میں ہوتی ہے ۔ مولانا شبلی کا مذاق اتنا صحیح ہے کہ 'سخن دان فارس' مولانا آزاد مرحوم کو برون کی تصنیف سے بہتر مانتے ہیں ۔ انھی مہدی حسن صاحب کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں :

"برون کی کھتونی سے کہیں بہتر ہے" (مکاتیب شبلی، جلد دوم ، صفحہ ۲۳۲)

شعر فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد ۔ شبلی کا اس جوش و ہیجان کے ساتھ برون کو اپنے ناوک بیداد کا ہدف بنانے میں خدا جانے کیا اسرار ہے ۔ برون کی تصنیف میرا دل خوش کن مطالعہ رہی ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے ۔ یہ کتاب اپنے فن میں بے حد مفید اور کار آمد ہے اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس وقت تک اس سے بہتر کوئی تصنیف اس جامعیت کے ساتھ کسی زبان میں موجود نہیں ۔ برون نے جو دشوار گزار اور کٹھن منزل طے کی ہے ، شبلی اس کے مردِ میدان نہیں ہو سکتے ۔

لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ آخر پروفیسر برون نے وہ کون سا قصور کیا تھا جس کے لیے بارگاہ شبلی سے اس قدر مخذول و معتوب بنائے گئے ۔ برون نے اپنی تاریخ ادبیات ایران (صفحہ ۱۴۲ ، طبع ۱۹۰۶ع) میں فردوسی کے شاہنامے کے متعلق الفاظِ ذیل میں رائے دی ہے :

''اس عظیم الشان نظم کی ادبی وقعت و قابلیت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر اندازہ کرنے میں مشرقی و مغربی محققین قریب قریب متفق ہیں ، اس لیے میں بڑے تذبذب اور تردد کا احساس کرکے معترف ہوں کہ میں اس جوش و ہیجان میں شریک ہونے کے ناقابل ہوں ۔ میری رائے میں شاہنامہ سبعہ معلقہ کی مساوات پر بھی نہیں آ سکتی ، اگرچہ یہ مثنوی ممالکِ اسلام میں تمام رزمیہ نظموں کے لیے نمونہ اور مثال بن گئی ہے ۔ میرے خیال میں خوبیِ بیان ، نزاکتِ جذبات اور حسنِ ادا میں یہ فارسی زبان کی بہترین اخلاقی ، افسانوی اور عشقیہ نظموں کی ہم ردیف نہیں بن سکتی ، بے شک ذوق اور وجدان کے معاملوں میں بحث و مباحثہ کرنا ،خصوصاً ادبیات کے شعبے میں تقریباً بےسود ہے ۔ شاہنامہ کی قدرشناسی کے بارے میں غالباً میرا قصور کسی قدر اس قدرتی عجز کی بنا پر بھی ہے جس کی وجہ سے میں بالعموم رزمیہ اشعارکو پسند کرنے سے قاصر ہوں ۔ ان خامیوں سے ہم سب واقف ہیں ، خاص کر موسیقی میں جہاں واگنر کا ایک سرود بعض کو بالکل محو اور وارفتہ بنا دیتا ہے اور بعض کوبالکل بے تعلق چھوڑ دیتا بلکہ الٹا ناخوش کر دیتا ہے ۔''

مولانا شبلی اور پروفیسر برون کے بیانات میں جو فرق ہے اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں ۔ برون نے سبعہ معلقہ کو ترجیح دیتے ہوئے ساتھ ہی نیک نیتی کے ساتھ یہ اقرار بھی کر لیا کہ میں شاہنامے کی حقیقی داد دینے سے معذور ہوں ۔ برون کا دوسرا قول کہ شاہنامے سے بہتر فارسی‌زبان میں اور نظمیں بھی ہیں ، شبلی اس موقعے پر اغماض کر جائیں تو دوسری بات ہے ورنہ نظامی اور فردوسی کے مقابلے میں انھوں نے صاف نظامی کی افضلیت تسلیم کی ہے ۔

ہمارا مشرقی مذاق انتہا پسند واقع ہوا ہے ۔ عطریات میں ہم تیز بو والے عطر پسندکرتے ہیں، کھانوں میں چٹ پٹی یا کثرت سے شیریں اشیاء ہمیں مرغوب ہیں ، لباس میں بھڑک جائز سمجھتے ہیں ۔

اسی طرح تاریخ بھی وہی پسند کرتے ہیں جس میں قصے بھی ہوں ۔ اس کی کبھی پروا نہیں کرتے کہ یہ افسانے ہیں یا واقعے ۔ شبلی نے ملکی مذاق کی تبعیت میں فردوسی کے حالات قلم بند کرتے وقت اسی قسم کے ذرائع تلاش کیے جو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں ۔ نظامی عروضی اور دولت شاہ کے علاوہ مولانا کے پاس سب سے بہتر جو سند ہے وہ دیباچۂ بایسنغری ہے ۔ اگر برون کی تقلید میں پہلے دو مصنفین پر ہی اکتفا کرتے تو شاید مولانا کم ٹھوکریں کھاتے ، لیکن دیباچۂ بایسنغری ان کے مذاق کی چیز تھی ، اس کو دیکھ کر ایسے مفتون ہوئے کہ فردوسی کے حالات میں 'الف' سے لے کر 'یا' تک چند موقعوں کے سوا دیباچہ ہی ان کے پیش نظر رہا اور اس کے زیادہ دلچسپ مقامات کو ، جن کا زیادہ لغو ہونا بھی ظاہر ہے ، دل کھول کر نقل کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ شعرالعجم میں فردوسی کا تاریخی حصہ قریب قریب ناقابل اعتبار ہے ۔ ان چند مراتب کے بعد میں شعرالعجم کا مطالعہ شروع کرتا ہوں :

فردوسی کے نام کے لیے شبلی فرماتے ہیں :

"حسن بن اسحاق بن شرف نام اور فردوسی تخلص تھا ۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے ۔ مجالس المومنین میں بعض مورخوں کے حوالے سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخرالدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا گیا ہے ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۹۳)

خدا جانے مولانا نے صاحب مجالس المومنین کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹا ۔ قاضی صاحب کے اصلی الفاظ یہ ہیں :

"و بعضی گفتہ اند کہ او منصور بن فخرالدین احمد بن مولانا فرخ الفردوسی است ۔"

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک فردوسی کا نام منصور ہے ، نہ اُس کے باپ کا ۔ فردوسی کے نام کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے ۔ تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی ، دولت شاہ کے ہاں حسن بن اسحاق ،

دیباچۂ بایسنغری میں منصور بن احمد ، مجالس المومنین میں منصور بن احمد ہے ۔ لیکن اس باب میں سب سے بہتر مدار علیہ دیباچۂ قدیم شاہنامہ ہے جس کا بیان ہے :

"پدر فردوسی دو فرزند داشت یکی حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی و یکی مسعود ۔"

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :

''وطن میں بھی اختلاف ہے ۔ چہار مقالے میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا ، فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا ۔ (شعرالعجم ، صفحہ ۹۳)

جب ہم چہار مقالے کو اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اس میں صاف لکھا ہے :

''استاد ابوالقاسم فردوسی از دہاقین طوس بود از دیہی که آن دیہہ را باژ خوانند و از ناحیت طبران است ۔"

(طبع یورپ ، صفحہ ۴۷)

اب کہاں طبرستان اور کہاں طبران ۔ علامہ شبلی کو سخت غلطفہمی واقع ہوئی ہے ۔ شمالی ایران کا وہ کوہستانی علاقہ جو بحیرۂ خزر پر واقع ہے ، طبرستان کہلاتا تھا ۔ حدود دامغان سے لے کر کوہستان رے تک سب طبرستان میں شامل تھا اور وسیع معنوں میں اس کا اطلاق دارالمرز یعنی گیلان ، ماژندران ، دیلمان ، رستم دار اور جرجان پر ہوتا تھا ۔ طبران یا طابران طوس کے ایک شہر کا نام ہے ۔ طوس میں دو شہر شامل تھے اور مجموع طوس کہلاتا تھا ۔ پہلے شہر کا نام طبران اور دوسرے شہر کا نام نوقان تھا ۔ ابوالفضل بیہقی کے ہاں طابران کا ذکر آتا ہے :

''پس برین عزم سوی طابران‌طوس رفت ۔"

(صفحہ ۷۵٦ ، طبع کلکتہ)

فرماتے ہیں :

"سنہ ولادت معلوم نہیں ، البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہے ۔ اور

چوں کہ عمر کم از کم اسی برس کی تھی ، جیسا کہ وہ خود
لکھتا ہے :

کنون عمر نزدیک هشتاد شد
اسیدم بہ یک‌بارہ برباد شد

اس لیے سال ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیے ۔“
(شعرالعجم ، صفحہ ۹۳ و ۹۴)

جب چار سو گیارہ سے اسّی تفریق ہونے تو حاصل تفریق ۳۳۱ھ رہے ، نہ ۳۲۹ھ ۔ شعر بالا سے بھلا کون شخص یقین کر سکتا ہے کہ فردوسی نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی ۔ کیا اس عمر کے بعد گلزار عالم کی ہوا کھانا فردوسی کے لیے ممنوع تھا ؟ نہ وہ اپنی عمر ”هشتاد“ بتا رہا ہے بلکہ ”نزدیک هشتاد“ کہتا ہے ۔ شعر مذکورۂ بالا خاتمۂ شاہ نامہ میں آتا ہے اور خاتمہ ۴۰۰ھ میں مرقوم ہوا تھا ۔ چناں چہ یہ شعر :

ز هجرت شده پنج هشتاد بار
که گفتم من این نامهٔ شهریار

مولانا کا یہ عقیدہ تسلیم کرکے کہ فردوسی کا انتقال اسّی برس کی عمر میں ہوا ، اس کا سال ولادت معلوم کرنے کے لیے چار سو میں سے هشتاد کی تفریق کرنی ہوگی جس سے سال ولادت ۳۲۰ھ برآمد ہوتا ہے ، نہ ۳۲۹ھ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۰ھ میں فردوسی اپنی عمر کا اٹھترواں دور طے کر رہا تھا ، اس لیے کہ اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال جب ۳۷۰ھ ہوگا ، وہ شاہ نامہ شروع کرتا ہے ۔ اڑتالیس اور تیس (مدت شاہ نامہ) اٹھتر ہوتے ہیں ۔ ۳۸۸ھ میں (سلطان محمود کی تخت نشینی کا سال) فردوسی چھیاسٹھویں سال میں تھا ، بارہ اور چھیاسٹھ اٹھتر ہوتے ہیں ، جس طرح ۳۸۸ اور بارہ چار سو ہوتے ہیں ۔ فردوسی کی ولادت اس لیے ۳۲۲ھ و ۳۲۳ھ کے درمیان قرار پاتی ہے ۔

اس کے بعد شبلی فردوسی کے باپ کا ایک خواب نقل کرتے ہیں

جس کی تاویل نجیب الدین معتبر بیان کرتا ہے ؛ اصل میں اس قصے کا بانی دیباچۂ بایسنغری ہے ، اس سے پیشتر اس کی سراغ رسانی نہیں کی جا سکتی ۔ یہ دیباچہ ۸۲۹ھ میں تصنیف ہوا ہے ۔ اس امر میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے قصوں کا تعلق فردوسی کی حقیقی تاریخ سے بہت کم ہے ۔ وہ ایسے زمانے کی یادگار ہیں جب فردوسی کے متعلق اصلی تاریخ کی غیرحاضری میں افسانے اور قصص شایع ہونے لگے ہیں ۔

قولہ :

''چوں کہ آبائی پیشہ زمین داری تھا اور جس گاؤں میں سکونت تھی ، خود اس کی ملک میں تھا ، اس لیے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا ۔'' (شعرالعجم ، صفحہ ۹۳)

نظامی کی سند پر عبارتِ بالا نقل کی گئی ہے لیکن اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں :

"فردوسی در آن دیہہ شوکتی تمام داشت ، چنان کہ بدخل آن ضیاع از امثال خود بی نیاز بود ۔" (چہار مقالہ ، صفحہ ۴۷)

نظامی ، فردوسی کو گاؤں کا مقتدر شخص مانتا ہے ، لیکن مولانا نے وہ گاؤں ہی اس کو عنایت کر دیا ۔

فردوسی کی آسودگی اور فارغ البالی کا قصہ میرے خیال میں بے بنیاد معلوم ہوتا ہے اور شاہ نامہ میرے اس خیال کا مؤید ہے ۔ شاعر کئی موقعوں پر اپنی تنگ دستی کا شاکی[1] ہے ۔ چناں چہ :

---

۱ ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا فرماتے ہیں :

''فردوسی خود ہم برفاہ حال و سعۂ عیش خود در جوانی اشارہ کردہ و گفتہ است :

الا ای بر آوردہ چرخ بلند
چہ داری بپیری مرا مستمند

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۱) و دیگر که گنجم وفادار نیست
مر این رنج را کس خریدار نیست
(شاه نامہ ، جلد اول ، صفحہ ۳)

(۲) مرا دخل و خورد ار برابر بدی
زمانہ مرا چون برادر بدی
(شاه نامہ ، جلد چہارم ، صفحہ ۱۲۷ ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۳) نمالدم نمکسود و هیزم نہ جو
نہ چیزی پدید است تا جو درو
بدین تیرگی روز و هول خراج
زمین گشت از برف چون گوی عاج
من اندر چنین روز و چندین نیاز
باندیشہ در گشتہ فکرم دراز
همہ کار ها شد سر اندر لشیب
مگر دست گیرد حسین قتیب
(شاه نامہ ، جلد سوم ، صفحہ ۱۱۲ ، طبع بمبئی ، ۱۲۷۵ھ)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر حسین قتیب سے اپنی زمین کا حاصل ادا کرنے کی استدعا کرتا ہے ۔

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

چو بودم جوان برترم داشتی
بپیری مرا خوار بگذاشتی
بجای عنانم عصا داد سال
پراگندہ شد مال و برگشت حال

اما چنانکہ از همین ابیات و ابیات متعدد دیگر شاهنامہ بخوبی بر میآید شاعر استاد بر اثر نظم شاهنامہ و گذراندن عمر درین راه ثروت خود را از دست داد و در پیری تہی دست و بی چیز شد ۔"
(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم ، صفحہ ۳۶۲)
(مرتب)

قولہ :

''فردوسی نے وطن ہی میں شاہ نامے کی ابتدا کی اور ابومنصور نے جو طوس کا صوبے دار تھا ، اس کی سرپرستی کی ۔ ابومنصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلان خاں مقرر ہوا ۔ چوں کہ شاہنامے کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا ، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی ۔ سلان خاں کے نام حکم پہنچا کہ فردوسی کو دربار میں بھیج دو ۔ فردوسی نے پہلے تو انکار کیا ، لیکن پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لیے راضی ہوگیا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۹۵)

اس عبارت میں کئی امور دامن گیر تامل ہیں : شبلی اس عامل طوس کا نام یہاں ابومنصور لکھتے ہیں لیکن صفحہ ۱۱۵ پر منصور بن محمد بتاتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی توجیہ بھی بیان نہیں کرتے ۔ فردوسی خود اس کا نام نہیں لیتا ۔ ٹرنر میکن اپنے شاہنامے کی سرخی میں منصور بن محمد لکھتا ہے ۔ یہ قول کہ ابومنصور کے بعد سلان خاں عامل طوس ہوا ، غلط معلوم ہوتا ہے ۔ یہ منصور بن محمد یا ابومنصور یا مہترگردن فراز (جیسا کہ فردوسی لکھتا ہے) اگر واقع میں عامل طوس تھا تو ۳۷۰ھ کے قرب و جوار میں ، جب کہ شاہنامے کی ابتدائی منازل طے ہو رہی تھیں ، وفات پا چکا ہے ۔ ان ایام میں طوس یا خراسان کا آل غزنہ سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور خراسان ابوعلی سیمجوری ، حسام الدولہ تاش اور فائق کے حملوں کی جولان گاہ بن رہا تھا ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ منصور بن محمد سیمجوریوں کا کوئی ملازم یا ماتحت ہوگا ۔ اسی وجہ سے فردوسی نے اس کا نام جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام منسوب کیا ، شاہنامے سے خارج کر دیا ۔ سیمجوریوں اور غزنویوں کی رقابت سب کو معلوم ہے اور خراسان کے لیے ان کی زور آزمائیاں تاریخ میں مسطور ہیں ۔ جب میں نے سلان خاں کا نام پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ یہ پٹھانوں کا سا نام غزنوی تاریخ میں کہاں سے نکل آیا ۔ دیباچہ بایسنغری میں رجوع

کرنے سے معلوم ہوا کہ ارسلان خاں ہے ، لیکن آخری حصہ پھر بھی کھٹکتا رہا ، کیوں کہ آن ایام میں خان کا استعمال صرف شاہان ترک کے نام سے تعلق رکھتا تھا ۔ آخر تاریخ میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ارسلان خاں اصل میں ارسلان جاذب ہے جو سلطان محمود کا غلام اور مشہور و معروف جنرل تھا ۔ یہ شخص بقول عتبی ۳۸۹ھ میں طوس کا حاکم مقرر ہوا ۔ ۳۷۰ھ اور ۳۸۹ھ کے درمیان طوس پر خدا جانے کتنے انقلاب آئے ہیں اور کتنے عامل بدلے گئے ہیں ۔ فردوسی کو دربار میں طلب کرنا قطعاً غلط ہے ۔ شیخ محمد معشوق طوسی کا تعلق فردوسی کی روایات میں قدیمی معلوم نہیں ہوتا اور دیباچۂ بایسنغری کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو زمانۂ درویش پرستی کا عنفوان شباب ہے ، لیکن وہ تاریخی بزرگ ہیں ۔ مصنف کشف المحجوب اپنے معاصرین میں ان کا ذکر کرتے ہیں ۔

نفحات الانس (صفحہ ۲۸۳ ، نول کشور، ۱۹۰۵ع) میں جامی انھیں ''عقلاے مجانین'' میں شمار کرتے ہیں اور شیخ ابوسعید ابوالخیر (متولد ۳۵۷ھ ۔ متوفی ۴۵۱ھ) کا ہم‌عصر بتاتے ہیں ۔ ان بیانات کی رو سے انھیں فردوسی کا معاصر خورد مانا جا سکتا ہے ۔

قولہ : ''دربار کا میر منشی ربیع الدین (کذا) دبیر تھا ۔ اس نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامے کی تصنیف کا خیال تھا لیکن دربار کے شعرا میں سے کسی نے اس کی ہامی نہیں بھری ۔ اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعراے دربار کی آبرو خاک میں مل جائے گی ۔ عنصری نے کہا ، بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کو الٹا پھیر دیجیے ، لیکن اس کی اور تدبیر کرنی چاہیے ۔ چناں چہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہے ۔ سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا لیکن اس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا ، اس لیے حقیقتِ واقعہ سے آپ کو اطلاع دے دی

گئی ۔ فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو ۔ اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکررنجی پیدا ہوئی ۔ عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا ، بدیع الدین ہی کے مشورے سے لکھا تھا ۔ اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجیے ، عنصری نے جو لکھا تھا خود غرضی سے لکھا تھا ۔ فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں ۔ یہ اشعار بھی خط میں درج کیے :

بگوش از سروشم بسی مژده هاست
دلم گنج گوهر زبان اژدهاست
چه سنجد بمیزان من عنصری
گیا چون کشد پیش گابن سری

(شعر العجم ، صفحہ ۹۵ ، ۹۶)

اس قصے میں رودکی اور عنصری کا نام دیباچۂ بایسنغری میں ہر مقام پر ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے ، حتٰی کہ ابیات مذکورۂ بالا کے ایک تیسرے شعر میں ، جس کو مولانا نے دانستہ ترک کر دیا ، رودکی کا نام یوں لیا گیا ہے :

ز بیدانشی باشد و کودکی
که رای فزونی زند رودکی

یعنی اس سازش میں رودکی اور عنصری دونوں شریک و سہیم ہیں ۔ مولانا نے جیسا کہ حاشیے میں ارشاد کرتے ہیں (دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ (کذا) میں مر چکا تھا) اس کا نام خارج کر دیا ۔ بعض اوقات کسی روایت کی تصدیق یا تردید اور اس کے ضعف و ثقاہت کی شناخت تاریخی تائید کی غیر حاضری میں اسی قصے میں نکل آتی ہے جس سے ایک محقق کو اپنی تحقیق میں بڑی امداد ملتی ہے ، اس لیے ہر مورخ اپنا فرض جانتا ہے کہ پرانی روایات کو جوں کا توں ، جیسی

اس تک پہنچی ہیں ، حوالۂ قلم کر دے اور اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل ، ترمیم و اضافہ نہ کرے ۔ اس قصے کے راوی نے جس کو تاریخ کے فن سے کوئی دل‌چسپی معلوم نہیں ہوتی ، غالباً خاقانی کا یہ شعر ذہن میں رکھ کر کہ :

شاعر ساحر منم ملک معانی مراست
ریزہ خور خوان من رودکی و عنصری؛

یہ قیاس مترتب کیا کہ ان دونوں شاعروں کا ایک زمانہ ہے اور فردوسی کی برتری کا سکہ بٹھانے کے لیے اس لغو قصے کی بنیاد ڈالی ۔ حالانکہ رودکی و عنصری میں پوری ایک صدی کا فاصلہ ہے ۔ رودکی ۳۲۹ھ میں وفات پاتا ہے اور عنصری ۴۳۱ھ میں ۔ مولانا شبلی کو قصہ پسند آیا لیکن رودکی کا نام تاریخی مشکلات کی بنا پر کھٹکا ، چناں‌چہ اسے قلم زد کر دیا ۔ شبلی نے اس ترمیم سے تنقید کو ان افسانوں کی تردید اور تکذیب سے عاجز کر دیا ہے ۔ انھوں نے مرقومہ بالا دونوں شعروں کو فردوسی کی ٹکسال کا مان لیا ۔ آخر اس تیسرے شعر نے کیا قصور کیا تھا ۔ وہ بھی اسی مصنف کا ہے جس مصنف کے پہلے دو شعر ہیں ۔ فردوسی اپنی خواہش سے غزنین آیا ہے ، نہ سلطان محمود کی طلبی پر ۔ اس لیے قصۂ ہذا کی اس کے واقعات زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہو سکتی ۔ محمود کے دبیروں میں بدیع الدین کسی دبیر کا نام نہیں اور نہ 'الدین' پر ختم ہونے والے نام اس عہد میں رائج تھے ۔ ان کا رواج دیر میں ہوتا ہے ۔

قولہ : "حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری ، فرخی اور عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور بادہ و جام کا دور چل رہا تھا ۔ فردوسی ادھر جا نکلا ۔ حریفوں نے اس کو مخلِ صحبت سمجھ کر روکنا چاہا ۔ ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آ کر چلا جائے گا ۔ عنصری نے کہا یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہے ۔ آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طرح کیا جائے ، سب اس پر طبع آزمائی کریں ۔ اگر یہ

بھی مصرع لگائے تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ خود شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا ۔ عنصری نے ابتدا کی اور کہا :

چون عارض تو ماہ نباشد روشن

فرخی نے کہا : ع مانند رخت گل نبود در گلشن
عسجدی نے کہا : ع

مژگانت ھمی گزر کند از جوشن

قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا ۔
فردوسی نے برجستہ کہا : ع

مانند سنان گیو در جنگ پشن

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی ، فردوسی نے تفصیل بیان کی ۔ اُس وقت تو سب نے اس کو شریک صحبت کر لیا لیکن رشک اور حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہے ۔ سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے ۔"
(شعر العجم ، صفحہ ۹٦ ، ۹۷)

اس قصے کا اصلی راوی صاحب دیباچہ' قدیم ہے لیکن اس کے ہاں وہ حصہ جو حسد اور سازش سے تعلق رکھتا ہے ، غیر حاضر ہے ۔ پشن کسی پہلوان کا نام نہیں جیسا کہ برون اور شبلی کا خیال ہے ۔ وہ ایک مقام کا نام ہے جہاں ایرانی لشکر پر تورانیوں نے شب خون مارا تھا ۔ شاہنامے میں اس کے متعلق حسب ذیل روایت ہے :

ایرانی لشکر بسرکردگیِ طوس بن نوذر کاسہ رود کے پاس پہنچ جاتا ہے ۔ پہاڑی گھاٹی میں ، جہاں سے راستہ جاتا ہے ، تورانیوں نے ناگہانی حملوں سے تحفظ کی خاطر ہیزم کا انبار لگا دیا تھا ۔ ایرانی لشکر اس انبار میں آگ لگا کر بہ‌خیریت غنیم کے علاقے میں گھس جاتا ہے ۔ سامنے ایک حاکم نشین قلعہ ہے جس کے حاکم کا نام تژاو ہے ۔ تژاو دوسرے روز بیژن سے جنگ کر کے فرار ہو جاتا ہے ۔ اس کی

بیوی اسپنوی گرفتار کر لی جاتی ہے۔ ایرانیوں کی آمد کی اطلاع افراسیاب کو ملتی ہے اور تورانی لشکر بہ سپہ سالاری پیران ویسہ بہت جلد تیار ہو کر مقابلے کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ جاسوسوں کے ذریعے سے پیران کو اطلاع ملتی ہے کہ ایرانی شرابیں پی پی کر مست و غافل پڑے ہیں۔ طلایہ اور چوکی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ رات کو پیران مع اپنی تمام فوج کے بہ قصد شب خون آتا ہے۔ ایرانیوں کو سوتا دیکھ کر حملہ کر دیتا ہے اور قتل عام ایک بڑے پیمانے پر شروع ہو جاتا ہے۔ گیو اپنے خیمے میں بیدار ہے؛ ہتھیار لگا اور گھوڑے پر سوار ہو کر سپہدار یعنی طوس کے خیمے میں آ کر اس کو بیدار کرتا ہے۔ پھر اپنے باپ گودرز کو جا کر جگاتا ہے۔ ادھر بیژن کو جو مست پڑا تھا ہشیار کرتا ہے۔ اتنے عرصے میں تورانیوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ تمام ایرانی فوج کٹ چکی تھی اور معدودے چند متنفس بچے تھے۔ الغرض یہی مناسب معلوم ہوا کہ فرار اختیار کیا جائے۔ خیمہ وخرگاہ، باروبنہ چھوڑ کر بھاگے۔ تورانیوں نے تعاقب کیا اور فراریوں نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر جانیں بچائیں۔ یہ حالات ہیں اس بہت مشہور جنگ پشن کے۔ میرا مقصد اس جملۂ معترضہ سے یہی ہے کہ ہم نے جنگ پشن کے حالات دیکھ لیے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا موقع نظر نہیں آتا جس میں سنان گیو کی کوئی قابل ستایش و تحسین کار گزاری دیکھی جاتی جس کی بنا پر مصرع بالا میں کوئی خوش گوار تلمیح قائم ہوتی۔ یہ چند نفوس جن میں گیو بھی شامل ہے، بہ دشواری تمام اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں۔ نہ گیو کو اس جنگ میں کسی فخریہ کارنامے کا موقع ملا ہے اور نہ اس نے کبھی اس پر فخر کیا ہے۔ اس کے برخلاف ہومان تورانی، جب کہ گیو اور طوس سے میدان جنگ میں ایک موقعے پر مناظرے میں مصروف ہے، فخریہ کہتا ہے:

تو دانی کہ من روز جنگ پشن   چہ کشتم بدان رزمگاہ کشن

(شاہ نامہ، جلد دوم، صفحہ ۲۷۲، طبع ۱۲۷۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جنگ پشن ایرانیوں کے لیے ایک شرم ناک ہزیمت تھی اور مصرع بالا میں گیو کے نیزے کے لیے جو ادعا کیا گیا ہے ، بالکل بے حقیقت ہے - میرا خیال ہے کہ یہ مصرع کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہے جو بوجہ شہرت محض اس جنگ کے نام سے واقف ہے - لیکن اس کی اصلی کیفیت اور ضمنی واقعات سے بالکل بے خبر ہے - پشن کے متعلق شاہنامے میں کئی تلمیحیں موجود ہیں - یہ ادعا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ 'شین' کے التزام کے ساتھ کوئی اور شگفتہ قافیہ موجود نہیں - کشن (بفتح اول و ثانی بمعنی انبوہ بسیار) پشن سے زیادہ مشہور اور شگفتہ قافیہ موجود ہے اور غزنوی دور میں ہر شاعر نے اس کا استعمال کیا ہے - فردوسی :

یکی سرو بد سبز و برگش کشن
بر و شاخ چون رزمگاہ پشن

اوزان رباعی میں اس قدر گنجائش ہے کہ اسباب اور اوتاد ہم قافیہ ہو سکتے ہیں ، اسی وجہ سے جوشن (جس میں دو سبب خفیف ہیں) اور پشن (جو وتد مجموع ہے) قافیہ بن گئے - اگر اس قصے کے ہیرو واقعی عنصری و فرخی ہیں تو اُن کے لیے نہایت آسان تھا کہ اپنے قوافی کو بحر متقارب سالم یا بحر ہزج سالم اور متعدد اور مشہور بحروں میں لا کر جن کے قافیے صرف اسباب پر ختم ہوتے اور اوتاد کا استعمال ناممکن ہوتا ، فردوسی اور اس کی بے محل مداخلت سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھتے - ایسے بڑے پائے کے شعرا سے اس ادنلی سے نکتے کی فروگذاشت ناقابل معافی ہے -

فردوسی غزنین میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت پہنچتا ہے - کیا ایسے ابتدائی زمانے میں یہ مشہور شعرا عنصری ، فرخی اور عسجدی ، جن میں سے ہر ایک فن شعر کا کامل اُستاد ہے ، شہرت حاصل کر کے محمود کے دربار سے تعلق رکھتے تھے - اوروں کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ، لیکن فرخی کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں اس

عہد سے پندرہ سولہ سال بعد آیا ہے ، جیسا کہ فرخی کے حالات میں گزارش ہوچکا ہے ۔ ان وجوہ کی بنا پر مجھ کو اس قصے کے تسلیم کرنے سے انکار ہے ۔ مغربی تنقید بھی اس کے تسلیم کرنے سے منکر ہے ۔

اس کے بعد شبلی سلطان محمود کے ندیم ماھک کا قصہ قلم‌بند کرتے ہیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ ماھک کی معرفت فردوسی دربار سلطانی میں رسائی حاصل کرتا ہے ۔ لیکن اس قصے کا راوی بھی صاف دیباچۂ بایسنغری ہے اور اسی فہرست میں داخل ہونا چاہیے جس میں رودکی اور عنصری والا قصہ درج ہوا ہے ۔

اس کے بعد شبلی فرماتے ہیں :

''یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمود نے شاہ نامے کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر، یعنی عنصری ، فرخی ، زینی ، عسجدی ، منجیک چنگزن ، خرمی ، ابوبکر اسکاف ترمذی اس کام کے لیے انتخاب ہوئے تھے ۔'' (شعرالعجم ، صفحہ ۹۷ ، ۹۸)

شاہ نامے کے لیے سات شعرا کا سلطان کے حکم سے مامور ہونے کا قصہ سب سے پہلے دیباچۂ بایسنغری میں ملتا ہے ؛ اس کی مجعولیت کے لیے یہی کافی دلیل ہے ۔ شعرا کے نام لکھنے میں شبلی خاص بے پروائی سے کام لیتے ہیں ۔ ان ناموں میں نمبر سوم زینی ہے ، اس نام کا کوئی شاعر نہیں گزرا ۔ ان کی مراد غالباً زینتی سے تھی ۔ محمد عوفی اس کو زینتی علوی محمودی لکھتا ہے ۔ نیز نمبر پنجم منجیک ، اس کا پورا نام ابوالحسن علی الترمذی ہے ۔ عوفی اس کو شعرائے آل سامان میں داخل کرتا اور ابوالمظفر طاہر بن الفضل کا مادح بیان کرتا ہے ۔ طاہر ۳۷۷ھ میں وفات پاتا ہے ۔ نمبر ششم خرمی ، اس شاعر کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا ۔ عوفی اور نظامی اس سے ناواقف ہیں ، نمبر ہفتم ابوبکر اسکاف ترمذی ، تذکروں میں کسی ابوبکر اسکاف کا سراغ نہیں چلتا ۔ نفحات‌الانس میں البتہ جامی ایک بزرگ ابوبکر اسکاف کا ذکر کرتے ہیں ۔ دیباچۂ بایسنغری میں ابوبکر اسکاف کے بجائے ابوحنیفہ اسکاف ملتا ہے ۔ عوفی نے شعرائے آل ساجوق

میں اس کا شمار کیا ہے اور اس کا زمانہ عہد سلطان سنجر قائم کیا ہے ۔ لیکن عوفی کو اس بارے میں سہو ہوا ہے ۔ ابوحنیفہ اسکاف سلطان ابراہیم غزنوی کا مداح ہے ۔ ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ میں اس کی بہت تعریف کرتا ہے ۔ وہ فضل و ادب اور علمیت میں بے مثال تھا ۔ شعر اس کی کمترین صنعت ہے ۔ جب ابوالفضل سے اس کی پہلی ملاقات امیر فرخ زاد (۴۴۳ھ و ۴۵۰ھ) کے عہد میں ہوئی ہے ، ابوحنیفہ اس وقت مفت درس دیا کرتا تھا ۔ ابوالفضل کی فرمایش سے اس نے تین قصیدے لکھے جو تاریخ بیہقی صفحہ ۳۳۵ - ۳۴۴ ، صفحہ ۴۷۰-۴۷۶ اور صفحہ ۷۹۷-۸۰۱ پر درج ہیں ۔ سلطان ابراہیم نے اپنے حبس کے ایام میں ابوحنیفہ کی بعض تصنیفات دیکھیں ، ان کی عبارت اور خط کو بہت پسند کیا ، جب تخت نشین ہوا ، ابو حنیفہ کو بلایا اور اس کے قصیدے سنے اور خوب خوب انعام دیے اور تربیت کی[1] ۔ بعد میں منصب اشراف ترمک اس کے سپرد ہوا[2] ۔

قولہ : ”فردوسی اس وقت چپکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی ۔ رات کو جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا: ”عنصری سے پہلے شعرا نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہے ، چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے ، جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں ۔“ یہ کہہ کر نظم حوالے کی ۔ سرنامہ تھا :

کنون خورد باید مئی خوش گوار
کہ می بوی مشک آرد از جوئبار
ھوا پُرخروش و زمین پُر ز جوش
خنک آن کہ دل شاد دارد بنوش

۱۔ تاریخ بیہقی ، طبع کلکتہ ، صفحہ ۴۷۰ ۔ (مرتب)
۲۔ صفحہ ۷۹۷ ، تاریخ بیہقی ، طبع کلکتہ ۔ (مرتب)

همہ بوستان زیر برگ گل است
همہ کوہ پُر لالہ و سنبل است

(صفحہ ۹۲ ، طبع سوم)

دیباچے میں نہ کھانا کھانے کا ذکر ہے اور نہ عنصری سے پہلے داستانِ رستم و سہراب کی نظم کا ۔ اس کی عبارت ہے :

''ابوالقاسم باندک زمان داستان رستم و اسفندیار نظم کرد ۔ چنان چہ ماھک واقف نبود ابتدایش آن بود :

کنون خورد باید مئی خوش‌گوار
کہ می بوی مشک آرد از جویبار

شبی با ماھک گفت سیرالملوک را پیشتر نظم دادہ اند و صنعت سخن‌وری آنرا اساس محکم نہادہ ، ماھک گفت ممکن نباشد ۔''

لطف یہ ہے کہ مولانا رستم و سہراب کی داستان کا ذکر کرتے ہیں اور شعر داستان رستم و اسفندیار کے نقل کر رہے ہیں ۔ بہر حال دیباچے کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو فردوسی نے سلطان محمود کو پیش کی ، داستان رستم و اسفندیار ہے ، نہ داستان رستم و سہراب ۔ دیباچۂ قدیم اس سلسلے میں داستان سیاوُش کا ذکر کرتا ہے ۔ لیکن شاہ نامے کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو سلطان محمود کو پیش کی گئی ہے ، داستان جنگ کیخسرو ہے ۔ شاہ نامے میں سب سے پہلا موقع یہی ہے جہاں سلطان محمود کے مدحیہ اشعار پائے جاتے ہیں ۔ ان کی ابتدا ہے :

ز یزدان ابر شاہ باد آفرین
کہ نازد بدو تخت و تاج و نگین

خداوند تاج و خداوند گنج
خداوند شمشیر و خفتان و رنج

کہ گنجش ز بخشش بنالد ھمی
بزرگی ز نامش ببالد ھمی

ز دریا بدریا سپاه ویست
جهان زیر فرّ کلاه ویست

بگیتی بکان اندرون زر نماند
که منشور بخشش ورا بر نخواند

ز دشمن ستاند رساند بدوست
خداوند پیروزگر یار اوست

ببزم اندرون گنج پراگند
چو رزم آیدش شیر و پیل افکند

چو او مرز گیرد به شمشیر تیز
برانگیزد اندر جهان رستخیز

ازآن دست و آن تیغ گوهر فشان
ز گیتی نجوید همی جز نشان

که در بزم دریاش خواند سپهر
برزم اندرون شیر خورشید چهر

گواهی دهد در جهان آب و خاک
همان بر فلک چشمهٔ آفتاب

که چون او نبود است شاهی بجنگ
نه در بخشش و کوشش و نام و ننگ

اگر مهر با کین نیامیزدی
ستاره ز خشمش فروریزدی

تنش زورمند است و چندین سپاه
که اندر میان باد را نیست راه

پس لشکرش هفت صد ژنده پیل
خدای جهان یاور و جبرئیل

همی باژ خواهد ز هر مهتری
ز هر نام داری و هر کشوری

اگر باژ ندهند کشور دهند
همان گنج و هم تخت و افسر دهند
کہ یارد گذشتن ز پیمان اوی
دگر سر کشیدن ز فرمان اوی
کہ در بزم گیتی بدو روشن است
برزم اندرون شیر در جوشن است
ابو القاسم آن شہریار دلیر
کجا گور بستاند از چنگ شیر
جہاں‌دار محمود کاندر نبرد
سرِ سرکشان اندر آرد بگرد

(شاہنامہ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۴۴ بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اس مدح کے بعد فردوسی گویا ہے کہ میں نے یہ نظم اس مقصد سے لکھی ہے تا کہ ایام پیری میں اس سے نفع حاصل کروں ، لیکن مجھ کو کوئی قدردان سرپرست نہیں ملا ۔ میں منتظر رہا حتیٰ کہ اس امید اور انتظار میں عمر کے پینسٹھ سال میں نے فکر ، افلاس اور پریشانی میں گزار دیے ۔ جب پینسٹھ سے گزر کر میں چھیاسٹھویں سال میں لگا ، ضعیفی نے عصا میرے ہاتھ میں دے دیا ۔ میری سرخ و سفید رنگت زعفرانی ہوگئی ، بڑھاپے نے کمر جھکا دی ، آنکھوں کی بصارت ضعیف ہوگئی ، تب میں نے ایک آواز سنی کہ فریدون کی تلاش کون کر رہا تھا ، وہ دیکھو فریدون زندہ ہوگیا اور زمین و زمانہ اس کے غلام بن گئے ۔ (یہ تلمیح ہے سلطان محمود کی تخت نشینی کی طرف) اس نے اپنی فیاضی اور انصاف سے دنیا کو مسخر کر لیا ہے ۔ اس کی تاریخ کے آثار اور علامات سب طرف نمایاں ہیں ۔ جب میں نے یہ آواز سنی، اپنی کتاب اس کے نام پر منسوب کردی ۔ اور توقع کرتا ہوں کہ پادشاہ اس ضعیفی کے عالم میں میری دستگیری کرے ۔ اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں کہ یہ کتاب پادشاہ کے نام پر ختم کر دوں ۔ اسی تمہید میں ذیل کے شعر آتے ہیں :

جو پیکار کیخسرو آمد پدید
ز من جادویہا بباید شنید
بدین داستان در ببارم همی
بسنگ اندرون لالہ کارم همی
کنون خطبۂ یافتم زین نشان
کہ مغز سخن یافتم بیش ازان

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہنامہ ، فردوسی اس وقت سلطان کے نام معنون کر چکا ہے ، تب ہی تو فخریہ لہجے میں کہتا ہے کہ جنگ کیخسرو کے دوران میں تم میری سحر کاریاں دیکھنا ، اس داستان میں موتیوں کا مینہ برسا دوں گا اور پتھر میں لالہ آگا کر ناممکن کو ممکن کر دکھاؤں گا ۔ میرے دیباچے کے لیے ایسا عالی شان مخاطب مل گیا ہے جس سے میرے سخن گستری کے مغز میں بیشی ہو گئی ۔

شاہنامے سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ داستان رستم و سہراب اور داستان سیاوش ، طوس میں لکھی گئی تھیں ۔ موخرالذکر داستان فردوسی نے اپنی عمر کے سال پنجاہ و ہشتم یا ۳۸۰ھ میں لکھی ہے ۔ داستان رستم و اسفندیار اگرچہ غزنین میں لکھی گئی ہے اور اس میں سلطان کی طرف تلمیح بھی موجود ہے ، تاہم اس کو اوّلیت کا فخر حاصل نہیں ۔ اس کے مقابلے میں داستان سکندر بہتر استحقاق رکھتی ہے ۔

قولہ : ''فردوسی نے کہا "طوس کا باشندہ ہوں ۔" محمود نے اس کے حالات پوچھے اور اسی سلسلے میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے اور کس نے آباد کیا ؟ فردوسی نے تفصیل سے تمام واقعات بیان کیے ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۹۹)

گویا یہ باتیں سلطان اور فردوسی میں داستان اسفندیار سنانے کے بعد ہو رہی ہیں ۔ مولانا طوس کی آبادی کے بیانات کی طرف ایک نگاہ

غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر گئے، ان کی تفصیل دیباچۂ بایسنغری میں حسب ذیل ہے :

''جب کیخسرو نے اپنے باپ سیاوش کا انتقام لینے کے لیے طوس بن نوذر کو افراسیاب سے جنگ کے لیے بھیجا تو ہدایت کر دی کہ کلات کے راستے سے توران نہ جانا ، کیوں کہ وہاں میرا ایک بھائی فرود رہتا ہے ۔ وہ سودائی مزاج ہے : ایسا نہ ہو کہ تجھ سے لڑ مرے ۔ طوس اس ہدایت پر تعمیل کا اقرار کر کے رخصت ہوا ۔ جب تورانی سرحد آئی تو کیخسرو کی ممانعت کے باوجود اس نے کلات ہی کا راستہ اختیار کیا ۔ بعد میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ طوس اور فرود میں جنگ ہوئی اور فرود مارا گیا ۔ کیخسرو فرود کے قتل کی خبر معلوم کر کے بہت برافروختہ ہوا کہ میں نے طوس کو باپ کے خون کا بدلہ لینے بھیجا تھا ، نہ بھائی کو قتل کرانے ۔ جب طوس توران سے لوٹا ، ندامت کی وجہ سے کیخسرو کے پاس نہیں گیا بلکہ خراسان میں ٹھہر گیا اور وہاں کسی قصبے کو شہر کی صورت میں آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام شہر طوس رکھا ۔''

اس قصے کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود سے بیان کیا جس سے تاریخ میں فردوسی کی بلندپائگی کا نقش سلطان کے دل پر جم گیا ۔ میں اس روایت کے پچھلے حصے سے یہاں بحث کرتا ہوں ۔ اتفاق سے شاہنامے میں یہ تمام قصہ موجود ہے ؛ شاہ نامے میں لکھا ہے کہ جب کیخسرو کو اس کے بھائی فرود کے مارے جانے کا پرچہ گزرا تو اس نے اپنے چچا فریبرز کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا اور طوس کو معزول کر کے واپس آنے کا حکم دیا ۔ طوس لشکر کی کمان فریبرز کے سپرد کر کے سیدھا کیخسرو کی خدمت میں پہنچ گیا ۔ چنانچہ شاہ نامہ :

برفت و ببرد آنکہ بد نوذری
سواران جنگ آور لشکری

بره بر نکرد ایچ گوله درنگ
بنزدیک شاه آمد از دشت جنگ
زمین را ببوسید در پیش شاه
نکرد ایچ خسرو بدو در نگاه
بدشنام بکشاد لب شهریار
بر آن انجمن طوس را کرد خوار

خسرو نے بڑی لعنت و سرزنش کے بعد طوس بن نوذر کو اس کے اپنے گھر میں قید کیے جانے کا حکم دیا جس کو خدائے سخن اپنے برجستہ اور زور دار الفاظ میں یوں ادا کرتا ہے :

نژاد منوچہر و ریش سفید
ترا داد بر زندگانی امید
وگرنہ بفرمود می تا سرت
بد اندیش کردی جدا از برت
برو جاودان خانہ زندان تست
ہمان گوہر بد نگہبان تست
ز پیشش براند و بفرمود بند
بہ بند از دلش بیخ شادی بکند

(شاہ نامہ ، صفحہ ۷۱۳ ، جلد دوم ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اب ظاہر ہے کہ شاہ نامے کے بیان کے مطابق طوس بجائے خراسان میں ٹھہرنے اور طوس آباد کرنے کے سیدھا کیخسرو کے پاس جاتا ہے اور قید کردیا جاتا ہے ۔ شاہ نامے سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ شہر طوس ، طوس بن نوذر سے بہت پہلے آباد تھا ۔ گنج عروس کیکاؤس نے طوس میں ہی رکھا تھا ۔ کیخسرو نے یہ خزانہ خلع سلطنت کے وقت گیو ، زال اور رستم پر تقسیم کردیا ۔ شاہ‌نامہ :

دگر گنج کش خواندندی عروس
کہ آگند کاؤس در شہر طوس

بگودرز فرمود کانرا بہبخش
بگیو و بزال و خداوند رخش

سام نے جو رستم پہلوان کا دادا ہے ، اسی طوس میں ایک اژدھا مارا تھا ۔ داستان رستم و اسفندیار میں رستم اپنے اسلاف کی ستایش کے وقت سام کے ذکر میں گویا ہے :

نخستین بطوس اندرون اژدھا
کہ از چنگ اوکس نگشتی رھا
بہدریا نہنگ و بہخشکی پلنگ
دمش نرم کردی بکہ خارہ سنگ
بکشت آنچنان اژدھا را بگرز
جہان گفت او را زھی فروبرز

شہر طوس کے بانی کی حیثیت سے ہمارے ہاں عام طور پر طوس بن نوذر کا نام لیا جاتا ہے اور یہ روایت دیباچہ بایسنغری سے قدیم ہے ۔ پہلوی روایات بھی اسی عقیدے کی مؤید ہیں ، جیسا کہ "شتروی ھای ایران" (شہرھاے ایران) سے معلوم ہوتا ہے ۔ میرا مطلب یہاں اس روایت کے صحت و سقم سے نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اس قصے کا فردوسی کی طرف منسوب کیا جانا غلط ہے ۔ شبلی فرماتے ہیں :

"اس زمانے میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ محمود نے فردوسی سے فرمایش کی کہ ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں کچھ کہے ۔ فردوسی نے برجستہ کہا :

مست است بُتا چشم تو و تیر بدست
بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست
کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

(شعرالعجم ، صفحہ ۹۹)

عنصری اور فرخی کے ذکر میں اس خاص موضوع پر مولانا

کافی لکھ چکے تھے ۔ اگر اس موقع پر ایاز کے قصے کو نہ دہراتے تو کرم کرتے : ع

که حلوا چو یکبار خوردند و بس

علامہ شبلی نے شعرالعجم کے ورق کے ورق فردوسی کے حالات سے بھر دیے ، لیکن افسوس ہے کہ ان کو ادنٰی سی بات اب تک معلوم نہ ہوئی کہ آخر فردوسی سلطان محمود کے دربار میں کون سے زمانے میں آیا ۔ اگر اس خفیف سے واقعے کی تعیین کرلی جاتی تو کئی موقعوں پر دیباچے کی لغویات پر اعتبار کرنے سے بچ جاتے اور ایسا آسان شکار نہ بن جاتے ۔ میں پھر گزارش کرتا ہوں کہ فردوسی سلطان محمود کے دربار میں اس کے اورنگ نشین ہوتے ہی آ جاتا ہے ، یعنی ۳۸۸ھ میں غزنین آ چکا ہے ۔ اس سال سے ۳۹۴ھ تک سلطان محمود سے اس کے خوش گوار تعلقات قائم رہتے ہیں ۔ اس کے بعد کوئی واسطہ نہیں رہتا ۔ اب میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ ان ایام میں کیا ایاز کے ارغواں زار پر سبزۂ خط نکل آیا تھا ؟ اگر ایسا ہے تو کم سے کم ۳۸۸ھ میں اس کی عمر اُنیس سال کی ہونی چاہیے ۔ یہ بھی یاد رہے کہ مولانا ، فرخی کو بھی ایاز کے تیر نگاہ کا زخمی بتا چکے ہیں جس کی پاداش میں شاعر کا دربار بند ہوتا ہے (شعرالعجم ، صفحہ ۷۸) ۔

یہ پہلے دکھایا جا چکا ہے کہ فرخی غزنی میں ۴۰۵ھ کے بعد آیا ہے ۔ ایاز کی عمر ، جس کا شعلۂ عارض ۳۸۸ھ میں آتش خس پوش بن چکا ہے ، فرخی کی آمد پر چھتیس سال ہونی چاہیے ۔

ناظرین کو فرخی کا قصیدہ ایاز کی تعریف میں یاد ہوگا جس کے بعض اشعار فرخی کے حالات میں نقل ہوئے ہیں ۔ ان میں سے ایک دو شعر یہاں دوبارہ نقل کرتا ہوں : فرخی

سوار یکرہ در میدان بیاید
باین اندر فتد دلہای نظار

یکی گوید کہ آن سرویست بر کوہ
یکی گوید گل تازہ است پُر بار
زنان پارسا از شوق گردند
بکابین کردنی او را خریدار

یہ قصیدہ ۴۲۲ھ میں لکھا گیا ہے ۔ فرخی یہاں ایاز کو کبھی سرو کہتا ہے اور کبھی گل تازہ ۔ اس قسم کے الفاظ سولہ سترہ سے پچیس تیس سالہ نوجوان کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں ، نہ ترپن چون سال کے بوڑھے کے لیے ۔ اس سے میں یہ قیاس مرتب کرتا ہوں کہ ایاز ۴۲۲ھ میں اپنی عمر کا خوش ترین دور ، یعنی شباب کا زمانہ طے کررہا تھا اور یہ کہ جب فردوسی سلطان کے یہاں آیا ہے، یعنی ۳۸۸ھ میں ، اس کا وجود بھی دنیا میں نہ تھا ۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایاز ان ایام میں پیدا ہو چکا تھا تو اپنی ماں کی گود میں کھیلتا ہوگا ۔

رباعیِ بالا ایک نامعلوم طریقے سے فردوسی کی طرف منسوب ہے ۔ غالباً دیباچہٴ بایسنغری اس کا قدیم ترین راوی ہے ۔

قولہ : ”محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہ نامے کی تصنیف کی خدمت سپرد کی . . . ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دے دی جایا کریں ، لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کردیا اور کہا کہ جب کتاب پوری ہوجائے گی تو ایک ساتھ لوں گا ۔“

(شعرالعجم ، صفحہ ۹۳ ، طبع سوم ۱۳۳۹ھ)

فردوسی کے حامیوں نے قانونی حیلے تراشنے کی خاطر اس معاملے کو معاہدے کی صورت میں بدل دیا ہے تاکہ سلطان پر الزام آسکے اور فردوسی اس کی ہجو لکھنے میں حق بجانب ٹھہرے ۔ یہ روایت دیباچہٴ قدیم میں بھی موجود ہے ، تاہم ناقابل قبول ہے ۔ سلطان اور فردوسی میں کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہوا ۔ فردوسی اپنی

نیک نامی اور قدر دانی کی امید میں شاہ نامے کی نظم پر مصروف ہوا ، اور بقول خود سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت سے بیس سال پہلے سے مشغول تھا ۔ چنانچہ :

سخن را نگہداشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

کسی دوسرے مقام پر کہتا ہے :

همی گفتم این نامہ را چند گاہ
نہان بود از چشم خورشید و ماہ

خود مولانا شبلی بھی اس روایت کو صحیح نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں :

"عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچ کر اس کے حکم سے شاہ نامہ لکھنا شروع کیا ۔ اکثر تذکروں میں یہی لکھا ہے لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۶ ، طبع سوم ۱۳۳۹ھ)

فرماتے ہیں :

"دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چوں کہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رخ نہیں کیا ، اس لیے اس نے در اندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے ۔ نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا اور چوں کہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا اس لیے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا ۔ دیباچے میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا ، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف و جوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے ۔ فردوسی بھی اشعار کے ذریعے سے ان کا شکریہ ادا کرتا تھا ۔ حسن کو یہ ناگوار معلوم

ہوتا لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا :

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام
مائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوی در وزیر چرا ملتفت شوم
چون فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ ، اس لیے بھی اس نے فردوسی کی مخالفت کی ۔ ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے ۔''

(شعر العجم ، صفحہ ۱۰۱ ، ۱۰۲)

جب پروفیسر براؤن نے دیباچۂ بایسنغری کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی یہی وجہ تھی کہ دیباچے کے بیانات (اور مجھ کو کہنا چاہیے اکثر بیانات) پایۂ تاریخ سے ساقط ہیں ۔ لیکن شبلی نے اس قابل مورخ کی تصنیف کو تو ''براؤن کی کھتونی'' کہہ کر دور پھینک دیا اور دیباچے پر آنکھ بند کرکے بھروسہ کر لیا ۔ اب یاس کے لہجے میں فرماتے ہیں کہ ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے ۔ وہی مثل ہوئی جیسے کوئی کہے کہ تاریخ میں ہارون الرشید کا تذکرہ الف لیلہ کے بیان سے مختلف ہے ، ان میں سے کس پر اعتبار کیا جائے ؟ یہ معاملہ تو نہایت آسان تھا ۔ سب کو معلوم ہے کہ نظامی نے ۵۵۰ھ کے قرب و جوار میں اپنی کتاب لکھی ، اور دیباچہ ۸۲۹ھ میں لکھا گیا ۔ اب جو ذرائع معلومات کے نظامی کو مل سکتے ہیں وہ صاحبِ دیباچہ یا دولت شاہ کو نہیں مل سکتے ، اس لیے نظامی کے بیانات کے مقابلے میں دیباچے کی لغویات کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی ۔ دیباچہ نگار کا پایۂ تحقیق صرف اس ایک ادنیٰ سی بات سے ظاہر ہے کہ اس کو دیگر واقعات درکنار سلطان محمود کے وزیر کا نام تک صحیح معلوم نہیں ۔ اس وزیر کا نام خواجہ ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی ہے ۔ والدین کے گناہ کی اولاد کو عقوبت ملتے سنا ہے ، لیکن فرزند کی بداعمالیوں کی

پاداش میں صاحبِ دیباچہ نے احمد کے باپ حسن کو ماخوذ کیا ہے ۔ علامہ شبلی جو ایک مورخ بے بدل ہیں ، بجائے اس کے کہ ان امور سے دیباچے کی لغویت کا سراغ چلاتے ، خود اس کی لغویت کے شکار بن گئے ۔ چناں چہ بار بار اس کا نام حسن میمندی لکھ رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جہاں نظامی عروضی نے چہار مقالے میں "خواجہٗ بزرگوار احمد حسن" لکھا تھا ، شبلی نے اس کو بھی اصلاح دے دی ۔ چناں چہ جب اس کا بیان نقل کیا تو وہاں احمد حسن کے بجائے حسن میمندی لکھا ، گویا نظامی کی غلطی کی تصحیح کی ۔ مولانا کو ، معلوم ہوتا ہے "گلستان" خوب یاد تھی کیوں کہ اس میں ایک حکایت آتی ہے : "تنی چند از بندگان سلطان محمود گفتند حسن میمندی را کہ سلطان چہ گفت در فلان مصلحت ۔" (باب چہارم ، حکایت ہفتم) لیکن شیخ سعدی کو میں مصلحِ اخلاق مانتا ہوں ، نہ مصلحِ تاریخ ۔ جو لوگ غزنوی ادبیات اور اس عہد کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی اپنے ذاتی نام سے یاد کیے گئے ہیں ، نہ ان کے باپ حسن میمندی کے نام سے ۔ فرخی کہتا ہے :

خواجہ بزرگ شمسِ کفاۃ احمد حسن
کاحسان او و نعمت او دست کبریاست

دیگر

دستور ملک صاحب ابو القاسم احمد
آن حمد و ثنا را بدل و دیدہ خریدار

عتبی اور بیہقی وغیرہ سب اسی نام سے یاد کرتے ہیں ۔ حسن میمندی کسی زمانے میں سلطان کا وزیر نہیں بنا بلکہ امیر ناصرالدین سبکتگین کے عہد میں کسی خطا پر مصلوب ہوا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن دنوں فردوسی کا قصہ درپیش تھا ، ان دنوں خواجہ احمد میمندی وزیر نہیں تھا ۔ بقول عتبی ۴۰۷ھ میں خواجہ احمد باقاعدہ وزیر بنایا جاتا ہے ، اگرچہ اس سے چند سال پیشتر نیم سرکاری طریقے

پر وزارت کا کام بھی کرتا رہا ہے ۔ اشعار کی زبان بھی فردوسی کی زبان نہیں ۔ میں نظامی کے بیان کو تسلیم کرتا ہوں ، اس ترمیم کے ساتھ کہ فردوسی کا دوست اور محسن وزیر اول تھا ، وہ وزیر دوم کو سمجھا ۔ اس وزیر کا نام خواجہ ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائنی ہے ۔ اس سے فردوسی کے اچھے تعلقات تھے ۔ شاہنامے میں دو موقعوں پر اس کا ذکر آتا ہے اور فردوسی اس کا ممنون بھی معلوم ہوتا ہے ۔ شاہنامہ :

ز دستور فرزانۂ دادگر
پراگندہ رنج من آمد بسر

(صفحہ ۴۴۲ ، جلد دوم ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

صورت حالات میں یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کا سرپرست خواجہ ابوالعباس تھا ، نہ خواجہ ابوالقاسم احمد ۔ شاہنامے میں ابوالقاسم کا کہیں ذکر نہیں آتا ۔

مذکورہ بالا دونوں شعر ، جو وزیر اور بادشاہ کی درگاہ سے ہمارے شاعر کی بے نیازی اور استغناء کے معلن ہیں ، فردوسی کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے ، نہ وہ اس کی زبان میں ہیں ۔ ان پر عربی کا گہرا اثر ہے ۔ مبادیِ فطرت ، مائل ، طامع ، وزیر ، ملتفت ، فارغ ، فردوسی کے روزمرہ میں داخل نہیں ۔ ان شعروں کا مالک صاحب دیباچہ ہے ، نہ فردوسی ۔

''حسن میمندی مذھباً خارجی تھا ۔'' کاش اس موقع پر تو مولانا اپنی آنکھیں کھولتے کہ وہ شیعہ روایات کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں ۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ خواجہ ابوالقاسم احمد جو سلطان محمود کا رضاعی بھائی اور بچپن کا دوست ، ہم‌مکتب اور ہم صحبت تھا ، خارجی کیوں کر ہو سکتا ہے ۔ لیکن مولانا شیعہ روایت کے راز کو نہ سمجھے ۔ خواجہ کا خارجی خیال کیا جانا ایسا ہی ہے جیسا سلطان محمود کو خارجی کہنا ۔ ہجو کے اشعار میں خود سلطان کو خارجی بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ افسوس شبلی بِرون کے سبعۂ معلقہ کی سوئی نہ دیکھ سکے لیکن دیباچے کے اونٹ

کے اونٹ نگل گئے ۔

قولہ : ''دیباچے میں ایک اور وجہ بیان کی ہے اور وہ قرینِ قیاس ہے ؛ سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی ، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے (دیباچے میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) ۔ اس خاندان کا تاج دار فخرالدولہ تھا ، وہ فردوسی کا نہایت قدر دان تھا ۔ جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلے کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائے گا ۔ یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی ۔ محمود نے سنا تو اس کو ناگوار گزرا ۔'' (شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۳)

یہاں علامہ شبلی پھر دیباچۂ بایسنغری کے دام فریب میں پھنس گئے ۔ وہ اس کے عشوہ ہائے لاجوردی کے کچھ ایسے مفتون ہوگئے ہیں کہ گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل ۔

فخرالدولہ دیلمی اور فردوسی کا قصہ تاریخی لحاظ سے قطعی غلط ہے ؛ جس کی تفصیل یہ ہے کہ رکن الدولہ بویہ (المتوفی ۳۶۶ھ) کے تین فرزند تھے ؛ عضد الدولہ ، موید الدولہ اور فخر الدولہ ۔ عضدالدولہ بوجہ شہرت چنداں محتاج بیان نہیں ۔ مویدالدولہ کو باپ نے حین حیات میں اصفہان دے دیا اور فخر الدولہ کو رے ۔ رکن الدولہ کے بعد مویدالدولہ نے عضد الدولہ اپنے بڑے بھائی کے حکم سے فخرالدولہ پر فوج کشی کی ۔ فخرالدولہ بھاگ کر قابوس بن وشمگیر کے ہاں پناہ گزین ہوا ۔ ۳۷۰ھ میں موید الدولہ نے جرجان پر حملہ کیا ۔ قابوس اور فخرالدولہ شکست کھا کر خراسان بھاگ آئے ۔ سامانیوں نے ان کی امداد کے لیے حسام الدولہ ابوالعباس تاش کے ساتھ زبردست فوج روانہ کی لیکن مہم ناکامیاب رہی ۔ ۳۷۳ھ میں مویدالدولہ کے انتقال پر فخرالدولہ اپنے بھائی کے تخت پر بیٹھا ۔ امیر سبکتگین اور فخر الدولہ ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں آگے

پیچھے انتقال کرتے ہیں ۔ سبکتگین کے بعد باپ کی وصیت کے موافق امیر اسمعیل تخت نشین ہوتا ہے ۔ ملک کے مقاسمے پر بھائیوں میں جھگڑا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محمود ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے ۔ فردوسی اس واقعے کے بعد غزنین آتا ہے ۔ داستان رستم و اسفندیار غزنین ہی میں لکھی جاتی ہے ۔ اس کے خاتمے میں سلطان کے حق میں دعائیہ اشعار موجود ہیں ۔ چناں چہ شاہنامہ :

سرآمد کنون رزم اسفندیار
کہ جاوید بادا سرِ شہریار
ہمیشہ دل از رنج پرداختہ
زمانہ بفرمان او ساختہ
دلش باد شادان و تاجش بلند
بگردن بداندیش او را کمند

قصہ کوتاہ جب داستان رستم و اسفند یار لکھی گئی ہے ، فخرالدولہ اپنی قبر میں سو رہا تھا ، اس لیے فخرالدولہ کا فردوسی کے لیے انعام بھیجنے کا قصہ بالکل بے بنیاد ہے ۔

قولہ : ''بہرحال وجہ کچھ ہو ، واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدر دانی کا حق ادا نہ کیا ۔ فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامے کا صلہ پہنچا ۔ فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں ۔ فردوسی نے بڑی بے تابی سے دست شوق بڑھایا ، لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی کے پھول تھے ۔ فردوسی کے دل سے بے ساختہ آہ نکلی ۔ تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگر ان سفید دانوں کے لیے نہیں کھایا تھا ۔ ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵)

دیباچۂ قدیم کسی راوی منصور کی سند پر لکھتا ہے کہ سلطان محمود کے دبیر ابو سہل ہمدانی نے سلطان سے عرض کی کہ

ساٹھ ہزار دینار زر رکنی ایک شاعر کو دینے کی کیا ضرورت ہے ، طلائی سکوں کے بجائے روپہلے سکے ہی بہت ہیں ۔ سلطان اس مشورے پر عمل پیرا ہوا اور ساٹھ ہزار درم ایک ظرف میں رکھوا کر بھجوا دیے ۔ اس رقم کو فردوسی نے حمام کے دروازے پر لٹوا دیا ۔ اس بارے میں دیباچۂ قدیم اور چہار مقالہ متفق ہیں ۔

یہ رقم اگرچہ شاہ نامے کے مقابلے میں ہیچ ہے ، تاہم ان ایام میں روپے کی قیمت پر لحاظ کرتے ہوئے اچھی خاصی رقم تھی ۔ ساٹھ ہزار درہم ہمارے سکوں میں پندرہ ہزار روپے کے مساوی ہیں ۔ اب پندرہ ہزار روپے ایک اسّی سال کے بوڑھے کے لیے ، جو افلاس کے ہاتھوں تنگ ہو ، چنداں محقر نہیں ۔ فردوسی کا شاہ نامے کی نظم سے یہی مقصد تھا کہ اس کا ضعیفی کا زمانہ آسائش اور فارغ البالی میں گزر جائے :

به پیوستم این نامۂ باستان
پسندیده از دفتر راستان
که تا روز پیری مرا بر دهد
بزرگی و دینار و افسر دهد

(شاہ نامہ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۳۳ ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

یہ مقصد اس روپے سے ایک حد تک حاصل ہو سکتا تھا ۔ میرے نزدیک اس رقمِ کثیر کا حمام کے دروازے پر لٹوا دینا ناقابل عمل ہے ، اور نہ شاہ نامہ اس قصے کی تائید کرتا ہے ۔ فردوسی کے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاسدوں اور بدگویوں کی سخن چینی کی وجہ سے سلطان کے ہاں سے قطعاً محروم گیا :

چنین شهریاری و بخشندهٔ　　بگیتی ز شاهان درخشندهٔ
نکرد اندرین داستانها نگاه　　ز بدگوی و بخت بد آمد گناه
حسد برد بدگوی در کار من　　تبه شد بر شاه بازار من

بہر حال سائل منعم سے اور تشنہ دریا سے محروم گیا ۔

محمود کے ہاں کئی بوسہل ہیں ؛ ایک بوسہل زوزنی ، دوسرا

بوسہل حمدوی ، ایک بو سہل ہمدانی[1] بھی ہے ۔ لیکن فردوسی کے قیام غزنین کے زمانے میں ان میں سے شاید ایک بھی دبیر نہ ہو ۔ حسن میمندی اس وقت اپنی گور میں آرام کر رہا تھا ۔

صاحبِ دیباچۂ بایسنغری میں ایجاد کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہے ۔ بعض اوقات اس کے پاس قدیم راوی ہیں ورنہ اکثر اوقات وہ خود واقعات تراش لیتا ہے ؛ مثلاً ہجوِ سلطان محمود میں شعر ذیل اس نے دیکھا :

مرا سہم دادی کہ در پای پیل
تنت را بسایم چو دریای نیل

اس پر اس نے قصۂ ذیل تیار کیا ، جس کو میں شبلی کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں :

"محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کہا 'تیری دراندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا ۔' میمندی نے کہا 'حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے ، تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا ۔ انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے ۔' اس چبھتے ہوئے فقرے نے محمود کے دل میں اثر کیا اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا ۔ (یہاں دیباچے کے اصلی الفاظ یہ ہیں کہ "قرمطی را بامداد در

۱۔ غالباً ابوسہل حمدوی اور ابوسہل ہمدانی (جسے ابوسہل حمدونی بھی کہا جاتا ہے) ایک ہی شخص ہے ۔ مرتبین تاریخ بیہقی ، مطبوعہ طہران ، ڈاکٹر غنی اور ڈاکٹر فیاض ، بوسہل حمدوی کے متعلق فرماتے ہیں :

"این کلمہ در نسخہ مورلی ہمہ جا حمدونی است و در بعضی از کتابہای دیگر نیز چنان است ۔ در 'فا' حمدوی را بخط الحاق حمدونی کردہ اند وگویا ہمہ غلط است و صحیح حمدوی است ۔"

(صفحہ ۱۸ ، تاریخ بیہقی ، طبع طہران سنہ ۱۳۲۴ شمسی)

'فا' سے مراد مدرسۂ فاضلیہ مشہد کا قلمی نسخہ ہے ۔ (مرتب)

پای پیل اندازم وعقوبتِ او را عبرتِ سایر بی ادیان سازم ۔")

فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا ۔ صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے :

چو در ملک سلطان کہ چرخش ستود
بسی ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظلِّ عدلش قرار
شده ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردون شکوه
رہی را شمارد یکی زان گروه

سلطان محمود کو رحم آیا اور اس کی تقصیر معاف کی ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۵)

یہاں فردوسی کے بدیہہ اشعار کی زبان پر بھی ناظرین ایک منٹ کے لیے غور کر لیں ۔

خدا جانے صاحبِ دیباچہ کا یہ کون سا پُر اسرار ماخذ ہے جس سے حسبِ ضرورت وہ فردوسی کے اشعار نقل کر دیتا ہے ، جس تک نہ متقدمین کی رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کی ۔ اور اشعار بھی ایسے بر محل ہوتے ہیں کہ گویا فردوسی نے اسی موقع کے لیے لکھے تھے ۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ یہ اشعار صاحبِ دیباچہ کی تصنیف ہیں ۔

قولہ : "غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایازکو ایک لفافہ سر بہ مُہر دیا اور کہا 'میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا ۔ فردوسی ہرات کو روانہ ہوا ، محمود نے لفافے کی مُہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے :

یکی بندگی کردم ای شہر یار!
کہ ماند ز تو در جہان یادگار

پی افکندم از نظم کاخ بلند
که از باد و باران نیابد گزند
بسی رنج بردم درین سال سی
عجم زنده کردم بدین پارسی
چو برباد دادند گنج (کذا) مرا
نه بد حاصلی سی و پنج مرا
اگر شاه را شاه بودی پدر
بسر بر نهادی مرا تاج زر
وگر مادر شاه بانو بدی
مرا سیم و زر تا بزانو بدی
پرستار زاده نیاید بکار
وگر چند دارد پدر شهریار
سر ناسزایان بر افراشتن
وزیشان امید بهی داشتن
سر رشتهٔ خویش گم کردن است
به جیب اندرون مار پروردن است
درختی که تلخ است ویرا سرشت
گرش برنشانی بباغ بهشت
ور از جوی خلدش به هنگام آب
به بیخ انگبین ریزی و شهد ناب
سر انجام گوهر بکار آورد
همان میوهٔ تلخ بار آورد
ز بد اصل چشم بهی داشتن
بود خاک در دیده انباشتن
ازان گفتم این بیت های بلند
که تا شاه گیرد ازین کار پند

که شاعر چو رنجد بگوید هجا
بماند هجا تا قیامت بجا

(صفحہ ۹۹ ، شعرالعجم، ۱۳۳۹ھ طبع سوم)

سلطان محمود کے دربار سے فردوسی کی محرومی کا قصہ موجودہ ہجو کا بانی ہے ۔ لیکن یہ ہجو کسی اصلی بنیاد پر قایم نہیں بلکہ وضعی[1] ہے ۔ تذکرہ نگاروں کی عام روایت ہے کہ سلطان نے فی شعر ایک دینار دینے کا وعدہ کیا اور جب تیس پینتیس سال کی محنت کے بعد شاعر شاہ نامہ ختم کر کے لایا تو سلطان نے وعدہ خلافی کی اور سونے کے سکّوں کی جگہ چاندی کے درہم دیے جو شاعر نے کھڑے کھڑے حمام کے دروازے پر لٹا دیے ۔ یہ بیان اگر درست ہوتا تو فردوسی ہجو لکھنے میں حق بجانب ہوتا ، مگر فردوسی کی اپنی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس نظم پر مصروف تھا ۔ شاہ نامے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر کو کسی قسم کا انعام نہیں ملا ۔ چنانچہ :

چنین شهریاری و بخشندهٔ بگیتی ز شاهان درخشندهٔ
نکرد اندرین داستانها نگاه ز بدگوی و بخت بد آمد گناه
حسد برد بدگوی درکار من تبه شد بر شاه بازار من

(داستان خسرو پرویز و شیرین ، صفحہ ۱۰۵۱)

وہ اپنی ناکامی دشمن کی بدگوئی اور اپنی بد نصیبی پر محمول کرتا ہے ۔ اس صورت میں ہجو لکھنا اس کے لیے نامناسب تھا ۔

موجودہ ہجو دیباچۂ بایسنغری (تالیف ۸۲۹ھ) کے عہد سے چلتی ہے اور دیباچہ نگار زیادہ تر اس کا ذمہ دار ہے ۔ اس کی تیاری کے لیے بڑا حصہ شاہ نامے سے لیا گیا ہے ۔ اس کے بعد گرشاسپ نامہ ، بہمن نامہ ، نیز دیگر نامعلوم ذرائع سے خوشہ چینی کی گئی ہے ۔ پھر

۱- ہجو کی وضعیت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے مضمون ''فردوسی کی ہجوِ سلطان محمود'' مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد چہارم ۔
(مرتب)

اس کالائے دزدیدہ کو مسلسل نظم کی شکل میں ترتیب دینے کے واسطے جدید اشعار حسب موقع و ضرورت لکھ کر داخل کیے گئے۔ اس طرح سو شعر کی یہ ہجو تیار ہوئی ، ورنہ دیباچۂ بایسنغری سے قبل کے شاہ ناموں میں ہجو کے اشعار نہایت کم تعداد میں ملتے ہیں۔

مولانا شبلی کے منقولہ اشعار کی تعداد پندرہ ہے۔ ان میں سے شعر اول و دوم 'بناهای آباد' الخ اور 'پی افگندم' شاہنامے سے لیے گئے ہیں جو 'در ستائش سلطان محمود و گلۂ روزگار' کی سرخی کے ذیل میں 'لشکر آراستن خسرو بجنگ افراسیاب' سے قبل (صفحہ ۷۹۴ جلد دوم ، شاہنامہ ، طبع محمد مہدی اصفہانی ، ۱۲۶۲ھ بمبئی) ملتے ہیں۔

شعر نمبر ۳ 'بسی رنج بردم' الخ اگرچہ مطبوعہ شاہناموں میں نہیں ملتا لیکن ایک نہایت قدیم نسخے (۷۵۲ھ) کے خاتمے میں موجود ہے۔ اس کے دوسرے مصرع میں زندہ کی جگہ 'گرم' مرقوم ہے۔

شعر نمبر ۴ 'چو برباد دادند رنج مرا' الخ خاتمۂ شاہنامہ میں آتا ہے۔

شعر نمبر ۷ 'پرستار زادہ نیاید' الخ ۔ اس شعر کا استعمال فردوسی نے شاہنامے میں کسی مختلف مقصد سے کیا تھا۔ جب نوشیروان نے مہران ستاد کو اپنے واسطے خاقان چین کی دختر پسند کرنے کے لیے چین روانہ کیا ، اس کو ہدایت کی کہ خاقان کے متعدد لڑکیاں ہیں ، 'تو ان کے ظاہری حسن و جمال اور زیب و زینت پر نہ جانا ، اصلی ملکہ کی اولاد لانا۔ مجھے باندی کی بیٹی نہیں چاہیے ، اگرچہ اس کا باپ بادشاہ ہو۔ فردوسی نے اس موقع پر یہ شعر لکھا تھا :

پرستار زادہ نیاید بکار　　　اگر چند باشد پدر شہریار

"پاسخ نامۂ خاقان از نوشیروان و فرستادن مہران ستاد را برای دیدن و آوردن دختر خاقان ۔" (صفحہ ۷۹۶ ، جلد چہارم ، ۱۲۶۲ھ)

ہجو نگار نے شاہ نامے سے چرا کر سلطان محمود کے خلاف استعمال کیا۔

شعر نمبر ۸ و ۹ 'سرناسزایان' الخ اور 'سررشتہ' خویشتن' الخ بہمن نامے کے بعض اوراق میں جو دسویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے ، میری نظر سے گزرے ہیں -

قولہ : ''اب اس نے ہرات سے طوس کا رخ کیا - طوس سے قہستان گیا - ناصرلک یہاں کا حاکم تھا ، اس کو خبر ہوئی تو ندیمانِ خاص کو استقبال کے لیے بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا -'' (شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۷)

مولانا غالباً دیباچہ' بایسنغری کی سند پر لکھ رہے ہیں مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ فردوسی کے عہد میں کسی ناصر لک والیِ قہستان کا پتا نہیں چلتا - اس موقعے پر صاحب دیباچہ کو سہو ہوگیا - اس نے ناصرالدین والیِ قہستان کو، جو ہمارے شاعر سے دو ڈیڑھ سو سال بعد گزرا ہے ، فردوسی کا معاصر قرار دے دیا - محقق طوسی نے اپنی مشہور تالیف 'اخلاق ناصری' اسی ناصرالدین والیِ قہستان کے نام پر لکھی ہے - یہ ناصرالدین ، رکن الدین خورشاہ والیِ الموت کی طرف سے قہستان کا عامل تھا - اخلاق ناصری کے دیباچے میں یہ عبارت ملتی ہے :

''بوقت مقام قہستان در خدمت حاکم آن بقعہ مجلس عالی شہنشاہ اعظم بادشاہ معظم ناصرالحق والدین ملک الملوک عرب و العجم اعدل ولات السیف والقلم خسرو جہان شہریار ایران ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور تغمدہ اللہ برحمتہ -''

میں 'لک' کی تشریح سے قاصر ہوں - غالباً تمیزی یا عرفی کلمہ ہے - اس ناصرالدین کا ایک خطاب محتشم بھی ہے جو نظم آیندہ منسوب بہ فردوسی کے شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے :

و لیکن ز فرمودۂ محتشم ندانم کزین پیش چون سرکشم

روضۃ الصفا میں بھی اس کو ناصر الدین محتشم کہا گیا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ ناصر لک محتشم اور ناصر الدین محتشم ایک ہی شخص ہے - اس کی عبارت ہے :

"درین اثنا ملک شمس الدین کرت را برسالت پیش ناصرالدین محتشم کہ فاضل محقق خواجہ نصیر الدین طوسی اخلاق ناصری را بنام او نوشتہ ، فرستاد و او در آن اوان از قبل رکن الدین خور شاہ والی قلعہؑ سر سخت بود ۔"

(صفحہ ۷۰ ، جلد پنجم)

قولہ : ''فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی جس میں حاسدوں کی دراندازی ، اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بد عہدی و ناقدردانی کا ذکر تھا :

بہ غزنین مرا گرچہ خون شد جگر
ز بیداد آن شاہ بیداد گر

کزان هیچ شد رنج سی سالہ ام
شنید از زمین آسمان نالہ ام

همی خواستم تا فغانها کنم
بگیتی ازو داستانها کنم

بگویم ز مادرش و هم از پدرش
نہ ترسم بغیر از خداوند عرش

چون دشمن نمی داند از دوست باز
بہ تیغ زبانش کنم پوست باز

و لیکن ز فرمودۂ محتشم
ندانم کزین پیش چون سر کشم

فرستادم ار گفتہؑ داشتم
بہ نزدیک خود هیچ نگذاشتم

اگر باشد این گفتها نا صواب
بسوزان در آتش بشویان در آب

گذشتم ایا سرور نیک رای
ازین داوری تا بدیگر سرای

رسد لطف یزدان بفریاد من
ستاند بمحشر ازو داد من

"فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصرلک کو سنائے تو اس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہل کمال کی شان نہیں۔ میں لاکھ روپے ان اشعار کے معاوضے میں دیتا ہوں، اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا۔"

(شعرالعجم صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸)

میرے خیال میں مثنوی سے مراد اشعار بالا نہیں بلکہ ہجو کے ابیات ہیں۔ نہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فردوسی نے ناصر لک کو سنائے تھے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی اور ناصرلک میں ملاقات نہیں ہوئی۔ شاعر سلطان کی ہجو گوئی پر تلا ہوا تھا، بلکہ اس کے ماں باپ تک کو بکھاننا چاہتا تھا۔ لیکن محتشم کے کہنے پر اس نے ہجو کا ارادہ ترک کر دیا اور جو کچھ لکھی وہ محتشم کی خدمت میں یہ کہہ کر بھیج دی کہ اب اسے اختیار ہے، چاہے جلائے چاہے دھو ڈالے۔ وہ اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہے، قیامت کے دن انصاف ہوگا۔

اشعار بالا فردوسی کے قلم سے نہیں نکلے۔ اس کے مقابلے میں صاحب دیباچۂ بایسنغری ان کا جائز مالک کہلائے جانے کا زیادہ حق‌دار ہے۔ قدیم مآخذ میں یہ اشعار نہیں ملتے۔

قولہ : "فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا :

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست
چگونہ دریا کانرا کنارہ پیدا نیست
چہ غوطہا زدم و اندرو ندیدم در
گناہ بخت منست این گناہ دریا نیست"

(شعر العجم، صفحہ ۱۰۸)

یہ قطعہ بالعموم فردوسی کی طرف منسوب ہے اور فردوسی

کا معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل اس کے چار شعر ہیں ، وهوهذا :

حکیم گفت کسی را کہ بخت والا نیست
بہیچ وجہ مر او را زمانہ جویا نیست
برو مجاور دریا نشین مگر روزی
بدستت افتد دری کجاش همتا نیست
خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست
کدام دریا کانرا کرانہ پیدا نیست
شدم بدریا غوطہ زدم نہ دیدم در
گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

حقیقت میں یہ قطعہ فردوسی کے صحیح جذبات کا آئینہ دار ہے ۔

قولہ : ''سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں آیا تھا ، اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی، نہایت متاسف ہوا ۔ مسجد سے آکر ناصرلک کا عریضہ دیکھا ، اور بھی مکدر ہوا ۔ جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے ان کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا ۔''
(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۸)

یہاں دیباچے میں صاف لکھا ہے کہ سلطان نے حسن میمندی کو فردوسی کے حق میں کانٹے بونے کی پاداش میں ہلاک کر دیا ۔ مولانا شبلی خدا جانے کیوں اس اہم واقعے کو قلم انداز کر گئے ۔ دیباچے کے الفاظ ہیں :

''وبدان جماعت کہ خیانت بفردوسی کردہ بودند ، غضب بسیار فرمود ۔ حسن میمندی را بخطاب عنیف مخاطب داشت بلکہ نام آن بد فرجام برجریدۂ اموات برنگاشت :

چو فردوسی آن مرد والا گہر
غمین شد ز میمندیِ بی‌هنر
اذیت بسی زان فرومایہ دید
وزو بی‌سبب رنج و حرمان کشید

طبیعت مکافات آغاز کرد
سرش با دم تیغ انباز کرد"

تاریخی معاملات میں اس قدر دست برد قطعاً ناجائز ہے ۔ مولانا کو اختیار تھا کہ روایات کو قبول کریں یا رد کردیں ، لیکن جب ایک مرتبہ قبول کر لیا تو لازم تھا کہ قصے کے تمام خط و خال نقل کرتے ۔ حسن میمندی سبکتگین کے عہد میں بے شک قتل کیا گیا ہے لیکن ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا فردوسی کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا ۔

بعض وقت دو روایتوں کو لے کر مولانا نے ان کی کھچڑی سی پکا کر رکھ دی ہے ۔ اس غرض کے لیے دو مختلف روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے ۔

نظامی کا بیان ہے کہ فردوسی ہرات سے طوس جا کر وہاں سے بخط مستقیم طبرستان اسپہبد شہریار کے پاس چلا گیا جو مشہور آل باوند کا ایک رکن تھا ۔ طبرستان میں فردوسی نے ہجو لکھ کر اور دیباچے میں اضافہ کر کے شاہ نامہ شہریار کو پیش کیا کہ اس کتاب میں تمھارے بزرگوں کے حالات ہیں اس لیے تمھارے نام اس کا منسوب ہونا بہت مناسب ہے ۔ شہریار نے اس کو تسلی دی اور کہا کہ کتاب تو محمود ہی کے نام پر رہنے دے ، البتہ سلطان کی ہجو میں ایک لاکھ روپے میں خریدتا ہوں ۔ خود سلطان کسی دن نادم ہوگا اور تیری رضاجوئی کرے گا ۔

دوسری روایت دیباچۂ بایسنغری میں یوں ہے کہ فردوسی سلطان کے خوف سے ماژندران چلا گیا ۔ وہاں کا والی ان دنوں فرزندان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر سے تھا ۔ دیباچے کے اصلی الفاظ یہ ہیں :

''والیِ ماژندران در آن زمان از فرزندان فرزان (کذا) شمس المعالی قابوس بن وشمگیر بن منوچہر (کذا) بن شمس المعالی بود و پسر او داماد سلطان بود و از طرف مادر

دختر زادۂ مرزبان بن رستم بن شروین کہ مصنف مرزبان نامہ است "۔

جب والی کو معلوم ہوا کہ طوس کا ایک شیعہ شاعر جس نے شاہ نامہ غزنین میں نظم کیا تھا ، اپنی کتاب لے کر ماژندران آیا ہے اور فردوسی اور محمود کے تعلقات بھی اس کو معلوم ہوئے ؛ چوں کہ شیعۂ غلات سے تھا ، کہنے لگا چوں کہ شاعر دوست دارِ اہل بیت ہے ، اگر اپنی تصنیف میرے پاس بھیجے گا ، معقول معاوضہ پائے گا ۔ القصہ فردوسی نے والی اور اس کے اسلاف کی تعریف میں ابیات اضافہ کر کے شاہ نامہ پیش کیا ۔ والی بہت خوش ہوا لیکن بعد میں سلطان کے خوف سے معقول صلہ دے کر رخصت کر دیا ۔

مولانا فرماتے ہیں :

"ماژندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانے میں سپہبد فرماں روا تھا ۔ اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا ۔ فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہ نامہ پیش کیا ۔ سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے ، پھر سلطان محمود کا خیال آیا ؛ ایک گراں بہا صلہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے ، اس لیے میں آپ کو ٹھہرا نہیں سکتا ، آپ اور کہیں تشریف لے جائیں ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۹)

قابوس کے خاندان میں کوئی اسپہبد نہیں گزرا ۔ اسپہبد کسی شخص کا نام نہیں بلکہ آل باوند کا خاندانی خطاب ہے ۔ قابوس آل زیار سے تعلق رکھتا ہے جن کا پایہ تخت جرجان تھا ۔

باوندیہ خاندان کی حکومت کوہستان پریم اور شہریار کوہ میں تھی ۔ اس خاندان کے تمام حکمران اسپہبد کہلاتے تھے ۔ مثلاً اسپہبد شہریار ، اسپہبد رستم اور اسپہبد شروین وغیرہ ۔ صاحبِ دیباچہ

جس کی روایت کو مولانا نے نظامی عروضی کے بیان پر ترجیح دی ، حسب معمول شبلی کو غلط راستے پر لے جا رہا ہے ۔ اس غریب کو والی کا نام تک بھی معلوم نہیں ، اگرچہ اس کے بڑے بوڑھوں کے نام گنا گیا اور وہ بھی غلط سلط ۔ آل زیار میں دو بادشاہ سلطان محمود کے داماد ہوئے ؛ پہلا منوچہر بن قابوس (۴۰۳ھ و ۴۲۴ھ) لیکن یہ شخص صاحب دیباچہ کا ہیرو نہیں ۔ سلطان کا دوسرا داماد امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن قابوس مصنف قابوس نامہ ہے ۔ کیکاؤس ۴۱۲ھ میں پیدا ہوتا ہے ، عہد سلطان سودود (۴۳۳ھ و ۴۴۱ھ) میں غزنین جاتا ہے اور انھیں ایام میں صبیہ سلطان سے غالباً اس کی شادی ہوتی ہے اور عنقریب بعد تخت نشین ہو جاتا ہے ۔ اب صاحب دیباچہ کی مراد اس کیکاؤس سے ہے کیوں کہ وہ سلطان کا داماد ہونے کے علاوہ مرزبان بن رستم بن شروین کا دختر زادہ بھی ہے ۔ قابوس نامہ میں امیر عنصرالمعالی اپنے فرزند گیلان شاہ سے کہتا ہے :

”و جدۂ مادرم دختر ملک زادۂ المرزبان بن رستم بن شروین کہ مصنف مرزبان نامہ است و سیزدہم پدرش کیکاؤس بن قباد برادر ملک نوشیروان عادل و مادر تو فرزند ملک محمود بن ناصر الدین بودہ ۔“

اگر صاحب دیباچہ کی مراد عنصرالمعالی سے ہے تو وہ فردوسی کی وفات سے ، جو ۴۱۱ھ میں مانی جاتی ہے ، ایک سال بعد پیدا ہوا ۔ اگر اس کے باپ اسکندر بن قابوس سے مراد ہے تو وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا ۔ یہ ہے معیار صاحب دیباچہ کی تاریخ دانی کا ۔ خدا جانے ایسے جاہل کو شبلی نے اپنا خضرراہ کیوں بنا لیا ۔

فردوسی کا اٹھتر استی سال کی عمر میں قہستان ، طبرستان ، ماژندران اور بغداد جانا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے ۔ دیباچۂ قدیم اس باب میں خاموش ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کے عہد تک فردوسی کے سفر کا قصہ اختراع نہیں ہوا تھا ۔ صحیح صرف اس قدر ہے کہ وہ غالباً سجستان یا خراسان میں امیر ابوالمظفر نصر

بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہے۔ شاہ نامہ ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے ، صلہ مانگتا ہے اور ساتھ ہی یہ التجا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے بھی سفارش کرے۔ چناں چہ شاہ نامہ :

چو سالار[1] شہ این سخن های نغز
بخواند ببیند بہ پاکیزہ مغز

۱۔ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین متوفی ۴۱۲ھ ، جنھیں فردوسی 'سالار شہ' کے خطاب سے یاد کرتا ہے ، ابتدا میں سپہ سالار خراسان مقرر ہوئے۔ بعد میں سجستان ان کو تفویض ہوا۔ ان کا سکہ ۴۰۱ھ کا ضرب سجستان لاہور میوزیم میں موجود ہے۔ بعض درموں پر صرف 'شاہ نصر' درج ہے۔ ایسے دو درم راقم کے مجموعۂ مسکوکات میں شامل ہیں۔ فردوسی کے ساتھ ان کے تعلقات بے حد خوش گوار معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ نامے میں تین مختلف موقعوں پر ان کا ذکر آیا ہے۔ پہلے تمہید داستان شیرین خسرو میں، جس سے اشعار بالا منقول ہیں۔ دوسرے دیباچۂ شاہ نامہ میں :

نخستین برادرش کہتر بسال
کہ در مردمی کس ندارد ہمال
بویژہ دلاور سپہ دار طوس
کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس
ز گیتی پرستندۂ فرّ نصر
ز بد شاد در سایۂ شاہ عصر

تیسرے مقام پر خاتمۂ داستان اسکندر میں :

جہان دار و سالار او میر نصر
کزو شادمانست گردندہ عصر
سپہ دار چون بوالمظفر بود
سر لشکر از ماہ برتر بود
کہ پیروز نامست و پیرور بخت
ہمی بگذرد کلک او از درخت

(حاشیۂ مصنف)

ز گنجش من ایدر بوم شادمان
کزو دور بادا بد بدگمان
وزان پس کند یاد بر شہریار
مگر تخم رنج من آید ببار
کہ جاوید باد افسر و تخت اوی
ز خورشید تابندہ تر بخت اوی
(داستان خسرو و شیرین ، جلد چہارم ، صفحہ ۱۰۴)

معلوم نہیں کہ فردوسی امیر نصر کے ہاں کامیاب رہا یا ناکام رہا۔ بعض اوقات مولانا اپنے راویوں کے بیانات میں تصرف بےجا یا دخل بےجا بھی کرلیا کرتے ہیں ، جس کی ذمےدار ان کی سہل انگاری اور بے پروائی مانی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی بعض مثالیں پیش تر گزر چکی ہیں ، ذیل میں تازہ مثال پیش ہے :

''ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آ رہا تھا ، راستے میں دشمن کا قلعہ تھا۔ وہیں ٹھہر گیا اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجا لائے۔ دوسرے دن قاصد جواب لایا لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ محمود نے وزیراعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے؟ وزیر نے برجستہ کہا :

اگر جز بکام من آید جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود پھڑک اٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا ''اس بدقسمت کا جس نے ۱۵ برس خون جگر کھایا اور کچھ نہ حاصل ہوا۔'' محمود نے کہا ''مجھ کو سخت ندامت ہے۔ غزنین پہنچ کر یاد دلانا۔'' غرض پائے تخت میں پہنچ کر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں۔ لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے؛ ادھر شہر کے ایک دروازے سے ، جس کا نام رودبار تھا ، صلہ پہنچا ، ادھر دوسرے دروازے سے فردوسی

کا جنازہ نکل رہا تھا "۔

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰)

یہ روایت فردوسی کے بہت قریب زمانے تک پہنچ جاتی ہے ۔ کیوں کہ ۵۱۴ھ میں نظامی نے امیر معزی سے سنی اور معزی نے امیر عبدالرزاق سے ۔ میں اس کے بعض خط و خال ، جو اصل روایت سے مختلف ہیں ، یہاں دکھاتا ہوں ۔ نظامی نے لکھا تھا کہ ۵۱۴ھ میں میں نے یہ واقعہ سنا ۔ مولانا نے حاشیے میں اس کے بجائے ۵۱۲ھ لکھا ۔ نظامی نے لکھا تھا "محمود کے راستے میں کسی متمرد رئیس کی عمل داری تھی جو ایک مضبوط قلعے کا مالک تھا اور محمود کا پڑاؤ دوسرے روز اسی قلعے کے نیچے تھا اس لیے قاصد پیشتر روانہ کر دیا کہ کل حاضر ہو کر رسوم بندگی بجا لائے اور خلعت لے کر واپس چلا جائے ۔ دوسرے روز محمود نے کوچ کیا ۔ خواجۂ بزرگ بادشاہ کے دست راست پر چل رہا تھا کہ ایلچی واپس آتا اور سلطان کی طرف بڑھتا نظر آیا ۔ خواجہ سے سلطان نے پوچھا : "کیا جواب دیا ہوگا ؟" خواجہ نے جواب میں شعر مذکورہ بالا پڑھ دیا ۔ اس بیان سے بعض جزئیات میں مولانا کو اختلاف ہے ۔ جہاں نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی نے پچیس سال محنت کی ، وہاں شبلی نے پندرہ سال لکھے ۔ نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی کے لیے ساٹھ ہزار دینار کی نیل سرکاری اونٹوں پر بھجوائی ۔ مولانا نے اس کے بجائے ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوانا ظاہر کیا ۔ اشرفی اور دینار میں جو فرق ہے ظاہر ہے ۔ دینار ہمارے سکّوں میں ڈھائی تین روپے کے برابر ہے اور اشرفی پچیس تیس روپے کے ۔ نہ اشرفیاں اس عہد میں رائج تھیں ۔ نظامی کے ہاں شہر کا نام طبران اور اس کے دوسرے دروازے کا نام رزان ہے ، مولانا نے ان ناموں کا ذکر تک نہ کیا ۔ اگر ہم کسی مصنف کے بیانات کے ساتھ اس طرح بے پروائی کریں اور یہ طریقہ کچھ دن جاری رہے تو اصلی روایت چند ہی روز میں بالکل مسخ ہو جائے گی ۔ مثال کے لیے شعر مرقومۂ بالا پیش کرتا ہوں کہ

بےپروا اور غافل راویوں کے ہاتھوں اس شعر میں اس قدر تصرف اور تغیر ہوا ہے کہ فردوسی موجودہ حالت میں صرف ایک مصرع کا مالک رہ گیا ہے ، جس کا اثر روایت کے اعتبار پر بھی پڑتا ہے۔ شاہنامے میں فردوسی نے دو طرح اس کو لکھا ہے :

(۱) چو فردا برآید بلند آفتاب
من و گرز و میدان و افراسیاب

(شاہنامہ ، جلد اول ، صفحہ ۱۳۲ ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۲) نجویم برین کینہ آرام و خواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

(جلد دوم ، صفحہ ۲۳۰ ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

شبلی ارشاد کرتے ہیں :

”ناصر خسرو نے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ۴۳۰ھ میں ، جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کارواں سرا دیکھی۔ لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلے سے تعمیر ہوئی ہے۔ فرہنگ رشیدی اور چہار مقالے میں لکھا ہے کہ اس کا نام 'چاہ' ہے اور مرو اور نیشا پور کے راستے میں ہے۔“

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۱۱)

ناصر خسرو کا سفرنامہ مؤلفہ مولانا الطاف حسین حالی طبع ۱۸۸۲ع میری زیر نظر ہے۔ اس میں رباط چاہ یا کسی اور رباط کا ، جو فردوسی کے صلے سے تعمیر ہوئی ، مطلق ذکر نہیں۔ شبلی اپنے اقتباسات کو ایک بے پروائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ خدا جانے کہاں سے حوالہ لیا اور کس کے نام سے لکھا۔ مولانا نے بسم اللہ ہی غلط کی۔ ناصر خسرو کا سفر ۴۳۷ھ سے شروع ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ ۴۳۰ھ میں ناصر خسرو طوس پہنچا۔ مرو سے حکیم ناصر خسرو ۲۳ شعبان ۴۳۷ھ کو نیشاپور کے ارادے سے نکلا اور سرخس ہوتا ہوا شنبہ گیارہ شوال سال

مذکورہ کو نیشاپور پہنچ گیا ۔ سرخس اور نیشاپور کے راستے میں طوس[1] جہاں رباط چاہ بتائی جاتی ہے ، نہیں آتا ۔ اس لیے حکیم مذکور نہ طوس اور نہ اس کی رباط کا ذکر کرتا ہے ۔ اس کے الفاظ ہیں :

''پس بمرو رفتم و ازان شغل کہ بعہدہ من بود معاف خواستم و گفتم کہ مرا عزم سفر قبلہ است ۔ پس حسابیکہ بود جواب گفتم و از دنیاوی آنچہ بود ترک کردم الا اندک ضروری و بست و سوم شعبان بعزم نیشاپور بیرون آمدم و از مرو بسرخس شدم کہ سی فرسنگ باشد و از آنجا بہ‌نیشاپور چہل فرسنگ است ، روز شنبہ یازدھم شوال در نیشاپور شدم چہار شنبہ آخرین ماہ کسوف بود وحاکم زمان طغرل بک محمد بود برادرِ چغری بک ۔'' (سفر نامہ ، صفحہ ۳)

فرماتے ہیں :

''نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامے کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا اور بودلف راوی تھا ، یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو سناتا تھا ۔ لیکن شاہنامے میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فردوسی کے سرپرست اور مربی تھے ، کاتب اور راوی نہ تھے :

---

۱ ۔ سرخس اور نیشاپور کے راستے کی منزلیں حسب ذیل ہیں :
سرخس سے رباط آبگینہ (چھ فرسنگ) رباط آبگینہ سے رباط توران (سات فرسنگ) رباط توران سے رباط ماہی (سات فرسنگ) رباط ماہی سے رباط سنگ بست (چھ فرسنگ) رباط سنگ بست سے دیہہ خاکستر (تین فرسنگ) دیہہ خاکستر سے دیہہ باد (پانچ فرسنگ) دیہہ باد سے نیشاپور (سات فرسنگ) ۔ ان منازل میں ، جو میں نے نزھۃ القلوب حمد اللہ مستوفی سے لی ہیں ، معلوم ہوتا ہے کہ شہر طوس راستے میں نہیں آتا ۔ (حاشیہ مصنف)

ازان نامور نام دارانِ شہر
علی دیلم و بودلف راست بہر

بودلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بودلف ہے جو ایک محتشم رئیس تھا جس کے نام پر اسدی طوسی نے گشتاسپ نامہ لکھا ہے اور دیباچےمیں اس کی مدح و ثنا کی ہے:

ملک بودلف شہریارِ زمین
جہان دار آرانیِ پاک دین
بزرگی کہ باآسمان همسر است
ز نسل براهیم پیغمبر است"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۱۵ ، ۱۱۶)

شاہنامے میں بودلف کا ذکر یوں آتا ہے:

ازان نام ور نام داران شهر
علی دیلمی بود کو راست بہر
کہ همواره کارم بخوبی روان
همی داشت آن مرد روشن روان

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ "بود کو" کے بجائے بودلف چاہیے۔ میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ علی دیلم اور بودلف ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں۔ علی اس کا نام اورکنیت بودلف ہےکیوں کہ شعر مابعد میں ضمیر اور فعل واحد آئے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ کاتب ہو۔ جو اسمائے صفات اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں مثلاً "راست بہر" اور "آن مرد روشن روان" ان سے ظاہر ہے کہ وجاہتِ دنیاوی کے لحاظ سے علی دیلمی کوئی موقر رتبہ نہیں رکھتا تھا۔ میں قاضی صاحب کے نظریے میں شریک نہیں ہو سکتا ، کیوں کہ کنیت کی مماثلت اول تو کوئی وقیع اور وزنی دلیل نہیں ہو سکتی، علاوہ بریں گرشاسپ نامۂ اسدی ، جیساکہ اسدی کے حالات میں دکھایا جا چکا ہے ، ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوتا ہے۔ بعدِ زمانی کے علاوہ مراتبِ

دنیاوی میں اختلاف ایک دوسرے سے امتیاز دینے کے لیے کافی ہے۔

تاریخ عجم پر بعض قدیم عربی تراجم و تصنیفات کے نام گنا کر علامہ شبلی فرماتے ہیں :

''ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا۔ فردوسی کا دعویٰ ہے کہ قدیم زمانے کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی ، لیکن مرتب اور مدوّن نہ تھی۔ موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے۔ ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پراتم موبد جمع کیے اور ان پراگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کرائی۔'' (شعرالعجم ، صفحہ ۱۲۳)

فردوسی کو اس کے قومی غرور کے اثرات میں عربوں کی احسان ناشناسی کا ملزم قرار دینے میں مولانا شبلی صریح بے انصافی سے کام لے رہے ہیں ، اس لیے کہ عربوں کے احسان کا کوئی سوال یہاں شروع ہی سے پیش نہیں آتا۔ تاریخ ایران پر تراجم و تالیفات کرنے والے تمام تر ایرانی تھے۔ عربی زبان اس عہد کے ایران کی علمی اور ادبی زبان تھی۔ عبد اللہ بن المقفع ، محمد بن جہرم البرمکی ، ہشام بن قاسم سپاہانی، بہرام شاہ‌بن مروان شاہ ، بہرام بن بہرام سپاہانی ، بہرام الموبد ، زادویہ بن شاہویہ اصفہانی ، طبری ، مسعودی ، ابو حنیفہ دینوری ، موسی بن عیسی الخسروی ، ابوالموید بلخی قریب قریب تمام ایرانی اور ایران زا ہیں۔ فردوسی کو اپنے ملکی بھائیوں کی تصنیفات سے امداد لینے میں قومی غرور کیوں مانع آتا۔ نہ عربی ذرائع کا نظر انداز کرنا فردوسی کے لیے ممکن تھا۔ مثلاً سکندر کے حالات شاہنامے میں اسلامی روایات کے مطابق ہیں ، جو کسی پہلوی نسخے سے منقول نہیں ہو سکتے۔ مجوسیوں کے ملعون اور مردود سکندر

اور فردوسی کے سکندر میں ، جو خانۂ کعبہ کی زیارت کو بھی جاتا ہے ، بڑا فرق ہے ۔

رہا یہ امر کہ فردوسی نے عربی تصنیفات سے زیادہ کام کیوں نہیں لیا ؟ اس کے جواب تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن میں اس کی استطاعتِ ماحول اور زمانے کی مشکلات کا مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں ؛ تعلیم ہمارے زمانے کی طرح آن ایام میں عام نہیں تھی ، اس لیے کتابوں کا عزیز الوجود ہونا لازمی تھا ۔ علمی کتابوں کا ہر مقام پر دست یاب ہونا بھی دشوار تھا ۔ سامانی شاہی کتب خانے میں اگر یہ تمام ذخیرہ موجود تھا تو فردوسی جیسے غریب شاعر کے لیے اس تک رسائی معلوم ۔ شاہنامے کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے مقصد سے اس نے بلخ ، بخارا اور ہرات وغیرہ شہروں کا سفر بھی کیا ہے ۔ سیاحوں اور شائقین کے لیے سفر کرنا اور اپنی تلاش جاری رکھنا آن ایام میں دشوار تھا ۔ خراسان پر تین زبردست شخص اپنا استحقاق جتا رہے تھے ، اور اپنے حقوق کی محافظت میں ایک دوسرے کو زبانِ شمشیر سے جواب دے رہے تھے ۔ حسام الدولہ ابوالعباس تاش ، سپہ سالار ابو علی سیمجوری اور فائق بدنصیب خراسان کے طاقت ور دعوے دار تھے ۔ جنگ و فساد کی آگ ہر طرف بھڑک رہی تھی :

زمانہ سرای پر از جنگ بود
بجویندگان بر جہان تنگ بود

(شاہنامہ ، جلد اول ، صفحہ ۳)

فردوسی کو اپنی تصنیف کے لیے کسی معتبر اور مکمل تصنیف کی ضرورت تھی جو تمام قصص و افسانہ و تاریخِ ایران پر حاوی ہو ۔ مورخ کو اپنے تاریخی سرمایے کے لیے قدیمی ذرائع بھی درکار ہیں ۔ اس ضرورت سے اس نے اپنے آپ کو زردشتی روایات کا پابند کر لیا ۔ چناں چہ ایسی ہی کتاب پسند کی جس کے راوی اور مدّون پارسی اور مجوسی تھے ۔ فردوسی کا یہ قول کہ قدیم تاریخ ایران ایک پریشان

اور بے ترتیب حالت میں تھی ، میری رائے میں بالکل صحیح ہے ۔ شبلی نے جس قدر تصانیف کا نام لیا ہے ان کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ عربی ذرائع تاہم فردوسی کے مقصد کے لیے نامکمل تھے ۔ فردوسی خود باوجود جدوجہد تمام سلسلۂ روایات ایران پر حاوی نہ ہو سکا ۔ اگرچہ نامۂ خسروان کے علاوہ متعدد مقامات پر زندہ راویوں سے بھی مدد لی ، پھر بھی کئی داستانیں فردوسی سے چھوٹ گئیں ۔ مثلاً گرشاسپ نامے کی داستانیں فردوسی کو دست یاب نہیں ہوئیں ۔ چناں چہ اسدی :

بشهنامه فردوسی نغزگوی
چو از پیش گویندگان برد گوی
بسی یاد رزم یلان کرده بود
وزین در سخن یاد ناورده بود
نهالی بد این رسته هم ز اندرخت
شده خشک و بی‌بار و پژمرده سخت

(گرشاسپ نامۂ حکیم اسدی ، صفحہ ۱۰ - ۱۱ ، طبع آقا میرزا محمد ملک الکتاب ، بمبئی ، ۱۳۰۷ھ)

ابوعلی بلعمی بھی کہتا ہے کہ گرشاسپ کی داستان ابوالموید بلخی نے اپنے شاہنامۂ بزرگ میں مفصل بیان کی ہے ۔ علیٰ ھذا شہریار نامے اور بہمن نامے کے واقعات ہیں جو فردوسی کی نظر سے نہیں گزرے اور سلجوقی عہد میں دوسرے شعرا نے ان کو نظم کیا ۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ایران کی تاریخ پر کوئی سندی اور جامع کتاب موجود نہیں تھی ؟ اس کے علاوہ پہلوی اور عربی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور داستانوں کا وجود کافی شہادت ہے اس خیال کی کہ سلسلۂ روایات ِ ایران کی مکمل تدوین نہیں ہوئی تھی ۔ جستہ جستہ داستانیں مثلاً شہزاد و پرویز ، کارنامۂ اردشیر ، مزدک نامہ ، گنج شایگان ، شطرنج نامہ ، کارنامک ارتخشتر ، یادگار زریران ، اندرز خسرو قباتان ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ عجم

ایک منتشر حالت میں تھی ، اور اس کی داستانیں مختلف لوگوں کے پاس ملتی تھیں :

پراگندہ در دست ہر موبدی
وزو بہرۂ بردہ ہر بخردی

(شاہنامہ ، جلد اول ، صفحہ ۳)

فردوسی کا یہ دعویٰ کہ ایک دہقان رئیس نے پرانے موبدوں کو جمع کرکے ایران کی تاریخ پر ایک کتاب تدوین کی ، بالکل راست معلوم ہوتا ہے ۔ دیباچہ قدیم شاہنامہ اس بارے میں کافی روشنی ڈالتا ہے ۔ ابو منصور عبد الرزاق کے ذکر میں اس دیباچے میں لکھا ہے :

"ابومنصور[1] عبدالرزاق مردی بود با فر و خوش کام و

---

۱ ۔ بقول گردیزی اس کا نام ابو منصور محمد بن عبدالرزاق ہے ۔ اس کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ۔ عبدالملک بن نوح سامانی (۳۴۳ھ ۔ ۳۵۰ھ) کے عہد میں امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم کے عزل پر جمادی الآخر ۳۴۹ھ میں اس کو سپہ سالار خراسان بنا دیا گیا ۔ لیکن الپتگین (بانیٔ خاندانِ غزنہ) کو خوش رکھنے کے واسطے اسی سال ذی حجہ میں یہ منصب اس سے لے کر الپتگین کو دے دیا گیا ۔ ابومنصور واپس طوس چلا گیا ۔ منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۰ھ) کے زمانے میں غزنی کی طرف فرار کرتے وقت الپتگین خراسان اسی ابو منصور بن عبدالرزاق کے حوالے کرگیا ۔ ادھر دربار بخارا سے وہ التگین کی مزاحمت اور گرفتاری کے واسطے مقرر ہوا ۔ ابومنصور نے اپنی فوج تعاقب میں بھیجی مگر الپتگین ہاتھ نہ آیا ۔ اگرچہ دربار بخارا نے ابومنصور کو سپہسالار خراسان بنانے کا وعدہ کرلیا تھا ، لیکن اس کو یقین نہ آیا اور کھلم کھلا بغاوت کر دی ۔ مرو کی طرف بڑھا ، شہر کے دروازے اس پر بند کر دیے گئے ، اس نے غارت گری شروع کر دی ۔ باورد اور نسا پہنچا ۔ حاکم نسا کے ورثا سے بہت سا مال وصول کیا ۔ آخر وشمگیر نے یوحنا طبیب کو ہزار دینار رسوت دے کر اس کو زہر دلوا دیا ۔ سامانیوں نے امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم مذکور کو

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بزرگ اندر کام روایی و بادستگاهی تمام از بادشاهی و اندیشه بلند داشت و بگوهر از تخم گردان ایران بود . . . . . . از روزگار آرزو کرد تا او را نیز یادگاری بماند درین جهان ۔ پس دستور خویش ابو منصور المعمری را بفرمود تا بخداوندان کتب نامه کرد و کس فرستاد از دهقان و فرزانگان و جهان دیدگان از شهرها بیاوردند و چاکر او ابو منصور المعمری را بفرمود تا نامه گرد کر دو کس فرستاد بشهر های خراسان و شیاران را از آنجا بیاورد از هرجای چون شاخ (ماخ۔ ؟) پسرخانی (؟)از هرات و چون یزدان داد پسر شاپور از سیستان و ماهوی خورشید پسر بهرام از شاپور (نیشاپور) و شادان پسر برزین از طوس و بنشاند بفرا آوردن این نامها (از کیومرث) نخستین که اندر جهان آمد او بود که آئین مردی آورد و مردمان را از جانوران پدید کرد تا یزدگرد که آخر ملوک کیان بود اندر ماه محرم که سال برسی صد و چهل و شش (بود) از هجرت خواجۂ دنیا و عقبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ‌علیہ وسلم و این را شاهنامه نام نهاد ۔"

دوبارہ سپہ سالار خراسان بنا کر ابو منصور کی سرکوبی کو روانہ کیا ۔ جنگ قائم ہونے پر زہر اپنا اثر کر چکا تھا ۔ بینائی تک زائل ہو گئی ۔ شکست کے بعد اس کے آدمیوں نے اس کو لے جانا چاہا مگر اس کی حالت اس قدر غیر ہو چکی تھی کہ خود اس نے کہا کہ میرے لیے راحت اسی میں ہے کہ تم مجھے یہیں چھوڑ جاؤ ۔ چناں‌چہ اس کو میدان جنگ میں چھوڑ دیا گیا ۔ عین اس وقت ایک سقلابی غلام ، جو احمد بن منصور بن قراتگین کی فوج سے متعلق تھا ، پہنچا ۔ اس نے سب سے پہلے اس کا سر کاٹا ، پھر انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اپنے افسر کے پاس لے گیا ۔ ابو منصور کا قتل ۱ د — . د ۳ ھ میں تصور کرنا چاہیے ۔

(حاشیہٗ مصنف)

دیباچۂ قدیم کا یہ بیان فردوسی کے قول کی پوری پوری تصدیق کرتا ہے اور یہی شاہنامہ فردوسی کا قدیمی ماخذ ہے جس کا نسخہ اس کے مہربان دوست نے بہم پہنچایا تھا ۔

قولہ : ''سامانیوں (کذا) کو ایران کی تاریخ مرتب کرنے کا ھمیشہ خیال رہا ۔ ان میں سے نوشیروان کو سخت شغف تھا ۔ چناںچہ تمام اطراف و دیار میں قاصد بھیج کر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کیے ۔ یزدگرد نے اپنے زمانے میں ان سب کو دانش‌ور دہقان کے حوالے کیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز کے زمانے تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کردے ۔ دانش‌ور مذکور مدائن کے رؤسا میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا ۔ اس نے تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۲۵)

تاریخ ایران کے متعلق نوشیروان کا اشتیاق اور اس کے لیے ذخیرہ جمع کرنے کا ذکر کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا ۔ علیٰ ھذا دانش‌ور دہقان اور اس کی کتاب تدوین کرنے کا قصہ بھی کتبِ تواریخ میں نہیں ملتا ۔ فردوسی نے شاہ نامے میں نوشیروان کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں ۔ اس کی دانش مندی اور دانائی کی بڑی تعریف کی ہے لیکن واقعۂ بالا کا ذکر نہیں کیا ۔ شاہ نامے سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ہرمز پسر نوشیروانِ عادل نے قید کے ایام میں اپنے فرزند خسرو پرویز سے درخواست کی تھی کہ وہ ایک فوجی آدمی، جس کو پرانی جنگوں کے قصے یاد ہوں ، بھیج دے اور ایک بوڑھا آدمی جو بادشاہوں کے حالات میں دستگاہ رکھتا ہو ؛ ان کی نوشتہ تاریخ لائے ۔ شاہ نامہ :

و دیگر سواری ز گردن کشان
کہ از رزم دیرینہ دارد نشان

بر من فرستی که از کار زار
سخن گوید و کرده باشد شکار
همان نیز داننده مردی کہن
که از شہریاران گذارد سخن
نوشته یکی دفتر آرد مرا
بدان درد و سختی سر آرد مرا

(جلد ۴ ، صفحه ٦٦)

وله : ''رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہے ، تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام نریمان کی اولاد سے تھا ۔ اس کے پاس سلاطین ایران کی تاریخ تھی اور رستم کی اکثر داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں ۔ شغاد کا قصہ میں نے اس سے لے کر نظم کیا ۔''

(شعر العجم ، صفحه ۱۱۸ ، ۱۳۳۹ھ)

مولانا کے آخری جملے کی کسی قدر تشریح ضروری ہے ۔ فردوسی نے لکھا ہے : ع

بگویم سخن آنچہ زو یافتم

بہ ظاہر شاعر کا مطلب روایتِ شغاد ہی سے ہے ۔ اگرچہ آزاد سرو اور فردوسی کی ملاقات ان کے زمانوں کے تفاوت کو دیکھتے ہوئے مشکل معلوم ہوتی ہے ۔

احمد بن سہل جس کے پاس آزاد سرو تھا ، بہ‌قول زین‌الاخبار اصیلانِ عجم سے ہے ۔ جرج میں جو مرو کے عمدہ مواضعات سے ہے ، ان کا خاندان آباد تھا ۔ احمد کا باپ سہل بن ہاشم نجوم میں بڑا کامل تھا ۔ احمد کے تین بھائی تھے : فضل ، حسین اور محمد ۔ سہل سے کسی نے پوچھا کہ تم نے اپنے فرزندوں کا طالع بھی دیکھا ہے ؟ اس نے جواب دیا ''کیا دیکھوں ، تینوں ایک ہی دن میں عربوں کی حمایت میں مارے جائیں گے ''۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا ۔ جب احمد بڑا ہوا ، اس نے اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھانی ۔ اس

کے پاس ہزار آدمی جمع ہو گئے ۔ عمرو بن لیث نے اس کو بلوا کر قید میں ڈال دیا ۔ آخر حمام کے بہانے فرار ہو کر مرو پہنچا اور فوج جمع کر کے عمرو کے عامل کو گرفتار کر لیا ۔ پھر اسماعیل بن احمد سامانی کے پاس بخارا چلا گیا ۔ جب ۲۸۹ھ میں خراسان پر اسماعیل کا قبضہ ہوا ، نیشاپور احمد بن سہل کے حوالے ہوا ۔ اس کے ہاتھ سے بڑے بڑے کام نکلے۔ اسماعیل کے جانشین احمد بن اسماعیل (۲۹۵ھ و ۳۰۱ھ) کے عہد میں بھی معزز و مکرم رہا ۔ امیر نصر (۳۰۱ھ و ۳۲۱ھ) کے دور میں جب حسین بن علی نے بغاوت کی ، احمد اس کی سزا دہی کے لیے مامور ہوا ۔ پہلے اس نے ہرات حسین کے بھائی سے چھینا ، پھر حسین کو شکست دے کر گرفتار کر لیا ۔ اس کے بعد ایسے واقعات پیش آئے کہ خود احمد بن سہل باغی ہو گیا ۔ اس نے امیر نصر کا نام خطبے سے موقوف کر دیا ۔ قراتگین امیر گرگان نے اس پر چڑھائی کی ۔ احمد بن سہل نیشاپور چھوڑ کر مرو چلا آیا اور قلعۂ حسین تعمیر کیا ۔ بخارا سے اس کی سرکوبی کے واسطے حمویہ بن علی آیا ۔ اس نے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ احمد بن سہل تمام حزم و احتیاط بالائے طاق رکھ کر قلعے سے نکلا اور اپنے حریف سے جنگ کرنے حوران پہنچ گیا ۔ دریا کے کنارے گھمسان کا معرکہ ہوا ۔ اس کی فوج شکست کھا کر بھاگ گئی ۔ احمد تنہا لڑتا رہا ۔ گھوڑا مارا گیا ۔ پیدل ہو کر لڑا اور پکڑا گیا ۔ بخارا لے جا کر قید میں ڈال دیا گیا ۔ جہاں ۳۰۷ھ میں اس نے وفات پائی ۔

آزاد سرو، احمد بن سہل کا ساتھی فردوسی سے ملاقات کے وقت تقریباً سو یا سو سے زیادہ عمر کا ہوگا ۔ ان کی ملاقات ۳۶۵ھ اور ۳۷۰ھ کے درمیان ہونی چاہیے ، جب فردوسی شاہ نامے کے واسطے ذخیرے کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر اختیار کرتا ہے ۔

قولہ : "عربوں کے حملے میں یہ کتاب حضرت عمر کی خدمت میں پیش کی گئی ۔ آپ نے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات

کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں - غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہوکر حبش پہنچی - بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا - وہاں سے ہندوستان پہنچی - یعقوب لیث نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابومنصور عبدالرزاق بن عبدالرزاق عبداللہ بن فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے - چناں‌چہ تاج بن خراسانی ہروی ، یزدان داد ، شاہور سیستانی ، ماھوی بن خورشید نیشاپوری ، سلیمان طوسی ان سب نے مل‌کر سنہ ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا - یہی کتاب سامانیوں کے ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا - اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی ، وہاں ترجمہ ہو کر پھر ہندوستان پہنچی ، ہندوستان سے ایران میں آئی ، صریح غلط اور بیہودہ ہے - باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں -"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۲۵ و ۱۲۶)

شکر ہے کہ اس موقع پر شبلی نے اپنے مایۂ ناز دیباچے کے خلاف کسی قدر صدا بلند تو کی - لیکن میں ان باقی واقعات پر نظر ڈالتا ہوں : صاحب دیباچہ نے یعقوب بن لیث کو ایک صدی پایۂ فرودین میں رکھا - یعقوب ۲۶۵ھ میں رہگرائے ملک عدم ہوتا ہے - بھلا ۳۶۰ھ میں یعقوب اپنی قبر سے اٹھ کر ابومنصور عبدالرزاق کو حکم دینے کہاں سے آ گیا - صاحب دیباچہ کو اپنے قصوں کے توڑ جوڑ میں تاریخ کا لحاظ نہیں رہا - ابومنصور عبدالرزاق نے ترجمے کا حکم نہیں دیا بلکہ تدوین اور تصنیف کا - اس معاملے میں دیباچۂ قدیم اور شاہ نامہ دونوں ہی متفق ہیں - ۳۴۶ھ میں یہ تصنیف تیار ہوئی تھی ، نہ ۳۶۰ھ میں - تاج خراسانی کو دیباچۂ قدیم میں شاخ پسر خانی (؟) لکھا ہے لیکن شاہ نامے میں اس کا نام "ماخ" ہے :

یکی پیر بد مرزبان ہری
پسندیدہ و دیدہ از ہر دری

جہان دیدہ و نام او بود ماخ
سخندان با برگ و با بزر و شاخ
بپرسیدمش تا چہ دارد بیاد
ز ہرمز کہ بنشست بر تخت داد

(پادشاہی ہرمز و انوشیروان ، جلد چہارم ، صفحہ ۴۰۵)

فردوسی نے اس سے داستان ہرمز حاصل کی ۔ مولانا کا سلیمان طوسی دیباچہؑ بایسنغری میں سلیمان بن نورین ہے مگر دیباچہؑ قدیم میں صاف شادان پسر برزین ہے ۔ مزید شہادت کے لیے شاہ نامہ موجود ہے ۔ بیت :

نگہ کن کہ شادان برزین چہ گفت
بدانگہ کہ بکشاد راز از نہفت

("فرستادن نوشیروان برزوی پزشک را بہ ہندوستان برای آوردن داروی شگفت و فرستادن برزوی کتاب کلیلہ و دمنہ را بنزد او ۔") (جلد چہارم ، صفحہ ۳۳)

گویا شادان بن برزین کے حوالے سے داستان کلیلہ و دمنہ فردوسی نے لکھی ہے ۔ مولانا کے بیان کا یہ حصہ کہ یہ کتاب سامانیوں کے ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا ، ذرا غور طلب ہے ؛ خدا جانے صاحب دیباچہ نے یہ بیان کہاں سے اخذ کیا ۔ اگر صحیح ہے تو مولانا شبلی فردوسی پر عربوں کے احسان نہ ماننے کے معاملے میں ناحق ناراض ہوئے ۔ جب سامانی اور دقیقی اس کو مستند کتاب مانتے آئے ہیں تو پھر فردوسی نے معتبر مان کر اپنے شاہ نامے کی بنیاد اگر اسی کتاب پر ڈالی تو کیا قصور کیا ؟

خور فیروز کا سلطان محمود کی خدمت میں تاریخ عجم پیش کرنا یا بادشاہ کرمان کا مورخ آذر برزین کو جو عجم کی تاریخ پر سب سے بڑے سرمائے کا مالک تھا ، سلطان کے دربار میں روانہ کرنا ضعیف روایتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ ایک بات البتہ صاف ہے ؛ وہ یہ کہ

محمود کو تاریخ ایران سے کوئی خاص ذوق یا لگاؤ معلوم نہیں ہوتا ۔ شبلی فرماتے ہیں :

''ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہوگئی تھی ۔ عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں ۔ رودکی اور ابوشکور بلخی وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے ۔ سلطان محمود کے زمانے میں ایک فاضل نے 'شاہ نامے' کے جواب میں 'عمر نامہ' ایک کتاب نثر میں لکھی تھی۔ وہ ہماری نظر سے گزری ہے ۔ اس کا بھی یہی حال ہے ۔ اسی زمانے میں شیخ ابوعلی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآ نہ ہوسکا ۔

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۴۲)

ایران میں شروع ہی سے عربی کا شدت سے مخلوط ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ عباس مروزی کے اشعار اس بارے میں سند نہیں مانے جا سکتے ۔ متاخرین کے ہاتھوں ان میں اس قدر ترمیم ہو گئی ہے کہ قدامت کی بو تک باقی نہیں رہی ۔ رودکی کے متعلق مولانا کو جو سہو ہے وہ ظاہر ہے ۔ قطران تبریزی کے قصائد کی بنا پر ایسا فرماتے ہیں ۔ لیکن وہ سلجوقی عہد کی زبان ہے ۔ اس دور میں عربی ، فارسی زبان میں بہت دخیل ہوگئی تھی ۔ اس غلط فہمی کی بنا پر مولانا نے یہ نظریہ قایم کیا کہ دقیقی فارسی زبان کے گلزار کو عربی الفاظ کے خس و خاشاک سے پاک کرنے والا ہے ۔ رہا ابوشکور بلخی ، اس کے کلام کا جس قدر نمونہ شعرالعجم (صفحہ ۵۴ ، ۵۵) میں دیا گیا ہے اس میں عربی کا ایک لفظ بھی قسم کھانے کو نہیں ملتا ۔ عربی کا اثر ابتدا میں فارسی پر کچھ نہیں تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ، یہ اثر بتدریج ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں اس نے ایک طوفان بےتمیزی برپا کر دیا ۔ عمرنامہ

اور حکمت علائیہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں اس لیے کہ وہ پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں اور نثر میں ہیں۔ حکمت علائیہ کی نسبت یہ خیال کہ شیخ بو علی سینا نے خالص فارسی زبان میں لکھنے کا قصد کیا، مجھ کو غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اول تو فلسفیانہ اصطلاحات کی فارسی زبان میں غیر موجودگی کی بنا پر ایسا قصد کرنا دیوانگی سے کم نہیں تھا۔ دوسرے شیخ نے اس تصنیف میں ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے:

"باید کہ من خادم این مجلس بزرگوار کتابی تصنیف کنم بپارسی کہ اندر وی اصلہا ونکتہای پنج علم از علمہای پیشینگان گرد آورم بغایت مختصر۔"

(مایۂ دانش علائی، مطبع فیروز دکن)

علامہ شبلی فردوسی کی شاعری پر خیال آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سہراب اب سپہ گری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا۔ دیکھو فردوسی اس کی نالہ و زاری کو کس طرح ادا کرتا ہے:

همی گفت ازان پس دریغا دریغ
کہ شد ماه تابنده در زیر میغ
غریب آهوی آمدم در کمند
کہ از بند جست و مرا کرد بند
زهی چشم بندی کہ آن پُر فسون
بہ تیغم نخست و مرا ریخت خون
ندانم چہ کرد آن فسون‌گر بمن
کہ ناگہ مرا بست راه سخن
بہ زاری مرا خود بباید گریست
کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست

همی گفت و می سوخت از غم بسی
نمی‌خواست رازش بداند کسی
ولی عشق پنہان نماند کہ راز
بمردم نماید همی اشک باز
غم جان برآرد خروش از درون
اگر چند عاشق بود ذو فنون

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں۔ استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے، شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں: ع

کہ از بند جست و مرا کرد بند

ع: بہ تیغم نخست و مرا ریخت خون

یہ سب کچھ ہے لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہے، محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں، اس لیے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے، اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے:

ازان کار هومان نبودش خبر
کہ سہراب را هست خون در جگر
ولی از فراست بدل نقش بست
کہ او را پریشانی داد دست
بدام کسی پای بند آمده است
ز زلفی بتی در کمند آمده است
نهان می‌کند درد و خونین دلست
هوس میرود راه و پا در گلست
یکی فرصتی جست و گفتش براز
کہ ای شیر دل گرد گردن فراز

فریب پری پیکران جوان
نخواهد کسی کو بود پهلوان
نه رسم جهانگیری و سروری است
که از مهر ماهی بباید گریست
ز توران بکاری برون آمدیم
شناور به دریای خون آمدیم
اگر چند این کار باشد بکام
ولی هست در پیش رنج تمام
بیاید شهنشاه کاؤس و طوس
چو رستم که بر شیر دارد فسوس

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے :

توی مرد میدان این سروران
چکارت به عشق پری پیکران
تو کاری که داری نبردی بسر
چرا دست یازی بکار دگر
به نیروی مردی جهان را بگیر
ز شاهان بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدست تو آید فراز
بهر جای خوبان برندت نماز
ازان گفته سهراب بیدار شد
دلش بستهٔ بند پیکار شد
بگفت ای سر نامداران چین
بگفتار خوبت هزار آفرین
شد این گفت تو داروی جان من
کنون با تو نو گشت پیمان من
جهان را سراسر چه خشک و چه آب
در آرم بفرمان افراسیاب

بگفت این و دل را ز دلبر بکند
برآمد بر افراز تخت بلند

دیکھو ایک شجاع دام عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے ۔ فردوسی نے موقع پا کر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۴۹ ، ۱۵۱ ، طبع سوم)

سطور بالا میں مولانا کی نکتہ سنجیاں قابل ستائش ہیں ، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس موقع پر مولانا کسی نامعلوم شاعر کے کلام کی داد دینے میں مصروف ہیں ، کیوں کہ یہ تمام اشعار الحاق ہیں ، فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور بعد میں کسی نے اضافہ کر دیے ہیں ۔ یہ اصل میں چھپن اشعار کا ایک قطعہ ہے جو :

همی جست گرد آفرید و ندید دلش مهر پیوند او برگزید

سے شروع ہو کر :

ازان شاد شد شاه توران زمین همی کرد سهراب را آفرین

پر ختم ہوتا ہے ۔ اور ان اشعار کے درمیان واقع ہے :

بفرمان همه پیش او آمدند بجان هر کسی چاره جو آمدند

(سطر ۳۲ ، صفحہ ۸۹)

ازان پس چو نامه به خسرو رسید
غمی شد دلش کان سخنها شنید

(جلد اول ، صفحہ ۹۰ ، سطر ۱۵ ، بمبئی ، ۱۲۷۵ھ)

ان اشعار کی تلاش میں میں نے شاہنامے کے کئی معتبر اور قدیمی نسخے دیکھے لیکن ان میں یہ اشعار نظر نہیں آئے ۔ علاوہ برین خود ٹرنر میکن جس نے پہلی مرتبہ شاہنامہ چھاپ کر شائع کیا ہے ، ان اشعار کو الحاق مانتا ہے ۔

منوچہری

اس سے قبل ایک مقام پر گذارش ہو چکا ہے کہ مولانا کے منین و تاریخ غلط ہوتے ہیں ۔ اس قسم کی تازہ مثال ذیل میں پیش ہے ۔ شبلی فرماتے ہیں :

"امیر منوچہر بن شمس‌المعالی امیر قابوس بن وشمگیر ، جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور ۳۸۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا ، یہ اس کے دربار میں ملازم تھا ۔ اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا ۔ ۴۱۱ھ میں امیر منوچہر نے انتقال کیا تو یہ غزلین میں آیا ۔"

(شعر العجم ، صفحہ ۱۸۶)

فلک المعالی امیر منوچہر ۴۰۳ھ میں تخت نشین ہوا ، نہ ۳۸۶ھ میں ۔ اس کی وفات ۴۲۴ھ میں ہوئی نہ ۴۱۱ھ میں :

ولہ : "تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی لیکن یہ بھی خوشامد کا ایک پہلو تھا ، جس طرح قلعے میں لوگ بہادر شاہ سے گلستان پڑھنے جایا کرتے تھے "۔

(صفحہ ۱۸۶ ، شعر العجم)

یہاں تذکرہ نگار کیوں بدنام کیے جاتے ہیں ۔ عنصری کی استادی کا تو خود منوچہری کو اعتراف ہے[1] جہاں وہ کہتا ہے :

---

۱ ۔ اس کے متعلق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا اپنی 'تاریخ ادبیات در ایران' (صفحہ ۵۸۴ ، جلد اول) میں رقم طراز ہیں :

"ابوالقاسم حسن عنصری کہ منوچہری قصیدۂ معروف خود را بمطلع ذیل :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید
روبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن

گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند
تا عزیزی روضہ بیند و طبیعی نسترن[1]

کیا واقعی بہادر شاہ بادشاہ اتنی فارسی بھی نہیں جانتے تھے کہ گلستان پڑھا سکتے ؟ پادشاہ مرحوم کی تالیف شرح گلستان ، جو سنہ ۱۸۵۷ع سے کئی سال پیشتر قلعۂ معلیٰ میں چھپی تھی ، راقم کے کتب خانے کی زینت ہے ۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :

"بہر حال عنصری نے اس کو دربار شاہی میں پہنچایا اور سلطان محمد ابن سلطان محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا ، یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا ، کچھ روک ٹوک نہ تھی ۔ محمد چند روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار

ای نہادہ بر میان فرق جان خویشتن
جسم ما زندہ بجان و جان تو زندہ بتن

در مدح او سرودہ و او را در آن قصیدہ استاد خود خواندہ است ۔"

لیکن آقای محمد دبیر سیاقی مرتب دیوان منوچہری (مطبوعہ طہران ، سنہ ۱۳۲۴ شمسی) فرماتے ہیں :

"این نکتہ کہ منوچہری عنصری را استاد خود خواندہ است و برخی از تذکرہ نویسان باسناد آن ویرا شاگرد عنصری دانستہ اند، نہ از لحاظ تلمذ و تعلم است بلکہ از نظر اختراعیست کہ شاعر جوان بملک الشعراء دربار محمود و مسعود گذاردہ و از جہت ارادتیست کہ بوی ورزیدہ است ۔"

(صفحہ ن ، دیباچۂ دیوان منوچہری) (مرتب)

۱ ۔ قصیدہ در لغز شمع و مدح حکیم عنصری ، صفحہ ۶۴—۶۸ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی ، طبع ۱۳۲۴ شمسی ۔ (مرتب)

ہوکر قید ہوا اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تخت سلطنت پر جلوس کیا ۔"
(شعرالعجم ، صفحہ ۱۸۷)

منصب ترخانی[1] کا ذکر ہم غزنوی دور میں نہیں پڑھتے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ سلاطین مغول کے عہد میں رائج ہوا ۔ یہ ایک ترکی عہدہ ہے نہ ایرانی ۔ منوچہری کا سلطان محمد ابن سلطان محمود سے کوئی تعلق نہیں[2] رہا ۔ اس لیے اس کے دیوان میں محمد کی مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں اور ان ایام میں منوچہری کے دربار غزنہ سے تعلقات قائم ہوئے تھے ۔ فرماتے ہیں :

"دولت شاہ نے اس کو بلخی لکھا ہے چونکہ نہایت دولت‌مند تھا اس لیے شصت‌کلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا ۔"
(شعرالعجم ، صفحہ ۱۸۶)

قبلہ مولانا دولت شاہ[3] کی سند پر منوچہری کو بلخی مان رہے

---

۱ - مولانا شبلی نے اس سلسلے میں مجمع الفصحا کا حوالہ دیا ہے ۔ آقای محمد دبیر سیاقی لکھتے ہیں :

"منصب ترخانی داشتن استاد در دستگاہ محمد بن محمود کہ ھدایت در مجمع الفصحا متذکر آن شدہ است ، نیز مردود است ؛ زیرا چنانکہ در کیفیت پیوستن منوچہری بدربار مسعود گفتیم وی با محمد بن محمود کہ در سال ۴۲۱ھ گرفتار و در قلعہ مندیش زندانی شد ، نمیتوانستہ است ارتباط داشتہ و مقیم درگاھش باشد ۔"

(صفحہ م ، دیباچہ دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی) (مرتب)

۲ - آقای محمد دبیر سیاقی رقم طراز ہیں :

"این کہ دولت شاہ و امین احمد رازی منوچہری را از شاعران محمودی شمردہ اند درست نیست ، زیرا گذشتہ از آنکہ در دیوان این شاعر اصلا بنام محمود شعری دیدہ نمیشود ، چنانکہ در فوق گفتیم منوچہری حتیٰ محمد بن محمود را درک نکردہ تا چہ رسد بخود سلطان محمود ۔" (صفحہ ن ، دیباچہ دیوان منوچہری) - (مرتب)

۳ - "قول دولت شاہ سمرقندی در تذکرۃ الشعرا مبنی ببلخی بودن شاعر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہیں ۔ لیکن اگر منوچہری کے اشعار پر ، جن کو خود مولانا بھی نقل کرتے ہیں ، ذرا لحاظ کرایا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ بلخی نہیں بلکہ دامغانی ہے ۔ چنانچہ شعر :

سوی تاج عمرانیان هم بدینسان
بیامد منوچهری دامغانی[1]

اس کا لقب شصت کلہ نہیں تھا بلکہ کسی اور متاخر شاعر کا[2] جس کا نام بقول پروفیسر برون (صفحہ ۱۵۴ ، جلد دوم) شمس الدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

و تردیدی کہ سید نورالدین بن سید محمد صاحب تذکرۂ نگارستان (ص ۱۰۶) در بلخی یا دامغانی بودن شاعر کردہ و این کہ لطف علی بیگ آذر در آتشکدہ بتبع دولت شاہ ویرا در عداد شاعران بلخ آوردہ است ، بتصریح خود استاد کہ خود را دامغانی دانستہ است و بدان اشارہ شد باطل میشود ۔''

(صفحہ م ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی) ۔ (مرتب)

۱ ۔ صفحہ ۱۰۰ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ دبیر سیاقی (مرتب)

۲ ۔ دولتشاہ سمرقندی و بتبع او گروہی از تذکرہ نویسان منوچہری را بلقب شصت کلہ ملقب داشتہ اند ولی این مسئلہ سخت اشتباہست زیرا اولا جز دولتشاہ و تذکرہ نویسان بعد از وی ہیچ کس متذکر این قسمت نشدہ است ۔ ثانیاً چنانکہ از تواریخ و منابع دیگر پیداست لقب شصت کلہ از آن شاعری بودہ است بنام احمد بن منوچہر ، معاصر راوندی ، صاحب کتاب راحت الصدور کہ ہمین راوندی او را معاصر طغرل بن محمد بن ملک شاہ سلجوق (۵۲۱—۵۹۰) میداند ۔ از این روی شکی نیست کہ چون اتفاقاً نام این شاعر و نام منوچہری ہر دو احمد بودہ ، یکی پسر منوچہر و دیگری منوچہری لقب داشتہ است ، لذا دولت شاہ میان آن دو خلط کردہ و شصت کلہ را کہ لقب احمد بن منوچہر است بمنوچہری دادہ ۔''

(صفحہ ن و س ، دیباچہ دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی) (مرتب)

احمد منوچہر ہے۔

منوچہری اپنا نسب سامانی شاہی خاندان سے بیان کرتا ہے:

منم از نژاد بزرگان سامان
کہ بودند شاہان چتر و کواکب

فقیہ ہونے کے علاوہ عربی صرف و نحو اور علمِ طب میں بھی کامل تھا:

من بدانم علمِ دین و علمِ طب و علمِ نحو
تو نہ دانی دال و ذال و را و زا و سین و شین[۱]

عربی ادب میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی۔ تاریخ عرب اور تاریخ عجم سے بھی خوب واقف تھا، نجوم و ہیئت اور موسیقی کا بھی عالم تھا۔ غیر معمولی حافظہ ہونے کی وجہ سے شعرائے عرب کا کلام اس کے ورد زبان رہتا ہے۔ اس کی غیرمعمولی علمیت، فنی، ادبی اور تاریخی تلمیحات نے اس کے دیوان کو مشکل اور ادق بنا دیا ہے۔ بعض قصیدوں میں وہ لغات کا ابر بن کر گرجتا اور برستا ہے۔ تشبیب نگاری، مناظر قدرت، بہار باغ، گل و ریاحین، مرغ وپرند، سفر، شام و صبح، برف وغیرہ کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ جس طرح تشبیہات و استعارات میں جدت قدم قدم پر اس کے ہاں ملتی ہے، اسی طرح صنائع بدائع، لفظی لطافتیں، نئے عروضی اوزان کے استعمال میں بھی اسے تقدم حاصل ہے۔ مبالغہ، تکلف اور تصنع اس کے ہاں سب سے پہلی مرتبہ دیکھے جاتے ہیں۔ منوچہری کو اس نئی صنف شاعری کا موجد کہنا چاہیے جس کی ابتدا اور نشوونما شمال مغرب ایران میں ہوئی اور جس نے قطران تبریزی، خاقانی اور نظامی جیسے شعرا پیدا کیے۔ تجنیس کی بدعت منوچہری نے غزل کے میدان میں بھی شروع کر دی تھی، لیکن شکر ہے کہ یہ رواج مقبول نہ ہوا۔

۱۔ صفحہ ۷۰، دیوان منوچہری، مرتبہ محمد دبیر سیاقی، طبع ۱۳۲۴ شمسی۔ (مرتب)

گھوڑے کے بیان میں منوچہری کو خاص شغف ہے ۔ جس طرح تشبیب کا وہ بادشاہ ہے اسی طرح مدح کے میدان میں اس کا سمند قلم اسپ لنگ بن جاتا ہے ۔ مدح نگاری کبھی اس کو راس نہ آئی ۔ وہ طبیعت کا تمام زور تشبیب پر صرف کر دیتا ہے اور اسی ایک بات نے اس کے دیوان کو موجودہ مذاق میں زیادہ مقبول بنا دیا ہے ۔

۴۲۵ھ میں جب ساری اور آمل کی طرف سلطان مسعود بن محمود کا گزر ہوا، سلطان نے رے سے، جہاں آن ایام میں منوچہری مقیم تھا، خواہش کر کے بلایا :

خواست از ری خسرو ایران مرا از شصت میل
خود ز تو ہرگز نیندیشید در چندین سنین[1]

جب سلطان غزنین کی طرف مراجعت کرتا ہے ، منوچہری بھی کچھ عرصے کے بعد[2] غزنین پہنچ جاتا ہے :

دانی کہ من مقیمم بر درگہ شہنشہ
تا بازگشت سلطان از لالہ زار ساری
وین دشتہا بریدم وین کوہہا پیادہ
دو پای با جراحت دو دیدہ گشتہ تاری
امید آن کہ روزی خواند ملک بہ پیشم
بختم شود مساعد روزم شود بہاری
اکنون کہ شاہ شاہان بر بندہ کرد رحمت
کوشی کہ رحمت شہ از بندہ در گذاری

---

۱ ۔ صفحہ ۷۰ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی ۔ (مرتب)

۲ ۔ شعر ''دانی کہ من مقیمم ۔۔۔ از لالہ زار ساری'' سے آقای محمد دبیر سیاقی یہ دلیل لاتے ہیں کہ شاعر سلطان کی مراجعت سے قبل غزنین پہنچ چکا ہے اور وہاں اس کا منتظر ہے ۔ ملاحظہ کیجیے دیباچہ دیوان منوچہری ۔ (مرتب)

حشم آیدت که خسرو برمن کند نکوئی[1]
ای ویحک آب دریا از من دریغ داری

سلطان مسعود کو اس کی طرز شاعری دل سے پسند تھی :

از بهر آن که شعرم شه را بدل خوش آید
برخاست از توغلغل برخاست از تو زاری
من شعر بیش گویم کان شاه را خوش آید
الفاظهای نیکو ابیات‌های جاری
گر تو بهر مدیحی چندین طپید خواهی
نهار ناصبوری نهار بی قراری

مسعود نے بعض وقت خود شعر کی فرمایش کی ہے۔ منوچہری :

در خواستی تو شعرم این آمدت ز رادی
اینت کریم طبعی اینت بزرگواری
اضعاف حرفهای کز شعر من شنیدی
نیکیت باد و رحمت شادیت و شادخواری[2]

سلطان مسعود کے دربار سے تعلق پیدا کرنے سے پیشتر منوچہری گرگان ، رے اور خانقین میں رہ چکا ہے :

مرمرا باری بدین درگاه شاهست آرزو
نز ری و گرگان همی یاد آیدم نز خانقین[3]

پھر مسعود کی شاہانہ فیاضیوں کی طرف تلمیح کرتا ہوا گویا ہے :

---

۱ - صفحہ ۸۶ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی - (مرتب)

۲ - صفحہ ۸۵ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاقی - (مرتب)

۳ - آقای محمد دبیر سیاقی نے اپنے مرتبہ دیوان (صفحہ ۱۰۷) میں بجائے "خانقین" "خافقین" درج کیا ہے جس کے معنی مشرق و مغرب یعنی 'دو کنارے آسمان' کے ہیں ۔ (مرتب)

شاعرانرا در ری و گرگان و در شروان کہ دید
بدرۂ عدلی[1] بہشت پیل آوردہ بزین
آنچہ این مہتر دہد روزی بکمتر[2] شاعران
معتصم ہرگز بہعمر اندر نداد و مستعین

جس طرح انشاء کی آمد نے لکھنؤ میں، اسی طرح منوچہری کی آمد نے دربار غزنین میں ایک شور مچا دیا ہے ۔ حسد جو تلامیذالرحمن کا ازلی حصہ ہے ، بہت جلد اپنا رنگ لایا اور منوچہری کے بہت حاسد کھڑے ہوگئے۔ ان میں شروان کی طرف کا کوئی شاعر ہے جس کا نام باوجود کوشش نہ معلوم ہو سکا ۔ منوچہری کے خلاف اس نے بہت کچھ حصہ لیا ۔ عام حاسدوں کی شکایت اگرچہ منوچہری کے کئی قصائد میں ملتی ہے ، لیکن دو قصائد میں شاعر کا روے سخن اسی شروانی کی طرف ہے ، جب کہتا ہے :

سال پارین با تو ما را چہ جدال و جنگ خاست
سال امسالین تو با ما در گرفتی جنگ و کین
باش تا سال دگر نوبت کرا خواہد بدن
تا کرامی بایدم زد بر سر وی پوستین
من ترا از خویشتن درباب شعر و شاعری
کمترین شاعر شناسم ہذہ حق الیقین
گر مرا فرمودہ بودی خسرو بندہ نواز
بہتر از دیوان شعرت پاسخی کردم متین
میر فرمودت کہ رو یک شعر او را کن جواب
بود سالی و نکردی ، ننگ باشد بیش ازین
لیکن اشعار ترا آن قدر و آن قیمت نہ بود
کش بفرمودی جواب آن خسرو شاعر گزین

---

۱ ۔ محمد دبیر سیاقی کے ہاں ''عدلی ۔'' (مرتب)
۲ ۔ ''کہتر شاعری'' صفحہ ۱۷ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ دبیر سیاقی ۔ (مرتب)

گر تو ای نادان نه دانی هر کسی داند که تو
نیستی با من بگاه شعر گفتن هم نشین

. . . .

من بفضل از تو فزونم تو بمال از من فزون
بهتر ست از مال فضل و بهتر از دنیاست دین
مال تو از شهریار شهر یاران گرد گشت
ورنه اندر ری تو سرگین چیده ای از پارگین
گر نباشد در چنین حالت مزیدی مر ترا
عارضی بس باشدت بر لشکر میر مهین[1]
هیچ سالی زیست کز دینار سی صد چار صد
از پی عرض حشم کمتر کنی در آستین
وان گهی گوئی من از شاه جهان شاکر نیم
گر نه ننگ آید ازین شه رخت رو بر بند بین[2]
باز شروان شو بدان جای که دادندت همی
گوشت خوک مردهٔ یک ماهه و نان جوین[3]

۴۲۸ھ میں سلطان مسعود نے دریاے جیحون پر پل باندھے جانے کا حکم دیا ۔ اس کے متعلق منوچہری ایک قصیدے میں کہتا ہے :

جز تو نه بست گردن جیحون کسی بغل
وندر نراند پیل نه جیحون دران هزار
دو سال یا سه سال در آن بود تا به بست
جسری در آب جیحون محمود نام دار

---

۱ - دیوان منوچہری ، مرتبہ دبیر سیاق میں ''متین ۔'' (مرتب)
۲ - ''هین'' دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاق ، اور حاشیے میں ''سوی چین ۔'' (مرتب)
۳ - صفحہ ۷۰-۷۱ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر ساق ۔ (مرتب)

در مدت دو هفته به بستی تو ای ملک
جسری در آب جیحون به زان هزار بار
دریا بدان سپه که بجیحون گذاشتی
دریا نکرده بود بجیحون کسی گذار
سالار خانیان را با خیل و با خدم
کردی همه نگون و نگون بخت و خاکسار
تا بر کسی گرفته نه باشد خدای خشم
پیش تو ناید و نه کند با تو چار چار
پورتگین که خشم خدا اندرو رسید
او را ازان دیار دواند باین دیار[1]
تا گنج او خراب شد و خیل او اسیر
تا روز او سیاه شد و جان او فگار
او مار بود و مار چو آهنگ او کنی
اندر جهد ز بیم بسوراخ تنگ غار
گر شاه ما نکشت ورا بود زین قبل
کز تنگ[2] غار، هیچ امیری نکشت مار[3]

مذکورۂ بالا بیانات میں شاعر نے واقعیت کا بہت کم لحاظ رکھا ہے ۔ اصلی معاملات کو اس قدر رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی شناخت قریب قریب مشکل ہوگئی ہے ۔ پل کے لیے بیہقی کہتا ہے :

”و هشتم ماه ربیع الاول نامہ‌ٔ رفت سوی بکتکین چوگان دار محمودی و فرموده آمد تا بر جیحون پلی بسته آید که رکاب عالی

۱۔ دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاق میں یہ مصرع یوں درج ہے :
”اورا از این دیار براندی بدان دیار“ (مرتب)
۲۔ دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاق میں ”عار و ننگ ۔“ (مرتب)
۳۔ صفحہ ۳۲ ، دیوان منوچہری ، مرتبہ محمد دبیر سیاق ۔ (مرتب)

را حرکت خواهد بود سخت زود . . . و جواب رسید کہ پل بستہ آمد بدو جای و درمیانہ جزیرہ پلی سخت قوی و محکم کہ آلت و کشتی ہمہ بر جای بود ازان وقت باز کہ امیر محمود فرمودہ بود۔"

(بیہقی ، صفحہ ۷۰۴ ، طبع کلکتہ)

جب تمام ضروری سامان اور کشتیاں محمود کے وقت سے تیار تھیں ، تو ظاہر ہے کہ پل دو ہفتے کے اندر آسانی سے ترتیب دیا جا سکتا تھا۔ اس پر شاعر کو فخر اور بے جا فخر کرنے کا موقع ملا کہ جب محمود نے پل کے لیے دو تین سال لگائے ، میرے ممدوح نے صرف دو ہفتوں کے اندر اندر تیار کر لیا۔

پورتگین کے خلاف مسعود نے جس مہم کا ارادہ کیا تھا ، اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وزیر اور سران سپاہ اس مہم کے سخت مخالف تھے۔ چناں‌چہ وزیر احمد عبدالصمد کی اس کی نسبت یہ رائے تھی جو اس نے ابو نصر مشکانی سے ظاہر کی تھی۔ میں بیہقی کے الفاظ درج کرتا ہوں :

"وزیر چند بار استادم را گفت می بینی کہ چہ خواهد کرد از آب گذارہ خواهد شد در چنین وقت برمانیدن پورتگین ، بدان کہ وی بختلان آمد و پنج آب بگذشت این کاری است کہ خدای بہ داند کہ چون شود اوهام و خاطر ازین عاجزند و بونصر جواب داد کہ جز خاموشی روی نیست کہ نصیحت کہ بہ تہمت باز گردد نا کردنی ست و ہمہ حشم می دانستند و بایک دیگر می گفتند بیرون پردہ از هر جنسی چیزی ، و بو سعید مشرف را می فرا کردند تا می‌نبشت و سود نمی داشت و چون پیش امیر رسیدندی بر موافقت او سخن گفتندی کہ در خشم می شد۔"

(بیہقی ، صفحہ ۷۰۴ و ۷۰۵ ، طبع کلکتہ)

اسی ماہ کی آنیس تاریخ دو شنبہ کے روز مسعود نے پل سے

عبور کیا اور ترمذ پہنچ گیا ۔ بائیس کو ترمذ سے کوچ کیا اور سلخ کو چغانیاں پہنچا ۔ تیسری ماہ ربیع‌الآخر بدھ کے روز درۂ شونیان کی طرف بڑھا کیوں کہ اس طرف پورتگین کا سراغ چلا تھا ۔ سردی نے آدھر اپنا زور دکھایا ، برف‌باری جاری تھی ، جتنی تکلیف لشکر نے اس سفر میں اٹھائی ، پہلے کسی سفر میں نہیں دیکھی تھی ۔ نو ربیع الآخر کو وزیر کا خط آیا ، اس میں تحریر تھا کہ داؤد سلجوق ایک بڑے لشکر کے ساتھ سرخس سے گوزگانان کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ اس کا قصد ہے کہ اندخود کے راستے سے جیحوں پہنچ کر پل توڑ دے اور دریا پر قبضہ کر لے ۔ اگر خدا نخواستہ پل ٹوٹ گیا تو تکلیف کے علاوہ بڑی رسوائی کا سامنا ہے ۔ امیر مسعود اس خط کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا ۔ پورتگین اس وقت تک سومان سے نکل چکا تھا اور درے پر قابض تھا ۔ وہاں کے چپے چپے زمین سے واقف تھا ۔ علاوہ بریں ہوشیار بدرقے اس کے ہم راہ تھے ۔ ناچار امیر مسعود بغیر کوئی کام بنائے لوٹا ۔ بارہ کو جمعہ کے روز نہایت عجلت میں روانہ ہوا ۔ پورتگین اس موقع کا منتظر تھا ۔ وقت پا کر بہیر پر آ پڑا ۔ کچھ اونٹ اور کوتل گھوڑے لے گیا جس سے پریشانی اور بدنامی ہوئی ۔ (بیہقی ، صفحہ ۷۰۷)

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بیان میں اور منوچہری کے بیان میں بڑا فرق ہے ۔ محمودی دور کے شعرا مثلاً عنصری اور فرخی کے اکثر بیانات تاریخ سے حرف بہ حرف ملتے ہیں ۔ لیکن منوچہری اپنے زور بیان ، قادر الکلامی اور جوش طبیعت کی خاطر واقعات کو بے دردی کے ساتھ قربان کر دیتا ہے ۔

منوچہری کے ممدوحین کی فہرست میں یہ نام[1] شامل ہیں :

۱۔ آقای محمد دبیر سیاقی کے مرتبہ دیوان میں نمبر ۳ ، ۱۱ اور ۱۶ کی مدح میں کوئی قصیدہ نہ مل سکا ۔ باقی کے چودہ ناموں کے علاوہ اس دیوان میں خواجہ ابوالقاسم کثیر ، خواجہ ابو طاہر اور محمد بن نصر سپہ سالار خراسان کی مدح بھی ملتی ہے ۔ (مرتب)

(۱) ابو سعید سلطان مسعود بن یمین الدوله محمود ۔
(۲) شمس الوزرا احمد بن عبدالصمد وزیر سلطان مسعود ۔
(۳) بادشاه ابوالمظفر ۔
(۴) فضل بن محمد ۔
(۵) ابوالحسن بن الحسن ۔
(۶) علی ابن محمد ۔
(۷) خواجهٔ احمد ۔
(۸) خواجهٔ محمد ۔
(۹) خواجه ابوالعباس ۔
(۱۰) علی بن عبیدالله ۔
(۱۱) بیکقو ۔
(۱۲) محمد قصری ۔
(۱۳) بوحرب بختیار محمد ۔
(۱۴) ابوالحسن بن علی بن موسلی عمرانی ۔
(۱۵) حمید بوسهل زوزنی دبیر سلطان مسعود ۔
(۱۶) ابو ربیع بن ربیع ۔
(۱۷) اسد بن حارث بن منصور امام جیلان ۔

اسدی طوسی

یورپین تحقیقات مظہر ہے کہ دو اسدی گزرے ہیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ہیں اور اسدی تخلص دونوں میں عام ہے۔ اسدیؔ کلاں کا نام ابونصر احمد بن منصور طوسی ہے جو صاحبِ مناظرہ ہے۔ دوسرا اسدی خورد اس کا فرزند جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور 'گرشاسپ نامہ' اور 'لغت فرس' کا مصنف ہے۔ یہ بیان مجھ کو بہ ظاہر عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے[1]۔ باپ بیٹے میں تخلص کا اشتراک نہایت غیرمعمولی ہے لیکن دو زبردست مغربی مستشرق ڈاکٹر ایتھے اور پروفیسر برون اس کے راوی ہیں۔ اس نظریے کی ایک تصدیق نظامی گنجوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ محمود کے دربار سے فردوسی کی ناکامی کے اسباب پر غور کرتے ہوئے موصوف اتفاقیہ اسدی کا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ چناںچہ فرماتے ہیں :

۱۔ دو اسدیوں کا نظریہ جدید نقادان و محققین کے نزدیک بے سروپا ہے۔ براؤن اور ایتھے اس معاملے میں دولت شاہ سمرقندی پر اعتماد کر کے گمراہ ہوئے۔ مستشرقین میں سے پروفیسر چائیکین نے اپنے ایک مضمون میں جو ایشیاٹک سوسائٹی میگزین کے شمارہ ۲۲۸ ، بابت سال ۱۹۳۵ء میں شایع ہوا تھا ، اس خیال کی پر زور تردید کی۔ ایرانی نقادان میں سے آقای بدیع الزمان فروز انفر نے اپنی کتاب ''سخن و سخن وران'' (جلد دوم ، صفحہ ۴۹) میں ، ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم نے ''احوال و اشعار رودکی'' (بار اول ،جلد سوم ، صفحہ ۱۳۰۷) میں اور ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے اپنی ''تاریخ ادبیات در ایران'' (جلد دوم ، صفحہ ۴۰۳ - ۴۰۵) میں اس نظریے کو بے بنیاد بتایا ہے۔ (مرتب)

در سخا و سخن چو می پیچم
کار بر طالع است من ہیچم
نسبت عقربی است با قوسی
بخل محمود و بذل فردوسی
اسدی را کہ جود او[1] بنواخت
طالع و طالعی بہم در ساخت

(بہرام نامہ ، خمسہ ، صفحہ ۹)

یہاں محمود کے تعلق میں اسدیِ کلاں مانا جا سکتا ہے ، نہ اسدیِ خورد ، اس لیے یہ مغربی نظریہ قابل تسلیم ہے ۔

مولانا شبلی کے پیش نظر اگرچہ پروفیسر براؤن کی تاریخ تھی ، تاہم وہ اس اہم مغربی انکشاف کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھتے، جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شعرالعجم میں دونوں اسدیوں میں تخلیط قایم ہوگئی ۔ فرماتے ہیں :

''اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاج دار ہے ۔ صاحبِ آتش کدہ نے اس کو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۸۲)

یعنی بسم اللہ ہی غلط کی ؛ محمود کے سبعہ سیارہ میں اگر کسی اسدی کا شمار ہو سکتا ہے تو اسدی کلاں ہے ، اور مولانا اسدی خورد کا حال لکھنے بیٹھے ہیں جو گرشاسپ نامہ کا مصنف ہے ۔ اگر مذکورہ بالا مغربی نظریے پر یقین نہ کیا جائے تو بھی مولانا کا بیان غلط ہے ، اس لیے کہ صاحب 'گرشاسپ نامہ' سلطان محمود کا ہم عصر نہیں ۔ اس کا گرشاسپ نامہ ، جیساکہ آیندہ ذکر ہوگا ، ۴۵۸ھ

۱۔ کلیات دیوان حکیم نظامی ، مطبوعہ ۱۳۳۵ شمسی ، مرتبہ آقای وحید دستگردی (صفحہ ۶۱۰) میں ''جود او'' کی جگہ ''بودلف'' ملتا ہے جو درست تر معلوم ہوتا ہے ۔ (مرتب)

میں تصنیف ہوا ہے ۔ اس لیے وہ محمود سے بعد کا شاعر ہے [1]۔

قولہ : ”عراق سے آذربائیجان آیا ، یہاں کا رئیس ابودلف کرکری تھا ۔“ (شعرالعجم ، صفحہ ۱۸۲)

آذربائیجان میں ان ایام میں ، جیسا کہ قطران تبریزی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے ، مملانی خاندان بر سرِ حکومت تھا ، جو کرکوئی کہلاتا تھا ۔ ابودلف کرکری اران کا بادشاہ تھا جو شروان ، آذربائیجان اور بحرِ خزز کے درمیان واقع ہے ۔ اران اور ارمن دونوں ابودلف کے زیرِ حکومت تھے ۔ نہیں معلوم مولانا کو یہ مغالطہ کیونکر پیش آیا ۔ حالانکہ اسدی کے اشعار سے ، جن کو خود مولانا صفحہ ۱۱۶ پر نقل کرتے ہیں ، یہ امر صاف ظاہر ہے ۔ وہ اشعار یہ ہیں :

ملک بودلف شہریار زمین جہان دار ارانی پاک دین

اسدی ان ابیات میں اس کو ارانی کہتا ہے ۔ شبلی فرماتے ہیں :

”اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحاتِ فارسی پر کتاب لکھی ۔ چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ویانات (کذا) کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ سلگمین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے ۔“

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۸۳)

یہ اطلاع ”مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم“ سے لی گئی ہے ، جیسا کہ حاشیے میں ارشاد ہوا ہے ، لیکن مولانا ، پروفیسر براؤن کا مطلب نہ سمجھے ۔ اسدی کی ”مصطلحاتِ فارسی“ اس کے ہاتھ کی

۱۔ اسدی کے زمانے کے متعلق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں :

”اما ابو نصر علی بن احمد اسدی باید در اواخر قرن چهارم یا اوایل قرن پنجم ولادت یافتہ باشد و بهر حال دورۂ بلوغ او در شاعری مصادف بود با انقلابات خراسان و غلبۂ سلاجقہ برآن دیار و بر افتادن حکومت غزنویان از آل سامان... ۔

(تاریخ ادبیات در ایران ، صفحہ ۴۰۵) ۔ (مرتب)

لکھی ہوئی کہیں موجود نہیں ، نہ اس کو سلگمین نے شائع کیا ۔ البتہ اس کا ایک نسخہ جو پنجشنبہ ۱۹ ماہ محرم ۴۳۳ھ کو عبدالرحمن بن احمد بن الظہیر نے نقل کیا تھا ، ڈاکٹر پال ہورن نے ۱۸۹۷ع میں شائع کیا ہے ۔ عبدالرحمن کا نسخہ ویانا میں نہیں بلکہ پاپائے روم کے کتب خانے میں ہے ۔ وہ حکیم ابومنصور موفق بن علی ہروی کی "کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ" ہے جس کو اسدی نے شوال ۴۴۷ھ میں اپنے قلم سے نقل کیا ہے ۔ کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے : "علی بن احمد الاسدی الطوسی الشاعر ۔" اس کتاب کو سلگمین نے البتہ ۱۸۵۹ع میں چھاپا ہے ۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی اس کی تصنیف گرشاسپ نامہ ہے ۔ ابتدا میں گرشاسپ نامے کا محرک ابودلف شیبانی کا وزیر محمد بن اسمٰعیل حصبی ہوا ۔ گرشاسپ نامہ :

مہی بد سرِ دار و بنیان دین
گران مایہ دستور شاہِ زمین
محمد مہِ جود و چرخِ ہنر
سمٰعیل حصبی مر او را پدر
ز چرخِ روان تا بہ ارسندہ خاک
چہ و چون گیتی بدانستہ پاک

باقی اشعار شبلی نے درج کیے ہیں ، اس لیے دہرانا ضروری نہیں سمجھتا ۔

جب ابودلف شیبانی کو اسدی کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی ، اس نے اپنے ملازم لولو کی زبانی پیام بھیجا کہ یہ کتاب میرے نام پر لکھی جائے ۔ گرشاسپ نامہ :

بہ پیروزی آورد زی من پیام
گزینِ خدا لولوء نیک نام
کہ گوید همی شاہ فرہنگ جوی
بنام من این نامہ را باز گوی

اگر زان کہ فردوسی این را نہ گفت
تو با گفتۂ خویش گردانش جفت
کنون گر سپہرم نہ سازد کمین
بگویم بفرمانِ شاہِ زمین

اس کے بعد اسدی کہتا ہے کہ دو مثنوی نگار خاکِ طوس سے پیدا ہونے پر تم کوئی تعجب نہ کرنا ۔ یہ امرِ واقعہ ہے ۔ چنانچہ :

دو گویا چنین خاست باشد ز طوس
چنو شد نگوئی تو باشد فسوس
کزو نامہ را خوب کاری بود
ز من در جہان یادگاری بود

گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں دو سال کی محنت کے بعد ختم ہوا ۔ اس کے اشعار کی تعداد دس ہزار ہے ۔ شاعر نے خاتمے میں خود بیان کیا ہے ۔ گرشاسپ نامہ :

شد این داستان بزرگ اسپری
بہ پیروز روزی و نیک اختری
ز ہجرت بدور سپہری کہ گشت
شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت
جز آن کاندرین داستان بد ز بن
ز ہر در بسی گرد کردم سخن
چنین نامۂ ساختم بر شگفت
کہ ہر دانشی زو توان برگرفت
بہشتست بزمش ز کافور خشک
گیاہش ز عنبر درختان ز مشک
بسی حور نوکر وش آراستہ
از اندیشہ دوشیزگان خاستہ

ز پاکی روان شان ز فرهنگ تن
ز دانش زبان و ز معنی دهن
چنان کم بد اندر سخن پایگاه
بگفتم نبشتم سپردم بہ شاہ
برآمد همی بیت او ده هزار
دو سال اندرین برده شد روزگار
مباد آن نہ بینندہ را آفرین
کہ کمتر نویسد یکی بیت ازین

آخری تاکید کے باوجود گرشاسپ نامہ جس قدر برباد کیا گیا ہے ، مشکل سے اور کتاب اس قدر برباد ہوئی ہوگی ۔ قطران آذربائیجان میں اور اسدی اران میں اس طرز شاعری کے مقلد ہیں جس کے خصوصی جراثیم پہلی بار منوچہری کے ہاں معاینے میں آتے ہیں ۔ یہ صنف شاعری صنائع بدائع ، لفظی لطافت ، ترکیبوں کی خوش آہنگی ، غیر فطری تشبیہات و استعارات اور صنعت مبالغہ میں اغراق کے لیے مشہور ہے ۔ لفظی شان و شوکت اور خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف جس کے نمایاں خط و خال ہیں ۔

منوچہری اپنی مرکب تشبیہات میں عدیم المثال ہے ۔ اسدی نے بعض موقعوں پر اس کی تقلید کی ہے ۔ مثلاً یہ شعر :

همی تافت خنجر ز گردِ سپاه
چو ایمان پاک از میانِ گناه

دیگر :

دو زلفش همہ جیم و در جیم دال
دهن میم و بر میمش از نقطہ خال

قطران صنعتِ تجنیس کا حاکم ہے ۔ اسدی اس کی بھی پیروی کرتا ہے ۔ شعر:

بزرگان ببزم اندر آرام رام
نشستند جفت غم انجام جام

لیکن یہ صنعت لطیف سچ تو یوں ہے کہ قطران کا حصہ ہے۔ میں اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ قطران :

چون بطرف جوی بنهاده گل خود روی روی
جای بامعشوق می خوردن بطرف جوی جوی
برده از مرجان بگونہ لالۂ نعمان سبق
برده از مطرب بدستان بلبل خوش گوی گوی
بستد از یاقوت و بستد لالہ و گلنار نار
یافت از کافور و عنبر خیری و شبوی بوی
از نسیم سوسن و گل گشت چون قرقیر باغ
وز دم و زلف بت من گشت چون مشکوی کوی
چشم من چون چشمۂ آموی گشت ار هجر او
تن بخون چون درمیان چشمۂ آموی موی

صنعت مبالغہ اس میں شک نہیں کہ اسدی کا خاص حصہ ہے۔ میں بخوف طوالت صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں :

بشب مورچہ بر پلاس سیاه
نمودی بہ چشم از دو صد میل راه
ز گرد نبرد و ز گرد زمین
زمین گشت گردون و گردون زمین
خروشش چنان دشت بشگافتی
کہ در وی سپاهی گزر یافتی
چنان تیره گیتی کہ از لب خروش
ز بس تیرگی ره نبردی بگوش

فردوسی اور اسدی کی شاعری میں وہی تفاوت ہے جو آمد اور آورد ، سادگی اور تصنع میں مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔

فردوسی کے ہاں جہاں حلاوت ہے، اسدی میں ملاحت جھلک مارتی ہے ۔ خدائے سخن کی متانت کے مقابلے میں اسدی کے ہاں چلبلاہٹ اور بانکپن کا نمک بھی موجود ہے ۔ بلند مضمون ، منتخب

الفاظ ، چست بندش ، جوش و خروش کی تاثیر، چیدہ تشبیہ ، برجستہ اسمائے صفات نے اسدی کے کلام کو زیادہ شوخ اور سگھوڑ بنا دیا ہے۔ زبان کی ترقی وقت کی مساعدت اور طبیعت کی رنگینی اسدی کے حق میں فیصلے کے لیے جھکتی ہے ۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اصل اصل ہے اور نقل نقل ۔

شاہ نامہ اور گرشاسپ نامہ میں بہت مضامین عام ہیں ۔ بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسدی نے شاہنامہ سامنے رکھ کر گرشاسپ نامہ لکھا ہے ۔ مثلاً داستان بیزن کی تمہید کے وہ اشعار جن میں ایک تاریک رات کا منظر کھینچا گیا ہے اور جو شاہ نامے کے قدیم ترین اشعار مانے جا سکتے ہیں ۔ اسدی ان کا جواب دیتا ہے :

شاہ نامہ	گرشاسپ نامہ
شبی چون شبہ روی شستہ بقیر	شبی بد چو زنگی سیہ تر ز زاغ
نہ بہرام پیدا نہ کیوان نہ تیر	مہ نو چو در دست زنگی چراغ
دگر گونہ آرایشی کردہ ماہ	سیاهیش درهم سیاهی بدیر
بسیچ گزر کرد بر پیش گاہ	چو موج از بر موج دریای قیر
شدہ تیرہ اندر سرای درنگ	چو هندو بقیر اندر اندودہ روی
میان کردہ باریک و دل کردہ تنگ	سیہ جامہ و رخ فروهشتہ موی
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد	چنان تیرہ گیتی کہ از لب خروش
سپردہ هوا را بہ زنگار گرد	ز بس تیرگی رہ نبردی بگوش
سیاہ شب تیرہ بر دشت و راغ	میان هوا جای جای ابر ویم
یکی فرش افگندہ چون پرّ زاغ	چو افتادہ بر چشم تاریک نم
چو پولاد زنگار خوردہ سپہر	جهان گفتیش دوزخی هست تار
توگفتی بقیر اندر اندودہ چہر	بہر گوشہ دیو اندرو صد هزار
نمودم زهر سو بہ چشم اهرمن	از انگشت بد شان همہ پیرهن
چو مار سیہ باز کردہ دهن	دمان باد تاریک و دود از دهن

هرآنکه که بر زد یکی باد سرد — زمین را که از غار دیدار نه
چو زنگی برانگیخت ز انگشت گرد — زبان را ره و روی گفتار نه
چنان گشت باغ و لب جوئبار — بزندان شب در به بند آفتاب
کجا موج خیزد ز دریای قار — فروهشته بر دیدها پرده خواب
فروماند گردون گردان ز جای — فرشته گرفته ز بس بیم پاس
شده سست خورشید را دست وپای — پری در نهیب اهرمن در هراس
زمین زیر آن چادر قیر گون — بسان تن بی‌روان بد زمین
تو گفتی شدستی بخواب اندرون — هوا چون دژم سوگیی دل‌غمین
جهان را دل از خویشتن پر هراس — برآن‌سوگ‌بر کرده گردون‌زرشک
جرس برگرفته نگهبان پاس — رخ نیلگون پر ز سیمین سرشک
نه آوای مرغ و نه هرای دد — تو گفتی یکی آئینه ست از فراز
زمانه زبان بسته از نیک و بد — ستاره درو چشم زنگی ست باز

فردوسی کے ہاں اکثر تشبیہات مادی اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اسدی کی اکثر تشبیہیں ایسی ہیں جو غیر محسوس ہیں ۔ موجِ دریاے قیر ، پیرہنِ انگشت ، زندانِ شب ، دوزخِ تار واہمہ سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اسدی نے اپنے رسمی مبالغے کو ہاتھ سے نہیں دیا ۔ اور چوتھے شعر میں اپنی برجستہ طرز میں کہتا ہے کہ دنیا اس قدر تاریک تھی کہ نالہ لب سے نکلتے ہی بوجہ کثرتِ تاریکی راہ گم کر کے کہیں کا کہیں بھٹک جاتا تھا اور کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ فردوسی خداے سخن ہے ، مبتدی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے ، تاہم اسدی نے جو کچھ زورِ طبیعت دکھایا ہے ، لائق تحسین ہے ۔

بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اسدی نے فردوسی کے خیالات کو اپنے ہاں لے لیا ہے اور سرقہ کی سرحد ممنوعہ سے ڈانڈا مینڈا ملایا ہے ۔

گرشاسپ نامه	شاه نامه
هرآن چه‌که خوردی ازو آب پاک	که آبی کزو سرو آزاد رست
نشاید فگندن برو سنگ و خاک	سزد گر نباید برو خاک شست

پیامست از مرگ موی سپید چو پیریت سیمین کند گوشوار
ببودن چه داری تو چندین امید ازان پس تو جزگوش مردن مدار
یکی داستان زد برین مردمہ
کہ درویش را چون برانی زده
بگوید کہ من مہتر ده بدم یکی را بده در ندادند جای
همہ بنده بودند و من مہ بدم همی گفت بر ده منم کتخدای

اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبِ گرشاسپ نامہ نے فردوسی کے خیالات سے اپنی شاعری کو چمکایا ہے ۔

مثنوی کا ایوان جس کی بنیاد رودکی ، ابوشکور اور دقیقی جیسے معمارانِ سخن نے ڈالی تھی، فردوسی نے اپنے زمانے میں اس کو نہایت بلند اور عالی شان بنا دیا ۔ اسدی نے دھیمے رنگوں میں اس پر بیل بوٹے اور نقش و نگار بنائے ۔ نظامی نے اپنے وقت میں ان رنگوں کو زیادہ شوخ اور لطیف کر دیا ۔

چوتھا دور

قولہ : "اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی ۔ سلطان محمود اپنی ملکی اور قومی خصوصیات کا بہت دل دادہ تھا ، تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی ۔ فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے ۔ لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۰۹)

سلطان محمود کے دور میں ابتدائی دس گیارہ سال تک دفتر کی زبان فارسی تھی کیونکہ سلطان کے وزیر اول ابوالعباس فضل بن احمد کو عربی کا علم نہ تھا ، اس لیے تمام تحریرات فارسی ہی میں تھیں ۔ ۴۰۷ھ سے ابو القاسم احمد بن حسن میمندی وزیر ہوئے ۔ چونکہ وہ عربی دان تھے اس لیے فارسی متروک کر دی گئی اور عربی کا رواج ہوا ۔ تاہم فارسی کا استعمال قطعاً متروک نہیں ہوا اور ایسی حالتوں میں جب کہ مکتوب الیہ فارسی داں ہوتا ، تمام تحریرات فارسی میں بھیجی جاتی تھیں ۔

گزشتۂ بالا بیان میں نے تاریخ یمینی سے اخذ کیا ہے ، لیکن تاریخ بیہقی کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان مسعود کے زمانے میں دربارِ غزنہ کی زبان فارسی ہی تھی ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دربار میں عربی سے زیادہ فارسی کا رواج تھا ۔ جب خلیفہ قادر باللہ وفات پاتا ہے اور قائم بامراللہ اس کا جانشین ہوتا ہے ، بارگاہ خلافت

سے ایک سفیر مع فرمان خلیفہ آتا ہے - یہ فرمان عربی میں تھا ، چنانچہ اس کو اصل عربی میں سنائے جانے کے بعد سلطان مسعود کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ سنایا جاتا ہے ، جس سے ظاہر ہے کہ غزنین میں عربی کم سمجھی جاتی تھی - بیہقی کے الفاظ ہیں :

"امیر خواجہ ابو نصر را آواز داد پیش تخت شدہ و نامہ بستد و باز پس آمد و روی فرا تخت بایستاد و خریطہ بکشاد و نامہ بخواند - چون بپایان آمد، امیر گفت ، ترجمہاش بخوان تا همگنان را مقرر گردد ، بخواند بپارسی چنان کہ اقرار دادند شنوندگان کہ کسی را این کفایت نیست -"

(صفحہ ۳۵٦ ، طبع کلکتہ)

اسی طرح سلطان مسعود جب دربار عام میں اپنے بیعت نامے کی تصدیق کرتا ہے تو ابونصرمشکانی اصل عربی کو پڑھ کر سناتا ہے - لیکن اس کے فارسی ترجمے کو خود سلطان مسعود پڑھ کر حاضرین کو سناتا ہے - چنانچہ :

"امیر گفت شنودم و جملۂ آن مرا مقرر گشت ، نسخۂ پارسی مرا دہ - بونصر بدو باز داد و امیر مسعود خواندن گرفت و از پادشاهان این خاندان رضی اللہ عنهم ندیدم کہ کسی پارسی چنان خواندی و نبشتی کہ وی - نسخہ عهد را تا آخر بر زبان راند ، چنان کہ هیچ قطع نہ کرد و پس دوات خاصہ پیش آوردند در زیر آن بخط خویش تازی و پارسی هم زیر آنچہ از بغداد آوردہ بودند و هم زیر آنچہ استادم ترجمہ کردہ بود ، نبشت -"

(تاریخ بیہقی ، طبع کلکتہ ، صفحہ ۳٦۰-٦۱)

بیعت نامے کا عربی مسودہ اگرچہ بغداد سے تیار ہو کر آتا ہے ، لیکن سلطان مسعود عہد بیعت کرتے وقت اس کے فارسی ترجمے کو ترجیح دیتا ہے - چنانچہ فارسی عہد نامے کو سر دربار پڑھ کر سنایا جاتا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ دربار غزنہ میں فارسی ہی درباری

زبان مانی جاتی تھی ۔ علاوہ ازیں بیہقی میں اور بیسیوں خطوط ہیں جو سلجوقیوں ، غزنویوں اور طبرستانیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں لیکن یہ سب فارسی میں ہیں ، جس سے بہ وثوق کہا جا سکتا ہے کہ کم ازکم مسعود کے دور میں فارسی زبان ہی درباری زبان تھی ۔

قولہ : "سنجر کے شاعرانہ مذاق اورقدر دانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں ۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی ۔

ایک دفعہ ارکان دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا ۔ سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی ، خوشی سے اچھل پڑا ۔ سب کو انگلی کے اشارے سے بتایا ۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے ۔ معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا ، موقع پا کر اس نے برجستہ کہا:

ای ماہ چو ابروان یاری گویی
یا همچو کمان شهریاری گویی
نعلی زده از زر عیاری گویی
در گوش سپهر گوشواری گویی

یعنی اے چاند ! تو ابروے معشوق ہے یا بادشاہ کی کمان یا سونے کی نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ ۔

سنجر نے اسپِ خاصہ اور پانچ ہزار درہم عطا کیے ، معزی نے پھر برجستہ کہا :

چون آتش خاطر مرا شاہ بدید
از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چون آب یکی ترانہ از من بشنید
چون باد یکی مرکب خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیے کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے ۔ چوں کہ سنجر کا لقب معزالدین بھی تھا ، اس لیے معزی لقب ملا ، جو آج تخلص

ہو کر مشہور ہے۔"

(شعر العجم ، صفحہ ۱۱-۲۱۰)

حکایت بالا سلطان سنجر سے علاقہ نہیں رکھتی بلکہ نظامی عروضی ، جو اس قصے کا سب سے قدیم راوی ہے اور جو تمام قصہ خود امیر معزی کی زبان سے سنتا ہے ، سنجر کے باپ ملک شاہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ملک شاہ کا لقب معزالدین بھی تھا۔ اس کے علاوہ نظامی کے اور مولانا کے بیانات میں ضمنی اختلافات ہیں۔

ایک موقعے پر امیر معزی نظامی سے اپنی سرگذشت بیان کرتے وقت کہتا ہے کہ میرے باپ امیر الشعراء برهانی نے ابتدائے عہد سلطنت سلطان ملک شاہ میں اپنی وفات کے وقت مجھ کو اس مشہور قطعے کے ذریعے سے ، جس کا ایک بیت یہ ہے :

من رفتم و فرزند من آمد خلف الصدق
او را بخدا و بخداوند سپردم

سلطان ملک شاہ کے سپرد کر دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی تنخواہ اور چندی میرے نام کر دی گئی اور بادشاہی شاعر بن گیا۔ اگرچہ سال بھر برابر حاضر رہا لیکن بادشاہ کا دیدار دور سے بھی مجھ کو میسر نہ آیا اور تنخواہ سے ایک دینار تک وصول نہیں ہوا اور قرض برابر بڑھتا گیا۔ رمضان سے ایک یوم قبل میں شہزادہ علاءالدولہ امیر علی فرامرز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ شہزادہ شعر دوست ہونے کے علاوہ سلطان کا داماد اور ندیم خاص تھا۔ دربار میں اس کی بڑی عزت تھی اور میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کی کہ یہ بڑی مشکل ہے کہ جو وصف باپ میں ہو، بیٹے میں بھی ہو۔ بات یہ ہے کہ امیر برهانی میرا باپ نہایت ہوشیار آدمی تھا ، اور سلطان شہید الپ ارسلان فن شعر میں اس کا معتقد بھی تھا۔ میں شرمیلا اور خاموش طبیعت واقع ہوا ہوں۔ سال بھر خدمت گزاری کرتے گزری ، تنخواہ سے ایک حبہ وصول نہیں ہوا۔ مفت میں ہزار دینار کا قرض‌دار ہو گیا ہوں۔

آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ، اگر سلطان سے اجازت دلوادیں کہ نیشاپور چلا جاؤں اور اپنا قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نکالوں ۔ امیر علی نے جواب میں کہا کہ یہ ہمارا قصور ہے کہ اب تک تیری طرف سے غفلت برتی گئی لیکن اطمینان رکھ کہ آیندہ ایسا نہ ہوگا ۔ آج مغرب کے وقت بادشاہ چاند دیکھنے نکلے گا ، تو حاضر رہنا ، دیکھیں خدا کیا کرتا ہے ۔ شہزادے کے حکم سے سو دینار نیشاپوری اسی وقت مجھ کو مل گئے ۔ میں خوش خوش گھر آیا اور رمضان کے بندوبست میں مصروف ہوگیا ۔ عصر کے قریب سراپردۂ سلطانی پر آ کر حاضر ہوگیا ، شہزادہ علاء الدولہ بھی اسی وقت آیا ۔

میں اب نظامی کی اپنی عبارت نقل کرتا ہوں :

”آفتاب زرد سلطان از سراپردہ بدر آمد ، کمان گروہہ در دست ، علاء الدولہ بر راست ، من بدویدم و خدمت کردم ، امیر علی نیکوئیہا پیوست و بہ ماہ دیدن مشغول شدند ، و اول کسی کہ ماہ دید سلطان بود ۔ عظیم شادمانہ شد ۔ علاء الدولہ مرا گفت ، پسر برھانی درین ماہ نو چیزی بگوی ۔ من برفور این دو بیتی بگفتم :

ای ماہ چو ابروان یاری گویی
یا نی چو کمان شہریاری گویی
نعلی زدہ از زر عیاری گویی
در گوش سپہر گوشواری گویی

چون عرضہ کردم ، امیر علی بسیاری تحسین کرد ۔ سلطان گفت برو از آخر ہرکدام اسپ کہ خواہی بکشای ، و درین حالت بر کنار آخر بودم ۔ امیر علی را اسپی نامزد کرد ، بیاوردند و بکسان من دادند ، ارزیدی سی صد دینار نشاپوری ، سلطان بمصلی رفت و من در خدمت ، نماز شام بگزاردیم و بخوان شدیم ، بر خوان امیر علی گفت پسر برھانی درین تشریفی کہ خداوند جہان فرمود ہیچ نگفتی ؟ حالی دو بیتی بگوی ۔ من

بر پای جستم و خدمت کردم و چنان که آمد حالی این
دو بیتی بگفتم :

چون آتش خاطر مرا شاه بدید
از خاک مرا بر زبر ماه کشید
چون آب یکی ترانه از من بشنید
جو باد یکی مرکب خاصم بخشید

چون این دو بیتی ادا کردم ، علاء الدوله احسنتها کرد و
بسبب احسنت او سلطان مرا هزار دینار عطا فرمود۔ علاءالدوله
گفت جامگی و اجراش نرسیده است ۔ فردا بر دامن خواجه
خواهم نشست تا جامگیش از خزانه بفرماید و اجراش بر
سپاهان نویسد ، گفت مگر تو کنی که دیگران را این حسبت
نیست و او را بلقب من باز خوانید و لقب سلطان معزالدنیاوالدین
بود ، امیر علی خواجہ معزی خواند ، سلطان گفت امیر معزی ۔
بزرگ آن بزرگ زاده چنان ساخت که دیگر روز نماز پیشین هزار
دینار بخشیده و هزار و دویست دینار جامگی و برات نیز هزار من
غله به من رسیده بود و چون ماه رمضان بیرون شد مرا به مجلس
خواند با سلطان ندیم کرد و اقبال من روی در ترقی نهاد و بعد
ازان پیوسته تیمار من همی داشت و امروز هر چه دارم از عنایت
آن بادشاه زاده دارم ۔"

(چہار مقالہ ، طبع لیڈن ، صفحہ ۴۲ ، ۴۳)

قولہ : "غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے لیکن سچ یہ
ہے کہ اس صنم کدے کے آذر نظامی ہی ہیں ۔"

(صفحہ ۲۱۴)

تغزل میں نظامی کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں ، کیوں کہ
غزل کے پہلے باغبان شہید ، رودکی اور دقیقی ہیں ۔ غزنوی دور
میں عنصری بلکہ خود سلطان محمود کو اس کی آبیاری میں مصروف
دیکھا جاتا ہے ۔ حکیم سنائی زیادہ تر زہدیات اور کمتر تصوف کے

مضامین کو اس میں اشاعت دیتے ہیں ۔ مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے ، انوری کے ہاں سوزو گداز اورعشق محض ہے ۔ یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانے کا راستہ بتاتے ہیں ، رندوں کی صحبت میں جگہ دیتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دوعملی میں اس کا نشیمن آباد کرتے ہیں ۔ مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا پلا کر اسے مستِ سرمدی بنا دیتے ہیں ۔ حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرتے میں دقت پیش آتی ہے ۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظامی نے غزل کی کوئی خدمت کی ہو لیکن سنائی ، انوری اور خاقانی کے مقابلے میں انھوں نے کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں کیا ۔ اس لیے اس میدان میں نظامی کسی خاص شکریے کے مستحق نہیں ہیں ۔

حکیم سنائی

دیوانۂ لائے خوار کے قصے کے ذکر کے بعد ، جس کو بہ سببِ کثرتِ شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے ، علامہ شبلی فرماتے ہیں :

قولہ : "حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹئی کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو ان کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا ۔ چناں چہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا :

من نہ مرد زن و زر و جاهم
بخدا گر کنم و گر خواهم
گر تو تاجم دهی ز احسانم
بہ سر تو کہ تاج نستانم"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۱۷)

مجھ کو اس قصے پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہے ، اس لیے کہ یہ اشعار حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہے ۔ چناں چہ اشعار :

روزگار حسود بی‌باکم
از دل شوخ جان غمناکم
کرد پشتم کمان و گام چو تیر
کرد رویم چو قیرو موی‌چو شیر
پای بر پایم آمد از غم شصت
لاجرم دست میزنم بر دست

(حدیقہ ، صفحہ ۵۹۶)

دیگر

عمر دادم بجملگی برباد
بر من آمد ز شصت صد بیداد

(صفحہ ۵۹۸)

عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقع پر ان کا ایراد ہوا ہے ، وہاں متن میں ایسا کوئی ایما نہیں پایا جاتا ، جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہے ۔ تنہا ان اشعار کی بنا پر نتیجۂ بالا قائم کرنا خالی از غرابت نہیں ۔ یہ اشعار ''قناعت'' کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں ، اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہے کہ ان میں کسی خاص بادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہے ۔ ان ہی ابیات کے بعد یہ اشعار آتے ہیں :

زان کہ چون طوق منت بکشم
لقمۂ خوان نعمتت بچشم
نبوم بہر طمع مدحت گوی
این نیابی زمن جز از من جوی

(حدیقہ ، صفحہ ۶۱۱)

الغرض یہ اشعار اسی طرح چلے گئے ہیں اور ان سے کوئی صریحی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ۔ شاعر کا مقصد قناعت کی تعلیم و تلقین ہے اور بادشاہی خدمت سے اعراض و اغماض وغیرہ وغیرہ ۔

قولہ : "حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کی تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں ، اس لیے علماء نے سخت مخالفت کی ، یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی ۔ بہرام شاہ نے دارالخلافہ بغداد سے استفتا طلب کیا ، وہاں کے علماء نے لکھا کہ یہ مسائل قابلِ اعتراض نہیں ۔"

(شعرالعجم ، ص ۲۱۸)

جہاں تک تذکروں سے معلوم ہے ، بہرام شاہ نے دارالخلافت سے استفتا طلب نہیں کیا ۔ خود دولت شاہ ، جس سے غالباً مولانا نے یہ

قصہ نقل کیا ہے، کہتا ہے :

''چون کتاب حدیقہ تمام کرد علماء ظاہر غزنین بر حکیم طعن کردند و اعتراض نمودند ۔ آن کتاب را بدارالاسلام بغداد فرستاد و بدارالخلافت عرض کرد و از علمای بغداد و ائمہ آن دیار بر صحت عقیدۂ خود فتویٰ حاصل کرد ۔''

مخزن الغرائب میں لکھا ہے :

''چون کتاب حدیقہ را باتمام رسانید بہ مطالعہ علمای ظاہرغزنین درآمد، زبان طعن بر او دراز کردند و بہ کفر و الحاد منسوب نمودند، خواستند اور اتشہیر کنند ، او بہ علمای غزنین گفت کہ چرا مرا ملامت و سرزنش می کنید ۔گفتند تو در حدیقہ خلاف شرع گفتہ ، گفت کتاب حدیقہ را بعلماء دارالسلام بغداد عرض می دارم ، اگر علماء آنجا بر کفر من فتویٰ دھند ہر چہ سزای ما باشد بما رسانید ۔ پس حدیقہ را بدارالخلافت بغداد فرستاد ، واز علماء بغداد وائمہ آنجا بر صحت عقیدہ و بہ‌ثبوت ایمان و مذھبش دستخط و مواھیر نمودند، ازان سرزنش و بلیہ نجات یافت ۔''

مزید ثبوت کی ضرورت کے وقت خود حکیم سنائی کا قول نقل کیا جا سکتا ہے ۔ اس بارے میں 'حدیقہ' کے خاتمے میں کافی اطلاع موجود ہے ۔

سنائی امیر برہان الدین ابوالحسن بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریانگر کو خطاب کرکے کہتے ہیں :

ای تو بر دین مصطفیٰ سالار
بر طریق برادران کن کار
عہد دیرینہ را بیاد آور
از طریق برادری مگذر
دین حق را بحق توئی برہان
مر مرا زین عقیلہا برہان

تو بہ‌بغداد شاد و من ناشاد
خود نکوئی ورا رسم فریاد
سال و مہ ترس‌ناک و اندہ‌گین
گشتہ محبوس تربت غزنین

(صفحہ ۸۵۱ ، نولکشور)

بدایونی نے غالباً اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کتاب حدیقہ سنائی نے اپنے حبس کے ایام میں لکھی تھی۔ منتخب التواریخ میں بہرام شاہ کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"وحدیقۃ الحقیقت شیخ بنام اوست کہ درایام حبس فرمودہ وجہت حبس شیخ تعصب غزنویہ بودہ در وادی تسنن ۔"

(صفحہ ۱۲ ، طبع نولکشور)

مکن آخر برادری پیش آر
وز میان این حجابہا بردار
گرچہ هستم اسیر هر نا اهل
چشم دارم کہ کار گردد سہل
تاکی این انقباض و این دوری
بسر من کہ تو نہ معذوری
عہد های قدیم را یاد آر
حق نان و نمک فرو مگذار

اس کے بعد حدیقہ کے ذکر میں کہتے ہیں :

این کتابی کہ گفتہ ام در پند
چون رخ حور دلبر و دلبند
هرچہ دانستہ ام ز نوع علوم
کردہ ام جملہ خلق را معلوم
آنچہ نص است و آنچہ اخبار است
وز مشائخ هر آنچہ آثار ست

اندرین نامہ جملگی جمع است
مجلس عقل را یکی شمع است
ملکوت این سخن چو برخوانند
حرز و تعویذ خویشتن دانند
یک سخن زین و عالمی دانش
همچو قرآن پارسی دانش

(صفحہ ۸۵۲)

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے گویا ہیں :

جاهلان جملہ ناپسند کنند
وز سر جہل ریشخند کنند
وان کہ باشد سخن شناس و حکیم
همچو قرآن ورا کند تعظیم
گر کند طعنہ اندرین نادان
گو بکن نیست بہتر از قرآن
بہر شان لفظم ار بود ترفند
تو برو شکر کن بر ایشان خند
نخورم غم گر آل بوسفیان
نبوند از حدیث من شادان
بنده را مدح مصطفیٰ ست غذا
جان من باد جانش را بفدا
آل او را بجان خریدارم
وز بدی خواه آل بیزارم
گر بد ست این عقیده و مذهب
هم برین بد بداریم یا رب

(صفحہ ۸۵۳)

اس کے بعد امیر بریانگر سے استفتا کرتے ہیں :

تو چہ گوئی بیار و فتوی کن
نیست اندر سخن مجال سخن
گفتم این و برت فرستادم
درِ گنج علوم بکشادم
گر ترا این سخن پسند آید
جان من رستہ از گزند آید
ور پسند تو ناید این گفتار
خود ندیدی بجملہ باد انگار
این سخن را مطابقت فرمای
نیک و بد در جواب باز نمای
ندهم بیش ازین ترا تصدیع
عرض کن بر همہ شریف و وضیع
گوئی این اعتقاد مجدودست
جملہ بر گفتش آنچہ مقصود است

(صفحہ ۸۵۴)

حکیم سنائی ایک معلم[۱] کے فرزند تھے ، جیسا کہ حدیقۃ الحقیقۃ کے دیباچے میں ارشاد کرتے ہیں ۔ حدیقہ آپ نے خواجہ رئیس احمد بن مسعود بیشہ کی فرمایش سے لکھا ہے :

---

۱ - ''دریک قصیدہ دیگر وقتی کہ ممدوح خود را میستاید پدر خود را در قطار شعراء و سخن سرایان محسوب کردہ میگوید :

خاصہ از جود تو دارد پدرم
طوق از منت اندر گردن
همہ مہر تو نگارد بروان
همہ مدح تو سراید بہ سخن''

(احوال و آثار حکیم سنائی ، صفحہ ۹ ، مولفہ خلیل اللہ خلیلی)

محولہ بالا قصیدہ خواجہ اسعد هروی کی مدح میں ہے اور دیوان حکیم سنائی مرتبہ مدرس رضوی کے صفحہ ۱۸-۶۱۶ پر درج ہے - (مرتب)

لیکن کنون ز بس کرمش زیر تیشہ ام
خواجہ رئیس احمد مسعود بیشہ[1] را

اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں خواجہ احمد ہی ان کی جملہ ضروریات کے متکفل[2] تھے ۔ سنائی اس کی تصنیف پر قریباً دس سال یعنی ۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ تک مصروف رہے :

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام
پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

بعض نسخوں میں آخری مصرع یوں آتا ہے : ع
پانصد و بست و پنج گشتہ تمام[3]

حدیقہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشعار الحاق بھی ہیں ۔ مثلاً جنگ جمل کے واقعات کے ذکر میں شاعر نے تمام معتبر

---

۱ ۔ بعض نسخوں میں بجائے 'بیشہ' کے 'تیشہ' ملتا ہے ۔ اسی سبب سے مدرس رضوی نے اپنی مرتبہ مثنوی حدیقۃ الحقیقت ، طبع طہران میں تیشہ ہی دیا ہے ۔ (مرتب)

۲ ۔ مدرس رضوی اپنی مرتبہ دیوان حکیم سنائی کے دیباچے میں فرماتے ہیں :
''خواجہ عمید احمد بن مسعود تیشہ ، وی خانۂ جہت سنائی ساختہ واسباب راحتی اور افراہم کردہ و شاعر را بجمع اشعار متفرق و پریشانش وا داشتہ است ۔ سنائی در مقدمہ کتاب و در حدیقہ او را بسیار ستودہ و این بیت حدیقہ :

دوستی مخلص اندرین شہرم
کرد از صدق دوستی بہرم

و ابیات بعد آن را در ستایش و مدح وی گفتہ است ۔''
(صفحہ مطہ ، دیباچہ دیوان سنائی ، طبع طہران ، ۱۳۲۰ شمسی)
(مرتب)

۳ ۔ اسی مصرعے کی بنیاد پر ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں :
''در سال ۵۲۴ شروع کردہ و در ۵۲۵ بپایان بردہ است''
(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم ، صفحہ ۵۶۱)
(مرتب)

تاریخوں سے اختلاف کیا ہے ۔ جنگ جمل (۳۶ھ) میں حضرت عائشہ و حضرت طلحہ اور حضرت زبیر ایک فریق تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک فریق ۔

حدیقہ میں حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ کو ایک فریق قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ اس جنگ میں فرار ہوتے ہیں اور بغداد کی طرف چلے جاتے ہیں ۔

در جمل چون معاویہ بگریخت
خون ناحق بسی بہ خیرہ بریخت
شد ہزیمت بجانب بغداد
گشتہ از فعل زشت خود ناشاد

جب حضرت عایشہ کے اونٹ کی کوچیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ہودج گرتا ہے ، ام‌المومنین امان مانگتی ہیں ۔ حضرت علی ، محمد بن حضرت ابوبکر کو بلواتے ہیں اور محمد آ کر چاہتے ہیں کہ بہن کا سر کاٹ لیں ، لیکن حضرت علی منع کرتے ہیں :

جمل آن ستیزہ را پی کرد
برگ و ساز معاویہ فی کرد

ہودج زن بخاک تیرہ فتاد
وز خجالت نقاب رخ نکشاد

گفت بد کردہ ام امانم دہ
وز ترحم کنون ضمانم دہ

چون بدیدند زود برگشتند
در خوی و خون ورا نیاغشتند

خواند حیدر برادرش را زود
جملہ احوال ہا ورا بنمود

رفت وقتی محمد بوبکر
آن ہمہ صدق و فارغ از ہمہ مکر

پس بر آهیخت تیغ تا بزند
گفت حیدر مکن کس این نکند

عفو کن تا بسوی کعبہ رود
بعد ازین کارهای بد نکند
(صفحہ ۲۸۰)

محمد پھر اپنی بہن کو مکہ معظمہ کی طرف بھجواتے ہیں ۔ آپ مکہ پہنچ جاتی ہیں ۔ کچھ عرصے بعد امیرمعاویہ آپ کو قتل کر دیتے ہیں :

بر گرفتش محمد از سر راه
جملہ لشکر شده ز کار آگاه

بسوی مکہ زود بفرستاد
در تواضع محل او بنهاد

با هزاران خجالت و تشویر
رفت زی مکہ جفت گرم و زحیر

عاقبت هم بدست آن باغی
شد شهید و بکشتش آن طاغی

آن کہ با جفت مصطفی زینسان
بد کند مروراً بمرد مخوان
(صفحہ ۲۸۱)

شاعری کی ایک اور اہم خدمت جو سنائی نے کی ہے ، تغزل ہے ۔ سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں لیکن اس صنفِ سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کر لی ہے ۔ بلحاظِ زبان ان کی غزل ، قطعے اور قصیدے میں متقدمین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا ۔

تخلص کا رواج غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انھی کے ہاں پایا جاتا ہے ۔ وارداتِ حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انھی سے شروع ہوتا ہے ۔ اگرچہ مذاق میں زہدیت غالب ہے ، تاہم

تغزل کو خرابات کا رستہ بتانے والے حکیم سنائی ہیں ۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں ۔ عطار اور مولانا روم ان ہی کی بنیادوں پر قصر و ایوان تعمیر کرتے ہیں ۔ قصہ مختصر سنائی کے ہاں شاعری بلحاظ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے ۔ زہد خشک کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ رندی اور مستی کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے ۔ صومعہ چھوڑا جاتا ہے ، میخانہ آباد کیا جاتا ہے ۔ زہد سے اعتزال ہوتا ہے اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے ۔ امثال :

در دل آنرا کہ روشنائی نیست
در خراباتش آشنائی نیست

پسرا خیز و جام بادہ بیار
کہ مرا برگ پارسائی نیست

جرعہ می بجان و دل بخرم
پیش کس می بدین روائی نیست[1]

دیگر

ای ساقی می بیار پیوست
کان یار عزیز توبہ بشکست

برخاست ز جای زھد و دعوی
در می‌کدہ با نگار بنشست

بنهاد ز سر ریا و طامات
از صومعہ ناگہان برون جست

بنهاد[2] ز پای بند تکلیف
زنار مغانہ بر میان بست

۱ ۔ دیوان حکیم سنائی ، مرتبہ مدرس رضوی میں یہ اشعار غزلیات کے حصے میں نہیں ملتے ۔ البتہ دوسرا اور تیسرا شعر بصورت قطعہ (نمبر ۳۰) معمولی فرق کے ساتھ درج ہیں ۔ دیکھیے دیوان متذکرہ بالا ، صفحہ ۱۰۷۷ ۔ (مرتب)

۲ ۔ دیوان حکیم سنائی مرتبہ مدرس رضوی (صفحہ ۶۰۲) میں ''بگشاد'' ۔ (مرتب)

می خورد و مرا بگفت می خور
تا بتوانی مباش جز مست
اندر رہِ نیستی همی رو
آتش در زن بهر چه وی هست[1]

میرزا محمد حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۱۵۱) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات باصح اقوال ۵۴۵ھ میں ہوئی[2] ۔ امیر معزی المتوفی[3] ۵۴۲ھ

۱ - ''بهرچه زی هست''۔ (دیوان سنائی ، مرتبہ مدرس رضوی) ۔ (مرتب)

۲ - آقای مدرس رضوی نے اپنے مرتبہ دیوان حکیم سنائی کے آغاز میں شاعر کے حالات لکھے ہیں ۔ اس میں وہ ایک تفصیلی بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں :
''پس قول نزدیک بصواب برای وفات سنائی سال ۵۳۵ھ است و شاعری قطعه ای در وفات سنائی گفته و ماده' تاریخی در آن آورده است که اگرچه از نظر شعری بلند پایه و مهم نیست اما از نظر این بیت تاریخ :
عقل تاریخ نقل او گفته طوطی اوج جنت والا
که مصرع دوم آن بحساب جمل مطابق با سال ۵۳۵ھ و سال وفات سنائی معین میکند بسیار مهم است ۔'' (صفحه یز) ۔ مرتب

۳ - معزی کی تاریخ وفات کے بارے میں پروفیسرعباس اقبال نے دیوان معزی کے مقدمے میں بحث کی ہے اور کہا ہے :
''سال ۵۴۲ھ که تقی کاشی و دیگران برای سال فوت معزی معین کرده اند بچندین علت درست نمناید . . . . حدس کلی نگارندهٔ این سطور اینست که معزی . . . . بین ۵۱۸ھ و ۵۲۱ھ فوت کرده در حالیکه سن او به هشتاد میرسیده است ۔''
(مقدمه دیوان امیر معزی ، صفحه ل)
اس سلسلے میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا فرماتے ہیں :
''وی بعد از ۵۲۱ زنده نبود و شاید پیش ازین تاریخ و پس از سال ۵۱۸ درگذشته باشد . . . و باین تقدیر قول هدایت فوت معزی را سال ۵۴۲ دانسته (مجمع الفصحا ، جلد ۱ ، صفحه ۵۷۱) اشتباه است ۔'' تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم ، صفحه ۵۱۲) ۔ مرتب

کے مرثیے میں سنائی نے یہ اشعار لکھے ہیں :

تا چند معزای معزی کہ خدایش
زین جا بفلک برد و قبای ملکی داد
چون تیرفلک بود قرینش سره آورد
پیکان ملک برد و بہ تیر فلکی داد[1]

بہرام شاہ غزنوی کے علاوہ انھوں نے سلطان سنجر کی بھی مداحی کی ہے ۔ ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے :

خاک را از باد بوی مہربانی آمدہ است
در دہ آن آتش کہ آب زندگانی آمدہ است[2]

سنجر کے ابتدائی تخت نشینی کے ایام میں لکھا ہے ، جیسا کہ فرماتے ہیں :

چون بہ سلطانی نشستی تہنیت گویم ترا
ای کہ اسلاف ترا سلطان نشانی آمدہ است

خواجہ احمد معروف بہ عارف زرگر[3] اور قاضی فضل بن یحیٰی بن

---

۱ ۔ صفحہ ۲۷۷ ، دیوان حکیم سنائی ، مرتبہ مدرس رضوی ۔ (مرتب)
۲ ۔ دیکھیے دیوان حکیم سنائی ، مرتبہ مدرس رضوی ، صفحہ ۸۱-۷۹ ۔ (مرتب)
۳ ۔ ''در بعضی نسخ دیوان سنائی در عنوان قصیدہ' کہ بنام احمد است عارف زرگر ذکر شدہ و او نیز اگرچہ از جملہ عرفا بودہ لیکن از قصیدہ' کہ سنائی را در مدح قاضی فضل بن یحیی صاعد است و در آن قصیدہ او را بنام عارف زرگر خواندہ و گوید :

عارفی و زرگری گوئی کزو آموختہ است
خواجہ و حامی و صدر و مہتر و استاد ما
عارف زرگر کہ در دنیا چو عقل و آفتاب
عارفست اندر احاطت زرگر است اندر عطا

مسلم است کہ عارف زرگر قاضی مذکورہ بودہ است نہ احمد عارف ۔''
(صفحہ سا ، مقدمہ دیوان حکیم‌سنائی ، مرتبہ مدرس رضوی) ۔ مرتب

صاعد اور علی بن ھیصم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کیے ہیں ۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابوالمفاخر محمد بن منصور سرخسی مفتی مشرق کی تعریف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں ۔ اور بقول پروفیسر محمد اقبال ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی مثنوی سیرالعباد الی المعاد بھی انھی محمد بن منصور کے نام پر لکھی ہے ۔
(حواشی راحت الصدور ، صفحہ ۴۷۴ ، طبع یورپ)

اوحد الدین انوری

قولہ : "محمد نام ، اوحدالدین لقب ، انوری تخلص ۔ ابیورد کے علاقے میں بدھنہ ایک گاؤں ہے جو مہنہ کے مقابل واقع ہے ، انوری یہیں پیدا ہوا ۔ یہ دولت شاہ کا بیان ہے لیکن عرفی کہتا ہے : ع

"انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز"

(شعر العجم ، صفحہ ۲٦۴)

انوری کے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بہت جلد بعد اس کا کلام جمع کیا ہے اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے ، اس کا نام علی[1] بتاتا ہے ۔ صاحبِ دیباچہ کے الفاظ ہیں :

۱ ۔ محمد عوفی نے لباب الالباب میں انوری کا نام ''اوحدالدین محمد بن محمد الانوری'' دیا ہے ۔

مولانا نے انوری کے نام کے معاملے میں غالباً اس کی یا اس کے کسی خوشہ چین کی پیروی کی ہے ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی لباب الالباب کی قدامت کے پیش نظر عوفی کے ہمنوا ہیں چنانچہ :

''دربارۂ نامش‌هم چنانکہ دیدیم در مآخذ اختلافست‌وشاید قبول سخن عوفی بصواب نزدیک ترباشد۔''

(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم ، صفحہ ٦۵٦)

لیکن پروفیسر ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم اپنے مرتبہ دیوان انوری کے آغاز میں ''احوال و آثار انوری'' کے ضمن میں فرماتے ہیں :

''عوفی کہ از مولفان دیگربعصروی نزدیک‌تربوده است در لباب‌الالباب چنانکہ گذشت نام و نسب وی را اوحد الدین محمد بن محمد انوری ضبط

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

صاعد اور علی بن ہبصم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کیے ہیں ۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابوالمفاخر محمد بن منصور سرخسی مفتیِ مشرق کی تعریف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں ۔ اور بقول پروفیسر محمد اقبال ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی مثنوی سیرالعباد الی المعاد بھی انھی محمد بن منصور کے نام پر لکھی ہے ۔
(حواشی راحت الصدور ، صفحہ ۴۷۴ ، طبع یورپ)

اوحد الدین انوری

قولہ : "محمد نام ، اوحدالدین لقب ، انوری تخلص ۔ ابیورد کے علاقے میں بدھنہ ایک گاؤں ہے جو مہنہ کے مقابل واقع ہے ، انوری یہیں پیدا ہوا ۔ یہ دولت شاہ کا بیان ہے لیکن عرفی کہتا ہے : ع

"انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز"

(شعر العجم ، صفحہ ۲۶۴)

انوری کے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بہت جلد بعد اس کا کلام جمع کیا ہے اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے ، اس کا نام علی[1] بتاتا ہے ۔ صاحبِ دیباچہ کے الفاظ ہیں :

---

۱ ۔ محمد عوفی نے لباب الالباب میں انوری کا نام ''اوحدالدین محمد بن محمد الانوری'' دیا ہے ۔

مولانا نے انوری کے نام کے معاملے میں غالباً اس کی یا اس کے کسی خوشہ چین کی پیروی کی ہے ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا بھی لباب الالباب کی قدامت کے پیش نظر عوفی کے ہمنوا ہیں چنانچہ :

''دربارۂ نامش‌هم چنانکہ دیدیم در مآخذ اختلافست‌وشاید قبول سخن عوفی بصواب نزدیک ترباشد ۔''

(تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم ، صفحہ ۶۵۶)

لیکن پروفیسر ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم اپنے مرتبہ دیوان انوری کے آغاز میں ''احوال و آثار انوری'' کے ضمن میں فرماتے ہیں :

''عوفی کہ از مولفان دیگربعصروی نزدیک‌تربوده است در لباب‌الالباب چنانکہ گذشت نام و نسب وی را اوحد الدین محمد بن محمد انوری ضبط

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

"امیر حکیم امام ہمام اوحدالدین عمادالاسلام نادرۃ الفلک اعجوبہ" الزمان افصح فصحاء الدہر ملک الکلام و الشعرا علی الانوری نوراللہ مرقدہ و مثواہ و عرف بفضلہ ثراہ ۔"

البتہ محمد اس کے باپ کا نام[1] تھا ۔ اس پر محمد عوفی اور شادی آبادی[2] متفق ہیں ۔ دادا کا نام اسحاق تھا ۔ انوری کے کلیات سے ثابت ہے ۔ شعر

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ)

کردہ است و شک نیست کہ بخطا رفتہ است ۔" (مقدمہ دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۲۷ ، مطبوعہ طہران ، ۱۳۳۷ شمسی)
پھر لکھتے ہیں :
"نسخہ بسیار مضبوط و معتبر از قصاید انوری من خود دارم کہ در تصحیح و مقابلہ و تکمیل متن دیوان از آن بسیار بہرہ مند شدم و پندارم یکی از معتبر ترین نسخہاییست کہ برای ما ماندہ...و تاریخ ندارد اما از خط و کاغذ پیداست کہ در اواخر قرن ہشتم و اوایل قرن نہم از روی نسخہ بسیار معتبری نوشتہ اند ۔ در پشت این نسخہ بخط دیگری بجز خط کاتب متن کتاب چنین نوشتہ شدہ است :
دیوان قصاید امیر فاضل مجتہد کامل....علی بن محمود بن اسحق الانوری" (صفحہ ۲۸) ۔ (مرتب)

۱ ۔ انوری کے نام پر بحث کے اختتام پر ڈاکٹر نفیسی نے اپنی رائے درج کی ہے :

"بگمانم نام و نسب درست او 'اوحدالدین علی بن وحید الدین محمد بن اسحق ابیوردی ' بودہ باشد ۔"

(صفحہ ۲۹ ، مقدمہ دیوان انوری) ۔ (مرتب)

۲ ۔ شرح قصائد انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی ۔ مصنف شادی آباد عرف مانڈو کا رہنے والا تھا اور سلطان ناصرالدین مالوی ۹۰۵ھ و ۹۱۶ھ کی فرمایش پر اس نے یہ شرح لکھی ہے ۔
(حاشیہ مصنف)

زندہ اسلاف تو بتو ، چو بمن
جدم اسحق و جدت اسمعیل[1]

وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف[2] ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے ۔ انوری خود ایک سے زیادہ مقام پر اپنے آپ کو خاوران کی طرف منسوب کرتا ہے ۔ قطعۂ ذیل اور اشعار ملاحظہ ہوں :

بر سپہر صیت پیدا شد ز خاک خاوران
تا شبانگاہِ ابد چار آفتاب خاوری
خواجۂ چون بوعلی شیدانی[3] آن صاحب قران
مفتی چون اسعد شوجان[4] زہر شرک بری
صوفی صافی چو سلطان طریقت بو سعید
شاعری ساحر چو مشہور خراسان انوری[5]

شعر :
دی ز خاک خاوران چون ذرہ مجہول آمدہ
گشتہ امروز اندرو چون آفتاب خاوری[6]

---

۱ ۔ کلیات انوری ، طبع نول کشور صفحہ ۲۶۱ ۔ یہ کلیات نول کشور کے ہاں ۱۸۸۰ع اور ۱۸۹۷ع میں چھپ چکا ہے ۔ پہلی اشاعت میں ۶۷۷ اور دوسری میں ۶۶۷ صفحات ہیں ۔ میں نے اس مضمون کے دوران میں پہلی اشاعت سے کام لیا ہے ۔ بخیال اختصار آیندہ صرف شمار صفحات پر اکتفا کی جائے گی ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ ۔ مولانا نے غالباً دولت شاہ کی پیروی کرتے ہوئے انوری کا وطن بدنہ بتایا ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر سعید نفیسی : ''نخستین کسی کہ انوری را از مردم دھی بنام ''بدنہ'' از توابع ابیورد دانستہ دولت شاہ در تذکرۃ الشعرا است و دیگران کہ این مطلب را تکرار کردہ اند ازوگرفتہ اند'' (مقدمہ دیوان انوری ، صفحہ ۳۲) (مرتب)

۳ ۔ دیوان انوری مرتبہ سعیدنفیسی (صفحہ ۴۶۵) میں ''شادانی'' (مرتب)

۴ ۔ مرتبہ سعید نفیسی میں ''خوشان'' (مرتب)

۵ ۔ کلیات انوری ، طبع نول کشور، صفحہ ۱۰۷ (حاشیۂ مصنف)

۶ ۔ ایضاً کلیات ، صفحہ ۴۰۳ (حاشیۂ مصنف)

دیگر :

چندان کہ از زبانت برآید بگیر زر
در خاوران لیم کہ میسر نمی‌شود[1]

دیگر :

کاندر اطراف خاوران ازوی هیچ کس را همی‌نیاید یاد[2]

خاوران ایک ناحیہ کا نام ہے جس میں مہنہ، نسا، ابیورد اور درگز شامل ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خاوران ناحیہ ہونے کے علاوہ ایک قصبے[3] کا نام بھی ہے اور انوری اسی قصبے کی طرف منسوب ہے[4]۔

قولہ : ”انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلم کو خیر باد کہا اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے :

---

۱ ۔ کلیات انوری، طبع نول کشور صفحہ ۴۴۴ (حاشیۂ مصنف) ۔

۲ ۔ ایضاً کلیات صفحہ ۱۲۳ (حاشیۂ مصنف) ۔

۳ ۔ پروفیسر سعید نفیسی کا خیال ہے کہ انوری ناحیۂ خاوران کے قصبۂ ابیورد سے تعلق رکھتا ہے :

”دربارهٔ شهری کہ درآن یا توابع آن انوری بجهان آمده است تردیدی نیست و همہ جا ابیورد نوشتہ اند ۔ دشت پهناوری کہ امروز در آن سوی مرزهای شمال مشرق ایران جای گرفتہ و نام کنونی آن بزبان ترکی ”قراقوم“ بمعنی شن‌زار سیاهست و اینک رود اترک قسمتی از جنوب آن و رود جیحون یا آموی.....شمال آنرا فرا گرفتہ است در میان ایران همواره بنام دشت خاوران معروف بوده است.... در قسمت جنوبی دشت خاوران.....شهر بزرگی بوده است بنام ”نسا“....در محاذات شهر نسا و در مشرق آن چند شهر کوچک تر در جنوب بلخ و در شمال هرات بوده است کہ هنوز هم هست و معروفترین آنها ابیورد یا باورد و سرخس و میهنہ زادگاه عارف مشهور ابوسعید ابوالخیرست ۔

(صفحہ ۲۹ ، ۳۰ ، مقدمہ دیوان انوری) ۔ (مرتب)

۴ ۔ معجم البلدان از یاقوت حموی ، نزهت القلوب حمداللہ مستوفی، صفحہ ۱۸۹ ، طبع ملک الکتاب ، ۱۳۱۱ھ ، بمبئی ۔ (حاشیۂ مصنف)

گر دل و دست بحر و کان باشد
دل و دست خدایگان باشد

صبح کو دربار میں جاکر قصیدہ پڑھا ، سنجر نہایت سخن شناس تھا ، بہت محظوظ ہوا اور "کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ" انوری نے آداب بجا لا کر عرض کی :

جز آستان توام درجہان پناہی نیست
سر مرا بجز این در حوالہ گاہی نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا - سنجر رادکان سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا - راہ میں چند قصیدے لکھ کر پیش کیے جن میں سے ایک یہ ہے :

باز این چہ جوانی و جمال ست جہان را
وین حال کہ نوگشت زمین را و زمان را"

(شعرالعجم ، صفحہ ۶۵-۲۶۴)

شعر 'جز آستان تو ام' الخ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے اور انوری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا - رادکان سے روانگی کے وقت جو قصیدہ سنایا جاتا ہے اور جس کا مطلع اوپر درج ہے ، بے شک انوری کا ہے ، لیکن سلطان سنجر کی تعریف میں نہیں بلکہ عماد الدین پیروز شاہ اور اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں ہے - کلیات (مطبوعہ) میں یہ سب سے پہلا قصیدہ ہے - یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں ممدوح کا نام موجود ہے :

پیروز شہ عادل منصور و مظفر
کز عدل دگر بارہ بنا کرد جہان را

(کلیات صفحہ ۳)

۱ - دیوان انوری، مرتبہ سعید نفیسی میں صفحہ۸ پر یہ شعر یوں درج ہے:

فیروز شہ عالم منصور معظم
کز عدل بنا کرد دگر بارہ جہان را

(مرتب)

اور یہ شعر بھی :

دستور جلال‌الوزرا کز در عالیش[1]
انصاف رسانند هر انصاف رسان را

(کلیات صفحہ د)

قولہ : ''ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو ۔ یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں اس کو کبھی اٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا ۔ انوری خود اس قصیدے میں کہتا ہے :

خسروا بندہ را چو دہ سال است
کہ همی آرزوی آن باشد
کز ندیمان مجلس ار نشود
از مقیمان آستان باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتداً نہیں ، بلکہ دس برس کی امید واری کے بعد لکھا گیا ہے ۔''

(شعرالعجم صفحہ ۲۶۵)

اگر واقعی سب سے پیش تر یہ اعتراض مولانا شبلی کو سوجھا ہے ، تو وہ تہہ دل سے مبارک باد کے مستحق ہیں ۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ علامہ موصوف اس معاملے میں پروفیسر براؤن کی 'تاریخ ادبیات ایران' کے مرہون منت ہیں، اگرچہ بہ ظاہر اس سے استفادہ تسلیم نہیں کیا گیا ۔ اس موقع پر پروفیسر براؤن کے الفاظ ہیں :

''امر فی الواقعہ یہ ہے کہ قصیدۂ مذکورہ خود ایسی شہادت پیش کرتا ہے کہ شاعر بڑی مدت پیش تر مشق سخن میں مصروف تھا ۔ اشعار

خسروا بندہ را چو دہ سال ست
کش همی آرزوی آن باشد

۱ ۔ دیوان مرتبہ ڈاکٹر سعید نفیسی میں : ع
دستور جلال الدین کز درگہ عالیش (مرتب)

کز ندیمان مجلس ِ ار نشود
از مقیمان آستان باشد"
(تاریخ ادبیات ایران ، صفحہ ۳۸۰ ، طبع ۱۹۰۶ع)

قولہ : "رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر اس کی عزت افزائی کی ۔"
(شعرالعجم ، صفحہ ۲٦٦)

دس سال کی امیدواری کے باوجود جیسا کہ گذشتہ اشعار سے واضح ہوتا ہے ، انوری سنجر کے دربار میں منادمت بر طرف ، مقیمِ آستان بننے کا رتبہ بھی حاصل نہ کر سکا ۔ اگر اسی رفتار سے اس نے ترقی کی ہے تو سنجر کو اس کے گھر آنے کے لیے عمرِ نوح درکار ہے ۔

میں سنجر اور انوری کے تعلقات کی بابت اسی مضمون کے ضمن میں کسی موزوں مقام پر گفتگو کروں گا ۔ یہاں اسی قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انوری کے گھر سنجر کے آنے کی روایت کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ ایک مرتبہ کوئی وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا اور شاعر نے اس کے خیرمقدم میں قصیدہ ، قطعہ اور رباعی لکھے ہیں ۔ چناں چہ رباعی :

منصوبہٴ ہر گزت درآمد بضمیر[1]
کاید بدرت موکب میمون وزیر
ہین کوکب[2] غنچہ‌گو بیا دست ببوس
ہان[3] دست چنار گو بیا دست بگیر
(کلیات ، صفحہ ٥٦٨ ، طبع نول کشور)

۱۔ دیوان انوری مرتبہ ڈاکٹر سعید نفیسی (صفحہ ٦۰۹) میں یہ مصرع اس طرح دیا گیا ہے :
منصوریہ ہرگزت در آید بضمیر ؟
(مرتب)

۲۔ پروفیسر نفیسی کے ہاں 'کواب ۔' (مرتب)

۳۔ ڈاکٹر سعید نفیسی کے ہاں 'کو ۔' (مرتب)

کسی اور قطعے میں کہتا ہے :

بچیزی دیگر این تشریف را تشبیه نتوان کرد
حدیث مصطفیٰ میدان و بوایوب انصاری

(کلیات ، صفحہ ۱۴۷)

قطعۂ ذیل بھی ملاحظہ ہو :

ای خداوندی که بنّای جهان یعنی خدای
گوهر پاک ترا اصل نکو کاری نهاد
آستانِ ساحتِ جاهِ ترا چون برکشید
عقل کلی پای بر خاکش بدشواری نهاد
فتنه را خواب ضروری دیده از گیتی بدوخت
چون قضا در دیدهٔ بخت تو بیداری نهاد
دی حیات نونهادستی مرا در تن چنانک
بالله ار در خاک هرگز آبرا زاری نهاد
عذر آن اقدام چون خواهم که خاکش را سپهر
سرمهٔ چشم خداوندی و جباری نهاد
شاد باش ای مصطفیٰ سیرت که خلق شاملت
بی‌تکلف بر تکبر داغ بیزاری نهاد
از شرف در عرض من عرق نهادستی چنانک[1]
مصطفیٰ در نسل بو ایوب انصاری نهاد

(صفحہ ۶۴۹)

اسی سلسلے میں وہ قصیدہ لکھا گیا ہے جس کا مطلع ہے :

زهی از کلکت اندر چشم دولت کحل بیداری
بعونش کرده مدتها جهان بانان جهان داری

یہ عقیدہ کہ قصیدہ کسی وزیر کی تعریف میں ہے ، رباعی بالا کے علاوہ ذیلی کے ابیات سے بھی مفہوم ہوتا ہے :

۱- پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان (صفحہ ۳۷۰) میں :
''عرق ستی نهاد چنانک'' (مرتب)

مجیر[1] دولت و دینی و اندر دیدۂ دولت
ز رای تست بینائی ز بخت تست بیداری
تو آن صدری کہ عالم را کمال آمد وجود تو
نگر تا خویشتن را کمتر از عالم نہ پنداری

ناظرین اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ کریں :

ترا لطف تو داعی بود ، گر نہ کس روا دارد
کہ رخت کبریا ہرگز بچونان کلبۂ آری
نزولت را بہ نزد من مثل دانی چہ می‌آرم
نزول مصطفٰی نزدیک بوایوب انصاری

(کلیات ، صفحہ ۳۶۹ و ۳۷۰)

قولہ : ''انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے ، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا لیکن دربار تک رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی ، جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک‌الشعرا امیر معزی تھا اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا ۔ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا ، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں وہ قصیدے کا قصیدہ یاد کر لیتا تھا ۔ جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے ۔ چناں چہ قصیدے کا قصیدہ خود پڑھ کر سنا دیتا ، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا ۔ انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن ، پاگلوں کی صورت بنا کر معزی کے پاس گیا اور کہا کہ میں شاعر ہوں ، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا ہوں ، آپ پیش کرا دیجیے ۔ معزی نے کہا ''کیا لکھا ہے، پڑھ کر سناؤ'' انوری نے پڑھا :

۱۔ دیوان انوری مرتبہ ڈاکٹر سعید نفیسی میں یہ قصیدہ بہ عنوان ''در مدح صدر اجل خواجہ مجیرالدین گوید'' صفحہ ۳۰۹ پر دیا گیا ہے ۔ (مرتب)

زهی شاہ و زهی شاہ و زهی شاہ
زهی میر و زهی میر و زهی میر

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا ۔

زهی شاہ و زهی شاہ و زهی شاہ
زهی ماہ و زهی ماہ و زهی ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں ۔ معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے ، انوری سے "کہا کل آنا" انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لے کر دربار میں گیا اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے سناؤ ۔ انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا :

گر دل و دست بحر و کان باشد
دل و دست خدایگان باشد
شاہ سنجر کہ کمترین خدمش
در جہان بادشہ نشان باشد

دو شعر پڑھ کر رک گیا اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہے تو باقی اشعار سنائیے ۔ معزی چپ ہوا ، انوری نے پورا قصیدہ سنایا ۔ سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمانِ خاص میں داخل کیا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶)

پروفیسر برون نے اس قصے کو حبیب السیر سے بتمامہ نقل کر کے اس پر کوئی تیقن ظاہر نہیں کیا ہے ۔ میں اس خیال میں پروفیسر موصوف کا تابع ہوں ۔ علامہ شبلی نے اس کے بعض خط و خال قلم انداز کر دیے ہیں ۔ میں اس روایت کے اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ ایک مرتبہ کے سننے میں کامل قصیدہ ازبر کر سکتا ہے ، اس کا فرزند دو مرتبہ کی ساعت میں یاد کر لیتا ہے اور ان کا غلام تین مرتبہ کی ساعت میں حفظ سنا سکتا ہے ، اور حسن اتفاق سے ان بوالعجب

ہستیوں کا اجتماع ایک ہی وقت اور ایک ہی خاندان میں ہوتا ہے ، قطع نظر کر کے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انوری کے معتقدین نے نہ صرف اس قصے میں بلکہ اور موقعوں پر بھی امیر معزی کو بدنام اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مثال میں انوری کا ایک شعر پیش ہے :

بر سر من مغفری کردی کلہ وان برگذشت
بگذرد بر طیلسانم نیز دور معجری

شادی آبادی اس شعر کی تشریح میں کہتے ہیں :

''درین بیت رمز آنست کہ امیر معزی بحضرت انوری از روی حسد تہمتی دروغ کردہ بود و پیش پادشاہ تعریض کردہ کہ انوری شہر بلخ را ھجو کردہ ۔ پادشاہ بدو منقلب شد و حکم انوری را مقنعۂ زنان پوشانید و تشہیر کرد و خواست تا حضرت انوری را بر خر سوار کند و بگرد شہر بگرداند ۔ چون حکیم مذکور این قصیدہ را گفت و پادشاہ را مع کبرای بلخ تعریف کرد ، باز داشتند و بخر سوار نہ کردند و مہربان شدند ۔''

حالاں کہ امیر معزی ۵۴۲ھ میں سنجر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے ۔ اور ہجو بلخ کا واقعہ سنجر (متوفی ۵۵۲ھ) کی وفات کے بہت عرصے بعد طغرل تگین کے دور میں ہوتا ہے ۔

شادی آبادی نے ایک اور واقعہ انوری کے ایک اور شعر کی شرح میں لکھا ہے ۔ شعر یہ ہے :

کس دانم از اکابر گردن کشان نظم
کو را صریح خون دو دیوان بگردن است

شادی آبادی کہتے ہیں :

''امیر معزی کہ سر آمد شعرای زمانہ بود و پیش سلطان سنجر مرتبہ و تقرب بسیار داشت از دیوان مولانا احمد معالی (بلمعالی نحاس؟) دزدیدہ است و ہر دو دیوان را ھلاک کردہ

است و دیوان خود ساختہ است ۔"

علاوہ بریں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انوری کا سرپرست سلطان سنجر کا آخری وزیر ابوالفتح ناصر الدین طاہر ابن مظفر ابن نظام‌الملک (۵۲۸ھ و ۵۴۸ھ) تھا ۔ کلیات میں اس وزیر کی مدح میں بیسیوں قصیدے اور قطعات ہیں اس لیے قوی احتمال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے طاقت‌ور وزیر کے مقابلے میں امیر معزی کی کوشش دربار میں انوری کی رسائی کے بر خلاف چنداں سرسبز نہیں ہوسکتی تھی ۔

قولہ : "انوری کو علم نجوم میں کمال تھا ۔ سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیارہ برج میزان میں جمع ہوئے ۔ انوری نے اس بنا پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہوجائیں گے ۔ لوگوں نے ڈر کر ، تہہ خانے اور سرد آب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر ان میں چھپ کر بیٹھے ۔ اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا ۔ سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا ۔ انوری نے کہا "قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے ۔" فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا :

گفت انوری کہ از جہت بادھای سخت
ویران شود عمارت و کہ نیز برتری
در سال (کذا) حکم او نہ وزیدست ھیچ باد
یا مرسل الریاح تو دانی و انوری"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۶۶ و ۲۶۷)

یہ سبعہ سیارہ کا اقتران نہیں تھا بلکہ پانچ ستاروں کا ، لیکن سلطان سنجر کے عہد میں نہیں کیوں کہ اس کا انتقال ۵۵۲ھ میں ہوتا ہے اور ستاروں کا اجتماع بسند نزہت القلوب حمداللہ مستوفی ۵۸۱ھ میں اور بسند کامل ابن‌الاثیر ۲۹ جمادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوتا ہے ۔ ان میں پچھلی تاریخ صحیح ہے ۔ فی‌الواقع انوری نے اس طوفان کے متعلق اگر کوئی اشعار لکھے ہیں تو وہ ہم تک نہیں پہنچے ۔ کلیات

میں پسر میر داد کے مدحیہ قصیدے میں البتہ ایک تلمیح پائی جاتی ہے جس سے اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ انوری طوفان کی شدت کی اس نوعیت کا جو مولانا شبلی کے بیان سے مترشح ہے ، اور جس کو تمام تذکرہ نویس ایک مبالغہ آمیز طریق سے بیان کرتے آئے ہیں ، ہرگز ہرگز معتقد نہیں تھا ۔ وہ اس طوفان کا ذکر نہایت بے پروایانہ انداز میں کرتا ہے اور تلمیح شعر ذیل میں آتی ہے :

آباد دار نیمۂ خود از جہان بداد
طوفان باد نیمۂ خود گو خراب خواہ[1]

(کلیات صفحہ ۳۶۳)

مقطع میں یہی شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ یوں لایا گیا ہے :

آباد دار ملک زمین خسروا بداد
طوفان باد ملک ہوا گو خراب‌خواہ

(صفحہ ۳۶۳)

طوفان کا ذکر[2] اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قضیہ اُن ایام میں بہت کچھ بحث و جدال اور مناظرات کا مورث ہوا ہے ۔ اس بحث میں ، جیسا کہ پروفیسر براون نے ذکر کیا ہے ، ظہیر فاریابی نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے ۔

وہی قطع جو فرید کاتب کی طرف منسوب ہے ، قصائد ظہیر میں بھی ملتا ہے ، و ھوھذا :

---

۱ - عمادالدین فیروز شاہ کی مدح میں یہ قصیدہ ، جس کا مطلع ہے :

شاہا صبوح فتح و ظفر کن شراب خواہ
نرد و ندیم و مطرب و چنگ و رباب خواہ

دیوان انوری مرتبہ پروفیسر سعید نفیسی میں صفحہ ۲۷۷-۲۷۸ پر درج ہے ۔ اس میں یہ شعر نہیں ہے ، البتہ دوسرا شعر مقطع سے پہلے موجود ہے ۔ (مرتب)

۲ - طوفان سے متعلق اشارے ، جیسا کہ آیندہ مذکور ہوگا ، نظامی گنجوی اور کمال اسمعیل کے ہاں بھی ملتے ہیں ۔ (حاشیہ مصنف)

می گفت انوری که شود بادها چنانک
کوه گران ز پای درآید چو بتگری
سالی گذشت و برگ نه جنبید از درخت
یا مرسل الریاح تو دانی و انوری[1]

(قصائد ظهیر ، صفحه ۱۴۸ ، طبع نول کشور ۱۸۸۰ع)

سیاروں کے اقتران کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے :

اجتماع اختران دانی که در میزان چراست
خود نکو دانی که آن صنعت چه نیکو کرده‌اند
از برای ذرهٔ خاک کف پای ترا
نقد هفت اقلیم گردون در ترازو کرده اند

(قصائد ظہیر ، صفحہ ۱۶۵)

ظہیر نے طوفان کے بطلان میں کوئی رسالہ بھی لکھا ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :

رسالتی که ز انشای خود فرستادم
بمجلس تو در ابطال حکم طوفانی
اگر در آن سخنم شبهتی ست و میخواهی
که از جریدهٔ ایام نیز برخوانی
مرا چنان که بود هم معیشتی باید
که بی غذا نتوان داشت روح حیوانی

(قصائد ظہیر ، صفحہ ۱۷۱)

ظہیر جن ایام میں طوفان کی نزع میں مصروف تھا ، آذربائیجان

---

۱ - دیوان انوری مرتبہ پروفیسر نفیسی میں صفحہ ۴۶۵ پر یہ قطعہ بہ ادنٰی تصرف یوں ملتا ہے :

می گفت انوری که درین سال بادها
چندان وزد که کوه بجنبد چو بنگری
بگذشت سال و برگ نجنبید از درخت
یا مرسل‌الریاح تو دانی و انوری (مرتب)

میں مقیم ہے ۔ قزل ارسلان ۵۸۷ھ میں قتل ہوتا ہے اور نظامی کا ممدوح ابوبکر نصرةالدین اس کا جانشین ہوتا ہے ۔ قطعۂ ذیل میں ظہیر کا مخاطب یہی نصرة الدین معلوم ہوتا ہے ۔ شاعر شکایت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی پیشین گوئی میں کہا تھا کہ طوفانِ باد سے دنیا تباہ ہو جائے گی ، اس کو تم نے خلعت اور انعام سے سرفراز کیا ، لیکن میرے ساتھ ، جس نے اس پیشین گوئی کی تردید کی ہے ، اور ہی طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے :

شاها زکٰوة گوش و زبان را زدی نقط
بشنو ز من سوالی و تشریف ده جواب

آنکس کہ حکم کرده بطوفان باد و گفت
کاسیب آن عمارتِ گیتی کند خراب

تشریف یافت از تو و اقبال دید و جاه
در بند آن نہ شد کہ خطا گفت یا صواب

من بنده چون خطای وی ابطال کرده ام
با من چرا ز وجہِ دگر می‌رود جواب

(قصائد ظہیر ، صفحہ ۱۶۴)

قولہ : "انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترکِ ملازمت کر کے نیشاپور چلا آیا ۔ اب اس کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی ۔ ہر طرف سے امراء و رؤسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجیے ۔ ۵۳۳ھ میں سلطان احمد پیروز شاه نے اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا ۔ انوری یہ سن کر کہ دریائے جیحون راه میں پڑتا ہے ، اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچ کر سلطان احمد سے معذرت چاہی اور وہیں رہ گیا ، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آ کر ایک قصیده لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا ۔ مطلب کی بات اس طرح ادا کی :

این حال که در بلخ کنون دارم
از خوف پریشانی و گمراهی
زین پیش اگر وہم و گمان بردی
آن مخطی کوتہِ نظر شاهی
بر عبرهٔ جیحون نه بآمورزش
چون بط به طبیعت شدمی راهی

سلطان احمد نے اس کو دربار میں طلب کیا اور معتمدِ خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۲٦۷)

یہ خیال کہ پیشین گوئی غلط ثابت ہونے کی بنا پر انوری سنجر کے دربار سے قطع تعلق کر کے نیشاپور چلا جاتا ہے ، درست معلوم نہیں ہوتا ۔ سنجر اور انوری کے تعلقات میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوا ۔

سلطان احمد پیروز شاہ کے سوانح کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں ۔ کلیات اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک خطائی شہزادہ تھا اور سنجر کے عہد سے آٹھ نو سال بعد خراسان کے بعض حصے ، جن میں بلخ اور ترمذ قابل ذکر ہیں ، اس کے تصرف میں آ جاتے ہیں ۔ جن میں موخرالذکر مقام کو وہ اپنا پایۂ تخت بنا لیتا ہے ۔ وہ کوئی سلجوق شہزادہ نہیں تھا ۔ انوری کے اس شعر سے واضح ہو جاتا ہے :

ز شیر بیشهٔ سلجوقیان بیک جولان[1]
شکاری که بصد سال[2] کرده بر بوده

(صفحہ ۳٦۳)

لیکن خوارزم شاہیوں سے بھی اس کا کوئی علاقہ تسلیم نہیں

۱ ۔ دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی (صفحہ ۲۸٦) میں "حمله ۔" (مرتب)
۲ ۔ "شکاری که بصد کرده بود بر بوده" ۔
(دیوان انوری ، مرتبہ پروفیسر سعید نفیسی) مرتب

کیا جا سکتا ، کیوں کہ انوری اُس کو خطائی مانتا ہے ۔ بلخ پر پہلی مرتبہ قابض ہونے کے بعد بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ اُس کو چھوڑ دیتا ہے ۔ اس وقت تک ہمارے شاعر کے اس کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہوجاتے ہیں ، چنانچہ کلیات میں ایک سے زیادہ موقعوں پر انوری ، پیروز شاہ کے بلخ چھوڑنے پراپنا افسوس ظاہر کرتا ہے ۔ شعر

تو میروی و زمین و زمان همی‌گویند
زهی ز عدل تو خلق خدای آسوده

پیروز شاہ جس وقت ترمذ کو مستقلاً اپنا صدر مقام بنا لیتا ہے ، انوری جو آن ایام میں بلخ میں قیام‌پذیر ہے ، اس کے دربار میں حاضری کا اشتیاق اپنے بعض قصائد میں ظاہر کرتا ہے مثلاً :

قسمم ز خدمت تو بدوری چرا فتاد[1]
گفت انوری بهانه چه آری گناه تست

گفتم که آب جیحون گفتا خری مکن
بگذر که عالمی همه آب و گیاه تست

گفتم که طالعی خللی هست[2] گفت نیست
عیب از خیالهای دماغ تباه تست

یوسف نه ای و بیژن اگر نه به گفتمی
کاندر ازای مجلس شه بلخ چاه تست
(صفحہ ۵۵)

ایک اور قصیدے میں ، جو عماد الدین پیروز شاہ کے بلخ چھوڑنے کے سات ماہ بعد لکھا جاتا ہے ، انوری کہتا ہے :

خسروا من بنده را در مدت این هفت ماه
گر میسر گشتی اندر هفت کشور یاوری

---

۱ ۔ مرتبہ پروفیسر نفیسی میں ”چرا دوری اوفتاد ۔“ (صفحہ ۳۴) (مرتب)
۲ ۔ پروفیسر نفیسی کے ہاں : ”گفتم بطالعم خللی هست ۔“ (مرتب)

تا مرا از لجۂ دریای حرمان دوست دار
فی‌المثل بر تختۂ بردی کشان[1] تا معبری
هستمی از بس کہ سر بر آستانت سودمی
چون دگرابنای‌جنس‌خویش‌اکنون سروری
لیکن ازبس قصد این ناقص عنایت روزگار
مانده ام در قصر دریای عنا چون لنگری

(صفحہ ۳۷۴)

پیروز شاہ آخر کار اپنے وزیر جلال‌الوزرا کو اس کی طلبی کا حکم دیتا ہے ۔ وزیر انوری کے نام فرمانِ طلب روانہ کرتا ہے ۔ جواب میں شاعر ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے بعض اشعار حوالۂ قلم ہوتے ہیں :

مثال عالی دستور چون بہ بندہ رسید
قیام کرد و ببوسید و بر دو دیدہ نہاد
مرا بخدمت او[2] خواندہ‌ای کہ خدمت او
کنند سپہر کہ هست او زمانہ را بنیاد[3]
عماد دولت‌ودین‌آن کہ حصن دولت و دین
پس از وفور خرابی ازو شدند آباد
شہ مظفر پیروز شہ کہ فتح و ظفر
ز سایۂ علم و شعلۂ سنانش زاد

(صفحہ ۶۴۱)

علامہ شبلی شاعر کے طلب کیے جانے کی تاریخ ۵۳۳ھ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ۔ انوری کا بیان اس کے متعلق بالکل

---

۱ ۔ ڈاکٹر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان میں صفحہ ۳۰۷ پر :
''برتختہ بردی موکشان ۔'' (مرتب)

۲ ۔ پروفیسر نفیسی کے مرتبہ دیوان (صفحہ ۳٦۷) میں ''شہ ۔'' (مرتب)

۳ ۔ ڈاکٹر سعید نفیسی کے ہاں یہ مصرع یوں ملتا ہے :
''لہ من سپہر و زمانہ‌کنند این بنیاد ۔'' (مرتب)

صاف ہے ۔ شعر

اندر آمد ز در حجرهٔ من نیم شبی[1]
روز پهنجنبه یعنی دوم بہمن ماه
سال بد پانصد و سی وسه ز تاریخ عجم[2]
گفت برخیز که از شہر برون شد همراه

(صفحہ ۳۵۷)

شاعر کا مقصد یہاں سنِ یزدجردی[3] سے ہے جو ان ایام میں عام طور پر ایران میں رائج تھا ۔ سنہ ہجری اس وقت ۵۶۰-۶۱ھ کے مابین ہونا چاہیے ۔

قوله : "اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی ۔ ہجو میں وہ نہایت دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا ۔ جو شعر اس کی زبان سے نکلتا ، عالم میں پھیل جاتا ۔ اس کے ساتھ طبیعت میں تنک ظرفی اور کم حوصلگی تھی ۔ ذرا کسی سے رنج ہوا اور اس نے ہجو کا طومار باندھ دیا ۔ اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانے کو دشمن بنا لیا تھا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۶۹ و ۲۷۰)

اس پر مجھ کو انگریزی ضرب المثل یاد آتی ہے کہ "پہلے کتے کو بدنام کر لو ، پھر شوق سے اس کو پھانسی دو" ۔ ایک شاعر کے کمالات سے انکار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کم ترین اوصاف کو خوب چمکایا جائے اور اصلی کمال سے

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان انوری (صفحہ ۲۷۱) میں بجائے "نیم شبی" "صبح دمی ۔" (مرتب)

۲ - پروفیسر سعید نفیسی کے ہاں "عرب" بجائے "عجم" ۔ (مرتب)

۳ - پروفیسر سعید نفیسی نے اسے سنہ ہجری سمجھتے ہوئے لفظ "عجم" کو "عرب" سے بدل دیا جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے ۔ (مرتب)

اغماض کیا جائے۔ چونکہ علامہ شبلی کے گوشۂ خاطر میں ظہیر فاریابی کے مبالغہ آمیز احترام نے اپنا گھر بنا لیا ہے ، اس لیے غریب انوری کو مشکل سے بیرون آستاں جگہ دی جاتی ہے ۔ دو تلواریں ، تمام دنیا جانتی ہے ، ایک میان میں نہیں آتیں ۔ اس لیے مجھ کو حیرت ہے کہ انوری کو شعرالعجم کے مشاہیر میں کیوں داخل کیا گیا اور کیوں اس کے ساتھ بے مہر مادر کا سا سلوک جائز رکھا گیا ۔

انوری کے کمالات سے ، جس نے اپنے وطن کی تاریخ کے بعض نہایت تاریک موقعوں پر اپنی شاعری کے ذریعے سے عظیم الشان کارنامے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس نے اپنی طبعی شرافت اور اخلاقی جرأت کا شان دار ثبوت دیا ہے ، مولانا کو اسی قدر یاد رہا کہ ہجو میں وہ نہایت لطیف مضامین پیدا کرتا ہے ۔ لیکن طبیعت کا دنی اور تنک ظرف ہے ۔

متقدمین کے بیانات نیز کلیات کے تتبع سے یہ امر متحقق نہیں ہوتا کہ انوری کو ہجو میں کوئی خاص شغف تھا ۔ ہجو اتفاقیہ انوری کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جیسے اور شعرا کے کلام میں ، لیکن یہ کہنا کہ جہاں کسی سے ناراض ہوا ، ہجو کہہ دی اور اس طرح ساری دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا ، میرے خیال میں واقعات پر مبنی نہیں ۔ انوری فرشتہ نہیں تھا ، انسان تھا ۔ بعض معاصرین سے اس کی عداوت ضرور رہی ہے اور یہ تلخ تجربہ ہر شاعر اور ہر انسان کو ہوا کرتا ہے ، لیکن اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے دوستوں اور مداحوں کا دائرہ وسیع تھا ۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے ۔ صدور اور امرا اس کی عزت کرتے تھے ، سلاطین اور وزراء اس کا احترام کرتے تھے ۔ ان میں سے بعض نے اس کے قطعات کے جواب میں قطعات لکھے ہیں ، اور میں بعض کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۔

(۱) قاضی حمیدالدین صاحبِ مقامات حمیدی (المتوفی ۵۵۹ھ) اس عہد کے نہایت مشہور شاعر ، فاضل اور ادیب ہیں ۔ انوری سے

ان کا رشتۂ اتحاد بے تکلفی کی حد تک پہنچا ہوا تھا ۔ دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف تھے اور دونوں نے مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے حق میں قطعات لکھے ہیں ۔

انوری کے ایک قطعے کے جواب میں ، جس سے شبلی نے دو شعر نقل کیے ہیں ، قاضی صاحب لکھتے ہیں :

مرا انوری آن چو دریا تونگر
همی از سخن زادۂ کان فرستد
چو بی برگیم گشت او را مقرر
ز خلد بریںم همی خوان فرستد
چو هر گنج را جای ویرانی آمد
ازان گنج خود سوی ویران فرستد
ہمانا و آن دوست کو دوستان را
غذای دل و راحت جان فرستد

ایک موقع پر قاضی صاحب انوری سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہے اور تمام واقعات اس کے ارادے کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں ، لیکن خدا جب چاہے اس میں تغیر پیدا کر سکتا ہے ، کیونکہ وہ قادر مطلق ہے ۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اس کی مشیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے :

اوحد الدین کہ در سوال و جواب[1]
بدهد داد علم و بستاند
بہ بزرگی جواب این فتوی
بکند چون بفضل برخواند

---

۱ ۔ دیوان انوری مرتبہ ڈاکٹر سعید نفیسی (صفحہ ۳۸۳) میں : ”در جواب سوال ۔“ (مرتب)

آن کہ داند کہ حال عالم چیست
پس تواند کزان[1] بگرداند
هم برآن گر بماند از چہ بود
عقل این جا فرو همی‌ماند

(صفحہ ٦٦٥)

انوری جواب دیتا ہے :

ای بزرگ جہان حمید الدین
کہ خرد مدح تو همی‌خواند
دانکہ از هیچ روی نتوان گفت
کہ نداند همی و نتواند
ماند یک چیز آن کہ خود نکند
گرچہ جای[2] تواند و داند
زان کہ بر بی‌نیاز واجب نیست
کہ[3] پئی نفع کس قضا راند
'لم' در افعال او نیاید ازان
کہ سبب درمیانہ بنشاند
غنی مطلق از غرض[4] دورست
فعل او کی بفعل ما ماند
هیچ تدبیر نیست جز تسلیم
خویش[5] را بیش ازین نرنجاند

(صفحہ ٦٦٥)

(۲) شجاعی ایک شاعر ہے جو انوری کو لکھتا ہے :

۱ - مرتبہ سعید نفیسی میں ''گر آن ۔'' (مرتب)
۲ - مرتبہ سعید نفیسی میں ''حالی ۔'' (مرتب)
۳ - اشاعت سعید نفیسی میں ''کز ۔'' (مرتب)
۴ - اشاعت نفیسی میں ''عرض ۔'' (مرتب)
۵ - اشاعت نفیسی میں ''خویشتن ۔'' (مرتب)

ای انوری تویی که بفضل و هنر بوانـد
احرار روزگار و افاضل ترا رهی
(صفحہ ۷۵۲)

اور جواب میں انوری لکھتا ہے :

شجاعی ای خط و شعر تو دام و دانۂ عقل
هزار مرغ چو من صید دام و دانۂ تو

میں بخوف طوالت صرف ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں : پورے قطعوں کے لیے کلیات ملاحظہ ہو[1] :

(۳) تاج الافاضل فخرالدین خالد بن ربیع المسامکی سے انوری کی گہری دوستی تھی ۔ وہ کہتے ہیں :

سلام علیک انوری کیفَ حالک
مرا حال بی تو نہ نیک است باری

(۴) ارشدالدین ایک اور شاعر ہے جس کے قطعے کے جواب میں انوری کہتا ہے :

هیچ دانی ارشدالدین کز کف و طبع تو دوش
من چه شربت های آب زندگانی خورده ام
(صفحہ ۷۰۸)

(۵) کمالی شاعر انوری کا معاصر ہے ۔ اس کے قطعے کے جواب میں انوری لکھتا ہے :

شعر های کمالی آن بہ سخن
پای طبعش سپرده فرق کمال[2]

(۶) ایک اور شاعر[3] انوری کو اپنے گھر بلاتا ہے :

---

۱ ۔ دیکھیے دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۴۳۶ ۔ (مرتب)
۲ ۔ دیوان انوری اشاعت سعید نفیسی صفحہ ۴۲۰ ۔ (مرتب)
۳ ۔ پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان (صفحہ ۴۴۲) میں اس قطعہ کا مالک قاضی حمیدالدین کو بتایا گیا ہے ۔ (مرتب)

اوحدالدین انوری ای من مرید طبع تو
وی هوای عشق و مهر تو مراد طبع من
هم بہ بینم دولتِ وصلِ تو اندر ربع خویش
کر محل دولت و اقبال گردد ربع من

(صفحہ ۱۸ء)

(ے) ایک اور شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا ، انوری کی مدح میں قصیدہ[۱] لکھتا ہے :

ای در هنر مقدمِ اعیانِ روزگار
درنظم و نثر اخطل و حسّانِ روزگار
آسان بر نفاذ تو دشوار اختران
پیداست بر ضمیر تو پنهانِ روزگار
حلم ترا کرانہ همی کرد ناگهان
بکسست هر دو پلہ میزان روزگار
اخلاق تو سواد همی کرد لطف[۲] تو
پُر عهد بیان[۳] دفتر و دیوان روزگار
با عقل ترسان ترسان[۴] گفتم کہ در ثنا
آنرا کہ هست دیدۂ[۵] اعیان روزگار
لقمانِ روزگارش خوانم چہ گفت نی
جز انوری کہ زیبد لقمانِ روزگار

(صفحہ ۱۵۵)

۱ - پروفیسر سعید نفیسی کے نزدیک یہ قصیدہ انوری کا لکھا ہوا ہے - چنانچہ اس کے عنوان میں فرماتے ہیں :
''در مدح عدوةالبلغا افصح الفصحا خواجہ رشیدالدین شاعرگوید -''
(دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۱۵۰) (مرتب)
۲ - اشاعت نفیسی میں بجائے ''لطف تو'' ''ناگہان -'' (مرتب)
۳ - اشاعت نفیسی میں ''بیاض -'' (مرتب)
۴ - اشاعت نفیسی میں ''ترس ترسان -'' (مرتب)
۵ - اشاعت نفیسی میں ''زبدۂ -'' (مرتب)

(۸) ایک اور شاعر لکھتا ہے :

فرخندہ اوحدالدین فرزانہ انوری
ای آنکہ از تو عالم وحدت منورست[1]

(۹) سراجی شاعرِ ترمذی کے خط کے جواب میں انوری کہتا ہے :

سراجی ای ز مقیمانِ حضرت ترمذ
رسید نامۂ تو همچو نامہ[2] ز بہشت

(صفحہ ٦٦٣)

(۱۰) ایک وزیر دربار سے آٹھ کر اپنے محل کی طرف جا رہا تھا۔ دامن پاؤں میں آلجھا ، گر پڑا ۔ انوری نے اس موقعے پر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کا ابتدائی شعر ہے :

صاحبا سقطۂ مبارک تو　　　نہ ز آسیب حادثات رسید

(صفحہ ٦٣٨)

وزیر قطعے کا جواب قطعے میں دیتا ہے ۔ میں ابتدائی شعر پر قناعت کرتا ہوں :

گر چہ شب سقطۂ من هر کہ دید
پارۂ از روز قیامت شمرد

(صفحہ ٦٦٩)

کلیات سے بعض ایسے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انوری نے زمانے کو اپنا دشمن بنانے کے بجائے ایسی کوشش بھی کی ہے کہ دشمنوں کو دوست بنایا جائے۔

فتوحی مروزی اس کا سخت ترین معاند مانا گیا ہے ، لیکن

---

۱ - یہ چار اشعار کا ایک قطعہ ہے جس کے عنوان میں پروفیسر نفیسی لکھتے ہیں :

''حکیم از بام افتادہ دوستی این قطعہ گفتہ است ۔''

(صفحہ ۳۴۷ ، اشاعت نفیسی) ۔ (مرتب)

۲ - اشاعت نفیسی (صفحہ ۳٦۱) میں ''دوحہ ای ۔'' (مرتب)

انوری اس کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ کسی دوست کو لکھتا ہے:

آمدم باغمی کہ جان ببرد گر نہ لطفِ تو غمگسار آید[1]
گرفتوحی ز دوست داری تو بندہ را نیز دوست دار آید
یا بنزدیک او روم روزی کہ بروزیم یک دو بار آید

(صفحہ ٦٣٨)

کسی اور موقعے پر شاعر اپنے کسی دشمن کی سفارش میں جس نے اس کو نقصان پہنچایا ہے، کہتا ہے:

ای جوان بخت سروری کہ ندید
چون تو فرزانہ چشم عالم پیر
بندہ را خصم اگر بہ پیش تو کرد
نقش عنوان نامۂ تزویر
مالش آن بس کہ تا بحشر بماند
بی گنہ مستِ شربتِ تشویر
سیر امیدش از عطای بزرگ
ای بزرگ جہان بجرم حقیر
زانکہ جز دست جود تو نکشد
پای ظلم و نیاز در زنجیر
مادری پیر دارد و دو سہ طفل
از جہان نفور جفت نفیر
ہمہ گریان لقمہ از امید
ہمہ عریان جامہ از تدبیر
غم دل کردہ بر رخ ہر یک
صورت حال ہر یکی تصویر

۱ - پروفیسر نفیسی اس قطعے کے عنوان میں کہتے ہیں:
"بخانۂ فتوحی رفتہ بود و مخدوم ازو متغیر شدہ در عذر آن گوید۔"
(صفحہ ۳۰۲، اشاعت نفیسی) - (مرتب)

دست اقبالت ار نہ بکشاید
بند ادبار این معیل فقیر
گاو دوشای عمر او ندھد
زین پس از خشک سال حادثہ شیر
(صفحہ ۱۵۴)

انوری کا اگر زمانہ دشمن ہوتا تو اس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر فیاض جذبات کا اظہار کرتا ۔ مولانا شبلی کی افراط و تفریط استعجاب انگیز ہے ۔ کبھی تو انوری کو ایسا بلند پایہ مانتے ہیں کہ سنجر جیسا جلیل القدر سلطان دو مرتبہ اس کے گھر جاتا ہے اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اتنا کم‌ظرف اور بد حوصلہ بتاتے ہیں کہ تمام دنیا کو اس کا دشمن بنا دیتے ہیں ۔

قولہ : ”سلطان علاءالدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے ۔ سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہان کا رئیس تھا ، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار میں بھیج دو ۔ ملک طوطی نے فخرالدین مروزی کو ، جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا ، حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں ۔ فخرالدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا ۔ اس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا ، اس لیے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا :

ھی الدنیا تقول بملاء فیھا حذار حذار من بطشے و فتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے ۔ تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا۔“ (شعرالعجم ، صفحہ ۲۷۰)

مولانا شبلی اس موقع پر پہلی مرتبہ محمد عوفی کی لباب الالباب کا حوالہ دیتے ہیں ۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اس وقت تک

ان کی نظر سے نہیں گزری تھی ، اس لیے کہ شبلی فخرالدین مروزی کو ملک طوطی کے دربار کا شاعر اور منشی بیان کرتے ہیں ، جو ملک طوطی کے خوف سے انوری کو اصل واقعے سے اطلاع نہیں دے سکتا تھا ۔ حالانکہ لباب سے ایسا کوئی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ قیاس میں آتا ہے کہ خود علاء الدین کے دربار سے اس کا تعلق تھا ۔ اس موقع پر لباب کی عبارت ہے :

''بنزدیک ملک طوطی بنشست تا آن بلبل بستان فصاحت را بخدمت او فرستد و لطف مجاملت درمیان آورد و چنان می نمود کہ اورا بجہت تعہد و تلطف استدعا می کند و در ضمیر داشت کہ چون بر وی دست یابد او را نکال گرداند و امیر عمید فخرالدین را زان حال علم بود و صورت حال بنزدیک او نمی توانست نبشت چہ از سطوت قہر سلطان علاءالدین می اندیشید و مصادقت و دوستی باہمال رضا نمی داد ۔''

(لباب الالباب ، جلد دوم ، صفحہ ۱۳۸)

ملک طوطی مرو شاھجہان کا رئیس نہیں ہے بلکہ قبائل غز کا سردار ۔ سنجر کے دربار میں غزوں کے دو ایلچی رہا کرتے تھے؛ ایک کا نام قرغود تھا اور دوسرے کا طوطی ۔ جب ۵۴۸ھ میں ان قبائل نے سنجر کو شکست دے کر اور اسیر کر کے تمام خراسان پر قبضہ کر لیا تو میاں طوطی کا طوطی خوب بولنے لگا اور طوطی سے ملک طوطی بن گئے ۔ انوری جو غزوں سے دلی نفرت رکھتا تھا ، شومی قسمت سے غز انقلاب کے دور میں کچھ عرصے کے لیے ملک طوطی کے دربار میں توسل پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بضرورت وقت اس کی مدح و ثنا میں نظمیں بھی لکھتا ہے ۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تعریفوں میں درپردہ تعریض مقصود ہے ، مثلاً یہ شعر :

طوطی ای آنکہ ز انصاف تو ھر نیم شبی
بلبل شکر بعشوق برد[1] زمزمہ را

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۳۳۱) میں ''کشد ۔'' (مرتب)

دیکھو شاعر طوطی کے لیے بلبل لے آیا ۔ اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو :

خسرو صاحبقران طوطی کہ از انصاف او
باز را تیہواھوا خواہ است و شاہین را حمام

شاعر نے پرندوں کا ضلع نہیں چھوڑا ۔ اور ذیل کی رباعی میں تو پورا چڑیا خانہ بھر دیا ہے ۔ رباعی

ای زیر ہمای ہمت چرخ مدام
کبک از نظرت گرفتہ با باز آرام
اقبال تو شاہین و کبوتر ایام
سیمرغ نظیر خسرو طوطی نام

(صفحہ ۵۳۰)

دیوان میں اکثر غوریوں کے متعلق کئی تلمیحات ملتی ہیں لیکن کوئی نظم ایسی موجود نہیں جس کو علاء الدین کی ہجو کے نام سے موسوم کیا جاسکے ۔ البتہ ایک شعر ایسا ہے جو علاءالدین کی ناراضی کے اسباب پیدا کرسکتا ہے :

کہ بسوراخ غورکین تو در بمثل موش مادہ شیر نر است

(صفحہ ۷۰)

قولہ : "انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھ کر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا ۔ چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمایش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کر دی ۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں :

چار شہرست خراسان را بر چار طرف
کہ وسط شان بہ مسافت کم صد در صد نیست

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۲۰۷) میں "تیہو را ۔" (مرتب)

گرچه معمور و خرابش همه مردم دارد
نه چنان هست که آبستن دام و دد نیست
بلخ را عیب اگر چند باوباش کنند
بر هر بی خردی نیست که صد بخرد نیست
مصر جامع را چاره نه بود از بد و نیک
معدن زر و گہر بی مرب و بسد نیست
حبّذا شہر نشاپور که در ملک خدای
گر بہشت ست همین است وگرنه خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختۂ کلاہ کیا اور اوڑھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی ۔ اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی لیکن قاضی حمیدالدین جن کی تصنیف سے "مقامات حمیدی" ہے اور جن کی شان میں انوری نے لکھا ہے :

بمدح و ثنا گر کنم رای نظمی
نه دشوار گویم نه آسان فرستم
ولیکن به مدح جناب حمیدی
اگر وحی باشد هراسان فرستم

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اس کی جان بچ گئی ۔ انوری نے ان واقعات کا اس قصیدے میں ذکر کیا ہے : ع

ای مسلمانان فغان از دور چرخ چنبری

چوں کہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم ، صفی‌الدین عم ، مفتی تاج الدین ، حسن محتسب ، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی ، اس لیے قصیدے میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃالاسلام ہے ۔ میں اس کی ہجو کیوں کر کہہ سکتا ہوں ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۲)

ہجو بلخ کے اصل واقعات ، ایسا معلوم ہوتا ہے ، ہم تک نہیں

پہنچے۔ تذکرہ نگاروں کا ماخذ غالباً وہی قصیدہ ہے جو ''سوگند نامہ درباب نفی ہجو بلخ'' کے نام سے مشہور ہے ۔ میں بھی ان واقعات کے مطالعے کے وقت اسی سوگند نامے سے کام لوں گا ۔

سنجر کی وفات کے بعد جب خراسان میں انقلاب پر انقلاب آ رہے تھے اور آئے دن حکمران بدل رہے تھے ، انوری بلخ میں سکونت اختیار کرچکا تھا ۔ ان دنوں طغرل تگین کا عہد حکومت تھا ، جیسا کہ شاعر سوگند نامے کے مقطع میں کہتا ہے :

حبذا تاریخ این انشا کہ فرماندہ بہ بلخ
رایت‌طغرل تگین بودہ است و رای ناصری

(صفحہ ۴۰۴)

اس فرماندہ کے حالات سے ہم تاریکی میں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زمانہ سنجر کے بعد ہے ۔ چناں‌چہ انوری :

ملک اگر در دولت[1] سنجر بآخر پیر گشت
شد جوان بار دگر در دولت طغرل تگین

(صفحہ ۳۲۳)

علیٰ ھذا ہجو بلخ کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں ۔ بالعموم یہی خیال کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ انوری کے آخر حصہ عمر سے تعلق رکھتا ہے جس کے بعد وہ عزلت نشین ہو جاتا ہے ۔ پروفیسر براون اور میرزا محمد قزوینی اس واقعے کا ظہور انوری کی پیشین گوئی کے غلط ثابت ہونے کی پاداش میں بتاتے ہیں ۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ انوری کی عزلت گزینی سے بہت عرصہ پیش تر ظہور میں آیا ہے ۔ انوری کی تشہیر سلطان سنجر (المتوفیٰ ۵۵۲ھ) اور قاضی حمید الدین (المتوفیٰ ۵۵۹ھ) کے سنین وفات کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی ہوگی ۔کہا جاتا ہےکہ قاضی حمید الدین شاعر کو بلخیوں کے ہاتھ سے نجات دلواتے ہیں ۔

ہجو کے اصلی مصنف کے نام سے ہم ناواقف ہیں ۔ سوگند نامے

۱۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۲۵۷) میں 'نوبت ۔' (مرتب)

میں صرف "حسود" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے ۔ شعر

باز دان آخر کلام من ز منحول حسود
فرق کن لقش الٰہی را ز نقش آذری

(صفحہ ۴۰۱)

اور ہمارے شاعر کے ساتھ اس کی عداوت دس سال سے چلی آ رہی ہے :

تا تو فرصت جوی گردی وزا کمین گاہ حسد
غصہ[1] دہ سالہ را بامن[2] بہ‌صحرا آوری

(صفحہ ۴۰۴)

ہجو کا مصنف خواہ کوئی ہو ، حکیم انوری کے بیان سے صاف پایا جاتا ہے کہ صاحب "خر نامہ" نے (جو بہ قول شادی آبادی حکیم سوزنی[3] ہے) اس کی ہجو کی ہے ۔ سوگند نامہ : شعر

چون مر او را واضع خرنامہ گیرد ریش گاؤ
گاو او در خرمن من باشد از ... خری

(صفحہ ۴۰۲)

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ "ہجو بلخ" اور چیز ہے اور "خر نامہ" کوئی اور چیز ہے ۔ اور وہ نظم جس سے بلخی ناراض ہوتے ہیں "ہجو بلخ" ہے ، نہ "خر نامہ"۔ شادی آبادی نے حکیم سوزنی کے کلیات سے "خرنامہ" کے چند اشعار نقل کیے ہیں ۔ چوں کہ موجودہ

۱۔ مرتبہ نفیسی (صفحہ ۴۰۳) میں 'در ۔' (مرتب)
۲۔ اشاعت نفیسی میں 'باری ۔' (مرتب)
۳۔ جدید ایرانی ناقدین کے نزدیک یہ حرکت فتوحی ہی کی تھی ۔ چناں‌چہ پروفیسر سعید نفیسی :

"اثیرالدین فتوحی بہ بدخواہی قطعہ ای سرودہ کہ در آن از شہرہای مرو و نیشاپور و ہری تحسین کردہ و مردم شہر بلخ را نکوہیدہ و آن را بانوری نسبت دادہ است ۔"

(مقدمہ دیوان انوری ، صفحہ ۳۴) ۔ (مرتب)

مذاق کے معیار سے پست ہیں لہٰذا قلم انداز کیے جاتے ہیں ، صرف وزن و ردیف کی خاطر ایک شعر لکھ دیا جاتا ہے :

آن سر خران بجای نماید سر خری
پرُ مغز خر شود همه دیوان دفترم

شادی آبادی ، سوزنی کے دیوان سے امیر معزی کی ہجو کے بعض اشعار نقل کر کے یہ غلط نتیجہ مترتب کرتے ہیں کہ ہجوِ بلخ کا واضع خود امیر معزی تھا ، لیکن امیر معزی ۵۴۲ھ میں وفات پاتا ہے ۔ اثیر الدین فتوحی ان ایام میں زندہ تھا اور انوری سے اس کی مخالفت کا راز بھی طشت از بام ہے ، اس لیے تذکرہ نگاروں نے ہجو کا قرعہ اس کے نام پر ڈالا ہے ۔

آمدم برسر قصہ ؛ ہجو کا خمیازہ بے گناہ انوری کو اٹھانا پڑا ۔ تفصیلی واقعات کسی کو معلوم نہیں ۔ سوگند نامے میں شاعر نے اس قدر کہا ہے : بیت

بر سر من مغفری کردی کله وان برگذشت
بگذرد بر طیلسانم نیز دور معجری

(صفحہ ۳۹۹)

اس شعر کی ترجمانی میں اہل تذکرہ نے قیاس دوڑایا ہے کہ بلخیوں نے انوری کو تختہ کلاہ کیا اور عورتوں کی اوڑھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی ۔ شادی آبادی کہتے ہیں کہ امیر معزی کی شکایت پر یہ تشہیر بادشاہِ عہد کے حکم سے وقوع میں آئی ۔ لیکن ایک اور قصیدے سے جو مجد الدین کی مدح میں ہے اور جس کا مطلع ہے :

اکنون که ماه روزه بنقصان در اوفتاد
آه از حجاب حجرۂ دل بر در اوفتاد[1]

اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا ۔ غوغائی

---

۱ ۔ صفحہ ۸۰ ، دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی ۔ (مرتب)

اس کے گھر پر چڑھ آئے تھے اور اس کی تخویف و توہین وہیں عمل میں آئی تھی ۔ شاعر مجد الدین کو خطاب کر کے کہتا ہے :

الحق مجال نیست کہ بندہ[1] چو دیگران
از عشق خدمت تو بدین کشور اوفتاد
او را کہ شکرهای شکر ریز شعرهاست
زهری بدست واقعہ در شکر اوفتاد
از حضرتی[2] حشر بدرش حاضر آمدند
نادیدہ مرگ در فزع محشر اوفتاد
تیمارش از تعرض هر بیخبر فزود
دستارش از عقیلہ صد[3] معجر اوفتاد
بشنو کہ در عذاب چگونہ رسید صبر[4]
بنگر کہ در عذاب[5] چگونہ خر[6] اوفتاد
با منکران عقل دربن خطہ کار او
داند همی خدای کہ بس منکر اوفتاد
کافور در غذاش بافطار هر شبی
از جور او (؟) بمومن و بر کافر اوفتاد
از بس کہ بار داوری این و آن کشید
او را سخن بحضرت این داور اوفتاد

(صفحہ ۹۸)

اس ورطہ بلا سے جن لوگوں نے انوری کو نجات دلوائی ، ہم ان کے ناموں سے مطلق بے خبر ہیں ۔ سوگند نامے میں جن بزرگوں

۱- مرتبہ نفیسی میں ''الحق مجال نسبت بندہ ۔'' (مرتب)
۲- اشاعت نفیسی میں 'حضرتت' (مرتب)
۳- مرتبہ سعید نفیسی میں 'نہ از معجر ۔' (مرتب)
۴- 'چند ۔' (مرتب)
۵- 'خلاف ۔' (مرتب)
۶- 'در ۔' (مرتب)

کا نام بسبیل تذکرہ آیا ہے اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہیں ۔ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں ، ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ بلخ کی ہجو کا خیال بھی دل میں لا سکوں ۔ اس کے متعلق سوگند نامے کے بیانات بالکل صاف ہیں :

با چنین سکان اگر از قدر شان عقدی کشند
فارغ آید چرخ اعظم از چہ از بی زیوری
هجو گویم بلخ را هیهات یارب زینهار
خود توان گفتن کہ زنگارست زر جعفری

(صفحہ ۱۰۳)

ان بزرگوں میں سب سے مقدم نظام الدین ہیں ۔ شبلی ان کو نظام الدین احمد مدرس کہتے ہیں ۔ لیکن ان کا پایہ اس سے بدرجہا افضل و ارفع معلوم ہوتا ہے ۔ شادی آبادی ان کو ضابطِ بلخ کہتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ قاضی القضاۃ ہیں ۔ سوگند نامہ :

افتخار خاندان مصطفٰی در بلخ و من
کردہ ام در خدمتش حسّانی و هم بوذری[1]

آن نظام دولت و دین کانتظام عدل او
در دل اغصان کند باد صبا را رهبری

در پناه سدّهٔ جاهِ رعیت پرورش
بر عقاب آسمان فرمان دهد کبک دری

هم نبوت در نسب هم پادشاهی در حسب
کو سلیمان تا در انگشتش کند انگشتری

مسند اقضی القضاۃ شرق و غرب افراشتہ
آن کہ هست از مسندش عباسیان را برتری

۱۔ پروفیسر نفیسی کے ہاں یہ مصرع یوں درج ہے :
"کردہ هم سلمانی اندر خدمتش هم بوذری" (مرتب)

آنکہ پیش کلک و طبعش[1] آن دو سحر آنکہ حلال
صد چو من هستند چون گوسالہ پیش سامری

آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کنند
از میان هر دو بردارد شکوهش داوری

(صفحہ ۴۰۰)

قاضی حمیدالدین کے ذکر کے بعد انوری خواجہ صفی‌الدین عمر کا ذکر کرتا ہے ۔ شعرالعجم میں انھیں "صفی الدین عم" کہا گیا ہے ۔ لیکن سوگند نامہ :

خواجۂ ملت صفی الدین عمر در صدر شرع
آنکہ نبود دیو را در سایۂ او قادری

کلیات میں ان کی تعریف میں ایک اور قصیدہ موجود ہے جس کا مطلع ہے :

زمانۂ گذران بس حقیر و مختصرست
ازین زمانۂ دون در گذر کہ در گذرست[2]

تاج الدین کے بعد مجد الدین ابوطالب کا نام آتا ہے ۔ غالباً یہ وہی بزرگ ہیں جن کے مدحیہ قصیدے سے چند اشعار اوپر درج ہوئے ہیں ۔ شبلی ان کو ابوطالب نعیم کہتے ہیں ۔ سوگند نامہ :

مجد دین بوطالب آن عالم کہ رہ گم شد[3] درو
عقل کل آن کردہ از بیرون عالم اطهری[4]

شعرالعجم میں ایک اور نام ملتا ہے "حسن محتسب" مگر سوگند نامہ اس سے واقف نہیں ہے ۔

۱۔ اشاعت نفیسی میں 'نطقش ۔' (مرتب)
۲۔ صفحہ ۳۶ ، دیوان انوری ، مرتبہ ڈاکٹر سعید نفیسی ۔ (مرتب)
۳۔ اشاعت نفیسی میں 'یک رہ شد ۔' (مرتب)
۴۔ 'از هری ۔' (مرتب)

قوله : "بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزین ہو کر بیٹھا ۔ سلطان علاؤ الدین غوری جہاں سوز نے دربار میں طلب کیا لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا :

کلبۂ کاندرو بہ روز و بشب
جای آرام و خورد و خواب من است
جایگہ دارم اندرو کہ ازو
چرخ در عین رشک و تاب من است
ہر چہ در مجلس ملوک بود
ہمہ در کلبۂ خراب من است
رحل اجزا و نان خشک درو
گرد خوان من و کباب من است
قلم کوتہ و صریر خوشش
زخمہ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صوفیانۂ اطلس
از ہزار اطلس انتخاب من است
ہر چہ بیرون بود ازین کم و بیش
حاش للسامعین عذاب من است
خدمت پادشہ کہ باقی باد
نہ ببازوی آب و خاک من است
زین قدر راہ رجعتم بستہ است
آن کہ او مرجع و مآب من است
وین طریق از نمایش است خطا
چکنم این خطا صواب من است
نیست این بندہ را زبان جواب
جامہ و جای من جوابہ من ست"

(شعرالعجم، صفحہ ۲۷۲)

علاؤ الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جا سکتا کیوں کہ بہ روایتِ مشہور علاؤ الدین انوری سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی خاطر نشین رہے کہ اگرچہ انوری کی گوشہ‌نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں، لیکن کلیات سے اس قدر قطعی پایا جاتا ہے کہ حکیم انوری ۶۱-۵۶۰ھ میں سلطان عماد الدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے، اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس سنہ سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا، کیوں کہ کلیات میں متعدد قصائد اسی پیروز شاہ کی مدح و ثنا میں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصے میں لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن علاءالدین جہاں سوز ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے اس لیے انوری کی عزلت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

قطعۂ بالا میں انوری جس بادشاہ[1] کی خدمت سے دست کش ہوتا دیکھا جاتا ہے، وہ کوئی اور بادشاہ ہے جس سے اس کے گہرے اور دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصے تک رہ چکا ہے، کیوں کہ یہ طلبی کی تحریک ایک عرصے تک جاری رہی ہے اور کئی قطعات اس سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں انوری کا آخری جواب اور پادشاہ کی طرف سے اس کا جواب‌الجواب، جس پر یہ تحریک ختم ہو جاتی ہے، درج کیے جاتے ہیں:

خسروا روزی ز عمرم گر سپہر افزون کند
تا نگیرد بستہ مرگم چون مگس را عنکبوت

گر توانم سجدہ گاہ شکر سازم ساحتش
چون مسیح مریم از صفر حمل تا پای حوت

پس چگوئی صرف یارم کرد بر درگاہ تو
ہر یکی زین روزہا را از پی یکروزہ قوت

طالب مقصود را یک سمت باید مستوی
مرد را سرگشتہ دارد اختلافات سموت

۱۔ یہ بادشاہ غالباً عماد الدین پیروز شاہ ہے۔ (حاشیۂ مصنف)

من چو کرم پیله ام قانع بیک نوع از غذا
تو امان با صبر چون وتر حنیفی باقنوت[1]

(صفحه ٦۲٦)

بادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہے لیکن وزن مثمن کے بجائے مسدس ہے :

ای بتو مخصوص اعجاز سخن[2]
چون بوتر آئی و در معنی قنوت[3]

سمت درگاهت سعود چرخ را
گشته در دوران کل خیر السموت

ما[4] چو قرص ارزن و حوت غدیر
تو چو قرص آفتاب و برج حوت

صعوهٔ ما مرغ سیمرغ تو نیست
تو قوی بازو بفضل و ما بقوت

۱- دیوان انوری مرتبہ ڈاکٹر سعید نفیسی میں صفحہ ٦۵ - ۳٦۴ پر یہ قطعہ زیر عنوان 'فی الشکایت' درج کیا گیا ہے اور اس میں سات اشعار ہیں ۔ آخری دو شعر یہ ہیں :

فضلهٔ طبعم نسیج الوحد ازین معنی شد ست
فضلهٔ کرمک نسیج از الف شد یا برگ توت
انوری لاف سخن تاکی زنی خاموش باش
تاکه چون مردان مسلم گرددت ملک سکوت

(مرتب)

۲- پروفیسر نفیسی نے یہ قطعہ اپنے مرتبہ دیوان انوری کے صفحہ ۳٦۵ پر دیا ہے ۔ ان کے خیال میں یہ انوری نے قاضی حمید الدین کو لکھا تھا ۔ (مرتب)

۳- اشاعت نفیسی میں 'چون برای وتر در معنی قنوت' (مرتب)

۴- پروفیسر نفیسی کے ہاں اس سے قبل یہ شعر ملتا ہے :

روزگاری در کمال ناقصان
روزگار اطلس کند از برگ توت (مرتب)

پیش نظم چون نسیج الوحد تو
چیست نظم ما نسیج العنکبوت
گرچہ در تالیف این ابیات نیست
بی سمین غثی و قصبی بی کروت
رای عالی در جواب این مبند
لایق اینجا السکوت ست السکوت[1]

قولہ : ”انوری نے حسبِ روایتِ دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا ۔“
(شعرالعجم ، صفحہ ۲۷۳)

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہے۔ پروفیسر براؤن ، پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں[2] دیتے ہیں : آتش کدہ قلمی ۵۵۶ھ اور

۱- سعید نفیسی صاحب کے مرتبہ دیوان میں اس کے بعد یہ شعر ہے :
ای بحق بخت تو حی لاینام
بادی الدر حفظ حی لایموت (مرتب)

۲- پروفیسر نفیسی مرحوم اپنے مرتبہ دیوان انوری کے مقدمے میں بہت سے تذکروں کے حوالے سے انوری کی تاریخ ہاے وفات درج کرتے ہیں - چناں چہ :
”در کتابهای مختلف آنچہ دربارۂ تاریخ مرگ انوری نوشتہ اند بدین گونہ است : در تاریخ کبیر جعفری در ۵۸۰ھ ، در تذکرة الشعرا ۵۴۷ چاپ شده و در برخی از نسخهای خطی آن ۵۵۶ نوشتہ اند ۔ در خلاصہ الاشعار ۵۴۴ ، در مجمع الفضلا ۵۴۷ ، در هفت اقلیم ۵۸۰ ، در نظم گزیده ۵۷۴ ، در مراة الخیال و تذکرۂ حسینی ۵۴۹ ، در آتش کده ۵۴۰ ، در نتایج الافکار ۵۸۰ ، در خزانہ عامرہ ۵۸۰ ، در ریاض العارفین ۵۷۵ ، در مجمع الفصحا ۵۷۵ ، در مفتاح التواریخ ۵۴۷ و ۵۹۷ ، در شمع انجمن ۵۸۵ ، در ریحانۃ الادب ۵۴۷ یا ۵۵۱ یا ۵۷۵ ، در طرائق الحقائق ۵۴۷ و ۵۷۵ ، در مجمل فصیحی ۵۸۵ و در برخی از نسخ خلاصۃالاشعار
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

طبع بمبئی ۵۵۹ھ ، تقویم التواریخ حاجی خلیفہ ۵۴۷ھ ، مرات الخیال شیر خاں لودھی ۵۴۹ھ ، ہفت اقلیم ۵۸۰ھ ، مجمل فصیحی ۵۸۵ھ ، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی ۵۸۷ھ اور مرات العالم ۵۹۲ھ ۔

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہے ہر صورت میں غلط ہے ۔ چونکہ طوفانِ باد کے سلسلے میں انوری کا نام بھی لیا جاتا ہے اور طوفان کی تاریخ ۵۸۲ھ ہے ، اس لیے انوری کی وفات اس سن[1] کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی ۔

حمداللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا مزار سرخاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم دفن ہیں ، بتاتا ہے اور یہ کسی قدر حیرت خیز ضرور ہے ۔ اس لیے کہ شاعر کا اکثر حصۂ عمر بلخ میں بسر ہوا ہے ، اواخر عمر میں تبریز جا کر کیا کرتا[2] ۔

قولہ : ''انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

در ۵۸۷ ضبط شدہ است و در بعضی دیگر ۵۴۶ نوشتہ شدہ ۔ حاج خلیفہ در کشف الظنون در ذیل کلمۂ دیوان انوری نوشتہ است ''اوحد الدین علی بن اسحاق ابیوردی متوفی در ۵۶۵'' ۔ برخی از خاور سناسان در ۵۸۷ و برخی در ۵۹۱ ضبط کردہ اند ۔''
(مقدمۂ دیوان انوری ، صفحہ ۴۸) (مرتب)

۱- ''...درین میان آنچہ پیش از ۵۸۲ است پذیرفتنی نیست زرا با دلایلی کہ پیش ازین آوردہ ام انوری در قران سنارگان در سال ۵۸۲ زندہ بودہ است...من سال ۵۸۵ را کہ در مجمل فصیحی و پس از آن در شمع انجمن آمدہ است درست ترین تاریخ رحلت انوری می دانم ۔''
(مقدمۂ دیوان انوری ، صفحہ ۴۸) (مرتب)

۲ - پروفیسر سعید نفیسی دیوان انوری کے مقدمے میں صفحہ ۴۹ پر فرماتے ہیں :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے ، نادر ، باریک اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں ۔ ان ہجووں میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے صاف نظر آتی ہے ۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا جو کلام زیادہ نادر ہے ، اسی قدر زیادہ فحش ہے ۔ سینکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کے قابل نہیں ۔ کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو "آتش کدۂ آذر" موجود ہے ۔ ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے ۔ ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے ، وہ حاضر ہے ۔

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی، پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی ۔ دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے :

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را
یکی مدیح و دگر قطعۂ تقاضایی
اگر بداد ، سوم شکر، ورنہ داد ھجا
ازین سہ بیت دو گفتم دگرچہ فرمایی"

(شعر العجم ، صفحہ ۲۸۳-۸۴)

انوری کی شاعری کے کئی پہلو ہیں ؛ مثلاً اوصاف نگاری یا

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

"درین تردیدی نباشد کہ وی در شہر بلخ در گذشتہ است و ہرکس کہ درین زمینہ بحث کردہ گفتہ است وی را در جوار احمد خضرویہ در بلخ بخاک سپردہ اند جز حمداللہ مستوفی کہ در نزہت القلوب (صفحہ ۸۹) نوشتہ است وی را در مقبرہ الشعرای سرخاب در تبریز دفن کردہ اند و این حتماً درست نیست ۔"

ڈاکٹر سعید نفیسی نے انوری کا مزار بلخ میں ہونے کی ایک دلیل کے طور پر ساتویں صدی ہجری کے خراسانی شاعر خواجہ فرید الدین احول اسفراینی کا یہ شعر پیش کیا ہے :

باد اگر برد ببلخ آب ز بحر شعر من
آتش رشک بر زند شعلہ ز خاک انوری

(مرتب)

مداحی ، اخلاقیات و پند و حکم اور مہاجات ۔ اپنے ہم وطنوں میں انوری اپنے کمال قصیدہ نگاری کی بنا پر فردوسی اور سعدی جیسے شہسواران فن کا ہم عناں مانا گیا ہے ۔ مولانا شبلی برخلاف مذہب جمہور اس کو ہجو گوئی کی نبوت کا منصب عطا فرماتے ہیں اور اس کے حقیقی کمال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے ۔ نہ انھوں نے قصیدہ گوئی کی اہم دقائق ، مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کی داد دی ہے ۔

مولانا نے انوری کا کلیات بچشم خود نہیں دیکھا ، محض اس انتخاب کی بنا پر ، جو صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام کا دیا ہے ، یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ انوری کا کلام جس قدر نادر ہے ، اسی قدر زیادہ فحش ہے ۔ سینکڑوں اشعار ہیں لیکن ایک بھی درج کے قابل نہیں ۔ اب اگر صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام سے زیادہ تر ایسا نمونہ پیش کیا جو مولانا کے نزدیک مردود و مطرود ہے تو یہ صاحب آتش کدہ کی بدمذاقی کا قصور ہے ، جس نے صرف ایسا کلام پسند کیا ۔ یا خود مولانا شبلی کا جنھوں نے محض آذر کے انتخاب کی بنا پر ایک غیر موجہ اور عاجلانہ فیصلہ دے دیا جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دور ہے ۔ ہمیں انوری کا کلام خود دیکھنا چاہیے ۔ وہ ابھی تک بازار میں دستیاب ہوتا ہے ۔

کلیات میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے جس سے ہر مذاق کا شخص اپنے اپنے مطلب کے پھول چن سکتا ہے ۔ اس چمنستان میں جہاں ہجو اور فحش کے خار ہیں وہاں متین اور سنجیدہ کلام کے گل و ریاحین بھی کثرت کے ساتھ نظر افروز ہیں ۔ البتہ کانٹوں کی اس قدر بہتات نہیں جس کے مولانا شبلی مدعی ہیں ۔ اور یہ خیال تو قطعی غلط ہے کہ اس کا کلام جس قدر زیادہ نادر ہے ، اسی قدر زیادہ فحش ہے ۔ انوری کی فحش گوئی صرف چند عریاں اور قابل اعتراض الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے ۔ دشنام دہی میں کسی لطافت خیال اور دقت نظر کی ضرورت نہیں ہوتی ، اس لیے اس صنف سخن میں شاعر کی قوت تخیل کے کارناموں کی تلاش کرنا میرے خیال

میں بے سود ہے ۔ انوری کی اوصاف نگاری سے قطع نظر کرنا ، اس کی نحش نگاری کی تعریف کرنا ، اس کے اخلاقیات کو پس پشت ڈالنا اور اس کی ہجویات کو اچھالنا ، ایک ایسی عجیب تحسین ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزری ہوگی :

بخون غلطیده دست و تیغ غازی مانده بی تحسین
تو اول زیب اسپ و زینت برگستوان بینی

ہجو کی مثال میں جو قطعہ مولانا شبلی نے نقل کیا ہے اور جس کو میں اوپر درج کر آیا ہوں ، ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کو ہجو سے کس قدر حقیقی ُبعد ہے ۔ اس اچھے خاصے قطعے پر یہ کلنک کا ٹیکا ناحق لگایا گیا ۔ اگر اس قسم کی لطیفہ سنجی ہجو میں داخل کر لی گئی ، تو میرے خیال میں مولانا کی ثقاہت کے اعلی معیار تک کوئی مشرقی اور مغربی شاعر نہیں پہنچ سکتا اور ظرافت و خوش طبعی کا وجود ، جس کے ایرانی شعرا بالعموم شیدائی نظر آتے ہیں ، شجرِ ممنوعہ قرار پاتا ہے ۔

ذیل میں اسی ذخیرے سے ، جس کو مولانا شبلی رد کر چکے ہیں ، ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مثالیں جو مذاقِ حال کی رو سے قابلِ اعتراض نہیں ، پیش کی جاتی ہیں ۔

جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا ، وہاں ابو علی آبی نام کا ایک عہدہ دار رہا کرتا تھا ۔ بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر شاعر اس سے ناراض ہو گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو علی آبی کی ناک اس کے منہ پر بلحاظ تناسب کثیرالحجم واقع ہوئی تھی اور تمام چہرے پر چھاگئی تھی ۔ انوری اس شاندار ناک کی تعریف میں اپنے خیالات ذیل کی رباعی میں دیتا ہے : رباعی

با بوعلی آبی[1] ار بہم بہ نشینی شخصی‌بینی شش جہتش زو بینی
گر دیدہ بدیدن رخش چار کنی چندان کہ ازو بینی بینی بینی

---

۱ ۔ مرتبہ سعید نفیسی (صفحہ ۶۳۱) میں ''پی'' بجائے ''آبی۔'' (مرتب)

ایک مرتبہ سرخس میں امساکِ باراں ہو گیا اور بارش دیر میں ہوئی ۔ انوری نے آبی اور بے آبی کے انضمام سے یہ لطیفہ حاصل کیا :

سرخس از رنج[1] بی آبی و آبی
دریغا روی دارد در خرابی
ز بی آبی خلاصی یافت[2] امسال
خداوندا خلاصش ده ز آبی

یعنی سرخس بے آبی اور آبی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا ۔ اس سال بے آبی سے اس کو نجات مل گئی ، الٰہی اس کو آبی سے بھی پاک کر ۔

خواجہ ابوالفتح کے بخل کی تشہیر :

خواجہ بوالفتح از کمال حرص و بخل
سیم حاصل می کند بی‌فایدہ
وز پی نانی همی گوید زنش
ربنا انزل علینا مایدہ (صفحہ ۵۸۱)

ممدوح کو ، جس سے صلہ حاصل کرنے میں شاعر مایوس ہوچکا ہے ، یوں خطاب کرتا ہے :

خداوندا همی دانم کہ چیزی نیست در دستت
گرم[3] چیزی ندادستی بدین تقصیر معذوری
ولیکن گر کسی پرسد چہ دادستت روا داری
کہ گویم عشوه اول روز و آخر روز دستوری (صفحہ ۷۵۵)

اگر آپ نے مجھے کچھ عطا نہ کیا تو معذور ہیں اس لیے کہ آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں ، لیکن جب لوگ مجھ سے پوچھیں کہ کیا دیا ؟ تو کہیے کیا کہوں ؟ کیا یہی کہ صبح کو فریب دیا اور شام کو رخصت دی ۔

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۴۶۱) میں ''جور ۔'' (مرتب)
۲ ۔ اشاعت نفیسی میں ''دادی ۔'' (مرتب)
۳ ۔ پروفیسر سعید نفیسی کے ہاں ''اگر ۔'' (صفحہ ۴۶۷) (مرتب)

نجیب مشرف اور فرید عارض :

چه خیر باشد در لشکری که نیز دروا
نجیب مشرف و عارض فرید لنگ بود
شکست پای یکی ، زود یاکه[2] دیر رسد
خبر، که دست دگر نیز زیر سنگ بود (صفحه ٦۷٥)

ایک قرآن خواں قاری کی قرأت انوری کے لیے ناخوشنودی کے اسباب پیدا کرتی ہے اور شاعر اپنی ناراضی کا اظہار ذیل کے ابیات میں کرتا ہے :

دوش در خواب من پیمبر را
دیدمش کو ز است آزرده است
گفتمش ای بزرگ چت بوده است
طبع پاک تو از چه پژمرده است
گفت زین مقریک همی جوشم
رونق دین[3] ایزدی برده است
انچه این زن بمردمی خواند
جبرئیل آن بمن نیاورده است (صفحه ٦۱۲)

کسی وزیر کو ، جس سے انعام کی امید میں شاعر یاس سے ہم دوش ہے ، یہ مشورہ دیا جاتا ہے :

تو وزیری و منت مدحت گوی
دستِ من بی عطا روا بینی
شو ، وزارت بمن سپار و مرا
مدحتی گوی تا عطا بینی
(صفحه ۷۳۹)

---

۱ - اشاعت نفیسی (صفحه ۳۹۳) میں ''درخیل و لشکری که درو ۔'' (مرتب)

۲ - ''نه ۔'' (مرتب)

۳ - اشاعت نفیسی (صفحه ۳۳۲) میں ''وحی ۔'' (مرتب)

تم وزیر ہو اور میں تمھارا مداح ۔ سخت افسوس ہے کہ پھر بھی خالی ہاتھ رہوں ۔ خیر ! میں تجویز کرتا ہوں کہ وزارت تم میرے حوالے کرو اور شاعری میں تمھارے سپرد کروں ۔ پھر تم قصیدے کہنا اور میں انعام دوں گا ۔

تاج الدین عمزاد جب زیارت بیت‌اللہ سے واپس آتا ہے ، انوری اس کے خیر مقدم میں کہتا ہے :

عمزاد ز حج باز رسید است بنوی
با توبرۂ طاعت و انبان کرامت[1]

انوری کے ہاں ہجو بحیثیت مجموعی ، اگر دیکھا جائے ، تو دس بارہ آدمیوں سے زیادہ کی نہیں ملے گی ۔ ان میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ متعدد موقعوں پر کلیات میں ان کی مذمت ملتی ہے ۔ ان بدنصیبوں میں ایک قاضی طوس ہیں ، نمبر دوم سدیدالدین بیہقی ، نمبر سوم تاج الدین عمزاد اور نمبر چہارم کافی ہروی ہیں ۔ شاعر کہتا ہے :

چار کس یابی کہ در ہجو[2] من اند
گر بجویی از ثریا تا ثری
قاضیِ طوس و سدید بیہقی
تاجکِ عمزاد و کافی هری[3]

(صفحہ ۷۵۳)

---

۱ ۔ چھ اشعار کا یہ قطعہ اشاعت نفیسی کے صفحہ ۳۶۴ پر درج ہے ۔ (مرتب)

۲ ۔ اشاعت نفیسی میں ''کہ مہجو منند ۔ '' (مرتب)

۳ ۔ سات اشعار کا یہ قطعہ بہ عنوان ''وقال فی التهدید'' پروفیسر نفیسی کے مرتبہ دیوان انوری میں صفحہ ۳۶۴ پر دیا گیا ہے ۔ تہدید کا انداز دیکھنے کے لیے اس کا تیسرا شعر درج کرنا ضروری ہے وهوهذا :

تو همی کوشی کہ پنجم شان شوی
احتیاطی کن درین بیع و شری (مرتب)

قولہ : ''انوری کے دیوان میں چند ہجویں انوری کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں ۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا ۔ لیکن غالباً اور شعرا نے یہ ہجویں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دی ہیں ۔ اور چونکہ پبلک اس کی دشمن تھی ، وہ اسی طرح قائم رہ گئیں ۔''
(شعرالعجم ، صفحہ ۲۸۵)

میں نہیں سمجھا کہ یہ عام لوگ کون ہیں ۔ اگر تذکرہ نگار ہیں تو باوجود متعدد تذکرے دیکھنے کے مجھ کو اس قسم کا کوئی چرچا نظر نہیں آیا ۔ بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ انوری نے شادی ہی نہیں کی تھی :

انوری زن ازان سبب نہ کند
کہ مبادا زنش پسر زاید[1]

کسی دوست کو ، جس نے شادی کے باب میں مشورہ دیا ہے ، جواب دیتا ہے :

بخدای کہ بی ارادت او
خلق را رنج و شادمانی نیست
کاندرین روزگار زن کردن
بجز از محض قلتبانی نیست[2]

---

۱ ۔ دیکھیے صفحہ ۴۰۱ ، دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ۔ (مرتب)
۲ ۔ ملاحظہ ہو دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی صفحہ ۳۶۰ ۔ (مرتب)

انوری کے حالات

اوحدالدین انوری کا باپ محمد ، ایک شہزادی کریمۃ النساء رضیۃالدین کی سرکار میں ایک قابل اعتماد منصب پر سرفراز تھا ۔ یہ سرکار شعرا کی قدر داں تھی ۔ انوری اپنے باپ کی وفات کے بعد غالباً اسی سرکار میں توسّل قائم کرنا چاہتا ہے ۔ ایک خطابیہ قصیدے میں جس کا مطلع ہے :

ای فخر همه نژاد عالم   وی سیّدهٔ زنانِ عالم

(کلیات صفحہ ۲۸۱)

شاعر اپنا مدعا یوں عرض کرتا ہے :

بودی پدرم به مجلسِ تو   یار سره و حریف محرم
توشاد بزی که رفت و زو ماند   میراث به ماندگانِ او غم
ارجو که رهی شود بمدحت[1]   بر اغلب مادحانِ مقدم[2]

(صفحہ ۲۸۲)

بلحاظ پایۂ علوم انوری اپنے زمانے کا غیر معمولی آدمی مانا جاسکتا ہے ۔ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا :

خاطری دارم منقاد چنان کاندر حال
گویدم گیر هران علم که گویم یکبار

(صفحہ ۱۹۲)

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۲۰۲) میں "سعیت ۔" (مرتب)

۲ ۔ یہ قصیدہ اگرچہ مطبوعہ کلیات اور بعض قلمی نسخوں میں موجود ہے ، لیکن بعض وجوہ سے جو اس مضمون کے خاتمے میں ظاہر کیے گئے ہیں ، احتمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ انوری کا نہ ہو ۔
(حاشیۂ مصنف)

نجوم میں استاد ہونے کے علاوہ منطق ، فلسفہ اور ہیئت میں ماہر تھا ۔ حکمت اور فلسفے میں اس کا پایہ نہایت بلند تھا ۔ طبیعیات اور الٰہیات میں کافی لیاقت رکھتا تھا ۔ شاعری جس کی بنا پر وہ دنیا میں مشہور و معروف ہے ، اس کے کمالات کا ایک ادنٰی پایہ ہے ۔ نثر میں بھی صاحبِ قدرت تھا ۔

اگر نامہ باید نوشتن نویسم
بکلک و بیان دیبۂ خسروانی

(کلیات ، صفحہ ۳۱۶)

ادبیات میں البتہ کمزور تھا :

در ادب گرچہ پیادہ است چو خشمت گہِ عفو
در سخن هست چو عقلت گہِ ادراک سوار

(صفحہ ۱۹۲)

وہ اعلٰی درجے کا خطاط بھی تھا :

گویند کہ چیست حاصل تو
ای بی حاصل ز زندگانی
گویم خطکی و بیتکی چند
از دولتهای ابن جهانی

(صفحہ ۷۵۵)

نرد و شطرنج خوب کھیلتا تھا :

دگر نرد و شطرنج خواهی ببازم
حریفانہ سحر حلال از روانی

(صفحہ ۳۱۶)

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ انوری کی تعلیم و تربیت ایک خاص نصب العین کی بجا آوری کی غرض سے ہوئی تھی ۔ یعنی یہ کہ بڑا ہو کر سلاطین کی منادمت کے قابل ہو سکے ۔ ایسے درباروں میں جہاں علمی روایات اور تہذیب نے اپنا گہوارہ بنا لیا تھا ، منصبِ ندیمی ایک قابلِ اعتماد اور ذمہ دارانہ منصب شمار

کیا جاتا تھا - ملک کے بہترین دماغ اس عہدے کے آرزو مند رہتے تھے اور دربارِ سلطانی میں رسائی ان کی غایتِ مرام ہوتی تھی - مگر ندیمی بجائے خود ایک دشوار گزار مرحلہ تھا - اس میں انسان کو مستجمع کمالات اور ہمہ صفت موصوف ہونا ضروری تھا - ظریف، طباع اور حاضر جواب ہونے کے علاوہ ندیم کے لیے ضروری تھا کہ شاعر بھی ہو - طب، فقہ اور نجوم میں مہارت رکھتا ہو، شعرائے قدیم و جدید کا کلام اس کو مستحضر ہو، ادب سے آشنائی رکھتا ہو، تاریخ اور محاضرات پر عبور ہو، قصے، لطیفے اور چٹکلے خوب جانتا ہو، قدرتی خوش تقریر ہو - موسیقی داں ہو اور چنگ و رباب بجانا جانتا ہو؛ مختصر یہ ہے کہ علوم میں قاموس ہو اور نرا زاہدِ خشک نہ ہو -

انوری فطرتاً، علماً و فضلاً اس ممتاز منصب کا مستحق تھا اور اسی آرزو میں وہ سلطان سنجر سلجوقی کے دربار کا رخ کرتا ہے - اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے اس نے دربار کے امرا سے تعلقات قائم کیے ہوں گے - لیکن اس سے قبل میں ایک ضروری مسئلے کو چھیڑتا ہوں -

انوری کا صحیح زمانہ تعین کرنا ہمارے لیے ایک مشکل معما ہے - اس کے ہاں بعض قصائد کسی وزیر نظام الملک صدر الدین محمد کی تعریف میں ملتے ہیں جو بہ ظاہر مشہور نظام الملک طوسی کا نبیرہ اور فخرالملک کا فرزند مانا جا سکتا ہے - یہ شخص اپنے باپ کے قتل کے بعد ۵۰۰ھ سے ۵۱۵ھ[1] تک سلطان سنجر کا وزیر رہا

۱ - ۵۱۵ھ غالباً مصنف یا کاتب کی غلطی سے درج ہو گیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ صدر الدین محمد بن فخر الملک مظفر بن نظام الملک ۵۱۱ھ تک سلطان سنجر کا وزیر رہا ہے کیونکہ ۵۱۱ھ سے ۵۱۶ھ تک نظام الملک طوسی کا بھتیجا یعنی اس کے بھائی فقیہ اجل ابوالقاسم کا لڑکا شہاب الاسلام سلطان سنجر کا وزیر تھا - (مرتب)

ہے بلکہ ایک قصیدہ تو اس کے منصب وزارت پر فائز ہونے کے عین موقع پر لکھا گیا ہے[1] :

به نیک طالع و فرخنده روز و فرخ فال
به سعد اختر و میمون زمان و خرم حال
به بارگاهِ وزارت به فرخی به نشست
خدایگان وزیران و قبلهٔ آمال
نظام مملکت و صدر دین و صاحب عصر
سپهر رفعت و قدر و جهان جاه و جلال
محمد آن که به اقبال او خورد[2] سوگند
روان پاک محمدؐ به ایزد متعال

(صفحہ ۲۵۲)

دوسرے قصیدے میں اس کا نام یوں آتا ہے :

نظام مملکت سلطان و صدر دین خدای
خدایگان وزیران ، وزیر خوب سیر
محمد آن که ز جاهش گرفت ملت و ملک
همان نظام که دین ز ابتدا به‌عدل عمر[3]

ان قصائد کے اعتبار پر انوری کی شاعری گویا قرن ششم کے آغاز میں شروع ہو جاتی ہے لیکن اس نظریے کے تسلیم کرنے میں کئی مشکلات مانع ہیں : اس کی وفات ۵۸۲ھ کے بعد ، جب کہ ستاروں کا اقتران برج میزان میں ہوا تھا ، مانی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ طوفان کی بحث و تمحیص میں انوری نے بھی حصہ لیا تھا ، اور کہ

---

۱ - بہت ممکن ہے کہ یہ قصیدہ انوری کا نہ ہو اور کسی دوسرے شاعر کا ثابت ہو - اس کی زبان انوری کی زبان سے یقیناً مختلف اور سلیس و سادہ ہے - (حاشیۂ مصنف)

۲ - اشاعتِ نفیسی (صفحہ ۱۹۰) میں ''دهد'' (مرتب)

۳ - دیکھیے دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۱۲۱ - (مرتب)

وہ آن لوگوں میں تھا جو طوفان کے ظہور کے حق میں اعتقاد رکھتے تھے ۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ طوفان کے سلسلے میں ایک آدھ تلمیح ، جیسا کہ گزشتہ اوراق میں دیکھا جا چکا ہے ، انوری کے کلیات میں بھی پائی جاتی ہے ۔ اب یہ خیال کرنا کہ انوری برابر اسّی سال تک شعر کہتا رہا ، واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ اس صورت میں اس کی عمر ایک صدی سے زیادہ تسلیم کرنا ہوگی ، اور جہاں تک معلوم ہے اس کی درازیِ عمر کی بابت کوئی روایت موجود نہیں ۔

کلیات سے اس قدر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مدت شعر گوئی زیادہ سے زیادہ تیس سال رہی ۔ اس کے بعد وہ تائب ہوکر عزلت نشین ہو جاتا ہے :

سی سال در طریق تجرد دلم بتافت[1]
اکنون ز خدمت در تو بر کران رسید

(صفحہ ۱۲۲)

دیگر

کسی کہ مدت سی سال شعر باطل گفت
خدای بر ہمہ کامیش داد پیروزی

(صفحہ ۷۳۷)

رباعی

سی سال درخت بخت من بار آورد
چرخ این ہمہ شبم بر وی تیار آورد
زان روی برویم این قدر کار آورد
تا دشمنم از دوست پدیدار آورد

(صفحہ ۵۶۲)

---

۱ - اشاعت نفیسی (صفحہ ۱۰۳) میں "تاخت ۔" (مرتب)

اب اگر ۵۰۰ھ انوری کی شاعری کا سال آغاز مانا جاتا ہے تو ۵۳۰ھ میں یہ مدتِ سی سالہ ختم ہو جاتی ہے؛ حالانکہ کلیات میں ان دو سالوں کے درمیانی زمانے کی ایک تلمیح بھی نہیں آتی، اور اگر ملتی ہے تو ۵۴۰ھ کے بعد کی ملتی ہے۔

کلیات میں تاریخ و سال کی طرف جو متعدد اشارے ملتے ہیں، ذیل میں علیحدہ علیحدہ دکھائے جاتے ہیں:

۵۴۰ھ: بحکم دعوی زیچ و گواهی تقویم
شب چهارم ذی حجه و سنه ثامیم

(صفحه ۳۰۰)

۵۴۱ھ: عدد سالهای عمرش باد
همچو تاریخ پانصد و چل و یک

(صفحه ۲۴۴)

۵۴۲ھ: بوده در نرد فرح نقشش بکام
تا "فرح" تاریخ این نقش ست و "نرد"

(صفحه ۱۰۰)

(فرح = ۲۸۸، نرد = ۲۵۴، فرح + نرد = ۵۴۲)

۵۴-: عدد سالهای مدت تو
همچو تاریخ پانصد و چل واند

(صفحه ۶۳۶)

۵۴-ھ: عدد سالهای عمرش باد
همچو تاریخ پانصد و چل واند

(صفحه ۶۵۱)

۵۶۰-۶۱ھ مطابق سال بد پانصد و سی و سه ز تاریخ عجم
۵۳۳ یزدجردی گفت برخیز که از شهر برون شد همراه

(صفحه ۳۵۷)

علاوہ بریں کلیات میں جو اور تلمیحیں واقعات تاریخی سے متعلق

ملتی ہیں ، سب کی سب ۵۴۰ھ کے بعد کے واقعات کے متعلق ہیں ۔ مثلاً تسخیر ہزار اسپ ۵۴۲ھ ، جنگ سلطان سنجر و علاءالدین غوری جہانسوز ۵۴۴ھ ، رفتن سنجر بعراق ۵۴۷ھ ، وفات ابو الفتح ناصرالدین طاہر وزیر سلطان سنجر ۵۴۸ھ ، فتنۂ غزان ۵۴۸ھ ، مقامات حمیدی ۵۴۹ھ ، وفات سلطان سنجر ۵۵۲ھ ۔

ان وجوہ کے زیر اثر یہ نظریہ قائم ہوتا ہے کہ انوری کی شاعری غالباً ۵۴۰ ہجری سے چند سال پہلے شروع ہوتی ہے اور یہ صدر الدین محمد نظام الملک ، فخرالدین کا فرزند نہیں ہے بلکہ کوئی اور جو اگرچہ وہی نام و خطاب اور منصب رکھتا ہے لیکن زمانے کے لحاظ سے صدرالدین محمد مذکور الصدر سے بہت موخر[2] ہے ۔

۱ ۔ پروفیسر سعید نفیسی دیوان انوری سے ۵۴۰ھ سے قبل کے بھی دو حوالے پیش کرتے ہیں ۔ ان میں سے پہلا ۵۳۰ھ اور ۵۴۰ھ کے درمیان کا ہو سکتا ہے جسے وہ خدا جانے کیوں ۵۳۰ھ کا بیان کرتے ہیں ۔ چنانچہ شعر :

عدد سالہای مدت تو
همچو تاریخ پانصد و سی واند (صفحہ ۳۸۳)

حافظ صاحب کے ہاں بجائے ''سی'' ''چل'' ہے جس سے یہ معاملہ اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے ۔

دوسرا شعر وہی ہے جس سے حافظ صاحب سنہ ۵۳۳ یزدجردی مطابق ۵۶۰-۶۱ ھ مراد لیتے ہیں ۔ پروفیسر نفیسی نے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''عجم'' کو ''عرب'' سے تبدیل کرکے ۵۳۳ھ مراد لے لیا ۔ (مرتب)

۲ ۔ انوری کے اس ممدوح کی بابت پروفیسر سعید نفیسی کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے ۔ وہ دیوان انوری کے مقدمے میں صفحہ ۳۶ پر رقم طراز ہیں :

''دیگر از ممدوحان وی نظام الملک صدر الدین محمد ست کہ مراد صدر الدین محمد بن ناصرالدین طاہر بن فخرالملک مظفر بن

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سنجر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی غرض سے انوری سب سے پیشتر ابوالفتح ناصرالدین طاہربن فخر الملک بن نظام الملک کے دربار سے، جو جمادی الاول ۵۲۸ھ سے ۵۴۸ھ تک سنجر کا وزیر تھا، تعلق پیدا کرتا ہے۔ ایک عرصہ امیدواری کرنے کے بعد طاہر کو اپنی طرف توجہ دلاتے ہوئے گویا ہے:

ای بزرگی[۱] کہ از بزرگی و جاه
هر کہ برَ خدمت تو یافت ظفر
کرد بیرون ز دست محنت پای
برد از دولتت بکیوان سر
بگذشت از فلک بمرتبہ آنک
کرد روزی بدرگہ تو گذر
بنده نیز ار بحکم امیدی
خدمتی گفت ازو عجب مشمر

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

نظام الملک پسر ناصرالدین ابوالفتح طاهر سابق الذکر باشد۔ در خاندان نظام الملک دو تن بنام صدر الدین محمد و با لقب نظام الملک بوده اند: یکی صدر الدین محمد بن فخرالملک مظفر بن نظام الملک کہ در ۵۱۱ کشتہ شده است و دیگر همین نظام‌الملک صدر الدین محمد بن طاهر۔ باحسابی کہ پیش ازین کرده ام انوری در ۵۱۱ شاید هنوز بجهان نیامده بوده باشد و ناچار کسی را کہ در ۵۱۱ کشتہ شده مدح نکرده است۔ پس ممدوح انوری باید نظام الملک صدر الدین محمد دوم باشد۔"

گویا انوری کا ممدوح هم‌نامی کے باعث بجائے بھتیجے کے چچا کو سمجھ لیا گیا۔ (مرتب)

۱ - پروفیسر نفیسی کے نزدیک یہ قصیدہ علاء الدین محمد کی مدح میں ہے۔ (مرتب)

عاجزی بود کرد با تو پناه
از بدِ روزگارِ بد گوهر

مهملی بود دامن تو گرفت
از جفای سپهر دون پرور

طمعش بود کز خزانهٔ جود[1]
بی نیازش کنی بجامه و زر

گردد از دست بخشش تو غنی
یابد از فرّ دولت تو خطر

برهد از نحوست انجم
بجهد از مساحت کشور

مدتی شد که تا بدان امید
چشم دارد براه و گوش بدر

هست هنگام آن که باز کند
بر سر او همای چتر[1] تو پر

حلقه بر گوش چرخ کرد هر آنک
کرد بر وی عنایت تو نظر

بنده را گوشمال داد بسی
بعنایت یکی درو بنگر

صله دادن ترا سزاوار ست
زان که آن دیده ای ز جد و پدر

بیخ کان را نشاند دست قضا[2]
شاخ آن جز کرم نیارد بر

۱ - اشاعت نفیسی، صفحه ۱۰۵ ''جود -'' (مرتب)
۲- اشاعت نفیسی ''نشانه دست سخات -'' (مرتب)

لیست نادر ز خاندان نظام
دانش و رادی و ذکا و هنر
نور نادر نہ باشد از خورشید
بوی نادر نہ باشد از عنبر
(صفحہ ۱۵۹)

یہی عرض حال کسی قدر شکایت کے لہجے میں ذیل کے ابیات میں کیا گیا ہے :

صاحبا بندہ را درین یک سال[1]
در مدیح تو شعرهاست متین
واندر ابیات آن معانی بکر
چون خط و لفظ تو خوش و شیرین
هر کہ او را وسیلتی ست چنان
نہ همانا کہ حالتی ست چنین[2]
گہ ز خاک تحیّرش بستر
گہ ز خشت توقفّش بالین[3]
آخر این روزگار جافی را
کہ بجاہ تو دارد این تمکین
خود نہ پرسی یکی ز روی حساب[4]
تاچہ می‌خواهد از من این مسکین

۱۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۲۶۲) میں یہ مصرع یوں درج ہے :
'داشت اندیشہ کارد از پی مدح' (مرتب)

۲۔ اشاعت نفیسی میں :
چون چنان دید روزگار خسیس
کہ مرو را عزیمتست چنین (مرتب)

۳۔ اشاعت نفیسی میں :
تاچو زین بسترم خلاص دهند
آستان تو باشدم بالین (مرتب)

۴۔ اشاعت نفیسی 'عتاب'۔ (مرتب)

وقت کوچ ست و عرصہ تنگ مرا
دل بہ تیار خرج راہ رهین[1]
نیست در سکنۂ زمانہ کسی
کاضطراب مرا دهد تسکین
تو کن احسان کہ هرکہ جز تو بود
ننهد پا ازان سوی تحسین

(صفحہ ۳۳۰)

لیکن ذیل کے اشعار میں یہ مودبانہ شکایت شکرمندانہ لہجے میں بدل جاتی ہے:

بندہ سالی ست تا درین خدمت
گہ بہنگام و گاہ بی‌هنگام[2]
دهد از جنس دیگرت زحمت
آرد از نوع دیگرت ابرام
آن همی بیند از تہاون خویش
کہ بدان هست مستحق ملام
وان نمی بیند از مکارم تو
کہ بشرحش توان نمود قیام
شد مکرّم ز غایت کرمت
کرم الحق چنین کنند کرام

(صفحہ ۲۹۳)

۱- اشاعت نفیسی میں یہ اور آیندہ دو شعر ایک دوسرے قصیدے سے تعلق رکھتے ہیں جو صدر الوزرا خواجہ ناصر الدین ابوالفتح طاہر بن المظفر کی مدح میں ہے (صفحہ ۵۱ - ۲۴۹) جب کہ اوپر والا قصیدہ امیر ابوالمفاخر فخر الدین محمد کی تعریف میں ہے - (مرتب)

۲- ''در مدح جلال الوزرا خواجہ ناصر الدین ابوالمظفر گوید -''
اشاعت نفیسی، صفحہ ۱۲ - ۲۰۹ - (مرتب)

دیگر

بندہ حالی ست کہ تا درکنف دولت تو
غم ایام نخوردست چہ اکثر چہ اقل[1]
ورنہ با او فلک آن کرد ازین پیش ہمی
کاتش و آب کند با شکر و موم و عسل
گاہ با ضربت رمحی ز سماک رامح
گاہ با نکبت عزلی ز سماک اعزل
رویش از غصۂ ایام بر دشمن و دوست
داشتی چون گل خود رو اثر جوف و خجل[2]
گوش کارہ شود از قصۂ او[3] لاتسمع
ہوش[4] والہ شود از غصۂ او لاتسأل
بخت بیدار تو بود آن کہ برانگیخت چنین
دولت خفتۂ او را ز چنان خواب کسل
للہ الحمد کہ تا حشر نمی‌باید بست
در قطار تعبش نیز نہ ناقہ نہ جمل
شد ز فرّ تو ہمہ مغز چو تجویف دماغ
گرچہ وی بود ہمہ پوست چو ترکیب بصل

(صفحہ ۲۵۸)

کلیات میں ابوالفتح طاہر کی تعریف میں قصاید کثرت سے ملتے ہیں ۔ ان میں سب سے پہلی تاریخی تلمیح ۵۴۰ھ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ شاعر نے اس کے خیر مقدم میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع گزشتہ سطور میں درج ہو چکا ہے ۔

۱- ''در مدح خواجہ ناصر الدین ابوالفتح طاہر و یصف الربیع ۔''
اشاعت نفیسی ، صفحہ ۸۷ - ۱۸۴ - (مرتب)
۲- اشاعت نفیسی میں ''چون گل دو روی اثر حوب و خجل ۔'' (مرتب)
۳- اشاعت نفیسی 'من' ۔ (مرتب)
۴- 'ہوش' ۔ (مرتب)

دوسری تلمیح جو اشعار ذیل میں پائی جاتی ہے ، تسخیرِ ہزار اسپ سے تعلق رکھتی ہے ۔ انوری ناصر الدین طاہر کو خطاب کرکے کہتا ہے :

حصن هزار اسپ اگرچه بر در آن ملک
سدّ قدیم ست حصنهای حصین را
کعبهٔ دهلیز شه چو دید فصیلش
سجده کنان بر زمین نهاد جبین را
سیرا سریع شهاب کلک تو بس بود
رجم چنان صد هزار دیو لعین را
خود مدد تیغ پادشه بچه کار است
خاصه تهیای کارهای چنین را
نیست خوارزم شاه کز پس شش ماه
چشمهٔ خون کرد چشم حادثه بین را
دست بفتراک اصطناع تو در زد
معتصم ملک کرد حبل متین را

(صفحہ ۱۷)

تسخیرِ ہزار اسپ کے واقعات یہ ہیں کہ جب ۵۳۶ھ میں سلطان سنجر ، اتخان سپہ سالار گور خان سے جنگ میں مصروف تھا ، اتسز خوارزم شاہ خراسان آ کر مرو اور نیشاپور کو لوٹ لیتا ہے ۔ سنجر اس کی اس حرکت پر جب فوج کشی کی دھمکی دیتا ہے تو خوارزم شاہ جواب میں ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے دو شعر ہیں :

اگر باد پایست رخش ملک
کمیت مرا پای هم لنگ نیست
تو این جا بیایی من آن‌جا روم
خدای جهان را جهان تنگ نیست

(راحت الصدور ، صفحہ ۱۷۳ ، ۱۹۲۱ع)

۱۔ اشاعت نفیسی صفحہ ۱۱ ”تیر ۔“ (مرتب)

سنجر ۵۴۲ھ میں ہزار اسپ کا محاصرہ کرتا ہے۔ اثنائے تسخیر میں اوحد الدین انوری یہ رباعی لکھتا ہے :

ای شاہ ہمہ ملک زمین حسب تراست
وز دولت و اقبال جہان کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر
فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

یہ رباعی ایک تیر کے ذریعے سے قلعے میں ڈلوا دی گئی۔ محصورین کی طرف سے رشید الدین وطواط نے جواب میں ذیل کی رباعی لکھی : رباعی

ای شہ کہ بجامت می صاف ست نہ دُرد
اعدای ترا ز غصہ خون باید خورد
گر خصم تو ای شاہ بود رستم گرد
یک خر ز ہزار اسپ تو نتواند برد

کچھ عرصے کے بعد قلعہ فتح ہوتا ہے اور انوری سلطان کی زبان سے یہ رباعی لکھتا ہے :

اندیشۂ انتقام چون جزم کنیم
دھن ہمہ دشمنان بیک حزم کنیم
با چرخ چو با اتسز اگر رزم کنیم
گردون بسم اسپ چو خوارزم کنیم

(صفحہ ۵۴۱)

کلیات میں متعدد مقامات پر ایسے اشارے پائے جاتے ہیں ، جن کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ سنجر اپنے وزیر طاہر کو کچھ عرصے کے لیے معزول یا معطل کر دیتا ہے اور وزارت کسی اور کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس واقعے کی اطلاع کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن ذیل کے اشعار اس بیان کی تائید کے لیے کافی ہیں : ابیات

اگرچه طایفه ای در حریم کعبهٔ ملک
ورای پایهٔ خود ساختند ماوی را
به پنج روزه ترق به سقف او بردند
چو لات و عزی اطراف تاج و سدری را
شکوه مصطفویت آخر از طریق نفاذ
ز طاقهاش در افگند لات و عزی را
طریق خدمت اگر بسپرند باکی نیست
زمانه نیک شناسد طریق اولی را

(صفحه ۱٦)

دیگر

خصم ار بکمال تو تشبه نکند به
تا می چه کند بازوی بیدست علم را
بختت نه سمین ست که ره گم کند اقبال
گر نیل کشد دشمن بدبخت ورم را
جمره است مگر خصم تو زیرا که نپاید
در هیچ عمل منصب او بیش سه دم را

(صفحه ۷)

دیگر

بود بی بالش تو صدر وزارت خالی
بود بی‌حشمت تو کار ممالک مختل
خصم اگر دولتکی یافت بصد جهد آنرا[1]
روزکی چند نگهداشت به تزویر و حیل
آخرالامر در آمد بسر اسپ حیلش[2]
تا در افتاد بیک واقعه چون خر بوحل

---

۱ - اشاعت نفیسی ''یافت مزور آنرا -'' (مرتب)
۲ - اشاعت نفیسی ''اجلش -''۔ (مرتب)

اور مسندِ وزارت پر اس کے دوبارہ تقرر پر یہ قصیدہ لکھا :

شرفِ گوهر اولاد انظام
ملک را باز شرف داد نظام
خواجہ مملکت و حاکم[1] عصر
ناصر الدین و نصیر اسلام
بوالمظفر کہ بعونِ ظفرش[2]
عدل شد ظلم و ضیا گشت ظلام

ذیل میں کوشش کی جاتی ہے کہ انوری اور سلطان سنجر کے تعلقات پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے ۔

سلطان سنجر

یاد رہے کہ کلیات میں سلطان سنجر بن ملک شاہ (۵۱۱ھ و ۵۵۲ھ) کی مدح میں بہت کم قصائد ملتے ہیں ۔ عام روایات اگرچہ انوری کو سنجر کا خاص شاعر مانتی ہیں اور یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ سلطان کی نظروں میں انوری کی وقعت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ خود سنجر دو مرتبہ اس کے مکان پر جا کر عزت افزائی کرتا ہے ۔ لیکن کلیات ان بیانات کی تائید نہیں کرتا اور نہ قصائد میں ایسے اشارے پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر شاعر کے ساتھ سنجر کے نہایت گہرے تعلقات تسلیم کیے جائیں ۔

قصائد کی زبان میں بالعموم ایک تصنع اور تکلف کی ادا شروع سے آخر تک ملحوظ ہے اور وہ بےتکلفانہ لہجہ ، جو ایک دیرینہ مداح اپنے ممدوح کے حق میں اختیار کرلیتا ہے ، بالکل مفقود ہے ۔ نہ کہیں صلہ مانگا گیا ؛ نہ عطیے کا شکریہ ادا کیا گیا اور نہ

۱ ۔ صفحہ ۲۱۵ ، اشاعت نفیسی ''صاحب ۔'' (مرتب)
۲ ۔ اشاعت نفیسی ''شرفش ۔'' (مرتب)

کہیں عرض حال ہے ۔ شاعر صرف دو موقعوں پر البتہ اپنے متعلق کچھ کہتا ہے ؛ پہلا وہی جہاں اپنی دہ سالہ امیدواری کی بابت کہتا ہے ۔

نیز ایک قطعے سے جو راحت الصدور میں بھی دیا گیا ہے ، اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سنجر نے ایک مرتبہ اپنے سامنے بلوا کر اس کے اشعار سنے تھے اور بیٹھنے کا حکم دیا تھا ۔ وہ قطعہ یہ ہے :

انوری را خدایگان جہان
پیش خود خواند و دست داد و نشاند

بادہ فرمود و شعر خواست ازو
وندران سحر کرد و دُر بفشاند

چون بمستی برفت بار دگر
کس فرستاد و پیش تختش خواند

ہمہ بگذار ، این نہ بس کہ ملک
نام[۱] او بر زبانِ اعلی راند

بیش ازیں در زمانہ دولت نیست
ہیچ باقیش در زمانہ نماند

یہ امر قرین قیاس ہے کہ انوری سنجر کے دربار میں اس کے آخری ایامِ سلطنت میں پہنچتا ہے ۔ پہلی تلمیح وہی ہے جو قلعہ ہزار اسپ کی تسخیر اور ۵۴۲ھ سے تعلق رکھتی ہے ۔

دوسری تلمیح غالباً سلطان سنجر اور سلطان مسعود سلجوق کی ملاقات سے علاقہ رکھتی ہے اور اشعار ذیل میں پائی جاتی ہے :

گفتم کہ حدیث عراق گویم
ور خود ہمہ بیتی سہ چار باشد

چون سلک معانی نظام دادم
تا زان سخنم آبدار باشد

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۳۸۳ "ذکر ۔" (مرتب)

الہام الٰہی چہ گفت ، گفتا
آن را کہ خرد ہیچ یار باشد

چون سایۂ مرا مدیح گوید
با ذکر عراقش چہ کار باشد

خسروا! بسر تازیانہ بخشد
چون ملک عراق ار ہزار باشد

سنجر ملک عراق کی بد نظمی کے حالات سن کر ، جو ان دنوں سلطان مسعود سلجوقی کے زیر نگیں تھا ، اواخر شعبان ۵۴۴ھ میں رے جاتا ہے ۔ مسعود ان دنوں ہمدان میں تھا ۔ چچا کے آنے کی خبر سن کر اس نے بالا بالا بغداد جانے کا قصد کیا ۔ لیکن شرف‌الدین موفق کے مشورے سے وہ اس ارادے سے باز آ کر سیدھا چچا کی خدمت میں رے پہنچ گیا ۔ چچا بھتیجوں میں جو غلط فہمی تھی دور ہو گئی اور جنگ کا خطرہ بالکل جاتا رہا ۔ مسعود اٹھارہ روز تک برابر ، جب تک سنجر رے میں رہا ، چچا کی خدمت گزاری میں مصروف رہا ۔

تیسری تلمیح سلطان سنجر اور علاءالدین غوری جہانسوز کے مابین در اوبہ پر محاربے کے متعلق ہے ۔ شاعر سنجر کو خطاب کر کے کہتا ہے :

بندہ درین مختصر غرض کہ تو گفتی
آیت تحصیل آن چو روز مبین ست

قاعدۂ تہنیت ہمی نہ نہد زانک
خصم نہ فغفور چین و غور نہ چین ست

گر چہ ہنوز از غریو لشکر خصمت
جمجمۂ کوہ پر صدای انین ست

ور چہ ز تیغ مبارزان سپاہت
سنگ بخون مخالفانت عجین ست

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۸۸ "سنجر ۔" (مرتب)

با چو تو صاحبقران بذکر نیرزد
وین سخن الہام آسمان برہن ست

(صفحہ ٦٢)

علاء الدین ۵۴۵ھ میں تخت نشین ہو کر اور بہرام شاہ بن مسعود پر فتح پا کر غزنین پر قابض ہو جاتا ہے اور وہ اجناس جو ملوک غور ہر سال بطور خراج سنجر کو بھیجا کرتے تھے ، بند کر دیتا ہے ۔ یہ استبداد دیکھ کر سنجر بقصد جنگ غور کی طرف بڑھتا ہے ۔ اوبہ پر مقابلہ ہوتا ہے ۔ عین جنگ کے وقت چھ ہزار سوار ترک غز اور خلجی علاءالدین کو چھوڑ کر سنجر سے مل جاتے ہیں جس سے غوریوں میں بد دلی پھیل جاتی ہے ، تاہم وہ لڑتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں ۔ علاء الدین گرفتار ہو جاتا ہے ۔ بقول نظامی عروضی یہ جنگ ۵۴۷ھ میں ہوئی تھی جس میں خود نظامی بھی شریک تھا ۔

مجدالدین ابوالحسن عمرانی

سنجری دور میں انوری کا سب سے عزیز ممدوح مجدالدین ابوالحسن عمرانی ہے ۔ شاعر خلوص دل سے اس کا سپاس گزار معلوم ہوتا ہے ۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں لیکن انوری نے ایک مقام پر اس قدر کہا ہے :

عدد سالہای عمرش باد همچو تاریخ پانصدوچل‌واند

(صفحہ ٦٥١)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن کی جواں مردی اور فیاضی نے اس کے دل پر گہرا نقش بٹھایا ہے ۔ جب وہ اپنے عروج امارت پر تھا ، انوری نے اس کی تعریف میں خوب خوب قصیدے لکھے ۔ جب وہ گرفتار ہو کر حبس میں بھیج دیا جاتا ہے ، شاعر اس کو نہیں بھولتا

بلکہ اپنے اشعار سے اس کی تسلی کرتا ہے اور ڈھارس بندھاتا ہے۔ آخر ابوالحسن قتل کیا جاتا ہے، انوری اب بھی اس کے ساتھ وفادار رہتا ہے اور اس کے احسان اور خوبیاں اپنے ابیات میں بیان کرتا ہے۔ ابوالحسن کے قتل کے واقعے سے پندرہ سال بعد تک بھی اس کی یاد انوری کے صفحۂ دل سے محو نہیں ہوتی۔

ذیل میں اُن نظموں سے بعض اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) در احسان بگو کہ بکشاید
بوالحسن را چو تختہ بند کنند (صفحہ ۶۴۰)

(۲) احتباس روزی خلق آسمان آغاز کرد
آدمی زاد از بقا یکبارگی مایوس شد
خلق را بی وجہ روزی عمر شاید بود، نی
وجہ روزی از کجا چون بوالحسن محبوس شد
ای جہان را بودہ بنیاد از طریق مکرمت
چون تو مستاصل شدی یکبارگی مدروس شد

(صفحہ ۶۴۰)

قید خانے میں اس کی تسلی کے لیے یہ نظم بھیجتا ہے:

(۳) گر چہ در دور تو ای دریا دل و کان دستگاہ
مدتی گرگان شبان بودند و دزدان محتسب
و اندران دوران کہ انصاف تو روی اندر کشید
فتنہا شد در شبیخون[1] قصدہا شد منشعب
سایہ مفگن بر حدیث انقلابی کاوفتاد
کان نہ اول حادثہ است از روی[2] دور منقلب
کان و دریایی منہ در حبس دل بر اضطراب
زان کہ کان پیوستہ محبوس ست و دریا مضطرب

(صفحہ ۵۸۹)

---

۱ - اشاعت نفیسی، صفحہ ۳۳۳ "شد ذو شجون چون -" (مرتب)
۲ - اشاعت نفیسی "از روزگار منقلب -" (مرتب)

(۴) هیچ میدانی که در گیتی ز مرگ بوالحسن
چرخ جز قحط کرم دیگر چه دارد فایده
ای دریغا ! آن که چون یادش کند گوید جهان
ای دریغا ! حاتم طائی و معن زایده
روزهٔ روزی درآمد خواجه بی‌روزی مباش
یاد می کن "ربنا انزل علینا مایده"

(صفحه ۴۲۷)

(۵) بس دور که چرخ[1] و اختران بگذارند
تا مرد وشی چو بوالحسن باز آرند
کو حیدر هاشمی و کو حاتم طی
تا ماتم مردمی و مردی دارند

(صفحه ۵۶۰)

(۶) تا حادثه قصد آلِ عمران کرده است
کس نیست که او حدیث احسان کرده است
احسان ز کسان بوالحسن بود مگر
کو همچو کسانش روی پنهان کرده است

(صفحه ۵۶۱)

ان ہی ایام میں خواجہ مودود ابن احمد عصمی سے جو خاندان نظام‌الملک کا ایک رکن ہے ، تعلقات ہو جاتے ہیں ۔ متعدد قصائد خواجہ مودود کی مدح میں لکھے گئے ہیں ۔ لیکن خواجہ تھے بےفیض، انوری نے آخر چل کر لکھا :

مودود احمد عصمی عشوه ایم داد
گفتم که اوسر ست و سر آخر ز تن به است
راغب شدم بخدمت او تا شدم چنانک
حال سگان بوالحسن از حال من به است[2]

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی صفحہ ۶۰۳ ''بس دور فلک که اختران .'' (مرتب)
۲ ۔ صفحہ ۳۵۶ ، دیوان انوری ، اشاعت نفیسی ۔ (مرتب)

اب ہم اس دور میں آ جاتے ہیں جو تاریخ میں حادثۂ غز کے نام سے مشہور ہے - قبائل غز ترکمانوں سے علاقہ رکھتے تھے اور ختلان علاقۂ بلخ میں اُن کو مویشیوں کے لیے رہنے بنا دیے گئے تھے - وہ چوبیس ہزار بکریاں بطور خراج سالانہ سلطانی مطبخ میں دیا کرتے تھے - لیکن خوان سالار سلطانی کی زیادہ ستانی اور سخت گیری سے یہ لوگ تنگ آ کر آمادۂ جنگ ہوگئے اور نذرانہ دینے سے صاف انکار کردیا - امیر قماج والیِ بلخ نے آخر یہ معاملہ سلطان سنجر کے گوش گزار کیا - ان کی تنبیہ و تادیب کے لیے اجازت حاصل کی اور فوج کشی کردی - اس مہم میں قماج اور اس کا فرزند علاءالدین مارے گئے اور فوج نے شکست کھائی - اب یہ مشورہ قرار پایا کہ سلطان بذات خود لشکر کشی کرے - غز سردار بہت بڑا تاوان دینے پر آمادہ تھے اور سنجر بھی قبول کرنا چاہتا تھا ، لیکن امرائے دربار اس مصالحت کے بالکل خلاف تھے ، جن میں مؤید کا نام قابل ذکر ہے - بہر حال جنگ کی ٹھن گئی - ادھر اہل لشکر جنگ کے خلاف تھے - انھوں نے کوئی تن دہی نہیں دکھلائی ، ادھر غز جان توڑ کر لڑے اور میدان ان ہی کے ہاتھ رہا - شاہی افواج کو شکست فاش ملی اور سلطان گرفتار ہوگیا[1] -

اس میں شک نہیں کہ یہ مہم شروع ہی سے ایک غلطی تھی - اس ہزیمت اور اس کے خوفناک نتائج کا الزام شعرائے عہد ، اہلِ فوج کے سر تھوپتے ہیں ، بلکہ اُن کو بے حمیتی ، بزدلی اور جبن کا ملزم قرار دیتے ہیں - ان کی یہ رائے ہمیں باور کر لینی چاہیے -

حکیم کوشککی نے ، جو اس عصر کا مشہور ہزّال ہے ، امرائے سنجری کے خلاف کئی نظمیں لکھی ہیں ، جن میں سے ایک یہاں نقل کی جاتی ہے :

۱ - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "راحت الصدور" صفحہ ۱۷۷ ، مرتبہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ، طبع یورپ ۱۹۲۱ع - (حاشیۂ مصنف)

ایا شمشیر زن ترکان پُر دل
به نسبت از نی و تاتار و کاشان
یکایک در خراسان پروریده
به ناز و نعمت و دولت تن آسان
شما را پادشاه هفت کشور
رسانیده بمیری از نخاسان
بروز کودکی خفته که و مه
بسی درپیش دکان رواسان
بهر شهری ز نام غز شنودن
شده چون دیو از آهن هراسان
فلک کفران نعمت های سنجر
طلب کرد از شما ناحق شناسان
زهی در ماندگان بی‌حمیت
زهی خر بندگان ناسپاسان
کسی‌خودزادوبوم‌وملک‌واقطاع
چنین بیرون دهد از دست آسان
مسلم بین که‌چون بیرون‌کشیدند
بشمشیر از ... زن تان خراسان

قاضی حمید الدین ، صاحبِ ''مقاماتِ حمیدی'' نے ذیل کا قطعہ لکھا ہے :

حکیم کوشککی را بخواب دیدم دوش
زبان کشاده بمدح مبارزان سپاه
ز راه طعنه و طنز و تماخره می گفت
خهی گذارده هر یک حقوق نعمت شاه
فسوس زیر رکاب شما کمیت و سمند
دریغ بر بر و فرق شما قبا و کلاه

ز پیش کافر کفران نعمت آورده
گریختند چو از پیش توبہ خیل گناہ

نہ دیدہ گرد سپاہ سیاہ پوش ہنوز
کہ گشت صبح سپید شما چو شام سیاہ

ز بس تعجب کفار جملہ می‌گفتند
زہی جماعت غز لا الہ الا اللہ

فتح کے بعد غزوں نے مرو کا رخ کیا - یہ شہر آن ایام میں عروس البلاد کا حکم رکھتا[1] تھا اور داؤد چغری بیگ کے زمانے سے دار الملک رہا تھا - اس کی دولت کی کوئی انتہا نہیں تھی ؛ خزائن اور دفائن سے معمور تھا - غز تین روز تک شہر کو غارت کرتے رہے - اکثر باشندے گرفتار ہوئے اور طرح طرح کے شکنجوں میں ڈالے گئے تا کہ پوشیدہ خزانوں کا سراغ بتائیں - قتل و غارت اور خون ریزی ایک وسیع پیمانے پر عمل میں آئی - عورتوں کی عصمت دری کی گئی - انوری غالباً ان ہی واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے :

بعلم تست کہ چندین ہزار نفس نفیس
چہ زن چہ مرد چہ پیر و جوان چہ شاہ چہ داہ

باضطرار درین ورطہ اوفتاد و نرست
بلی اگرچہ یکی را درین نبود گناہ

ز خون کشتہ چنان ست رود مرو ہنوز
کہ در گذار بمانند ماہیان بشناہ

بدشتہاش ز بس کشتہ بعد چندین سال
عجب مدار کہ از خون بود نمای گیاہ[1]

۱- ”در مدح خواجہ ناصر الدین ابوالفتح طاہر حین باز آمدن از محل مخوف گوید -“ دیوان انوری ، اشاعت نفیسی ، صفحہ ۷۶ - ۲۷۴ - (مرتب)

جب مرو کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تو غزوں نے نیشاپور کا رخ کیا ۔ اب شاہی فوج کے نفر بھی ان کے شریک ہو گئے تھے ۔ ابتدا میں شہریوں نے مدافعت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے ، لیکن غزوں کی کثرت سے بہت جلد مغلوب ہو گئے ۔ جامع مسجد منیعی میں اکثر عورات ، اطفال اور ذکور ، جو بہ‌غرض پناہ جمع ہوئے تھے ، قتل کر دیے گئے ۔ مسجد مطرز میں آگ لگا دی گئی اور اس کے شعلوں کی روشنی میں رات بھر شہر لٹتا رہا ۔ شیخ محمد اکاف اور امام محمد بن یحیٰی جیسے پاک نفوس شکنجوں میں ڈالے گئے اور بے دردی سے ہلاک کیے گئے ۔ خاقانی موخرالذکر کے مرثیے میں کہتا ہے :

در دولت محمد مرسل نہ داشت کس
فاضل تر از محمد یحیٰی قبای خاک
آن کرد روز تہلکہ دندان فدای سنگ
وین کرد روز قتل دہان را فدای خاک

دیگر

گردون سر محمد یحیٰی بباد داد
محنت نصیب سنجر مالک رقاب شد

دیگر

چرخ از سر محمد یحیٰی ردا ربود
دھر از سر سعادت سنجر کلاہ برد

خراسان کے اور امصار کے ساتھ بھی غزوں نے یہی سلوک روا رکھا ۔ صرف ہرات نے کامیابی کے ساتھ مدافعت کی اور اس تباہی اور بربادی سے جس نے خراسان کو ایک دو نسلوں کے لیے بےچراغ کر دیا تھا ، ہراتیوں نے اپنی قوت بازو اور مردانہ جد و جہد سے رستگاری حاصل کی ۔ جہاں جہاں غزوں کا قدم گیا ، ان کے عقب میں قحط و وبا اور عالم‌گیر تباہی نے اپنا چہرہ دکھایا ۔ غز ملک میں چاروں طرف پھیل چکے تھے اور اپنی تباہ کن رسالت کے مقاصد

انجام کو پہنچا چکے تھے ۔ باشندے ان کے خوف سے جنگلوں ، پہاڑوں اور کنوؤں میں چھپتے پھرتے تھے ۔ سنجر کے جنرل اور کپتان ، جنھوں نے اس کے اقبال کے دور میں بیسیوں میدان مارے تھے اور مشہور مہمیں سر کی تھیں ، ان غیرمتمدن وحشیوں کے نام سے لرزتے تھے ۔ خراسان میں جنگجو طبقے کی کمی نہیں تھی ۔ لڑنے والے اور ملک کی حفاظت کرنے والے کافی تعداد میں میسر آسکتے تھے ، لیکن ان کو ترتیب دینے اور حیطۂ انتظام میں لانے والا کوئی نہ تھا ۔ مخلوق کی آنکھیں سنجر کو ڈھونڈ رہی تھیں اور سنجر ان میں موجود نہ تھا ۔ ان صورت حالات میں بعض وطن پرستوں نے خانِ سمرقند[1] کے نام ایک سفارت بھیجنا چاہی جس کے ذریعے سے وہ ملک کی حالت زار بیان کر کے خاقان سے امداد و استعانت اور مداخلت کے مستدعی ہوئے ۔ خراسانی اس سفارت کے لیے یوں اور بھی آمادہ ہوئے کہ سال گزشتہ خاقان نے غزوں کے خلاف ایک مہم بھی سر کی تھی ۔ یہ سفارت غالباً ۵۵۰ھ اور ۵۵۱ھ کے درمیان بھیجی جاتی ہے ۔ خواجہ کمال الدین جو فضلاے عصر میں بے مثل عالم اور سنجر کے دربار میں بہت بڑا رتبہ رکھتے تھے ، اس سفارت کے قائد اعظم تھے ۔

یہ انوری تھا جس نے سفارت نامہ کا مضمون نظم میں تیار کر کے دیا ۔ خراسانیوں کا یہ فریاد نامہ ایک ایسی دستاویز ہے جو بہلحاظ پاکیزگیِ جذبات ، علوِ تخیل اور صفائیِ زبان فارسی نظموں میں ایک بے مثل چیز ہے ۔ اس میں عبرت ، حسرت ، تباہی اور مظلومی کے نقشے کو نہایت صحیح الفاظ میں کھینچا ہے ۔ واقعات کے بیان کرنے میں مبالغے سے کام نہیں لیا ۔ حقیقت و واقعیت کی لہر شروع سے آخر تک موج زن ہے ۔ اگر انوری کا اور کلام ہم تک نہیں پہنچتا

۱- اس سے مراد غالباً رکن الدین محمود خاں سوم بن ارسلان (۵۳۶ - ۵۸ھ) ہے جو سنجر کا محکوم تھا ۔ (حاشیۂ مصنف)

اور صرف یہی نظم اس کی یادگار رہتی تو تنہا اس نظم کے اعتبار پر اس کا شمار ایران کے بہترین شعرا میں کیا جا سکتا تھا ۔ نظم کیا ہے ، ایک سیلاب اشک ہے جو خراسان نے اپنے ایتام ، شہدا ، عصمت دریدہ عورات ، سوختہ عمارات ، غارت شدہ اماکن ، بے چراغ بلاد ، پامال شدہ حرمت اور تلف شدہ دولت کے ماتم میں بہایا ہے ۔

انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں یہی معجزہ اکتفا کرتا ہے ۔ وہ اپنے ملک کو سر تا سر برباد ہوتا دیکھتا ہے ، حب وطن اور غیرت کے جذبات اس کے قلب میں موجیں مارتے ہیں ، درد اور حمیت اس پر استیلا پاتے ہیں اور وہ ان جذبات کو کامیابی کے ساتھ شعر کے پیکر میں تبدیل کر دیتا ہے ۔

اس نظم میں شاعر نہ صنائع و بدائع کا منت کش ہے ، نہ لفظی دل فریبی اور آرائش عبارت کا ممنون احسان ہے ، نہ استعارات کے اینچ پینچ ہیں ، نہ تشبیہات کی دھوم دھام ہے ۔ سیدھے سادے جملوں میں ان خونیں واقعات کے بعض خط و خال بیان کر رہا ہے لیکن ہر جملہ درد میں ڈھلا ہوا ہے اور ہر فقرہ تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا ۔ تمہید کے اشعار ہیں :

بر سمرقند اگر بگذری ای باد سحر
نامۂ اہل خراسان بہر خاقان بر

نامۂ مطلع آن رنج تن و آفت جان
نامۂ مقطع آن درد دل و سوز جگر

نامۂ ، بر رقمش آہ عزیزان[1] پیدا
نامۂ ، در شکنش خون شہیدان مضمر

نقش تحریرش[2] از سینۂ مظلومان خشک
سطر عنوانش از دیدۂ محرومان تر

۱۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۱۰۵ 'غریبان ۔' (مرتب)
۲۔ اشاعت نفیسی 'تقریرش ۔' (مرتب)

ریش گردد ہر صوت ازو گاہ سماع
خون شود مردمک دیدہ ازو وقت نظر

تا کنون حال خراسان و رعایا بودہ است
بر خداوند جہان خاقان پوشیدہ مگر

نی نبودہ است کہ پوشیدہ نباشد بروی
ذرہ نیک و بد نہ ملک و ہفت کشور[1]

کارہا بستہ بود بی شک در وقت کنون
وقت آن ست کہ راند سوی ایران لشکر

خسرو عادل خاقان معظم کز جد
پادشاہست و جہان دار ز ہفتاد پدر

دایمش فخر بدین ست کہ در پیش ملوک
پسرش خواندی سلطان سلاطین سنجر

باز خواہد ز غزان کینہ کہ واجب باشد
خواستن کین پدر بر پسر خوب سیر

انوری کی شاعری کا ساغر مدح و قدح کی صاف و دُرد سے ہی لبریز نہیں ہے ، بلکہ اس کی سطح کے نیچے الم و درد و یاس کا عنصر بھی اپنا نشیمن بنائے ہوئے ہے ، جو ضرورت کے وقت بجلی کی سی سرعت کے ساتھ سطح سے اُبھر کر فضاے بسیط میں طوفانِ یاس و حسرت بپا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے ۔ اس کے کہاں کے اس پہلو کو ، افسوس ہے ہمارے ہاں بالکل ہی فراموش کردیا گیا ہے ۔

اب شاعر ، خاقان کو خطاب کرکے یوں عرض مطلب شروع کرتا ہے :

ای کیومرث بقا ، بادشہ کسریٰ عدل
وی منوچہر لقا ، خسرو افریدون فر

قصۂ اہل خراسان بشنو از رہ لطف
چون شنیدی ز سر رحم در ایشان بنگر

۱۔ اشاعت نفیسی 'اختر ۔' (مرتب)

این دل افگار جگر سوختگان می گویند
کای دل و دولت و دین را ز تو شادی و بطر[1]
خبرت هست کزین زیر و زبر شوم غزان
نیست یک تن ز خراسان که نشد زیر و زبر
بر بزرگان زمانه شده خردان سالار
بر کریمان جهان گشته لئیمان مهتر
بر در دونان احرار حزین و حیران
در کف رندان ابرار اسیر و مضطر
شاد ، الاّ بدر مرگ ، نه بینی مردم
بکر ، جز در شکم مام ، نیابی دختر
مسجد جامع هر شهر ستوران شان را
پایگاهیست که نه سقفش پیداست نه در
خطبه نکنند بهر خطه بنام غز از آنک
در خراسان نه خطیب ست کنون نی منبر
کشته فرزند گرامی را اگر ناگاهان
بیند از بیم خروشید نیارد مادر
آن کرا صدره غز زر ستد و باز فروخت
دارد آن جنس که گوئیش خریدست بزر
بر مسلمانان زان شکل[2] کنند استخفاف
که مسلمان نه کند صد یک ازان با کافر
هست در روم و خطا امن مسلمانان را
نیست یک ذره سلامت به مسلمانی در
خلق را زین غم فریاد رس ای شاه نژاد
ملک را زین ستم آزاد کن ای پاک گهر
(صفحه ۱٦۸)

۱- اشاعت نفیسی 'ظفر -' (مرتب)
۲- 'گونه' اشاعت نفیسی - (مرتب)

اگر یہی مقصد ہم عبارت میں ادا کرنا چاہیں تو غالباً اس کے لیے ہمیں زیادہ الفاظ کی ضرورت ہو گی اور اگر اسی قدر الفاظ سے کام لینا چاہیں تو شاید خوبی اور صفائی سے نہ ادا کر سکیں ۔ یہ اس قادر الکلام کا کمال ہے کہ نہ زیادہ الفاظ کو کام میں لایا ، نہ حشویات کو داخل کیا اور اپنا مقصد خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کردیا اور تاثیر بھی پیدا کر دی ، جو دلوں کے گداز کرنے میں جادو کی خاصیت رکھتی ہے :

شاعر عرض حال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے :

بخدایی که بیاراست بنامت دینار
بخدایی که بیفراخت بقدرت افسر
که کنی فارغ و آسوده دل خلق خدای
زین فرومایه غز شوم پی غارت گر
وقت آن ست که یابند ز رحمت پاداش
گاه آن ست که گیرند ز تیغت کیفر
زن و فرزند و زر جمله بیک حمله چو پار
بردی امسال روان شان بدگر حمله ببر
آخر ایران که ازو بودی فردوس برشک
وقف خواهد بد تا حشر برین شوم حشر
سوی آنحضرت کز عدل تو گشتست چو خلد
خویشتن زین جا کز[1] ظلم غزان شد چو سقر
هرکه پایی و خری داشت بحیلت بفکند
چه کند آن که[2] نه پایست مر او را و نه خر
رحم کن رحم برآن قوم که نبود شب و روز
در مصیبت شان جز نوحه گری کار دگر

۱ ۔ اشاعت نفیسی میں ''دور ازین جای که از ۔'' (مرتب)
۲ ۔ اشاعت نفیسی ''چه کند مسکین آنرا که نه پایست و نه خر ۔'' (مرتب)

رحم کن رحم بر آن قوم که جویند جوی
از پس آن که نخوردندی از ناز شکر

رحم کن رحم بر آنها که نیابند نمد
از پس آن که از اطلس شان بودی بستر

رحم کن رحم برآن قوم که رسوا گشتند
از پس آن که بزیبائی[1] بودند سمر

گرد آفاق چو اسکندر بر گرد ازانک
توئی امروز جهان را بدل اسکندر

از تو رزم ای شه و از بخت موافق نصرت
از تو عزم ای ملک و از ملک العرش ظفر

همه پوشند کفن چون تو بپوشی خفتان
همه خواهند امان چون تو بخواهی مغفر

ای سر افراز جهان بانی کز غایت فضل
حق سپرده است بعدل تو جهان را یکسر

بهره ای باید از عدل تو نیز ایران را
گرچه ویران شده بیرون ز جهانش مشمر

تو چو خور روشنی و هست خراسان اطلال
نه بر اطلال بتابد چو بر آبادان خور

هست ایران بمثل شوره و تو ابری و ابر
هم بیفشاند بر شوره چو بر باغ مطر

بر ضعیف و قوی امروز توئی داور حق
هست واجب غم حق[2] ضعفا بر داور

خواجہ کمال الدین کے ذکر میں گویا ہے :

۱ - اشاعت نفیسی "مستوری ـ" (مرتب)
۲ - اشاعت نفیسی "جملہ ـ" (مرتب)

پیش سلطان جہان سنجر کو پروردت
ی چنو[1] پادشہ دادگر حق پرور
دیدہ ای خواجۂ آفاق کمال الدین را
کہ نباشد بہ جہان خواجہ ازو کامل تر
نیک دانی کہ چہ و تا بہ کجا داشت برو
اعتماد آن شہ دین پرور نیکو محضر
ہست ظاہر کہ برو ہرگز پوشیدہ نبود
ہیچ اسرار ممالک چہ ز خیر و چہ ز شر
روشن است آن کہ بر آن جملہ کہ خور گردون را
بود ایران را رایش ہمہ عمر اندر خور
وندران مملکت و سلطنت و آن دولت
چہ اثر بود ازو ہم بسفر ہم بہ حضر
با کمال الدین ابنای خراسان گفتند
قصۂ ما بخداوند جہان خاقان بر
چون کند پیش خداوند جہان از سر سوز
عرضہ این قصۂ رنج و غم و اندوہ و فکر
از کمال کرم و لطف تو زیبد شاہا
کز کمال الدین داری سخن ما باور
زو شنو حال خراسان و عراق[2] ای شہ شرق
کہ مراو راست ہمہ حال چو الحمد از بر
(صفحہ ۶۰۱)

میں نے اس نظم کے ذکر میں کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے ، صرف اس خیال کی بنا پر کہ ہمارے ہاں اب تک اسے قرار واقعی اہمیت حاصل نہیں ہوئی ہے ۔ اگرچہ مولانا شبلی نے اسے

۱ ۔ اشاعت نفیسی "ہمچو تو ۔" (مرتب)
۲ ۔ اشاعت نفیسی میں "غزان" بجائے "عراق ۔" (مرتب)

فراموش نہیں کیا ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس سے بہتر توجہ کی مستحق ہے - یورپ میں اس کی وقعت ایک عرصہ دراز سے معلوم ہے اور ایک سے زیادہ مستشرق نے اس کے ترجمے پر قلم اٹھایا ہے -

۵۴۹ھ میں قاضی حمید الدین کی مشہور کتاب "مقامات حمیدی" تصنیف ہوتی ہے - انوری قطعۂ ذیل اس کی تقریظ میں لکھتا ہے :

هر سخن کان نیست قرآن یا حدیث مصطفیٰ
از مقامات حمید الدین شد اکنون تر‌ّهات

اشک اعمیٰ دان مقامات حریری و بدیع
پیش آن دریای مالا مال از آب حیات

شاد باش ای عنصر محمودیان را روح تو
زان کہ تو محمود عصری ما بتان سومنات

از مقامات تو گر فصلی بخوانم بر عدو
حالی از نا منطقی جذر اصم یابد نجات

عقل کل خطی تأمل کرد ازو گفت ای عجب
علم اکسیر سخن داند مگر اقضی القضات

دیر مان ، ای قدر و رایت عالم تائید را
آفتابی بی زوال و آسانی بی ثبات[1]

(صفحہ ۶۰۱)

اس کے دوسرے سال قاضی صاحب انوری کے نام ایک قطعہ بھیجتے ہیں - شاعر جواب میں قطعہ لکھتا ہے - میں پہلے شعر پر قناعت کرتا ہوں :

قطعۂ صدر اجل قاضی قضات شرق و غرب
آن کہ بر عالم نفاذ او قضای دیگر است

(صفحہ ۶۲۱)

۱ - اشاعت نفیسی ، صفحہ ۳۳۵ "باثبات -" (مرتب)

ادھی ایام میں غزوں کے سردار ملک طوطی سے شاعر تعلق کر لیتا ہے ، لیکن یہ تعلق نہ اصلی ہے اور نہ دیرپا ۔

خراسان کا سیاسی مطلع فتنہ ، آشوب اور انقلاب کے گھرے بادلوں سے گھرا ہوا تھا ، وہاں کسی چیز کو قیام نہیں تھا ۔ جیسا کہ مشرقی ممالک کا دستور ہے ، غز بھی جانے کے لیے آئے تھے ۔ وہ ایک طوفان بے تمیزی کی طرح اٹھے ، خراسان ، عراق ، کرمان اور غزنہ پر چھا گئے اور کچھ عرصے کے بعد ہنڈیا کے ابال کی طرح بیٹھ گئے ۔ لیکن اس سے قبل وہ عام بربادی اور عالم گیر تباہی کے کام کو خاطر خواہ تکمیل تک پہنچا چکے تھے ۔ اب سنجر ، غزوں کی قید سے آزاد ہو کر وفات بھی پا چکا ہے اور انوری شہر بلخ میں مستقل سکونت اختیار کر چکا ہے ۔ ان ایام میں طغرل تگین بلخ کا حکمران ہے اور آزاد حاکم معلوم ہوتا ہے ۔

انوری کے کلیات میں دو تین قصیدے اور چند قطعات اس کی مدح میں ملتے ہیں ، لیکن کوئی قابل ذکر تعلق معلوم نہیں ہوتا ۔ طغرل تگین کے دور میں انوری کی زندگی کا وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے ، جسے ہجو بلخ کے نام سے پکارا جاتا ہے ، اور جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ دوسرے مقام پر بیان ہو چکا ہے ۔

میں یہاں چند الفاظ انوری کے "سوگند نامے" کی بابت کہنا مناسب سمجھتا ہوں ؛ یوں تو اس کی اکثر نظمیں چیدہ ، منتخب اور لطیف ہیں لیکن یہ نظم اس کی چوٹی کی نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے ۔ "سوگند نامہ" انوری کے اعجاز نگاری کی مثال میں بلاخوفِ تردید پیش کیا جا سکتا ہے ۔

اس نظم میں اس کی شاعری اپنے بہترین معیار اور انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے ۔ موقع نہایت نازک تھا ، دشمن اپنا کام ختم کر چکے تھے اور ہجو کا الزام اس کے سر منڈھ دیا گیا تھا ۔ اور غضب یہ ہوا تھا کہ بلخیوں کے جذبات اس کے برخلاف مشتعل ہو چکے تھے ۔ غوغائی اس کے گھر پر چڑھ آئے ، اس کی بے حرمتی

کا جوش ابھی فرو نہیں ہوا تھا ، بالکل ممکن تھا کہ اور دست اندازی کی جاتی اور عزت کے ساتھ جان پر بھی حملہ ہوتا ۔ انوری خود بے جا تہمت پر طیش ، بے حرمتی کے رنج اور جان کے خوف جیسے مختلف جذبات کے اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا ۔ آخر اس نظم کی شکل میں وہ اپنی بےگناہی کی آواز بلند کرتا ہے ۔ اس کے طاقت ور قلم کی گونج دور دور سنائی دیتی ہے اور عوام کا جوش مخالفت ایک برف کے تودے کی طرح ، جو تابشِ آفتاب کے سامنے پگھل کر اور پانی ہو کر بہہ جاتا ہے ، فرو ہو جاتا ہے ۔

اس نظر سے دیکھتے ہوئے ''سوگند نامہ'' انوری کا اعجاز ہے ۔ ذرا اس کی تمہید ملاحظہ ہو :

ای مسلمانان ! فغان زین دور چرخ چنبری !!
وز نفاق تیر و قصد ماه و کید[1] مشتری

کارِ آب نافع اندر مشربِ من آتش ست
شغل[2] خاک ساکن اندر سکنهٔ[3] من صرصری

آسمان در کشتیِ عمرم کند دایم دوکار
گاه شادی بادبانی ، وقت انده لنگری

گر بخندم ، وان بہر عمریست ، گوید زهر خند
ور بگریم، کان بہر[4] روزیست ، گوید خوبگری

بر سر من مغفری کردی کہ وان بر گذشت
بگذرد بر طیلسانم نیز دور معجری

روزگارا ! گر ز عنقا می‌نیاموزی ثبات !!
چون زغن تا چند سالی ماده و سالی نری !!

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۳۰۱ ''سیر ۔'' (مرتب)
۲ ۔ ''شان ۔'' (مرتب)
۳ ۔ ''کلبہٴ ۔'' (مرتب)
۴ ۔ ''ھمہ ۔'' (مرتب)

از ستمهای فلک چندان که گوئی گنج هست
واثقم زیرا که بامن هم بدین گنبد دری

گوئیا تا آسمان را رسم دوران آمده است
داده اندی فتنه را قطبی بلا را محوری

گر بگرداند به پهلو هفت کشور مر ترا
یک دم از مهرت[1] نه‌گوید کز کدامین کشوری

بعد ما کاندر لکدکوب حوادث چند سال
بخت شورم حنجری کرده است و دورش خنجری

خیره خیرم کرد صاحب تهمت اندر هجو بلخ
تا همی‌گویند کافر نعمت آمد انوری

قبة الاسلام را هجو ای مسلمانان که گفت ؟
حاش لله بالله ار گوید جهود خیبری

آسمان ار طفل بودی بلخ کردی دایگیش
مکه ماند کرد معمور جهان را مادری

ہجو کی افترا کے خلاف گویا ہے :

با چنین سکان که گراز قدر شان عقدی کشند
فارغ آید چرخ اعظم از چه از بی زیوری

هجو گویم بلخ را هیهات یارب زینهار
خود توان گفتن که زنگارست زر جعفری

بالله ار با من توان بستن بمسمار قضا
جنس این بدسیرتی یا مثل این بدگوهری

خاتم حجت در انگشت سلیمان سخن
افترا کردن برو ، ور گیرد از دیو و پری

۱ - ''مردم -'' (مرتب)

باز دان آخر کلام من ز منحول حسود
فرق کن نقش الٰهی را ز نقش آذری

مرد را چون ممتلی شد از حسد کار افتراست
معدهای بدمزاجان راق افتد از پری[1]

عیش من زین افترا تلخی گرفت و تو هنوز
چربک او همچنان چون جان شیرین میخوری

آن نمی گویم که در طیّ زبان آورده ام
آن هجا گر نزد من یابی بود از کافری

گر بخاطر بگذرانیدستم اندر عمر خویش
یا نیم چونانکه گرگ یوسف از تہمت بری

جاودان بی زارم از ذاتی که بیزاری او
هست در بازار دین صراف جان را بی زری

آن توانایی دوانایی که در اطوار غیب
دام بدبختی نہاد و دانۂ نیک اختری

اس طاقت‌ور تردید کے سامنے دشمنوں کا افترا کب تک سرسبز رہتا ، آخر "نقش الٰہی" "نقش آذری" پر ظفریاب ہوا ـ اس کے ترکش کے آخری تیر (جن میں چند دشمنوں کے اوپر بھی برسائے گئے ہیں) ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں :

چون مرا در بلخ هم از اصطناع اهل بلخ
دق مصری چادری کردست و رومی بستری

بر سر ملک چنان فارغ نہ باشد کس چو من
حبّذا ملکی کہ باشد افسرش بی افسری

دی ز خاک خاوران چون ذره مجهول آمده
گشته امروز اندرو چون آفتاب خاوری

---

۱ ـ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۳۰۳ "بد مزاجان راق افتد در مجالس از پری ـ"
(مرتب)

با چنین‌ها آن چنان ها زاید از خاطر مرا
ای عجب کز آب خشکی زاید از آتش تری
این همه بگذار آخر عاقلم در نفس خویش
کادمی را هست عقل از ممکنات اکبری[1]
پس چگونه هجو گویم خطهٔ را کز درش[2]
گر درآید دیو بنهد از برون مستکبری
تا تو فرصت جوی گردی وز کمین گاه حسد
غصهٔ ده ساله را بامن[3] بصحرا آوری
هیچ عاقل این کند جز آن که یک سو افگند
اصلِ نیکو اعتقادی ، رسم نیکو محضری
دشمنان را مایه دادن نزد من دانی که چیست؟
جمع کردن موش دشتی با پلنگ بربری
مستقیم احوال شو تا خصم سرگردان شود
بس که پرکاری کند او چون تو گردی مسطری
این دقائق من چنان ورزم که از بی‌فرصتی
سکته گیرد این و آن بر بوفراس و بحتری
از عقاب و پوستینش گر نه گوید به بود
گرچه در دریا تواند کرد خربط گاذری
چند رنجی کز قبولم تازه شاخی می دمد
هر کجا پنداری ای مسکین که بیخی می بری
رو که از یاجوج بهتان رخنه هرگز کی فتد
خاصه در سدّی که تائیدش کند اسکندری

(صفحه ۳۰۴)

۱ - اشاعت نفیسی ''اکثری -'' (مرتب)
۲ - ''پس چه گوبی هجو گویم بلخ را کز هر درش'' اشاعت نفیسی ، صفحه ۳۰۴ - (مرتب)
۳ - ''باری -'' (مرتب)

اس واقعے کے بعد انوری کچھ عرصے کے لیے بلخ چھوڑ دیتا ہے ، اور بغداد پہنچ کر قطب الدین مودود بن زنگی (۵۴۴ھ و ۵۶۴ھ) کے دربار میں رسائی حاصل کر لیتا ہے[1] ۔ اس موقعے پر شاعر نے کوئی مستقل تصنیف بھی مودود کے نام پر معنون کی ہے :

برین نوید رسیدم درین دیار و زمن[2]
بگوش حضرت شاه جهان رسید خبر
مرا بحضرت عالی تقربی فرمود
برای شاه بپرداختم یکی دفتر
هزار فصل درو لفظها همه دل‌کش
هزار عقد درو نکتها همه دلبر

(صفحہ ۱۸۴)

یہاں وہ علمی مشاغل اور تصنیفات میں اپنی زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے :

بدان امید که شاه جهان شرف دهدم
شوم بدولت او نیک بخت و نیک اختر
بهر دو ماه بسازم ز علم تصنیفی
برای دولت منصور خسرو صفدر
برین مثال بود تازه یاد تا عقبیٰ
برین نهاد بود زنده نام تا محشر

---

۱ - انوری کا بغداد پہنچ کر مودود بن زنگی کی مدح میں قصیدہ لکھنا اور پھر فوراً واپس آجانا بظاہر بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن یہ قصیدہ انوری کے ایک کلیات (نوشتہ ۸۰۲ھ) میں بھی ، جو راقم کی ملک ہے ، موجود ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ - ''بدین نوید رسیدم بدین دیار و دمن'' دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۱۱۴ ۔ قصیدہ ''در صفت بغداد و مدح سلطان قطب الدین مودود شاه زنگی گوید ۔'' (مرتب)

بماند نام سکندر هزار و هفصد سال
مصنفات ارسطو بنام اسکندر

(صفحہ ۱۸۴)

مودود جو علمی فتوحات کی بجائے جوع الارض اور فتح البلاد کی تجاویز میں زیادہ منہمک تھا ، انوری کے مقاصد کے ساتھ کوئی دل چسپی کا اظہار نہیں کرتا ، اس لیے شاعر شکستہ دل ہو کر اور اجازت لے کر بغداد کو خیر باد کہتا ہے :

ولیک شاہ بفتح بلاد مشغول است
نمی کند بہ پرستندگان خویش نظر
بمہرگفت کہ چون نیستت بکام جہان
درین ہوس منشین روزگار خویش مبر
بہ یک قصیدۂ غـرّا بخواہ دستوری
ز بارگاہ خداوند تاج و زینت و فر

دیگر

خدایگانا آمید داشت بندہ ہمی
کہ در ثنای تو بر سروران شود سرور
ببارگاہ تو ہر روز بیش تر آید
کنون برسم رسن تاب می‌شود پس تر
ز دخل نیست مثالی و خرج او بی حد
ز نفع نیست نشانی و وام او بی مر
اگر چنان کہ دہد شہریار دستوری
غلام وار دہد بوسہ آستانۂ در
بسوی خانہ گراید زبان بشکر و ثنا
بیاد ملک خداوند کردہ دایم تر

بغداد چھوڑنے کے بعد معلوم نہیں ہوتا کہ شاعر کہاں کہاں گیا اور کیا کرتا رہا ، مگر کچھ مدت بعد واپس بلخ آجاتا ہے -

عماد الدین پیروز شاہ احمد

اب عمادالدین پیروز شاہ ، خراسان کے افق پر ایک نئے ستارے کی طرح طلوع کرتا ہے، اور بلخ کے دروازے پر بہ حیثیتِ فاتح نمودار ہوتا ہے - وہ شہر کی غارت کا حکم دے چکا ہے - ابھی اس کی تعمیل میں کچھ وقفہ ہے کہ بلخیوں کے مجمع سے ، جو نئے فاتح کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے ہیں ، اوحدالدین آگے بڑھتا ہے اور بلخیوں کی حمایت میں قطعہ[۱] ذیل سناتا ہے :

ای ترا گشتہ میسر[۲] حشم دیو و پری
کوش تا آب سلیمان پیمبر نبری

زان کہ در نسبت ملک تو کہ باقی بادا
ہست امروز ہمان نوبت عدل[۳] عمری

تویی آن سایہ یزدان کہ شب چتر تو کرد
این کہ در سایہ او ، روز ستم شد سپری

نامہ فتح تو سیارہ بہ آفاق برد
کہ بشارت گر فتح تو نشاید بشری

تو کہ صد سد سکندر کنی از گرد سپاہ
خویشتن را سزد ار صد چو سکندر شمری

---

۱ - پروفیسر نفیسی اس قطعے پر ''بمدح الملک خاقان تگین'' کا عنوان دیتے ہیں - (مرتب)

۲ - اشاعت نفیسی صفحہ ۲۹۸ ''مسخر'' - (مرتب)

۳ - اشاعت نفیسی میں بجائے ''نوبت عدل عمری'' ''رتبت پیغامبری'' ملتا ہے - (مرتب)

رای اعلای ترا کشف شود حالت بلخ
کہ برحمت سوی آباد و خرابش نگری
در زوایاش ہمہ طایفہای منقطع اند
ہمہ از خانہ برون و ہمہ از دانہ بری
تو سلیمانی و این طائفہ موران ضعیف
بودہ خواہان تو عمری بدعای سحری
ظاہر و باطن ایشان ہمہ پای ملخ است
چہ شود کز سر پای ملخی در گذری
(صفحہ ۳۹۰)

وہی انوری جس کی تذلیل میں چند سال پیشتر بلخیوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ، آج ان کے حق میں فرشتۂ رحمت بن کر نئے فاتح کے سامنے رحم و معافی کی درخواست کر رہا ہے - یہ واقعہ اس کی جبلی شرافت اور اخلاقی جرأت کی ایک روشن مثال ہے - کیا ہم ایسے عالی ظرف اور بلند حوصلہ انسان کو ''دنی الطبع ، تنک ظرف اور کم حوصلہ'' کہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں ؟

بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر پیروز شاہ بلخ کا قبضہ ترک کر کے یکایک روانہ ہو جاتا ہے - انوری اس کی روانگی پر اپنا دلی تاسف ظاہر کرتا ہے - چنانچہ :

تو می روی و زمین و زمان ہمی گویند
زہی ز عدل تو خلق خدای آسودہ
(صفحہ ۳٦۴)

کچھ عرصے کے بعد وہ دوبارہ وارد ہوتا ہے اور شاعر اس کے خیر مقدم میں ذیل کا قطعہ لکھتا ہے :

احمد مرسل ز خاک مکہ چون ہجرت گزید
مدتی آن خطہ بود انگشت نومیدی گزان
باز چون باز آمد از اقبال میمون موکبش
تازہ شد چون در سحرگاہان گل از باد وزان

بلخ را پیروز شاه احمد همان هجرت نمود
تا فرو بارید از هم همچو برگ اندر خزان
باز چون در ظل عالی رایتش آرام یافت
زنده شد بار دگر چون از صبا شاخ رزان
شکر یزدان را که شد آباد و خرم تا بحشر
قبهٔ اسلام ازین و کعبهٔ اسلام ازان (صفحہ ۷۱۰)

پیروز شاہ کا زمانہ ۵۶۰-۶۱ھ سے تصور کرنا چاہیے - یہی پادشاہ انوری کا حقیقی ممدوح ہے اور اس میں شک نہیں کہ سنجر کے مقابلے میں اس کا دعویٰ نہایت زبردست ہے - شاعر نے بعض زبردست قصائد اسی پیروز شاہ کی تعریف میں لکھے ہیں - قصائد کی تعداد بھی کافی ہے اور ان کی زبان سے پایا جاتا ہے کہ شاعر کو اپنے ممدوح سے دلی آنس ہے - انوری کی اصلی قدردانی بھی اسی دربار میں ہوئی - اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں بھی متعدد قصائد ملتے ہیں -

مجدالدین ابوطالب نعمہ انوری کا (قیام بلخ کے زمانے میں) ایک اور ممدوح ہے - اس کے تعریفی قصاید بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں اور شاعر اس کا ممنون بھی ہے -

مجھے افسوس ہے کہ کلیات ، غوریوں کے ساتھ انوری کے مراسم پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا - نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مراسم کس زمانے میں قائم ہوئے مگر نہ تو وہ دیرپا ہیں اور نہ گہرے -

قرن ششم کے ساتویں عشر میں سلوک غور غزوں کی طاقت کو برباد کر کے خراسان کے بعض حصوں پر قابض ہو جاتے ہیں - بعض رباعیوں میں ان کی طرف اشارے ملتے ہیں - امیرالجبال کے نام پر ایک قطعہ بھی ہے - ایک پورا قصیدہ شہاب‌الدین اور حسن مودود کی تعریف میں ملتا ہے - یہ شہاب‌الدین اگرچہ مشہور سہاب‌الدین غوری فاتحِ ہندوستان نہیں ہے - اس قصیدے کا مطلع ہے :

عرصۂ مملکت غور چہ نامحدودست[1]
کہ دران عرصہ چنان لشکر نامعدودست

اس قصیدے میں غوریوں کے نسب کے سلسلے میں ایک عجیب بیان ملتا ہے ، جو تاریخی روایات کے بالکل منافی ہے - سلاطین غور کا نسب بروئے تاریخ ضحاک تازی سے ملتا ہے ، اور طبقات ناصری میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے - لیکن انوری ان کا سلسلۂ نسب حضرت داؤد پیغمبر علیہ اسلام سے ملاتا ہے - غور کے ذکر میں وہ کہتا ہے :

رونق ملک سلیمان پیمبر دارد
عرق سلطان چہ عجب کز نسب داؤدست

کلیات میں ایسے قصائد ، جو مختلف سلاطین و صدور و امرا و علما وغیرھم کے نام ایک ایک دو دو مرتبہ لکھے گئے ہیں ، بے شمار ہیں - ذیل میں صرف ان لوگوں کے اسماء کی فہرست دے دی جاتی ہے :

(۱) ستر اعلی جلال الدین والدنیا (۲) صفوۃ الدین مریم (۳) کریمۃ النساء رضیۃ الدین (۴) عصمت الدین (۵) تاج الملوک بادشاہ (۶) ملک یوسف (۷) عزالدین (۸) عضد الدین و ناصرالملک (۹) ملک شاہ معظم بن طغانشاہ (۱۰) زین الدین عبداللہ (۱۱) عمادالملک جلال الدین ابوالفضل (۱۲) علاء الدین محمد (۱۳) صاحب عادل عمر صدر دنیا (۱۴) علاءالدولہ علاء الدین ابوعلی حسن (خانوادۂ نظام) (۱۵) کمال الدین ابی سعد مسعود (۱۶) عزیز الدین طغرائی (۱۷) ضیاء الدین منصور (۱۸) شرف الامرا اوحدالدین اسحاق (۱۹) پیروز شاہ بن طغان تگین (۲۰) وزیر محمود (۲۱) بہاء الاسلام فخر الدین محمد (۲۲) تاج الدین ابراہیم (۲۳) محمد بن ابراہیم سری

۱ - "در مدح سلطان شہاب الدین و ناصرالدین فرمود" صفحہ ۳۵ ، دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی - (مرتب)

(۲۴) فخر الدین ابوالمفاخر (۲۵) صدر جہان علاء الدین محمود (۲۶) شمس الدین اغلبک پہلوان لشکر (۲۷) علاء الدین امیر اسحاق (۲۸) فرزندان میرداد (۲۹) مودود شاہ ناصر الدین موید (۳۰) کمال الدین محمد (وزیر) (۳۱) بہاء الدین علی (۳۲) شمس الدین بہروز (۳۳) حسام الدین حسین (۳۴) قوام الدین (۳۵) فخرالزمان اسحاق (۳۶) جمال اشراف (۳۷) خواجۂ منصور عامر (۳۸) خواجۂ فخری (شاعر) (۳۹) خواجہ اسفندیار (۴۰) کمال الدین مسعود (۴۱) اجل جمال الدین (۴۲) تاج عمزاد (۴۳) صفی موفق سبعی (۴۴) الغ جاندارابک ایناجخ سنقر (۴۵) مجد الدین عالی ابوالمعالی ابن احمد (۴۶) صدر الوزرا مویدالملک (۴۷) نصیر الملک محمد بن عمر (۴۸) مجد الدین علی بن عمر (۴۹) بدر الدین سنقر (۵۰) مویدالملک نظام الدین محمد (۵۱) نصیر الدین محمود وزیر (۵۲) ابوالمناقب ظہیر الدین ناصر (۵۳) رضی الدین ابو رضا (۵۴) فخر الدین ایناجخ خاصبک (۵۵) ناصر الدین قتلغ شاہ (۵۶) عماد الدین ملک شاہ معظم (۵۷) ابوالمحاسن نصر بن نصر (۵۸) سراجی (ترمذی) شاعر (۵۹) ارشد الدین (شاعر) (۶۰) خواجہ کمال الدین (شاعر) (۶۱) شجاعی (شاعر) (۶۲) تاج الافاضل فخرالدین خالد بن ربیع المالکی (شاعر) (۶۳) ملک طوطی (۶۴) کمال الزمان ، مغنیِ سلطان سنجر (۶۵) فرید الدین کاتب ۔

کلیات اس کے واقعات زندگی پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا ۔ اتفاقیہ چند باتوں کا ذکر آ گیا ہے ؛ وہ یہ ہیں کہ ایک مرتبہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا ۔ ایک قصیدے میں جو کسی وزیر کے نام ہے ، کہتا ہے :

تا دست شکستہ پای جہدم
در جستن ناگزیر لنگ ست
دریاب مرا و زود در یاب
کین دست شکستہ نیک تنگ ست

(صفحہ ۴۶)

ایک مرتبہ بیماری رشتہ میں مبتلا ہوا تھا :

بدست حادثہ بندی نہاد بر پایم
که همچو حادثه گاهی نهان و گه پیداست
سبک بصورت خوبان گران بقوت طبع
که پشت طاقتم از بار او همیشه دوتاست
نظر بحیله از اعضا جدا نمی کندش
کراست بند بر اعضا که آنهم از اعضاست
عصاست پایم و در وضع آفرینش خلق
شنیده ای که کسی را بجای پای عصاست

(صفحہ ۳۹)

درد نقرس کی تکلیف بھی اس کو ہو جایا کرتی تھی :

بزرگوارا دانی کز آفت نقرس
ز هرچه ترشی من بنده می‌بپرهیزم

(صفحہ ۲۹۸)

سفر میں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ انوری اور اس کے ہمراہیوں کو، جو تعداد میں تیرہ تھے، جن میں تین شاعر، چھ خیاط اور چار منشی تھے، دو سواروں نے آکر گھیر لیا اور بہت پریشان کیا :

من و سه شاعر و شش درزی و چهار دبیر
اسیر و خوار بماندیم در کف دو سوار
دبیر و درزی و شاعر چگونه جنگ کنند
اگرچه چارده باشند ور چهار هزار

(صفحہ ۶۸۱)

ہمیں اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قزاق تھے اور جب تک انہوں نے اس جماعت کو اچھی طرح نہ لوٹ لیا ہوگا ، نہ چھوڑا ہوگا ۔

وہ ایک بڑے کنبے والا آدمی تھا ، جس کے افراد کی تعداد پچاس کے قریب تھی :

بپذیرش کہ بندۂ تو سزد
او و پیوستگان او پنجاہ

(صفحہ ۳۵۶)

مصارف زیادہ تھے اور خود بھی اسراف کی حد تک فیاض تھا اس لیے قرضے کی مصیبت میں گرفتار رہتا تھا ۔

وہ طبیعت کا شریف ، حوصلے کا بلند اور خوش اخلاق تھا ۔ لیکن بلند نظری اور بے پروائی اس کے خصائل کا امتیازی جوہر ہے ۔ صاف گوئی اس کی ایک اور خصوصیت ہے ۔

خطرے اور مصیبت کے وقت وہ زیادہ دلیر اور جری تھا ۔ خطرہ جس قدر زیادہ ہوتا ، اس کی ہمت اتنی ہی زیادہ بلند اور حوصلہ مضبوط ہوجاتا ۔ دوسروں کی آفت میں سینہ سپر ہونے سے دریغ نہیں کرتا اور عام طور پر بے خوف اور نڈر تھا ۔

وہ قدرتاً خوش طبع ، بذلہ سنج اور ظریف تھا ۔ ایسا شخص ہمیشہ کثیر الاحباب اور ہر دل عزیز ہوتا ہے ، اسی لیے اس کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا ۔ اس کی صاف گوئی کی عادت نے بہتوں کو اس کا دشمن بھی بنا دیا تھا لیکن دشمنی کے اظہار میں وہ پہل نہیں کیا کرتا تھا ۔ اسی طرح ہجو میں بھی ابتدا نہیں کرتا ، بلکہ پہلے حریف کو جتا دیتا کہ اپنا رویہ درست کر لے ورنہ ہجو سے تواضع کی جائے گی ۔

اس کے ساتھ ہی وہ رحم دل اور بردبار تھا اور دشمنوں تک کو معاف کر دیتا تھا ۔

غرور ، جو تلامیذالرحمان کا طغرائے امتیاز ہے ، انوری میں بہت کم پایا جاتا ہے ، تفاخر اس کا شیوہ نہیں ۔

اگرچہ اس کی عمر درباروں میں اور قصیدہ خوانی میں گزری ، جہاں خوشامد کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا ، تاہم خوشامد سے اس کو دلی نفرت ہے ۔ انسان ، انسان سب اس کی نظر میں مساوی ہیں اور اپنے جیسے انسان کی منت پذیری اس کے نزدیک بدترین

فعل ہے -

شراب وہ پیتا تھا ، اُسے خود اقرار ہے -

کلیات میں بیسیوں قطعات موجود ہیں جو صرف دوستوں سے شراب منگوانے کی خاطر لکھے گئے ہیں -

شعرا میں وہ ابوالفرج کا زیادہ مداح ہے اور اسی کی تقلید[1] کرتا ہے - اور معاصرین میں عمعق ، ادیب صابر اور معزی کا ذکر احترام سے کرتا ہے - باوجودیکہ خود مسلم الثبوت اُستاد فن بلکہ پیغمبر فن ہے لیکن شعر گوئی اس کے نزدیک ایک ذلیل اور قابلِ نفرت پیشہ ہے - شاعر اور حلال خور اس کی رائے میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں ، نہیں بلکہ شاعر حلال خور سے بھی زیادہ کثیف ہے -

علوم کا دل سے شیدائی ہے اور حکمت پر تو جان قربان کرتا ہے - قسمت کی بوالعجبی دیکھیے کہ بو علی سینا کا متعلم ، رودکی کا جانشین بنا دیا جاتا ہے لیکن قلبی رجحان کا کیا کرتا - وہ قدم قدم پر نمایاں ہے ، زرق برق درباروں اور گرم نشاط محفلوں میں یکایک وہ ایک آہ سرد کھینچتا ہے - ارسطو اور بو علی اس کو یاد آتے ہیں اور دل پکڑ کر رہ جاتا ہے -

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی کا خیال مختلف ہے - چناں چہ فرماتے ہیں :

''این کہ برخی وی را پیرو روش ابوالفرج در شعر دانستہ اند نیز درست نیست زیرا کہ سبک انوری بسیار کامل تر و مصنوع تر و آویختہ تر با مسایل علمی از روش ابوالفرج رونیست - تنہا وجہ اشتراکی کہ درمیان ہست این‌ست کہ انوری بوزن و قافیہ و ردیف برخی از قصاید ابوالفرج قصایدی سرودہ است و ہمین سبب شدہ کہ برخی وی را شاگرد ابوالفرج و برخی ہم وی را پیرو اسلوب او در شعر پنداشتہ اند -''

(مقدمۂ دیوان انوری ، صفحہ ۳۸) - (مرتب)

انوری اگرچہ کنشت میں دیر نشینوں کا سرتاج ہے لیکن کعبے کی محبت اس کے دل سے نہیں گئی ۔ شاعری میں عزت کے باوجود وہ فردوسی سے مرتد ہے اور بو علی کا کلمہ پڑھتا ہے ۔ وہ 'شاہ نامے' کو رد کرتا ہے اور 'شفا' کے آگے سر خم کرتا ہے ۔ کہتا ہے :

در کمال بو علی نقصان فردوسی مگیر
هر کجا آمد شفا شهنامه گو هرگز مباش

بو علی کے لیے یہ احترام اس کو سنائی کے خلاف اعتراض کرنے کی ترغیب دیتا ہے ۔ حکیم سنائی نے ایک مقام پر لکھا تھا :

که یارب مر سنائی را سنائی ده تو در حکمت
چنان کزوی برشک آید روان بو علی سینا

انوری نے جواب میں کہا :

سنائی گرچه از وجه مناجاتی همی گوید
بشعر اندر ز حرص آن که یابد دیدهٔ بینا
ولیکن از طریق آرزو پختن خرد داند
که با بخت زمرد بس نیاید کوشش مینا
برو جانی مکن تن در مشیت ده که دیر افتد
ز یاجوج تمنا رخنه در سد "ولو شئنا"

(صفحہ ۵۸۸)

اہل تصوف کو وہ پسند نہیں کرتا ۔ اس دلیل کی بنا پر میں خیال کرتا ہوں کہ مصرع مشہور :

چون سنائی هستم آخر گر نه همچون صابرم

میں انوری نے اپنے آپ کو حکیم سنائی کا مثیل نہیں کہا ہے بلکہ حکیم سہائی کا ۔ ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۳۲ا۵ھ میں یہی مصرع یوں درج ہے :

از سهائی بیشم آخر گرچه کم از صابرم

بہ قول محمد عوفی ، سہائی کا پورا نام "الحکیم محمود ابن علی السہائی

المروزی" ہے اور طلحہ مروزی نے اس کا مرثیہ لکھا ہے ۔
اس کی شاعری پر مخالف معاصرین نے کفر نگاری کا الزام لگایا ہے ۔ فتوحی مروزی کہتا ہے :

گدیہ و کفر در اشعار شعارست ترا
کفر در مدحی و در گدیہ ہمہ کفرانی
صنعت کفر بشعر از تو در افزود چنانک
بق‌بق از فاضلی و طنطنہ از خاقانی

(صفحہ ۳۱۴)

قاضی نور اللہ شوستری شیعہ شعراء کی فہرست میں اس کا شمار کرتے ہیں ، لیکن کلیات میں کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے کہ وہ مذہب سنت والجماعت کا ایک رکن تھا[1] اور غالباً شافعی فرقے سے تعلق رکھتا تھا ۔ مسئلہ جبر و قدر میں وہ اشاعرہ کا ہم زبان ہے ۔ رویت باری کا وہ قائل ہے ، "عدل عمر" قدم قدم پر اس کے قصائد میں پایا جاتا ہے ۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

نہ در خلافت بوبکر دم زنم بہ خلاف[2]
نہ در امامت فاروق در مجال و نطق
نہ در نشستن عثمان چو رافضی بدگو
نہ در شجاعت حیدر چو خارجی احمق

۱۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا فرماتے ہیں :
"سید نور اللہ شوستری در کتاب مجالس المومنین انوری را یکی از شاعران شیعی مذہب دانستہ و او را نیز در ردیف بسیاری از کسانی کہ تشیع را بر آنان بستہ ، در آوردہ است ۔ از دیوان و اشعار او مطلقاً چنین برنمیآید...او در اشعار خود چند بار بعدل و نصفت و صلابت عمر اشارہ کردہ و ظہور شریعت مہدی را بوسیلہ او دانستہ است ۔"
(صفحہ ٦٦٨ ، تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم) (مرتب)

۲۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ١٧٦ ۔ (مرتب)

سر خوارج خواهم شگافتہ چو انار
دل روافض خواهم[1] کفیده چون جوزق

ان اشعار پر بھی لحاظ کیا جائے:

بسر مصطفیٰ شریف قریش
کہ ز جمع رسل عزیز ترست[2]

بوفا و صفای صدق عتیق
کہ دل و جان فروش و شرع خرست

بدلیری و ہیبت عمری
کہ ظہور شریعت از عمرست

بحیا و حیات ذوالنورین
کہ حقیقت مولف سورست

بکف و ذوالفقار مرتضوی
کہ بحرب اندورن چو شیر نرست

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واسطے کہتا ہے:

دین بعمر شد قوی گرچہ پس از عہد او
باقی ناموس کفر خنجر حید
معرکہ مکر دیو ظل
چرخ...

ناظرین

اور فردوسی
ہیں۔ اسی قسم
صابر اور خود سلہ

۱۔ اشاعت نفیسی ملعود
۲۔ دیوان انوری، مرتبہ
۳۔ صفحہ ۴۸، دیوان انوری

خلاصۃ التوریخ (؟) میں میری نظر سے گزرا ہے ۔ موقع یہ ہے کہ عید کا چاند ، جس کا بے تابی سے انتظار کیا جا رہا تھا ، نظر آ چکا ہے ۔ ہلال کو دیکھ کر انوری کہتا ہے :

این نیم قدح کہ در لب این طاس ست

رشیدی کہتا ہے :

گوئی کہ بدست پارۂ الماس ست

ادیب صابر کہتا ہے :

شکل مہ نو راست چو کج کارد بود

سلطان سنجر کہتا ہے :

نی نی غلطی کشت بقا را داس ست

انوری کی وفات پر اس کے کسی دوست نے ذیل کا قطعہ لکھا ہے :

(۱) انوری رفت و آرمیدِ و گزید
بر سرای پلید عالم پاک
(۲) ... در غمش همی گویند
زرد و دیدۂ نمناک
... ...نفت

تھا ، لیکن زمانے
... ہرزہ پسندی ، علوم
... تلخیاں محسوس کر کے
...عری اختیار کرتا ہے ۔
...وف تردید کہہ سکتا ہے :

مانبودیم بدین مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فن ما

اگرچہ شعر نے اس کی روحانی اولوالعزمیوں اور طبعی رجحان کو کوئی تسکین نہیں بخشی ، کیونکہ وہ اس سے ہمیشہ ملول اور دل گیر نظر آتا ہے ۔ اس کے شریف جذبات اس پیشے کے خلاف ہمیشہ سرگرم پیکار ہیں ، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انوری نے اپنے سرسبز دماغ ، عالمانہ روشِ تحریر اور نکتہ آفرینی سے شعر کے درجے کو کئی پایہ بلند اور رفیع کردیا ہے ۔

انوری کا اعجاز اس کے قصاید مانے گئے ہیں ۔ متقدمین کے نزدیک محاسنِ قصیدہ گوئی زیادہ تر شان و شکوہِ الفاظ ، نادر تشبیہات اور صنائع بدائع پر ختم تھیں ۔ لیکن انوری کی جدت پسند طبیعت نے اس میں مضمون داخل کیا ، خیال بندی کا شوخ رنگ چڑھایا اور صنائع کا زور توڑ کر اس کو علمیت کے رنگ میں رنگ دیا ۔ فارسی زبان اس کے ہاں ایک نئی کروٹ لیتی ہے ۔ جدید خیالات اور نئے اسلوب وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں ۔ وہ سینکڑوں بندشوں کا مبتدع ہے اور اس کے جھوٹے نوالوں کو متاخرین مزے لے لے کر چباتے ہیں ۔ قریب قریب ہر شاعر نے اس کے اثرات میں اپنی قندیلِ سخن کو روشن کیا ہے ، جن میں ظہیر ، ابن یمین ، عرفی اور قاآنی قابل ذکر ہیں ۔ ہمارے لغات کا ایک بڑا جزو اس کی جدت طرازی کا مرہون منت ہے ۔

صنائع میں وہ لف و نشر اور تجنیس کی طرف زیادہ مائل ہے ، اور کلامِ حشو یا جملۂ معترضہ کے استعمال میں ید طولیٰ رکھتا ہے ۔ وہ ادائے خیال کے لیے نازک اور خوبصورت لباس کے بجائے سنجیدہ اور متین پیرایہ تلاش کرتا ہے ۔

انوری ، ایران میں ثالثِ ثلاثہ رسل مانا گیا ہے اور یہ فیصلہ ابھی تک مسلم ہے ۔ متاخرینِ ہند میں اس کے خلاف بغاوت پھیلانے والوں میں سب سے پہلے ابوالفضل علامی کا نام لیا جا

سکتا ہے ۔ ابوالفضل کے بعد میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی قابل ذکر ہیں ۔ اُن کے مقلد آزاد بلگرامی ہیں اور مولانا شبلی کی رائے حقیقت میں آزاد سے ماخوذ ہے ۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے دور میں قصیدہ گوئی کی حقیقی عظمت مردہ ہو چکی تھی اور غزل نے عالمگیر قبولیت حاصل کر لی تھی ، اس لیے مذاق میں عام انقلاب جاگزیں ہوچکا تھا ۔ عرفی جیسا مسیح نفس بھی مردہ قصیدے کے جسم میں روح پھونک کر اس کا دورِ احیا نہ لاسکا ۔

انوری کے دور میں غزل نے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں کی تھی ۔ منچلے شعرا کے سامنے جو میدان تھا وہ قصیدے کا تھا ۔ اسی سرزمین میں وہ اپنے جوش طبیعت کی جولانیاں دکھاتے تھے ۔ یہ عہد قصیدے کی تاریخ کا زرین دور مانا جانا چاہیے ۔ شعرا کثرت سے موجود تھے جن میں اکثر مشہور و معروف ہیں ۔ مثلاً امیر معزی ، ادیب صابر ، عبدالواسع جبلی، حکیم روحانی ، حکیمِ سوزنی ، فتوحی ، سنجری ، حکیم سنائی اور رشیدالدین وطواط وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن سب نے اپنے تفنن طبع کے لیے قصیدہ نگاری ہی کو اختیار کیا تھا ۔

ان میں جو انوری کے ہم چشم مانے گئے تھے وہ فتوحی اور سنجری تھے :

این کہ پرسد ہر زمان این . . . خران گاؤ ریش
کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری

(صفحہ ۵۰۴)

گویا معاصرین کی نظرِ انتخاب میں انوری ، فتوحی اور سنجری پر قرعہٴ فال ڈالا گیا تھا ۔ کوئی انوری کو ترجیح دیتا تھا ، کوئی فتوحی کا معتقد تھا اور کوئی سنجری کی فضلیت کا قائل تھا ۔ گویا سعدی ، امامی اور مجد ہمگر کی ترجیح کی بحث بہ تبدیل اسماء ایک صدی پیشتر چھیڑ دی گئی تھی ۔ لیکن غورکرو آج فتوحی اور سنجری کو کون جانتا ہے ۔ زمانے نے ان کے کلام کی طرح ان کے ناموں کو بھی صفحہٴ ہستی سے مٹا دیا اور جو تھوڑا بہت اُن کے متعلق

جانتے ہیں ، انوری کے طفیل میں جانتے ہیں ۔ وہاں دنیا نے سعدی کے حق میں فیصلہ دیا ، یہاں انوری کے حق میں ۔

متاخرین میں بعض نے ظہیرفاریابی کو انوری پر ترجیح دینا چاہی لیکن ان کی کوشش بار آور نہیں ہوئی ۔ خود مولانا شبلی ظہیر کی افضلیت کے قائل ہیں لیکن انوری اور ظہیر میں کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔ ظہیر کی شاعری اس وقت شروع ہوتی ہے جب انوری کا زمانہ ختم ہوتا ہے ۔ ظہیر کے قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر انوری کا مقلد بھی ہے اور انوری کے جواب میں جو چند قصائد اس نے لکھے ہیں ان میں کوئی ترقی نہیں دکھائی ہے ۔ میں بخوف طوالت صرف چند امثال پر اکتفا کرتا ہوں ۔

انوری کا ایک قصیدہ ہے :

صبا بہ سبزہ بیاراست باغ دنیلی را
نمونہ گشت زمین مرغزار عقبلی را

ظہیر نے اسی زمین میں یہ مطلع بہم پہنچایا ہے :

سفر گزیدم و بشکست[۱] عہد قربلی را
مگر بہ حیلہ بہبینم جمال سلمٰی را

(صفحہ ۳۷ ، قصائد ظہیر ، طبع نولکشور ، ۱۲۹۷ھ)

میں آن میں انوری کے مطلع کو ہر اعتبار سے بہتر مانتا ہوں ۔

---

۱ ۔ معطوف و معطوف علیہ کی حالت میں یہ تفاوت جو ''سفر گزیدم و بشکست'' کی ترکیب میں بجائے ''سفر گزیدم وبشکستم'' دیکھا جاتا ہے ، ایک ایسا اسلوب ہے جو سب سے پہلے قرن پنجم میں دیکھا جاتا ہے ۔ انوری کے کلام میں یہ تغیر بہت عام ہے ۔ چنانچہ امثال ذیل :

(۱) جستم ز جاو پیش دوید و سلام کرد
و آوردمش چو تنگ شکر تنگ در کنار

(صفحہ ۱۹۶)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

لیکن اس قسم کا مقابلہ شاید بعض ناظرین کی رائے میں نا مناسب ٹھہرے - دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں استادوں نے جہاں ایک ہی قافیہ باندھا ہو ان اشعار کا مقابلہ کرلیا جائے - اس نقطۂ نظر سے ذیل کے اشعار پر ناظرین ایک نظر ڈال لیں :

ظہیر	انوری
مزاج کودکی از روی خاصیت بمذاق هنوز طعم شکر می‌نهاد کنسلی را	روایح کرمت با ستیزه روی طبع خواص نیشکر آرد مزاج کنسلی را
بدست خویش قلم در کشیده مفتی عقل بیک اشارت رایت هزار فتوی را	بهرچه مفتی رایت قلم بدست گرفت قضا برات نویسد جواب فتوی را
سخن چه عرض کنم بر جماعتی که زجهل زبانگ خر نه شناسند نطق عیسلی را	نسیم باد در اعجاز زنده کردن خاک ببرد آب همه معجزات عیسلی را
وجود او که جهان را ز ابتدا ے ظہور بجای نور بصر بود چشم اعمیٰ را	زکنه رتبت تو قاصرست قوت عقل بلی ز روز خبر نیست چشم اعمیٰ را

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

(۲) القصه باز گشتم و آمد بخانه زود
در باز کرد و باز به‌بست از بس استوار

(صفحہ ۱۹۴)

(۳) همچنان کردم و این شعر اداکردم و رفت
جان ازان رجعت فی‌الفور پر از واشوقاه

(صفحہ ۳۵۹)

(۴) رفتی و با تو جالی که جهان داشت ببرد
گر جهان را پس ازین ناقص خوانیم سزاست

(صفحہ ۵۶)

(۵) آوردمش بجای و نشاند و نشست پیش
بردست بوسه دادم و بر روی او گلاب

(صفحہ ۲۸)

(حاشیۂ مصنف)

الوری	ظہیر
وجود جود تورا ایچ فتاد اگرنہ وجود	ہزار بار بدیوان رزق رد کردہ
بہ نیم نان ز قضا می فروخت اجریٰ را	جہان ز بہر نشانت برات اجریٰ را
شکوہ مصطفویت آخر از طریق نفاذ	اگر صلابت او بانگ بر فلک بزند
ز طاقہاش برافگند لات وعزیٰ را	بخالفی دہد اقرار لات و عزیٰ را
خدای عزوجل گویی از طریق نفاذ	برای تحفۂ نظارگان بیارایم
بہ اعتدال ہوا دادہ جان معنیٰ را	بہ حیلہ ہای عبارت عروس معنیٰ را
خیزید کہ ہنگام صبوح دگرآمد	صبح دگر از مشرق اقبال بر آمد
شب رفت وزمشرق علم صبح برآمد	در گلشن ایام نسیم سحر آمد
(صفحہ ۱۷۰)	(صفحہ ۲۳ ، کلیات ظہیر)
خورشید می اندر افق جام نکوتر	آن وعدہ کہ تقدیر ہمی داد وفا شد
چون لشکر خورشید بہ آفاق برآمد	وان کار کہ ایام ہمی خواست برآمد
نام تو بسی تربیت نام عمر کرد	شاہنشہ ابی بکر محمد کہ جہان را
زانرویکہ عدل توچو عدل عمرآمد	از حضرت او مژدۂ عدل عمر آمد
نزدیک خروس ازپی بیداری مستان	شمشیر تو در ظلمت شبہای حوادث
دیریست کہ پیغام نسیم سحرآمد	چون پرتو خورشید و طلوع سحرآمد
در امر تو امکان تغیر نہ نہفتند	سر بر خط حکم تو نہد ہرکہ یکی روز
گویی کہ مثالی ز قضاوقدر آمد	در دائرۂ حکم قضا و قدر آمد
اوصاف تو در نسبت آوازۂ ایشان	خصمت کہ پرستندۂ سم خرعیسیٰ ست
وصف نفس عیسیٰ و آواز خر آمد	اندر نظر عقل چو دنبال خر آمد
بر بوک و مگرعمر گرامی مگذارید	آن مایہ ندانست کہ بر ہیچ نیاید
خود محنت ماجملہ ز بوک و مگر آمد	ہرکار کہ در معرض بوک و مگرآمد

ظہیر ، انوری کی متانت اور دقت نظر کو نہیں پہنچ سکتا ۔ زبان کی صفائی جو ظہیر کا امتیازی جوہر ہے ، انوری سے مقابلے کے وقت اس کا صریحی تفوق ثابت نہیں کرتی ۔ لیکن جب ہم ان

گوناگوں اور مختلف الموضوع مضامین کا خیال کرتے ہیں جو انوری نے اپنے اشعار اور نظموں میں روشناس کیے ہیں ، تو ظہیر کی شکست ایک بدیہی واقعے کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔

ذیل کے اشعار پر بھی غورکیا جائے جو بہلحاظ ترکیب و بندش دونوں استادوں کے ہاں متحدالمضمون مانے جا سکتے ہیں ، صرف اس فرق کے ساتھ کہ ایک صبح کا ذکر کرتا ہے اور ایک شام کا ۔ اور نگاہِ انتخاب کا فیصلہ پھر انوری کے حق میں ہے :

انوری

چون وقت صبح چشم جہان سیر شد ز خواب
بگسستہ شد ز خیمۂ مشکین شب طناب
بنمود روی صورت صبح از کنار شب
چون جوی سیم بر طرف نیلگون سراب (صفحہ ۲۷)

ظہیر

چون بر زمین طلیعۂ شب گشت آشکار
آفاق ساخت کسوت عباسیان شعار
پیدا شد از کرانۂ میدان آسمان
شکل ہلال چون سر چوگان شہریار (صفحہ ۱۵)

انوری کی شاعری میں گوناگوں واقعات اور معاملات پر بحث کی گئی ہے ، اس کی تشبیب میں مختلف النوع موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے ۔ بہار و باغ ، گل و ریاحین کے علاوہ ، جو ہر ایرانی شاعر کا ایک مقبول مضمون ہے ، انوری کے ہاں کہیں ذکر معشوق ہے ، اس کے فراق کا بیان ہے یا آمد کا ذکر یا مکالمہ ہے ۔ کہیں صبح کا نقشہ کھینچا گیا ہے ، کہیں شام کا منظر دکھایا ہے ۔ کبھی سرگرم سفر ہے ؛ دشت و بیاباں ، کوہ و صحرا کے مناظر پیش کرتا ہے ، کہیں شب عید کے نظارے ہیں اور عید گاہ پہنچنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ کہیں فلکیات کے ذکر میں مصروف ہے ؛ بروج اور سبعہ سیاروں پر قلم اٹھاتا ہے ، اور ہر ستارے کا جدا جدا حلیہ لکھ

رہا ہے ۔ یہ موضوع اس کے ہاں بہت پسندیدہ ہے ۔ کہیں زمانے کی نا قدری ، علم و ہنر کی کساد بازاری کا دکھڑا بیان ہوتا ہے ۔ تقدیر اور آسمان کی بوالعجبیاں دکھائی ہیں ، صحن بستان و غدیر ، قصر و ایوان ، اُن کی نقاشی اور مختلف منظروں ، شکار گاہوں اور رزم گاہوں کا خاکہ اُتارا ہے ۔

صبح کا وقت ہے ، صبوحی کی تلاش ہے ، اور شراب سے لو لگ رہی ہے ۔ نخاس میں ایک ہندی کنیز دیکھی جاتی ہے ، شاعر اس پر عاشق ہو جاتا ہے ۔ بات چیت کا موقع بھی مل جاتا ہے ، عشق جتایا جاتا ہے ، وہ مسکراتی ہے اور کہتی ہے "تمھارے کیسے میں روپیہ بھی ہے ؟ روپے سے سب کچھ ہو سکتا ہے ، آسمان تک کے ستارے توڑے جا سکتے ہیں ۔" یہ جواب دیتے ہیں : ع

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

وہ کہتی ہے "تو میرا کہا مانو اور میرے خیال سے درگزرو ۔" یہ سن کر آپ بے تاب ہو جاتے ہیں اور گریہ و بکا شروع کر دیتے ہیں ۔ وہ رحم کھاتی ہے اور جلال الوزرا کے پاس جانے ، قصیدہ سنانے اور روپیہ حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے ۔ یہ اس رائے کو پسند تو کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں "میں جلال الوزرا کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کرسکتا ۔" کنیز یہ بزدلی دیکھ کر ناراض ہوتی ہے اور لاحول پڑھتی چلی جاتی ہے ۔

حضرت اپنی بے زری پر تاسف کرتے ہوئے گھر آتے ہیں ۔ اندر کی طرف سے دروازے کی دونوں زنجیریں چڑھا لی جاتی ہیں ۔ کمرے میں اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں ، دروازے کی طرف پیٹھ کرلی جاتی ہے اور دیوار کی طرف منہ ، اور کہتے ہیں کہ آج تمام رات مجھے اپنی بے زری پر رونا چاہیے ۔ آنسوؤں کا ایسا دریا بہایا جائے جس میں سفینۂ نوح تک غرق ہوجائے ، نالے ایسے شرر بار ہوں کہ فلک پر جا کر انجم رخشاں کی طرح چمکیں ۔

قصہ مختصر حضرت سرگرمی کے ساتھ اس معرکہ خیز کام میں

مصروف ہوجاتے ہیں ۔ اتنے میں سپیدۂ سحری چمکتا ہے اور سیمرغِ سحر جوئے شیر میں اپنی چونچ ڈال دیتا ہے ۔ ان کی آنکھ لگ جاتی ہے ۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ خود بدولت جلال الوزرا کے دربار میں کھڑے ہیں ، وہ مسند زرتار پر بیٹھا ہے اور ان سے دریافت کرتا ہے کہ حضرت خیر ہے ، آپ آج کس فکر میں بوتیار کی طرح خاموش ہیں ؟ حضرت جرأت کر کے پیش قدمی کرتے ہیں اور کنیز کے ساتھ اپنے عشق اور بے تابی کا سارا ماجرا سنا دیتے ہیں ۔ جلال الوزرا اسی وقت اپنے آدمی کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ کنیز کو خرید لاؤ اور لا کر ان کے حوالے کر دو ۔ آدمی جاتا ہے ،کنیز خرید لاتا ہے اور ان کے حوالے کر دیتا ہے ۔

عین اس وقت ان کی آنکھ کھل جاتی ہے ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نہ جلال الوزرا کا دربار ہے اور نہ وہ کنیز ہے ، تنہا پڑے ہیں ۔ خواب کی تعبیر کے لیے معبر کے پاس جاتے ہیں ، وہ تعبیر بیان کرتا ہے اور آجرت میں ان کی پگڑی پر قبضہ کر لیتا ہے ۔

اس تشبیب میں انوری نے ظریفانہ پیرایہ اختیار کیا ہے اور شروع سے آخر تک اسے خوب نباہا ہے ۔ یہی کیفیت ذیل کی تشبیب میں مشاہدہ کی جاتی ہے ۔

عید کی صبح ہے ، آپ چند دوستوں کے ساتھ عید دیکھنے کی غرض سے صحرا کا رخ کرتے ہیں ۔ چوں کہ سواری کا شوق ہے ، اس لیے زیر ران ایک گھوڑا بھی ہے لیکن کمزور ، دبلا اور مریل ۔ قدم قدم پر گرتا ہے ، اس کے ساتھ یہ بھی گرتے ہیں اور اٹھ کر اسے اٹھاتے ہیں اور پھر سوار ہوتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ کبھی یہ اسے اٹھاتے ہیں اور کبھی وہ انھیں اٹھاتا ہے اور اس طرح راستہ طے ہو رہا ہے ۔ یار لوگ چھیڑنا شروع کرتے ہیں ؛ ایک کہتا ہے میاں ذرا رکابیں ڈھیلی کر لو ، تمھاری ٹانگیں لمبی ہیں ۔ دوسرا کہتا ہے ذرا ایڑ تو لگاؤ ، دیکھیں تمہارے دُلدُل کی رفتار کیسی ہے ۔ یہ چپ ہیں ، شرمندہ بھی ہیں اور پریشان بھی ۔ کبھی ادھر دیکھتے ہیں ،

کبھی اُدھر جھانکتے ہیں کہ دیکھیں یہ کیا پھبتی سناتا ہے اور وہ کیا آوازہ کستا ہے -

اتنے میں ملازم دوڑا ہوا آتا ہے ، یہ پوچھتے ہیں : ''بھئی گھر میں خیریت تو ہے؟'' وہ کہتا ہے''کیسی خیریت ، تم تو گھوڑا اڑائے عید گاہ جا رہے ہو اور اس طرف اصلی عید (معشوق) گھر پر آئی ہے -'' یہ سنتے ہی ان پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی ہے - اس سے کہتے ہیں: ''لا ، گھر کی کنجیاں تو مجھے دے ، میں جاتا ہوں اور تو اس مردار پر سوار ہو جا اور آہستہ آہستہ گھر لے آ -''

قصائد میں ، بالخصوص اوصاف نگاری میں ، اس کی طرز زیادہ دقیق اور مشکل ہے - میں چند اشعار ، جو نہ زیادہ مشکل ہیں اور نہ آسان ، اس کی ایک تشبیب سے نقل کرتا ہوں :

ای ترک ! می بیار کہ عیدست و بہمن ست
ہنگام بادہ خوردن و شادی برزن ست[1]

ایام خز و خرگہہ گرم ست ازین سبب
خرگاہ آسمان ہمہ در خز ادکن ست

خالی مدار خرمن آتش ز دود عود
تا در چمن ز بیضۂ کافور خرمن ست

آن عہد نیست این کہ ز الوان گل چمن
گویی کہ کارگاہ حریر ملون ست

سلطان دی بہ لشکر صرصر جہان بکند
بینی کہ جور صرصر دی چون جہان کن ست

در خفیہ گر نہ عزم خروج است باغ را
چون آب گیرہا ہمہ پر تیغ و جوشن ست

نفس نباتی ار بہ عزب خانہ باز شد
عیبش مکن کہ مادر بستان ستردن ست

۱- ''غالب مشو نہ نوبت بازی و بر زنست''
(اشاعت نفیسی ، صفحہ ۵۳) (مرتب)

باد صبا کہ فحل بنات نبات بود
مردم گیاہ شد کہ نہ مرد ست و نہ زن ست
از جوش نشو ، دیگ نما تا فرو نشست
از دود تیرہ بر سر گیتی نہنبن ست

انوری اس روش خاص کے لیے مشہور ہے ۔ ان حالتوں میں وہ اکثر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہے اور اسی عالم میں اس کی جدت طرازی کا اصلی جوہر نمایاں ہوتا ہے ۔ میں ایک تشبیب سے اور مثال دیتا ہوں :

جرم خورشید چو از حوت درآید بحمل
اشہب روز کند ادہم شب را ارجل
کوہ را از مدد سایۂ ابر و نم شب
پر ظرائف شود اطراف چہ ہامون و چہ تل
ساعد و ساق عروسان چمن را بینی
ہمہ بربستہ حلی و ہمہ پوشیدہ حلل
پیش پیکان گل و خنجر برق[1] از پی آنک
تا نہ سازند بکین و نسگالند جدل
بر محیط فلک از ہالہ سپر سازد ماہ
بر بسیط کرہ از خوید[2] زرہ پوشد طل
وز پی آن کہ مزاجش نہ کند فاسد خون
سرخ بید از ہمہ اعضا بکشاید اکحل
باد با آب شمر آن کند اندر بستان
کہ کند با رخ آیینہ بسوہان صیقل
ہرکرا فصل دی از شغل نما غزلی داد
شحنۂ نفس نباتیش در آرد بعمل

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۱۸۳ "بید ۔" (مرتب)
۲ ۔ اشاعت نفیسی میں "سبزہ" بجائے "خوید ۔" (مرتب)

مرغزاری شود اکنون فلک و ابر درو
راست چونانکه‌توگویی همه‌ناقه است‌وجمل

میل[1] اطفال نبات‌از جهت قسوت و قوت
کرده یک روی به‌اعلی و دگر در اسفل

لیکن جوش و ہیجان ، صدمہ اور ارتعاش کی حالت میں اس کی روش ملائم ، سریع اور سہل ہو جاتی ہے ۔ کسی وزیر کی وفات کے موقع پر دیکھا جاتا ہے کہ شاعر فرط غم میں تکلف اور تصنع کے پردوں کو یک قلم اٹھا دیتا ہے ، اور ایک سادہ مگر شیریں طرز اختیار کرتا ہے ۔ خیالات وہی ہیں جو قدرتی طور پر انسان کے دل میں موجیں مارتے ہیں ۔ جذبات کا ارتعاش اور کیفیت قلب کا اضطراب جو بالکل حقیقی ہے ، ہر شعر سے ظاہر ہے ۔ تمہید کے چند اشعار پر قناعت کی جاتی ہے :

شهر پُر فتنه و پُر مشغله و پُر غوغاست
سید و صدر جهان بار نه دادست کجاست

دیر شد دیر که خورشید فلک روی نمود
چیست امروز که خورشید جهان ناپیداست

بارگاهش ز بزرگان و ز اعیان پُر شد
او نه بر عادت خود روی نهان کرده چراست

دوش گفتند که رنجور ترک بود ، آری
بار نادادنش امروز برآن قول گواست

پرده دارا تو یکی در شو و احوال ببین
تا چگونه است بهش هست که دلها درواست

ور ترا بار بود ، خدمت ما هم برسان
مردمی کن، بکن این کار که این کار شماست

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی "پیش ۔" (مرتب)

ور توانی کہ رہ بار ندہی بہ باشد
تا در آییم و سلامی بکنیم ار تنہاست

ور چنانست کہ حالیست نہ بر وفق مراد
خود مگو[1]، برگ نیوشیدن این حال کراست

کہ تواند کہ بہ اندیشہ برآرد ز جہان
کزجہان آن کہ جہان‌صد یک‌ازان‌بود جداست

وان کہ برخاست ازو رسم بدی تا بہ نشست
دامن عمر بیفشاند و بیک رہ برخاست

آفریدہ چہ کند گر نہ کشد بار قضا
کافرینش ہمہ در سلسلۂ بند قضاست

اجل از بار خدای اجل اندر نہ گذشت
گر تو گوی کہ ز من درگذرد این سوداست

اسی طرح جب بحث و استدلال کی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہے ، وہ اسی روش سے کام لیتا ہے ۔ ذیل میں تقدیر ایزدی کی ہمہ گیری اور انسانی مجبوری کے مسئلے پر گرم سخن ہے :

اگر محول حال جہانیان نہ قضاست
چرا مجاریِ احوال بر خلاف رضاست

بلی قضاست بہر نیک و بد عنان‌کش خلق
بدان دلیل کہ تدبیر ہای جملہ خطاست

ہزار نقش برآرد زمانہ و نہ‌بود
یکی چنان کہ در آیینۂ تصور ماست

کسی ز چون و چرا دم نمی تواند زد
کہ نقشبند حوادث ورای چون و چراست

بدست ما چوازین حل و عقد چیزی نیست
بعیش ناخوش و خوش‌گر رضا دہیم سزاست

(صفحہ ۳۸)

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۲۹ ''بگو ۔'' (مرتب)

آیندہ ابیات میں آفتاب غروب ہونے، رات آنے اور ستارے نکلنے کا ذکر ہے اور خلاف معمول تشبیہات سے زیادہ کام لیا گیا ہے :

نماز شام ز صحن فلک نمود مرا
عروس چرخ کہ بنهفت روی در چادر
بدان صفت کہ شود غرق کشتی زرین
بطرف دریا چو بگسستہ شد ازو لنگر
بگرد گنبد خضرا چنان نمود شفق
کہ گرد خیمۂ مینا کشیدہ شعشعہ[1] زر
ستارگان ہمہ چون لعبتان سیم اندام
بسوگ مہر بر افگندہ نیلگون معجر
بنات نعش همی گشت گرد قطب چنان
کہ گرد حقۂ پیروزہ گوهرین زیور[2]
بدان مثال همی تافت راہ کاہکشان
کہ بر بنفشہ ستان برکشیدہ صف عبہر
ز تیغ کوہ بتابید نیم‌شب پروین
چنان کہ در قدح لاجورد هفت درر
سپہر گفتی نقاش نقش مانی گشت
کہ هر زمان بنگارد هزار گونہ صور
ز برج جدی بتابید پیکر کیوان
بشکل شمع فروزندہ درمیان شمر
همی نمود درخشندہ مشتری در حوت
چنان کہ دیدۂ خوبان ز عنبرین معجر[3]

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی، صفحہ ۱۱۲ ''کشند شقۂ زر ۔'' (مرتب)

۲ ۔ اشاعت نفیسی ''چنبر ۔'' (مرتب)

۳ ۔ اشاعت نفیسی ''چادر ۔'' (مرتب)

ز طرف[1] میزان می‌تافت صورت مریخ
بدان صفت کہ میٔ لعل‌رنگ در ساغر
چنان کہ عاشق و معشوق در نقاب کتان
بتافت تیر درخشان و زهرهٔ ازهر
برسم لعبت بازان سپهر آینہ رنگ
زمان زمان بنمودی عجایب دیگر

(صفحہ ۱۸۱)

سفر کے محاسن :

سفر مربی مردست و آستانۂ جاہ
سفر خزانۂ مالست و اوستاد ہنر
دران زمین کہ تو در چشم خلق[2] خوار شوی
سبک سفر کن ازان جا برو بجای دگر
درخت اگر متحرک شدی ز جای بجای
نہ جور ارّہ کشیدی و نی جفای تبر
بشهر خویش درون بی‌خطر بود مردم
بکان خویش درون بی‌بہا بود گوهر[3]
بجرم خاک و فلک بر نگاه باید کرد
کہ این کجاست ز آرام و آن کجا ز سفر

(صفحہ ۲۱۴)

دوستوں کی جدائی :

بدامن مژه رفتن ز طرف خاری خس
بہ پلک چشم ستردن ز روی خارا خار

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی ''قلب ۔'' (مرتب)

۲ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۱۲۱ ''دران دیار کہ در چشم خلق ۔'' (مرتب)

۳ ۔ بقول پروفیسر سعید نفیسی یہ شعر امیر معزی کے ایک قصیدے میں بھی ملتا ہے ۔ (مرتب)

هزار لقمہ بدندان ربودن از دم شیر
هزار عقدہ بدندان کشودن از سرمار
بقعر چاہ فتادن ز آسان بلند
بفرق برشدن از دشت جانب کہسار
ازین مخاطرہ گر صد ہزار آید پیش
بہ از جدایی یاران ہزار بار ہزار

(صفحہ ۲۲۳)

غزل

انوری کے ہاں تغزل کا ذخیرہ سنائی سے بہتر حالت میں پایا جاتا ہے ، اگر چہ تصوف کی چاشنی نے ان کی غزل کو زیادہ بامزہ بنا دیا ہے ۔ انوری کے پاس عشقِ محض ہے ، جس میں سوز و گداز کی تاثیر غالب ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایرانی ذہنیت کے نزدیک عشق کا اصلی سرمایہ سوز و گداز ہے ۔ خمریات اور رندی کے مضامین صرف چند غزلوں میں نمودار ہیں ۔ وہ تصوف کے کوچے سے قطعاً نابلد ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے نہال کو سعدی پروان چڑھاتے ہیں لیکن ان سے پیشتر سنائی ، انوری ، خاقانی ، عطار اور مولانا روم کی کوششوں نے اس کی آبیاری میں بڑا کام کیا ہے ۔

میں انوری کی غزلوں کے بعض نمونے صرف تاریخی دلچسپی کے واسطے دیتا ہوں ، کیوں کہ عرصہ ہوا ہم اس پایے کے مذاق کو خیرباد کہہ چکے ہیں :

گر جان و دل بدست غم تو نہ دادمی
پای نشاط بر سر کیوان نہادمی
گر بیم زلف پرخم تو نیستی مرا
من کارهای بستہ خود برکشادمی

ور بر سرم نوشته نبودی قضای تو
شهری پر از بتان بتو چون اوفتادمی
گر بی تو خواست بود مرا عمر کاشکی
هرگز نه بودمی و ز مادر نه زادمی
(صفحه ۵۳۸)

بدان عزمم که دیگر ره به بت خانه کمر بندم
دل اندر وصل و هجران بتی بیدادگر بندم
برندی سر برافرازم به باده رخ بر افروزم
ره می خانه برگیرم در طامات بربندم
گرم یار خراباتی بکیش خویش بفریبد
بزنارش که در ساعت چو او زنار بربندم
(صفحه ۳۹۶)

تا رخت دل اندر خم زلف تو نهادیم
بر رخ ز غم عشق تو خونابه کشادیم
در آرزوی روی تو از دست برفتیم
و اندر طلب وصل تو از پای فتادیم
تو سر بخداوندی ما نیز فرود آر
در بندگی روی تو چون داد بدادیم
تا بسته بند اجل خویش نه گردیم
از بند غم عشق تو آزاد مبادیم
نی نی به اجل هم نرهیم از غم عشقت
با عشق تو میریم که با عشق تو زادیم (صفحه ۳۹۲)

باز دوش آن صنم عشوه فروش
شهری از ولوله آورد بجوش

صبح دم بود که می شد بوثاق
چون پراندوش نه بیهش نه بهوش
دست برکرده بشوخی از جیب
چادر افگنده ز شنگی بر دوش
لاله از تابش می پروین پاش
زهره از باد سحر سنبل پوش
دامن از خواب کشان در نرگس
دام دلها زده از مرزنگوش
پیش کارش قدحی باده بدست
او یکی چنگ خرش اندر آغوش
ای بسا شربت خون کز غم او
دوش گشتست بر آوازش نوش
روستایی بچه ای شهر بسوخت
کس درین فتنه نه باشد خاموش
(صفحه ۲۸۳)

مست از درم درآمد دوش آن مه تمام
در بر گرفته چنگ و بکف بر نهاده جام
گویی که لعل ناب و عقیق گداخته است
در جام او ز عکس رخ او شراب خام
بنشست بر کنار من و باده نوش کرد
آن ماه سرو قامت و آن سرو کش خرام
باچنگ در کنار بد اندر کنار من
مخمور[۱] تا بصبح سپید از نماز شام

---

۱ ـ اشاعت سی، صفحه ۵۴۴ "می خورد ـ" (مرتب)

در گوشه ای که کس نبد آگه ز حال ما
زان عشرت بغایت و زان مستی تمام

نی مطرب و نه ساقی و نی یار و نی حریف
او بود، انوری و می لعل والسلام

(صفحہ ۵۰۶)

شعرا غزل کے مقطع میں بالعموم اپنا تخلص لایا کرتے ہیں ۔ یہ دستور سنائی اور انوری کے دور سے پابندی کے ساتھ رائج ہے ۔

بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی

انوری کی شہرت کا راز زیادہ تر اس کی بدیہہ گوئی میں مضمر ہے ۔ اس پر اگر اس کی لطیفہ خوانی اور بذلہ سنجی، جس کے لیے اس کی موزوں طبیعت ہر وقت حاضر اور آمادہ تھی، اضافہ کی جائے تو اس کی غیر معمولی شخصیت کا، جو علم و فضیلت کے اوصاف سے آفتاب نصف النہار کی طرح ضیا بار تھی، کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

یورپ میں موجودہ زمانے میں "Scrap Books" کا رواج ہے، جنھیں سفینہ یا بیاض کے نام سے پکارا جا سکتا ہے ۔ شائقین اپنے احباب اور ملنے والوں سے کوئی نظم یا لطیفہ بطور یادگار اس میں لکھواتے ہیں ۔ خواتین میں یہ شوق زیادہ ہوتا ہے ۔ وہ ہر واقف ناواقف سے فرمایش کرتی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انوری کے عہد میں بھی یہ دستور کسی حد تک جاری تھا ۔ ایک دن وہ خواجہ فخری سے ملنے جاتا ہے ۔ خواجہ اپنا سفینہ دے کر اس سے نظم کی فرمایش کرتا ہے ۔ انوری وہیں بیٹھا بیٹھا بیس بیت کا ایک قطعہ لکھ دیتا ہے ۔ میں یہاں بخوف طوالت قطعے کے پہلے شعر اور آخری دو بیتوں پر قناعت کرتا ہوں :

ای برادر گر مزاج از فضلہ بیرون آمدی
آدمی پس یا ملک یا دیو بودی یا پری

خواجہ فخری ای مشامت بوی حکمت یافتہ
گر حکیمی زین معانی رنگ ھان تا ناوری
آنچہ حالی در خیال[1] آمد ھمین ابیات بود
کاندرین محضر بخط خویش بنوشت انوری

(صفحہ ۷۵۱)

یورپ میں کسی سے ملنے جاتے ہیں تو اطلاع کی غرض سے کارڈ بھیج دیا جاتا ہے ۔ انوری ایسے موقعوں پر اشعار سے کام لیتا ہے ۔ میں ایک آدہ مثال یہاں پر درج کرتا ہوں :

ای خداوندی کہ از ایام اگر خواھی بیابی
جز نظیر خویش دیگر ھر چت از خاطر برآید
کمترین بندگانت انوری بر در ستادہ
چون حوادث باز گردد یا چو اقبال اندر آید

(صفحہ ۶۷۶)

ای خاک درت سرمہ شدہ چشم و دلی را
از بس کہ کف پای تو بر خاک در آید
بر درگہ تو بندہ ستادہ است بخدمت
دستوری تو چیست رود یا کہ در آید

(صفحہ ۶۶۱)

اس کی لطیفہ خوانی کی بعض مثالیں اس سے قبل دی جاچکی ہیں ، یہاں چند اور اضافہ کی جاتی ہیں :

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۴۶۴ ”ضمیر ۔“ (مرتب)

کمال الزمان، سنجر کے عہد کا نہایت مشہور مغنی ہے ۔ انوری نئے ڈھنگ سے اس کا مرثیہ لکھتا ہے :

هرگز گمان مبر که کمال الزمان بمرد
کو روح محض بود بجسم فنا پذیر
می‌دان که ساکنان فلک سیر گشته اند
از مطربی زهره برین چرخ گنده پیر
خواهش گری بنزد کمال‌الزمان شدند
کو بود در زمانه درین علم بی نظیر
گفتند زهره را ز فلک دور کرده ایم
ای رشک جان زهره بیا جای او بگیر

ممالک اسلام میں محتسب کا فرض ہوتا ہے کہ عوام میں ظاہری بداخلاقی اور کھلم کھلا بے حیائی کے جرائم کا انسداد کرے ۔ اس قسم کے قانون شکنوں کو بغرض عبرت کسی چوک یا بازار میں سزا دی جاتی تھی ۔ شعرا کے طبقے میں محتسب ہمیشہ غیر ہر دل عزیز رہا ہے اور وجہ ظاہر ہے کہ شعرا مذہب سے آزاد ہوتے ہیں اور محتسب مذہب کا حامی ۔

انوری بازار میں ایک حسین عورت کو دیکھتا ہے ، جس کو محتسب کسی جرم کی پاداش میں سزا دے رہا تھا ۔ یہ واقعہ ذیل کے قطعے میں منظوم ہوتا ہے :

دی محتسبی براه دیدم | در دست گرفته چوب ارزن
مه رو زنکی گرفته می زد | نظاره برو ز بام و برزن
پرسیدم از آن میان یکی را | کان چوب چرا زند بران زن
گفتا زنکی ست روسپی تن | وین محتسبی ست روسپی زن

(صفحہ ۹۱ے)

پنج ارکان اسلام اور مسئلۂ ابتہاج :

یکی و پنج و سی وز بیست نیمی
وگر قدرت بود فرسنگکی چند

چو زین بگذشت ما و مطرب و می
کنہ از بندہ و عفو از خداوند (صفحہ ٦٦٩)

تقاضاے صلہ :

شعری بسان دیبۂ زربفت بافتم
وان گہ بسوی صدرِ مجیری[1] شتافتم
گرپرسدم کسی کہ زجودش چہ یافتی
ای آفتاب خواجہ[2] چہ گویم چہ یافتم (صفحہ ۷۰٦)

صلہ نہ ملنے کا گلہ :

شعر تر و خوب بندہ گوید انعام نصیب غیر باشد
این رسم نوآمدہ است امسال انشاءاللہ کہ خیر باشد

حسنِ طلب :

شد مدتی کہ عہد زمین بوس تازہ کرد
در خدمت مبارک میمونت انوری
واکنون بر آستانۂ میمونت[3] روز و شب
کش آستانہ[4] باد پر از ماہ و مشتری
از لطف شامل تو طمع دارد این قدر
کاخر چہ می کنی وکجائی ، چہ میخوری
(صفحہ ۷۳۹)

شراب یا سرکہ :

بزرگوارا دانی کز آفت نقرس
ز ہرچہ ترشی من بندہ می بپرہیزم

۱ - اشاعت نفیسی ، صفحہ ٦٢۴ ''صدر محرر۔'' (مرتب)
۲ - اشاعت نفیسی ''آفتاب جود ۔'' (مرتب)
۳ - اشاعت نفیسی، صفحہ ۴٦۴ ''عالیست ۔'' (مرتب)
۴ - اشاعت نفیسی ''آسمانہ ۔'' (مرتب)

شراب خواستم و سرکہ کہن دادی[1]
کہ گر خورم بقیامت مصوص برخیزم
شراب دار تو آخر کجاست تا قدحی
بگوش و بینیِ آن قلتبان فرو ریزم

ایک خشک جواب :

مرا پیام فرستی کہ من بہ پرسش تو
چو چشم دارم بر من سلام چون نہ کنی
کشند پای بدامن درون بلی شعرا
چو دست بخششت از آستین برون نکنی[2]

اخلاقیات

اخلاقی تعلیم کا ذخیرہ انوری کے ہاں کم ہے لیکن جو کچھ ہے ، اس پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دائرے میں بھی اس نے اپنی زبردست شخصیت کی مہر لگا دی ہے اور نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کا درس جو مذہبیت کے اثر سے معرا ہے اور نہ دوسرے شعرا کی طرح قومی یا ملکی رسوم و قیود کی روایات کا پابجولاں ہے ، صرف انسانی آزادی ، حرمت نفس اور خود داری کا نصب العین پیش کرتا ہے ۔

انوری اس دبستان فکر کا موسس ہے ، جسے ابن یمین نے اپنی نظموں میں بہت کچھ نشو و نما اور ترقی دی ، لیکن جس کو ہماری مشرق آب و ہوا نے کبھی فروغ اور اشاعت کا موقع نہیں دیا ۔ ابن یمین اس میں شک نہیں اس موضوع کی نشر و اشاعت میں ایک

۱ - اشاعت نفیسی ، صفحہ ۴۳۲ :
''شراب خواستہ ام سرکہ ام فرستادی '' (مرتب)
۲ - صفحہ ۴۷۳ ، دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ۔ (مرتب)

بڑی حد تک انوری کا مرہون منت ہے۔

انوری کہتا ہے انسان کا اصلی لباس آزادی ہے لیکن امید و بیم نے خلق کو خلق کا مسخر اور مقیّد کر دیا ہے۔ اپنے جیسے انسان کے پاس امید لے کر جانا اپنی عزت نفس کو خوار کرنا ہے۔ یاد رکھو احسان اٹھانا کاہش روح ہے۔ عذاب برداشت کرنا یا جہنم میں پھینک دیا جانا سوال کی ذلت اٹھانے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ہزار بار قابل ترجیح ہے۔

اپنی آنکھوں کے خون میں روٹی ڈبو کر کھانا، دوسرے کے گھر سے سرکہ مانگ کر کھانے سے بہتر ہے۔ آدمی کو چاہیے دوسرے کا متوسل اور دست نگر نہ ہو۔ جو شخص کسی کا دست‌نگر نہیں، وہی آدمی ہے ورنہ کس اور خس میں کچھ فرق نہیں۔ تم میں اگر کچھ دینے کی طاقت نہیں تو کچھ پروا نہیں لیکن کوشش کرو کہ نہ لینے کی طاقت برقرار رہے۔ دوسرے کا احسان اٹھا کر اگر تم مال دار بھی ہو گئے تو کیا اس سے تمھیں روحانی نقصان نہیں پہنچے گا؟

آئین حکومت ہر قوم کا ذہنی و عقلی نصب‌العین رہا ہے اور ہر قوم نے اپنی ذہنیت کے مطابق اس کی حرمت اور تائید میں آرا کا اظہار کیا ہے، لیکن انوری نے انسانی آزادی اور استغنا کے اصول کو اس کے انتہائی مدارج تک پہنچاتے ہوئے اس آئین کو گدائی کی اقسام میں شامل کیا ہے۔ وہ گویا ہے کہ "بادشاہی کیا ہے؟ گدائی ہے۔ بادشاہ ہر شخص کا محتاج ہے۔ اس کا سامان سلطنت، تمھیں معلوم نہیں کہاں سے آیا ہے؟ سنو! اس کے گلے کے موتی ہمارے بچوں کے آنسو ہیں اور لعل و یاقوت ہمارے یتامیٰ کا خون ہے۔ وہ ہمارا پانی پیتا ہے اور ہماری روٹی کھاتا ہے۔ عُشر اور خراج کیا ہے؟ گدائی ہے۔ کیا ایک چیز کے دس نام نہیں ہوتے؟ مختصر یہ کہ ہر قسم کی ضرورت گدائی ہے اور مانگنے والا، عام اس سے کہ حضرت سلیمان[۴] ہوں یا قارون، فقیر ہے۔

کسی کو دینا بے شک طریق احسان ہے لیکن نہ لینا اس سے بھی بڑا احسان ہے اور مشکل بھی ہے ۔ دینے میں جس قدر مروت ہے ، نہ لینے میں ہزار درجہ زیادہ مروت ہے ۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور کسب حلال سے روزی پیدا کرو ، جاہل صوفیوں کی طرح روزینہ‌دار نہ بنو ۔"

آدمی کو بے نیاز اور آزاد بنانے کے لیے انوری کی یہ تلقین ہے اور اس کا آخری قول ہے :

آزادگی ست حلۂ مردان و انوری
آن دست گاہ کو کہ من آزاد مردمی (صفحہ ۱۴۷)

اور معاملات میں کہتا ہے کہ صبر و شکر ایسی نعمتیں ہیں جو سلاطین کو بھی نصیب نہیں ۔ جب ہمیں اس قدر مل رہا ہے جو ہماری ضروریات کو اکتفا کرتا ہے تو اس پر قانع رہنا چاہیے ۔ قناعت بہترین کیمیا ہے ۔ تمھارے پاس اوصاف اضافی مثلاً دولت و مال نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ، کوشش کرو کہ تمھارے طبعی اوصاف یعنی اخلاق درست ہوں ۔ تمھارا سلوک بنی نوع کے ساتھ ایسا ہو کہ وقت پر سب تمھارے رنج کو اپنا رنج سمجھیں ۔ دو باتوں میں سے ہمیں ایک کام کرنا چاہیے ؛ یا دوسروں کو فائدہ پہنچائیں یا ان سے فائدہ اٹھائیں ۔

لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کی اخلاق شاعری کا نمونہ ناظرین کے سامنے پیش کروں ۔

صفائیِ اخلاق :

صفہ ای را نقش می بستند استادان چین
بشنو این معنی کزین خوشتر حدیثی نشنوی
اوستادی نیمہ ای را کرد همچون آیینہ
اوستادی نیمہ ای را کرد نقش مانوی
ای برادر خویشتن را صفہ ای دان همچنان
هم بہ سقف نیک عالی هم بہ بنیاد قوی

باری ار آن لیمهٔ پر نقش نتوانی شدن
جهد آن کن تا مگر آن لیمهٔ دیگر شوی

(صفحہ ۷۵۴)

شاہی و گدائی :

آن شنیدستی کہ روزی زیرکی با ابلہی
گفت کین والیِ شہر ما گدای بیحیاست
گفت چون باشد گدا آن کز کلاهش تکمہای
صد چو ما را روزها بل سالہا برگ و نواست
گفت ای نادان غلط اینک ازین جا کردہ ای
آن ہمہ برگ و نوا دانی کہ آنہا از کجاست؟
دُر و مروارید طوقش اشک اطفال من است
لعل و یاقوت ستامش خون ایتام شماست
آن کہ تا آب سبو پیوستہ از ما خواستہ است
گر بجویی تا بمغز استخوانش نان ماست
خواستن گدیاست خواهی عشرخوان خواهی خراج
زان کہ گردہ نام باشد یک حقیقت را رواست
چون گدایی چیزی دیگر نیست جز خواہندگی
ہر کہ خواهد گر سلیمان ست وگر قارون گداست

(صفحہ ۶۲۳)

رنج و راحت کی بے ثباتی :

در حدود ری یکی دیوانہ بود
روز و شب کردی بسوی دشت گشت
در تموز و در بہار و در خزان
سوی بازار آمدی از سوی دشت[1]

---

۱ - اشاعت نفیسی (صفحہ ۳۶۲) میں یہ شعر اس طرح درج ہے :
در تموز و دی بسالی یک دو بار
آمدی در قلب شہر از طرف دشت (مرتب)

گفتی ای آنانکه عیش آماده اید
هر زمانی زیر این زرینه طشت
قاقم و سنجاب در سرما سه چار
توزی و کتان بگرما هفت و هشت
گر شما را با نوایی بد چه شد
ور چه مارا بی نوایی بد چه گشت
راحت هستی و رنج نیستی
بر شما بگذشت و بر ما هم گذشت
(صفحه ۶۰۳)

حسنِ معاشرت :
در جهان با مردمان دانی که چون باید گذاشت
آن قدر عمری که یابد مردم آزاد مرد
کاستینها در غم او تر کنند از آب گرم
فی‌المثل گر بگذرد بر دامن او باد سرد[1]

سوال و طمع کی ذلت :
بودن اندر عذاب چون جرجیس
یا شدن در جحیم چون ابلیس
بهتر ست از سوال کردن و طمع
وایستادن به پیش مرد خسیس (صفحه ۶۸۵)

قناعت سب سے بہتر کیمیا ہے :
کیمیای ترا کنم تعلیم
که در اکسیر و در صناعت نیست
رو قناعت گزین که در عالم
کیمیای به از قناعت نیست

---

۱ - صفحه ۳۷۱ ، دیوان انوری ، مرتبه سعید نفیسی - (مرتب)

منت پذیری کے خلاف تلقین :

آلودهٔ منت کسان کم شو
تا یک شبه در و ثاق تو نان ست
ای نفس برستهٔ قناعت شو
کانجا همه چیز نیک ارزان ست
تا بتوانی حذر کن از منت
کین منت خلق کاهش جان ست
زین سود چه سود اگر شود اکنون[1]
در مایهٔ نفس عین نقصان ست
در عالم تن چه میکنی هستی
چون مرجع تو بعالم جانست
چندان که مروت ست در دادن
در نا ستدن هزار چندان ست

(صفحه ۶۲۳)

وقت کی قدر :

روز را رایگان ز دست مده
نیست امکان آن که باز رسد

(صفحه ۶۷۳)

راحت میں شکر نہ کرنا اور تکلیف میں شکایت کرنا انصاف پسندی نہیں :

روزی که فلک جبهٔ درویش گرفتی
از فضلهٔ زنبور برو دوختمی جیب
اکنون همه شب منتظرم تا بفروزند
شمعی که بهر خانه چراغی نهد از غیب

---

۱ - اشاعت نفیسی ، صفحه ۳۵۳ "فزون ـ" (مرتب)

آن روز فلک را چو دران شکر نه گفتم
امروز درین زشت بود گر کنمش عیب[1]

(صفحہ ۵۸۹)

یعنی پہلے میں اس قدر مال دار تھا کہ جب دھوپ نہ ہوتی اور آفتاب غائب رہتا تو میں موسی شمعیں جلا لیتا ، اب میں اس قدر غریب ہوں کہ گھر میں روشنی کے لیے چاند کا منتظر رہتا ہوں۔

خدا پر بھروسا :

خدای کار چو بر بندۂ فرو گیرد
ہر چہ دست زند رنج دل بیفزاید
وگر بطمع شود زود نزد همچو خودی
ز ہر چیزی خوار و نژند باز آید
چو اعتقاد کند کز کسش نیاید خیر[2]
خدای قدرت والای خویش بنماید
بدست بنده ز حل و ز عقد چیزی نیست
خدای بندد کار و خدای بکشاید (صفحہ ۴۴۶)

کوئی واقعہ بیان کر کے اس کی استدلالی قوت کے اعتماد پر اخلاق نتیجہ ترتیب دینا معلمین اخلاق کا پرانا دستور رہا ہے۔ اس طریق میں وصف یہ ہے کہ مستمع پر اس قسم کی نصیحت کا محض سرسری موعظت کے مقابلے میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر کڑوی گولیوں کو شکر میں ملفوف کر کے ہمیں آسانی سے کھلا دیتا ہے ، اسی طرح معالجِ اخلاق ان فرضی قصوں کے ذریعے سے پند و موعظت کی تلخی کو قند و نبات بنا دیتا ہے۔ انوری کی تلقین میں یہ وصف زیادہ نمایاں ہے جیسا کہ گزشتہ امثال سے ظاہر

---

۱ - ''امروز نشاید کہ بدین هم کنمش عیب'' اشاعت نفیسی، صفحہ ۳۲۵- (مرتب)

۲ - اشاعت نفیسی ، صفحہ ۴۰۲ ''نیاید چیز۔'' (مرتب)

ہے - یہاں ایک اور مثال دی جاتی ہے جو شاعری کی مذمت سے علاقہ رکھتی ہے -

انوری کا شمار شعر کے اقالیم ثلاثہ میں کیا جاتا ہے ، لیکن با وصف اس کے وہ شاعری کا زبردست مخالف ہے - اس کی رائے میں شاعری کا پیشہ خاکروب کے پیشے سے بھی زیادہ ذلیل اور کثیف ہے - وہ کہتا ہے میں نے ایک حلال خور سے دریافت کیا کہ بھائی ہمارا تمھارا پیشہ جیسا کچھ ہے معلوم ہے ، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو اور میں ناکام ہوں - خاکروب کہتا ہے کہ اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ میں تمھارے مقابلے میں زیادہ با کمال ہوں یا تم میرے مقابلے میں بے ہنر ہو - اصلی وجہ قدردانی ہے - میرے آقا کو میرے ہنر کی قدر ہے ، اس لیے میرے کام کو رونق ہے، لیکن تمھارے آقا کو تمھارے کام کی کوئی قدر نہیں ، وہ یہی سمجھتا ہے کہ تمھارا کام وہی معمولی ہے جو سدا سے ہوتا آیا ہے - پھر وہ یہ بھی خیال کرتا ہے کہ ان عالم لوگوں کے کارنامے بازاری جنس کی طرح بالکل عام ہیں اس لیے وہ کیوں قدر کرنے لگا ، اس کو تمھاری کاوش جگر کی کیا خبر :

با یکی مردک کناس همی گفتم دوش
تو چه دانی که ز غبن تو دام چون خسته است
صنعت و پیشهٔ ما هر دو همی دانی چیست
آن چرا تیز رود وین ز چه رو آهسته است
گفت از عیب خود و از هنر ما مشناس
زین که ما را ز چنار آتش و از نی[1] جسته است
کار فرمای دهد رونق کار من و تو
داند آن کس که دمی بامن و تو بنشسته است

---

۱ - اشاعت نفیسی ، صفحہ ۳۴۰ ”آتش رزق -“ (مرتب)

کار فرمای مرا پایهٔ من معلوم ست
لاجرم کار من از بند تقاضا رسته است
باز چون گاو خراس از تو و از پایهٔ تو
کار فرمای ترا دیده چنان بربسته است
که چنان ظن برد او کانچه تو ترتیب کنی
کردهٔ دایم و پرداختهٔ پیوسته است
یا چنان داند کاین عمر عزیز علما
همچو روز و شب جهال متاع رسته است
او چه داند که دران شیوه چه خون باید خورد
که ترا از سر بیداد در آن پی خسته است
انوری هم ز تو بر تست که بر شاخ درخت
عقل داند که ستمهای تبر از دسته است

(صفحه ۶۰۹)

بوعلی اور فردوسی :

انوری بہر قبول خلق تا کی ننگ شعر
راه حکمت رو قبول عامه گو هرگز مباش
رفت هنگام غزل گفتن دگر سردی مکن
راویان[1] را گرمیِ هنگامه گو هرگز مباش
تاج حکمت با لباس عافیت باشد بپوش
جان چو کامل شد طراز جامه گو هرگز مباش
در کمال بوعلی نقصان فردوسی مگیر
هر کجا آمد شفا ، شهنامه گو هرگز مباش

(کلیات قلمی)

شعر اور شرع :

---

۱ - اشاعت نفیسی ، صفحه ۳۱۳ "عاشقان ـ" (مرتب)

کسی کہ مدت سی سال شعر باطل گفت
خدای بر ہمہ کامیش داد پیروزی
کنون کہ روی نہد جملہ در حقیقت شرع
چہ اعتقاد کنی باز گیردش روزی
برو کہ عاقل ازین اختیار آن بیند
کہ کشت تشنہ نہ بیند ز ابر نوروزی
ز شعر نقش[1] تو آن بارہای عار کشید
کہ چون ہلال بطفلی در آمدش کوزی
ز شرع جان تو آن شعلہ ہای نور زند
کہ تو بہر فلکی آفتابی افروزی
تو رای شرع[2] بہ آخر بری ہمی و خطاست
چو عین شعر بہ آخر بری بیاموزی

(صفحہ ۷۳۷)

جس وقت انوری کا آفتاب شاعری طلوع ہوا ہے ، خراسان کا سیاسی مطلع انتہائی تاریکی میں تھا ۔ اس دور انقلاب میں انسانی قسمت کا ساغر آلام و آزار اور شدائد کی شراب سے لبریز تھا ۔ عنان حکومت غیرمتمدن اور وحشی اقوام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی ، جن کے اوضاع و اطوار سباع کے اوضاع و اطوار سے کم نہ تھے ۔ پرانے درباروں کے چراغ گل کر دیے گئے تھے ۔ ان کے بجائے ایسے دربار قائم ہوئے تھے جن کے راس الرؤسا اکثر نو کاسہ اور نوکیسہ تھے ۔ ان کے مشاغل اور مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھے ۔ ندیمی کا قابل عزت پیشہ اجلاف اور اراذل کے ہاتھ میں چلا گیا تھا ، جن کے نزدیک ندیم اور مسخرہ ایک ہی معنی رکھتا تھا ۔ اہل علم و ارباب کمال ہر طرف خوار پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا تک نہیں تھا ۔

---

۱ ۔ اشاعت نفیسی ، صفحہ ۷٦۳ ''نفس ۔'' (مرتب)
۲ ۔ اشاعت نفیسی ''شعر ۔'' (مرتب)

ہزال ، رنود اور مطربوں کی گرم بازاری تھی ۔ انوری ان واقعات اور جذبات عصری کا مرقع اپنی مختلف نظموں میں کافی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ چناں‌چہ اہلِ عصر کی بدتمیزی :

ربع مسکون آدمی را بود دام و دد گرفت
کس نمی داند کہ در آفاق انسانی کجاست

دور دور خشک سال و قحط دین و دانش ست
چند گوئی فتح بابی کو و بارانی کجاست

من ترا بنایم اندر حال صد بو جہل جہل
گر مسلمانی ، تو تعیین کن مسلمانی[1] کجاست

آسمان بیخ کمال از خاک عالم برکشید
تو زنخ می زن کہ در من گنج نقصانی کجاست

خاک را طوفان اگر غسلی دھد وقت آمدہ است
ای دریغا ! داعیِ چون نوح و طوفانی کجاست

(صفحہ ۶۱۷)

منصبِ ندیمی کی توہین :

نشاید بہر آداب ندیمی
دگر بر جان و دل زحمت نہادن

زبان کردن بہ نظم و نثر جاری
ز خاطر نکتہ ھای بکر زادن

کہ باز آمد ھمہ کار ندیمان
بہ سیلی خوردن و دشنام دادن[2]

مسخروں اور مطربوں کی قدر اور علوم کی بے قدری :

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم
تا در طلب راتب ھر روزہ نمانی

۱- اشاعت نفیسی ، صفحہ ۳۳۹ ''کہ سلمانی ۔'' (مرتب)
۲- صفحہ ۴۴۲ ، دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ۔ (مرتب)

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا داد خود از ہر کس و نا کس[1] بستانی

کمال کی کساد بازاری :

ہر کس کہ جگر خورد و بمردی ہنر آموخت
در دور قمر گو بنشین خون جگر خور
نزدیک کسانی کہ بصورت چو کسی اند
با صورت[2] ایشان نفسی بر زن و برخور
پیغام زنی آر و ہمہ اطلس و خز پوش
یا مسخرہ باش و ہمہ حلوای شکر خور[3]

(صفحہ ۶۷۹)

شعر کی بے قدری :

خاطری چون آتشم ہست و زبانی ہمچو آب
فکرت تیز و ذکای نیک و شعری[4] بی خلل
ای دریغا ! نیست ممدوحی سزاوار مدیح
وی دریغا نیست معشوقی سزاوار غزل

(صفحہ ۶۹۴)

مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم اُن ایام کی اخلاقی پستی اور ابتذال کا کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ ساتھ ہی انوری کے دلی جذبات کا حال بھی معلوم کر سکتے ہیں ۔ ایسے خیالات کے مالک کو ہم کسی حالت میں دنی الطبع ، سفلہ مزاج اور تنگ ظرف نہیں

۱۔ ''از کہتر و مہتر'' اشاعت نفیسی ، صفحہ ۴۷۱ ۔ (مرتب)

۲۔ ''سیرت'' صفحہ ۴۰۹ ، اشاعت نفیسی ۔ (مرتب)

۳۔ ''اشاعت نفیسی میں :

''پیغام زنان می بر و دیبای بزر پوش
یا مسخرگی می کن و حلوای شکر خور

(مرتب)

۴۔ اشاعت نفیسی صفحہ ۴۲۰ ''دنی رام و طبعی'' ۔ (مرتب)

کہہ سکتے ۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ مولانا شبلی کی نگاہ میں انوری کے اخلاق کا معیار نہایت پست ہے ۔ اس کی مہاجات کی بنا پر مولانا نے اس کی نسبت ایک نہایت مذموم رائے قایم کی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ ہجو اس کے ہاں ایک اتفاق ہے ۔ اس کا اخلاق معیار معاصرین سے نہایت بلند تھا ۔ بیس سال تک وہ ایک ثقہ ، متین اور سنجیدہ شاعر کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن معاش کی طرف سے ناکام رہتا ہے ، اس لیے کہ اس کے اخلاق تفوق نے اس کے اور اس کے معاصرین کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی ۔ آخر وہ یہ راز معلوم کرلیتا ہے اور آیندہ کے لیے اپنے نصب‌العین میں تبدیلی کا عازم ہوتا ہے ۔ چناں‌چہ کہتا ہے :

چہ آبروی بیفزایدم ز مدح و غزل
چرا بآتش فکرت همی بکاهم روح[1]

بیاد بوک و مگر بست سال بردادم
مرا خدای نہ داد ست زندگانی نوح

عنان طبع ازین پس کشیده خواهم داشت
اگر کشاده نہ بینم در قبول فتوح

وگر عطا نہ دهندم بر آرم از پس مدح
بلفظ هجو دمار از سر چنین ممدوح

یہ قرارداد اس کی اخلاق بندشوں کی بہت سی گرہیں کھول دیتی ہے اور مستقبل اس میں وہی تغیر دیکھتا ہے جو عبید زاکانی بہ اقتضائے وقت و زمانہ انوری سے دو قرن بعد اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اخلاقی انقلاب آیندہ زندگی میں اس کو کامیابی کی شاہراہ پر لگا دیتا ہے ۔

۱۔ دیکھیے صفحہ ۳۶۶ ، دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ۔ (مرتب)

کلیات انوری طبع نولکشور

یہ ہمارے ملک کی بد نصیبی ہے کہ باوجود فارسی زبان کی قدر اور رواج کے فارسی کتب کی طبع کا انتظام ہمارے ہاں نہایت ناقص ہے ۔ اس کے لیے ہم یورپ اور ایران میں کافی بد نامی اٹھا چکے ہیں اور اٹھا رہے ہیں ، لیکن اب تک ہمیں فارسی کتابوں کا صحیح چھاپنا نہیں آیا ۔ گزشتہ قرن میں کلکتہ ، لکھنؤ ، کان پور اور دہلی سے بہ لحاظ طباعت و صحت اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں ۔ مگر ہم نے ایک صدی بعد ترقیِ معکوس کی ہے اور یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں کہ موجودہ صدی میں کتاب اسی قدر زیادہ غلط چھپتی ہے جس قدر قرن ماسبق میں صحیح چھپتی تھی ۔

کلیات انوری سب سے پہلے تبریز میں ۱۲۶۶ھ میں چھپا تھا ، دوسری مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۹۷ھ میں نول کشور پریس سے شائع ہوا ۔ اسی اشاعت کی دوبارہ تجدید اسی مطبع سے ۱۳۰۶ھ میں ہوئی ۔

منشی نول کشور کی پہلی اشاعت تبریزی نسخے سے منقول ہے ۔ اس کے علاوہ اس میں منشی برج موہن لال خلف بابو بہاری لال متوطن دہلی کے ایک قلمی نسخے سے بھی امداد لی گئی ہے ۔ اس کلیات میں اہل مطبع ایک عجیب غلطی کے شکار ہوگئے ہیں ۔ اس میں بعض ایسے قصائد بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو انوری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور نہ انوری کے وطن اور عہد میں لکھے گئے ، بلکہ ہندوستان میں ۔

یہ قصائد جن کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں ، سلطان شمس الدین التتمش (۶۰۷ھ و ۶۳۳ھ) اور اس کے فرزند رکن الدین فیروز کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک قدیم ہندی شاعر ''تاج ریزہ''

نامی کی یادگار[1] ہیں جو بہ لحاظ زمانہ امیر خسرو دہلوی سے مقدم ہے ۔ اس عہد کے ہندی نژاد شعرا کا سراغ، اگرچہ وہ کافی تعداد میں موجود تھے ، بہت کم ملتا ہے ۔ اس لیے میں اس غلطی کا جس نے ہمارے وطن کے ایک قدیم شاعر کا پتا دیا ، بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں ۔

اس قسم کی غلطی متاخرین کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی ، بلکہ قدیم زمانے میں عمل میں آئی ہوگی ۔ فہرست (کتب قلمی فارسی) برٹش میوزیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی انوری کے ایک کلیات میں یہی غلطی موجود ہے ۔

ذیل میں ان قصائد کی ایک فہرست دی جاتی ہے جو اس قدیم شاعر کی یادگار ہیں :

(۱) مژده عالم را ز عالم آفرین آورده اند
ز آنکه شه را از خلیفه آفرین آورده اند
ناصر الاسلام مستنصر که طوق طاعتش
ز آسمان در گردن اهل زمین آورده اند

(صفحہ ۱۳۳)

قصیدۂ ھذا شاعر نے اس وقت لکھا ہے جب سلطان شمس الدین التتمش کے پاس خلیفہ المستنصر باللہ (۶۲۳ھ و ۶۴۰ھ) کا سفیر دہلی آتا

۱ - ''نسخہ کامل از دیوان انوری کہ بنام ''قصاید انوری'' در ۶۹۷ صحیفہ وزیری در چاپخانہ نولکشور لکھنؤ در ماه مارچ ۱۸۸۹ مطابق ماه رجب ۱۳۰۶ چاپ آن بپایان رسیده و از روی نسخۂ کاملی چاپ کرده اند اما گاهی اشعاری را که از انوری نیست و از سید سراج الدین سگزی شاعر قرن هفتم مقیم هندوستان است ندانسته درمیان سخنان انوری داخل کرده اند و پیداست که دو نسخه بیک دیگر پیوسته از دیوان انوری و سید سراج الدین بوده و تشخیص نداده اند و اشعار سید را نیز داخل اشعار انوری کرده اند ۔''

(مقدمۂ دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی، صفحہ ۵۳) (مرتب)

ہے اور اس کی آمد کی خوشی میں تمام شہر کی آئین بندی کی جاتی ہے ۔ طبقات ناصری سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیر دوم ربیع الاول ۶۲۶ھ کو دہلی پہنچتا ہے ۔

قصیدے سے واضح ہوتا ہے کہ تحائف میں پادشاہ کے لیے خلعت اور ایک تازی گھوڑا بھی تھا ۔ طبقات ناصری میں گھوڑے کا ذکر نہیں ہے :

شادیِ عام ہست در شہر این کہ بہر شہریار
خلعت خاص امیرالمومنین آوردہ اند

خلعتی یا رب چگونہ چون عروس آراستہ
راست بر بالای شاہ را آستین آوردہ اند

مرکبی کاندر روانی آب را مائد روان
یا مگر باد صبا را زیر زین آوردہ اند

مرکبی زین سان مبارک ، خلعتی میمون چنین
از برای ظل یزدان شمس دین آوردہ اند

حامی آفاق التتمش[1] کہ عزم و حزم او
گرد بر گرد جہان حصن حصین آوردہ اند

(صفحہ ۱۳۳)

آئین بندی کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے :

خسروا از رشک صورتہا[2] کہ بر ایوان تست
چین در ابروی نکو رویان چین آوردہ اند

صحن درگاهت بہ نزہت گلستانی شد کزو
خار خاری در دل خلد برین آوردہ اند

۱۔ صحیح تلفظ التتمش ہے جیسا کہ شعر ہذا میں مذکور ہے ، نہ التمش جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے ۔ (حاشیہٴ مصنف)

۲۔ مکانات پر نقاشی کا رواج ایران میں غزنوی اور سلجوق دور میں عام تھا ۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ رسم ہندوستان میں بھی آ گئی تھی ۔ (حاشیہٴ مصنف)

شہر را از شش جہت در زر و زیور بستہ اند
قبّہا سر بر سپہر ہفتمین آوردہ اند

(صفحہ ۱۳۴)

(۲) ساقی بیا کہ وقت می لعل روشن ست
میدان خاک تیرہ کنون سبز گلشن است

(صفحہ ۸۵)

یہ قصیدہ غیاث الدین محمد شاہ کی تعریف میں ہے ، چناں چہ :

عادل غیاث دین کہ بیک تن گہہ وغا
از بہر قصد جان عدو صد تہمتن ست
فرمان دہ زمانہ محمد شہ آن کہ ملک
از رای او چو روی عروسان مزین ست

(صفحہ ۸٦)

انوری کے عہد میں دو غیاث الدین گزرے ہیں ؛ پہلا غیاث الدین محمد سلجوقی المتوفیٰ ۵۵۴ھ ، دوسرا غیاث الدین محمد غوری برادر معظم شہاب الدین غوری ، لیکن میں ان دونوں سے اعراض کر کے التتمش کے فرزند غیاث الدین کے نام یہ قصیدہ مانتا ہوں[1] - ذیل کے شعر میں "سیر" اور "من" ہندی الفاظ ہیں اور ان ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں - چنانچہ :

خیز از می قدیم مرا سیر کن برطل
بگذر ازین حدیث کہ یک سیر و یک مَن ست

(صفحہ ۸٦)

انوری کا ان الفاظ سے واقف ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے -

۱- پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان انوری میں یہ قصیدہ صفحہ ۵۵ - ۵٦ پر درج ہے - (مرتب)

(۳) ساقی بیار باده که نوروز عالم ست
روز خجسته چون رخ شاه معظم ست

(صفحه ۸۳)

قصیدۂ هذا رکن الدین فیروز بن سلطان شمس الدین التتمش کی تعریف میں ہے[۱]۔ چنانچہ شعر :

فیروز شاه کعبۂ اقبال رکن دین
کز خاک پای او اثر آب زمزم ست

(صفحه ۸۴)

(۴) افزود باز رونق هر مرغزار گل
چون زیر یافت نالۂ هر مرغزار گل

(صفحه ۲۶۴)

یہ قصیدہ[۲] بھی التتمش کے فرزند غیاث الدین محمد کی مدح میں ہے اور اس کا نام موجود ہے۔

(۵) ای راستی که در دل لیل و نهار یافت
مانا که ز اعتدال مزاج بهار یافت

(صفحه ۸۱)

یہ بھی[۳] رکن الدین فیروز مذکور الصدر کی ستائش میں ہے اور اس کا نام مذکور ہے۔

(۶) این منم کز دیده یاقوت روان آورده ام
بیدلان را از سخن قوت روان آورده ام

(صفحه ۳۰۶)

۱۔ پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان انوری میں یہ قصیدہ داخل ہے اور صفحہ ۵۱ - ۵۲ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

۲۔ ملاحظہ ہو دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی، صفحہ ۱۹۳ - ۱۹۴ - (مرتب)

۳۔ دیکھیے دیوان انوری، اشاعت سعید نفیسی، صفحہ ۶۲ - ۶۴ ۔(مرتب)

یہ[1] بھی رکن الدین فیروز شاہ کی تعریف میں ہے۔

(۷) بیدلان را روی تو آئینۂ جان آمده است
وز لب و دندان تو لولو و مرجان آمده است

(صفحہ ۸۷)

یہ قصیدہ نظام‌الملک قوام الدین محمد جنیدی کی تعریف میں ہے جوشمس‌الدین التتمش اور رکن الدین فیروز شاہ کا وزیر رہا ہے۔ اس کا نام ان ابیات میں آتا ہے:

آصف ثانی نظام الملک دستور جهان
کز کمال کامگاری چون سلیمان آمده است
صاحب عادل قوام الدین محمد کز شرف
چون محمد زبدهٔ ترکیب ارکان آمده است

(صفحہ ۸۸)

اس کا جنیدی ہونا اس شعر سے ظاہر ہے:

گوهر آل جنیدی وز کرامتهای تو
مالک‌دینار شد هر کو سخن‌دان آمده است

(صفحہ ۸۸)

شاعر اپنی ہندی نژادی کا ذکر یوں کرتا:

مولد و منشا مبین در خاک هندوستان مرا
نظم و نثرم بین‌که بر آب خراسان آمده است

(صفحہ ۸۹)

(۸) صبح خیزانیکه وصف آن خط و خد کرده اند
در ره فکرت نوشتن جهد بی حد کرده اند

(صفحہ ۱۳۶)

۱- یہ قصیدہ پروفیسر سعید نفیسی، کے مرتبہ دیوان میں شامل نہیں، اگرچہ ''در ستایش رکن الدین فیروز شاہ'' کے عنوان سے بعض قصائد ان کے ہاں ملتے ہیں۔ (مرتب)

یہ قصیدہ بھی نظام الملک جنیدی کی تعریف میں ہے ، اور قصیدے کے ذیل میں اس کا نام بھی موجود ہے ۔

(۹) بفریاد آمدم این جا بفریاد
مگر شاہ جہان دادم دہد داد

(صفحہ ۱۳۵)

یہ قصیدہ[1] کسی شخص کی شکایت میں لکھا گیا ہے جس سے شاعر کا جھگڑا ہوتا ہے اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ شاعر نہایت غیظ کی حالت میں ہے اور کہتا ہے کہ اگر بادشاہ نے میری فریاد نہیں سنی تو میں بغداد جا کر امیرالمومنین کے دربار میں شاکی ہوں گا ، اور اپنے آنسوؤں سے بغداد میں ایک نیا دجلہ جاری کر دوں گا ۔ وہاں بھی سماعت نہیں ہوئی تو خانۂ کعبہ جا کر اور پردۂ کعبہ پکڑ کر خدا کی جناب میں فریاد و زاری کروں گا ۔ بعد میں گویا ہے کہ غالباً مجھے اس انتہائی کارروائی پر عمل در آمد کی ضرورت نہیں ہوگی ، کیوں کہ ہمارا پادشاہ خود عادل و منصف ہے ، اور وہ رکن الدین و الدنیا ہے ، یعنی رکن الدین فیروز ۔

(۱۰) ای فخر ہمہ نژاد آدم
وی سیدۂ زنان عالم

(صفحہ ۲۸۱)

قصیدۂ[2] ہذا کسی شہزادی کی تعریف میں ہے ، جس کا خطاب کریمۃ النساء اور نام رضیۃ الدین ہے ۔ چنانچہ :

سلطانت کریمۃ النساء خواند
شد ذات شریف تو مکرم

۱۔ دیکھیے دیوان انوری ، اشاعت سعید نفیسی ، صفحہ ۶۷ - ۶۸ ۔ (مرتب)

۲۔ دیوان انوری ، مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۲۰۲ - ۲۰۱ ۔ (مرتب)

راضی ز تو ای رضیہ الدین
حق قادر و ذوالجلال اکرم

(صفحہ ۲۸۱)

پادشاہ سے اس کے تعلقات یوں بیان کیے گئے ہیں ۔ ابیات :

اقبال تو بر فزونست ہر روز
از دولت خسرو معظم
آن پادشہی کہ خسروان را
از ہیبت او فرو شود دم
از ورد دعای تو سحر گاہ
بنیاد بقای اوست محکم

(صفحہ ۲۸۲)

رضیہ الدین کی سرکار میں شعرا کی آمد و رفت بھی تھی :

در مدح و ثنات شاعران را
تشریف و صلات[1] و خز معلم

(صفحہ ۲۸۲)

میں ایک مدت تک اس قصیدے کو سلطان رضیہ الدین بنت سلطان شمس الدین التتمش کی مدح میں مانتا رہا ، لیکن انوری کے ایک قلمی کلیات میں ، جس سے گزشتہ بالا الحاقی قصائد ترک کر دیے گئے ہیں ، یہ قصیدہ داخل ہے ۔ اس شہادت کی بنا پر میں اپنے نظریے سے دست کش ہوگیا ہوں ، اگرچہ مطمئن نہیں ہوں ۔

۱۔ اشاعت نفیسی میں ''تشریف ز صوف وخز معلم'' ۔ (مرتب)

نظامی گنجوی

قولہ : "الیاس یوسف نام ، ابو محمد کنیت ، نظام الدین لقب ، نظامی تخلص ، باپ کا نام مؤید تھا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۸۹ ، طبع الناظر پریس ، ۱۹۱۷ع)

شیخ نظامی کا نام در اصل الیاس ہے اور اس کے لیے یہ شعر سند ہے ۔ لیلی مجنوں :

و الیاس کالف بری ز لامش
هم با نود و نہ است نامش[1]

(خمسہ' نظامی ، صفحہ ۲۰۸ ، طبع مطبع مظفری بمبئی ، ۱۳۲۷ھ)[2]

ایک اور شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام اویس بھی تھا[3] ۔ لیلی مجنوں :

۱۔ الیاس کے اعداد ایک سو دو سے "الف" اور "با" کے اعداد کے تخرجے سے ننانوے بچتے ہیں۔ (حاشیہ' مصنف)

۲۔ اس مضمون کے دوران میں صفحات کے حوالے اسی خمسے سے دیے گئے ہیں ۔ (حاشیہ' مصنف)

۳۔ اس نام کے متعلق وحید دستگردی مرحوم اپنی کتاب گنجینہ' گنجوی میں فرماتے ہیں :

"در این زمان بہ سبب این بیت کہ بدین صورت غلط در نسخ چاپی ضبط شدہ است :

یا رب تو مرا کہ ویس نامم
در عشق محمدی تمامم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یا رب تو مرا کاویس نامم
در عشق محمدی تمامم
زان شد که محمدی جمال است
روزیم کن آنچہ در خیال است

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۴)

یوسف ان کے والد کا نام تھا ، زکی دادا کا اور مؤید پردادا کا ۔

لیلیٰ مجنوں :

گر شد پدرم بہ نسبت جد
یوسف پسر زکی موید

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۹)

قولہ : ''قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے ۔ اصل وطن یہاں تھا ، لیکن چوں کہ قم صدر مقام ہے اس لیے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۸۹)

تفرش[1] کے متوطن تفرش کی طرف ہی منسوب ہوا کرتے ہیں : مثلاً میر عبدالغنی تفرشی ، میرزا طاہر تفرشی ، امیر قدسی تفرشی ،

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

بعضی گمان کردہ اند کہ نام نظامی ویس بودہ و این اشتباہ و غلط تعجب آوری و صحیح بیت اینست :

یا رب تو مرا کاویس نامم
در عشق محمدی تمامم

یعنی من کہ در عشق محمد بسر حد کمال رسیدہ و نام اویس قرنی برمن نہادن سزاوار است ۔''

(صفحہ و ، گنجینۂ گنجوی ، ۱۳۱۸ شمسی)

(مرتب)

۱- اس کی قدیمی شکل طبرش ہے ، چناں چہ شرف الدین علی وزیر عراق جو جلال الدین سنکبوتی کا وزیر ہے ، طبرشی کہلاتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

تابیا تفرشی وغیرہ لیکن جو ضعیف روایت نظامی کو تفرش کی طرف نسبت دیتی ہے ، اصل میں یوں ہے کہ شیخ تفرش کے موضع ''تامن'' کے ، جس کو بہ تخفیف من ''تا'' بھی کہا جاتا ہے ، رہنے والے تھے - چناں چہ اب بھی اُن کی اولاد وہاں آباد ہے :

بتفرش دهی هست ''تا'' نام او
نظامی از آنجا شده نامجو

لیکن خمسہ میں تامن اور تفرش کی طرف کوئی تلمیح نہیں ملتی' اور نظامی گنجہ کے ساتھ اس کثرت سے اپنے آپ کو مضاف کر رہے ہیں کہ اس تعلق کی موجودگی میں کسی اور شہر یا وطن کی طرف نسبت دینے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی -

---

۱- وحید دستگردی مرحوم فرماتے ہیں :

''دلیل قمی و تفرشی بودن نظامی نزد تذکرہ نویسان این دو بیت است (از اقبال نامہ ، صفحہ ۲۹) :

چو در گرچہ در بحر گنجہ گمم
ولی از کہستان شہر قمم
بہ تفرش دهی هست''تا'' نام او
نظامی از آنجا شدہ نام جو

این دو بیت بابیات نظامی هر چند شباهت تام دارد و زبان همان زمانست اما در نسخ کہن سال ما این دو بیت نیست بعلاوہ درجائی واقع شدہ است کہ ارتباطی با مطلب ندارد و رشتہ معنی را قطع میکند یعنی میانہ این دو بیت :

نظامی ز گنجینہ بگشای بند
گرفتاری گنجہ تا چند چند
برون آر اگر صیدی افکندۂ
روان کن اگر گنجی آکندہ

این دو بیت کمال ارتباط معنوی و لفظی را باهم دارند و صاحب ذوق سلیم میداند کہ جای دو بیت قم و تفرش درمیان این دو بیت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

قولہ : ”سال ولادت کسی نے بیان نہیں کیا لیکن چونکہ بروایت صحیح سنہ وفات ۵۹۶ھ ہے اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان کی جاتی ہے ، اس لیے سال ولادت ۵۳۳ ہجری سمجھنا چاہیے ۔“ (شعرالعجم ، صفحہ ۲۸۹)

مولانا نظامی کے سال وفات کے متعلق مورخین میں سخت اختلاف ہے ۔ چنانچہ تذکرۂ دولت شاہی میں ۵۷۶ھ ، آتش کدہ میں ۵۸۷ھ ، جہاں آرا میں ۵۹۷ھ ، کشف الظنون میں ۵۹۶ھ ، صبح صادق اور شاہد صادق میں ۶۰۲ھ اور تقی کاشی کے ہاں ۶۰۶ھ ہے ۔

سنہ ۵۹۶ ہجری اصل میں شرف نامے کے اختتام کی تاریخ ہے ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

نیست ۔“ (گنجینۂ گنجوی ، صفحہ یج)

پروفیسر سعید نفیسی بھی ”دیوان قصاید و غزلیات نظامی“ میں احوال نظامی کے سلسلے میں ”مولد و مسکن“ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

”در ہمہ کتابہا ہمیشہ نظامی را گنجوی دانستہ اند ۔ مولف خلاصۃ الاشعار نخستین کسیست کہ گوید اصل وی از ولایت قمست اما مولدش در گنجہ واقع شدہ پیداست این مطلب را از دو بیتی گرفتہ است کہ در برخی از نسخہای نا معتبر تازۂ اقبال نامہ ضبط کردہ اند و آشکار است کہ الحاقیست...... گذشتہ از آنکہ این دو بیت کہ ویرا از مردم ’تا‘ روستایی در تفرش از قہستان قم معرفی کردہ است در نسخہای قدیم و معتبر خمسۂ نظامی نیست بر ساختگی و الحاق بودن آنہا نیز دلیل دیگر ہست و آن اینست کہ ظاہراً در زمان نظامی بآبادی معروف کہ اینک نام آنرا ’تفرش‘ مینویسند ”طبرش“ میگفتہ اند ۔“

(دیوان نظامی گنجوی ، مرتبہ استاد سعید نفیسی ، طبع طہران ، ۱۳۳۸ شمسی) ۔ (مرتب)

ہمارے ہاں مورخین میں ایک اور دستور رہا ہے کہ تاریخ وفات کی غیر حاضری میں مصنفین کی آخری تصنیف کی تاریخ کو ان کی تاریخ وفات مان لیا جاتا ہے - چناں چہ حکیم سنائی ، عنصر المعالی کیکاؤس وغیرھم کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا ہے -

اقبال نامہ میں نظامی نے جہاں حکماء کی وفات کے عنوان قائم کیے ہیں ، وہاں اپنی وفات کا عنوان بھی قائم کردیا ہے - اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی - اسی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا ہے - مولانا نظامی نے عاشق رسول ہونے کی حیثیت سے اسی عمر میں وفات پانے کی خواہش کی ہے ، تاکہ موت میں بھی اتباع سنت رسول کی جائے - لیکن ایک امر کی آرزو اور بات ہے اور اس آرزو کا پورا ہونا اور بات ہے - ہمارے پاس بعض ایسے وجوہ موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نامے کے اختتام کے کئی سال بعد تک وہ زندہ رہے ہیں -

لیکن سال ولادت معلوم کرنے کے لیے ایک یقینی ذریعہ یہ ہے کہ شیخ نظامی لیلیٰ مجنوں میں اپنی عمر ۷ × ۷ = ۴۹ بتاتے ہیں - بیت

زین سحر سحر گہی کہ رانم　　　مجموعہ ہفت سبع خوانم
(خمسہ ، صفحہ ۲۰۷)

چونکہ یہ مثنوی ۵۸۴ھ میں ختم ہوتی ہے ، چنانچہ ابیات :

کاراستہ شد بہ بہترین حال
در سلخ رجب بہ ثے و فا دال
تاریخ عیان کہ داشت باخود
ھشتاد و چہار بعد پانصد - (خمسہ ، ۲۰۴)

اس لیے اگر سال عمر انچاس ۵۸۴ھ سے تفریق کیے جائیں تو ۵۳۵ھ سال ولادت[1] نکل آتا ہے - سال وفات کے متعلق اسی

---

۱ - سال ولادت نظامی کی بابت وحید دستگردی کا خیال ہے کہ :
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۶۰۷ ہجری کے بعد تک زندہ تھے۔

قولہ : ''اس زمانے کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا اور فرمایش کر کے ان سے اپنے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں۔ اسباب اس کے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا، لیکن یہ سعادت دور والوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی، وہ بہرام شاہ تھا۔ نظامی نے مخزن اسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی اور صلے میں اس نے پانچ ہزار

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

''ولادت وی در یکی از سالہای پانصد و سی تا پانصد و چہل اتفاق افتادہ و ازین سنوات خارج نیست۔''

(گنجینۂ گنجوی، صفحہ یح)

پروفیسر سعید نفیسی کے نزدیک نظامی کا سال ولادت ۵۴۰ھ ہونا چاہیے۔ پھر فرماتے ہیں :

''در سنگی کہ بر سر خاک او در گنجہ از جانب حکومت شوروی آذربایجان گذاشتہ اند ولادت او را در سال ۵۳۵ حساب کردہ اند۔''

(دیوان قصاید و غزلیات نظامی، صفحہ ۵) (مرتب)

۱۔ نظامی کے سال وفات پر بحث ختم کرتے ہوئے پروفیسر سعید نفیسی لکھتے ہیں :

''بالاخرہ چنانکہ از ظاہر وقایع و روایات بیرون می‌آید، تقریباً مسلم میشود کہ رحلت نظامی در سالہای آخر قرن ششم و در ہر حال پس از ۵۹۷ بودہ است و ہمان ۵۹۸ بہترین روایت ست و درین زمان سن وی از ۶۰ متجاوز بودہ است۔''

(دیوان نظامی، صفحہ ۶۵)

جناب وحید دستگردی کا خیال ہے کہ :

''تاریخ وفات حکیم نظامی را باید بین سالہای ۵۹۹ تا ۶۰۲ دانست۔''

(صفحہ۸، کلیات دیوان حکیم نظامی، طبع طہران، ۱۳۳۵) (مرتب)

اشرفیاں ، ایک قطار شتر اور انواع و اقسام کے بیش قیمت
کپڑے بھیجے ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۰)

یہ خیال کہ بہرام شاہ کی فرمایش پر مخزن اسرار لکھی گئی ، صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ نظامی نے اپنی خواہش سے اسے بہرام شاہ[1] کے نام پر معنون کیا ہے ، چنانچہ مخزن :

بر ہمہ شاہان ز پی این جہال
قرعہ زدم نام تو آمد بفال

مخزن اسرار کے اکثر نسخوں میں اگرچہ تاریخ تصنیف ۵۵۹ھ ملتی ہے جیسا کہ مولانا شبلی نے اوپر ذکر فرمایا ہے اور اس کی سند یہ اشعار ہیں :

بود حقیقت بہ شہار درست
بست و چہارم ز ربیع نخست
از گہہ ہجرت شدہ تا این زمان
پانصد و پنجاہ و نہ افزون بران

لیکن بعض قدیم نسخوں میں "پنجاہ و نہ" کی بجائے "ہشتاد و دو" ملتا ہے ۔ مگر میرے خیال میں "ہفتاد و دو" زیادہ صحیح[2]

---

۱ ۔ ملوک ارزنجان کے مفصل حالات تاریخوں میں نہیں ملتے۔ بانی٫ خاندان منکوچک کے بعد اس کے دو فرزند اسحاق اور داؤد یکے بعد دیگرے بر سر حکومت آئے ۔ داؤد کا فرزند الملک السعید فخرالدین بہرام شاہ ۵۵۰ھ میں جانشین پدر ہو کر بقولے ۶۱۵ھ میں اور بقولے ۶۲۲ھ میں وفات پاتا ہے ۔ (حاشیہ٫ مصنف)

۲ ۔ پروفیسر سعید نفیسی کے سامنے تین روایات ہیں یعنی :
(ا) "پانصد و سال یک افزون بران"
(ب) "پانصد و پنجاہ و دو افزون بران"
اور
(ج) پانصد و پنجاہ و نہ افزون بران"

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

معلوم ہوتا ہے۔ اس خیال کا موید یہ قرینہ ہے کہ نعت سوم میں نظامی نے ایک موقع پر ۵۷۰ھ کا ذکر کیا ہے :

پانصد و هفتاد بس ایام خواب
روز بلند است بمجلس شتاب

نیز اس وقت ان کی عمر چالیس سے کم یعنی سینتیس اڑتیس سال کی تھی ، چنانچہ مخزن اسرار :

طبع کہ با عقل بہ دلالگیست
منتظر نقد چهل سالگیست

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

وہ ان میں سے پہلی روایت کو غلط قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

''و ناچار یکی از دو روایت دیگر کہ ۵۵۲ و ۵۵۹ باشد درست است و چون نسخہای قدیم تر همہ ۵۵۲ دارد قول دوم مرجحست و باید تاریخ نظم مخزن الاسرار را ۵۵۲ دانست۔''

(دیوان نظامی ، اشاعت نفیسی ، صفحہ ۷۷-۷۸)

تعجب ہے کہ ایک طرف تو پروفیسر نفیسی نظامی کا سال ولادت ۵۴۰ھ ثابت کرتے ہیں اور دوسری جانب مخزن الاسرار کا سال تصنیف بجائے آگے بڑھانے کے ۵۵۲ھ تسلیم کرلیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک نظامی نے بارہ سال کی عمر میں مخزن الاسرار کی سی متصوفانہ مثنوی لکھ ڈالی۔ لطف یہ ہے کہ مخزن کی تاریخ تصنیف کی پہلی روایت یعنی ۵۰۱ھ کو ردکرنے کے ضمن میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

''۔۔۔بشرط آنکہ در ۵۰۱ در زمان سرودن مخزن الاسرار بیست سال داشتہ باشد و آنهم بانکات حکیمانہ ای کہ در مخزن الاسرار هست از جوان بیست سالہ ای بعید می نماید ۔ ۔ ۔'' (صفحہ ۷۷)

ان کے مقابلے میں وحید دستگردی کی رائے باوزن ہے :

''مخزن الاسرار را نظامی در دورۂ جوانی و حدود سی سالگی منظوم داشتہ۔'' (صفحہ مز ، گنجینۂ گنجوی)

اور صفحہ غح پر فرماتے ہیں : ''این بنام ملک فخر الدین بهرام شاہ پادشاہ ارزنجان در سنہ ۵۷۲ انجام یافتہ۔''

(مرتبہ)

مخزن کے انعام سے متعلق سب سے قدیم وہ بیان ہے جو ابن بی بی نے مختصر سلجوق نامے میں دیا ہے ۔ میں بجنسہ یہاں اس کو نقل کرتا ہوں :

"ملک فخرالدین بہرام شاہ صاحب سیرت نیکو و علو همت و فرط مرحمت بود و در ایام پادشاهی او مملکت ارزنجان در کمال خورسندگی بود و کتاب مخزن الاسرار را نظامی گنجه بنام او کرد و بخدمتش تحفه فرستاد و پنج هزار دینار و پنج سر استر راهوار جائزه فرمود ۔"

(راحت‌الصدور ، مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال ، حاشیہ صفحہ ۲۰۷)

انعام کی روایت اس میں شک نہیں نہایت عام ہے ، لیکن میں نظامی کے ان بیانات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو شیریں خسرو میں محفوظ ہیں اور گزشتہ بیانات کے بالکل منافی ہیں ۔ نظامی باربد رامشگر کے حق میں خسرو پرویز کی داد و دہش اور اپنے زمانے کی نا قدردانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

چو عالی همتی گردن بر افراز
طناب هرزه از گردن بینداز

بخورسندی طمع را دیده بردوز
ز چون من قطرهٔ دریائی آموز

که چندین گنج بخشیدم بشاهی
وزان خرمن نجستم برگ کاهی

نه بی برگی سخن را راست کردم
نه او داد و نه من درخواست کردم

مرا این بس که پر کردم جهان را
ولی نعمت شدم دریا و کان را (خمسه ، صفحہ ۱۰۸)

مخزن کے بعد ہی شیریں خسرو تصنیف ہوتی ہے اور مخزن کے صلہ نہ ملنے کی شکایت قدرتاً شیریں خسرو میں کی جا سکتی ہے ۔ اشعار بالا سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بہرام شاہ نے کوئی

صلہ نہیں دیا ۔

قولہ : ''مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا ۔''
(شعرالعجم، صفحہ ۲۹۱)

خود نظامی کے اپنے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی عمر چالیس سال سے کسی قدر کم تھی ۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

طبع کہ با عقل بہ دلالگیست
منتظر نقد چہل سالگیست

تا بچہل سال کہ بالغ شود
خرج سفرهاش مبالغ شود

یار کنون بایدت افسون بخوان
درس چہل سالگی اکنون بخوان
(خمسہ ، صفحہ ۱۴)

قولہ : ''اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے اور دشت و بیابان طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینے میں پایۂ تخت میں پہنچے ۔''
(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۳)

مولانا نظامی کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ اتابک قزل ارسلان گنجہ سے صرف تیس فرسنگ کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا تھا ، جب اس نے نظامی کی طلبی کے لیے اپنا قاصد روانہ کیا ۔ نظامی کو یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک ماہ کے سفر کی ضرورت نہیں ۔
خسرو شیریں :

شبی[1] روزی سفر کن کانکہ از راہ
بہ سی فرسنگ آمد موکب شاہ[2]

---

۱ ۔ بعض نسخوں میں ''بسی روزی سفر کن الخ'' ملتا ہے جس کو غالباً مولانا شبلی نے ''بہ سی روزی سفر کن الخ'' پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سفر ایک ماہ میں طے ہوا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ ۔ خمسۂ نظامی مرتبہ وحید دستگردی (صفحہ ۴۱۸) میں پہلا مصرع یوں درج ہے :
''کہ سی روزہ سفرکن کاینک از راہ'' (مرتب)

قولہ : ''ان میں علم و فضل کی قدر دانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال‌الدنیا والدین شاہ آخستان تھا ، جو سلاطین شروانیہ کے سلسلے کا درۃ التاج تھا ۔ یہ خاندان خالص ایرانی نسل یعنی بہرام چوبین کی یادگار تھا ۔ منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا ۔ . . منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ 'لیلی مجنوں' کی داستان نظم کیجیے ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۴)

'لیلی مجنوں' کے لیے خاقان کبیر منوچہر نے فرمایش نہیں کی ۔ وہ اس عہد سے ایک دراز مدت قبل وفات پا چکا ہے ۔ یہ کتاب منوچہر کے فرزند ابوالمظفر جلال الدین اخستان کی فرمایش پر لکھی گئی ہے جو آن دنوں والیِ شروان تھا[1] ۔ چنانچہ ابیات :

خاقان جہان ملک معظم
مطلق ملک الملوک عالم

صاحب جہت جلال و تمکین
یعنی کہ جلال دولت و دین

تاج ملکان ابوالمظفر
زیبندۂ ملک ہفت کشور

شروان شہ آفتاب سایہ
کیخسرو و کیقباد پایہ

---

۱ ۔ وحید دستگردی لکھتے ہیں :
''این نامہ بخواهش ابوالمظفر شروان شاہ اخستان بن منوچهر بن اخستان کہ بنا بقولِ مورخان ایران نژاد و از نسل بهرام چوبین بوده بنظم در آمده است ۔'' (گنجینۂ گنجوی ، صفحہ ف)
(مرتب)

شاہ سخی[1] اخستان کہ نامش
مہرپست کہ مہر شد غلامش

بہرام نژاد و مشتری مہر[2]
درّ صدف ملک منوچہر

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۳)

قولہ : ”نظامی نے اس مثنوی کے صلے میں پادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحب زادے ولیِ عہدِ سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کیے جائیں ۔“ (شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۶)

حقیقت یہ ہے کہ نظامی نے لیلی مجنون میں شاہ اخستان کے بعد اس کے فرزند کو ، جس کا نام دادا کے نام پر منوچہر رکھا گیا ہے ، علیحدہ خطاب کیا ہے جس کے ضمن میں کہا ہے کہ میرے فرزند نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اس کو تمھارے حوالے کردوں تاکہ تمھاری حفاظت میں آجائے اور ہم درس بھی ہو جائے۔

ابیات :

آن گوہر کان کشادۂ من
پشت من و پشت زادۂ من

گوہر بکلاہ و کان بر افشاند
وز گوہر کان شہ سخن راند

کین یکس را بعہد و سوگند[3]
بر کش بہ پناہ آن خداوند

بسپار مرا بعہدش امروز
کو نو قلم است و من نوآموز

تا چون گہرش کمال گیرد
اندر ز ترا بفال گیرد

---

۱ ۔ خمسہ مرتبہ وحید دستگردی (صفحہ ۴۴۵) میں ”سخن ۔“ (مرتب)

۲ ۔ مرتبہ وحید دستگردی میں ”چہر۔“ (مرتب)

۳ ۔ اساعت وحید دستگردی (صفحہ ۴۵۱) میں ”بعقد و پیوند ۔“(مرتب)

کان تخت نشین کہ اوج سایست
خوردست ولی بزرگ رایست
آن یوسف هفت بزم و نہ مہد
هم والیِ عہد ، هم ولیِ عہد
نو مجلس و نو نشاط و نو مہر
فرزند شہ اخستان منوچہر[1]
(خمسہ ، صفحہ ۲۰۶)

اور تعریف کے بعد اصل مدعا کا اظہار یوں کیا گیا ہے :

دارم بخدا امیدواری
کز غایت ذہن و هوشیاری
آنجات رساند از عنایت
کآمادہ شوی بہر کفایت
هم نامۂ خسروان بخوانی
هم گفتۂ بخردان بدانی
این گنج نہفتہ را درین درج
بینی چو مہ دو هفتہ در برج
دانی کہ چنین عروس مہدی
ناید ز قرآن هیچ عہدی
گر در پدرش نظر نیاری
تیمار برادرش بداری
از راہ نوازش تمامش
رسمی ابدی کنی بنامش
تا حاجت مند کس نباشم[2]
سر پیش و نظر ز پس نباشم[2]

۱ ۔ اشاعت وحید دستگردی ''درّ صدف ملک منوچہر۔'' (مرتب)
۲ ۔ اشاعت دستگردی (صفحہ ۳۵۲) میں ''نباشد ۔'' (مرتب)

این گفتم و قصه گشت کوتاه
اقبال تو باد و دولت شاه

(خمسه ، صفحہ ۲۰۷)

قولہ : "قزل ارسلان کے مرنے کے بعد ، اس کا بھتیجا یعنی محمد بن ایلدکز کا فرزند ارجمند ابوبکر نصرۃالدین ۵۸۷ھ میں مسندآرا ہوا ۔ نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا ، اس وقت تک انھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں سلاطین وقت کی فرمایش سے لکھی تھیں ، لیکن سکندرنامہ اپنی خواہش سے لکھا اور ابوبکر نصرۃالدین کے نام سے موسوم کیا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۶)

سکندرنامے کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب خود نصرۃ الدین کی فرمایش سے لکھی گئی تھی ۔ چنانچہ :

نشاط از تو دارد گہر سفتنم
سزاوار تست آفرین گفتنم

خرد کاسمانرا زمین می کند
برین آفرین آفرین می کند

چو فرمان چنین آمد از شہریار
کہ برنام ما نقش بند این نگار

بگفتار شہ مغز را تر کنم
بگفت کسان مغز در سر کنم

فرستم عروسی بدان بزمگاہ
کز و چشم روشن شود بزم شاہ[1] (خمسہ ، صفحہ ۱۲)

دیگر : چو فرمود شہ باغی آراستن
سمن کشتن و سرو پیراستن
بسرسبزی شاہ روشن ضمیر
بہ نیروی فرہنگ فرمان پذیر

۱ ۔ از شرفنامہ ۔ (مرتب)

یکی سرو پیراستم در چمن
کہ بر یاد او می‌خورند انجمن[1]

(خمسہ ، صفحہ ۲۵۵)

قولہ : ”کتاب لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی تو مقررہ رقم کے علاوہ سواری کا گھوڑا ، بیش قیمت کپڑے ، خلعت وغیرہ عطا ہوا ۔“ (شعرالعجم : صفحہ ۲۹۶)

اور حاشیے میں فرماتے ہیں :

”لیکن تعجب ہے کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہے ۔ اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لیے جائیں تو تب بھی ایسی رقم ہے جو نہ نظامی کے شایاں ہے ، نہ ایک مشرق بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہے ۔“

اس کے متعلق شیخ نظامی کا بیان حسب ذیل ہے :

چو شہ دید در گوہر دل پسند
پسندید و شد کار گوہر بلند

ازان نقد رومی کہ باشد درست
ہزارم پذیرفتہ بود از نخست

چو من نزل در خورد او ساختم
بپای وی این در برانداختم

ہزارم پذیرفتہ را داد زود
بسی چیزہا نیز بروی فزود

ز مرکوب و دیبا و صد گونہ چیز
ہمان خلعت پادشاہانہ نیز

دو صد نقد دیگر ز دیوان بہر
نوشتم بادرار دیوان دہر

۱ ۔ از اقبال نامہ ۔ (مرتب)

بدان تا رسانندگان جو بجو
رسانند هر سالی از نو بنو (اقبال‌نامہ قلمی)

گویا جس وقت پادشاہ نے فرمایش کی تھی ، اس وقت ایک ہزار اشرفی (درست) صلہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا ۔ جب کتاب ختم ہو کر پیش ہوئی ، زر موعود ان کو مل گیا ۔ اس کے علاوہ اسپ و خلعت اور دیبا کے تھان عنایت ہوئے اور دو سو اشرفی سالانہ نقد پنشن مقرر ہوگئی ۔ ساتھ ہی یہ لحاظ بھی رہے کہ یہ انعام صرف اقبال نامہ یعنی سکندر نامہ بحری کے لیے عطا ہوا ہے ۔ شرف نامہ اس سے تین سال قبل لکھا جاچکا ہے ، اس کا صلہ اس انعام میں شامل نہیں ۔ جب خود نظامی نے اس عطیے کو دلی مسرت اور دعا آشنا الفاظ کے ساتھ قبول کرلیا تو ہمیں چاہیے کہ اسی پر قناعت کریں اور مشرق فیاضی کے خلاف شکوہ سنج نہ ہوں ۔ نظامی انعام کے ذکر کو ان ابیات پر ختم کرتے ہیں :

خدایا جہانرا بدین گنج بخش
بر افروز چون دیده را از درخش
فلک را بحشمت گراینده دار
بدو داد و دین هر دو پاینده دار

(اقبال نامہ قلمی)

قولہ : ''اساتذہ سے میں نے سنا ہے کہ سلاطین وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی ان کے بیٹے سے بیاہ دی تھی ۔ میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا لیکن 'سکندر نامہ بحری' کے خاتمے سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحب زادی اور اپنے فرزند محمد کو نصرة الدین کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

دو گوہر برآمد ز دریای من
فروزنده از روی شان رای من

یکی عصمت مریمی یافتہ
یکی نور عیسٰی برو تافتہ
فرستادہ ام ہر دو را نزد شاہ
کہ یاقوت را درج دارد نگاہ
عروسی کہ دور او ز مادر بود
بہ از پردہ دارش برادر بود
بباید چو آید بر شہریار
چنین پردگی را چنان پردہ دار
چو من نزل خاص تو جاندادہ ام
جگر نیز با جان فرستادہ ام

آخری شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہے“

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۷)

میں علامہ شبلی کے اس عجیب و غریب انکشاف کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا ۔ یہ امر میری سمجھ سے باہر ہے کہ نظامی اپنی صاحب زادی کو نصرۃالدین کے پاس کیوں بھیجتے اور صاحب زادی وہاں کیا کرتیں ۔ اگر کسی رشتہ داری کے خیال سے بھیجی گئی تھیں تو بہتر تھا کہ علامہ شبلی اس کی وضاحت کر دیتے ۔ لیکن میں یہ دعوٰی کرنے کے لیے تیار ہوں کہ نظامی کے کوئی صاحب زادی نہیں تھیں ۔ ان کے صرف ایک اولاد تھی یعنی محمد جن کے لیے فرمایا ہے : بیت

یک دانہ اولین فتوحم یک پیالہ آخرین صبوحم

نہ اشعار بالا سے کوئی ایسا قیاس مترتب ہو سکتا ۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے سکندر نامہ اپنے فرزند محمد کے ہمراہ بھیجا ہے اور یہی سکندر نامہ وہ صاحب زادی ہے ۔

دو گوہر سے مولانا نظامی کی مراد آن کے فرزندِ صلبی محمد اور فرزندِ روحانی سکندر نامہ ہیں ۔ ”عصمت مریمی“ میں بھی شاعر نے پھر اسی نظم کی طرف تلمیح کی ہے ۔ گویا فکرِ بکر کے مقبولہ خیال

کو "عصمت مریمی" کے جدید پیرایے میں ادا کیا۔ عروس سے مراد وہی نظم ہے اور "مادر" سے مقصد مفروضہ صاحب‌زادی کی والدہ نہیں ہیں بلکہ شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے۔ جو لوگ نظامی کی شاعری سے واقف ہیں وہ میرے اس بیان سے اتفاق کریں گے کہ شیخ نظامی بعض اوقات اپنے ضمیر یا طبیعت کو عورت فرض کر لیتے ہیں اور اپنی نظم کو عروس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی مثالیں دی جاتی ہیں:

(۱) ضمیرم نزن بلکہ آتش زن است
که مریم صفت بکر و آبستن است
تقاضای آتشوی چون آیدش
که از سنگ و آهن برون آیدش

(۲) عروس مرا پیش گوهر شناس
کند تازه روی بسی اقتباس

(خمسہ، صفحہ ۲۵۴)

(۳) بگفتار شه مغز را تر کنم
بگفت کسان مغز در سر کنم
فرستم عروسی بدان بزم گاه
کزو چشم روشن شود بزم شاه
عروسی چنین شاه را بنده باد
بدین مهر آفاق فرخنده باد

(خمسہ، صفحہ ۱۲۹)

(۴) این گنج نهفته را درین درج
بینی چو مه دو هفته در برج
دانی که چنین عروس مهدی
ناید ز قران هیچ عهدی

گر در پدرش نظر نیاری
تیمار برادرش بداری

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۷)

انھی ابیات سے ، جو مولانا شبلی نے نقل کیے ہیں ، ایک شعر ترک کر دیا گیا ہے جس سے ہر قسم کی بدظنی رفع ہو سکتی ہے۔ وہ بیت یہ ہے :

بنوبتگہ شہ دو ہندوی بام
یکی مقبل و دیگر اقبال نام

(خمسہ ، صفحہ ۳۳۱)

"مقبل" سے مراد آن کے فرزند محمد اور "اقبال" سے مراد "اقبال نامہ" ہیں ۔

قولہ : "اس کتاب (سکندر نامہ) کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی ؛ چناں چہ جہاں اور حکما کے مرنے کا الگ الگ عنوان قایم کیا ہے ، اپنے نام کی بھی سرخی قایم کی ہے ۔ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں :

نظامی چو این داستان شد تمام
بعزم شدن تیز برداشت گام
فزون بود شش مہ ز شصت و سہ سال
کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال

اس کتاب پر ان کی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہوا ۔ سالِ وفات میں سخت اختلاف ہے ۔ دولت شاہی میں ۵۹۶ ہجری لکھا ہے لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہے ۔ تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے ۔ جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں ۔ لیکن اس قدر قطعی ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۷ و ۲۹۸)

حکمائے یونان کی وفات کے ذکر کے ساتھ اپنی وفات کا عنوان قایم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نظامی نے اسی عمر میں یا چھٹی صدی کے اندر اندر انتقال فرمایا ۔ بہ حیثیت عشق رسول اس میں شک نہیں کہ اس عمر میں انتقال کرنے کے لیے آرزو مند ضرور تھے۔ دوسرے انھوں نے حکمائے یونان کے ساتھ اپنی ذات کو بھی شریک بنانا چاہا ہے ۔ جہاں انھوں نے ان حکما کے مقالات کا ذکر کیا ہے، اپنے مقالات بھی علیحدہ عنوان کے تحت دے دیے ہیں ۔ اسی طرح ان کی وفات کے ساتھ اپنی وفات کا عنوان بھی باندھ دیا ۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس عہد سے ایک عرصے بعد تک زندہ رہے[1] ۔

بعض سکندر ناموں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ نظامی نہ صرف ساتویں صدی کے آغاز میں موجود تھے بلکہ اس کے پہلے عُشر کا ایک معتدبہ حصہ کم از کم طے کرچکے ہیں ۔ وہ اشعار یہ ہیں :

طرف دار موصل بہ مردانگی
قدر خان شاهان بفرزانگی

۱۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا اپنی کتاب ''حماسہ سرائی در ایران'' طبع ۱۳۲۴ شمسی میں بحث و تمحص کے بعد (صفحہ ۳۲۹ و ۳۳۰) نظامی کا سال وفات سنہ ۶۱۹ھ قرار دیتے ہیں ۔ بعد ازاں اپنی کتاب ''تاریخ ادبیات در ایران'' جلد دوم میں فرماتے ہیں :

''و با تحقیقی کہ دربارۂ سال ختم اقبالنامہ و تقدیم آن در آخرین بار بہ ملک القاهر عز الدین ابوالفتح مسعود بن نور الدین صاحب موصل (۶۰۷ - ۶۱۵) در کتاب حماسہ سرایی در ایران کردہ ایم تاریخ ۶۱۹ را برای سال فوت نظامی صحیح تر دانستہ ایم لیکن اینجا با ولادت نظامی در حدود سال ۵۳۰ و قبول ۸۴ سال عمر برای او باید سال ۶۱۴ را انتخاب کرد ۔''

(صفحہ ۸۰۱ ، بار سوم ، ۱۳۳۹ شمسی) ۔ (مرتب)

سر سرفرازان و گردن کشان
ملک عز دین قاہر شہ نشان
بطغرای دولت چو طغرل تگین[1]
ابوالفتح مسعود بن نور دین

نور الدین ارسلان شاہ والیِ موصل سنہ ۶۰۷ ہجری میں وفات پاتا ہے ۔ اس کا فرزند الملک القاہر عز الدین[2] مسعود اسی سال تخت نشین ہو کر ۶۱۵ھ میں فوت ہوتا ہے (جامع التواریخ) ۔ ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے سکندر نامے کو عز الدین مسعود کے نام کے ساتھ بھی منسوب کیا ہے اور اس احتمال کے لیے پوری گنجائش ہے کہ یہ انتساب نصرۃ الدین ابوبکر کی وفات کے بعد جو ۶۰۷ھ میں واقع ہوتی ہے ، عمل میں آیا ہوگا ، جب کہ دربار اتابکی سے نظامی کے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں ۔

۱- طغرل تگین انوری کا ممدوح ہے ۔ (حاشیہء مصنف)

۲- پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :

''درین مثنوی دو بیت هم در مدح عز الدین نامی گفته است که از قراین معلوم میشود پسر جهان پهلوان نصرة الدین مسعود بوده است و در حق او فرموده :

ملک عز دین آنکه چرخ بلند
بدو داده اورنگ خود را کمند
گشایندهٔ راز هفت اختران
ولایت خداوند هشتم قران

(قصاید و غزلیات نظامی ، مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۱۱۶)

لیکن آقای وحید دستگردی کا کہنا ہے کہ :

''این نامه (اقبال نامه) بنام ملک عزالدین مسعود بن ارسلان سلجوق که در موصل پادشاهی داشته ، منظوم شده ۔''

(گنجینہء گنجوی ، صحفہ فج)

نیز دیکھیے ''تاریخ ادبیات در ایران'' از ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا سے مندرجہ بالا حاشیہ ۔ (مرتب)

قوله : ”قصیدے بہت ہیں لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں ۔
سنائی کا انداز ہے ، اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر
کہتے ہیں ، لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں ، اس لیے مقبول
نہ ہو سکے ۔ البتہ ایک قطعہ نہایت صاف ، شستہ اور پُرلطف
کہا ہے جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا ۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود
می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نبد هیچ کس از بادہ فروشان بیدار
یا کہ من هیچ کسم ، هیچ کسم در نکشود
پاسی از شب بگزشت (کذا) بیشترک یا کمتر
رندی از غرفہ برون کرد سر و رخ بنمود
گفت خیراست درین وقت کرا میخواهی
بی‌محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا ، گفت برو ، هرزہ مگو
کاندرین وقت کسی بہر کسی در نکشود
این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند
کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
این خرابات مغان ست درو رندانند
شاهد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
هرچہ در جملۂ آفاق درین جا حاضر
مومن و برهمن و گبر و نصاریٰ و یہود
گر تو خواهی کہ دم از صحبت ایشان بزنی
خاک پای همہ شو ، تاکہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا
ہے لیکن جواب نہ ہو سکا ۔“

(شعرالعجم ، صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۱)

نظامی کے قصائد ، اگر کبھی انھوں نے لکھے تھے ، اب نہیں

ملتے[1] - آتش کدہ میں صرف دو قصیدوں سے بعض چیدہ اشعار نقل کیے گئے ہیں - یہ قطعہ جس کو غزل کہنا زیادہ صحیح ہوگا ، اس میں شک نہیں عام طور پر نظامی کی طرف منسوب ہے ؛ چناں چہ آتش کدہ میں ان ہی کے نام پر دیا گیا ہے - بعد کے مولفین صاحبِ آتشکدہ کے پیرو ہیں ، لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس باب میں مصنفین کو مغالطہ پیش آیا ہے - راقم کے پاس مولانا عراقی کا ایک دیوان ہے جو کم از کم آٹھویں قرن ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے - اس دیوان[2] میں یہ قطعہ جزوی اختلاف کے ساتھ مع عراقی کے تخلص کے موجود ہے جس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

بخرابات شدم دوش مرا بار نبوذ
میزدم نعره و فریاد و ز من کس نشنوذ

یا نبد هیچکس از باذه فروشان بیدار
یا خوذ از هیچکسی هیچکسم در نگشوذ

۱- پروفیسر سعید نفیسی نے اپنے مرتبہ دیوان قصاید و غزلیات نظامی میں ان کے سولہ قصائد درج کیے ہیں - ان میں سے چند قصائد کا ماخذ صرف ایک ایک ہے اور بعض کے لیے خود مرتب نے حاشیے میں تسلیم کیا ہے کہ وہ دوسرے شعرا سے بھی منسوب کیے جاتے ہیں - (مرتب)

۲- پروفیسر سعید نفیسی نے یہ غزل اپنے مرتبہ دیوان قصائد و غزلیات نظامی کے صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۶ پر نقل کی ہے اور اس میں کل چودہ اشعار ہیں لیکن حاشیے میں لکھتے ہیں :

"رجوع کنید بکلیات شیخ فخر الدین ابراهیم همدانی متخلص بعراقی چاپ من -"

چناں چہ کلیات عراقی (صفحہ ۱۹۳ ، طبع دوم میں بھی یہ غزل درج ہے لیکن اس میں صرف دس شعر ہیں - اس کے ماخذ کے طور پر انھوں نے دو نام دیے ہیں ؛ پہلا دیوان اوحدی کا ایک نسخہ جس کے حاشیے پر دیوان عراقی اور دیوان جلال الدین طیب شیرازی لکھا ہوا تھا اور دوسرے حافظ محمود شیرانی صاحب والا نسخہ دیوان عراقی جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملک ہے اور پروفیسر سعید نفیسی نے وہیں دیکھا تھا - (مرتب)

چونکه یک نیمه ز شب یا کم یا بیش برفت
رندی از غرفه برون کرد سر و رخ بنموذ
گفت خیرست درین وقت تو دیوانه شذی
مغز پرداختی آخر بنگوئی که چه بوذ
گفتمش در بگشا ، گفت برو هرزه مگوی
تا درین وقت ز بہر چو توئی در که کشوذ
این نه مسجد که بہر لحظه درش بکشایم
تا تو اندر دوی و اندر صف پیش آئی زوذ
این خرابات مغانست و درو زنده دلان
شاهد و شمع و شراب و غزل و روذ و سروذ
(سر کوشان عرفاتست و سراشان کعبه
عاشقان همچو خلیله و رقیبان نمروذ)[1]
زر و سر را نبود هیچ درین بقعه محل
سود شان جمله زیانست و زیان شان همه سوذ
ای عراقی چه زنی حلقه برین در شب و روز
زین همه آتش خود هیچ نه بینی جز دوذ

نظامی کے مقابلے میں عراقی کو اس غزل کا زیادہ مستحق مانا جا سکتا ہے ۔ میری دلیل صرف یہی ہے کہ اول تو وہ ایسے نسخے میں[2] ملتی ہے ، جو اب سے تقریباً چھ سو سال پیش‌تر کا مرقومہ ہے

۱- یہ شعر داخل متن نہیں ہے بلکہ بعد میں کسی نے حاشیے غزل میں ایسے خط میں لکھا ہے جو دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

۲- اس دیوان کے رسم الخط کی بعض خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں :
جب حرف ما قبل حرف علت ہے یا حرف صحیح متحرک ہے ، دال کو بالعموم ذال لکھا جاتا ہے ۔ مثلاً دیدی ، شاد ، باد ، یابد ،
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتاب جس قدر قدیم ہے اسی قدر زیادہ معتبر ہے ۔ علاوہ بریں اس غزل میں واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کیا گیا ہے ۔ یعنی خرابات ، بادہ فروش ، رند ، مغان ، شاہد ، شمع ، شراب اور سرود وغیرہ کا حقیقی اطلاق متصوفین کے نزدیک کچھ اور ہے جو ان الفاظ کے اصلی معنوں سے ظاہر نہیں ہوتا ۔ مغربی فرماتے ہیں :

اگر بینی درین دیوان اشعار
خرابات و خراباتی و خمّار

بت و زنار و ناقوس و چلیپا
مغ و ترسا و گبر و دیر و مینا

شراب و شاهد و شمع شبستان
خروش بربط و آواز مستان

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

آمد اور بدان کو دیذی ، شاذ ، باذ ، یابذ ، آمذ اور بذان مرقوم کیا ہے ۔ است کا الف اکثر اوقات حذف کردیا گیا ہے ؛ مثلاً خوش است ، خیراست اور مسکین است کو خوشست ، خیرست اور مسکینست لکھا ہے ۔ آنچہ ، چنانکہ اور آنکہ کو آنچ ، چنانک اور آنک عام طور پر لکھا ہے ۔ 'تا' و 'یا' کے نقاط پہلو بہ پہلو ایک ہی سطح پر ملا کے نہیں لکھے جاتے بلکہ علیحدہ علیحدہ مختلف سطحوں پر: مثلاً 'ت' اور 'ی' کو یوں لکھا ہے : 'ت' و 'ي' ۔ علاوہ بریں یاے تحتانی کے اوپر نقاط لگانے کی رسم بھی جاری ہے مثلاً دیدی ، دمیدی اور خمیدی کو ذیذی ، دمیذی اور خمیذی لکھا گیا ہے ۔ کاف بیانیہ ، ہاے مختفی کے علاوہ یاے تحتانی کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے ۔ جیم و کاف و باے فارسی اور عربی میں کچھ امتیاز نہیں ۔ جب 'با' و 'یا' یا 'نون' و 'تا' ساتھ آگئے ، ان کے نقاط کو بلا امتیاز ایک ہی جگہ لکھ دیا ہے ؛ مثلاً تنگنائے اور بیروں کو 'تنکنای' اور 'پرون' لکھا ہے ۔ میم و دال مہملہ ، سین مہملہ و رائے مہملہ پر بعض اوقات الٹا جزم دیا ہے اور ہاے ہوز کے سوسہ نہیں دیا جاتا ۔ (حاشیۂ مصنف)

می و می خانہ و رلد خرابات
حریف و ساقی و مرد مناجات
خط و خال و قد و بالا و ابرو
عذار و زلف پیچان پیچ گیسو
مشو زنہار ازان گفتار در تاب
برو مقصود ازان گفتار در یاب
مپیچ اندر سر و پای عبارت
ببین اشعار ارباب اشارت
کہ ہر یک را ازین الفاظ جانیست
بزیر ہر یکی پنہان جہانیست

جذباتِ عرفان کو مجاز کی زبان میں ادا کرنے کا طریقہ سب سے پیش‌تر سنائی سے شروع ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں اس طریق کو مقبول بنانے والے شیخ فرید الدین عطار ہیں - ان کے ہاں اسرارِ عرفان ، رندانہ طریق سخن میں ادا کیے گئے ہیں - گویا حقیقت کو مجاز کے پردے میں اور کعبے کو صنم خانے کے آغوش میں چھپا دیا گیا ہے - عطار کے بعد مولانا روم اور ان کے بعد شیخ عراقی یہی رنگ اختیار کرتے ہیں - نشۂ عشق ان پر چھایا ہوا ہے - رندی اور سرمستی ان کی شاعری کی روح ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ غزل اسی قسم کے جذبات سے معمور ہے -

شیخ نظامی کے رزمیہ اشعار کی مثال میں مولانا شبلی نے دو شعر بھی درج کیے ہیں :

ز سم ستوران دران پہن دشت
زمین شش شد و آسمان گشت ہشت
فرو رفت و بر رفت روز نبرد
نم خون بماہی و بر ماہ گرد

(شعرالعجم ، صفحہ ۳۴۱)

درست یہ ہے کہ دونوں شعر فردوسی کے ہیں اور تمام مطبوعہ و غیرمطبوعہ شاہ ناموں میں ملتے ہیں ۔ بیاض بندہ علی خاں میں فردوسی کے منتخب کلام میں یہ اشعار بھی موجود ہیں ۔ اب بھی اگر کسی صاحب کو شبہہ ہو تو مخزن الغرائب[1] سے ذیل کا لطیفہ جو سرخوش[2] کے حالات میں درج ہے ، ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ۔ واضح رہے کہ صاحب مخزن الغرائب ، جو سرخوش سے اس کے عجیب انداز خود ستائی کی بنا پر ناراض ہیں ، لکھتے ہیں اور سرخوش کی عبارت نقل کرتے ہیں :

می گوید ''شبی در خواب دیدم کہ روح من در سیر سماوات است ۔ شوری در گوش من می آید کہ احسنت و آفرین باد ۔ ہیچ صورتی بہ نظر در نمی آید ۔ من پرسیدم کہ تحسین چہ چیز می کنند ۔ گفتند بیتی از ملا نظامی گنجوی مقبول ملاء الاعلی افتادہ کہ گفتہ :

ز سم ستوران در آن پہن دشت
زمین شش شد و آسمان گشت ہشت

گفتم شعر خود بلند است اما رزمیہ است ، این جا چہ مناسبت دارد ۔ این جا باید کہ شعر توحید و نعت درجۂ قبول یابد ۔ در خواب خندہ می کنم و می گویم کہ راست گفتہ‌اند کہ معلوم شد شعر فہمی عالم بالا ۔''

اس پر صاحب مخزن الغرایب ذیل کے الفاظ اضافہ کرتے ہیں :
''دروغ گو را حافظہ نباشد ۔ این عزیز شعر فردوسی را بہ شیخ نظامی قرار دادہ و فرشتگان را بہ نسیان منسوب نمودہ کہ شعر فردوسی را بنام شیخ نظامی گویند ۔''

---

۱ ۔ احمد علی سندیلہ کی تصنیف ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ ۔ کلمات الشعرا کا مصنف ۔ (حاشیۂ مصنف)

قولہ : ''۱۴ رمضان ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرب ارسلان علاء الدین آقسنقری کی فرمایش سے ہفت پیکر لکھی جس میں بہرام گور کا قصہ ہے ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۹۶)

نظامی نے اس پادشاہ کا نام علاء الدین کرب ارسلان[1] دیا ہے۔ چناں چہ :

عمدۃ المملکت علاء الدین
حافظ و ناصر زمان و زمین
شاہ کرب ارسلان کشور گیر
بہ ز الپ ارسلان بتاج و سریر[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقب ''غیاث الدین'' اس کے نام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ۔

یہ علاء الدین امیر مراغہ ہے ۔ وہ آقسنقر احمد یلی کے اسباط سے ہے جس کو باطنیوں نے ۵۲۷ھ میں قتل کیا ہے ۔ خود علاءالدین کے متعلق اسی قدر معلوم ہے کہ ایتوغمش نے ۶۰۲ھ میں اس کا محاصرہ کیا تھا ۔ ''راحت الصدور'' میں اس کو اتابک علاء الدین خداوند مراغہ لکھا ہے اور سلطان طغرل کے حالات میں دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے ۔

اگرچہ عام خیال ہے کہ بہرام نامہ علاءالدین کی فرمایش پر لکھا گیا ہے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ نظامی نے اپنی خواہش سے اس کے نام پر منسوب کیا ہے ۔ میرے مؤید یہ اشعار ہیں :

۱- ''این نامہ بنام سلطان علاء الدین کرب ارسلان اقسنقری در حدود پانصد و نود و سہ هجری انجام یافتہ ولی سال آغاز او معین نیست۔''
(وحید دستگردی ، گنجینۂ گنجوی ، صفحہ فب)
(مرتب)

۲- خمسۂ نظامی ، مرتبہ وحید دستگردی ، صفحہ ۶۱۲ - (مرتب)

چون من الحق شناختم به قیاس
کاهل فرهنگ را تو داری پاس
نخری رزق کیمیا سازان
نه پذیری فریب طنازان
نقش این کارنامهٔ ابدی
بر تو بستم به طالع اسدی[1]

(هفت پیکر ، صفحه ۱۱ ، طبع نول کشور ، ۱۳۲۲ھ)

دیگر

این چنین نامه بر تو شاید بست
کز تو جای بلند نامی هست
چونکه شد لعل بسته بر تاجش
بر تو بستم ز بیم تاراجش
گر بسمع تو دل پسند بود
چون بزیر تو ارجمند[2] بود

(هفت پیکر ، صفحه ۱۱۳ ، طبع نول کشور ، ۱۳۲۲ھ)

نظامی نے یہ کتاب ایک خط کے ساتھ علاء الدین کے پاس ، جب وہ روئیں دژ میں مقیم تھا ، بھیجی تھی -

قوله : "قصیدے میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا اور جس قدر مثنویاں لکھیں ، سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں ، تاہم قصیدے کو انھوں نے مداحی سے آزاد رکھا اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صفت سے اور بھی مفید کام لیے

۱- خمسهٔ مرتبه وحید دستگردی میں "رصدی -" (صفحہ ۶۱۷) (مرتب)

۲- خمسهٔ مرتبه وحید دستگردی (صفحہ ۸۳۲) میں "سر بلند -" (مرتب)

جا سکتے ہیں ، لیکن افسوس ہے کہ ان کے نقش قدم پر کوئی نہ چلا ۔" (شعرالعجم ، صفحہ ۲ - ۳۰۱)

جب مثنوی کے میدان ہی میں شیخ نظامی سلاطین کی مدح سرائی سے باز نہیں آتے تو قصائد کے میدان میں خدا جانے کیا قیامت ڈھاتے ہوں گے ۔ خود مولانا شبلی فرماتے ہیں :

"مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں......... پادشاہوں کے سامنے اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں وہی ہوتی ہے جو گدا پیشہ شاعروں کا انداز ہے ؛ یعنی حضور کا نمک خوار ہوں ، غلام ہوں ، بندۂ درگاہ ہوں ، حضور کی ذرا سی توجہ سے میرے کام بن جائیں گے ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۹۹ - ۲۹۸)

لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے قصائد لکھے بھی ہیں یا نہیں ؟ عوفی کا بیان ہے کہ مثنویاں یادگار ہیں ، باقی جنسِ کلام سنی نہیں گئی ۔ خود نظامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزلیں اور ضرورتاً قصائد بھی لکھے ہیں ۔ انھوں نے اپنے دیوان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن آج سب ذخیرہ ناپید[1] ہے ۔ لیلیٰ مجنوں :

گر ساز کنم قصاید چُست
او پیش نہد قلاید سست

(خمسہ ، صفحہ ۱۹۳)

قزل ارسلان کے دربار میں قصیدہ لکھ کر لے گئے ہیں ۔ خسرو شیریں :

۱- پروفیسر سعید نفیسی مرحوم نے دیوان قصائد و غزلیات نظامی میں مختلف ماخذ سے نظامی کے نام منسوب کیے جانے والے سولہ قصیدے ، ایک سو اکانوے غزلیں اور کچھ قطعات اور متفرق اشعار جمع کر دیے ہیں ۔ (مرتب)

درآمد راوی و برخواند چون در
ثنای کان بساط از گنج شد پر
(خمسہ ، صفحہ ۱۹۲)

بہرحال قصیدے جو کچھ لکھے آج نہیں ملتے ؛ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ قصیدوں میں آن کا انداز مداحیہ تھا یا حکمیہ۔ ایک قصیدہ جس کی ابتدا ہے : مصرع

ملک الملوک فضلم بفضیلت معانی[1]ــــالخ

ان کی طرف منسوب ہے ۔

نظامی کے حالات

نظامی کے حالات و مقولات سے اگرچہ مجھ کو کافی مزاولت نہیں ، تاہم سرسری مطالعے میں جو باتیں میری نظر سے گزریں ، یہاں ذکر کرتا ہوں :

شیخ کی کم سنی میں ان کے والد یوسف کا انتقال ہوگیا ہے ۔ ان کی ایک نصیحت کتاب شیریں خسرو میں قلم بند کی ہے :

پدر کز من روانش باد پر نور
مرا پیرانہ پندی داد مشہور
کہ از بیدولتان بگریز چون تیر
وطن درکوی صاحب دولتان گیر
(خمسہ ، صفحہ ۱۸۳)

والدہ ایک کرد خاندان کی رئیسہ تھیں اور ان ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی ۔ لیلیٰ مجنوں :

۱۔ ملاحظہ ہو دیوان قصاید و غزلیات نظامی مرتبہ سعید نفیسی صفحہ ۵۷ - ۲۵۵ ۔ (مرتب)

کو مادر من رئیسہ[۱] کرد
مادر صفتانہ پیش من مرد
غم بیشتر از قیاس خورد است
گرداب فزون ز قدِ مرد است

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۹)

ایک ماموں بھی تھے جن کا نام خواجہ حسن یا عمر[۲] تھا۔ یہ ان کی بیش تر ضروریات کے کفیل تھے۔

لیالی مجنوں :

کو خواجہ حسن کہ خال من بود
خالی شدنش وبال من بود

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۹)

ازواج کے متعلق یہ یاد رہے کہ ان کی تین بیویاں تھیں اور اگر زائد بھی ہوں تو تعجب نہیں ۔ لیکن یہ سب کنیزیں تھیں اور سب کا انتقال ان کی زندگی میں ہوا[۳] ۔ زیادہ بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ

۱- آقای وحید دستگردی اس شعر سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ نظامی کی والدہ کا نام رئیسہ تھا : ''نام مادرش رئیسہ و از قبیلہ کرد بود ۔''
(صفحہ ز ، گنجینۂ گنجوی)

لیکن سعید نفیسی لکھتے ہیں :
''مرحوم وحید ازین بیت استنباط کردہ است کہ نام مادرش 'رئیسہ' بودہ و حال آنکہ پیداست دربن بیت کلمۂ رئیسہ اسم عامست و نہ اسم خاص ۔''

(دیوان قصاید و غزلیات نظامی ، صفحہ ۳) ۔ (مرتب)

۲- لیلیٰ مجنوں طبع نول کشور ۱۳۳۲ ہجری میں خواجہ عمر لکھا ہے ۔
(حاشیۂ مصنف)

۳- ''نظامی سہ زن وسہ ہمسر یکی بعد از مرگ دیگری اختیار کردہ و این ہر سہ پیش از رحلت وی دار دنیا را وداع گفتہ اند ۔''
(صفحہ ز ، گنجینۂ گنجوی ، وحید دستگردی)
(مرتب)

مثنویاں بیویوں کے حق میں منحوس ثابت ہوئیں - پہلی کنیز[۱] جن کو شاہ دربند نے ان کی خدمت میں بھیجا تھا ، شیریں خسرو کی ولادت پر اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں - شیریں کی وفات کے موقعے پر شیخ نے ان کا مرثیہ لکھا ہے :

سبک رو چون بت خفچاق من بود
گمان افتاد خود کافاق من بود
همایون پیکری نغز و خردمند
فرستاده به من دارای دربند
چو ترکان گشته سوی کوچ محتاج
به ترکی داده رختم را به تاراج

(خمسہ ، صفحہ ۱۱۸)

دوسری بیوی لیلی مجنوں کی تصنیف کے دور میں داغِ مفارقت دے گئیں - اقبال نامہ :

چو بر گنج لیلی کشیدم حصار
دگر گوهری کردم آنجا نثار

(خمسہ ، صفحہ ۲٦۷)

شرف نامے کے اختتام کے بعد تیسری بیوی رحلت کر گئیں - اقبال نامے میں مرثیہ موجود ہے :

فلک پیشتر زانکه آزاده بود
ازان به کنیزی مرا داده بود
همان مهر و خدمتگری پیشه داشت
همان کاردانی در اندیشه داشت

۱- محمد ان ہی کے بطن سے معلوم ہوتے ہیں :

اگر شد ترکم از خرگه نهانی
خدایا ترک زادم را تو دانی

(خمسہ ، صفحہ ۱۱۸) - (حاشیہ مصنف)

بباده نهاده رخش ماه را
فرس طرح کرده بسی شاه را
خجستہ گلی خون من خورد او
بجز من نکس در جہان مرد او
چو چشم مرا چشمہ نور کرد
ز چشم منش چشم بد دور کرد
ربایندہ چرخ آن چنانش ربود
کہ گفتی کہ تا بود ہرگز نبود
بخوشنودیی کان مرا بود ازو
چگویم خدا باد خوشنود ازو

(خمسہ ، صفحہ ۲۶۶)

خود فرماتے ہیں کہ بیویوں کے معاملے میں بڑا بد قسمت ہوں۔ جہاں ایک نئی مثنوی لکھنے بیٹھا ایک بیوی کی قربانی دینی پڑی:

مرا طالع طرفہ ہست از سخن
کہ چون نو کنم داستان کہن
در آن عہد[1] کان شکر افشان کنم
عروس شکر خندہ قربان کنم
ندانم کہ با داغ چندین عروس
چگونہ کنم قصہ روم و روس

(خمسہ ، صفحہ ۲۶۶)

ولاد میں صرف ایک فرزند کا ذکر کرتے ہیں جن کا نام محمد تھا۔ ان کے سوا کوئی اور اولاد نہ تھی۔ شیریں خسرو میں سب سے پہلے ان کا ذکر آتا ہے جب سات سال کے تھے:

بہ بین ای ہفت سالہ قرۃ العین
مقام خویشتن در قاب قوسین

۱۔ خمسہ اشاعت دستگردی (صفحہ ۱۱۹۶) میں "عید۔" (مرتب)

منت پروردم و روزی خدا داد
نه بر تو نام من نام خدا باد

(خمسه، صفحه ۲۷۸)

لیلی مجنوں کے وقت ان کی عمر چودہ سال تھی :

ای چارده ساله قرة العین
بالغ نظری علوم کونین
آن روز که هفت ساله بودی
چون گل به چمن حواله بودی
و اکنون که بچارده رسیدی
چون سرو باوج سر کشیدی

(خمسه، صفحه ۲۰۸)

سکندر نامے کی ابتدا کے وقت محمد سترہ سال کے تھے :

و زین هفده خصل آوریدن بدست
شده هفده ساله بدینسان که هست

محمد عوفی نے لباب الالباب میں نظامی کے اشعار ان کے فرزند کے مرثیے سے نقل کیے ہیں جو یہ ہیں :

ای شده همسر خوبان بهشت
آن چنان عارض و آنکه برخشت

بر نخ عمر بسر کردن خوش
دوزخی ناشده رفتی به بهشت

خط نیاورده بتو عمر هنوز
این قضا بر سرت آخر که نوشت

چه عجب گر شودی جان جهان
خاک از دیدهٔ من خون آغشت

سبزه زار خطت اندر خاکست
آب کی باز توان داد بکشت

(لباب الالباب، طبع یورپ، صفحه ۳۹۷)

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد ہی ہیں جو نوجوان انتقال کرتے ہیں - لیکن ان کی وفات کا حادثہ اقبال نامے کے اختتام کے بعد تصور کرنا چاہیے- شیخ نظامی مثنویات کے مشغلے اور عزلت گزینی سے قبل ایک زمانے تک درباداری کرتے رہے ہیں - بہرام نامہ :

من کہ سر سبزیم نماند چو بید
لالہ زرد و بنفشہ گشت سفید

باز ماندم ز ناتنومندی
از کلہ داری و کمربندی

خدمتی مرد وار می کردم
راستی را کنون نہ آن مردم

روزگارم گرفت و بست چنین
عادت روزگار هست چنین

نا فتادہ شکستہ بودم بال
چون فتادم چگونہ باشد حال (خمسہ ، صفحہ ۱۱)

مخزن اسرار کے وقت ان کی عمر از روئے حساب سینتیس سال ہونی چاہیے کیوں کہ میرے خیال میں یہ نظم سنہ ۵۷۲ ، ۵۷۳ ہجری میں لکھی گئی ہے - شیریں خسرو کے وقت پورے چالیس سال کے تھے - چنانچہ :

پس از پنجاہ چلہ در چہل سال
مزن پنجہ برین حرف ورق مال

(خمسہ ، صفحہ ۵۹)

دوسرے موقع پر کہا ہے :

چو در عہد چہل سال از کم و بیش
رسد گوئی چنان را آن چنان پیش

(خمسہ ، صفحہ ۵۷)

پچاس سالہ عمر کی طرف بھی اس میں اشارے موجود ہیں :

بدین پنجاه سالہ حقہ بازی
بدین یک مہرہ کل تا چند بازی
نہ پنجہ سال اگر پنجہ ہزار است
قلم در کش کہ ہم ناپایدار است

(خمسہ ، صفحہ ۳۲)

لیلیٰ مجنوں کے وقت انچاس سال کے تھے۔ بہرام نامہ کے وقت جو سنہ ۵۹۳ ہجری میں اختتام پذیر ہوتا ہے ، ان کی عمر اٹھاون سال کے قریب ہونی چاہیے۔

شرف نامہ ۵۹۶ھ میں اور اقبال نامہ ۵۹۹ھ میں ختم ہوتے ہیں۔ اس تصنیف نے سب سے زیادہ وقت لیا ہے۔ پچاس برس کی عمر میں اس کو شروع کرتے ہیں اور تریسٹھ سال کے سن میں انجام کو پہنچاتے ہیں۔ پچاس سالہ عمر کی طرف اشارہ یہ ہے :

چو تاریخ پنجہ در آمد بسال
دگر گونہ شد بر شتابندہ حال

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۳)

ستاون سال کی طرف تلمیح شعر ذیل میں موجود ہے۔ اقبال نامہ :

هنوزم بہ پنجاہ و هفت از قیاس
درم بر ترازو نہد حق شناس

(خمسہ ، صفحہ ۳۳۲)

ساٹھ سال کا ذکر یوں کیا ہے۔ اقبال نامہ :

بہ شصت آمد اندازۂ سال من
نگشت از خود اندازۂ حال من

(خمسہ ، صفحہ ۳۳۲)

اور سب سے آخر میں تریسٹھ برس کی عمر کا بیان ملتا ہے۔ اقبال نامہ :

فزون بود شش مہ ز شصت و سہ سال
کہ بر عزم رہ بر دهل زد دوال

(خمسہ ، صفحہ ۳۳۰)

اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ نظامی نے پچیس چھبیس سال خمسے کی تصنیف پر صرف کیے ہیں ، لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ بغیر کسی اور مشغلے کے مسلسل اسی کام پر مصروف رہے ۔ یہ صورت بھی واقع ہوئی ہے کہ ابھی ایک کتاب ختم ہونے نہیں پائی ہے کہ دوسری کی داغ بیل ڈال دی اور پھر دوسری کو چھوڑ کر پہلی کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ شیریں خسرو ، لیلیٰ مجنوں سے اور سکندر نامہ ، بہرام نامے سے بہت پہلے شروع کیے جاتے ہیں ، لیکن ان کے اختتام کے ایک عرصے بعد تکمیل پاتے ہیں ۔

شیریں خسرو ایک ایسی کتاب ہے جس کی تاریخ تصنیف اچھی طرح معلوم نہیں ۔ ایک شعر میں ۵۷۶ھ دیا گیا ہے :

گذشته پانصد و هفتاد و شش سال
نزد بر خط خوبان کس چنین خال

(خمسہ ، صفحہ ۱۸۹)

اور خیال کیا گیا ہے کہ یہ خاتمے کی تاریخ ہے ، لیکن یہ عقیدہ درست نہیں ۔ یہ اس مثنوی کی ابتدا یا اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ ہے ۔ طغرل بن ارسلان (۵۷۱ و ۵۸۰ ہجری) کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ اس کتاب پر قلم اٹھایا جاتا ہے :

ملک طغرل که دارای وجود است
سپهر دولت و دریای جود است
بسلطانی بتاج و تخت پیوست
بجای ارسلان بر تخت بنشست
من این گنجینه را در می‌کشادم
اساس این عمارت می‌نهادم

(خمسہ ، صفحہ ۵۴)

ابتدا میں ان کا ارادہ تھا کہ ایک نسخہ طغرل کی خدمت میں بھیجیں اور اس سے اتابک شمس الدین ابو جعفر محمد کے نام سفارش کرائیں :

بدان لفظ بلند گوهر افشان
کہ جان عالم است و عالم جان
اتابک را بگوید کای جہانگیر
نظامی وان گہی صد گونہ تقصیر
کہ آمد وقت آن کو را نوازیم
ز کار افتادۂ را چارہ سازیم
چنین گویندۂ در گوشہ تا چند
سخندانی چنین بی توشہ تا چند
کنون عمریست کین مرغ سخن سنج
بشکر نعمت ما می برد رنج
بدان سر کز سریر عرش بیش است
کہ گر بنوازیش بر جای خویش است
(خمسہ ، صفحہ ۴۸د)

کتاب ختم ہونے کے بعد وہ کچھ مدت طغرل کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے منتظر بھی رہے :

بدین نیکو کہ مقصود دل آمد
بکم مدت مرادم حاصل آمد
درنگ از بہر آن افتاد در راہ
کہ تا فارغ شود از شغل ہا شاہ
بفتح ہفت کشور سر بر آرد
سر نہ چرخ را در چنبر آرد
شکوہش چتر بر گردون رساند
سمندش کرہ بر جیحون جہاند
(خمسہ ، صفحہ ۴۵)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد خود ہی کتاب لے کر اتابک شمس‌الدین کے دربار میں حاضر ہوئے اور مدعاے دلی ان اشعار میں ادا کیا :

بدستوری حدیثی چند کوتاه
بخوانم من اگر فرمان دهد شاه

من شب خیز کز پیکان راهم
جرس جنبان هاروتان شاهم[1]

بر عرض[2] بندگی دیر آمدم دیر
اگر دیر آمدم شیر آمدم شیر

چہ خوش گفت آن سخن گوی جہانگرد
کہ دیر آی و درست آ ای جوانمرد

غیر حاضری کی معافی اس لیے مانگی جا رہی ہے کہ گنجہ کچھ عرصہ قبل اتابکوں کے قبضے میں آچکا ہے :

ز گنجہ فتح خوزستان کہ کرد است
ز عمان تا بہ اصفاهان کہ خورد است

(خمسہ ، صفحہ ۵۵)

اور نظامی اس وقت سے اب تک اس کے دربار میں حاضر نہیں ہوئے ہیں ۔ کتاب پیش کرتے وقت کہتے ہیں :

درین اندیشہ بودم مدتی چند
کہ نزلی سازم از بہری خداوند

نبودم تحفۂ جیپال و فغفور
کہ پیش آرم زمین را بوسم از دور

بدین مشتی خیالی فکرت انگیز
بساط بوسہ کن کردم شکر ریز

---

۱ ۔ خمسہ مرتبہ وحید دستگردی (صفحہ ۱۳۷) میں یہ شعر یوں درج ہے :
من از سحر سحر پیکان راهم   جرس جنبان و هاروتان شاهم
(مرتب)

۲ ۔ اشاعت دستگردی میں ''عرش ۔'' (مرتب)

اگرچہ مور قربان را نشاید
مگس نزل سلیمان را نشاید
نبود آبی جزین در مغز میغم
وگر بودی نبودی هم دریغم

(خمسہ ، صفحہ ۵۰)

چونکہ کتاب قزل ارسلان کے بڑے بھائی اتابک محمد کے نام معنون کرتے ہیں ، قزل ارسلان سے اس کی معذرت میں کہتے ہیں :

کہ گر بودم ز خدمت دور یک‌چند
نبودم فارغ از شغل خداوند
کمر بستم بہ تعلیم فسانہ
بدین خدمت ترا کردم نشانہ
چو شد پرداختہ در سلک اوراق
مسجل شد بنام شاہ آفاق

اس انتساب کی وجہ صرف یہ ہے کہ چونکہ آپ ہر ایک چیز اپنے بھائی کے نام کے ساتھ نسبت دینے کے خواہش مند ہیں اس لیے میں نے پیش بینی کر کے اس کو انھی کے نام پر معنون کیا :

چو دانستم کہ این جمشید ثانی
کہ بادش تا قیامت زندگانی
اگر یک برگ گل بیند درین باغ
بنام شاہ آفاقش کند داغ
مرا این رهنمونی بخت فرمود
کہ تا شہ باشد از این بندہ خشنود

(خمسہ ، صفحہ ۵۷)

اتابک محمد نے شیریں خسرو کے صلے میں دو گاؤں تجویز کیے تھے ۔ لیکن ابھی سند تیار نہیں ہوئی تھی کہ اتابک کا ۵۸۲ھ میں

---

۱ ۔ اساعت دستگردی (صفحہ ۱۳۷) میں ''ملخ ۔'' (مرتب)

انتقال ہوگیا ۔ قزل ارسلان ان حالات سے باخبر تھا لہٰذا اس نے تخت نشینی کے بعد ایک موقع پر ، جب گنجہ سے ۳۰ فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن تھا ، قاصد بھیج کر ان کو بلایا ۔ جب دربار میں آئے ، بڑا احترام کیا اور موضع حمدونیاں انعام میں دے دیا ۔ نظامی کی یہ خواہش تھی کہ ایک گاؤں سلطان دے اور دوسرا شہزادوں سے دلوائے :

یکی دہ زان دو شہ را داد باید
خود از شہزادگان دیگر کشاید

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۵)

دوسرا گاؤں ان کو شاید کبھی نہیں ملا ۔ اسی اثنا میں قزل ارسلان ایک شب ، اپنے بستر پر مقتول پایا جاتا ہے ۔ اس کے جسم پر چھروں کے پچاس زخم تھے ۔ یہ واقعہ بقول صاحب جامع التواریخ شوال ۵۸۷ھ میں پیش آیا :

بسلطانی چو شہ نوبت فرو کوفت
غبار فتنہ از گیتی فرو روفت

شکوہش پنج نوبت بر فلک زد
نفاذش گرد ہفت اقلیم را خورد

خروش طبل گفتی تا دو میل است
کہ میدانست کان طبل رحیل است

بدان اورنگش آرام اندکی بود
چو برقش زادن و مردن یکی بود

بری ناخوردہ ز ایام جوانی[1]
چو ذوالقرنین ز آب زندگانی

شہادت یافت از زخم بد اندیش
کہ باشد آن جہانش زین جہان بیش

(خمسہ ، صفحہ ۱۹۳)

۱ ۔ اشاعت دستگردی (صفحہ ۴۲۳) میں ''از باغ جوانی'' (مرتب)

قزل ارسلان صرف پانچ سال یعنی سنہ ۵۸۲ ہجری سے ۵۸۷ھ تک حکومت کرتا ہے ۔ شاعر نے اس کو پنج نوبت کے نام سے اور اس کے مارے جانے کے واقعے کو ''شہادت یافت'' سے تعبیر کیا ہے۔ نصرۃ الدین ابوبکر ۵۸۷ھ و ۶۰۷ھ اس کا قائم مقام ہوتا ہے ۔ اور شاعربھی اپنی تصنیفات کو اسی لئے اتابک کے ذکر پر ختم کرتا ہے :

گر او را سوی گوهر گرم شد جای
نسب داران گوهر باد برپای

خصوصاً وارث اعمار شاهان
نظرگاه دعای نیک خواهان

مؤید نصرة‌الدین کافرینش
ز نام او پذیرد نقش بینش

پناه خسروان اعظم اتابک
فریدون وار بر عالم مبارک

ابوبکر محمد کز سر داد
ابوبکر و محمد زو شده شاد (خمسہ ، صفحہ ۹۳-۹۴)

اسی طرح سکندر نامے کی بھی مختلف اشاعتیں مختلف سلاطین کے نام ہیں ۔ سب سے قدیم وہ اشاعت ہے جو ملک عزالدین مسعود خلف قطب‌الدین مودود والی موصل (۵۷۶ھ و ۵۸۹ھ) کے نام پر منسوب ہے ۔ چنانچہ یہ اشعار :

ملک عز دین آنکہ چرخ بلند
باو داد اورنگ خود را کمند

اس عقیدے کا مؤید یہ امر ہے کہ نظامی اپنی عمر پچاس سال اور اپنے فرزند محمد کی عمر سترہ سال بتاتے ہیں ۔ باپ بیٹوں کی عمر کی طرف اشارے سے ظاہر ہے کہ سکندر نامے کی بنیاد سنہ ۵۸۵-۸۷ ہجری کے مابین رکھی جا چکی ہے ۔ یہی کتاب بعد میں جلال الدین اخستان کے فرزند سے منسوب ہوئی ہے :

اگر شد سہی سرو شہ اخستان
تو سرسبز بادی درین گلستان
گر او داشت از نعمتم بہرہ‌مند
رساند از زمینم بچرخ بلند
تو زان بہتر و برترم داشتی
در باغ را بستہ نگذاشتی
مرا از کریمان صاحب زمان
توی ماند باقی کہ باقی بمان

(شرف نامہ ، خمسہ ، صفحہ ۱۹۶)

اس کی آخری اشاعت اتابک نصرۃالدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور سنہ ۶۰۷ ہجری میں اس کی وفات کے بعد نظامی اسی کتاب کو ملک عزالدین ابوالفتح مسعود بن نورالدین ارسلان شاہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں ، جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزارش ہو چکا ہے -

سنہ ۵۹۰ ہجری میں عراق میں ایک خوفناک زلزلہ آیا تھا جس سے بے شمار جانیں تلف ہوئیں اور مختلف شہروں کی عمارات کو نقصان پہنچا - نظامی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں - اقبال نامہ :

ازان زلزلہ کاسمان را درید
شدہ شہرہا در زمین نا پدید
چنان لرزہ افتاد بر کوہ و دشت
کہ گرد از گریبان گردون گذشت
زمین گشت چون آسمان بی قرار
معلق زن از بازی روزگار
برآمد یکی صدمہ از نفخ صور
کہ ماہی شد از کوہہ گاو دور
فلک را ملاسل ز ہم برگسست
زمین را مفاصل بہم در شکست

جہان را چنان درهم افشرد سخت
کز افشردگی کوه شد لخت لخت

ز بس گنج کانروز برباد رفت
شب شنبه را گنجه از یاد رفت[1]

ز چندان زن و مرد و برنا و پیر
برون نامد آوازهٔ جز نفیر

بکم مدت آن مرز ویران و بوم
بفرّ تو آبادتر شد ز روم

(خمسہ ، صفحہ ۲۵۸)

ان کے ہاں طوفان باد کی طرف بھی تلمیح ہے ۔ قزل ارسلان کی مدح میں اپنی ذات کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

اگر طوفان بادی سهم ناک است
سلیمانی چنین داری چه باکست
ز حیف این قران مارا چه بیم است
که دارا دادگر داور رحیم است
قرانی را که با این داد باشد
چو فال او مبارک باد باشد

(خمسہ ، صفحہ ۵۷)

دوسرے مقام پر فرمایا ہے :

نگه دارم به چندین اوستادی
چراغی را درین طوفان بادی

(خمسہ ، صفحہ ۱۹۰)

یہ طوفان جس کے سلسلے میں انوری متاخرین میں ناحق بدنام ہے ، ۲۹ جمادی الثانی ۵۸۲ ہجری میں توقع کیا جا رہا تھا ۔ زیادہ تر اہل تنجیم اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں ، لیکن شعرا بالعموم اس کے

۱ ۔ اس مصرع کا ایک نسخہ یوں بھی ہے :
''شہنشاہ را گنج از یاد رفت''۔ (حاشیہ مصنف)

معتقد نہیں ہیں ؛ مثلاً انوری ، ظہیر ، نظامی اور کمال اسماعیل ۔

سلطان محمود اور فردوسی کے واقعات کی طرف ایک سے زیادہ موقع پر نظامی نے اشارہ کیا ہے ۔ شیریں خسرو میں فرماتے ہیں :

گرت خواہیم کردن حق شناسی
نخواہی کردن آخر ناسپاسی
وگر با تو رہ ناساز گیریم
چو فردوسی ز مزدت باز گیریم
فقاعی را تو دانی سر کشادن
توانی مہر گنج از زر کشادن

(خمسہ ، صفحہ ۵۳)

بہرام نامے کی تمہید میں اشارہ ہوا ہے :

در سخا و سخن چہ می‌پیچم
کار بر طالع است من ہیچم
نسبت عقربی است یا قوسی
بخل محمود و بذل فردوسی
اسدی را کہ جود[1] او بنواخت
طالع و طالعی بہم در ساخت

(خمسہ ، صفحہ ٦)

شرف نامے کے خاتمے میں ممدوح کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے :

زر پیلوار از تو مقصود نیست
کہ پیل تو چون پیل محمود نیست

اقبال نامے میں فرماتے ہیں :

بیاد نظامی یکی طاس می
خوری ہم بآئین کاؤس کی

۱۔ خمسہ ، اشاعت دستگردی (صفحہ ٦۰۲) بجائے ”جود او“ ،”بودلف“ ملتا ہے لیکن پروفیسر سعید نفیسی اس کو ’بر او‘ درج کرتے ہیں ۔ دیکھیے دیوان نظامی ، مرتبہ سعید نفیسی ، صفحہ ۱۰۳ ۔ (مرتب)

ستانی باین طاس طوسی نواز
حق شاهنامه ز محمود باز
دو وارث شہار از دوکان کہن
ترا در سخا و مرا در سخن
بوامی که ناداده باشد نخست
حقِ وارث از وارث آید درست
(خمسه ، صفحه ۲۵۹)

ان ابیات سے اگرچہ کوئی نئی اطلاع بہم نہیں پہنچی ، تاہم اتنا پتا چل گیا کہ نظامی کے عہد میں فردوسی کی ناکامی کا افسانہ عام طور پر رائج تھا ، اگرچہ سلطان کی پیل‌بار انعام بخشیوں کے قصے بھی ساتھ ساتھ مشہور تھے ۔ فردوسی کے سلسلے میں اسدی کے ذکر سے یہ بات صاف ہے کہ نظامی کا مقصد صاحبِ ' گرشاسپ نامہ' سے نہیں ہے بلکہ اسدیِ کلاں سے ۔ گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں ابو دلف والیِ اران کے لیے لکھا گیا ہے اور سلطان محمود سے اس کتب کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا ۔ اسدی کلاں کے حق میں محمود کی فیاضی کا قصہ ہم تک نہیں پہنچا ہے اور گردش ایام کے دراز سفر کے مراحل میں تاریخ کی یادداشت سے محو ہو گیا ہے ۔

یہ خیال کہ نظامی ہمیشہ گوشۂ عزلت میں مقیم رہے اور سلاطین کے دربار میں نہیں گئے ، صحیح نہیں معلوم[1] ہوتا ۔ اول تو ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ مثنوی نگاری کا سلسلہ وہ اپنی عمر کے سینتیسویں سال سے شروع کرتے ہیں ۔ اس سے پیش‌تر آخر

۱۔ اگرچہ اس عقیدے کے خلاف یہ شعر ہیں ۔ بہرام نامہ :

چون بعهد جوانی از بر تو
بر در کس نرفتم از در تو
همه را بر درم فرستادی
من نمی‌خواستم تو می‌دادی

(حاشیۂ مصنف)

وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے ؟ اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسے اعلی دماغ اور روشن طبیعت کا شخص اتنی عمر تک بغیر کسی شغل کے نہیں رہ سکتا ۔ بعض ابیات سے جو اس سے پیش‌تر مرقوم ہوچکے ہیں ، پایا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی دربار سے ان کا تعلق ضرور رہا ہے ۔ سکندر نامے کے ایک بیت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے :

زہ شاہان گیتی درین غار ژرف
کرا بود چون من حریفی شگرف

زمانۂ عزلت میں بھی سلاطین سے تعلق رکھنا اسی امر کی دلیل ہے کہ ایام شباب میں ایک عرصے تک مجلس سلاطین کے حاشیہ‌نشیں رہے ہیں ۔

جیسا کہ ان ابیات سے پایا جاتا ہے ، اتابک محمد اور اس کے بھائی قزل ارسلان کے ہاں حاضر ہوئے ہیں ۔ فخر الدین بہرام شاہ کے دربار میں گئے ہیں اور پھر جانے کا قصد کر رہے ہیں کہ اتنے میں دشمن کی فوجوں نے گنجہ کا محاصرہ کرلیا ، اس لیے انہیں اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا ۔ مخزن اسرار :

بود پسیچم کہ درین یک دو ماہ
تازہ کنم عہد زمین بوس شاہ

گرچہ درین حلقہ کہ پیوستہ اند
راہ برون آمدنم بستہ اند

پیش تو از بہر فزون آمدن
خواستم از پوست برون آمدن

باز چو دیدم ہمہ رہ شیر بود
پیش و پسم دشنہ و شمشیر بود

لیک درین خطۂ شمشیر بند
بر تو کنم خطبہ بنام[۱] بلند (خمسہ ، صفحہ ۱۲)

۱۔ خمسہ ، اشاعت دستگردی (صفحہ ۳۰) میں ''ببانگ'' ۔ (مرتب)

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ طبعاً گوشہ‌پسند تھے۔
شیریں خسرو :

چو مشک از ناف عزات بو گرفتم
بہ تنہائی چو عنقا خو گرفتم

لیکن عمر کے پچاس مراحل طے کرنے کے بعد بھی کبھی کبھی باہر نکلنے اور لوگوں سے ملنے کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے :

برون آی زین پردۂ هفت رنگ
کہ زنگی بود آئینہ زیر زنگ
نہ گو گرد سرخی نہ لعل سپید
کہ جوینده باشد ز تو ناامید

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۲)

دیگر

توانم در زهد بر دوختن
ببزم آمدن مجلس افروختن

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۴)

لیکن پھر اپنے طبعی رجحان سے مجبور ہوجاتے ہیں ۔ شرف نامہ :

و لیکن درختِ من از گوشہ رست
ز جا گر بجنبم شود بیخ سست

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۴)

بعض لوگوں نے آن کے کلام کی دزدی بھی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ ان کی متاع کے سارقوں نے خود انہیں سارق مشہور کر دیا۔
لیلیٰ مجنوں :

دزد در من بجای مرد است
بدگویدم این چہ جای درد است
دزدان چو بکوی دزد پویند
در کوی دولد و دزد گویند

گر دزدی من حلال باشد
بد گفتنِ من وبال باشد
او دزد و منش گزارم از شرم
دزدی خجل است آن بہ آزرم
نی نی چو بگدیہ دل نہادہ است
گو خیز و بیا کہ در کشادہ است
گنجِ دو جہان در آستینم
در دزدیٔ مفلسی چہ بینم
واجب صدقہ ام بزیر دستان
گو خواہ بدزد و خواہ بستان

(خمسہ ، صفحہ ۲۰۷)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے ۔ شرف نامہ :

برین چار سو چون نہم دستگاہ
کہ ایمن نباشم ز دزدان راہ
چو دریا چرا ترسم از قطرہ دزد
کہ ابرم دہد بیش ازان دست مزد
سیاہان کہ تاراج رہ می‌کنند
بدزدی جہان را سیہ می‌کنند
بروز آتشی برنیارند گرم
کہ دارد ہمی دیدہ از دیدہ شرم
دبیران نگر تا بروز سفید
قلم چون تراشند از مشک بید
نہان مرا کاشکارا برند
ز گنجہ است اگر تا بخارا برند
بہ ارسن گذارم کہ خود روزگار
بہر نیک و بد باشد آموزگار

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۲)

کلام پر تبصرہ

نظامی نے اپنی طبیعت کی رنگینی اور مشکل پسندی سے مثنوی گوئی کو ایک ایسے معراج کمال تک پہنچایا ہے جس تک نہ قدما کے پیکِ تخیل کو رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کا طائرِ وہم پہنچ سکا - امیر خسرو اور مولانا جامی نے اس مقام تک پرواز کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن حق یہ ہے کہ نظامی کے ایوانِ بلند تک نہیں پہنچ سکے -

منکہ درین مرحلہ شان ماندہ ام
قدری ازان بیشترک راندہ ام[1]

ان کا طرز وہی ہے جو منوچہری ، قطران تبریزی ، قوامی مطرزی اور خاقانی کا ہے - یہ دبستانِ شعرا جس کو عراق دبستان کہا جا سکتا ہے ، اپنے بلند تخیل ، غیرضروری تکلف ، مشکل پسندی ، صنائع بدائع ، شوکت الفاظ اور مستعار گوئی کے لیے مشہور ہے لیکن نظامی کی جدت یہ ہے کہ انھوں نے قصیدے کی زبان کو مثنوی کے میدان میں کامیابی کے ساتھ برتا - صنعت پرستی ، نئی نئی ترکیبوں ، جدید تشبیہات ، کنایات و استعارات نے ان کے کلام کو دقیق اور مشکل کر دیا ہے - وہ ایک خیال کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنا نہیں جانتے بلکہ پیچ دے کر اس کو ایک دل فریب پیرایے میں ادا کرتے ہیں - تلاش اور موشگافی قدم قدم پر نمایاں ہے جس کے اثر میں بعض اوقات الفاظ و معنی میں تصادم ہوجاتا ہے اور شعر ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے -

آورد کے ذوق میں آمد سے بالکل بےزار ہیں - ان کی رائے میں شعر وہی ہے جو بے حد تلاش اور جگر کاوی کے بعد دستیاب ہو -

---

۱- صفحہ ۲۹ (مخزن الاسرار) خمسہ مرتبہ وحید دستگردی - (مرتب)

شرف نامہ :

سخن گفتن و بکر جان سفتن است
نہ ہر کس سزای سخن گفتن است
بدین دل فریبی سخنهای بکر
بسختی توان زادن از راه فکر

(خمسہ ، صفحہ ۱۳)

دیگر مخزن اسرار :

از پیٔ لعلی کہ بر آرد ز کان
رخنہ زند بیضۂ هفت آسمان
بہ کہ سخن دیر پسند آوری
تا سخن از دست بلند آوری

دیگر شیریں خسرو :

سخن کو از سر اندیشہ ناید
نوشتن را و گفتن را نشاید
سخن گوهر شد و گوینده غواص
بسختی در کف آید گوهر خاص

(خمسہ، صفحہ ۵۸)

زر کے عوض کلام بیچنا ان کے نزدیک ذات میں داخل ہے ۔ مخزن اسرار :

سیم کشانی کہ چو زر مرده اند
سکۂ این کار بہ زر برده اند
هر کہ بزر نکتہ[1] چون روز داد
سنگ ستد لعل[2] شب افروز داد
میوهٔ دل را کہ بجانی دهند
کی بود آبی کہ بنانی دهند (خمسہ ، صفحہ ۳۸)

۱- خمسہ ، مرتبہ دستگردی (صفحہ ۳۳) میں ''سکہ ۔'' (مرتب)

۲- خمسہ ، اشاعت دستگردی میں ''زر ۔'' (مرتب)

اسی لیے ان کو قصیدہ گو شعرا پسند نہیں ہیں۔ بلکہ خود امیر معزی کو، جو ملک شاہ اور سنجر کے عہد کا ملک الشعرا ہے، ناپسند کرتے ہیں۔ مخزن اسرار :

آنکہ سرش زر کش سلطان کشید
باز پسین لقمہ ز آہن چشید
وانکہ چو سیماب غم زر نہ خورد
نقرہ شد و آہن سنجر نہ خورد

(خمسہ، صفحہ ۱۳)

فرماتے ہیں کہ سخن دانی ایک چشمۂ حکمت ہے۔ پیٹ کی خاطر اس چشمۂ پاک کو گندہ کرنا سخت ظلم ہے۔ شعر اسی قسم کا کہنا چاہیے جس کی شرع اجازت دے۔ ان قابل ستایش خیالات کو اپنا بدرقہ بنا کر نظامی شاہراہ سخن پر گامزن ہوتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا اور فارغ البال ہوتے تو وہ اپنے اعلیٰ معیارِ معنی پرستی کے مطابق اسی قسم کا ادبیات پیدا کرتے جس کا نمونہ ہم مخزن اسرار میں دیکھتے ہیں، اور ممکن تھا کہ اس سے بھی بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑتے۔ ان کی اخلاقی رفعت اور شان تقدس سے اسی طرح کی امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اقتضاے وقت اس طلسم کشاے حقیقت کو شہرستان مجاز کا چمن آرا بنا دیتا ہے۔ ضرورت اور مجبوری کا رو سیاہ، یہ ہاروت فن، جو شاہد سخن کو مصطبہ سے آزاد کر کے صومعہ میں آباد کرنا چاہتا تھا، شیریں کے قصر کا مزدور اور لیلیٰ کا محمل آرا بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنی قدرت معنی آفرینی کو خسرو کی آرائش دیہیم اور بہرام کے تاج کی زینت کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ باغ سخن کا یہ نخل‌بند اپنے گلشن کے بہترین پھول جمع کرتا ہے اور ہار بنا کر سکندر کے گلے میں پہنا دیتا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ملک کو نظامی کے تقدس کی بہ نسبت عشقیہ افسانوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہ فرشتہ خصلت بالآخر اس پست معیار پر اتر آتا ہے۔ لیکن خدا جانے کس قدر قلق

اور قربانی کے بعد فرماتے ہیں - شیریں خسرو :

مرا چون مخزن الاسرار گنجی
چہ باید در ہوس پیمود رنجی
و لیکن در جہان امروز کس نیست
کہ او را در ہوس نامہ ہوس نیست

(خمسہ ، صفحہ ۵۸)

مخزن اسرار لکھی ، دنیا نے کوئی صلہ نہیں دیا - شیریں خسرو لکھی اور گاؤں مل گیا - ضرورت نے اگرچہ انہیں مصطبہ نشین بنا دیا ، تاہم اس خرابات کی فضا میں وہ اپنی معنویت کو نہ بھولے - حسن و عشق کی معرکہ آرائیوں کے ضمن میں دانش و حکمت کا درس دینا نہیں چھوڑا - لیلیٰ کے ناز اور شیریں کی عشوہ گری کے پہلو میں اخلاقیات کے موتی دائیں بائیں بکھیر دیے ہیں اور دور از کار واقعات کے گرد و پیش میں تہذیب نفس اور تعلیم انسانی کے دقائق اور نکات بیان کیے ہیں - مختصر یہ ہے کہ دیر میں حرم کا اور خرابات میں صومعہ کا ماحول پیدا کر دیا ہے - چنانچہ آج اگر کوئی ان موتیوں کو رولنا چاہے اور خمسے کا انتخاب کر لے تو اس سے حکمت و دانش کی ایک بڑی کتاب مدون ہو سکتی ہے بلکہ ان کی معنویت کے جرعہ نوشوں نے خلاصۃ الخمسہ کے نام سے ایک علیحدہ تالیف تیار کی ہے - جس طرح نظامی اخلاق اور زندگی کا اعلیٰ معیار پیش کرنے میں پیش پیش ہیں ، اسی طرح انہوں نے اپنی زندگی بسر کی ہے -

فلاسفہ نے ہر ہر شے کا علیحدہ علیحدہ رب النوع مانا ہے - نظامی نے شاعر کے طبعی فیضان یا مبدء فیاض کو مختلف ناموں سے پکارا ہے - کبھی اس کو سروش اور ہاتف کہا ، کبھی سلیمان اور کبھی طغان شاہ - کہیں ہاتف دل کہا ہے - شیریں خسرو :

مرا چون ہاتف دل بود دم ساز
بر آورد از رواق ہمت آواز

(خمسہ ، صفحہ ۵۸)

کہیں اس کو خضر کے نام سے یاد کیا ہے ۔ شرف نامہ :

مرا خضر تعلیم گر بود دوش
برازی که آمد[1] پذیرای گوش

(خمسہ ، صفحہ ۱۲۶)

اور اس شعر کی بنا پر سکندر نامے کے شارحین میں وہ قصہ مشہور ہوگیا ہے جس میں نظامی کو حضرت خضر کا شاگرد تسلیم کیا گیا ہے ۔ لیکن شعر ذیل سے تمام معما حل ہو جاتا ہے ۔ اقبال نامہ :

همانا که آن هاتف خضر نام
که خارا شگاف است و خضرا خرام

(خمسہ ، صفحہ ۲۸۴)

فردوسی اور نظامی

میری رائے میں فردوسی اور نظامی کا مقابلہ کرنا اور ایک کو دوسرے پر تفضیل دینا سخت ظلم ہے ۔ نظامی ، فردوسی سے پورے دو سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں ۔ اس عرصے میں فارسی زبان بے حد ترقی کرچکی تھی۔ بدیع الزمان اور عتبی کے اثرات میں فارسی میں وہ رنگینی پیدا ہو گئی تھی جو فردوسی کے دور میں نامعلوم تھی ۔ نظم و نثر کے ایوان پر صنعت پرستی نے اپنی رنگ آمیزی شروع کر دی تھی۔ منوچہری ، اسدی ، قطران ، انوری ، نصراللہ عبد الحمید مستوفی اور قاضی حمید الدین کی سحرکاریوں نے گلزار سخن کو ہرہفت کر دیا تھا ۔ جب نظامی پیدا ہوتے ہیں ، فارسی کا گلشن پوری بہار پر تھا ۔ انھوں نے اس باغ میں جو پھول کھلائے ، رنگت کے اعتبار سے زیادہ شوخ اور بُو کے اعتبار سے زیادہ دل‌ربا تھے ۔ اس کام کے لیے ان کی طبیعت بے حد موزوں واقع ہوئی تھی ۔ نظامی کو ان کی خدا داد ذہانت ، علمیت اور بلند تخیل نے اپنے معاصرین پر ایک قابل رشک

---

۱ ۔ اشاعت وحید دستگردی (صفحہ ۸۶۲) میں ''نامد (ید) ۔'' (مرتب)

تفوق بخش دیا ہے ۔ صنعت پرستی سے قدرتی لگاؤ رکھتے ہیں ۔ خیالات کو رنگین بنانے میں کمال حاصل ہے ۔ عین عالم جوانی میں بزم شعر میں آتے ہیں ، قدر دانی ہاتھ پکڑتی ہے ، سلاطین عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور معاش کی طرف سے ایک حد تک فارغ البال ہیں ۔ اور اسی صنف سخن پر ہاتھ ڈالتے ہیں جس میں نام پیدا کرنے اور سرخ روئی حاصل کرنے کی گنجائش دیکھتے ہیں ۔ اگر کہیں قصیدے کی بزم میں پہنچتے تو شاید اور معاصرین سے بازی نہ لے جاتے ۔

ادھر فردوسی کو دیکھیے ، عین موسم پیری میں یہ پہلوان سخن وری کے میدان میں آتا ہے ۔ پچاس اڑتالیس برس کی عمر میں شاہنامے کی ہفت‌خوان میں پہلا قدم رکھتا ہے ۔ نامۂ خسرواں اور اس کی پراگندہ داستانوں کی تلاش میں خاصا وقت صرف کر دیتا ہے ۔ ادبیات میں کوئی اعلیٰ نمونہ اس کے پیش نظر نہیں ۔ صرف ایک دقیقی اس کی رہنمائی کرتا ہے ورنہ جس طرف دیکھیے سناٹا نظر آتا ہے اور ہُو کا عالم ہے ۔ قدامت کے ذوق میں وہ نامۂ خسرواں کے ترجمے کے وقت زیادہ تر تحت‌اللفظی ترجمے کا پابند ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اکثر اوقات شاعری کے جذبات کا خون کرنا پڑتا ہے ۔ اس پر تاکید یہ ہے کہ وفات سے پیشتر شاہنامے کے سر پر اختتام کا سہرا بندھا دیکھ لوں ۔ سرپرستوں کے بارے میں بالکل بدنصیب ہے ۔ بڑھاپے کے آلام و امراض کے علاوہ افلاس اور تنگ دستی نے بوڑھے شاعر کو علیحدہ پریشان کر رکھا ہے ۔ جوان بیٹے کی وفات اور بھی اس کی کمر توڑ دیتی ہے ۔ ان مخالف ہواؤں کے باوجود یہ دھن کا پکا شاہنامے کی کشتی کو ساحل تک پہنچا دیتا ہے :

شوق ہے سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دست‌گاہ و قطرہ دریا آشنا

لیکن ایسے ماحول میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ، فردوسی اپنی شاعری کے کیا گل کھلاتا اور کیا گلدستے بناتا ۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر مقابلہ کرنا مقصود ہے تو میں کہتا ہوں کہ

فردوسی کے نشتروں کا نظامی کے نشتروں سے مقابلہ کر لیا جائے۔ اس صورت میں دیکھ لیا جائے گا کہ نظامی با ایں ہمہ رنگینی و آرائش، شان و شکوہ و بلند آہنگی و سرمایۂ جاں گدازی، فردوسی کے مقابلے میں نمایاں طور پر بازی نہیں لے جا سکتے۔ اور میں کہتا ہوں فردوسی کا پلہ پھر بھی بھاری ہے۔ ناصر خسرو کے الفاظ قطران تبریزی کے حق میں، فردوسی بغیر کسی تردد کے نظامی کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اور کیا اس میں کوئی شک کر سکتا ہے کہ ہم نظامی کی تصانیف سے خالص فارسی نہیں سیکھتے۔

فردوسی کا فیضان نظامی پر اس قدر صریح اور نمایاں ہے کہ اس کے وام سے نظامی کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ شیخ، فردوسی کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ جب کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں ایسے الفاظ میں کرتے ہیں جن سے خلوص اور عقیدت ٹپکتی ہے۔ کبھی وہ اس کو دانائے طوس کہتے ہیں، کبھی دانائے پیشینہ اور کبھی پادشاہِ شعرا۔ بعض اوقات اپنی مستانہ خرامی کی ادا میں اس کے وارث بن جاتے ہیں، اور کبھی اپنے ممدوح سے فردوسی کا وہ قرضہ طلب کرتے ہیں جو حسبِ روایتِ شعرا، سلطان محمود کے ذمے واجب الادا ہے۔ نظامی کا یہ جوشِ عقیدت اس میں شک نہیں فردوسی کے حق میں اہل سنت و جماعت کے ہاں ایک بڑی حد تک عزت و احترام کا مورث ہوا ہے جو اس لیے بدنام تھا کہ اس نے شاہنامہ لکھ کر مجوسیوں کی خدمت کی ہے۔

متعدد موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ نظامی بلا تکلف فردوسی کے مقولے باندھ جاتے ہیں۔ لیکن مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نظامی کی تصنیفات سے میری نا آشنائی اس بارے میں زیادہ روشنی ڈالنے سے مجھ کو قاصر رکھتی ہے۔ چند مثالیں بہر حال ہدیۂ ناظرین ہیں:

(۱) چہ خوش گفتہ است فردوسیِ طوسی
کہ مرگِ خر بود سگ را عروسی (خمسہ، صفحہ ۹۵)

(۲) مثل زد درین آنکہ فرزانہ بود
کہ بر ناید از ہیچ ویرانہ دود (صفحہ ۲۵۵)

(۳) نگر آنکہ دانای پیشینہ گفت
کہ بردر نشاید دو سوراخ سفت (صفحہ ۱۲۶)

(۴) چنین زد مثل شاہ گویندگان
کہ یابندگانند جویندگان (صفحہ ۱۲۶)

بعض ماہرین فن امیر خسرو اور مولانا جامی کو الزام دیتے ہیں کہ ان بزرگ واروں نے مولانا نظامی کے خانۂ شاعری کو بالکل تاراج کر دیا ہے ۔ دعوی کیا جاتا ہے (خدا کرے اس میں مبالغہ نہ ہو) کہ ان دونوں بزرگوں کی مثنویات میں کوئی ایسی داستان نہیں جس میں نظامی کا مصرع یا شعر بعینہ یا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ نہ پایا جائے[1] ۔ امثال میں یہ ابیات نقل کیے ہیں جو معاً نظامی سے ماخوذ بتائے جاتے ہیں :

نظامی

مرا ای کاش کی مادر نزادی
وگر زادی بخوردِ سگ بدادی

جامی

مرا ای کاش کی مادر نمی زاد
وگر می‌زاد کس شیرم نمی داد

نظامی

دو کارست با فرّ و فرخندگی
خداوندی از تو ز ما بندگی

۱- احسن القواعد صفحہ ۸۶-۱۸۵، مطبع مجتبائی ، ۱۹۲۳ع - مخزن الفوائد صفحہ ۱۰۷ ، مطبع سنگین - ہفت آسمان ، صفحہ ۴۶ - ۴۷ ، اشاعت ایشیاٹک سوسائٹی بنگال - (حاشیۂ مصنف)

خسرو

ای صفتت بندہ نوازندگی
از تو خدایی و ز ما بندگی

نظامی

زن از پہلوی چپ گویند برخاست
نیاید ہرگز از چپ راستی راست

جامی

زن از پہلوی چپ شد آفریدہ
کس از چپ راستی ہرگز نہ دیدہ

یہ ہماری کوتاہ نظری اور فردوسی کے حق میں بے انصافی ہے اگر ہم نظامی کو ان خیالات کا مخترع یا موجد مانتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ امثال بالا میں خسرو ، جامی اور نظامی ، فردوسی کے خرمن کی خوشہ چینی کر رہے ہیں ۔ ذیل میں فردوسی کے اشعار جن سے نظامی کے اشعار ماخوذ ہیں ، درج ہوتے ہیں :

فردوسی

نزادی مرا کاش کی مادرم
وگر زاد مرگ آمدی بر سرم (صفحہ ۲۱۹)
مرا مادرم گر نہ زادی ز بن
نرفتی ز تن نیک یا بد سخن (صفحہ ۳۳۸)
نزادی مرا کاش کی مادرم
نگشتی سپہر بلند از برم

پذیرفتہ بادا ترا زندگی
ترا شہریاری مرا بندگی

چودختر ز پہلوی چپ شد پدید
ازو راستی در جہان کس ندید

نظامی

مرا ای کاش کی مادر نزادی
وگر زادی بخورد سگ بدادی

دو کار است با فرّ و فرخندگی
خداوندی از تو ز ما بندگی

زن از پہلوی چپ گویند برخاست
نیاید ہرگز از چپ راستی راست

سخن آرائے گنجہ پر فردوسی کا کس قدر احسان ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ایک طویل مطالعے کی ضرورت ہے، جس کا موقع سردست مجھ کو میسر نہیں، تاہم بعض امثال یہاں حوالہ قلم ہیں:

فردوسی	نظامی
نوشتند نامہ بہر کشوری	فرستاد نامہ بہر کشوری
بہر نام داری و ہر مہتری	بہر مرزبانی و ہر مہتری
بہ آواز گفتند ما بندہ ایم	نہادند سر ہا کہ تا زندہ ایم
بفرمان و رایت سرافگندہ ایم	بدین عہد و پیمان سرافگندہ ایم
بخور ہر چہ داری فزونی بدہ	بخور چیزی از مال و چیزی بدہ
تو رنجیدۂ بہر دشمن منہ	ز بہر کسان نیز چیزی بنہ
سپاہ پراگندہ را گرد کرد	پراگندۂ چند را گرد کرد
زمین آہنین شد ہوا لاجورد	کہ از آب دریا بر آورد گرد
زمین گر کشادہ کند راز خویش	زمین گر بضاعت برون آورد
نماید سر انجام و آغاز خویش	ہمہ خاک در زیر خون آورد
کہ گر دو برادر نہد پشت پشت	دو دل یک شود بشکند کوہ را
تن کوہ را خاک ماند بمشت	پراگندگی آرد انبوہ را
نباشی بس ایمن ببازوی خویش	مکن تکیہ بر زور بازوی خویش
خورد گاؤ نادان ز پہلوی خویش	نگہ دار وزن ترازوی خویش

فردوسی	نظامی
نخندد زمین تا نگرید هوا	ز شیران بود روبهانرا نوا
هوا را نخوانم کف پادشا	نخندد زمین تا نگرید هوا
درشتی ز کس نشنود نرم گوی	سخن تا توانی بآزرم گوی
سخن تا توانی بآزرم گوی	که تا مستمع گردد آزرم جوی
سیه مار چندان دمد روز جنگ	سیه شیر چندان بود کینه ساز
که از کام دریا برآید نهنگ	که از دور دندان نماید گراز
ز بهر درم تند و بدخو مباش	ز بهر درم تند و بدخو مباش
تو باید که باشی درم گو مباش	تو باید که باشی درم گو مباش
که او چون من وچون تو بسیاردید	جهان در جهان خلق بسیار دید
نخواهد همی با کسی آرمید	رمید از همه با کسی نارمید
که شاه جهان از گمان برتر است	که شاه جهان از گمان برترست
چو بر تارک مشتری افسر است	جهان کان گوهر شد او گوهرست
که شیری نترسد ز یک دشت گور	یکی گرگ را کو بود سهمناک
نتابد فراوان ستاره چو هور	ز بسیاری گوسفندان چه باک
بکام تو بادا سپهر بلند	بکام تو بادا سپهر بلند
ز چشم بدانت مبادا گزند	ز چشم بدانت مبادا گزند
که دانست کین کودک ارجمند	که دانست کین کودک خورد سال
بدین سال گردد چو سرو بلند	شود با بزرگان چنین بد سگال
جهان را بلندی و پستی تویی	پناه بلندی و پستی تویی
ندانم چه ای هرچه هستی تویی	همه نیستند آنچه هستی تویی
که مرغی که زرین همه خایه کرد	زمانه دگر گونه آئین نهاد
بمرد و سر باز بی مایه کرد	شد آن مرغ کو بیضه زرین نهاد
چو از سرو بن دور شد آفتاب	چو رخت از سر کوه برد آفتاب
سر شهریار اندر آمد بخواب	سر شاه شاهان درآمد بخواب
چنین است گیتی و زین ننگ نیست	درین پرده بر آسمان جنگ نیست
ابا کردگار جهان جنگ نیست	که این پرده با کس هم آهنگ نیست

یکی خیمه‌ای داشت افراسیاب — زهی بارگاهی که چون آفتاب
ز مشرق به مغرب کشیده طناب — ز مشرق به مغرب رساند طناب
بنا کردم از نظم کاخی بلند — نه حرفی که عالم زیادش برد
که از باد و باران نیابد گزند — نه باران بشوید نه بارش برد
چو دانا ترا دشمن جان بود — دشمن دانا که غم جان بود
به از دوست مردی که نادان بود — بهتر ازان دوست که نادان بود

تنقید شعرالعجم

(حصه دوم)

تنقید شعرالعجم
(حصہ دوم)

قولہ : "اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا ۔ ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا ۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا ، یہاں تک کہ اس کا بیٹا نکوداردار خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہوگیا اور اپنا نام احمد رکھا ۔ ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغون خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کرکے ۶۸۰ھ میں قتل کردیا ۔"
(شعرالعجم ، حصہ دوم ، صفحہ ۲ ، معارف پریس اعظم گڑھ)

محقق طوسی کی وزارت کا قصہ کسی اصلیت پر مبنی نہیں ۔ تاریخیں متفق ہیں کہ ہلاکو کا پہلا وزیر امیر سیف الدین بتیکچی بہادر بن‌عبداللہ خوارزمی ہے جو بہ‌حیثیت وزیر ۶۵۳ھ میں ہلاکو کے ساتھ ہی ایران میں آتا ہے اور فتح بغداد کے بعد نجف اشرف کی حفاظت کے لیے ہلاکو سے سو مغولی سپاہی مانگتا ہے ۔ ۶۶۱ھ میں جب ہلاکو برکہ خاں پادشاہ قبچاق کی جنگ کے لیے جاتا ہے ، وزیر موصوف دشمنوں کی بدگوئی کی بنا پر خان کے حکم سے ہلاک کر دیا جاتا ہے ۔ اس واقعے کے بعد صاحب دیوان شمس الدین محمد جوینی منصب وزارت پر سرفراز ہوتے ہیں اور مستقلاً ۲۲ سال برابر یعنی باقی ایام ہلاکو و کامل عہدِ اباقا خاں و سلطان احمد اس عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہتے ہیں ۔ خود محقق طوسی نے کتاب اوصاف الاشراف صاحب دیوان کے نام پر اور کتاب ترجمۂ ثمرۂ بطلیموس ان کے فرزند خواجہ بہاء الدین محمد حاکم اصفہان کے نام پر لکھی ہے ۔ سلطان احمد کا

اصلی نام تکدار، توکدار یا تکودار ہے، نہ نکودار۔ وہ ۶۸۰ھ میں قتل نہیں کیا جاتا کیونکہ ۶۸۱ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور دو سال اور دو ماہ حکومت کرنے کے بعد ہلاک کیا جاتا ہے۔ ترکوں کی مخالفت سلطان احمد کے ساتھ مذہبی بنا پر نہیں تھی، بلکہ زیادہ تر سیاسی تھی۔ اگر مذہب کا سوال درمیان میں ہوتا تو شاید احمد کو تخت ہی نصیب نہ ہوتا، کیونکہ وہ تخت نشینی سے پیشتر ہی حلقہ بگوشِ اسلام تھا اور دربار کے تمام شہزادے اور طاقت‌ور امیر کافر تھے۔ دوسرے دعوے داروں کے باوجود سب کے اتفاق سے سلطان احمد پادشاہ بنایا جاتا ہے۔ ارغون، ہلاکو خاں کا سب سے بڑا پوتا اور اباقا خاں کا فرزندِ اکبر ہے۔ وہ باپ کے تخت کا دعوے دار تھا۔ احمد نے کئی لڑائیوں کے بعد بصد خرابی بصرے سے اس کو گرفتار کیا اور قتل کرنے کے بجائے قید کر دیا۔ ارغون کے طرف داروں نے، جن کی ایک طاقت ور جماعت دربار میں موجود تھی، قید کی پہلی ہی رات سازش کر کے اُس کو آزاد کر دیا اور احمد کے طرف داروں کو قتل کر کے ارغون کو پادشاہ بنا دیا۔

قولہ : "سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے۔ یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے، جو مشہور صوفی گزرے ہیں، اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مدح سرائی کی :

دو جہان را صلای عید زدند
سکہ بر نام بو سعید زدند
در چمن گفتہ بلبل و قمری
مدح این گلبن اولو الامری"

(شعرالعجم، صفحہ ۲)

مصنف جام جم کے "مشہور صوفی" ہونے کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود علامہ شبلی اس سے ناواقف ہیں۔ شیخ اوحدی کرمانی (اوحد الدین حامد کرمانی) ۶۹۷ ہجری میں

بعہد غازان خان وفات پاتے ہیں ۔ مثنوی جام جم ۷۳۳ھ میں تصنیف ہوتی ہے ، چنانچہ شعر :

چون بتاریخ برگرفتم فال
هفتصد رفته بود سی و سه سال

(جام جم قلمی)

در حقیقت اس مثنوی کے مصنف رکن الدین اوحدی مراغی ثم الاصفہانی ہیں ، جو شیخ اوحد الدین کرمانی کے مرید ہیں اور ۷۳۸ ہجری میں انتقال کرتے ہیں ۔ "اوحدی" تخلص انہوں نے اپنے مرشد اوحد الدین حامد کرمانی کے لقب کی یادگار میں رکھا ہے ۔

قوله : ''تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں ، اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا ۔ اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں ، شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لیے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں ۔ مثلاً :

ہمای ہمایون خواجوی کرمانی ، آئینۂ اسکندری امیر خسرو ، سکندر نامۂ جامی ، تیمور نامۂ ہاتفی ، شاہنامۂ قاسم گونا بادی ، اکبر نامۂ فیضی ۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے ہیں ، دل میں کچھ نہیں ۔"

(شعر العجم ، صفحہ ۳)

اس سے پیشتر سامانی ، غزنوی اور سلجوقی دوروں کا مذکور ہو چکا ہے ۔ ان دوروں میں مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کا شاعری پر کوئی اثر نہیں دکھایا گیا ، جس کا اب تاتاری قتل عام سے فنا ہو جانا بیان کیا جاتا ہے ۔ مولانا نے اب تک صرف تین رزمیہ کتابوں یعنی شاہنامہ ، گرشاسپ نامہ اور سکندر نامہ کا زیادہ تر ادبی حیثیت سے ذکر کیا ہے ۔ اور میں یقین نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں نے مسلمانوں کے جنگی و قومی جذبات کو برانگیختہ کرنے ، یا ان کے بیدار رکھنے میں کوئی مدد کی ہو ، کیونکہ ان کی تمام داستانیں

غیر مذاہب کے جنگ آزماؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ رستم سیستانی تھا، کیخسرو کیانی، سکندر یونانی اور نوشیرواں ساسانی۔

فارسی میں رزمیہ شاعری محض اتفاقیہ رائج ہوئی ہے۔ ایرانیوں کو اپنے قومی افسانے اور تاریخ سے شغف تھا، فردوسی نے اس کو نظم کر دیا۔ اسدی نے ایک اور داستان، جس کے واسطے وہ کہتا ہے کہ فردوسی کو نہیں ملی، گرشاسپ نامے کے نام سے نظم کردی۔ ملکی و مذہبی اثرات میں ہمارے ہاں تقلید پسندی کا زور ہے؛ چنانچہ اسلامی ادبیات کے تمام دوروں میں یہی ایک اصول، یعنی تقلید صراحت کے ساتھ نمایاں ہے۔ شاعر اپنے تفننِ طبع کے لیے کسی نہ کسی کا ضرور تتبع کرتے رہے ہیں۔ نظامی کے دور تک، فردوسی کی تقلید کرتے رہے، چنانچہ بہمن نامہ، شہریار نامہ وغیرہ شاہنامے کی تقلید میں لکھے گئے۔ جب نظامی نے اپنی طرز کا اعلیٰ معیار پیش کیا تو تمام صنعت پرست اُن کی طرف جھک گئے۔

چنگیزیوں کے بعد تو مقابلتاً زیادہ رزمیہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا کی فہرست ابھی ناتمام ہے اور میں ذیل کے نام اضافہ کرتا ہوں:

مفتاح الفتوح امیر خسرو، جس میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی جنگ کا ذکر ہے۔ خاور نامۂ ابن حسام (۸۳۰ھ)۔ تغلق نامۂ بدرچاچی، جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار تھے، فتوح السلاطین عصامی اور بہمن نامۂ آذری، فتوحات جاہلی شستری (۹۹۴ ہجری) شاہ رخ نامۂ قاسمی گونابادی، ظفرنامۂ حمد اللہ مستوفی (۷۳۵ ہجری) شہنشاہ نامۂ احمد تبریزی (۷۳۸ ہجری)۔ ظفرنامہ کے اشعار کی تعداد پچھتر ہزار ہے، یعنی شاہنامۂ فردوسی سے بھی پندرہ ہزار اشعار زائد ہیں۔ تاہم مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں اور انھوں نے محض شاعری کے فرائض ادا کیے ہیں۔ خسرو، حمد اللہ مستوفی، جامی اور ہاتفی کے لیے یہ کہنا کہ محض منہ چڑایا ہے، کسی حالت میں صحیح نہیں مانا جا سکتا۔

مولانا کے نزدیک رزمیہ شاعری کے ضروری اوصاف یہ ہیں :

(۱) واقعہ مہتم بالشان ہو (۲) لڑائی کے ہنگامے کا بیان پُر رعب ہو (۳) جنگ کے ساز و سامان ، رزم آزماؤں کی لڑائی کے تمام داؤں پیچ بتائے جائیں وغیرہ ۔ میں کہتا ہوں کہ گزشتہ بالا شعرا میں سے ہر ایک نے قریب قریب ان فرائض کو ادا کیا ہے ، لیکن پھر بھی مولانا شبلی فرماتے ہیں :

اگرچہ شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

''ہمائے ہمایوں'' ایک عشقیہ نظم ہے جس میں شہزادۂ ہما والیِ خاور اور شہزادیٔ ہمایوں دختر فغفور چین کے عشق و محبت کا فرضی قصہ ہے ۔ اس کا رزمیہ نظموں سے کوئی تعلق نہیں ۔

قولہ : ''جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا ، جو تصوف کے سوا ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا ، یعنی غزل گوئی ۔ یہ مسلم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اس کی ابتدا شیخ سعدی اور ان کے معاصرین سے ہوئی ۔''

(شعر العجم ، صفحہ ۴)

جنگی جذبات کی معدومیت اگر ایران میں غزل کے وجود کی ذمہ دار ہے تو آخر اس عہد کے ہندوستان کو کیا ہوا تھا ؟ یہ ملک چنگیزی سیلاب سے بالکل مامون رہا ہے ، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی خسرو اور حسن دہلوی جیسے غزل گو موجود ہیں ۔ تصوف مغولوں کی آمد سے پیشتر اکثر ممالک اسلام میں موجود تھا ، البتہ ان کی آمد نے اس کی ترقی کی رفتار کو تیز کردیا اور یہ تصوف ہے جس نے غزل گوئی کو حقیقی ترقی دی ۔

قولہ : ''کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہوگئے ۔ ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا ۔ اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے ۔ شیخ

سعدی ، ابن یمین ، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے ۔ ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا ، وہی زبان پر آیا ۔" (شعر العجم ، صفحہ ۴)

دنیا کی بےثباتی ، مشرق کے اکثر مذاہب کا ایک وقیع موضوع رہا ہے جس کو ان ممالک کی غیر مستقل طرز حکومت نے اور بھی ممتاز حیثیت دے دی ہے ۔ اسلام میں اس کی تلقین کی آیات کلام پاک میں موجود ہیں ۔ تصوف نے اپنے اصولوں کو اسی مضمون کی اساس پر قائم کیا ہے ۔ ایرانی شعرا میں سب سے پیشتر محمد بن وصیف سجزی اس موضوع کو اپنی شاعری میں روشناس کراتا ہے ۔ رودکی ، ناصر خسرو ، سنائی ، انوری اور خاقانی بغیر کسی استثنا کے یہی بولیاں بول رہے ہیں ۔ لیکن یہ فردوسی ، خیام اور عطار ہیں جن کے ہاں قدم قدم پر یہی درس عبرت دیا گیا ہے ۔ سعدی ، ابن یمین اور خواجہ حافظ اس بارے میں کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں ۔ در حقیقت اگر کوئی شاعر اس انقلاب سے کسی قدر اثر پزیر ہوا ہے تو وہ کمال اسماعیل ہے۔

شیخ فرید الدین عطار

میں رفعِ تشکیک کی غرض سے ابتدا ہی میں گزارش کیے دیتا ہوں کہ علامہ شبلی ، شیخ عطار کو بار بار خواجہ عطار لکھ رہے ہیں ۔ ہم خواجہ کا لفظ آج کل بھی ہر شخص کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے چہجائیکہ آن ایام میں ۔ قدما میں خواجہ کے واسطے کسی قسم کی تعمیم نہیں مانی گئی ، وہ خاص خاص طبقے کے لوگوں کے نام کے ساتھ ملتا ہے ؛ مثلاً اربابِ مناصب و دبیرانِ سلطانی کے ناموں کے ساتھ ۔ علاوہ بریں "خواجہ عطار" کے لقب سے ایک اور بزرگ ، جو نویں صدی ہجری میں وفات پاتے ہیں ، ممتاز ہیں ۔ ان کا پورا نام خواجہ علاء الدین[1] عطار ہے ۔

فقیر کے واقعے کے ذکر کے بعد ، جس کی ناگہانی وفات سے متاثر ہو کر شیخ فرید الدین عطار اپنی دکان لٹا دیتے ہیں ، مولانا شبلی فرماتے ہیں :

"لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود

۱۔ پروفیسر سعید نفیسی اپنی کتاب "احوال و آثار فرید الدین عطار" میں گیارہ ایسے اشخاص کے ناموں کی فہرست دیتے ہیں جن کے اسماء کا ایک جزو 'عطار' تھا ۔ اسی ضمن میں فرماتے ہیں :

"از همه معروفتر علاءالدین محمد بن محمد عطار بخاریست که از بزرگان مشایخ تصوف از سلسلهٔ نقشبندی بوده و از بزرگان اصحاب خواجه بهاءالدین نقشبند بشمار میرفته...و وی در شب چهار شنبهٔ ۲۰ رجب ۸۰۲ پس از نماز خفتن در گذشته ۔"

(صفحہ ۷۱ - ۷۲)۔ (مرتب)

خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں ۔ ان کی کتابوں سے
ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچے میں آنے کے بعد
وہ اپنے قدیم پیشے میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار و
عرفان کی حقائق پر کتابیں لکھتے رہے ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۸ ، مطبع معارف ، اعظم گڑھ)

میں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ عطار کی عمر میں تصوف و عرفان سے ذوق آشنا ہونے کا انقلاب کسی بیرونی تحریک یا واقعے کی بنا پر نہیں ہوا ۔ نہ یہ تبدیلی ان کی عمر کے کسی خاص وقت میں ہوئی ، بلکہ وہ ابتدا ہی سے بنا برتقاضاے طبیعت حضرات صوفیہ کے معتقد اور منازلِ سلوک و عرفان کے سالک تھے ، چنانچہ تذکرۃ الاولیا کے دیباچے میں ارشاد کرتے ہیں :

"دیگر باعث آن بود کہ بی سببی از کودکی باز دوستی این
طایفہ در جانم موج می زد و ہمہ وقتی مفرح دل من از سخن
ایشان بود ، برای آنکہ 'المرء مع من احب' ۔"

(تذکرۃ الاولیا ، صفحہ ۵ ، مرتبہ پروفیسر نکلسن)

رہا فقیر کا قصہ ، وہ صرف اس کی اپنی نوعیت کی بنا پر تسلیم یا رد کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ تمام اہل تذکرہ اس پر متفق ہیں ، صحیح نہیں ، کیوں کہ محمد عوفی اور حمداللہ مستوفی اس کا ذکر نہیں کرتے ۔ عطار کے عہد سے قریباً ڈھائی سو سال بعد سلطان حسین مرزا کے عہد کے مصنفین ، جن میں مولانا جامی اور دولت شاہ قابل ذکر ہیں ، اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعد کے تذکرہ نگار ان کے مقلد ہیں ۔ لیکن خود مولانا جامی اور دولت شاہ اس قصے کے ضمنی واقعات اور سوال و جواب پر متفق نہیں ہیں ۔ بہرکیف میرے نزدیک شیخ عطار کے سوانح میں اس قصے کے لیے کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا ، کیوں کہ اول تو وہ خود ہی ایامِ طفلی سے اصحابِ ذوق و عرفان کی صحبت کے مائل تھے ۔ دوسرے جہاں تک معلوم ہے ، جیسا کہ مولانا بھی معترف ہیں ، شیخ عطار فقر و تصوف کے

ساتھ ساتھ مطب اور دارو خانہ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے "دل بیار و دست بکار" پر عامل رہے۔

قولہ : "خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم میں انھوں نے مدت تک سیّاحی بھی کی۔ "لسان الغیب" میں لکھتے ہیں :

چار اقلیم جہان گردیدہ ام
. . . .

سر بر آوردہ بہ محبوبی عشق
سر کردہ مکہ و مصر و دمشق

کوفہ و ری تا خراسان گشتہ ام
سیحن و جیحونش را ببریدہ ام

ملک هندستان و ترکستان زمین
رفتہ چون اهل خطا از سوی چین

عاقبت کردم بہ نیشاپور جای
اوفتاد از من بعالم این صدای

در نشاپورم بہ کنج خلوتی
با خدای خویش کردم وحدتی

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰)

میرا عقیدہ ہے کہ مولانا شبلی نے "لسان الغیب" بہ چشم خود نہیں دیکھی ہے ، بلکہ ابیاتِ بالا میرزا محمد بن عبدالوہاب کے دیباچہ تذکرۃ الاولیاء مرتبہ پروفیسر نکلسن سے نقل کر لیے ہیں - اور ایسے اشعار کو ترک کر دیا ، جن سے شیخ عطار کی شیعیت کا گمان ہو سکے - مثلاً :

شہر شاپورم تولد گاہ بود
در حرم گاہ رضا ام راہ بود
مرقد اثنا عشر رفتم بچشم
می زنم بردشمنانش سنگ بشم

اس دیباچے میں اسی 'لسان الغیب' سے میرزا محمد نے عطار کی شیعیت کے ثبوت میں یہ اشعار بھی حوالۂ قلم کیے ہیں:

شیعۂ پاکست عطار ای پسر
جنس این شیعہ بجان خود بخر
ما ز فاروق التجا بر کندہ ایم
پی ز نوربن شما ببریدہ ایم
بوحنیفہ را ز دست بگذار تو
خود برو اندر پی کرّار تو

(تذکرۃ الاولیا، طبع بریل، ۱۳۲۲ ہجری، صفحہ یب)

'لسان الغیب'[1] اگرچہ میری نظر سے نہیں گزری، تاہم اس قدر عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمیں اس کتاب کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں بہت کچھ تامل اور تردد سے کام لینا چاہیے۔ یہ کتاب اس قدر نامعلوم ہے کہ جب تک ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس کے کتب خانے کی فہرست ترتیب دے کر شائع نہ کی، اس وقت تک کوئی اس سے واقف نہ تھا۔ سب سے پہلے میرزا محمد قزوینی نے اس کا ذکر کیا اور علامہ شبلی دوسرے شخص ہیں کہ جو اس کا نام لیتے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ''لسان الغیب'' کے مصنف[2] نے اپنی

۱۔ اس تنقید کے چند سال بعد 'لسان الغیب' کے دو نسخے میرے ہاتھ آئے، اس کے مطالعے کے بعد میں بدستور اپنی رائے پر قائم ہوں کہ لسان الغیب اسی شیعہ مصنف کی تالیف ہے جس نے مظہر العجائب لکھی ہے اور عطار کی طرف اس کا انتساب ایک ناپاک افترا ہے۔

(حاشیۂ مصنف)

۲۔ ''در هر صورت هیچ تردیدی نیست کہ مردی بوده است جعال در قرن نهم کہ خود را فرید الدین محمد عطار می خوانده و از مردم تون بوده و در مشهد می زیسته و چندین کتاب سست و بی مغز

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شیعیت کے اظہار میں ایک کتاب ''مظہر العجائب'' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام پر لکھی تھی ، جس میں ان کی مدح میں مبالغے کے علاوہ نواصب ، روافض و خوارج پر ، جن سے اس کی مراد اہل سنت و جماعت ہیں ، جا و بےجا حملے کیے تھے ۔ کسی فقیہ نے جو سمرقندی ہے ، مصنف پر رفض کا الزام لگا کر 'مظہر العجائب' کو جلوا دیا اور خود اس پر قتل کا فتویٰ لگا کر سزا دہی کا حکم دے دیا ۔ عوام الناس ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہو گئے ؛ اس کا گھر لوٹ لیا ، اس کے فرزند کو قید کر دیا اور قریب تھا کہ اس کی جان ضائع ہوجائے ، اتنے میں خداے تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایک برہان دکھائی : غیب سے اس کے کانوں میں آواز آئی کہ اے عطار ! خوف نہ کھا ، ان ظالموں کے ہاتھوں سے تو فوراً رہا ہو جائے گا ۔ اس الہام کے بعد اس کے پرِ پرواز پیدا ہو گئے اور مصنف شہبازِ تیز پرواز کی طرح اڑتا ہوا لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہو گیا :

بالہامم ندا در داد یزدان
کہ ای عطار ! تو خود را مترسان
خلاصی این زمان از دست ایشان
ازین معنی مکن خاطر پریشان

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

مانند اشترنامہ یا شترنامہ و بلبل نامہ و بی سرنامہ وترجمۃ الاحادیث یا مواعظ و جواہر الذات و حلاج نامہ یا منصور نامہ و یا ہیلاج نامہ و خیاط نامہ و سی فصل و کنزالاسرار و کنزالحقائق و گل و ہرمز و لسان الغیب و مظہر العجایب و معراج نامہ و مفتاح الفتوح و وصلت نامہ ساختہ کہ ہیچ وجہ از فرید الدین عطار نیشابوری نیست و در ضمن کتابہای عطار را ہم بخود بستہ است و درمیان او و عطار نیشابوری اندک شباہتی ہم نیست ۔''
(احوال و آثار عطار ، از پروفیسر سعید نفیسی ، صفحہ ۱۶۷) ۔ (مرتب)

پریدم از میان شان چشم کن باز
بالہام الٰہی ہمچو شہباز

(مظہر العجائب قلمی)

اس واقعے کے بعد مصنف وطن سے آوارہ ہو کر مکہ چلا جاتا ہے 'ور وہاں کتاب لسان الغیب تصنیف کرتا ہے :

این لسان از پیش احمد گفتہ ام
در مقام مکہ اش بنوشتہ ام

(از مقدمہ مرزا محمد قزوینی)

لسان الغیب گویا اس ماحول میں پیدا ہوتی ہے ۔ اب اس کو شیخ فرید الدین عطار کی طرف منسوب کرنا جو مذہب سنت و جماعت کے پیرو ہیں ، جیسا کہ اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے ، میں کہتا ہوں سخت ظلم ہے ۔ علیٰ ھذا اس کتاب کی بنا پر شیخ کی سبّاحی کا دعویٰ بھی میرے نزدیک نا قابل قبول ہے ۔ کیوں کہ وہ اس حصہ ادبیاتِ مجعول سے تعلق رکھتی ہے جو شیخ عطار کے نام پر موضوع ہوا ہے ۔ لیکن اس کے متعلق آیندہ بحث ہوگی ۔

قولہ : ''خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے ، خرقہ فقر مجد الدین بغدادی سے حاصل کیا تھا ۔ مجد الدین بغدادی قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب خاص تھے ۔''

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۰)

شیخ مجد الدین بغدادی سے خرقہ فقر حاصل کرنے کی روایت پر اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک کم‌زور اساس پر قائم ہے ۔ تذکرۂ عطار میں ایک فقرہ آتا ہے کہ :

''و من یک روز پیش امام مجد الدین خوارزمی در آمدم ، او را دیدم کہ می گریست ۔ گفتم ''خیر ست؟'' گفت ''زہی سپاہ سالاران کہ درین امت بودہ اند بمشابہ انبیا علیہم السلام کہ ''علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' ۔ پس گفت ''ازان می گریم

کہ دوش گفتہ بودم کہ خداوندا کار تو بعلت نیست ، مرا ازین
قوم یا از نظارگیان این قوم گردان کہ قسمی دیگر را طاقت
ندارم ، می گریم کہ بود کہ مستجاب شدہ باشد ۔''
(تذکرۃ الاولیا ، صفحہ ۶ ، طبع لیڈن)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ امام مجد الدین خوارزمی ، جو عالم ہیں اور شیخ مجد الدین بغدادی جو نجم الدین کبریٰ کے مرید ہیں ، ایک[1] ہی شخص ہیں ؟ دوسرے شیخ عطار جو کہا جاتا ہے ، ۵۱۳ ہجری میں ولادت پاتے ہیں ، شیخ مجد الدین سے عمر میں بہت اقدم ہیں ۔ شیخ مجد الدین کو جو شہرت حاصل ہوئی ، وہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ ہجری و ۶۱۷ ہجری) کے عہد میں ہوئی ہے ۔ اب کیا عطار اسی تراسی سال تک بے پیرے رہے ؟ بالخصوص ایسا شخص جو مشائخ کی صحبت کا بچپن ہی سے شیفتہ تھا ۔ شیخ مجد الدین جو ۶۱۳ھ میں قتل کیے جاتے ہیں[2] ، اپنی وفات کے وقت غالباً جوان ہی تھے ۔ اب شیخ عطار تصوف میں اس قدر

۱۔ پروفیسر سعید نفیسی اپنی کتاب ''جستجو در احوال و آثار فرید الدین عطار نیشاپوری'' میں ان کو ایک شخص گردانتے ہیں ۔ چناں چہ :
''مجد الدین ابو سعید شرف بن مؤید بن فتح یا ابوالفتح محمد بغدادی خوارزمی ، اصل وی از بغدادک خوارزم و برادر بہاء الدین محمد بن مؤید بغدادی کاتب تکش خوارزم شاہ و مولف ''رسالہ جبہیہ'' و ''التوسل الی الترسل'' بودہ و از معروف ترین اصحاب نجم الدین کبریٰ بشمار میرفتہ ۔''
(صفحہ ۳۹ ، احوال و آثار عطار : طبع طہران ، ۱۳۲۰ شمسی)
(مرتب)

۲۔ شیخ مجدالدین کے قتل کی تاریخ کی بابت پروفیسر سعیدنفیسی لکھتے ہیں :
''درست تر آنست کہ مجد الدین بغدادی پس از پانزدہ سال ریاضت در پایان زندگی شیخ الشیوخ خوارزم شدہ بود و درمیان وی و سلطان محمد دشمنی در گرفت و در ۶۱۶ او را غرق کردند ۔''
(صفحہ ۳۹ ، احوال و آثار عطار نیشاپوری) ۔ (مرتب)

شہرت اور تصنیفات کے باوجود اسّی سال کی عمر میں ایک جوان شخص کے ، جو شہرت اور قابلیت میں کچھ بھی درجہ نہیں رکھتا ، مرید بنائے جاتے ہیں ۔ شیخ مجد الدین کی شہرت ان کے خونِ ناحق کی وجہ سے ہوئی ہے ۔ حمد اللہ مستوفی کہتا ہے :

''شیخ مجد الدین بغدادی در سنہ ثلث عشر و ست مائۃ بعہد ناصر خلیفہ بہ تہمت آنکہ با مادر خوارزم شاہ معاشرت ورزیدہ ، بحکم خوارزم شاہ شہید شد ۔ بعد از قتلش خوارزم شاہ پشیمان شد ، بخدمت شیخ نجم الدین کبریٰ رفت و گفت ''چنین خطای از من صادر شد ، دیت خون او چہ باشد ؟'' شیخ گفت ''جان من و تو و اکثر اہل جہان بجہت خون او اشاید ۔ چون ناکردنی کردہ شد ، تدارک نتوان کرد ۔''

حقیقت میں عطار کے مرشد[1] ہونے کے مستحق خواجہ ابوالفضل سعد الدین[2] شافعی المذہب ہیں ، جو وزارتِ خراسان سے دست بردار

۱۔ ہفت اقلیم میں ، اس سلسلے میں شیخ رکن الدین اکّاف کا نام بھی دیا ہے اور مثنویات میں کئی موقعوں پرعطار نے ان کی حکایات درج کی ہیں لیکن شیخ مجد الدین کا نام کہیں نہیں آتا ۔

(حاشیہ مصنف)

۲۔ ان کے متعلق پروفیسر سعید نفیسی رقم طراز ہیں :

''چنان مینماید کہ مراد ازین خواجہ سعد الدین خراسانی با این اوصافی کہ عطار در دانش و پارسائی و پرہیزگاری او میگوید و او را قطب اولیا و صاحب شریعت و طریقت میخواند ، سعد الدین محمد بن مؤید بن ابوبکر حسن بن محمد بن حمویہ حموی جوینی باشد کہ بمناسبت نام جدش او را حموی می نامیدہ اند و اصل وی از مردم بحر آباد جوین و از بزرگان عرفای قرن ششم و از اصحاب معروف نجم الدین کبریٰ بودہ است......و وی در سال ۵۴۲ ولادت یافتہ و در ۶۳ سالگی در روز عید اضحیٰ سال ۶۰۵ درگذشتہ و در بحر آباد جوین مدفون شدہ است ۔''

(احوال و آثار فرید الدین عطار نیشاپوری ، صفحہ ۳۹ - ۴۰) - (مر۲ب)

ہو کر طبقۂ صوفیہ میں شامل ہوتے ہیں اور تیس سال سے زیادہ عرصے تک گوشۂ عزلت میں مقیم رہے ہیں ۔ شیخ عطار نہایت پرجوش اور معتقدانہ الفاظ میں خسرو نامے میں منقبت کے بعد ان کا ذکر کرتے ہیں ۔ میں چند ابیات یہاں نقل کرتا ہوں :

خدا را آنکہ محبوب و حبیب است
ابوالفضل جہان پیر لبیب است

دل و دین خواجہ سعدالدین کہ امروز
دل اوست آفتابی عالم افروز

خراسان را وزارت داشت بالش
ولی انداخت او تا برد آلش

چو ابراہیم ادہم ملک بگذاشت
کہ چون بستی خلافت یک جو انگاشت

سر یک موی او عالم نداند
کہ داند قدر او ادہم نداند

بحق امروز قطب اولیا اوست
حریم خاص را خاص خدا اوست

گر اوتادند ، گر ابدال امروز
ازو دارند کشف حال امروز

چو بود او در شریعت شافعی[1] دوست
طریقت را علی الحق شافعی اوست

شدہ سی سال تا وی بر سخنہا
بخلوت روی آوردہ است تنہا

خدایا قادری و می توانی
باوج ہمت خویشش رسانی

۱۔ پروفیسر نفیسی دونوں مصرعوں میں بجائے ''شافعی'' ''ساوجی'' لکھتے ہیں ۔ دیکھیے احوال و آثار عطار ، صفحہ ۴۰ ۔ (مرتب)

مرا در خرمن او خوشه چین دار
ز نور او دلم را راه بین دار
که تا این بنده هم پی بر پی شان
بیابد بار بر درگاه سلطان

(خسرو نامہ عطار، صفحہ ۴۵، طبع ثمر ہند، لکھنؤ)

آخری دو شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عطار خواجہ سعدالدین کے مرید ہیں۔

شیخ مجد الدین اور قطب الدین خوارزم شاہ معاصر نہیں ہیں۔ قطب الدین خوارزم شاہ (۴۹۰ و ۵۲۱ ہجری) خوارزم شاہیوں کا دوسرا سلطان ہے۔ اور جس پادشاہ کے حکم سے شیخ مجد الدین ہلاک ہوئے، وہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ (سنہ ۵۹۶ ہجری و سنہ ۶۱۷ ہجری) ہے۔

قولہ : ''فقرا کا ایک تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیا کے نام سے مشہور ہے اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہے۔ عبدالوہاب قزوینی نے، جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے۔''

(شعرالعجم، صفحہ ۱۱ و ۱۲)

عطار کا یہ تذکرہ جس کا مولانا ذکر فرماتے ہیں، حقیقت میں پروفیسر نکلسن نے مرتب کر کے ۱۹۰۵ع میں شائع کیا ہے۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی، پروفیسر براؤن کے شاگرد نہیں ہیں بلکہ شریک محنت فاضل جن سے براؤن استفادہ کرتے رہے ہیں۔

قولہ : ''صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں: سنائی، اوحدی، مولانا روم اور خواجہ فرید الدین عطار۔''

(شعرالعجم، صفحہ ۱۲)

اس فہرست میں اوحدی کے نام کا داخلہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوحد الدین کرمانی شاعر نہیں ہیں، نہ اوحدی ان کا تخلص ہے۔ اگر مولانا شبلی کی مراد اوحدی مراغی سے ہے تو آن کے ہاںے

کے ، بلکہ ان سے بہتر درجنوں صوفی شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے ۔

شیخ عطار کے حالات

تذکرہ نگاروں نے بہت کم حالات دیے ہیں ، اور جو کچھ دیے ہیں ، شبہہ سے خالی نہیں ، کیوں کہ ان کے نام پر اور لوگوں نے کتابیں تصنیف کر کے ان کے حالات کے مرقع کو اور بھی دھندلا بنا دیا ہے ۔ ان کا نام محمد ہے ، فرید الدین لقب ، فرید اور عطار تخلص[1] ہے :

من محمد نامم و این شیوہ نیز
ختم کردم چون محمد ای عزیز

(مصیبت نامہ قلمی)

وطن نیشاپور ہے کیوں کہ ان کا معاصر محمد عوفی ان کو نیشاپوری بیان کرتا ہے ۔ خود عطار نے اپنے وطن کا ذکر نہیں کیا ۔ جس شعر میں نیشاپور کا ذکر کیا ہے اس سے اس کی وطنی خصوصیت واضح نہیں ہوتی :

بود مجنونی بہ نیشاپور در
زو ندیدم در جہان رنجور تر

۱۔ پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان قصائد و غزلیات عطار (طبع طہران ، ۱۳۱۹ شمسی) میں کل ۸۷۲ غزلیات شامل ہیں جن میں سے ۸۲ غزلیات میں فرید تخلص ملتا ہے اور باقی میں عطار ۔ چناں چہ فاضل مرتب لکھتے ہیں :
"از اینجا معلوم میشود کہ در آغاز شاعری خود بمناسبت لقب وی کہ فرید الدین بودہ ، فرید تخلص کردہ است و سپس تخلص خود را تغییر دادہ و عطار تخلص کردہ است ۔"
(صفحہ خ ، مقدمہ دیوان عطار) ۔ (مرتب)

تاریخ ولادت ۵۱۳ ہجری بتائی جاتی[1] ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں ، کیوں کہ اُن کے ہاں ایسے بزرگ ، جو اُن کے قریب العہد ہیں ، ایسے ہیں جو سنجر متوفّٰی ۵۵۲ھ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا ذکر شیخ عطار بصیغۂ ماضی بیان کرتے ہیں مثلاً سلطان سنجر ، مہستی ندیمۂ سنجر، عباسہ ایک باخدا خاتون جس کا سنجر معتقد ہے ، خواجہ رکن الدین اکاف[2] اور احمد غزالی ۔ سب سے حیرت انگیز امر یہ ہے کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں اپنے کسی معاصر کا ذکر نہیں کرتے ۔ البتہ مظہر العجائب میں شیخ مجد الدین اور شیخ نجم الدین کبریٰ کا ذکر آتا ہے ۔ لیکن میں اس تصنیف کو شیخ عطار کی تسلیم نہیں کرتا ۔ البتہ ان کی شاعری کا زمانہ معلوم کرنے

۱- صفحہ ۱۸۷ - ۱۹۲ ، تذکرۃ الشعرائے دولت شاہ ، طبع لیڈن ۔
(مرتب)

۲- ''این نام را باختلاف رکن الدین اکاف یا رکن الدین آکاف ضبط کردہ اند و تنہا مولف ہفت اقلیم کہ آنہم این مطلب را آوردہ ، درست نوشتہ و رکن الدین اسکاف آوردہ است و البتہ پیداست کہ اکاف و آکاف تحریف از ہمان کلمۂ اسکافست ... و عطار خود او را رکن الدین اسکاف می نامد...نیز ممکنست کلمۂ اکاف کہ در بعضی نسخہا آمدہ و در زبان تازی بمعنی پالان دوزست درست باشد ولی این حدس دورست ۔''

(احوال و آثار فرید الدین عطار ، صفحہ ۳۶ و ۳۸ ، ڈاکٹر سعید نفیسی)

اور اسی کتاب کے تکملے میں لکھتے ہیں :

''در باب رکن الدین اسکافی کہ پیش ازین شرحی آمدہ است چون در بیشتر از نسخہای خطی آثار عطار نسبت او را اسکافی نوشتہ‌اند پیروی از آنہا کردم ولی در برخی نسخہای دیگر اکافی نوشتہ اند ... و ممکنست اکافی نسبت باکاف درست تر باشد ، ظاہراً مراد ازین رکن الدین اکافی ابوالقاسم عبدالرحمان بن عبدالصمد بن احمد ابن علی نیشاپوری اکف سختی شافعی باید باشد کہ از بزرگان قرن ششم ایران و از مردم نیشاپور و از دانشمندان پارسای پرہیزکار زمانہ و از شاگردان ابو نصر بن استاد ابوالقاسم قشیری بودہ ۔''

(تکملہ احوال و آثار فرید الدین عطار ، صفحہ ۱۶۸) (مرتب)

کے لیے ہمارے پاس دو ذرائع ہیں : پہلا یہ ہے کہ 'منطق الطیر' کے بعض نسخوں میں اس کی تاریخ تصنیف ۵۸۳ھ ملتی ہے ، چناں چہ :

روز سہ شنبہ بوقت استوا
بیستم روزی بد از ماہ خدا
پانصد و هفتاد[1] و سہ بگذشتہ سال
هم ز تاریخ رسول ذوالجلال

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار اس سنہ میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں ۔ دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ خروج مغول کے متعلق اُن کے ہاں ایک دو حوالے ملتے ہیں ۔ مثلاً :

هر کو بخلاف پشت بر دین آرد
در وقت زکواة بر جبین چین آرد
مستوجب حد گردد و جبار جهان
بر حد زدلش ترک ز ماچین آرد

(از دیوان قلمی)

دیگر :

کافر ز رہ خطا ببازی ماند
وز راہ حقیقی نہ مجازی ماند
یا آنکہ مرا ریش شہیدانہ نبود
یا خود ز خطا کافر غازی ماند

ان کا خاندان نہایت مذہبی تھا اور مذہبی ماحول میں ان کی

---

۱ ۔ پروفیسر سعید نفیسی اس جگہ بجائے ''هفتاد و سہ'' ''هشتاد و سہ'' دیتے ہیں اور آگے لکھتے ہیں :

''در بعضی نسخہا بجای پانصد و هشتاد و سہ پانصد و هفتاد و سہ آمدہ و گارسن دوتاسی تاریخ اتمام آن را سال ۱۱۷۵ میلادی آوردہ کہ ۵۷۱ میشود ۔ اما در چاپ مطبعۂ نولکشور ۱۳۲۸ ، همچنین ۵۸۳ آمدہ ۔''

(صفحہ ۱۲۹ ، احوال و آثار فرید الدین عطار) ۔ (مرتب)

تربیت اور نشو و نما ہوئی ـ شیخ کے والد کا بڑی عمر میں انتقال ہوتا ہے ـ اسرار نامہ میں ان کی وفات کا ذکر آتا ہے :

بپرسیدم در آندم از پدر من
کہ چونی ؟ گفت چونم ای پسر من

ز حیرت پای از سر می ندانم
دلم گم گشت دیگر می ندانم

نگردد این کمان کار دیده
بباروی چو من پیری کشیده

چنین عالم کہ دریا می زند جوش
ز خونم قطرۂ برناورد جوش

بدو گفتم کہ چیزی گوی آخر
کہ سرگردان شدم چون گوی آخر

جوابم داد کای دانندہ فرزند !
بفضل حق بہر نامی ہنرمند

ز غفلت خود نمائیدم همہ عمر
چہ گویم ژاژ خائیدم همہ عمر

بآخر دم چنین گفت آن نکوکار
کہ یارب مر محمد را نگہ دار

پدر این گفت و مادر گفت آمین
وزان پس زو جدا شد جان شیرین

خدایا گفت این هر دو گرامی
بفضلت مهر بر نہ بر تمامی

اگرچہ گردنم زیر گناهست
دعای این دو پیرم حرز راهست

ببین یارب دو پیر ناتوان را
بدیشان بخش جان این جوان را

والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے ، جو زہد و اتقا میں لاثانی

تھیں ۔ انھوں نے بھی دراز عمر پائی اور اٹھائیس برس تک بےچادر و بے موزہ رہیں اور ترک دنیا کر کے گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر ، دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہیں ۔ خسرو نامہ میں آن کے مرثیے میں فرماتے ہیں :

مرا گر بود انسی در زمانہ
بمادر بود او رفت از میانہ
اگرچہ رابعہ چندین بقر بود
ولیک این ثانیہ آن شیر نر بود
نبود او زن کہ مرد معنوی بود
سحرگاہان دعای او قوی بود
ز سال بست و هشت اکنون زیادت
کہ نی چادر نہ موزہ بود عادت
ز دنیا فارغ و دولت گزیدہ
گرفتہ گوشہ و عزلت گزیدہ
چنان چشم قوی داشت آن ضعیفہ
کہ ملک شرع را روی حنیفہ
اگرچہ عنکبوتی ناتوان بود
ولیکن بر سر من پہلوان بود
نہ چندان ست بر جانم غم او
کہ بتوان کرد ہرگز ماتم او
چو محرم نیست این غم با کہ گویم
مرا او بود محرم تا چہ گویم
اگر برسم باو با او بگویم
غمی کز مرگ او آمد بروىم

(خسرو نامہ ، مطبع ثمر ہند ، صفحہ ۲۰۶)

خسرو نامہ انھوں نے ساٹھ سال کی عمر کے کئی سال بعد لکھا ہے ۔ اس عمر میں بھی وہ والدہ کو اس طرح یاد کرتے ہیں جیسے

کوئی بچہ کر رہا ہو ۔ لیکن یہ سب اسی مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے جس کی فضا میں عطار نے پرورش پائی تھی ۔

عطار اس قدر گم نام رہنا چاہتے ہیں کہ باوجود تصنیفات کثیرہ اپنے ذاتی حالات بہت کم دیے ہیں ۔ 'اسرار نامہ' میں اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے غزا میں شریک ہونے کا اتفاقیہ ذکر کردیا ہے :

بہر دکان کسی پترد پریدیم
بہر کم کان کسی پوید دویدیم

گہی با رند در می‌خانہ بودیم
گہی رخ بر در می‌خانہ سودیم

گہی زنار ترسایان بہ بستیم
گہی در دیر ترسایان نشستیم

گہی با کافران در جنگ بودیم
گہی با آتش اندر سنگ بودیم

گہی سجادہ بر دوش آوریدیم
گہی در بحر دل جوش آوریدیم

گہی سر بر سر زانو نہادیم
گہی در ھا و ھو اندر فتادیم

ان کی طبیعت میں مسکنت اور کسر نفسی جاگزیں تھی ۔ ایک دن ایک دوست نے آن سے بیان کیا کہ فلاں شخص بطریق حلال روزی کماتا ہے ، یعنی یہودیوں سے جزیہ وصول کرکے اپنا پیٹ پالتا ہے ۔ اس سے اچھی کمائی اور کیا ہوسکتی ہے ؟ شیخ نے فرمایا "میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا ، صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں ننگ دو جہاں ہوں ۔ اگر سو یہودی بھی مجھ سے جزیہ لیں تو کم ہے" :

رفیقی گفت با من کان فلانی
حلالی می خورد قوت جہانی

که جزیه از یهودان می ستاند
وزآن جا می‌خورد به زین که داند
بدو گفتم که من آن می ندانم
من آن دانم که از ننگ جهانم
که باید صد جهود بس پریشان
که تا خواهند از من جزیه ایشان

(کلیات عطار ، الٰہی نامہ ، صفحہ ۸۷۸ ، نولکشور)

ان کا پیشہ طب تھا اور ساتھ ہی دارو خانہ کھول رکھا تھا اور مطب بڑی رونق پر تھا ۔ ایک حکایت میں کہتے ہیں "ہمارے شہر میں ایک مال دار بخیل بیمار تھا جس کے پاس پچاس ہزار دینار نقد موجود تھے ۔ مجھے اس کے علاج کے لیے ایک آدمی لینے آیا ۔ میں نے جا کر دیکھا کہ سو برس کا پیرِ فرتوت ہے جو بوجہ مرض بالکل گھل چکا ہے اور موت کے گھاٹ آ لگا ہے ۔ اس کے پہلو میں ایک سر بمہر عرقِ گلاب کا شیشہ رکھا ہوا تھا ۔ میں نے تیمارداروں سے کہا کہ شیشہ کھول کر تھوڑا سا گلاب مریض پر چھڑک دو ۔ مریض نے جو نیم غشی کی حالت میں تھا ، فوراً آنکھ کھول دی اور کہنے لگا : "خبردار ! گلاب نہ چھڑکنا ! میں اس کے صرف کیے جانے کے مقابلے میں اپنا مرنا آسان سمجھتا ہوں ۔" بوڑھا بخیل یہ الفاظ ختم کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کا دم نکل گیا ۔" اس حکایت کا ابتدائی شعر ہے :

بشہر ما بخیلی گشت بیمار
که نقدش بود پنجه بدره دینار

(اسرار نامہ ، صفحہ ۱۷۷ ، طبع طہران ، ۱۲۹۸ھ)

تصنیفات میں ساٹھ برس کی عمر سے لے کر نوے سال تک کی طرف اشارے ملتے ہیں :

(۱) ...سی سال بصد هزار تگ بدویدیم
تا از... وه نو بدرگهت برسیدیم

سی سال دگر گرد درت گردیدیم
چوبک زن بام و عسس در بودیم
(کلیات ، مختار نامہ ، صفحہ ۹۵۲)

(۲) اگر من پشت را سازم کمانی
چو سالم شصت شد نبود امانی
مرا در شست افتاده است هفتاد
چنین صیدی کرا در دست افتاد
ز شست آن کمان تیری شود راست
ز شصت من کمان کوز برخاست
ازان شست و کمان قوت شود بیش
ازین شصت و کمان دل می شود ریش
(اسرار نامہ ، قلمی)

(۳) تو غافلی و بهفتاد پشت تو چو کمان
تو خوش بخفتہ وعمرت چوتیر رفتہ زشست (دیوان قلمی)

(۴) چون بهفتاد بیفتادی واین نیست عجب
عجب اینست کہ این نفس تو هر دم بتراست (دیوان قلمی)

(۵) مرگ در آورد پیش وادی صد سالہ راه
عمر تو افگند شست در سر هفتاد و اند (دیوان قلمی)

(۶) گر وصل منت باید ای پیر نود سالہ
هم خرقہ بسوزانی ، هم قبلہ بگردانی (دیوان قلمی)

تمام عمر گوشۂ قناعت میں بسر کر دی اور آستانۂ ملوک سے کوئی سروکار نہیں رکھا :

چہ خواهم کرد طول و عرض دنیا
کبودی سما و ارض دنیا
مرا ملکی کہ من دارم بسند است
وگر در بایدم چیزی پسند است

چو در ملک قناعت پادشاهم
توام کرد دائم هرچه خواهم

(کلیات ، الٰہی نامہ ، صفحہ ۹۳۳)

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :

شکر ایزد را کہ ادباری نیم
بستۂ هر ناسزاواری نیم
من زکس بر دل چرا بندی نهم
نام هر دونی خداوندی نهم
نی طعامی هیچ ظالم خورده ام
نی کتابی را تخلص کرده ام

(منطق الطیر ، کلیات ، صفحہ ۱۱۶۲ ، نولکشور)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے :

نی ز همت میل ممدوحی مرا
نی ز ظلمت خلوت روحی مرا
نی هوای لقمۂ سلطان مرا
نی قفای سیلی دربان مرا

(منطق الطیر ، کلیات ، صفحہ ۱۱۶۳)

دربار داری کے سلسلے میں اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ کسی بادشاہ کی خدمت میں عید کی مبارک باد کا ایک قصیدہ لکھ کر لے گئے ہیں ۔ اس کا نام کہیں ظاہر نہیں کرتے ۔ لیکن وہ بادشاہ بھی آن ہی کے ڈھب کا معلوم ہوتا ہے ۔ اس نے تین ماہ برابر روزے رکھے ہیں اور شیخ مبارک باد میں قصیدہ لکھتے ہیں اور ردیف بھی 'روزہ' لاتے ہیں ۔ مدح نگاری چوں کہ آن کو راس نہیں ہے ، اس لیے اس قصیدے میں ایسے ثمرِ خام پیدا کیے ہیں[1] کہ قصیدے کا جوہر شناس آن کو دیکھ

---

۱ ۔ اس قصیدے کی بابت پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کر دنگ رہ جائے گا ۔ گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

خدایگان فلک قدر آنکہ هر رمضان
ز خوان او بکشاد است قرص[1] خور روزہ
سہ ماہ روز چو او داشت[2] نور روزہ او
مدام در دو جہان گشت نامور روزہ
ز بہر روزۂ شہ نُہ سپہر جشنی ساخت
کہ بو کہ شہ بکشاید بدین قدر روزہ

دعا کے وقت کہا ہے :

خدایگانا شعر لطیف را عطار
ردیف کرد بمدح تو سربسر روزہ
منم کہ ختم سخن برمنست و زہرا[3] کراست
کہ صد سخن بکشاید بلبہ[4] بر روزہ
ہمیشہ تا شب وروزاست عید روزی باد
ہزار عیدت و عیدیت باد هر روزہ (دیوان قلمی)

بلبل نامہ عطار کی تصنیف مانا جاتا ہے، جو بحرِ ہزج ، مسدس محذوف میں ہے ۔ اس کے خاتمے پر بحر منسرح میں مثنوی کے کچھ اشعار ملتے ہیں ، جن میں شاعر اپنے فرزند ضیاءالدین یوسف کو پند

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

''این قصیدہ بروش شاعران دیگر در تغزل و تشبیب و مدح پادشاہ از عطار سابقہ ندارد و بسیار شگفتست و با آنکہ در پایان تخلص وی آمدہ دورست کہ ازو باشد ۔''

(حاشیہ صفحہ ۶۴ ، دیوان عطار ، مرتبہ سعید نفیسی ، ۱۳۱۹ شمسی)

۱ ۔ دیوان قصائد و غزلیات عطار مرتبہ پروفیسر نفیسی (صفحہ ۴۵-۴۶) میں بجائے ''قرص'' ''قصر۔'' (مرتب)

۲ ۔ دیوان مرتبہ سعید نفیسی میں ''روزہ گرفت و ز نور۔'' (مرتب)

۳ ۔ اشاعت نفیسی ''وہرگرہ است'' (مرتب)

۴ ۔ اشاعت نفیسی میں ''ردیف ۔'' (مرتب)

دیتا نظر آتا ہے :

ای شب امید مرا ماہ نو
دیدۂ بختم بجمالت گرو

از پس سی روز برآید ہلال
روی نمودی‌توپس از شصت سال

سال تو چار است بوقت شمار
چار تو چل باد و چلت باد چار

نام تو شد یوسف مصر وفا
باد لقب دولت دین را ضیا

من کنم از خامۂ حکمت نگار
بہر تو این مایۂ حکمت نگار

گرچہ ترا نیست کنون فہم تند
چون بحد فہم رسی کار بند !

فرماتے ہیں ، جب تک تمھارے منہ پر خط نہ نکل آئے گھر سے باہر قدم مت دھرنا :

تا نشود برقع روی تو موی
پا منہ از خانہ ببازار و کوی
سلسلہ بند قدم خویش باش
حبس نشین حرم خویش باش
ہیچ کہ از صحبت ہم خانگان
رخت مکش بر در بیگانگان

تعلیم اور مکتب نشینی کے سلسلےمیں جو نصیحتیں کی ہیں ، ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اُستاد کی مارکھانا اگرچہ سعادت ہے ، لیکن تم کوشش کرو کہ اس سعادت سے محروم رہو :

سیلی او گرچہ فضیلت دہ است
گر تو بسیلی نرسانی بہ است

قرآن پاک بچپن میں حفظ کر لینا کیوں کہ بچپنے میں جو چیز

یاد ہو جاتی ہے ، انسان بڑا ہو کر نہیں بھولتا :

حرف نوشتہ بدل طفل خورد
کزلک نسیان نتواند بسترد

خط پاکیزہ لکھنے کی کوشش کرنا ۔ شعر گوئی اگرچہ ایک قسم کا کمال ہے لیکن اس میں عیب بھی ہیں ۔ گاہے ماہے لکھو تو کوئی مضائقہ نہیں ، لیکن میری طرح اس کو پیشہ نہ بنا لینا :

ور چہ فتد گہ گہی اندیشہ اش
کوش کہ چون من نکنی پیشہ اش

مختلف بلبل ناموں کے خاتمے میں اشعار بالا[1] میری نظر سے گزرے ہیں ۔ تاہم مجھ کو یقین نہیں آتا کہ یہ عطار کے قلم سے نکلے ہوں[2] ۔

مذہبا سنت جماعت ہیں اور ظن غالب ہے کہ حنفی ہیں ۔ قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اصحاب اربعہ کی مدح میں قلم اٹھایا ہے ۔ قاضی نوراللہ شوستری[3] اور میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ان کو

۱ ۔ نظر ثانی کرتے وقت معلوم ہوا کہ بلبل نامہ کے اشعار مذکورہ بالا مولانا جامی کے قلم سے نکلے ہیں اور ان کی مثنوی "تحفۃ الاحرار" (مقالہ بستم در پند دادن فرزند ارجمند) میں موجود ہیں ۔ ضیاءالدین یوسف جامی کے فرزند کا نام ہے، انھی کے نام پر نصاب ضیائی مولانا جامی نے تصنیف کیا ہے : (حاشیہ مصنف)

۲ ۔ پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں ۔

"درین تردیدی نیست کہ عطار را پسری بودہ است بلقب و نام ضیاءالدین یوسف کہ در پایان مثنوی بلبل نامہ اندرزھای باو دادہ است و درین زمان چہار سالہ بودہ و گویا این اشعار را در چاپ طہران حذف کردہ اند ۔" (احوال و آثار عطار ، صفحہ ۱۹)

۳ ۔ "مولف مجالس المومنین کہ بشیعہ تراشی معروف است کوشیدہ است کہ عطار را ہم شیعہ کند و دلیلی کہ آوردہ اشعاریست کہ ازو در منقبت علی بن ابی طالب نقل کردہ است غافل از اینکہ برخی از آن اشعار از فریدالدین عطار نیشا پوری کہ مورد بحث ماست نیست و از دیگریست

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شیعہ تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کا یہ عقیدہ محض ایسی تالیفات پر مبنی ہے جو بعد میں شیخ عطار کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں ورنہ عطار نے ایک سے زیادہ موقع پر اصحاب ثلاثہ کے مخالفوں کو تشنیع کی ہے۔ آن کے نزدیک چاروں صحابہ کا رتبہ برابر ہے :

دوئی باشد کجا در چار ای خام
یکی بینی در آغاز و در انجام
گر این هر چار را باهم نداری
تو یک عالم ز دو عالم نداری

(خسرو نامہ ، صفحہ ۴۱ - ۴۲ ، طبع ثمر ہند)

مصیبت نامے میں تعصب کرنے والوں کو خطاب کرکے فرماتے ہیں :

ای تعصب بند بندت کرده بند
چند گویی چند از هفتاد و اند
در سلامت هفت صد ملت ز تو
لیک هفتاد و دو بر علت ز تو
هست کیش و راه ملت بی‌شمار
تا تو نشماری نیابی روزگار
گر تو هستی پس رو صدیق را
یا علی آن عالم تحقیق را

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

...وانگہی صوفیہ هرگز درباہ' هیچ یک از خلفای چهارگانہ غلو نکرده اند و یکی را بر دیگری ترجیح نداده اند و بہمین جهت در آثار عطار مدح هر چهار یار آمده است ۔ منتهی در بعضی از مثنویهای او کہ اخیراً در طهران چاپ کرده اند گویا عمداً مناقب سہ خلیفہ نخست را حذف کرده اند'' (صفحہ ۸۰-۸۱ ، احوال و آثار عطار ، پروفیسر سعید نفیسی) (مرتب)

بی تعصب گرد و بی‌تقلید شو
شرک سوز و غرقهٔ توحید شو
چون صحابه یک بیک آزاده اند
در هدایت چون نجوم افتاده اند
گر کسی در یک تن آن قوم پاک
کرد طعنی بر ستاره ریخت خاک

(مصیبت نامهٔ قلمی)

اور حضرت ابوبکرؓ کے حق میں لکھتے ہیں :

از صحابه سی هزار و سه هزار
از میان جانش کردند اختیار
او کجا در بند آب و جاه بود
کآب و جاه او همه الله بود
آن‌که از عرش و فلک فارغ بود
شک نباشد کز فدک فارغ بود

(مصیبت نامهٔ قلمی)

منطق الطیر میں پھر یہی استدلال پیش کیا گیا ہے :

ای گرفتار تعصب آمده
دائما پُر بغض و پُر حب آمده
گر تو لاف از عقل وز لب می‌زنی
پس چرا دم از تعصب می‌زنی
در خلافت میل نیست ای بی خبر
میل کی آید ز بوبکرؓ و عمرؓ
میل اگر بودی در آن دو مقتدا
هر دو کردندی پسر را پیشوا!
بهترین چون لزد تو باشد بتر
کی توان گفتن ترا صاحب نظر

کی روا داری کہ اصحاب رسولؐ
مرد ناحق را کنند از جان قبول

یا نشانندش بجای مصطفیٰؐ
از صحابہ نیست این باطل روا

اختیار جملہ شان گر نیست راست
اختیار جمع قرآن پس خطاست

بلکہ هر چہ اصحاب پیغمبر کنند
حق کنند و لایق و درخور کنند

گر کنی معزول یک تن را ز کار
می‌کنی تکذیب می و سہ هزار

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے بارے میں کہتے ہیں :

در عمرؓ گر میل بودی ذرۂ
کی پسر کشتی بہ زخم درۂ

گر خلافت بر خطا می‌داشت او
هفده من دلقی چرا می‌داشت او

چون نہ جامہ دست دادش نی گلیم
بر مرقع دوختہ پارہ ادیم

آنکہ زینسان شاهی خیلی کند
کی روا داری کہ او میلی کند

آنکہ گاهی خشت و گاهی گل کشد
این همہ سختی نہ بر باطل کشد

گر خلافت بر هوا می‌راندی
خویشتن بر سلطنت بنشاندی

شهرهای منکران هنگام او
شد تهی از کفر در ایام او

گر تعصب می کنی از بهر آن
نیست انصافت بمیر از قهر آن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق گویا ہیں :

چند گویی مرتضیٰؓ مظلوم بود
از خلافت راندن محروم بود

چون علی شیر حق است و تاج سر
ظلم نتوان کرد بر شیر ای پسر

مرتضیٰ نامی مکن از خود قیاس
زان که در حق غرق بود آن حق‌شناس

گر چو تو پر کینہ بودی مرتضیٰؓ
جنگ جستی پیش خیلی مصطفیٰ

او ز تو مردانہ تر آمد بسی
پس چرا جنگی نکرد او با کسی

گر بناحق بود صدیقؓ ای عجب
او چو برحق بود حق کردی طلب

پیش حیدرؓ خیل ام المومنینؓ
چون نہ بر منوال دین جستند کین

لاجرم چون دید چندان جنگ و شور
دفع کرد آن قوم را حیدرؓ بہ زور

آن کہ با دختر تواند جنگ کرد
داند او سوی پدر آهنگ کرد

ای پسر تو بی نشانی از علیؓ
عین و لام و یا بدانی از علیؓ

حضرت عمرؓ کے حق میں کہتے ہیں :

اگر بر دل ز فاروقت غباریست
ترا در راہ دین آشفتہ کاریست

چہ برخیزی بخصمی چراغی
کہ روشن زوست چون فردوس باغی

عجم ز اول جہود و گبر بودند
ازو گوی مسلمانی ربودند
کسی کاجدادش ایمان از عمرؓ یافت
ز مہر او چرا امروز سر تافت
(خسرو نامہ‘ قلمی)

کلام پر تبصرہ

سادگی اور سلاست شیخ عطار کے کلام کا سب سے نمایاں وصف ہے ۔ ان کا اصلی مقصد شاعری نہیں ہے بلکہ شعر کو اپنے خیالات و جذبات و واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے ۔ محاسنِ شعری کا کہیں نام کو بھی سراغ نہیں ۔ سیدھی سادی زبان میں جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ گزرتے ہیں ۔ تصنع اور آورد کا سایہ تک نظر نہیں آتا ۔ الفاظ کی تلاش یا ان کے انتخاب کی ضرورت انھیں کبھی محسوس نہیں ہوتی اور مضامین ہیں کہ بادل کی طرح آمڈتے چلے جاتے ہیں ۔ لکھنے سے نہ ان کا قلم تھکتا اور نہ دماغ خستگی محسوس کرتا ہے ۔ عطار پُر گوئی کے لیے مشہور ہیں اور خود انھیں اس کا اعتراف ہے ، بلکہ شکایت ہے کہ میں ایک مضمون کی خواہش کرتا ہوں اور ایک کے بجائے دس آ جاتے ہیں :

چنانم قوّتِ طبع است در فکر
کہ یک معنی بخوانم صد دھد بکر
در اندیشہ چنان مست و خرابم
کہ دیگر می‌نیاید ہیچ خوابم
نیابم خواب شب بسیار و اندک
ازین پہلو ہمی‌گردم بدان یک
ہمی رانم معانی را ز خاطر
کہ یک دم خواب یابم بو کہ آخر

یکی را گر برانم ده برآید
بتر را گر برانم بہ برآید

زبس معنی کہ دارم در ضمیرم
خدا داند کہ در گفتن اسیرم

(اسرار نامہ ، صفحہ ۱۹۴ - ۱۹۵ ، طبع طہران)

پُرگوئی کے باوجود اعلیٰ درجے کی پختگی موجود ہے ۔ گھلاوٹ اور تاثیر غالب ہے ۔ تمام کلام صاف اور ہموار ہے اور حشو و زوائد سے پاک ۔ خیالات متین اور سنجیدہ ہیں ، جن میں خلوص اور پاک اعتقادی کی لہر شروع سے آخر تک دوڑ رہی ہے ۔ انھی اوصاف نے انھیں ایران کے مشاہیر اور اعلیٰ اساتذہ کی صف میں کھڑا کر دیا ہے ۔ آن کے اپنے زمانے میں ایک بڑی جماعت ان کی شیدائی اور معتقد تھی ۔ اپنے ایک دوست کا ذکر کرتے ہیں ، جس کی فرمائش پر انھوں نے خسرو نامہ تصنیف کیا ہے کہ اس کو ان کا پورا مختار نامہ ، سو قصیدے ، ایک ہزار غزلیں اور قطعات یاد تھے ۔ اس ایک بیان سے ان ایام میں عطار کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

غزلیات :

قدما کے مقابلے میں انھوں نے غزل کو بے حد ترقی دی ہے ۔ جو غزل صاف نکل آتی ہے وہ سعدی کی غزل کے ہم پلہ ہے ۔ غزل میں انھوں نے رندی اور مستی کے مضامین روشناس کر دیے ہیں ۔ خمریات میں خیام کا سا رنگ ہے ، لیکن اُس کے ہاں شرابِ محض ہے ، اور ان کے ہاں شرابِ معرفت ہے ۔ اس میدان میں وہ صوفیا کے نبیِ غیر مرسل شمار ہونے چاہییں ۔ حقیقت کو مجاز کی زبان میں بیان کرنے کی بنیاد حکیم سنائی ڈالتے ہیں ، لیکن یہ عطار ہیں جو اس بنیاد پر عالی شان عمارت تیار کرتے ہیں ۔ مے و جام ، پیمانہ و مے خانہ ، رند و خرابات ، زنار و بُت ، ترسا و کنشت جو فارسی غزل گویوں کے دستمایہ ناز ہیں ، اصل میں ان کے مقبول بنانے والے فریدالدین عطار ہیں ۔ غزل میں عشق کی چاشنی کا رنگ عطار سے پیشتر موجود تھا

مگر جوش و سرمستی ، محویت و استغراق ، عطار سے قبل نا معلوم کیفیت تھی ۔ سنائی تصوف کے کوچے میں آنے کے باوجود نرے زاہد خشک رہے ، ان کے ہاں شریعت پہلے ہے اور طریقت بعد میں ۔ مثلاً فرماتے ہیں :

ز راه دین توان آمد بصحرای نیاز آری
به معنی کی رسد مردم گزر نا کرده بر اسما

دیگر

چو جان از دین قوی کردی تن از خدمت مزین کن
که اسپ غازی آن بهتر که با برگستوان بینی

دیگر

دولت و دین نی و بر جان نقش حکمت دوختن
نوح و کشتی نی و در دل عشق طوفان داشتن

لیکن عطار زہدیت سے گزر کر عشق و محویت اور فنا کی منازل میں مقیم ہیں ۔ چنانچہ :

گر سرّ عشق خواهی از کفر و دین گذر کن
کانجا که عشق آمد چه جای کفر و دین است

دیگر

لب دریا همه کفر است و دریا جمله دین داری
ولیکن گوهر دریا ورای این و آن باشد

دیگر

ز کفر و دین و ز نیک و ز بد ز علم و عمل
برون گذر که برون زین بسی مقامات است

اسی غزل کے باقی اشعار بھی ملاحظہ ہوں ، خصوصاً مطلع جو بالکل حافظ کے رنگ میں ہے :

بیا که قبلهٔ ما گوشهٔ خراباتست
بیار باده که عاشق نه مرد طاماتست

مگو ز خرقہ و تسبیح زانکہ این دل مست[1]
میان بہ‌بستہ بزنار در خراباتست[2]
چہ داند آنکہ نداند کہ چیست لذت عشق
از آنکہ لذت عاشق ورای لذاتست
مقام عاشق و معشوق از دو کون بیرونست
کہ حلقہ در عشاق تا[3] سماواتست
بنوش درد و فنا[4] شو اگر بقا خواہی
کہ زاد راہ فنا[5] دردی خراباتست
بکوی نفی فرو شو چنانکہ برنائی
کہ گرد دائرۂ نفی عین اثباتست
ز ہر دو کون فنا شو درین رہ ای عطار
کہ فانی رہ عشاق فانی الذاتست[6]

الغرض عشق و سرمستی اور فنائیت کا جذبہ غالب ہے۔ یہ اشعار بھی پیش نظر رہیں:

گم شدم در خود نمی دانم کجا پیدا شدم[7]
شبنمی بودم ز دریا غرقہ در دریا شدم

۱۔ دیوان عطار مرتبہ سعید نفیسی (صفحہ ۶۳ - ۶۴) میں ”تسبیح و زہد کین دل ما۔“ (مرتب)

۲۔ اشاعت نفیسی میں یہ مصرع یوں ہے:
”میان بیشہ پر نار در بطاعاتست۔“ (مرتب)

۳۔ اشاعت نفیسی میں ”در معشوق ما۔“ (مرتب)

۴۔ اشاعت نفیسی ”فرو شو۔“ (مرتب)

۵۔ اشاعت نفیسی میں ”بقا۔“ (مرتب)

۶۔ پروفیسر نفیسی کے ہاں مقطع یوں درج ہے:
بنوش درد و فنا شو ز درد ای عطار
کہ باقی رہ عشاق فانی الذاتست (مرتب)

۷۔ اشاعت نفیسی (صفحہ ۲۴۲) میں: (مرتب)
”گم شدم در خود چنان کز خویش ناپیدا شدم۔“ (مرتب)

سایهٔ بودم ز اول بر زمین افتاده خوار
راست کان خورشید پیدا گشت ناپیدا شدم

وارداتِ عشق :

ترسا بچه ام افگند از زهد برسوائی[1]
اکنون[2] من و زناری در دیر به تنهائی

دی زاهد دین بودم ، دریای یقین[3] بودم
سجاده نشین[4] بودم ، سر دفتر دانائی

امروز اگر هستم دردی کش و سر مستم[5]
در بت کده بنشستم دین[6] داده به ترسائی

نه محرم ایمانم ، نه کفر همی دانم
نه اینم و نه آنم ، در مانده برسوائی[7]

دوش ازغم کفر و دین یعنی که نه آن و این
بنشسته بدم غمگین شوریدهٔ و سودائی[8]

ناگه ز درون جان در داد ندا جانان
کای عاشق سرگردان تا چند ز شیدائی[9]

---

۱ - پروفیسر نفیسی کے مرتبہ دیوان (صفحہ ۳۶۷) میں ''بترسائی ـ'' (مرتب)
۲ - ''زین پس ـ'' (مرتب)
۳ - ''سجاده نشین ـ'' (مرتب)
۴ - ''ز ارباب یقین ـ'' (مرتب)
۵ - ''شوریده و سر مستم ـ'' (مرتب)
۶ - ''دل ـ'' (مرتب)
۷ - شوریده و سودائی ـ'' (مرتب)
۸ - پروفیسر نفیسی کے ہاں یہ شعر یوں دیا گیا ہے :
دوش از غم کفر و دین در خانه بدم غمگین
یعنی که نه آن نه این در مانده برسوائی (مرتب)
۹ - ''ز رسوائی ـ'' (مرتب)

روزی دو اگر از ما[1] ماندی تو چنین تنها
باز آی سوی دریا چون[2] گوهر دریائی
هرچندکه بی[3] دردی ، کی محروم ما گردی
فانی شو اگر مردی ، تا محرم ما آئی
عطار چه دانی تو، وین قصه چه خوانی تو
گر هیچ نمانی تو[4] این جا شوی آن جائی

دیگر

دی بامداد کان صنم آفتاب روی
برمن گذشت همچو مه اندر میان کوی
گفتم : مگر عزیمت خمار[5] کرده ای
گفتا : بلی تو نیز بیا با کسی مگوی
چون ساعتی برآمده من نیز در شدم
او در درون و خلق ز بیرون بگفت و گوی
دیدم بناز تکیه زده بر کنار حوض
همچون گلی که نو بدمد بر کنار جوی
می کرد آب را تن و اندام او خجل
می زد شراب از[6] لب او سنگ بر سبوی
گیسوی مشکبوی سپر[7] در فکنده بود
موی میانش گم شده اندر میان موی

---

۱ - ''دو سه ای از ما ۔'' (مرتب)
۲ - ''تو ۔'' (مرتب)
۳ - ''بر دردی ۔'' (مرتب)
۴ - ''چو لیک بدانی تو ۔'' (مرتب)
۵ - پروفیسر سعید نفیسی کے مرتبہ دیوان (صفحہ ۳۷۵) میں ''حمام ۔'' (مرتب)
۶ - ''را ۔'' (مرتب)
۷ - ''ببر ۔'' (مرتب)

چون دید کآب دیدهٔ من گرم می رود
مشتی گلم بداد که دست از دلت بشوی
دست از دلم بشستم و آن گاه گفتمش
کای جان نازنین ! دل عطار را بجوی

وحدتِ وجود :

ان سے پہلے فارسی نظم میں اس کا بہت کم پتا چلتا ہے ۔

مستزاد :

نقد قدم از مخزن اسرار برآمد خود گنج عیان شد
خود بود که خود بر سر بازار برآمد بر خود نگران شد
در کسوت ابریشم و پشم آمد و پنبه تا خلق بپوشند
خود بر صفت جبّه و دستار برآمد لبس همگان شد
در موسم نیسان ز سما شد سوی دریا در کسوت قطره
در بحر بشکل دُر شهوار برآمد در گوش بُتان شد
در عینِ بُتان خواست که خود را بپرستد خود را بپرستید
خود گشت بت و خود بپرستار برآمد خود عین بتان شد
خود بر سر خود تیغ جفا زد ز سر قهر خود مرہم خود جست
خود بر صفت خسته ببازار برآمد خود فاتحه خوان شد
خود بزم شد و می‌خور و ساغر شد و ساقی خود پیر خرابات
خود می شد و خود از خم خمار برآمد خود کوزه کشان شد
اشعار مپندار اگر چشم سرت هست رازیست نهفته
آنچه بزبان از دل عطار برآمد این بود که آن شد

قصائد :

قصائد اکثر برباد ہو گئے ، اب جو ملتے ہیں تیس اور چالیس سے زیادہ نہیں ۔ ان میں دنیا کی بےثباتی اور انسانی زندگی کی ناپائداری کے تمام دلائل لا کر ہم کو روحانیت کی طرف مدعو کرنے کی

کوشش میں مصروف ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ ہم سب فانی ہیں اور دورانِ حیات میں عاجز و ناتواں ۔ افلاک و ایام کی آغوش میں بسنے والا انسان جو تقدیر کی زنجیروں میں سخت جکڑا ہوا ہے ، دنیا میں آ کر پابندِ غفلت اور محوِ خواب بن گیا ہے ، حالانکہ اس کا بار گراں ہے ، اس کی منزل دراز ہے اور موت اس کی گھات میں ہے ۔ کہتے ہیں انسان کا دیباچہ و تتمۂ حیات خون و خاک ہیں ۔ وہ خون جو رحمِ مادر میں قرار پکڑتا ہے اور وہ خاک جو بعدِ حیات اس کو جگہ دیتی ہے ۔ انسان اگر دیدۂ غور سے زمین پر نگاہ ڈالے تو مشرق سے مغرب تک اس کو نظر آئے گا کہ چپہ چپہ مقام پر اس کے ابنائے جنس محوِ خوابِ عدم ہیں :

کز شرق تا بہ غرب سراپای خفتہ اند
خورد و بزرگ و پیر و جوان و شہ و گدا

دیگر

زیر خاک از حد مشرق تا بہ‌مغرب خفتہ اند
بندہ و آزاد و شہری و غریب و شیخ و شاب

زمانہ ماہِ نو کی داس (درانتی) بناتا ہے اور اس داس سے اس بے بس گھاس یعنی انسان کو کاٹتا اور چھانٹتا رہتا ہے :

چو داس ماہ نو از بہر آن همی‌آید
کہ تا چو خوشہ سر خلق می زند ز قفا
گیا همی دمد از خاک گور و غم این است
کہ نیست هیچ غمی داس را ز رنج گیا

فردوسی یہی خیال ان الفاظ میں ادا کرتا ہے :

بیابان و آن مرد با تیز داس — گیاہ تر و خشک ازو در هراس
تر و خشک را او همی بدرود — وگر لابہ سازی همی نشنود
دروگر زمانست و ما چون گیا — همانش نبیرہ همانش نیا

ایام حیات میں جو لوگ گلاب کی طرح شگفتہ تھے، اب ان کی

خاک پر ابر گلاب برساتا ہے ، سنبل کی طرح جن کی زلفیں تابدار تھیں خاکِ تاریک نے نہ وہ عارض چھوڑے اور نہ وہ زلفیں ۔ اس خاک پر اتراتے نہ چلو کیوں کہ تمھارا راستہ حسینوں کی آنکھوں پر گزرتا ہے ۔ لالہ میں جو یہ سرخی دیکھتے ہو یہ تمھارے عزیزوں ہی کا خون ہے جو خاک پر بہایا گیا ۔ اس موقعے پر عطار بالکل خیام کی بولی بولنے لگتے ہیں :

وان کہ رویش همچو گل بشگفته بودی این زمان
ابر می‌ریزد بزاری بر سر خاکش گلاب
وان که زلفش همچو سنبل تاب در سر داشتی
خاک تاریکش نه سر بگذاشت نی زلف و نه تاب

دیگر

جملهٔ زیر زمین گر بحقیقت نگری
شکن طرهٔ مشکین و لب چون شکر است
چشم دل باز کن از مردمی نیک و بدان
مردم چشم بتانست که ترا ره‌گذر است

دیگر

از غبار خاک ره مفشان سر و دست ای عزیز
زان که آن فرق عزیزان بد که این جا شد غبار
خون دلهای عزیزان‌ست در گل ریخته
آن همه سرخی که می‌بینی بروی لاله زار
جملهٔ زیرِ زمین در خاک برهم ریخته‌ست
زلف‌های تابدار و لعل‌های آبدار

دیگر

فصیح در سخن آمد به‌پیش من آن خم
که بوده ام تن مردی ز مردمان کبار
هزار بار خم و کوزه کرده اند مرا
هنوز تلخ مزاجم ز مرگ شیرین کار (دیوان قلمی)

خیام کا یہ انداز عطار کو بے حد پسند ہے ۔ غزلیات میں بھی بعض وقت یہی رنگ اختیار کیا ہے ، مثلاً :

یک شربت آب خوش نتوان خورد در جہان
کین کوزہا ز خاک تن دوستان ماست

(بیاض بندہ علی خاں)

قصہ مختصر ، اس قسم کا استدلال ہے جو عطار ہم کو دنیا سے دل گیر اور اداس بنانے کے لیے پیش کرتے ہیں ۔ یہ خیالات اگرچہ جدید نہیں کیوں کہ ان کو قریب قریب ہر ایرانی شاعر کے ہاں دیکھا جاتا ہے ، لیکن ان کے ہاں یہ خیالات محض اتفاقیہ ہیں اور کوئی مقصد و غایت نہیں رکھتے ، مگر عطار کے ہاں وہ اُن کے فلسفۂ تصوف کی مبادیات میں داخل ہیں ۔ سالک کو دنیا کی طرف سے برداشتہ خاطر کرنے کے بعد وہ حقیقت کی دعوت دیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے دل کی صفائی اور طہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ یہ بات اشکِ گرم اور آہِ سرد سے حاصل ہوگی ، یعنی شب زندہ داری اور نالہ و زاری سے :

با دہان خشک و چشم تر قناعت کن ازانک
ہر کہ قانع شد بخشک و تر شہ بحر و بر است

دیگر

ز اشک گرم و دم سرد خود بکن خوی خشک
کہ معتدل تر ازین نیست ہیچ آب و ہوا

عطار نے انسانی زندگی کی بےاعتباری اور بےحقیقتی پر نادر مضامین نکالے ہیں فرماتے ہیں:

قطرۂ بیش نہ ای چند ز خود اندیشی
قطرۂ چیست اگر گم شد اگر دریا شد
بود نابود تو یک قطرۂ آبست ہمی
کہ ز دریا بکنار آمد و در دریا شد

(بیاضِ بندہ علی خاں)

خسرو نامہ میں کہتے ہیں :

درآمد پشہ‌ٔ از لاف سرمست
دمی بر فرق کوہ قاف بنشست
چو برجست و ازانجا با عدم شد
چہ افزود اندران کوہ وچہ کم شد

فردوسی کے ہاں یہ خیال بہتر پیرائے میں ادا ہوا ہے :

یکی مرغ بر کوہ بنشست و خاست
برآن کُہ چہ افزود ازان کُہ چہ کاست
تو آن مرغی و این جہان کوہ تست
چو رفتی جہان را چہ اندوہ تست

(بیاض بندہ علی خاں)

مختار نامہ میں بھی مطلب یوں ادا ہوا ہے :

خلقی کہ درین جہان پدیدار شدند
در خاک بعاقبت گرفتار شدند
چندین غم خود مخور کہ ھمچون من وتو
بسیار درآمدند و بسیار شدند

(کلیات عطار ، صفحہ ۹۹۵ ، طبع نول کشور)

قصائد اگرچہ زہد و حکمت و پند و موعظت کے مضامین پر شامل ہیں لیکن ذیل کے اشعار میں کسی قدر رنگ بدلا ہے اور نظارۂ گل و ریاحین میں مصروف ہیں :

باد شمال می وزد جلوۂ یاسمن نگر
وقت سحر زعشق گل بلبل نعرہ زن نگر
سبزۂ تازہ روی را نو خط جوئبار بین
سنبل شاخ شاخ را مورچہ‌ٔ چمن نگر
سوسنِ لطیف را ھمچو عروس بکر بین
باد مشاطہ فعل را جلوہ گرِ سمن نگر

خیری سرفگندہ را در غم عمر رفتہ بین
سوسن شیر خوار را آمدہ در سخن نگر
لعبت شاخ ارغوان طفل زبان کشادہ بین
ناوک چرخ بوستان غنچۂ بیدھن نگر
تا کہ بنفشہ باغ را صوفیی فوطہ‌پوش کرد
از پی رہ زنی او طرۂ یاسمن نگر
خیز و بیا بوقت گل بادہ بدہ کہ عمر شد
چند غم جہان خوری شادی انجمن نگر
تا گل پادشاہ وش تخت نہاد در چمن
لشکریان باغ را خیمۂ نسترن نگر

باد شمال اور لشکریانِ باغ سے یکایک منہ موڑ کر پھر وہی قدیمی سرودِ فنا چھیڑ دیا ہے:

ای دل خستہ عمرشد تجربہ گیر از جہان
زندگیی بدست کن مردن مرد و زن نگر
از سر خاک دوستان موج دریغ می زند
برگذر و ز خاک شان حسرت تن بہ تن نگر
فکرکن و بچشم دل حال گذشتگان ببین
ریختہ زیر خاک‌ہا طرۂ پرشکن نگر
از سر خاک دوستان سبزہ دمید خون‌گری
ماتم خویشتن بگیر مردن خویشتن نگر

رباعیات:

غزلیات و قصائد کے مقابلے میں ان کی رباعیات کا درجہ بلند ہے۔ تمام 'مختار نامہ' سرتا سر رباعی ہے، جس میں پانچ ہزار رباعیاں ہیں۔ اصل میں چھ ہزار تھیں، لیکن ایک ہزار خود مصنف نے کمزور سمجھ کر نکال دیں۔ ان کے علاوہ چار سو کے قریب اور رباعیاں دیوان میں شامل ہیں۔ 'مختار نامہ' کلیات کے ساتھ نول کشور

کے ہاں چھپ گیا ہے ۔

کامل بننے کی تلقین :

گر خاص نہ ای تو عام می‌باید بود
ور پختہ نہ ای تو خام می‌باید بود
در کفر نہ ای تمام و در ایمان هم
در هر چہ دری تمام می‌باید بود

یہی خیال مثنوی میں یوں ادا ہوا ہے کہ ایک ترسا زادہ مسلمان ہوگیا ، دوسرے دن شراب پی کر مست ہوگیا ۔ اس کی ماں نے ملامت کی اورکہا کہ اے فرزند ! تیرے فعل سے حضرت عیسیٰؑ نا خوش ہوئے اور حضرت محمدؐ خوش نہیں ہوئے :

یکی ترسا مسلمان گشت بیروز
بہ می خوردن شد آن جاهل دگر روز
چو مادر مست دید او را ز دردی
بدو گفت ای پسر ! آخر چہ کردی
کہ شد آزردہ عیسیٰؑ زود از تو
محمدؐ ناشدہ خوشنود از تو
مخنث وار رہ رفتن نکو نیست
کہ هر رعنا مزاجی مرد او نیست
بمردی رو درین دنیا کہ هستی
کہ نامردیست در دین بت‌پرستی

ترغیبِ عمل : رباعی

بی رہ رفتن رموز می‌اندیشی
برفیست کہ در تموز می اندیشی
مردان جهان هزار عالم رفتند
تو هر دو قدم هنوز می‌اندیشی

دیگر

تو بیکاری و همچنین خواهی بود   اما همہ ذرات جهان در کارند

حکیم خیام کی تقلید : رباعی

لالہ ز رخ چو ماہ می بینم من
سبزہ ز خط سیاہ می بینم من
وان کاسۂ سر کہ بود پُر باد غرور
پیمانۂ خاک راہ می بینم من

دیگر

ہر کوزہ کہ بیخود بہ دہان باز نہم
گوید بشنو تا خبری باز دہم
من ہمچو تو بودہ ام درین رہ صد بار
نی نیست ہمی گردم و نی باز رہم

دیگر

ہر ذرہ کہ در وادی و در کہساریست
از پیکر بر گذشتۂ آثاریست
و آن ہر صورت کہ بردری و بر دیواریست
از روی خرد ز صورت دلداریست

(کلیات ، صفحہ ۹۹۵

دیگر

قومی کہ بخواب مرگ سر باز نہند
تا حشر ز قال و قیل خود باز رہند
تا کی گویی کہ کس خبر باز نہ داد
چون بی خبرند از چہ خبر باز دہند

دیگر

بس عمر عزیز ای دل مسکین کہ گذشت
بس کافر کفر و مومن دین کہ گذشت
ای مرد خرد حساب کن تا چندند
چندین کہ در آمدند و چندین کہ گذشت

دیگر

بر بستر خاک خفتگان می‌بینم در زیر زمین نهفتگان می‌بینم
چندان کہ بصحرای عدم می‌نگرم نا آمدگان و رفتگان می‌بینم

مثنویاں :

جس چیز نے ان کی شہرت کو بال پرواز دیے ، وہ ان کی مثنویاں ہیں ۔ ان میں اخلاق اور تصوف کو ملا کر لکھا ہے ۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حکایات کے بڑے شائق ہیں ۔ تمام مثنویوں میں قدم قدم پر حکایات موجود ہیں ۔ چونکہ غیر معمولی حافظے کے مالک ہیں اس لیے اخبار و قصص انبیا و اولیا و سلاطین و مشاہیر کثرت کے ساتھ مستحضر ہیں ؛ اور جو نکتہ یا مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں ، اس کے مناسب حال اس ذخیرے سے حکایت لے آتے ہیں ؛ اور لطف یہ ہے کہ ایک حکایت پر بس نہیں کرتے بلکہ اس موقع کے مناسب متعدد قصے اور چٹکلے بیان کر جاتے ہیں ۔ قصہ‌گوئی کا لپکا اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ حمد و مناجات جیسی مقدس زمینوں میں بھی قصہ نقل کرنے سے باز نہیں آتے ۔ یہ سب کچھ سہی، تاہم ہر شعر صدق و اخلاص اور تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ حمد و منقبت و مناجات ایسی دھوم دھام سے لکھتے ہیں کہ فارسی گویوں میں کوئی بھی ان کی ٹکر کا نہیں ۔ اور رسولؐ کے تو عاشق زار ہیں ۔ روضۂ رسولؐ کی یاد میں لکھتے ہیں :

منم در فرقت آن روضۂ پاک
کہ بر سر می کنم از آرزو خاک
اگر روزی در آن میدان درآیم
چگویی زین خم چوگان بر آیم
بہ آہی بگسلم بند جہان را
حنوطی سازم از خاک تو جان را

(اسرار نامہ ، صفحہ ۲۷)

مختصر یہ کہ پاکی ، پاک اعتقادی اور پاک گوئی ان کا اصلی جوہر ہے اور یہی وصف اُن کے کلام میں نمودار ہے ۔

مثنویوں کی زبان بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے ۔ عطار جس تیزی سے نظم لکھتے ہیں ، اکثر لوگ اس تیزی کے ساتھ نثر بھی نہیں لکھ سکتے ۔ اگر فکر و تلاش سے قلم روک کر لکھتے تو بڑوں بڑوں سے بازی لے جاتے ۔ صرف خسرو نامہ میں ذرا قلم کو روکا ہے اور نظامی سے ڈانڈا مینڈا ملا دیا ہے ۔

'منطق الطیر' میں منازلِ سلوک یعنی طلب ، عشق ، معرفت ، استغنا ، توحید ، حیرت ، فقروفنا بیان کی ہیں ۔ اس کے لیے پرندوں کا ایک فرضی قصہ لکھا ہے کہ ایک روز پرندے جمع ہوکر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم کا کوئی نہ کوئی بادشاہ ہوتا ہے ، اس لیے ہمیں بھی کسی کو اپنا بادشاہ بنا لینا چاہیے ۔ اس مقصد کے لیے قرعۂ انتخاب عنقا کے نام پر پڑتا ہے ۔ اب سارے طیور ہدہد کی رہنمائی میں عنقا کی تلاش میں نکلتے ہیں ۔ اور اس سفر میں مذکورۂ بالا منازلِ سلوک ان کو پیش آتی ہیں ۔ عطار کی مثنویوں میں منطق الطیر سب سے زیادہ مقبول ہے اور متعدد بارچھپ چکی ہے ۔

'الٰہی نامہ' کے دوران میں یہ قصہ بیان ہوا ہے کہ کسی خلیفہ کے چھ فرزند تھے ۔ ایک روز خلیفہ نے بلا کر اُن سے کہا کہ تم ہر ایک اپنی اپنی دلی آرزو بیان کرو ، تاکہ میں اسے برلاؤں ۔ چنانچہ پہلے نے عرض کی کہ پریوں کے بادشاہ کی لڑکی سے میری شادی ہو جائے ۔ دوسرے نے کہا میں جادو گری سیکھنا چاہتا ہوں ، کیونکہ اس فن کا جاننے والا بڑا طاقتور ہوتا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ جادو کے زور سے کبھی پرندہ بن جاؤں اور کبھی ہاتھی ۔ تیسرے نے یہ استدعا کی کہ مجھ کو جام جہاں نما مل جائے جس کے ذریعے سے دنیا کے تمام راز معلوم کرسکوں ۔ چوتھے کی یہ خواہش تھی کہ مجھ کو آب حیات مل جائے ۔ پانچواں حضرت سلیمان کی انگشتری کا متمنی تھا اور چھٹا کیمیا کا طالب تھا ۔

خلیفہ ان کی ہر خواہش کو ہوا و ہوس پر مبنی کہہ کر مسترد کر دیتا ہے اور مختلف حکایات سے ان کے نقائص پر استدلال کرتا ہے۔ یہ مثنوی بائیس مقالوں میں ہے اور کلیات عطار کے ساتھ نول کشور کے مطبع میں چھپی[1] ہے۔

'اسرار نامہ' میں مختلف مقالوں میں، جن کی تعداد بیان نہیں ہوئی، سالک کے لیے عام اخلاق پند و نصائح ہیں جو مختلف حکایات پر شامل ہیں۔ حمد و نعت و منقبتِ اصحابِ اربعہ کے اشعار، جو اس مثنوی کے دیباچے میں پائے جاتے ہیں، در حقیقت 'خسرو نامہ' کی پہلی اشاعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب 'اسرار نامہ' تصنیف ہوا، یہی اشعار اس کے ساتھ بھی لگا دیے گئے۔ بعد میں ایک دوست کی فرمائش پر جب 'خسرو نامہ' کا اختصار کیا تو حمد و نعت وغیرہ کے جدید اشعار کہہ کر اس میں اضافہ کر دیے۔ 'اسرار نامہ' طہران میں ۱۲۹۸ھ میں چھپ چکا ہے۔ مطبع والوں نے یہ ستم ظریفی کی کہ منقبت اصحاب ثلاثہ کے تمام اشعار خارج کر دیے۔

'مصیبت نامہ' آج تک نہیں چھپا[2]۔ میں جس نسخے سے کام لے رہا ہوں، وہ میرے عزیز دوست پروفیسر سراج الدین ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل کے مملوکہ کلیات عطار میں شامل ہے۔ عطار کے جس قدر کلیات معلوم ہیں، ان میں یہ نسخہ سب سے قدیم ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۸۵۷ھ ہے۔

'مصیبت نامہ' میں چالیس مقامات ہیں جن میں سالک فطرت، تمثیلاً چاروں فرشتگان عظام، عرش، کرسی، لوح محفوظ، قلم، بہشت و دوزخ، آسمان، آفتاب و ماہتاب، اربع عناصر، کوہ و دریا، جماد و نبات، حیوان، وحوش و طیور، شیطان، جن، انسان،

۱۔ 'الٰہی نامہ' سنہ ۱۳۱۶ شمسی (م ۵۶-۱۳۵۵ھ) میں طہران سے بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اس میں بہت سی غلطیاں اور سقم ہیں۔ (مرتب)

۲۔ 'مصیبت نامہ' طہران سے سنہ ۱۳۵۴ھ میں چھپ گیا ہے۔ (مرتب)

ساتوں انبیائے کرام ، حس و خیال ، عقل ، دل اور روح کے پاس جاکر ہر ایک سے فرداً فرداً تلاشِ حقیقت اور رہبری کا سوال کرتا ہے ۔ سب کے سب عجز کے قائل ہوتے ہیں اور روح آخر کار اس کا بیڑا پار کرتی ہے ۔ ضمن میں بیسیوں حکایات نقل کر دی ہے ۔ خاتمے میں 'اشتر نامہ' کی طرف شعر ذیل میں اشارہ ملتا ہے :

بختی افلاک نتواند کشید
نظم اشتر نامۂ تو ای فرید

یہ شعر بلکہ اس کے ساتھ جو قطعہ[1] ہے ، اگر الحاق ہو تو

۱- وہ قطعہ حسب ذیل ہے :

شاد باش ای شاہ دیوان سخن
دُرِّ دریای سخن کان سخن
داد داری در سلوک و سیر راہ
لاجرم در ملک نطقی بادشاہ
نامۂ اسرار معنی چون توی
آسمان شعر را شعری توی
شعر نتوان گفت سحراست این حلال
باد راز منطقت عین الکمال
نور جان ها در سواد خامہ است
سوز دل ها در مصیبت نامہ است
بختی افلاک نتواند کشید
نظم اشتر نامۂ تو ای فرید
خسرو ملک سخن عطار شد
زانکہ خوشبو چون گل و گلزار شد
روح پاکش غرق رحمت باد و نور
هم نشین و هم دمش رضوان و حور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عطار کے کسی مدّاح نے یہ قطعہ لکھا ہے اور کاتب نے لکھتے وقت اس کو شاملِ متن کر ایا ۔

(حاشیۂ مصنف)

کوئی تعجب نہیں ، کیوں کہ اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشترنامہ ، مصیبت نامہ سے پیش تر نظم ہو چکا ہے ۔ خسرو نامہ پر نظرثانی کے وقت عطار نے دیباچے میں اپنی مثنویوں کا ذکر کیا ہے ، چناں چہ :

مصیبت نامہ زاد رہروانست
الٰہی نامہ گنج خسروانست
جہان معرفت اسرار نامہ است
بہشت اہل دل مختار نامہ است
مقامات طیور اما چنانست
کہ مرغ عشق را معراج جان است
چو خسرو نامہ را طرزی عجیب است
ز طرز او کہ و مہ را نصیب است

(خسرو نامہ ، صفحہ ۵۲ - ۵۳ ، ثمر ہند لکھنؤ ، ۱۲۹۵ھ)

اس فہرست میں سب سے اول مصیبت نامے کا نام ملتا ہے ، لیکن اشتر نامہ ، جو شعر بالا کی رو سے مصیبت نامے سے اقدم ہے ، شامل نہیں ۔ جہاں مصنف نے اپنی اس قدر مثنویاں گنائی ہیں ، اشترنامے کو کیسے فراموش کر جاتے ، اگر وہ اس وقت تک لکھا جا چکا تھا ۔

خسرو نامہ عطار کی شاعری کی بہترین مثال ہے ۔ وہ ایسے وقت کی یادگار ہے جب ان کی شاعری جوان تھی ۔ اس کتاب کی دو اشاعتیں ہیں ؛ پہلی اشاعت چوں کہ طویل تھی اس لیے ایک دوست کے کہنے پر اس کو مختصر کر دیا ۔ اختصار کے علاوہ اکثر موقعوں پر مناسب اصلاح و ترمیم بھی کی اور حمد و نعت اور منقبت کے جدید اشعار لکھ کر شامل کر دیے ۔ چناں چہ :

چو او در حق این قصہ نکو گفت
چنان کردم همی القصہ کو گفت

برون کردم از آن جا انتخابی
بر آوردم ز یک یک فصل بابی
جدا نعتی و توحیدی بگفتم
بسی از دُرِّ حکمت نیز سفتم
وگر چیزی طرازش را زبان داشت
بگردانیدم از طرزی که آن داشت

(خسرو نامہ ، صفحہ ۵۱ - ۵۲ ، طبع ثمر ہند ، لکھنؤ)

اس مثنوی میں قیصر روم کے فرزند شہزادہ خسرو اور خوزستان کی شہزادی گل رخ کے عشق کا قصہ ہے - خسرو عین ولادت کے وقت اس کی سوتیلی والدہ کے خوف سے ماں کی آغوش سے جدا کیا جا کر ایک وفادار کنیز کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا ہے - یہ دایہ خوزستان پہنچ کر فوت ہو جاتی ہے اور ایک باغبان اس کی پرورش اپنے ذمے لے لیتا ہے - خسرو بہت جلد والیِ خوزستان کے فرزند بہرام کا جلیس اور ہم مکتب ہو جاتا ہے - بہرام کی بہن گل رخ ، خسرو پر عاشق ہو جاتی ہے - جب گل رخ کی شادی والیِ اصفہان سے ہو جاتی ہے ، خسرو اصفہان پہنچ کر گل رخ کو لے کر فرار ہو جاتا ہے - والیِ اصفہان حسنا کو گل رخ کے واپس لانے کے لیے تعین کرتا ہے - حسنا موقع پا کر گل رخ کو چرا کر ایک صندوق میں بند کر دیتی ہے اور صندوق لے کر اصفہان کے ارادے سے روانہ ہوتی ہے - راستے میں دریا میں طوفان آتا ہے اور کشتی ڈوب جاتی ہے - صندوق ایک چین کا ماہی گیر نکال لیتا ہے - گل رخ اس طرح بچ کر اور کئی مصیبتیں جھیلنے کے بعد شاہ چین کے محل میں پہنچ جاتی ہے اور کافور کی معرفت خسرو کو اپنی موجودگی کی اطلاع دیتی ہے - خسرو اس کو لینے کے لیے آ جاتا ہے اور ان کی ملاقات ہو جاتی ہے -

اس قصے کے ضمن میں مصنف نے بزم و رزم ، دریا ، پہاڑ اور جزیروں کے منظر خوب بیان کیے ہیں - شیخ عطار ، جو اور

تصانیف کے دوران میں شخص ایک صوفی با صفا اور زاہدِ خشک کے لباس میں نظر آتے ہیں ، اس مثنوی میں اپنی طبیعت کی رنگینی اور تخیل کی بلندی کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا معیار اس نظم میں اس قدر بلند کر دیا ہے کہ ہم اس تصنیف کو بغیر کسی پس و پیش کے نظامی کی ''شیرین و خسرو'' کے پہلو میں جگہ دے سکتے ہیں ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ساتویں صدی ہجری تک جس قدر عشقیہ مثنویاں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں ، ان میں خسرونامہ کو دوسرے نمبر پر جگہ ملنی چاہیے ۔ خسرو نامہ مطبع ثمرہند لکھنؤمیں (۱۲۹۵ھ) چھپا ہے ، مطبع والوں نے ایسے اشعار نکال دیے ہیں جو منقبتِ اصحابہ ثلاثہ ، امام ابوحنیفہ ، امام شافعی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعداد اسّی کے قریب ہے ۔

مثنویاتِ عطار کے تاریخی مواد سے متعلق بھی یہاں چند الفاظ کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں : عطار بالعموم اپنی حکایات ایسے ماخذ سے لیتے ہیں جو تاریخی اشخاص اور ان کی سرگذشت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس لیے ان مثنویات میں تاریخی دل چسپی کا جدید ذخیرہ موجود ہے ۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی سے متعلق شیخ عطار نے متعدد قصے[1] ایسے دیے ہیں جن کی رو سے سلطان کی سیرت و اخلاق کے ایسے پہلو پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے ، جس کو اس کے مورخین نے بالکل فراموش کر دیا ہے ۔ مورخین اس کی جنگ آزمائی ، فتح یابی ، دینی جوش و غزا کے خط و خال کو بڑے جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں ، لیکن اس کے ذاتی حالات ، جذبات و خیالات ، عادات اور خو بو پر کوئی

۱- راقم نے اس سلسلے میں ایک علیحدہ مضمون لکھا ہے ۔ دیکھو اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ فروری ۱۹۲۵ع ۔ (حاشیۂ مصنف)
یہ مضمون زیر نظر جلد میں بہ طور ضمیمہ شامل ہے ۔ (مرتب)

روشنی نہیں ڈالتے ۔ شیخ اس معاملے میں ایک حد تک ہماری امداد کرتے ہیں ۔ ان کے بیانات میں محمود ، خدا ترس ، درویش دوست ، دل سوز ، جفاکشی کا عادی ، فیاض اور زندہ دلی کا شائق انسان ہے ، جو جلال و طنطنۂ سلطنت کو فراموش کر کے نجی زندگی میں عام انسانوں سے سطحِ مساوات پر ملتا ہے ۔ اُن کی تکلیف اور مصیبت کا اُس کے دل میں درد ہے اور امداد کرنے میں دریغ نہیں کرتا ہے ۔ فیاض اس قدر ہے کہ ادنٰی ادنٰی لطیفوں اور چٹکلوں پر دیناروں کی تھیلیاں برساتا ہے ۔ اس کے کان نصیحت کو سننے کے لیے ہر وقت آمادہ ہیں ۔ ادنٰی ادنٰی انسان اس بڑے آدمی کو کڑوی کڑوی باتیں سنا سکتا ہے ۔ بہرام گور کی طرح شکار کا بے حد شائق ہے ۔ صحراؤں میں شکار کے پیچھے گھوڑا ڈال دیتا ہے اور لشکر سے جدا ہو کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے ۔ دیہاتیوں اور صحرائیوں کا ناخوانده مہمان بنتا ہے ۔کبھی کسی بوڑھے خارکش کی امداد کے لیے ، جو سنسان بیابان میں گدھے پر کانٹے لادنے کے واسطے کسی ہم‌درد انسان کی مدد کا منتظر ہے ، بڑھتا ہے : کانٹوں میں ہاتھ ڈالتا ہے اور گدھے پر رکھوا دیتا ہے ۔ کبھی کسی ضعیف عورت کی وزنی گٹھڑی ، جو سر پر لیے جا رہی ہے اور تھک گئی ہے ، لے کر اپنے گھوڑے پر رکھ لیتا ہے ، پھر بڑھیا کے چھیڑنے کے لیے گھوڑا تیز کر دیتا ہے ۔ بڑھیا پیچھے رہ جاتی ہے : غل مچاتی ہے ، سلطان کو روز قیامت اور پل صراط کی یاد دلاتی ہے ۔ محمود یہ ڈرانے والے الفاظ سن کر سہم جاتا ہے ۔ کبھی کسی ماہی گیر لڑکے کے ساتھ نصف کا شریک بن کر شکار کھیلتا ہے اور دوسرے دن لڑکے کو بلوا کر اپنے برابر تخت پر بٹھا لیتا ہے ۔ کبھی کسی بوڑھے ہیزم فروش سے جا کر خود ہیزم خریدتا ہے ؛ بوڑھا لکڑیوں کی قیمت ''دو جو سیم'' بتاتا ہے ۔ محمود سونے کے سکّوں کی تھیلی سے ایک ایک سکّہ نکال نکال کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھتا جاتا ہے ، اور پوچھتا جاتا ہے کہ ان میں کون سا سکّہ ''دو جو سیم'' کے

برابر ہے ؟ بوڑھا سر ہلاتا جاتا ہے اور ہر سکّے کو بڑا بتاتا ہے ۔ آخر سلطان تھیلی پھینک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے : "اچھا یہ تھیلی لے جاؤ اور اپنے "دو جو سیم" لے کر باقی کل واپس کر دینا ۔ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملنے جاتا ہے اور اُن کے ساتھ بھی شوخیوں سے باز نہیں آتا ۔ ان حکایات پر نظر ڈالنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمود کی شمشیر نہیں تھی جس کے کارناموں نے اسے محبوب بنا دیا تھا ، بلکہ اس کے یہی خسروانہ افعال تھے جنہوں نے وفات کے بعد بھی اس کی یاد کو تازہ اور اس کے نام کو محترم بنا دیا تھا ۔

محمود اور ایاز کے قصے ، جو سلجوقی عہد کے بعد فارسی ادبیات میں عالمگیر شہرت حاصل کرلیتے ہیں ، ان میں سے اکثر کے راوی شیخ عطار ہیں ۔ خود مولانائے روم نے ایک سے زائد حکایت عطار سے لی ہے بلکہ ایک موقعے پر تو حوالہ بھی دے دیا ہے ۔

شعرا کے متعلق بھی عطار بعض جدید اطلاع بہم پہنچاتے ہیں ۔ فردوسی کے سلسلے میں اُن کے ہاں دو بیان ہیں ؛ پہلا یہ کہ سلطان نے شاہ نامے کے سلسلے میں پیل بار انعام بخشا ، لیکن شاعر نے بلند حوصلگی کی بنا پر قبول نہیں کیا :

اگر محمود اخبار عجم را
بداد آن فیل و لشکر وان درم را

اگر تو شعر آری فیل داری
نہ یابی یک درم در روزگاری

چہ آن گر فیل دارش کم نہ ارزید
برِ شاعر فقاعی ہم نہ ارزید

زہی ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ
کنون بنگر کہ چون برگشت از راہ

(الٰہی نامہ ، کلیات ، صفحہ ۹۳۴ ، نول کشور)

دوسرا یہ ہے کہ شیخ الاکابر شیخ ابوالقاسم طوسی نے فردوسی

کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا ۔ رات کو شیخ نے خواب میں دیکھا کہ فردوسی جنت میں موجود ہے ۔ شیخ کو بڑی حیرت ہوئی ۔ پوچھا کہ تمھاری بخشش کیوں کر ہوئی ؟ فردوسی نے کہا کہ ایک شعر توحید کی بنا پر بخش دیا گیا ۔

اس واقعے کی طرف ایما کرتے ہوئے خاتمۂ ''مصیبت نامہ'' میں لکھا ہے :

می نباید شد بحمداللہ بزور
ہمچو فردوسی ز بیتی در تنور
ہمچو فردوسی فقع خواہم کشاد
چون سنائی بی طمع خواہم کشاد

رابعہ بنت کعب القزداری کے دردناک حالات[1] سے متعلق جو رودکی کی معاصر شاعرہ ہے ، عطار ہم کو بالکل جدید اور تفصیلی اطلاع دیتے ہیں ۔ (دیکھو الٰہی نامہ ، صفحہ ۹۱۸—۹۲۷)

علی ھذا فخر الدین اسعد گرگانی اور سبب تالیف ویس و رامین کے سلسلے میں الٰہی نامہ (صفحہ ۸۲۱ - ۸۲۰) میں ایک دل چسپ حکایت آتی ہے جو ہمارے لیے جدید معلومات کا حکم رکھتی ہے ۔

شعرا میں ازرق ، انوری ، شہابی ، عنصری اور خاقانی کا نام مصیبت نامہ میں آتا ہے ۔ ان کے علاوہ سلطان سنجر ، اس کی بہن صفیہ ، نظام الملک ، خواجہ رکن الدین اکف سے متعلق ان کے ہاں جدید اطلاع موجود ہے اور مشائخ کے حالات و مقولات کے لیے تو یہ مثنویاں بے حد ضروری ہیں ۔

تصنیفاتِ شیخ فریدالدین عطار

شیخ عطار کی تصنیفات کی بابت عجیب و غریب بیانات دیے

۱ - تفصیل کے لیے دیکھو اورینٹل کالج میگزین ، بابت ماہ مئی ۱۹۲۵ء جہاں راقم نے رابعہ پر ایک علیحدہ مضمون لکھا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)
یہ مضمون پیش نظر جلد میں بہ طور ضمیمہ نہ ملاحظہ ہو ۔ (مرتب)

گئے ہیں ۔ بعض نے ایک سو کتابوں کا ان کو مالک جانا ہے ۔ سب سے قدیم بیان وہ ہے جو مفتاح الفتوح تالیف ۶۸۸ھ میں ملتا ہے ، و ھو ھذا :

خداوندش نوشته صد مجلد
همه علمی که او مانده مخلد

شین ضمیر شیخ کی طرف راجع ہے ۔ "مظہر العجائب" میں بھی یہی تعداد بتائی گئی ہے ، چنانچہ :

ز بحر علم دارم صد کتب من
درو بنهاده‌ام اسرار لب من

لیکن دولت شاہ اور صاحب ہفت اقلیم نے صرف چالیس کتابیں اور رسالے ان کی طرف منسوب کیے ہیں ۔

دولت شاہ نے شیخ کی مصنفات کے یہ نام دیے ہیں :

(۱) تذکرۃ الاولیا (۲) اسرار نامہ (۳) الٰہی نامہ (۴) مصیبت نامہ (۵) اشتر نامہ (۶) مختار نامہ (۷) جواہر الذات (۸) وصیت نامہ (۹) منطق الطیر (۱۰) بلبل نامہ (۱۱) گل و ہرمز (۱۲) سیاہ نامہ (۱۳) ہیلاج نامہ (۱۴) اخوان الصفا (۱۵) حیدر نامہ ۔

صاحب ہفت اقلیم نے ذیل کی فہرست دی ہے :

(۱) الٰہی نامہ (۲) اسرار نامہ (۳) مصیبت نامہ (۴) وصلت نامہ (۵) بلبل نامہ (۶) پند نامہ (۷) جواہر نامہ (۸) بے سر نامہ (۹) خسرو نامہ (۱۰) ولد نامہ (۱۱) حیدر نامہ (۱۲) اشتر نامہ (۱۳) جواہرالذات (۱۴) مظہر العجائب (۱۵) منطق الطیر (۱۶) گل و ہرمز (۱۷) شرح القلب (۱۸) تذکرۃ الاولیاء (۱۹) اخوان الصفا (۲۰) دیوان (۲۱) لسان الغیب ۔ (اگرچہ فہرست میں نام شامل نہیں لیکن انتخاب کلام دیا ہے) ۔

قاضی نوراللہ شوستری کے ہاں یہ نام آتے ہیں :

(۱) منطق الطیر (۲) الٰہی نامہ (۳) بلبل نامہ (۴) مظہرالعجائب ۔

حاجی خلیفہ کے ہاں ذیل کی کتابیں ہیں :

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) بلبل نامہ (۴) پند نامہ (۵) تذکرۃ الاولیا (۶) جواہر الذات (۷) حیدر نامہ (۸) خسرو نامہ (۹) شتر نامہ (۱۰) منطق الطیر (۱۱) مصیبت نامہ (۱۲) مظہر العجائب (۱۳) وصلت نامہ ۔

ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرستِ کتب خانۂ اودھ میں یہ کتابیں مذکور ہیں :

(۱) دیوان (۲) حقائق الجواہر ۔ اس کا پہلا شعر ہے :

ای خدای سرّ هر انسان توی

کاشف راز حقائق جان توی

(۳) بے سر نامہ (۴) مصیبت نامہ (۵) اسرار الشہود (۶) جواہر الذات (۷) اشتر نامہ (۸) خسرو نامۂ کبیر (۹) خسرو نامۂ صغیر (۱۰) مظہر العجائب (۱۱) منطق الطیر (۱۰) بلبل نامہ (۱۳) وصلت نامہ (۱۴) پند نامہ (۱۵) خیاط نامہ (۱۶) کنز الحقائق (۱۷) ہفت وادی (۱۸) الٰہی نامہ (۱۹) اسرار نامہ ۔

گیارھویں قرن ہجری کا ایک کلیات[1] کتب خانۂ بانکی پور پٹنہ میں ہے ، جس میں حسب ذیل کتابیں ملتی ہیں :

(۱) جواہرالذات (۲) مظہر العجائب (۳) منطق الطیر (۴) حلاج نامہ (یا) منصور نامہ (۵) مصیبت نامہ (۶) لسان الغیب (۷) خیاط نامہ (۸) مفتاح الفتوح (۹) کنز الحقائق (۱۰) ہفت وادی (۱۱) اشتر نامہ (۱۲) پند نامہ (۱۳) دیوان ۔

کلیات کے علاوہ اس کتب خانے میں یہ کتابیں اور ہیں :

(۱۴) اسرار نامہ (۱۵) بلبل نامہ (۱۶) بی‌سرنامہ (۱۷) وصلت نامہ ۔

اسی کتب خانے کے فہرست نگار مولوی عبدالمقتدر صاحب نے

۱ ۔ فہرست بانکی پور ، نمبر ۴۶ ، صفحہ ۶۳ ۔ (حاشیۂ مصنف)

ذیل کی فہرست علیحدہ دی ہے :

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) مصیبت نامہ (۴) جواہر الذات (۵) اشترنامہ (۶) مختار نامہ (۷) حیدر نامہ (۸) بے سر نامہ (۹) سیاہ نامہ (۱۰) منطق الطیر (۱۱) گل و ہرمز (۱۲) پند نامہ (۱۳) وصلت نامہ (۱۴) وصیت نامہ (۱۵) بلبل نامہ (۱۶) اسرار الشہود (۱۷) گل و خسرو (۱۸) مظہر العجائب (۱۹) خیاط نامہ (۲۰) کنز الحقائق (۲۱) ہفت وادی (۲۲) لسان الغیب (۲۳) مفتاح الفتوح (۲۴) منصور نامہ (۲۵) کنزالبحر ۔

انڈیا آفس لائبریری کے ایک کلیات نمبر ۱۰۳۱ میں مثنویاتِ ذیل شامل ہیں :

(۱) اشتر نامہ (۲) خسرو و گل (۳) بلبل نامہ (۴) بند نامہ (۵) منطق الطیر (۶) ہفت وادی (۷) بے سر نامہ (۸) کنزالاسرار (۹) دیوان (۱۰) وصلت نامہ (۱۱) مفتاح الفتوح (۱۲) اسرار نامہ (۱۳) کنز الحقائق (۱۴) الٰہی نامہ (۱۵) مصیبت نامہ (۱۶) لسان الغیب (۱۷) جوہرالذات (۱۸) مظہرالعجائب ۔

اسی کتب خانے میں ایک ستہ[۱] عطار ہے ۔ اس کی تاریخِ کتابت ۸۰۷ھ و ۸۱۲ھ کے درمیان ہے اور مثنویاتِ ذیل پر شامل ہے :

(۱) اشتر نامہ (۲) اسرار نامہ (۳) خطبۂ الٰہی نامہ (۴) بلبل نامہ (۵) مصیبت نامہ (۶) وصلت نامہ ۔

پروفیسر سراج الدین آذر کے کلیات میں یہ کتابیں ہیں :

(۱) جواہرالذات ، برمتن (۲) دیوان ، برحاشیہ (۳) مختار نامہ ، حاشیہ (۴) دیباچۂ گل و ہرمز ، اشاعت اول (حاشیہ) (۵) منطق الطیر ، حاشیہ (۶) ہیلاج نامہ ، متن (۷) اسرار نامہ ، حاشیہ (۸) اشتر نامہ ، متن (۹) الٰہی نامہ ، حاشیہ (۱۰) مصیبت نامہ ، متن (۱۱) وصلت نامہ ، حاشیہ ۔ خاتمے کے اشعار نقل ہونے سے رہ گئے ہیں ۔ (۱۲)

---

۱ ۔ فہرست انڈیا آفس نمبر ۱۰۳۴ ، صفحہ ۶۱۸ ۔ (حاشیۂ مصنف)

گل و ہرمز ، متن (۱۳) بلبل نامہ ، حاشیہ (۱۴) نزہت الاحباب ، حاشیہ (۱۵) مفتاح الفتوح حاشیہ - صرف دیباچہ منقول ہے -

عطار کے معلومہ کلیات میں یہ نسخہ سب سے قدیم ہے اور صحت کے اعتبار سے متوسط درجے کا ہے - اس کی تاریخ کتابت ۸۵۷ھ ہے -

ستہ عطار[1] ، (ضمیمہ فہرست کتب فارسیہ برٹش میوزیم لائبریری) سنہ ۸۸۹ھ کا نوشتہ ہے ، اس میں یہ کتابیں داخل ہیں :

(۱) مختار نامہ (۲) الٰہی‌نامہ (۳) منطق الطیر (۴) مصیبت نامہ (۵) اسرار نامہ (۶) وصلت نامہ -

سنہ ۱۲۸۹ھ میں نول کشور نے جو کلیات چھاپا ہے ، اس میں کتب ذیل شامل ہیں :

(۱) جواہرالذات ، (جلد اول صفحہ ۲-۲۹۸ ، ایضاً جلد دوم ، صفحہ ۳۰۰-۵۸۲) (۲) ہیلاج نامہ ، صفحہ ۵۸۴-۷۷۰ (۳) الٰہی نامہ ، صفحہ ۷۷۲-۹۴۳ (۴) مختار نامہ ، صفحہ ۹۴۶-۱۰۳۷ (۵) منطق الطیر ، ۱۰۵۰-۱۱۶۵ (۶) بلبل نامہ ، صفحہ ۱۱۶۸-۱۱۸۴ (۷) نزہت الاحباب ، صفحہ ۱۱۸۶-۱۱۹۵ (۸) مفتاح الفتوح ، صفحہ ۱۱۹۸-۱۲۲۱ (۹) بے سر نامہ ، صفحہ ۱۲۲۴-۱۲۲۹ (۱۰) پند نامہ ، صفحہ ۱۲۳۲-۱۲۵۷ -

کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد کی فہرست میں عطار کی ایک اور تصنیف ملتی ہے ، اس کا نام ”آغاز عشق“ ہے - مطبع مسیحائی نے ایک اور مثنوی موسوم بہ اسرار نامہ طبع کی ہے -

اس طرح عطار کی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہوئی :

(۱) آغاز عشق (۲) اسرار نامہ (۳) اسرار نامہ (مطبع مسیحائی پریس) (۴) اشتر نامہ (۵) اسرارالشہود (۶) اخوان الصفا (۷) الٰہی نامہ (۸) بے سر نامہ (۹) بلبل نامہ (۱۰) پند نامہ (۱۱) تذکرۃالاولیا (۱۲) جواہرالذات (یا) جوہر نامہ (۱۳) حلاج نامہ (یا) منصور نامہ

---

۱ - نمبر ۲۳۶ ، صفحہ ۱۵۹ - (حاشیۂ مصنف)

(۱۴) حقائق الجواهر (۱۵) حیدر نامہ (۱۶) خسرو نامہ (یا) گل و ہرمز (۱۷) خیاط نامہ (۱۸) دیوان (۱۹) سیاہ نامہ (۲۰) شرح القلوب (۲۱) کنز الاسرار (۲۲) کنز البحر (۲۳) کنز الحقائق (۲۴) لسان الغیب (۲۵) منطق الطیر (۲۶) مصیبت نامہ (۲۷) مختار نامہ (۲۸) مظہر العجائب (۲۹) مفتاح الفتوح (۳۰) نزہت الاحباب (۳۱) وصیت نامہ (۳۲) وصلت نامہ (۳۳) ولد نامہ (۳۴) ہیلاج نامہ (۳۵) ہفت وادی[1]۔

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی نے اپنی کتاب ''احوال و آثار فرید الدین عطار'' کے صفحے ۹۷—۹۸ پر عطار سے منسوب کی جانے والی کتابوں کی مندرجہ ذیل فہرست دی ہے:

(۱) اخوان الصفا - (۲) اسرار نامہ - (۳) اشتر نامہ (۴) الٰہی نامہ - (۵) بلبل نامہ - (۶) بی سر نامہ - (۷) پسر نامہ - (۸) پند نامہ - (۹) تذکرۃ الاولیا - (۱۰) جواب نامہ - (۱۱) جواہر الذات - (۱۲) جواہر نامہ (۱۳) حیدر نامہ - (۱۴) خسرو نامہ - (۱۵) دریای ابرار - (۱۶) دیوان - (۱۷) ستہ عطار - (۱۸) شتر نامہ - (۱۹) شرح القلب - (۲۰) عبیر نامہ - (۲۱) گل‌وبلبل - (۲۲) گل و ہرمز - (۲۳) لسان‌الغیب - (۲۴) لیلیٰ و مجنون (۲۵) محمود و ایاز - (۲۶) مختار نامہ - (۲۷) مخزن الاسرار - (۲۸) مصیبت نامہ - (۲۹) مظہر الصفات - (۳۰) مظہر العجایب - (۳۱) مفتاح الفتوح - (۳۲) منطق الطیر - (۳۳) نامۂ سیاہ - (۳۴) وصلت نامہ - (۳۵) وصیت نامہ (۳۶) ولد نامہ - (۳۷) ہیلاج نامہ -

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل ۲۹ کتابیں بھی بقول سعید نفیسی عطار سے منسوب کی جاتی ہیں:

(۱) ارشاد بیان - (۲) ترجمہ الاحادیث - (۳) حلاج نامہ یا منصور نامہ - (۴) خرد نامہ - (۵) خسرو و گل - (۶) خیاط نامہ - (۷) دیوان رباعیات - (۸) سیاہ نامہ - (۹) سی فصل - (۱۰) شاہ‌نامہ - (۱۱) شفاالقلوب فی لقا ألمحبوب - (۱۲) صد پند - (۱۳) عشاق نامہ - (۱۴) کنز الاسرار - (۱۵) کنز الحقایق (۱۶) مثنوی عشقیہ عطار - (۱۷) مثنوی عطار -

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

مذکورۂ بالا مختلف فہرستوں سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ شیخ عطار کا کلام خود ان کے اپنے زمانے میں مدوّن نہیں ہوا تھا ۔ ان کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی جب کہ چنگیزی طوفان ایران کو زیر و زبر کر رہا تھا ، اس لیے اس عہد میں بھی اس کے جمع کیے جانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا ۔ آٹھویں صدی کی کوئی چیز کسی کتب خانے میں موجود نہیں ، نویں صدی کی متعدد چیزیں ملتی ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں عطار کی تصنیفات اہل ذوق جمع کرنے لگے ہیں ۔ اور چونکہ کوئی قدیم کلیات موجود نہیں ، اس لیے اپنے اپنے مجموعوں میں مختلف مثنویاں جمع کر رہے ہیں ، اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان مجموعوں میں مختلف چیزیں شامل ہوگئی ہیں ۔ کلیات ایک طرف ، ستے اور سبعے ایک دوسرے سے نہیں ملتے ۔ نہ ان میں کسی ترتیب کا لحاظ ہے ، جیسا اور شعرا کے کلیات میں دیکھا جاتا ہے ۔ اس انتشار اور ابتری کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ عطار کے کلیات میں دیگر شعرا کی تصنیفات سہواً شامل ہوگئیں ۔ دوسرا یہ ہوا کہ بعض لوگوں نے خاص خاص مقاصد کو مد نظر رکھ کر اپنی تصنیفات شیخ کے کلام میں شامل کر دیں ۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ایک سرسری نظر ایسی کتابوں پر ڈالی جائے ۔ میرا تبصرہ انھیں کتابوں پر محدود ہوگا جو میری نظر سے گزر چکی ہیں ۔

۱ ۔ آغاز عشق :

کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد دکن کی فہرست میں یہ کتاب

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
(۱۸) مظہر آثار ۔ (۱۹) مظہرالذات ۔ (۲۰) معراج نامہ ۔ (۲۱) مفرح نامہ (۲۲) مصباح نامہ ۔ (۲۳) مقامات طیور ۔ (۲۴) منتخب حدیقۂ سنائی ۔ (۲۵) منصور نامہ ۔ (۲۶) مواعظ ۔ (۲۷) نزہۃ الاحباب ۔ (۲۸) نزہت نامہ (۲۹) ہفت وادی ۔ (مرتب)

درج ہے ، جس کا نمبر ۱۵۵ ہے ۔ فہرست نگار نے اس کا نام "آغاز عشق" رکھا ہے ۔ در حقیقت یہ کوئی نئی مثنوی نہیں ہے ، بلکہ عطار کے خسرو نامہ کا ابتدائی حصہ ہے ۔ یہ ایک معما ہے کہ اس کا نام "آغاز عشق" کیوں رکھا گیا ۔

۲ ۔ اسرار الشہود :

ڈاکٹر اسپرنگر فہرست نگار[1] کتب خانۂ اودھ اور مولوی عبدالمقتدر خاں فہرست نگار[2] کتب خانۂ بانکی پور اور مطبع خادم التعلیم لاہور (جنھوں نے ۱۸۹۴ع میں اس کو طبع بھی کر دیا ہے) عطار کی تصنیف بیان کرتے ہیں اور بعض قلمی نسخوں میں بھی عطار کی طرف منسوب ہے ، لیکن صحیح یہ ہے کہ شیخ شمس الدین محمد لاہجی اسیری نوربخشی شارح گلشن راز کی تصنیف ہے ، جو سید محمد نور بخش کے مرید ہیں ۔ یہ کتاب ۸۴۲ھ کے گرد و پیش میں لکھی گئی ہے ، مطبوعہ کتاب کے صفحہ ۹ پر علیحدہ عنوان کے تحت میں مصنف اپنے پیر کی مدح شروع کرتا ہے ، جس میں اشعار ذیل آتے ہیں :

آن محمد نام عیسیٰ مرتبت
ملک معنی را سلیمان منزلت
آمدہ از غیب نامش نور بخش
بود چون خورشید بامش نور بخش

صفحہ ۱۰ پر ایک شعر میں اس کا تخلص اسیری موجود ہے :

ہر یکی در دور خود گشتہ جنید
چون "اسیری" دیدہ آزادی ز قید[3]

۱ ۔ فہرست ، صفحہ ۳۸۰ ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ ۔ فہرست ، صفحہ ۶۴ ۔ (حاشیۂ مصنف)
۳ ۔ فرقۂ نور بخشی پر پروفیسر محمد شفیع ایم ۔ اے نے ایک نہایت فاضلانہ
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صفحہ ۹۲ پر ایک حکایت میں مصنف اپنے بعض حالات دیتا ہے ، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جذبہٴ عشقِ الٰہی اس پر غالب آ جاتا ہے ، ایک ابدال سے اپنے آیندہ پیر سید محمد نوربخش کا نام سن کر اصفہان سے روانہ ہوتا ہے :

صبح دم پنہان ز خویش و اقربا
بہر طوف کعبہٴ صدق و صفا
آمدم بیرون ز شہر اصفہان
یک تنِ تنہا پیادہ بہر آن
تا مبادا دوستان بی خرد
مانعم آیند و کارم بد شود

مصنف یہ سفر غرہٴ ماہ رجب ۸۴۲ ہجری کو اختیار کرتا ہے :

سال تاریخش بود بی کیف و کم
هشت صد و چهل و دو بی بیش‌وکم (صفحہ ۹۴)

سید محمد نور بخش بانیِ فرقہٴ نور بخشیہ (۷۹۵ ہجری و ۸۶۹ ہجری) قاین میں ولادت پاتے ہیں اور خواجہ اسحق ختلانی کے مرید ہیں ، جو سید علی ہمدانی کے مرید تھے ۔ خواجہ نے آپ کو "نور بخش" کا خطاب عطا کیا ۔ ختلان میں ایک ہنگامے کے موقعے پر خلیفۃالمومنین بنا دیے جانے پر شاہ رخ بادشاہ نے آپ کو ہرات میں قید کر دیا ، ۸۲۶ھ میں آپ نے بھاگ کر اس قید سے رہائی پائی اور ایک عرصے تک بغداد ، بصرہ اور کردستان میں سیاحت کے بعد آپ نے گیلان میں سکونت اختیار کی اور شاہرخ کی وفات پر رے تشریف لے آئے جہاں تا حینِ وفات قیام پذیر رہے ۔

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

مضمون اورینٹل کالج میگزین (بابت سنہ ۱۹۲۵ع) کے پہلے اور دوسرے نمبر میں لکھا ہے ۔ میں نے یہ شعر اسی مضمون سے حاصل کیا ہے ۔
(حاشیہٴ مصنف)

۳ - اسرار نامہ :

یہ وہ اسرار نامہ نہیں ہے جو عطار نے بحرِ ہزج مسدس میں لکھا ہے اور عام فہرستوں میں اس کا افتتاحیہ[1] ہے :

بنام آن کہ جان را نور دین داد
خرد را در خدا دانی یقین داد

بلکہ یہ اور اسرار نامہ ہے جو بحر رمل مسدس میں ہے - اس کے پہلے دو شعر ہیں :

افتتاح نام ها از نام تو
هر دو عالم جرعہ نوش از جام تو
آن خداوندی کہ در عرض وجود
هر زمان خود را بہ نقشی وا نمود

اور خاتمے کا بیت ہے :

دیدۂ حق بین اگر بودی مرا
او رخ از هر ذره بنمودی مرا

یہ کل آٹھ صفحوں کا رسالہ ہے اور ۱۲۶۷ھ میں مطبعِ مسیحائی میں چھپ چکا ہے - استادانہ کلام ہے ، مسائل تصوف کو مختصراً چھیڑا گیا ہے کہ دنیا میں خدا کے سوا کچھ نہیں ، ذراتِ عالم اس کے مرآت ہیں اور اسی کے عشق میں مست ہیں - عجز و انکسار زادِ راہِ عشق ہے ، طالب کو بہشت بہشت اور کونین سے کوئی سرو کار نہیں - از روئے معنی انسان جانِ عالم ہے اور اس کا دل لوحِ محفوظ ہے ، نور و ظلمات کا برزخ انسان ہے اور انسان ہی مقصودِ عالم ہے - انسان اگر اپنی حقیقت شناخت کر لے تو کائنات کی

۱ - پروفیسر آذر کے کلیات میں پہلے دو شعر یوں ہیں :
بنام آن کہ از خاک آدمی کرد
ز کفلی و ز دودی آدمی کرد
جهان داری کہ جان را نور دین داد
خرد را در خدا دانی یقین داد (حاشیۂ مصنف)

حقیقت معلوم کر سکتا ہے ۔ دل جام جم اور عرش رحمانی ہے۔ عشق کیا ہے ؟ یہی قطرے کا دریا بن جانا :

عشق چبود قطره دریا ساختن
از دو عالم با خدا پرداختن

شیخ عطار کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ صاف اور منجھی ہوئی ہے ۔ محض اہل مطبع کی شہادت پر اس کو عطار کا کلام نہیں مانا جا سکتا ، کیونکہ نہ وہ کسی کلیات میں شامل ہے اور نہ کوئی تذکرہ نگار اس کا ذکر کرتا ہے ۔ علاوہ بریں حاجی خلیفہ غالباً اسی مثنوی کو مولانا جلال الدین رومی کی طرف منسوب کرتا ہے ۔ (کشف الظنون ، صفحہ ۹۵ ، جلد اول ، طبع مصر ، ۱۳۱۱ہجری)

۴ ۔ کنز الحقائق :

اکثر تذکرہ نگار اس تصنیف کے متعلق خاموش ہیں ۔ نویں صدی کے کلیات میں شامل نہیں ، لیکن دسویں اور گیارھویں قرن ہجری کے کلیات میں موجود ہے ۔ چنانچہ ایتھے انڈیا آفس کی فہرست (صفحہ ۶۱۵ ، نمبر ۱۰۳۱) میں اور ریو برٹش میوزیم کے ضمیمۂ فہرست کتب فارسی (نمبر ۲۳۵ ، صفحہ ۱۵۹) میں اور مولوی عبدالمقتدر خاں بانکی پور کی فہرست (صفحہ ۶۸) میں اس کو عطار کی تصنیف مانتے ہیں اور شعر ذیل افتتاحی بیان کرتے ہیں :

بنام آنکہ جان را نور دین داد
خرد را در خدا دانی یقین داد

لیکن یہ شعر اسرار نامۂ عطار کا افتتاحیہ ہے ۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے کتب خانۂ اودھ کی فہرست (صفحہ ۳۵۶) میں اور آئیوناف نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست (صفحہ ۲۱۲ ، نمبر ۴۷۷) میں بیت ذیل افتتاحی لکھا ہے :

بنام آنکہ اول کرد و آخر
بنام آن کہ باطن کرد و ظاہر

کنزالحقائق کا میرے پاس بھی ایک نسخہ ہے، جس کا پہلا شعر اسپرنگر اور آئیوناف کے نقل کردہ شعر کے مطابق ہے - فہرست نگاروں نے اسی کتاب کا ایک اور شعر نقل کیا ہے :

چو گفتم اندرو چندین دقائق
نہادم نام او کنزالحقائق

یہ شعر خفیف سے اختلاف کے ساتھ میرے نسخے میں موجود ہے - پہلے مصرع میں "اندرو" کی بجائے "اندرین" اور دوسرے میں "نام او" کی جگہ "نام وی" ہے -

اس مثنوی میں حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت علیحدہ عنوان سے چلتی ہے - "سببِ نظمِ کتاب" میں شاعر کہتا ہے کہ میرے چند دوستوں نے اسرار طاعت کے متعلق مجھ سے سوالات کیے - میں نے ان کی فہم کے مطابق جوابات کو نظم کر دیا اور اس کا نام کنزالحقائق رکھ دیا - میرا مقصد نظم کہنے سے اظہارِ لیاقت نہیں - چھ ماہ کے عرصے میں جب کہ سنہ ۷۰۹ ہجری تھا، یہ کتاب ختم ہوئی :

مرا مقصود ازین جز معرفت نیست
خدا داند کہ اظہار صفت نیست
ز ہجرت ہفصد و نہ شد ، نہادم
اساسش را ، بہ شش مہ نظم دادم

اس مثنوی کے بعض زیر بحث عنوان یہ ہیں :

تحقیق ایمان و اسلام - شہادت - طہارت - صلوٰۃ - زکوٰۃ - روزہ - حج - جہاد - نفس - شیطان - عشق - دنیا - بہشت و دوزخ - جان - عیسیٰ و دجال - شناخت و تحقیق - عہد مہدی - آب حیوان - صراط وغیرہ -

نسخہ ہذا نہروالہ گجرات میں سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں نقل ہوا تھا، جیسا کہ ورق اول کے صفحہ الف کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے - اس کے مصنف کا نام اسی صفحے میں عبارت ذیل

میں یوں لکھا ہے :

"کنز الحقائق پہلوان محمود بن پوریائے ولی"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام پہلوان محمود ہے ۔ عبارت منقولہ بالا کا راقم خواہ محب‌اللہ ہو ، جس کی مُہر پاس ہی لگی ہوئی ہے ، یا کوئی اور شخص ، مگر اس میں شک نہیں کہ وہ مصنف کی شخصیت سے بخوبی واقف تھا ۔ کیوں کہ اس مثنوی کے ساتھ ہی مثنوی "گلشن راز" اسی کاتب کے قلم کی لکھی ہوئی ملحق ہے ۔ اس پر محب‌اللہ نے صاف لکھا ہے : "گلشن راز من محمود چبستری در سنہ ۷۱۰ ھجری این در انظم سفتہ ۔" باوجودیکہ دونوں مثنویوں میں مصنفین کا نام "محمود" عام ہے اور دونوں اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں ، لیکن وہ مغالطہ نہیں کرتا ۔ پہلے کو پہلوان محمود کہتا ہے اور دوسرے کو محمود چبستری ۔

کنزالحقائق کے متن کی شہادت بھی محب‌اللہ کے بیان کی مؤید ہے ۔ مصنف نے ایک سے زیادہ موقع پر اپنا نام محمود دیا ہے ۔ مثلاً حمد کے خاتمے کا یہ شعر :

خداوندا بحق نیک مردان
کہ ما را عاقبت محمود گردان

تحقیق صلٰوۃ کے ذیل میں یہ بیت آتی ہے :

برو جان پدر بشنو ز محمود
کزینش جز حقیقت نیست مقصود

اور زکٰوۃ کے ذکر میں :

بیاموز ار ندانی این طریقت
ز محمود (از) زکٰوۃ (دین) حقیقت

اور بہشت و دوزخ کے بیان میں :

بہشت و دوزخت . . . کہ مقصود
کہ بشناسی بمعنی گفت محمود

یاد رہے کہ حاجی خلیفہ کے ہاں بھی یہ کتاب پہلوان محمود

خوارزمی کی تصنیف بتائی گئی ہے (کشف الظنون ، جلد اول ، صفحہ ۳۳۳ ، طبع مصر)۔

فرہنگ آنندراج میں انجمن آرائے ناصری کے حوالے سے لفظ "لت" کی تشریح میں اسی شاعر کی ایک رباعی درج ہے ، یہاں اس کو پہلوان محمود مشہور بہ پوریائے ولی خوارزمی لکھا ہے۔ رباعی

آنیم کہ پیل بر نتابد لت ما
بر چرخ زنند نوبت شوکت ما
گر در صف ما مورچہ گیرد جای
آن مورچہ شیر گردد از دولت ما

(جلد سوم ، صفحہ ۹۱)

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اس کتاب کو عطار[1] کی تصنیف نہیں مانا جا سکتا۔

۵ - مفتاح الفتوح :

اکثر کلیات میں موجود ہے اور تمام فہرست نگار عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں ، لیکن مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی دیباچہ تذکرۃ الاولیائے عطار طبع یورپ میں انڈیا آفس کے ایک نسخے سے جس کا نمبر سہواً ۵۵۹ دیتے ہیں ، اشعار ذیل نقل کرکے بیان کرتے

۱ - ولہ داغستانی "ریاض الشعرا" میں پہلوان محمود کے متعلق بیان کرتا ہے کہ ان کا تخلص قتالی ہے۔ پدر محترم کی تقلید میں کشتی گیری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ ریاضتِ جسمانی کے ساتھ ریاضتِ روحانی میں بھی سب کے سرکردہ اور ولی کامل تھے۔ اصل میں اورگنج سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثنوی کنزالحقائق سنہ ۷۰۳ھ میں تصنیف کی ۔ سنہ ۷۲۲ ہجری میں انتقال کیا اور خیوق خوارزم میں مدفون ہیں ۔
(حاشیہ مصنف)

ہیں کہ وہ کسی زنجانی[1] کی تصنیف ہے :

بسال شش صد و هشتاد و دو چار
شهور سال را بد آخر کار
ز ذوالحجه گذشته بد ده و پنج
که مدفون کردم اندر دفتر این گنج[2] (صفحه یو)

"مفتاح الفتوح" دراصل غزلیات کے ایک مجموعے کا نام ہے جس کو زنجانی مذکور نے ایک منظوم دیباچے اور اس تعلی کے ساتھ کہ وہ شیخ عطار کے روحانی فیضان اور انہیں کے طرز میں لکھ رہا ہے ، شائع کیا ہے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ "شیخ نے خواب میں آ کر مجھ کو اس تصنیف کا حکم دیا ۔" لیکن راقم اس قدر بدعقیدہ واقع ہوا ہے کہ اس ادعائی فیضان میں سرقے کا پہلو دیکھتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ اس زنجانی نے ایک منظوم دیباچہ لکھ کر شیخ عطار کی چونسٹھ غزلیات پر قبضہ کرلیا ہے کیوں کہ "مفتاح الفتوح" کی جس قدر غزلیات ہیں ، دیوان عطار سے اڑائی گئی ہیں اور دلاوری یہ کی ہے کہ عطار کا تخلص تک بحال رہنے دیا ہے ، ساتھ ہی پردہ دری کے خوف سے یہ ہدایت کردی ہے کہ کتاب کو اغیار کی نگاہ سے دور رکھنا :

وصیت کردم ای یار یگانه
که از ناساز پوشی این ترانه

وہ اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ میں نے ایک شب ایک

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :

"این مثنوی ظاهراً ازکسی‌ست بجز عطار زیراکه از مطالب آن چنین برمی‌آیدکه از مردم زنجان بوده و در آن گویدکه جزین کتاب دیگر چیزی نسروده است ۔"

(صفحه ۱۲۸ ، احوال و آثار عطار) (مرتب)

۲ - پروفیسر آذر اور نول کشور کے کلیات میں یہ اشعار نہیں ملتے ۔ (حاشیۂ مصنف)

بزرگ کو خواب میں دیکھا ، انھوں نے فرمایا کہ تم اپنے دوستوں کے لیے ایک رسالہ نظم کر دو اور اس کا نام "مفتاح الفتوح" رکھ دو :

مرا گفتہ چو برخیزی تو از خواب
کتابی جمع کن از بہر احباب
سخن گو اندرو روشن بہ برھان
تو مفتاح الفتوحش نام گردان

(کلیات ، صفحہ ۱۲۰۰ ، نول کشور)

جب میں بیدار ہوا تو کاغذ ، قلم‌دوات لے کر لکھنے بیٹھا لیکن کچھ نہ لکھ سکا ۔ اس کوشش میں دو ہفتے گزر گئے اور میں نے اپنے آپ کو اس کام کے بالکل ناقابل پایا ۔ بھلا کہاں میں اور کہاں یہ قیل و قال ، اور نہ میری یہ مجال کہ بغیر اجازت کے کوئی کام کروں ۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس کوشش سے دست‌بردار ہو جاؤں ۔ آں حضرت[1] نے سو مجلدات ہر علم پر لکھے ہیں ، نہ انھوں نے کسی سے پڑھا اور نہ کسی سے تعلیم پائی ۔ جو کچھ لکھا ، الہامِ خداوندی سے لکھا :

نکردم بی‌اجازت کار ہرگز
نگویم این سخن زنہار ہرگز
خداوندش[1] نوشتہ صد مجلد
ہمہ علمی کہ او ماند مخلد
نہ برکس خواندہ ، نی ازکس‌شنیدہ
بالہام از خدا بر وی رسیدہ

(کلیات ، صفحہ ۱۲۰۰ ، نول کشور)

میں اس فکر میں رہا کہ دیکھیے غیب سے کیا اطلاع دی جاتی ہے ۔ آخر ایک روز مجھ پر حالت طاری ہوگئی ۔ اس بے خودی کے

---

۱ ۔ "آں حضرت" سے مراد شیخ عطار ہیں ۔ گویا انھیں کے ارشاد اور فیضان سے کتاب "مفتاح الفتوح" تالیف ہوئی ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

عالم میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت ارشاد فرماتے ہیں : "اے مسکین ! تو آرایشِ لفظ و عبارت کے درپے نہ ہو اور معنی کو ضروری سمجھ کر انھیں کی تقریر پر اکتفا کر۔"

دراین اندیشہ بودم گاہ و بی‌گاہ
کہ تا خود چون کنند از غیبم آگاہ

بخود بودم فرورفتہ یکی روز
بدم در سینۂ تاب و جگر سوز

در آن دم حالتی دیدم نہانی
کہ شد بر خاطرم کشف معانی

در آن حیرانی و حیرت کہ بودم
بسمع دل ازان حضرت شنودم

کہ ای مسکین نگہ‌دار این اشارت
مدہ آرایش لفظ و عبارت

تو تقریر معانی کن درین کار
بہ جان و دل معانی دوست میدار

(ایضاً صفحہ ۱۲۰۱)

اب میں جان و دل سے ان کے ارشاد کا پابند ہوگیا اور جو کچھ لکھتا ہوں ، اُن ہی کے فیضان میں لکھتا ہوں ۔ اور میں تو محض بہانہ ہوں ، شعر گوئی اُن کے طرز کے بغیر نہ صرف بےلطف بلکہ بےکار ہے ۔ اب چوں کہ آنحضرت نے اجازت دے دی ہے ، میں بڑی تیزی کے ساتھ شعر لکھ سکتا ہوں اور میری طبیعت سے اعلی شعر ڈھلنے لگے ہیں :

بجان گفتم شدم منقاد رایش
سرم بادا فدای خاک پایش

سخن زآنجاست ای مرد یگانہ
بہانہ دان مرا اندر میانہ

سخن بی طرز او بی‌ساز آید
اگر گوئی بکاری باز ناید

اجازت چونکه شد زآنحضرت پاک
همی‌گویم سخن گستاخ وچالاک

چو زانحضرت اجازت شد چه‌باکم
نکو آید سخن از طبع پاکم

(کلیات ، صفحہ ۱۲۰۱ ، طبع نول کشور)

اس دیباچے کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ، جس کی تمام غزلیں دیوان عطار سے لی گئی ہیں ۔ تعجب ہے کہ یہ مقدس سرقہ اب تک طشت از بام نہیں ہوا ۔

۹ ۔ وصلت نامہ :

اس کے کئی نسخے نویں قرن کے لکھے ہوئے آج بھی موجود ہیں ۔ معلومہ نسخوں میں سب سے قدیم وہ ہے جو انڈیا آفس کے کتب خانے (فہرست صفحہ ۶۱۸ ، نمبر ۱۰۳۴) میں ہے ۔ اس کی تاریخ کتابت ۸۱۲ ہجری ہے ۔ فہرست نگار عطار کا تسلیم کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ایک مقام پر (فہرست کتب خانۂ اودھ ، صفحہ ۳۵۵) شیخ عطار کا بیان کیا ہے ، دوسرے موقع پر (فہرست کتب خانۂ اودھ ، صفحہ ۳۷۰) شیخ بہلول کا لکھا ہے ۔ نول کشور نے مثنوی شیخ بہلول کے نام سے اس کو چھاپ بھی دیا ہے ، اور سنہ ۱۲۹۷ ہجری میں بار دوم طبع کیا ہے ۔ ابتدائی شعر ہے :

ابتدا اول بنام کردگار
خالق هفت و شش و پنج و هزار[1]

---

۱ ۔ پروفیسر نفیسی کے ہاں یہ شعر یوں درج ہے :
ابتدا کردم بنام کردگار
خالق هفت و شش و پنج و چهار

(مرتب)

شیخ لقمان سرخسی، اس کتاب کی مرکزی شخصیت ہیں جن کو بایزید، جنید اور منصور سے مقدم مانا گیا ہے۔ گویا ایک طرف وہ بایزید اور امام جعفر صادقؓ متوفی ۱۴۹ ہجری کے اور دوسری طرف شیخ ابوسعید ابوالخیر متوفی ۴۴۰ھ کے ہم‌عصر مانے گئے ہیں اور ان کی عمر ۳۷۱ سال بتائی گئی ہے:

شیخ لقمان آن زمان با بایزید
بود باقی تا بدور بو سعید
عمر او صد بود و هفتاد و سه سال
دائما در قرب بود و در وصال

(مثنوی بہلول، صفحہ ۲۲، نول کشور)

اس کتاب کے خاص مضامین یہ ہیں: حمد و نعت، تخلیق آدم، حکایت بلال، حکایت از روئے رموز، حکایت سلطان محمود (سلطان ایک ویرانے میں جاتا ہے، وہاں ایک دیوانہ رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شیخ لقمان سرخسی ہیں جو حسین سے ملنے آئے تھے۔ اس نے اناالحق آشکارا کہا تھا۔ جب لقمان پہنچے وہ مر چکا تھا اور فرشتے اس کو غسل دے رہے تھے، اور نماز جنازہ کے بعد ایک سبز صندوق میں رکھ کر آسمان کی طرف لے گئے، وغیرہ وغیرہ) حکایت بہلول در بغداد، حکایت آوردن بایزید پوستین امام جعفرصادق (امام جعفرؓ شیخ بایزید کے ہاتھ اپنا پوستین لقمان سرخسی کے لیے بھیجتے ہیں)، حکایت منصور (منصور نامہ والی حکایت ہے اور آئندہ اوراق میں مذکور ہے)، حکایت فتح سومنات (جب محمود نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ سومنات پر حملہ کیا، مشرک قلعہ بند ہو کر لڑے اور سنگ باری سے سلطانی فوجوں کا بے حد نقصان کیا۔ محاصرہ چھ ماہ تک قائم رہا لیکن غنچۂ مقصود نہ کھلا۔ ایک دن سلطان نے جناب الٰہی میں دعا کی، اسی حالت میں اس پر بے خودی طاری ہوگئی۔ عالمِ رؤیا میں دیکھتا ہے کہ ایک نورانی صورت بزرگ تشریف لائے، ایک خشت ان کے ہاتھ میں ہے، وہ خشت انھوں نے قلعے کی دیوار پر

کھینچ ماری جس سے دیوار ٹوٹ گئی ۔ اتنے میں شاہی لشکر میں ایک شور مچ گیا ۔ سلطان کی آنکھ اس شور سے کھل گئی ۔ ایازِ خاص نے آ کر دیوار ٹوٹنے کی مبارک باد دی اور کہنے لگا کہ غیب سے ایک خشت آ کر ایسی لگی کہ دیوار ٹوٹ گئی ۔ سلطان نے فرمایا وہ خشت میرے پاس لاؤ ۔ جب لائی گئی تو دیکھا کہ اس پر حضرت لقمان سرخسی کا نام کندہ تھا ۔ سلطان شکریے میں شیخ سے ملنے جاتا ہے ۔ لقمان محمود سے پیشین گوئی کرتے ہیں کہ مجھ سے ڈھائی سو برس بعد شیخ محمد پیدا ہوں گے) ، حکایت شیخ محمد مذکور و مرید او ابوبکر، حکایت برنائے ضعیف ، حکایت بوذر و صحابی ، منزل خوف و رجا ، حکایت یحیٰی علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام ، منزل انس و ہیبت ، حکایت بایزید و سائل ، منزل انس و جلیس ، حکایت درویش مسافر و ابوسعید ، منزل جمال با جلال ، حکایت لقمان و پیر بخارا ، در مناجات و ختمِ کتاب ۔

وصلت نامے کے ان بعض بیانات سے ، جن کو اوپر درج کر آیا ہوں ، واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ عطار کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی ، کیونکہ اس میں خوارق کی ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے جو عطار کی طبیعت کے بالکل ناموافق ہے ۔ اس کے اکثر بیانات افسانوی حیثیت رکھتے ہیں اور تذکرۃ الاولیاے عطار کے بیانات کے خلاف ہیں ۔ مثلاً شیخ لقمان سرخسی کو جو وجاہت یہاں دی گئی ہے ، وہ تمام روایات کے خلاف ہے ۔ شیخ عطار نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کے حالات میں ان کے متعلق اس قدر لکھا ہے کہ ”وہ عقلاے مجانین میں سے تھے ۔ ایک روز پوستین کے پیوند لگا رہے تھے کہ شیخ ابوسعید (جو ابھی طالب علم تھے) آ نکلے ۔ لقمان نے کچھ نجاست ان پر پھینک دی ۔ انھوں نے خوشی سے اس کو برداشت کرلیا ۔ اس پر لقمان نے کہا : ”لڑکے میں تجھے اس پوستین کے ساتھ سی دوں ؟“ ابو سعید نے جواب دیا : ”آپ کی خوشی ۔“ پھر کچھ ٹانکے بھر کر بولے : ”ابوسعید ! میں نے تجھے سی دیا ہے ۔“ اب لقمان اٹھے

اور ابوسعید کا ہاتھ پکڑ کر لے چلے ۔ راستے میں پیر ابوالفضل حسن ملے ۔ کہنے لگے : "اے ابوسعید ! تمھارا راستہ ادھر نہیں ہے ۔" اس پر لقمان ابوسعید کا ہاتھ آن کے ہاتھ میں دے کر چلتے بنے ۔"

(تذکرۃ الاولیاے عطار ، صفحہ ۳۲۴ ، جلد دوم)

امام جعفر صادقؓ کا بایزید کے ہاتھ شیخ لقمان کے لیے پوستین بھیجنا تاریخی لحاظ سے ناممکن ہے ۔ امام جعفر صادقؓ اور شیخ لقمان کے زمانوں میں جو فرق ہے ، ظاہر ہے ۔ نہ لقمان کی درازیِ عمر کے متعلق کوئی روایت موجود ہے ۔ رہا سومنات کا واقعہ ، اس کے متعلق شیخ عطار اپنے تذکرے میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ : "فتح سومنات شیخ ابوالحسن خرقانی کے خرقے کی برکت سے حاصل ہوئی تھی جو شیخ نے بر وقتِ ملاقات سلطان کو دیا تھا ۔" ان کے الفاظ یہ ہیں :

"پس سلطان برفت بغزا ، در آن وقت بسومنات شد ، بیم آن افتاد که شکسته خواهد شد ۔ ناگاه از اسپ فرود آمد و بگوشهٔ شد، و روی بر خاک نهاد و پیراهن را بر دست گرفت و گفت الٰهی بحق آبروی خداوند این خرقه که مارا برین کفار ظفر دهی که هرچه از غنیمت بگیرم بدرویشان بدهم ۔ ناگاه از جانب کفار غباری و ظلمتی پدید آمد ، تاهمه تیغ در یک دیگر نهادند و می کشتند و متفرق می شدند تاکه لشکر اسلام ظفر یافت ۔ و آن شب محمود بخواب دید که شیخ می گفت آبروی خرقهٔ ما بردی بردرگاه حق اگر دران ساعت در خواستی جملهٔ کفار ار اسلام روزی کردی ۔"

(تذکرۃ الاولیا ، صفحہ ۲۰۹ - ۲۱۰ ، جلد دوم مرتبهٔ نکلسن)

اس بیان کی تائید تاریخ فرشتہ و تاریخ بناکتی وغیرہ سے ہوتی ہے ۔ اب شیخ عطار وصلت نامہ میں (اگر وہ اس کے مصنف ہیں) اسی واقعے کو غیر ذمہ دارانہ طریقے پر لقمان سرخسی کی طرف منسوب نہیں کر سکتے ۔

پیر بخارا کی حکایت بھی اسی قسم کے خوارق سے لبریز ہے ۔ پیر یہ معلوم کرکے کہ شیخ لقمان سرخسی نماز نہیں پڑھا کرتے ،

ان کی ہدایت کے لیے بخارا سے روانہ ہوتے ہیں - مگر اس شان کے ساتھ کہ مع اپنے مریدوں کے شیروں پر سوار ہیں اور کوڑوں کے بجائے ہاتھوں میں سانپ ہیں - لقمان نے جب از روئے کشف معلوم کیا کہ پیر بخارا اس تجمل کے ساتھ اُن کی ہدایت کے لیے آتے ہیں تو یہ بھی ایک دیوار پر بیٹھ کر اُن کے استقبال کو روانہ ہوئے - میں کہتا ہوں کیا یہ خرافات عطار کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں ؟

یہ افسانے ایسے عہد کی یادگار ہیں جب دنیا میں انقلابِ مغول کے بعد اوہام پرستی اور خوش عقیدگی کی لہر دوڑ گئی ہے - پاک باز اور فرشتہ صفات صوفیوں کی جگہ اوباش اور عیار لے لیتے ہیں اور بزرگوں کی کرامات و خوارق کی تشہیر سے اپنی دوکان فروشی کرتے ہیں - لقمان سرخسی کی شعبدہ بازیوں کی نمائش سے جو ہم "وصلت نامے" میں پڑھتے ہیں ، عطار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا - یہ قصے صرف لقمان کی قبر کے مجاور کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں -

وصلت نامے کے مختلف اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصنف شیخ بہلول[1] ہیں ، چنانچہ :

نام او کردم بوصلت‌نامہ من
زانکہ وصلت دیدہ ام از خویشتن
ہر کہ می خواہد کہ او واصل شود
درد بہلولش ہمہ حاصل شود

(مثنوی حضرت شیخ بہلول ، صفحہ ۴ ، طبع نول کشور، ۱۲۹۷ھ)

گفتۂ بہلول از جانان بود
ہرچہ گوید آیت و برہان بود

۱ - پروفیسر سعید نفیسی لکھتے ہیں :

"قطعاً این مثنوی از عطار نیست و از شاعریست کہ نام و تخلص او بہلول بودہ ، چنانکہ خود میگوید......"

(صفحہ ۱۳۱ ، احوال و آثار عطار) (مرتب)

گفتهٔ بہلول را توحید دان
دائمش در ترک و در تجرید دان

(ایضاً ، صفحہ ۲۹)

هست بہلول از قدم تا سر گناه
رحمتت کرده است پیش رهنما (کذا)
محو گردان ای خدا بہلول را
وارهان از خویشتن این گول را

(ایضاً ، صفحہ ۳۰)

بلکہ شیخ بہلول نے ایک مقام پر شیخ عطار کی 'منطق الطیر' سے ایک شعر بھی نقل کر دیا ہے اور حوالہ بھی دے دیا ہے۔ کہتے ہیں :

آن چنانکہ گفت عطار امین
در کتاب منطق الطیر از یقین
سایہ در خورشید گم گردد مدام
خود همہ خورشید گردد والسلام

یہ حوالہ پروفیسر آذر کے کلیات (نوشتہ ۸۵۷ھ) میں موجود ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ شعرِ عطار میں "گردد" کی بجائے "بینی" ہے۔ کلیات عطار طبع نول کشور (صفحہ ۱۰۷۷ ، منطق الطیر) میں بھی ملتا ہے۔ لہذا میں اس شہادت ، نیز انداز کلام و بیان کی بنا پر (جو عطار سے بالکل مختلف ہے) وصلت نامہ کو شیخ بہلول کی تصنیف مانتا ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ وصلت‌نامہ کے بعض جدید نسخوں میں ایک دو شعر ایسے بھی ملتے ہیں ، جن میں عطار کا تخلص موجود ہے ؛ مثلاً پروفیسر آذر کے وصلت نامہ مشمولۂ کلیات (۸۵۷ھ) اور مثنوی شیخ بہلول (نول کشور) میں ایک شعر ہے :

درد آمد رهبر راه عیان
عاشق بی درد کی باشد روان (صفحہ ۲۶)

گیارھویں صدی کے ایک قلمی نسخے میں اس کو یوں بدل دیا ہے :

درد آمد بر در راہ عیان
عاشقست عطار پیشک در جہان

لیکن یہ ایک بےباکانہ تقلیب ہے اور ہمیں عطار کے تخلص کی موجودگی سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ عطار کے نام پر وصلت‌نامہ کے انتساب کی غلطی نویں صدی ہجری سے پیشتر واقع ہوئی ہے - اس وقت سے اب تک یہ مثنوی شیخ ہی کی مانی جاتی ہے ، اور یہ بات کاتبوں کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہی ہے - اس لیے تعجب نہیں اگر کسی دل چلے کاتب نے اس پر عطار کے نام کی مُہر لگانی چاہی ہو - خوش قسمتی سے پروفیسر آذر کا وصلت نامہ ایسی تقلیب سے پاک ہے - اگرچہ ''گفتۂ بہلول از جانان بود'' الخ ، اور اس کے ہم ردیف شعر میں غلطی سے بہلول کی بجائے عطار لکھا گیا ہے ، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سہو ہے -

رہے شیخ بہلول[1] ، مجھ کو افسوس ہے کہ میں سردست آن کا

---

۱ - میں یہ مضمون (تصنیفات عطار) ختم کر چکا تھا کہ پروفیسر آذر نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست ''مجموعۂ کرزن'' مرتبہ ڈبلیو آئیوناف ، جو اسی سال چھپی ہے ، نہایت مہربانی کر کے میرے پاس بھیج دی - فہرست مذکور میں (صفحہ ۱۶۴) ایک وصلت نامہ نمبر ۲۰۶ نوشتۂ ۱۰۶۶ ہجری کا مذکور آتا ہے ، اس کے خاتمے پر مصنف کا نام شیخ الشیوخ شیخ بہلول مرقوم ہے -
فہرست نگار کا بیان ہے کہ :
(۱) خاتمے کے علاوہ متن میں کئی موقعوں پر بہلول تخلص ملتا ہے -
(۲) ایسے اشعار کی جگہ جن میں عطار کا تخلص آتا ہے ، خالی چھوڑ دی گئی ہے -

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

سراغ نہیں لگا سکتا ۔ وہ کوئی غیر معروف شخص معلوم ہوتے ہیں ۔ ریو نے ایک دیوان اور وصلت نامہ ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے فہرست برٹش میوزیم میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال سنہ ۹۷۰ ہجری سے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

(۳) وصلت نامہ کے اڑتالیسویں شعر :

عاشقا این دم در آور سرّ جان
تا بیابی سرّ عشق لامکان

کو افتتاحیہ بنا دیا ہے ۔

(۴) دیباچے کے آخری شعر :

گفت وصلت‌نامہ را عطار پیر
ختم گردان یا الٰہیٰ دستگیر

کو بالکل اڑا دیا ہے

(۵) اور اس کے مقابل شعر کے مصرع :

درد پہلویش ہمہ حاصل شود

کو تقلیب کر کے مصرع :

درد بہلولش مگر حاصل شود

میں تبدیل کردیا گیا ہے ۔

۶) مختصر یہ ہے کہ شیخ بہلول نہایت چالاک سارق ہے لیکن اُس کی دلاوری ان اشعار میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے :

آن چنانم گفت عطار امین
در کتاب منطق از نور یقین
سایہ در خورشید گم گردد مدام
خود ہمہ خورشید گردد والسلام
قطرہ اندر بحر دریا اوفتد
در در خورشید والا اوفتد

[یہ مصرع اصل میں یوں ہے :

''ذرہ بر خورشید والا اوفتد''

(محمود شیرانی)]

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

پیشتر ہوا ہے۔ ریو کے ذہن میں غالباً شیخ بہلول دریائی ہیں، جو شاہ حسین مشہور بہ لال حسین کے پیر تھے۔ شیخ محمود المعروف بہ محمد پیر نے اپنی مثنوی "حقیقت الفقرا" میں، جو شاہ حسین کے حالات و کرامات میں ہے، لکھا ہے کہ[۸] شیخ بہلول شاعر بھی تھے اور مثنوی "آداب فقر" آن کی یادگار ہے:

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

گفتۂ عطار خود از مغز بود
لیک اندر صد لباس نغز بود
گفتۂ بہلول از جانان بود
ہر چہ گوید آیت برہان بود
گفتۂ بہلول را توحید دان
دائما در ترک و در تجرید دان

(۷) مثنوی هذا بالخصوص حلاج کے افسانے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں ان بیانات کے پڑھنے کے بعد بھی (جن کے ذکر کرنے میں تقدیم و تاخیر کا گنہگار ہوں) اپنے قدیمی نظریے پر قائم ہوں اور اب بھی مصر ہوں کہ مثنوی هذا شیخ عطار کے شایان شان نہیں، نہ وہ ان کے انداز میں مرقوم ہوئی ہے۔ اس کی اکثر حکایات افسانوی نوعیت کی ہیں، جن کا عطار کے قلم سے نکلنا دشوار ہے۔ نمبر ۴ میں جو شعر درج ہے، الحاقی ہے۔ نہ کلیات آذر میں موجود ہے، نہ نول کشور کی مثنوی میں۔ اس کی زبان کی خامی میرے بیان کے بغیر ظاہر ہے۔ نمبر ۵ میں مصرع کو "درد پہلویش ہمہ حاصل شود" پڑھنا شعر کو مہمل بنادیتا ہے۔ (۶) شیخ بہلول کے خلاف سرقے کا الزام بے حقیقت ہے، بلکہ میں کہوں گا کہ ایسی خام اور سقیم نظم کا عطار کی طرف منسوب ہونا سخت ظلم ہے۔ (۷) کتاب میں منصور کی صرف ایک حکایت ہے، زیادہ حکایات شیخ لقمان سے متعلق ہیں۔ پوری فہرست مضامین گزشتہ سطور میں آ چکی ہے۔

(حاشیۂ مصنف)

نظم آداب فقر زوست میان
همچو آیات مصحف از عثمان

لیکن ان کا انتقال سنہ ۹۸۳ ہجری میں ہوتا ہے :

چون شد او واصل خدای احد
بود هشتاد و سہ دگر نہ صد

اسی صدی میں ایک اور بہلول ملتے ہیں، جن کا پورا نام فریدالدین احمد جہاں گیر ہے اور بقول ''گلزار ابرار'' سنہ ۹۴۷ ہجری میں وفات پاتے ہیں - لیکن یہ تلاش بے سود ہے ، کیوں کہ ہمیں جس بہلول کی ضرورت ہے ، وہ کم از کم آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں -

۷ - **منصور نامہ (یا) حلاج نامہ :**

انڈیا آفس ، بوڈلین اور بانکی پور کے کتب خانوں میں موجود ہے اور فہرست نگار شیخ کی تسلیم کرتے ہیں - فاتحہ کا شعر ہے :

بود منصور ای عجب شوریده حال
در ره تحقیق او را صد کمال

اکثر نے 'منصور ای' کو الف کے اسقاط کے ساتھ لکھا ہے - یہ مثنوی علیحدہ چھپ بھی گئی ہے اور قلمی بھی ملتی ہے - اس میں منصور کے خلاف فتویٰ لگنے اور دار پر چڑھائے جانے کے حالات درج ہیں ، جو ہیلاج نامے[1] سے ملتے جلتے ہیں -

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی حلاج نامہ اور ہیلاج نامہ کو ایک ہی کتاب تسلیم کرتے ہیں ، چنانچہ :

''منصور نامہ ہمان هیلاج نامہ یا حلاج نامہ است زیرا کہ این کتاب در احوال حسین بن منصور حلاجست کہ در عرف زبان فارسی بمنصور حلاج معروفست -'' (صفحہ ۱۲۸ ، احوال و آثار عطار)

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

لکھا ہے کہ وہ پچاس سال تک اسرار پوش رہا ۔ پھر اس نے "انا الحق" کا نعرہ لگا کر اپنا راز فاش کر دیا ۔ اہل تقلید نے فتویٰ مانگا ، تین سو ستر عالموں نے کفر کا فتویٰ لگا دیا ۔ بغداد میں ایک سنسنی پھیل گئی ۔ جب خلیفہ کو اس امر کی اطلاع ہوئی ، اگرچہ منصور کا دوست تھا ، کیونکہ اس کی کئی تصنیفات پڑھ چکا تھا لیکن عوام اور جہلا کے خوف سے اُس نے منصور کے قید کیے جانے کا حکم دے دیا ۔ جب منصور قید خانے میں لایا گیا ، جیل میں اُس وقت چار سو قیدی تھے۔ منصور نے آتے ہی اُن سے کہا کہ تم اپنے اپنے گھر چلے جاؤ ۔ قیدی بولے : "ہم لوگ بھاری بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ، کیسے جاسکتے ہیں؟" منصور نے اُن کے قریب آ کر اپنا ہاتھ ہلایا ، قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں ۔ اس وقت قیدیوں نے عرض کی : "قید خانے کے دروازے بند ہیں ، ہم باہر نہیں نکل سکتے ۔" منصور نے ایک اشارہ کیا اور دیوار میں چار سو رخنے نمودار ہو گئے۔ قیدی ان منفذوں سے باہر نکل گئے ۔ قید خانے کے مہتمم نے

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

لیکن ہیلاج‌نامہ کے بیان میں انھوں نے اس کا جو افتتاحیہ دیا ہے وہ حافظ صاحب کے دیے ہوئے شعر :

"بود منصور ای عجب شوریدہ حال" الخ

سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ ان کی بحروں میں بھی اختلاف ہے یعنی :

بنام کردگار فرد بیچون   کہ مارا از عدم آورد بیرون

اس سے گمان ہوتا ہے کہ پروفیسر نفیسی کا خیال درست نہیں اور منصور نامہ یا حلاج نامہ اور ہیلاج نامہ دو مختلف مثنویاں ہیں ، اگرچہ دونوں میں حسین بن منصور حلاج کے بے سروپا واقعات نظم کیے گئے ہیں ۔ بقول حافظ صاحب حلاج نامہ (منصور نامہ) شیخ بہلول کی متذکرہ‌بالا مثنوی وصلت‌نامہ ہی کا ایک حصہ ہے جب کہ ہیلاج‌نامہ بذات خود ایک علیحدہ کتاب ہے ۔ (مرتب)

جب یہ کیفیت دیکھی ، آ کر اس کے قدموں میں گر گیا ۔ منصور نے اس کو چلے جانے کا حکم دیا ۔ داروغۂ جیل کے جانے کے بعد خود منصور مناجات الٰہی میں مشغول ہوگیا ۔

شبلی ، جنید کے پاس گئے اور منصور کے قید ہونے کی اطلاع دی ۔ جنید اپنے شاگردوں کو لے کر قید خانے پہنچے ۔ وہاں جا کر دیکھا کہ مخلوق کثرت سے جمع ہو رہی ہے ۔ اجازت لے کر اندر گئے اور منصور کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے یہ کیا دیوانگی اختیار کی ہے ۔ جو بات تم کہتے ہو وہ ہمارے پیشوا رسول اللہ ؐ نے بھی نہیں کہی ۔ ''انا الحق'' کہنا کفر محض ہے ۔ منصور نے جواب دیا کہ تم ان اسرار سے بے خبر ہو ، رسول اللہ ؐ نے ''من رأنی'' فرمایا ، ''لی مع اللہ'' کہا ، خود خدائے پاک نے ''نحن اقرب'' فرمایا ۔ تم مبتلائے تقلید ہو ، واصلین کے مرتبے کو کیا جانو ۔ اس پر ملاقات ختم ہوئی اور جنید باہر آ گئے ۔ لوگوں نے ان سے فتویٰ طلب کیا ۔ انھوں نے کہا میں ظاہر پر حکم دیتا ہوں ، باطن سے واقف نہیں ۔ بعد ازاں شبلی منصور کے پاس گئے ، کہنے لگے : ''اے شیخ ! تو نے اپنا راز کیوں فاش کر دیا ؟ اگر سر کی خیر چاہتے ہو تو سرّ کا ترک کہو۔'' جواب میں منصور نے کہا : ''میں منصور نہیں ہوں بلکہ :

من خدایم من خدایم من خدا
فارغم از کبر و کین و از ہوا

اول و آخر ، ظاہر و باطن میں ہوں ۔ میں سرّ توحید کو آشکار کرنے آیا ہوں تاکہ بقائے حق میں باقی رہوں ۔ مصطفیٰ ؐ میرے پیشوا ہیں اور راہ یقین کے رہنما ہیں ۔ لیکن تم ان غوغائیوں سے میرے لیے ایک روز کی مہلت مانگ لو ، کیونکہ میرا ایک مخلص دوست ، جس کا نام شیخ کبیر (عبداللہ خفیف) ہے ، کل تک یہاں پہنچنے والا ہے اور مجھ کو اس سے ایک ضروری راز کہنا ہے ، اس کے بعد میں دار کے لیے تیار ہوں ۔ دوسرے دن شیخ کبیر آ گئے اور سیدھے منصور کے پاس گئے ۔ ملامت کے لہجے میں کہنے لگے

"اے توحید پرست ! تونے سرِّ حق کو کیوں فاش کیا ؟ تو پچاس سال صاحبِ اسرار رہا ، اب کیا ہوگیا کہ اس قدر بے خود ہوگیا"؟ منصور نے کہا : "تم کو معلوم ہے کہ بحرِ معنی بے نہایت ہے اور انا الحق تو اس کی ایک ادنٰی سی موج ہے - تم سے لوگ اگر فتویٰ مانگیں تو دے دینا" - شیخ کبیر نے جواب دیا : "میں فتویٰ نہیں دے سکتا" :

شیخ گفتا آن چہ گفتی نی رواست
من ہمی‌دانم کہ ذات تو خداست
چون دہم فتویٰ ز جہل و از گمان
من عیان دیدم خدا را این زمان

منصور نے کہا : "خیر میرے کہنے سے دے دینا -" شیخ کبیر اس کے بعد چلے آئے ، عوام نے فتویٰ طلب کیا ، شیخ نے کہا : "منصور نے کہلا بھیجا ہے کہ میں واجب القتل ہوں ، مگر میری رائے ہے کہ وہ اہلِ ظاہر کے نزدیک واجب القتل ہے مگر باطن کے حال سے میں واقف نہیں -" اس کے بعد سب لوگ جمع ہوگئے - منصور آیا اور سولی پر چڑھ گیا - "انا الحق" کے نعرے لگانے لگا - حالت یہ ہوئی کہ سنگ و خشت ، دار و رسن تک سے "انا الحق" کی آوازیں آنے لگیں - ایک ظالم نے آکر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا - منصور نے اپنا لہو بھرا ہاتھ چہرے پر مل لیا - شبلی نے دریافت کیا کہ تم نے ہاتھ منہ پر کیوں ملا ؟ اس نے جواب دیا : "میں نماز عشق ادا کرنا چاہتا ہوں اور یہ اس کا وضو ہے -" شبلی نے پھر سوال کیا کہ تصوف کا کوئی رمز بیان کرو - اس نے کہا : "اپنے آپ کو سب سے کمتر دیکھنا -" پھر پوچھا کہ طریق عشق کا پتا دو - منصور کا جواب تھا :

گفت عشق این جا بود گردن زدن
بعد ازانش آتش اندر سوختن

ان الفاظ کے ختم ہونے پر اس کا سر کاٹ دیا گیا - جب سر

کٹ کر گرا ، اس سے "اناالحق" کی آواز برابر آرہی تھی ۔ تب منصور کے جسم کو جلا دیا اور ہوا اس کی خاک اڑا کر پانی میں لے گئی ۔

منصور نامہ میں یہ قصہ ہے ، جو مختصراً یہاں بیان ہوا ۔ اس مثنوی کے ہیلاج نامہ سے جہاں یہی قصہ ایک دراز طریقے پر بیان ہوا ہے ، قدیمی تعلقات معلوم ہوتے ہیں ۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ منصور نامہ در حقیقت کوئی مثنوی نہیں ، بلکہ وصلت نامے کی ایک حکایت ہے ، جو مطبوعہ وصلت نامے میں صفحہ ۱۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰ پر ختم ہو جاتی ہے ۔ نول کشور نے ۱۲۹۷ھ میں وصلت نامے کو بار دوم چھاپا ہے لیکن اس کا نام مثنوی حضرت شیخ بہلول رکھا ہے ۔ پروفیسر آذر کے وصلت نامے مشمولہ کلیات میں بھی یہ حکایت موجود ہے ۔

منصور نامہ کے متعلق ایک حیرت خیز امر یہ ہے کہ وہ اشترنامہ شامل کلیات پروفیسر آذر میں بھی موجود ہے ، جہاں خاتمے پر ''در رفع شدن هستی منصور و پیدا شدن حق و ختم کتاب'' کی سرخی کے تحت میں پوری حکایت درج ہے ۔ آخر سے تقریباً ایک صفحہ جو اصل قصے سے علاقہ نہیں رکھتا ، یا تو کاتب اتفاقیہ ترک کر گیا ہے ، یا مختصر کرنے کی غرض سے نکال دیا گیا ہے ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا منصور نامہ اصل میں وصلت نامہ کا ایک حصہ ہے یا اشترنامہ کا ؟ اس کے متعلق میرا عقیدہ ہے کہ وہ فی‌الواقع وصلت نامہ کا ایک جزو ہے اور اشتر نامہ میں اس کا ایراد غیر موزوں واقع ہوا ہے ، کیونکہ عین منصور نامہ کے قبل قریب قریب منصور کی یہی حکایت ایک وسیع پیمانے پر شروع کی جاتی ہے جس میں منصور قیدیوں کو رہا کر کے اور داروغۂ قید خانہ کو روانہ کر کے قید خانے میں تنہا مناجات میں مصروف ہو جاتا ہے ۔ مناجات کے اختتام کے بعد باقی حکایت کو ختم کیے بغیر منصور نامہ شروع ہو جاتا ہے اور منصور نامہ کے ختم پر اشتر نامہ بھی ختم ہو جاتا ہے ۔ بہر حال منصور نامہ کو علیحدہ تصنیف ماننے

میں ہم حق بجانب نہیں ، اگرچہ وصلت نامے کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے شیخ بہلول کی تصنیف ہے ۔

۸ - بے سر نامہ :

امین احمد رازی کی فہرست میں شامل ہے ۔ تمام فہرست‌نگار عطار کا مانتے ہیں اور چھپ بھی چکا ہے ۔ اس کا پہلا شعر ہے :

قادرا ! پروردگارا ! جاودان ! من بغیر تو نہ بینم در جہان

یہ ایک ترجیع بند ہے اور ہر بند کے ترجیعی ابیات یہ ہیں :

من خدایم من خدایم من خدا
فارغم از کبر و کینہ وز ہوا
سرّ بی سر نامہ را پیدا کنم
عاشقان را در جہان شیدا کنم

بے سرنامہ میرے خیال میں کسی علیحدہ وجود رکھنے کا مستحق نہیں ، اس کی تعمیر کا اکثر مواد منصور نامہ سے لیا گیا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ منصور نامہ کا موضوع منصور ہے لیکن بے سرنامہ میں یہ منصب شیخ عطار کو دیا جاتا ہے ، جو کبھی صیغۂ متکلم اور کبھی صیغۂ غائب میں دکھائے گئے ہیں ۔ بے سرنامہ میں اصل قصے کی ترتیبِ واقعات کی کوئی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ نفسِ قصہ سے سروکار رکھا گیا ۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ منصور کا درجہ عطار کو دیا جائے اور حدیثِ دار و رسن کی تجدید کی جائے ۔ اس کتاب کو شیخ عطار کی طرف منسوب کرنا انسانی فہم و شعور پر بیداد توڑنا ہے ۔ اس کے اثبات کے لیے ہم کو کسی کد و کاوش اور تحقیق و تلاش کی ضرورت نہیں ۔ اس قدر جاننا کافی ہے کہ بے سرنامہ ، منصور نامہ کی ایک مسخ شدہ شکل ہے ۔ فارسی ادبیات میں ایسے دلیرانہ سرقے کی مثال مشکل سے ملے گی ۔ میں بخوف طوالت بے سرنامے کے سارے گورکھ دھندے کو سلجھانا نہیں چاہتا ، صرف بعض امثال پر قناعت کرتا ہوں :

بے سر نامه

(۱) بود عطاری عجب شوریده حال
در ره تحقیق او را صد کمال
(۲) حال او حال عجب بود ای پسر
نی چو حال این کسان بی خبر
(۳) در رموز سرّ حق بی پرده بود
نی که همچون ما و تو در پرده بود
(۴) او یقین خویش حاصل کرده بود
در یقین خویش واصل گشته بود
(۵) در علوم دین وقوفی داشت او
هیچ علمی را فرو نگذاشت او
(۶) عالمان از علم او درمانده اند
عارفان از عرف او وامانده اند
(۷) عاشقان از عشق او حیران شدند
هردم از نوع دگر بریان شدند
(۸) بعد پنجه سال او اسرار یافت
از فرید الدین لقب عطار یافت

(بند ششم ، بے سرنامۂ قلمی)

منصور نامه

(از ابتدائے حکایات)

(۱) بود منصوری عجب شوریده حال
در ره تحقیق او را صد کمال
(۲) حال او حال عجب بود ای پسر
نی چو حال این خسیسان بی‌خبر
(۳) او رموز سرّ حق بی‌پرده بود
نی که چون ما راه را گم کرده بود

(۵) او یقین خویش حاصل کرده بود
دز یقین خویش واصل گشته بود
(۸) در علوم دین وقوف داشت او
هیچ علمی را فرو نگذاشت او
(۹) عالمان از علم او در مانده اند
عارفان از عرف او وامانده اند
(۱۰) عاشقان از عشق او حیران شدند
هردم از نوع دگر بریان شدند
(۱۳) بود پنجه سال او اسرار پوش
ناگهان از وی برآمد صد خروش

(مثنوی[1] حضرت شیخ بہلول، صفحہ ۱۳، طبع نول کشور، سنہ ۱۲۹۷ھ)

بے سر نامہ

(۷) مردمان گفتند این چه کرده ای
روی خود در خون چرا آلوده ای
(۸) گفتم این دم می گذارم من نماز
پس بخون سازم وضوی پاکباز
(۹) این نماز عشق را آنجا وضو
راست ناید جز بخون خوبرو
(۱۰) بعد ازان گفتند مر ای مرد کار
از تصوف این زمان رمزی بیار
(۱۱) گفت کمتر زین که می‌بینی به بین
تا ترا در راه حق باشد یقین

۱ - میرے پاس منصورنامہ علیحدہ بھی ہے مگر قلمی ہے ، اس لیے اس کے اشعار مثنوی شیخ بہلول مطبوعہ سے نقل کر رہا ہوں ۔ (حاشیہ مصنف)

(۱۲) بار دیگر گفتم ای صاحب نظر
از طریق عشق ده ما را خبر
(۱۳) گفت این جا بس بود گردن زدن
بعد ازان بر سوخته آتش زدن
(۱۴) این که گفتم این چنین شد حال من
منتشر شد در جهان احوال من

(بند دهم)

منصور نامه

(۱۴) شبلیش گفت این زمان چه دیده ای
دست در ساعد چرا مالیده ای
(۱۵) گفت این دم می گذارم من نماز
پس وضو سازم بخون ای پاک باز
(۱۶) کین نماز عشق را این جا وضو
راست ناید جز بخون ای خوبرو
(۱۷) بعد ازان شبلی بگفت ای مرد کار
از تصوف این زمان رمزی بیار
(۱۸) گفت کمتر زین که می‌بینی به بین
تا ترا در راهِ حق باشد یقین
(۱۹) بار دیگر گفت کای صاحب نظر
از طریق عشق ده ما را خبر
(۲۰) گفت عشق این جا بود گردن زدن
بعد ازانش آتش اندر سوختن
(۲۲) این بگفت و این چنین شد حال او
منتشر شد در جهان احوال او

(صفحه ۱۸ ، بیت ۴ ۱-۲ ب)

بی سر نامه

(٢) پیشوای ماست همچون مصطفی‌ ست
لاجرم تو آنچه گویی کی رواست
(٣) بعد ازان عطار گفت ای کور و کر
وز رموز سرِ عشق ای بی‌خبر
(٤) تو به‌بندی صورتی در ماندهٔ
کی تو حرف حق احمد خواندهٔ
(٥) "لی مع الله" گفت احمد در بیان
تو کجا دانی که هستی بی‌نشان
(٦) راز من گفتست احمد از صفا (کذا
تو کجا دانی که هستی بی وفا
(٧) تو بصورت همچو کافر مانده‌ای
واصل حق را تو کافر خوانده‌ای
(٨) خرقهٔ ناموس را پوشیده ای
وانگهی سالوس را کوشیده ای
(٩) بت‌پرستی می کنی در زیر دلق
می‌نمایی خویش را صوفی بخلق
(١٠) تو سلوک راه را گم کرده ای
لاجرم در صد هزاران پرده ای
(١١) دامگاهی کرده ای این خرقه را
می فریبی هر زمان این فرقه را
(١٢) در خودیِ خود گرفتار آمدی
لاجرم در عین پندار آمدی
(١٣) راه تجرید و فنا راه تو نیست
تو سخن کم گوی کان راه تو نیست
(١٤) رو که در تجرید ماندی مبتلا
سرّ توحید از کجا تو از کجا

(۱۵) رو که راه بی نشان راه تو نیست
عقل تو از راه معنی در شکیست
(بند هشتم ، بےسرنامہ قمی

منصور نامه

(۵) پیشوای ما همه چون مصطفی است
لاجرم آنچه تو گفتی نیست راست
(۸) بعد ازان منصور گفتش شو بدر
از رموز سرّ معنی بی‌خبر
(۹) تو برهنه صورت وامانده‌ٔ
کی تو هرگز حرف احمد خوانده‌ٔ
(۱۰) ”من رأنی“ گفت احمد درمیان
تو کجا دانی که هستی بی شان
(۱۱) ”لی مع الله“ گفت احمد از صفا
تو کجا دانی که هستی بی‌وفا
(۱۳) تو ز صورت همچون کافر مانده ای
واصل حق را تو کافر خوانده ای
(۱۴) خرقهٔ ناموس را پوشیده ای
وانگهی سالوس را کوشیده ای
(۱۵) بت‌پرستی می کنی در زیر دلق
می نمایی خویش را صوفی بخلق
(۱۶) تو سلوک راه خود واکرده ای
لاجرم در صد هزاران پرده ای
(۱۷) دامگاهی کرده ای این خرقه را
می فریبی هر زمان این فرقه را

(۱۸) در خودی خود بد گرفتار آمدی
لاجرم در عین پندار آمدی

(۱۹) راه تجرید و فنا راه تو نیست
تو سخن کم گوی کان راه تو نیست

(۲۰) رو که در تقلید ماندی مبتلا
سرّ توحید از کجا و تو کجا

(۲۱) رو که راه بی نشان راه تو نیست
عقل تو از راه معنی در شکیست

(مثنوی شیخ بهلول ، صفحه ۱۶ ، بیت ۵-۲۱)

بے سرنامہ کے کل دس بند ہیں ۔ نول کشور کے بے سر نامہ (مشمولہ کلیات) کے بندوں میں بے ترتیبی ہے اور متن بھی بے حد غلط ہے ، اس لیے میں نے بے سر نامہ قلمی مملوکہ پروفیسر آذر سے کام لیا ہے :-

۹ - خیاط نامہ :

اس کی ابتدا ہے :

بنام آن کہ ہستی زو نشان یافت
نفوس ناطقہ زو نور جان یافت

اور کتاب کا نام اس بیت میں واقع ہوتا ہے :

چو بر کاغذ نہادم نوک خامہ
نوشتم نام این "خیاط نامہ"

اکثر فہرست نگار مثلاً اسپرنگر ، ایتھے ، عبدالمقتدر خاں اور آئیوزاف ، شیخ عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن حاجی خلیفہ (کشف الظنون ، جلد اول ، صفحہ ۷۴۳ ، طبع مصر ، سنہ ۱۳۱۱ھ) اس کو خیاط کاشانی کی تصنیف بیان کرتا ہے ۔ فہرست نگر خیاط کو بہ تخفیف تشدید "یا" پڑھتے ہیں ، لیکن بیت مذکورۂ بالا میں "یا" پر

تشدید موجود ہے ، مجھ کو اس مثنوی کے مطالعے کا موقع نہیں ملا ۔

۱۰ - کنز الاسرار :

اسٹیورٹ نے اس کا نام "کنت کنزاً مخفی" لکھا ہے ۔ ڈاکٹر ایتھے نے "کنز البحر" ایک اور نام بتایا ہے ۔ اس کے خاتمے میں یہ شعر آتا ہے :

رساند نفع را بر خاص و عام این
کہ در شش صد نود نہ شد تمام این[1]

اگرچہ نسخوں میں "شش صد نود نہ" ملتا ہے لیکن ڈاکٹر ایتھے نے اس کو سہو کاتب پر محمول کر کے اس کا نسخہ "پنج صد نود نہ" یا "شش صد نوازدہ" تجویز کیا ہے[2] ، جو قابل قبول نہیں ۔ میرزا محمد کہتے ہیں ، "و ایتہ در فہرست کتب فارسیہ دیوان ہند . . . . بیت کنزالاسرار را حمل بر غلط بودن نسخہ کردہ است و این سہو است . . . . واین . . . . کتاب از عطار نیست . . . . و کنز الاسرار معلوم نیست از کیست[3] ۔" آئیوناف اس معاملے میں میرزا محمد سے بالکل متفق ہے ۔ کنز الاسرار کا میرے پاس بھی ایک نسخہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کا تخلص تربتی ہے ۔ اس نسخے میں تاریخ تصنیف سنہ ۶۹۹ ہجری کے بجائے ۷۹۹ ہجری دی گئی

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی اپنی کتب "احوال و آثار عطار" میں یہ شعر درج کر کے فرماتے ہیں :

"و این ہمان بیت است کہ در پایان ترجمۂ الاحادیث یا مواعظ ہم آمدہ و پیداست کہ گویندۂ آن ہمان گویندۂ ترجمۂ الاحادیث یا مواعظست کہ ہفتاد و دو سال پس از مرگ عطار آنرا سرودہ و بہیچ وجہ بفریدالدین عطار مربوط نیست" (صفحہ ۱۲۰) ۔ (مرتب)

۲ - فہرست کتب فارسیۂ انڈیا آفس نمبر ۱۰۳۱ (۸) ۔ (حاشیۂ مصنف)

۳ - مقدمہ انتقادی تذکرۃ الاولیاے عطار ، صفحہ یو ۔ (حاشیۂ مصنف)

ہے ۔ چنانچہ خاتمے کے چار بیت یہاں نقل کر دیے جاتے ہیں :

گناہ من فزون از کف دریاست
فزون ترهم ز اوراق شجرهاست
گناہ تربتی از حد برون است
کہ من از چہ‌سنی گویم فزون‌ست
دهد این نسخہ را با خلق رونق
بیامرزد بنقد آن بندۂ حق
رساند نفع هم بر خاص و عام این
کہ در هفصد لود نہ شد تمام این

بہلول کی حکایت کے آخر میں بھی شاعر اپنا تخلص لاتا ہے :

نصیحت های مسکین تربتی را
بگوش خود بگیرد مرد دانا
بنادان هرچہ می‌گویی دریغ است
ازان کہ آفتابش زیر میغ است

اس نسخے کی ابتدا میں نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے :

''الحمدللہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین ولاعدوان الا علی الظالمین ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : من حفظ علی آمتی اربعین حدیثاً مما یحتاجون الیہ کتب اللہ فقیہاً عالماً ۔ و بر امید این وعده هرکہ یاد دهد است من (کذا) چہل حدیث را کہ ازان چیز کہ محتاجند آدمیان بآن چیزها ، نویسد خدای تعالی ویرا فقیہ عالم ۔''

پہلے صفحے میں اس طرح سے کئی حدیثیں نقل ہیں ، اور ان کا فارسی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دے دیا ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے ساتھ والا ورق موجود نہیں ہے، جس میں دیباچے کا بقیہ حصہ ہونا چاہیے ۔ تاہم اس قدر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ مصنف نے اس مثنوی

میں چہل حدیث بیان کی ہیں اور احادیث کے مناسب حال حکایات بھی درج کر دی ہیں - بہرحال ''کنزالاسرار'' شیخ عطار سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی -

۱۱ : وصیت نامہ :

دولت شاہ نے شیخ کی تصنیفات کی فہرست میں اس کو شامل کیا ہے[1] - اسٹیورٹ نے اپنی فہرست میں اس کا نام ''اوسط نامہ'' بتایا ہے[2] - پروفیسر میترا[3] نے ''مثنوی مصباح'' لکھا ہے اور فہرست نگار ، عطار کی تصنیف مانتے ہیں - اس مثنوی کا پہلا شعر ہے :

ای بنامت کارها را افتتاح
نیست بی نام تو در امری فلاح[4]

لیکن اس مثنوی کے ایک شعر سے جو پروفیسر میترا نے فہرست کتب فارسیہ ریاست کپورتھلا (صفحہ ۱۰۴ ، نمبر ۱۸۴) ۱۹۲۵ع میں نقل کیا ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۸۲۵ ہجری کی تصنیف ہے ، وہ یہ ہے :

چون گذشت از هجرت خیرالانام
هشت صد و پنجاه و دو این شد تمام

اس لیے ہمیں ماننا چاہیے کہ اس کتاب سے عطار کو کوئی تعلق نہیں -

---

۱ - تذکرۂ دولت شاہ ، صفحہ ۱۹۰ ، مرتبہ پروفیسر برون - (حاشیۂ مصنف)
۲ - منقول از فہرست کتب فارسیہ انڈیا آفس - (حاشیۂ مصنف)
۳ - دیال سنگھ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر اور پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر ہیں - (حاشیۂ مصنف)
۴ - پروفیسر نفیسی 'وصیت نامہ' کو 'وصلت نامہ' یا 'مصیبت نامہ' کا چربہ سمجھتے ہیں ، چنانچہ :

''وصیت نامہ کہ پیداست تحریفی از همان وصلت نامہ یا مصیبت نامہ است و کتاب جداگانہ ای نیست -''

(صفحہ ۱۳۲ ، احوال و آثار عطار) - (مرتب)

۱۲ : مظہر العجائب :

دولت شاہ اس تصنیف سے واقف نہیں ۔ امین احمد رازی ، قاضی نور اللہ شوستری اور حاجی خلیفہ اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ معلومہ نسخوں میں سب سے پرانے برٹش میوزیم (نمبر ۳۲، صفحہ ۶۵ (۲) فہرست کتب فارسیہ) اور بانکی پور (ایڈ نمبر ۶۲۲۱ ، صفحہ ۵۷۹ ، جلد دوم ، فہرست کتب فارسیہ) کے کتب‌خانوں میں ہیں ۔ ان پر کوئی تاریخ نہیں لیکن فہرست نگاروں کی رائے میں گیارھویں صدی کے نوشتہ ہیں ۔ اس سے گمان گزرتا ہے کہ ''مظہرالعجائب'' گزشتہ تصنیفات کے مقابلے میں سب سے کم عمر ہے ۔ تمام فہرست نگار حسب معمول عطار کی تصنیف مانتے ہیں ۔

جب میں اس کتاب کے تبصرے کے لیے آمادہ ہوا تو لاہور میں ایک نسخہ تک موجود نہ تھا ۔ مجبوراً میں نے پروفیسر سراج الدین آذر کی خدمت میں دست‌گیری کی التجا کی ۔ انھوں نے کوشش کرکے کچھ ہی عرصے میں تین نسخے مہیا کر دیے ۔ میں ان کی اس مہربانی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ ان میں سے ایک نسخہ یار علی نے کلکتے[1] میں ۱۵ جمادی الاول سنہ ۳۳ عالم گیری موافق ۱۱۲۰ھ میں نقل کیا تھا ۔ اس نسخے کے ۶۶۲ صفحات اور فی صفحہ تیرہ ،

۱ ۔ سنہ ۱۷۰۰ء مطابق سنہ ۱۱۱۲ھ کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیہات سوتانتی ، کالی کتا اور گوبند پور شہزادۂ عظیم الشان : صوبہ‌دار بنگال سے خرید کر کلکتے کی بنیاد ڈالی ۔ تعجب ہے کہ ایسے ابتدائی زمانے میں سلطان کاتب کلکتے پہنچ جاتے ہیں ۔ مگر تاریخ جلوس عالم‌گیری اور تاریخ ہجری آپس میں مطابق نہیں ہیں ! سنہ ۳۳ جلوس عالم‌گیری سنہ ۱۶۹۰ء مطابق ۱۱۰۲ھ کے مطابق ہے ، جب کلکتے کا دنیا میں وجود ہی نہیں تھا ۔ سنہ ۱۱۲۰ ہجری میں اورنگ زیب زندہ نہیں تھا ، وہ سنہ ۱۱۱۸ہجری میں وفات پا چکا ہے ۔ اگر کاغذ، خط اور سیاہی کی شہادت کا لحاظ کیا جائے تو نسخۂ ھذا کی تاریخ تیرھویں قرن ہجری کی ابتدا میں ماننی پڑے گی ۔ (حاشیۂ مصنف)

چوده ، پندره یا سوله سطریں ہیں ۔ اس لیے اشعار کی تعداد تخمیناً نو یا دس ہزار کے درمیان ہوگی ۔ ابتدا کا شعر ہے :

آفرین جان آفرین جان جان
زان که هست او آشکارا هم نهان

چونکہ کتاب چھپی نہیں[1] ہے اس لیے اس کے بعض عنوان یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

''در بیان کتاب خویش ، روایت نجم الدین کبریٰ ، در آمدن سید کائنات بحجرهٔ علی علیه السلام ، گفتن نی نجم الدین کبریٰ را حال خود ، سپردن پدر شیخ را بمعلم ، دیدن شیخ پیر سالک و رسیدن بسیّد ناصر ، آوردن جبریل سیبی بنزد سید کائنات ، در آتش رفتن بوذر غفاری با امیرالمؤمنین ، در واقعهٔ پیر سالک که پیش شیخ آمد ، قصهٔ جنگ خندق ، شکستن ایاز گوهر را بفرمان سلطان محمود ، قصهٔ سید با شیر و غلام ، در بیان اهل مناصب ، قصهٔ شفیق بلخی و امام موسیٰ کاظم و هارون‌الرشید، قصهٔ پادشاه احمد ، قصهٔ خواجه ابرار و امام ابوبکر ، قصهٔ حکیم و پیر عراقی ، پند دادن شیخ حسین فرزند را ، قصهٔ پادشاه عادل و امیران ظالم ، قصهٔ عیاران خراسان و بغداد ، سوال کردن پیر سالک از عطار ، سوال از شیخ شبلی ، در واقعهٔ خواجه نیشاپوری و رفتن شیخ'' ۔

اس کتاب[2] کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ذو بحرین ہے ، یعنی

---

۱ ۔ مظهرالعجائب ، سنہ ۱۳۲۳ ؛ شمسی میں فتح‌اللہ خان شیبانی کے دیباچے کے ساتھ طہران سے شائع ہوگئی ہے ۔ (مرتب)

۲ ۔ علامہ محمد بن عبدالوهاب قزوینی نے مقدمهٔ ''تذکرهٔ عطار'' میں اور پروفیسر برون نے جلد دوم ''تاریخ ادبیات ایران'' میں عطار کے اکثر حالات اسی کتاب کے حوالے سے نقل کر کے اس کو ایک ناواجب امتیاز دے دیا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

صفحہ ۴۴۳ تک بحر رمل مسدس میں اشعار ملتے ہیں اور شعر :

گنہگارم ز فعل بد گنہگار
خداوندا توئی دانای اسرار

کے بعد سے بحر ہزج میں طبع آزمائی کی جاتی ہے ، اور بیت :

باز نقلی هم ز شبلی گویمت
سرّی از اسرار غیبی گویمت (صفحہ ۵۸۵)

سے دوبارہ رمل کی طرف مراجعت کی جاتی ہے اور خاتمے[1] تک یہی وزن رہتا ہے ۔

چندکلمے "جوہرالذات" اور "مظہرالعجائب" کے تعلقات کی نسبت کہنے مناسب معلوم ہوتے ہیں ۔ اگرچہ دونوں کتابوں میں زبان اور مضمون کے لحاظ سے کوئی اتحاد نہیں، تاہم صاحبِ "مظہرالعجائب" مصر ہے کہ "جوہرالذات" میری تصنیف ہے ۔ قدم قدم پر اس کا اعلان کرتا ہے اور سینکڑوں موقعوں پر دونوں کتابوں کا نام ساتھ ساتھ لاتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اگرچہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں لیکن "جوہر" اور "مظہر" ان میں نہایت قیمتی اور چوٹی کی کتابیں ہیں :

جوهر ذاتم جهان را جان بود
زانکه او از معنیِ قرآن بود
مظهر من را لسان الغیب دان
اوست اسرار دو عالم را زبان (صفحہ ۶۲۰)
زمظهر گردی تو انسان کامل
زجوهر ذات من گردی تو واصل (صفحہ ۵۳۲)
مظهرم می‌خوان و جوهر گوشدار
تا بیابی دُر معنی بی‌شمار (صفحہ ۱۲۴)

۱ ۔ ایک مقام پر چند صفحات کے لیے پھر بحر بدل دی گئی ہے ۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی ہوں تو کوئی تعجب نہیں ۔ (حاشیہٴ مصنف)

ان بیانات سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف سے علاقہ رکھتی ہیں ، لیکن ان کی زبان ، انداز کلام اور تاریخی معلومات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں کے مصنف دو مختلف شخص ہیں ، مثلاً الفاظ ''حقیقت'' اور ''جاگاہ'' وغیرہ جو صاحبِ جوہر کے لیے عصائے پیری کا حکم رکھتے ہیں ، مظہر میں مطلق غیر حاضر ہیں ۔ بعض باتیں ان میں مشترک ہیں ؛ مثلاً مظہر میں ''ابا'' کا استعمال خال خال موقعوں پر نظر آتا ہے مگر جوہر کے مقابلے میں بہت کم ہے ۔ ادائے مضمون میں دونوں کتابوں میں بے ترتیبی اور طوالت کا ڈھنگ موجود ہے ۔ دماغی قابلیت اور شاعری کے لحاظ سے دونوں مساوی ہیں ، صرف انیس بیس کا فرق ہے ۔ ایک ہی لفظ یا فقرے کی تکرار سے اشعار کی ابتدا ہونا جو ''جوہرالذات'' کا خوف ناک پہلو ہے ''مظہر'' میں اس سے بھی وسیع پیمانے پر نظر آتا ہے ۔ ناصر خسرو کو دونوں کتابوں میں ایک قابلِ حرمت حیثیت حاصل ہے ۔ ''جوہر'' میں حضرت علی رض کا ذکر نہایت احترام اور توقیر کے ساتھ ملتا ہے لیکن وہ خلوص اور عقیدت غیر حاضر ہے جو مظہر میں نمودار ہے ۔ یہاں حضرت علی رض کو وہی رتبہ حاصل ہے جو ''جوہر'' میں منصور کو دیا گیا ہے ۔ تاہم صاحب مظہرالعجائب کہتا ہے :

از برای روح احمد[ص] جوہرم
وز برای روح حیدر[ع] مظہرم

اس سے میں خیال کرتا ہوں کہ مصنف ''مظہر العجائب'' نے غالباً ''جوہر الذات'' کو دیکھا تک نہیں ، کیوں کہ یہ کتاب ، جس کا ''ھیلاج نامہ'' ایک سلسلہ ہے ، در حقیقت منصور کے لیے لکھی گئی تھی ۔ ''جوہرالذات'' میں رواداری کی روح موجود ہے اور تمام فرقوں حتیٰ کہ گبر و ترسا و یہود کو بھی مساوی مان لیا گیا ہے ۔ ''مظہر'' میں مذہبی جوش غالب ہے اور مصنف سوائے اپنے عقیدے کے لوگوں کے سب پر تبرّا بھیجتا ہے ۔ ''جوہر'' میں منصور کی

طرح دار پر چڑھائے جانے کی آرزو بے حد زبردست ہے ، لیکن صاحب مظہر کو عام انسانوں کی طرح اپنی جان عزیز ہے -

یہاں "مظہر" کی بعض خصوصیات لسانی بیان کی جاتی ہیں :

'ابا' بمعنی 'با' :

آن امامی کو بحق اسرار گفت
هم ابا منصور هم با دار گفت (صفحہ ۴)
رو تو این بیعت ابا مظهر به بند
تا شوی در ملک معنی سربلند
زانکه حیدر در درون یار گفت
هم ابا منصور هم با دار گفت

'باشش' بمعنی 'سکونت' :

ای برادر! علم معنی دانش است
زان مرا در کوی معنی باشش است
هرکرا باشد سعادت رهنمون
جای باشش باشدش شاپور و تون

'زایده' بجائے 'زائیده' :

خود نظامی بود از من زایده
داده ام او را بمعنی فایده

'قبولند' بطور مضارع :

اگر من راستی گویم ملولند
طریق راستی را کی قبولند

'رافض' بجائے 'رافضی' :

ای منافق تو مرا رافض مخوان
زانکه هستم من محب خاندان
هر که رافض خواندم ملعون شود
همچوسگ دائم سرش در خون شود

'روافض' بجائے 'رافضی' :

ز نادانی روافض خوالیم تو
ز دین مصطفیٰ میرالیم تو

'خارج' بجائے 'خارجی' :

ازین مردم بسی دیدیم خارج
ازان کردیم شان از دوست خارج

'تذکیرہ' بجائے 'تذکرہ' :

کتابی را کہ آن تذکیرہ نامست
مر او را شربت کوثر بجامست

دیگر

محبان علی خواهی بدانی   بذکر اولیا تذکیرہ خوانی

بعض اسالیب ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی مولانا روم مصنف کے زیر مطالعہ رہی ہے -

مظہرالعجائب	مثنوی معنوی
	(طبع نولکشور ، سنہ ۱۹۰۰ع)

'استون' بجائے 'ستون' :

چار یارند لیک در مذهب یکند	گرچہ تقلید ست استون جهان
چار استون شریعت بیشکند	هست رسوا هر مقلد ز امتحان
	(صفحہ ۲۸۶)
خانۂ در شرع احمد ساختند	بر پی غیر است سر از بهر من
چار استون اندرو پرداختند	خانۂ سمع و بصر استون تن
	(صفحہ ۳۰۸)

'اشکست' بجائے 'شکست' :

گفت این در را چرا اشکست تو	ای در از اشکست خود برسرمزن
بعد ازین خواهد شدن اشکست تو	کز شکستن روشنی خواهد شدن
	(صفحہ ۳۱۰)

'اشکاف' بجائے 'شکاف' :

مرا خود طاقت اشکاف نبود پس کنیزک آمد از اشکاف در
چنین زجری بہ او الطاف نبود دید خاتون را بمردد زیر خر
(صفحہ ۴۲۴)

اس کے علاوہ سلطان محمود کے حکم سے ایاز کے گوہر توڑنے کی حکایت دونوں مثنویوں میں عام ہے ۔ مولانا روم کی غزل کا ایک مشہور شعر ہے :

من ز قرآن برگزیدم مغز را
پوست را پیش سگان انداختم

مظہرالعجائب میں یوں آتا ہے :

روز قرآن مغز گیر و پوست مان
پوست را انداز پیش کرگسان

شیخ عطار کی عادت کے برخلاف مصنف ''مظہر العجائب'' اپنے متعلق بہت کچھ کہنے سننے کا عادی ہے ۔ چنانچہ سب سے زیادہ حکایتیں اس نے اپنے ہی متعلق لکھی ہیں ۔ یہاں وہ جستہ جستہ حالات دیے جاتے ہیں جو کتاب ھذا کے دوران میں مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں ۔

اپنے نام کے لیے کہتا ہے :

ہست نام من محمد یا فرید
گشتہ عطاری معانی برمزید
من ز باب علم عطار آمدم
لاجرم گویای اسرار آمدم

اور حسینی[1] ہونے کا دعویٰ ہے :

حسینی ام ازان با من بکینی
یزیدی ، کشتنی در خون نشینی

---

۱ ۔ پروفیسر سعید نفیسی ''لسان الغیب'' کے بعض اشعار مثلاً :
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جاے ولادت نیشاپور اور تونی الاصل ہیں :

خود مرا مولد بہ نیشابور بود
لیک اصل من ز کوہ طور بود

دیگر

اصل من از تون و نیشابور جای
باشدم در مشہد سلطان سرای

دیگر

اصل من از تون و شاپور[1] و ہری
خاک طوس است جوہر من از علی

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ)

این زمان عطار نقد بوذر ست   پیرو صادق امام رہبرست
ما فقیران حسینی مذہبیم   بر طریق آن حسین زاینجا رویم

اور

این زمان عطار نقد بوذرست   کمترین خادمان حیدر است

نیز

ما فقیرانیم و بوذر باب ماست   ہستی دنیا بپیش ما ہباست

سے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ :

"در ہر صورت این فرید الدین محمد عطار دیگر از مردم شہر تون بوده و شاید چنانکہ خود گوید در نیشابور ولادت یافتہ باشد (ہر چندکہ این نکتہ ہم مجعول مینماید) ولی در شہر مشہد میزیستہ است و نسب او با بوذر غفاری می رسیده است و حال آنکہ عطار نیشا بوری در آثار خود بہ ہیچ وجہ اشارہ بچنین نسبی نمی کند ۔"

(صفحہ ۱۴۸-۱۴۹ ، احوال و آثار عطار) ۔ مرتب

۱ ۔ پروفیسر نفیسی لسان الغیب سے اسی شاعر کے ایک شعر :

شہر شاپورم تولد گاہ بود   در حرم گاہ رضا ام راہ بود

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ایام طفلی میں جب تون میں قیام تھا ، برابر آٹھ ماہ تک شدید بیماری میں مبتلا رہے - مرض روز بروز ترقی کرتا گیا ، حتیٰ کہ والدین ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے - کفن آ گیا اور قبر تیار ہو گئی - بہ بوجہ اشتداد مرض بے ہوش تھے - اسی عالم میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آئے اور محبت کے لہجے میں ان سے کہا : "میاں لڑکے ڈرو مت ، ہم تمھیں اچھا کرنے آئے ہیں - تم زندہ رہو گے اور تمھارا کلام بہت مقبول ہوگا -" اس کے بعد آگے بڑھ کر ان کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور فرمانے لگے: "صاحبزادے ! تم ہمارا نام بھی جانتے ہو؟ سنو! میں علی رض ہوں ، تم مجھ کو تون ، طوس ، کاشان ، حلہ ، نیشاپور، سبزوار ، روم ، نجف ، آمل ، اور ساری دنیا میں تلاش کرنا -" مریض نے اپنا سر حضور کے قدموں پر رکھ دیا - آنحضرت کے جانے کے بعد پسینہ آیا اور خدائے پاک نے صحت عطا کر دی - اس حکایت کا پہلا شعر ہے :

من بدم در تون بوقت کودکی
گشتہ بیمار و گذشتہ از خودی (صفحہ ۶۱۴)

ایک حکایت میں بیان کرتے ہیں کہ جب والد نے مجھ کو تعلیم کے لیے بٹھایا تو میرا استاد بھی میرا ادب کرتا تھا - وہ ایک فاضل شخص تھا ، حکمت لقمان و تصوف میں کامل - جفر ، روحانی طریقے سے امام جعفر رض سے سیکھی تھی - نجم الدین کبریٰ کئی مرتبہ اس سے ملنے آئے لیکن وہ فخر الدین (رازی) سے ناخوش تھا - تین

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''سخت پیداست کہ این اشعار را کسی گفتہ است کہ مرد دروغزن بی‌باکی بودہ و چنان از اطلاع و آگاہی دور بودہ است کہ نمی‌دانستہ ہرگز کسی نام شہر نشابور یا نیشابور را شاپور نگفتہ و ننوشتہ و شاپور نام شہری بودہ است نزدیک کزرون -''
(احوال و آثار عطار ، صفحہ ۱۵) - مرتب

سو باسٹھ عارف اس کی خدمت گزاری میں مصروف رہتے تھے ۔ ایک روز یہ آستاد جس کا نام زبان پر لانا گستاخی سمجھتا ہوں ، کہنے لگا کہ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ دروازے سے کوئی شخص اندر داخل ہوا ۔ جب قریب آیا تو میں نے پہچان لیا کہ رسول اللہؐ ہیں ۔ میں دوڑ کر آپ کے قدموں میں گر گیا ۔ اب میں نے جو دیکھا تو آپ کے ہمراہ حضرت علیؓ بھی تھے ۔ رسول اللہؐ نے فرمایا : ”جانتے ہو میرے ساتھ کون ہیں؟“ میں نے عرض کی : ''اے ختم الانبیاء ! پہچانتا ہوں ، یہ وہی ہیں جو میرے ایمان ہیں ، اور آپ کے بعد امام کُل ، تمام کائنات ان ہی کی ذات کے پرتو سے روشن ہے ، تمام نبیوں کے امام اور پیشوا یہی ہیں ۔ آدم یہی ہیں اور عیسٰی ابن مریم اور منصور بھی یہی ہیں ۔“ رسول اللہؐ نے فرمایا : ''تم تو اولیاؤں کی سی باتیں کرتے ہو ۔“ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ صبح کے وقت تمھارے پاس ایک امیر مع ایک بندے کے آئے گا ۔ اس کو تم میرا جامِ اسرار پلا دینا ، کیونکہ وہ عطار ہوگا اور عالم پر ہمارے اسرار کھولے گا :

او بود عطار و عطر افشان شود

بوی معنیش همه در جان بود

تم کو چاہیے کہ عرفانیات میں اس کو درس دو ، نہ زہدیات میں ۔ ہم نے اس کو علم سلطانی ، انفاس حکیمی ، جفر حیدری ، تخت اولیا ، تاج انبیاء ، سترّ او کشف اور نور من عرف عطا کیا ہے ۔ مصنف کہتا ہے کہ جب میں نے استاد سے یہ خواب سنا ، میرے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی ۔ میں ولایت کے لیے بےتاب ہو گیا اور مختصر یہ کہ جب، مرشد نے بدرجۂ عنایت مجھ کو وارفتہ دیکھا ، ارشاد کیا کہ علوم صوری کو دل سے بھلا دو ۔ میں حکم بجا لایا اور پورے ایک چلّے شیخ کی خدمت میں رہا اور اپنے مقصد پر فائز ہو گیا ۔ بعد میں اجازت لے کر رخصت ہوا اور عزلت نشیں

ہو گیا ۔ اس حکایت کی ابتدا ہے :

چون پدر این بنده را تعلیم کرد
اوستادم هم مرا تعظیم کرد

ایک موقع پر کہتے ہیں کہ میں نے سات سو دس کتابیں پڑھی ہیں ، تب کہیں جا کر علم الٰہی حاصل ہوا :

هفصد و ده من کتب را خوانده ام
تا معانیِ خدا دانسته ام (صفحہ ۳۶۳)

دوسرے موقعے پر یہ تعداد ایک ہزار بتائی ہے :

دو پانصد خود کتاب اولیا را
دوباره خوانده ام خود اولیا را

ایام طفلی میں سترہ سال تک مشہد میں رہے اور مزار امام رضاؓ پر راتوں کو اوراد و وظائف پڑھتے رہے ۔ آخر روح امام نے ان کا مقام نیشاپور تجویز کیا :

بوقت کودکی من هفت ده[1] سال
بمشهد بوده ام خوش وقت و خوش حال
بحال کودکی بر آستانش
به شب ها خوانده ام ورد زبانش
مرا از روح او آمد مددها
دگر گفتا که شاپور است ترا جا

---

۱ - پروفیسر نفیسی بجائے ''هفتده'' ''هیجده'' دیتے ہیں اور ان اشعار کے بعد فرماتے ہیں :

''چون در این اشعار نام شهر مشهد را آورده است ، این خود محکم ترین دلیل بر نادرست بودن این مطالبست زیرا هیچ تردیدی نیست که تا پیش از قرن نهم به هیچ وجه اثری در ایران از شهری بنام مشهد نبوده و این شهر تنها از قرن نهم پس از ویران شدن و متروک شدن شهر طوس رو به آبادانی گزاشته است ۔''

(احوال و آثار عطار ، صفحہ ۱۵۲) - مرتب

جس زمانے میں "مظہر" لکھی جا رہی تھی ، اس وقت ایک سلطان ابوالقاسم حکمران تھا ۔ امرا نے اس کو ظلم کے راستے پر چلایا ۔ ان کے پیر نے امرا کو سمجھایا لیکن انھوں نے بادشاہ کو ظلم سے نہیں روکا ۔ شیخ ناراض ہو کر چلے گئے ۔ کچھ عرصے بعد سلطان نے کسی ملک پر چڑھائی کی ۔ اس ملک کے ایک حقیر سردار نے اس کو اور اس کے لشکر کو تباہ کر دیا ۔ اسی سلسلے میں ترکوں کے متعلق ایک پیشین گوئی کی ہے کہ میرے بعد ترک دنیا کو ویران کر دیں گے اور بہت جلد بعد ان کی سلطنت بھی تباہ ہو جائے گی :

بعد من ترکان کنند عالم خراب
بس دل مسکین کہ سازندش کباب
بر ندارد سلطنت شان در جہان
عاقبت ویران شود شان خانمان (صفحہ ۳۳۹)

متعدد موقعوں پر ناصر خسرو کا ذکر کیا ہے ، بلکہ اس کی حمایت[1] بھی کی ہے :

ناصر خسرو کہ اندوہی گرفت
رفت او خود گوشۂ کوہی گرفت

ناصر خسرو ز سر آگاہ بود
نی چو تو خود مرتد و گمراہ بود

ناصر خسرو بحق پی بردہ بود
از میان خلق بیرون رفتہ بود

یار او یک غار بود و تار بود
او بنور و نار حق درکار بود

اس حکیم کی ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک روز ایک پیر سالک مجھ سے ملنے آیا ۔ اثنائے گفتگو میں میں نے اس سے کہا کہ

---

۱ ۔ "و پیداست کہ چون ناصر خسرو اسمعیلی بودہ و وی ہم شیعہ بودہ است این توجہ نسبت بناصر خسرو از آنجاست ۔"
(صفحہ ۱۶۴ ، احوال و آثار عطار) ۔ مرتب

کوئی عجیب قصہ آتا ہو تو سناؤ ۔ پیر سالک نے کہا کہ آج میں وہ قصہ سناتا ہوں جو میں نے ایسے سالک سے سنا ہے جو حکیم ہونے کے علاوہ منصور حسینی کی طرح شاہ تھا ، (یعنی شاہ ناصر خسرو) :

از کمال حکمت او آگاہ بود
او چو منصور حسینی شاہ بود (صفحہ ۷۶)

اس نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ بغداد میں میرا گزر ہوا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص سر بہ سجدہ ہے اور چاروں طرف خلائق کا ہجوم ہے ۔ وہ شخص مناجات میں مشغول تھا ؛ جب مناجات ختم ہوئی ، افسر نے جلاد سے کہا : "بڑھو اور اپنا کام کرو ۔" جلاد اس کو ایک بلند طاق پر لے گیا اور وہاں سے گرا دیا ۔ وہ شخص گر کر مر گیا اور اس کی لاش آگ میں جلا دی گئی ۔ میں نے مقتول پر وجہ سیاست دریافت کی ۔ مجھ سے کہا گیا کہ دجلے کے کنارے کچھ لوگ جمع تھے ، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق گفتگو کر رہا تھا ۔ کسی نے کہا : سب کی اصل حضرت آدم ہیں ۔ دوسرے نے کہا رسول اللہؐ ہیں ۔ ایک نے کہا نبوت کو فضلیت ہے ۔ دوسرے نے کہا : نبوت پر ولایت کو شرف حاصل ہے ۔ اس پر سوال اٹھایا کہ ولایت کس کا حق ہے؟ متوفی نے کہا : حضرت شاہ ولایت کا ، جو افضل ہیں ، اور جو اس پر یقین نہیں رکھتا ، کافر ہے ۔ مصنف کی دینی حرارت ذیل کے اشعار سے واضح ہوتی ہے :

خود خدا قفلی ترا بر جان زدہ
راہ دینت بیشکی شیطان زدہ
زان نمی دانی امام خویش را
بیشکی افتادی از مادر خطا
بستر مادر ترا خود پاک نیست
گر ترا مردود گویم باک نیست (صفحہ ۸۰)

جب لوگوں نے اس سے ایسی باتیں سنیں ، زد و کوب کی ،

ہاتھ باندھ دیے اور شیخ (قاضی) کے پاس لے گئے - شیخ تمام گفتگو سن کر سخت طیش میں آیا - بولا کہ یہ شخص رافضی ہے ، کیوں کہ باجماع اہل سنت ، ولایت پیغمبر کا حق ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ تھے ، ولی نہیں تھے -

این ولایت حق پیغمبر بود
پیش اهل سنت این باور بود
او خلیفه بود ، کی بود او ولی
وین ولایت را نبی دارد نبی

لیکن دیکھو ، میں بھی اس کو کیسی سزا دیتا ہوں - یہ کہہ کر اور خچر پر بیٹھ کر بارگاہ خلافت کی طرف روانہ ہوا - حاجب نے شیخ کی آمد کی اطلاع خلیفہ کو دی - خلیفہ نام سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور استقبال کرکے لایا - شیخ نے تمام ماجرا بیان کیا - خلیفہ نے کہا "یہ تو ایک خفیف معاملہ ہے - میں نے ایسے ہزاروں انسان قتل کیے ہیں ، فرزندان علی تک کو نہیں چھوڑا -" اسی وقت ایک ترک امیر کو ، جس کا نام "اصیل مرد گیر سمرقندی" تھا ، حکم دیا کہ جاؤ پہلے اس مجرم کو قتل کرو اور پھر اس کی لاش کو جلا دو - شیخ نے اس موقعے پر یہ اضافہ کیا کہ تمھیں اس کار نیک میں بڑا ثواب ملے گا -

جب ناصر خسرو نے یہ ماجرا سنا ، اس کو بے حد رنج ہوا ، تب اس نے بد دعا کی :

چون بدید آن ناصر خسرو چنان
گفت بینایی و دانا بی‌گمان
گفت یا رب تو بحق جد من
دور گردان شان ز صدق جد من

ناصر خسرو کا بیان ہے کہ میں ایک شب اپنے گوشے میں ملول و غمگین بیٹھا تھا کہ اتنے میں غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی کہ خدا کا عذاب اس شہر پر نازل ہونے والا ہے ، تو یہاں

سے نکل جا :

یک شبی بودم بکنجی درد مند
با دل مجروح و جان مستمند
یک ندا آمد بگوشم کای حکیم
خیز رو زین شهر من بیرون سلیم
کز خدا آمد بلائی بی‌حساب
اوّلش رنج آید و آخر عذاب

میں علی الصبح اس شہر سے نکل کھڑا ہوا ۔ آخر شہر میں ایسی وبا پھوٹی کہ نہ شاہ بچا ، نہ اس کا لشکر اور نہ وہ شیخ :

شاعر کئی موقوں پر اپنی تصنیفات کا ذکر کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں :

ز بحر علم دارم صد کتب من
درو بنهاده‌ام اسرار لب من (صفحہ ۳۶۰)

کہتا ہے ، پہلے تین کتابیں لکھیں ، پھر ایک ، پھر تین :

باوّل سه کتب تقریر کردم
بآخر یک کتب تحریر کردم

جواهر نامه با مختار نامه
ز شرح القلب من ره برد خامه

ترا معراج نامه پیش حق خواند
جواهر نامه ات خود این سبق خواند

ترا مختار نامه چون بهشت است
بشرح القلب دلیا چون کنشت است

ز بعد این کتب خوان سه کتب را
که تا گردد وجودت خود مصفا

بوصلت نامه دان وصل معانی
ز بلبل نامهٔ ما وا تمانی

ز هیلاجم جهان در لرزش آمد
فلک از قدرتش در گردش آمد (صفحہ ۳۵۷)

ایک مقام پر سولہ کتابوں کے نام گنائے ہیں ، یعنی :

(۱) مظہر (۲) وصلت نامہ (۳) ہیلاج نامہ (۴) اسرار نامہ (۵) منطق الطیر (۶) خسرو و گل (۷) الٰہی نامہ (۸) پند نامہ (۹) مصیبت نامہ (۱۰) بلبل نامہ (۱۱) اشتر نامہ (۱۲) تذکرۃ الاولیا (۱۳) معراج نامہ (۱۴) مختارنامہ (۱۵) جواہرنامہ (۱۶) شرح القلب ۔

بدان خود را کہ در مظہر تو بینی
ز وصلت نامہ نام اظہر تو بینی
بدان خود را کہ ہیلاجم چنین گفت
کہ از اسرار نامہ در توان سفت
بدان خود را کہ مرغ لامکانی
کتاب طیر ما را آشیانی
بدان خود را و خسرو دان تو گل را
الٰہی نامہ گفتست این معما
بدان خود را کہ پند من شفیقست
مصیبت نامہ ات این دم رفیقست
بدان خود را کہ بلبل نامہ داری
باشترنامہ کی میخانہ داری
بدان خود را اگر تذکیرہ داری
جمیع اولیا را دیدہ داری
بدان خود را کہ این معراج نامہ
بہفتم آسمان دارد نشانہ
بدان خود را جواہر نامہ کن گوش
بشرح القلب من فی الحال می نوش (صفحہ ۳۵۶)

کتابوں کی تعداد سولہ[1] ہوتی ہے ، لیکن سترہ بتائی ہے ۔

بدان خود را کہ این ہفدہ[2] کتب را
نہادم بر طریق علم اسما (صفحہ ۵۶۴)

اور تمام اشعار کی تعداد دو لاکھ دو ہزار اور ساٹھ بیان کی ہے :

شمار بیت اینہا را بگویم
من از کشت معانی تخم رویم
دویست و دو ہزار و شصت بیت است
زیادہ یا کمی میدان کہ قید است (صفحہ ۵۶۴)

یہ تعداد مبالغے[3] سے خالی نہیں ہے ، کیوں کہ

---

۱ - مندرج اشعار میں صرف پندرہ کتابوں کے نام ہیں یعنی مختارنامہ مذکور نہیں ۔ (مرتب)

۲ - پروفیسر نفیسی کے ہاں بجائے ''این ہفدہ'' ، ''سی و دہ ۔'' (مرتب)

۳ - پروفیسر سعید نفیسی یہ اور چند دوسرے اشعار درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں :

''درین اشعار بسیار سست بچگانہ کہ شاید کودک دہ سالہ ہم پختہ تر و روان تر ازین بگوید می خواهد بگوید کہ چہل کتاب دارد کہ شمارۂ ابیات آن ۲۰۲۰۶۰ بیت می شود ولی پیداست کہ این ہم از ہمان لافہای گزافست کہ از حقیقت فرسنگہا دورست ۔ کسانی کہ شمارۂ مولفات فریدالدین عطار نیشابوری را چہل دانستہ و عدۂ اشعار او را بیش از دویست ہزار گفتہ اند ہمین سخنان را باور کردہ اند ۔'' (صفحہ ۱۶۵ ، احوال و آثار عطار)

چالیس کتابوں کی تعداد پروفیسر نفیسی نے لفظ ''سی و دہ'' سے اخذ کی ہے لیکن پھر اشعار :

و لیکن شعر گویم صد ہزارت
کہ دارم ملک اسرارم مدارت
ز بحر علم دارم صد کتب من
درو پنہادہ ام اسرار لب من

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شرح القلب[1] اور تذکرۃ الاولیا نثر کی کتابیں ہیں اور معراج نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے نہ تذکرہ نگار واقف ہیں اور نہ فہرست نگار ۔ کوئی تعجب نہیں اگر بے سر نامہ مراد ہو ۔ رہیں باقی تیرہ کتابیں ، ان کے ابیات کی تعداد کسی حالت میں اٹھاسی ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی ۔

مظہر کے دیباچے میں ان کتابوں کے نام لیے ہیں :

جوہر ذاتم عجائب بودہ است
همچو اشترنامہ مستی کردہ است

گر تو از مرغ حقائق پی بری
منطق الطیرم بخوان تا بشنوی

رو تو اسرار ولایت گوش کن
وان گہی جام نبوت نوش کن

رو مصیبت نامہ را از سر بخوان
تا شود حاصل ترا مقصود جان

گر تو از خسرو یکی گل داشتی
بلبل مسکین خود بگذاشتی

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ)

درج کرکے لکھتے ہیں :

''راستی انسان سرگردانست کدام یک از دروغہای این مرد را باور کند : یک جا می‌گوید کہ چہل کتاب دارد کہ شمارہ اشعار آن دویست ہزار و شش بیت می شود و در ہمان کتاب اندکی بعد می‌گوید کہ صد کتاب دارد و شمارہ اشعار آن صد ہزارست ۔''

(صفحہ ۱۶۶) ۔ (مرتب)

۱ ۔ ''شرح القلب کہ خود در مقدمہ مختار نامہ و خسرو نامہ ازان نام بردہ ولی از آن تا کنون اثری بدست نیامدہ و گویا آنہم مانند جواہر نامہ از دست رفتہ است ۔''

(احوال و آثار عطار ، صفحہ ۱۱۹) ۔ (مرتب)

گر الٰہی نامہ را گیری بگوش
جام وحدت را بگیری نوش نوش

گر تو پندم را بیابی در جہان
رو عزیزش دار ہمچون جان جان

رو بذکر اولیا مشغول شو
وآن گہی چون تذکرہ مقبول شو

(صفحہ ۱۳-۱۴)

کہا ہے کہ میں نے بہت کتابیں لکھی ہیں لیکن مظہر العجائب کو سب پر فوقیت ہے :

کتب (من) بسیار دارم در جہان
لیک مظہر را عجائب نیک دان (صفحہ ۱۴)
کتب بسیار دارم گر بخوانی
ازو دنیا و عقبیٰ را بدانی
بدان کین مظہرم جان کتبہا ست
درو اسرار دین حق ہویداست (صفحہ ۳۵۷)

ان کو عباسیوں نے بہت بلایا اور زمرۂ علما میں رکھنا چاہا ، لیکن یہ گئے نہیں ۔ وجہ ظاہر ہے ، یہ حق گو تھے اور وہ حق بات نہیں سنتے تھے :

مرا عباسیان بسیار خوانند
مرا بر عالمان خود جہانند (کذا ۔ نشانند ؟)
اگر من راستی گویم ملولند
طریق راستی را کی قبولند (صفحہ ۵۸۳)

ایک حکایت میں ، جو صفحہ ۴۷۶ سے شروع ہو کر ۵۷۹ پر ختم ہوتی ہے ، کہا ہے کہ ایک پیر سالک نے آکر مجھ سے تیس سوال کیے اور ان کے جواب طلب کیے ۔ میں یہ سوالات سن کر حیران رہ گیا ۔ دل میں کہنے لگا کہ الٰہی ! ان سوالوں کا جواب کیوں کر دے سکوں گا ۔ مجھ میں یہ توفیق نہیں اور یہ ظالم تمام

اسرار غیب مجھ سے دریافت کر رہا ہے ، ان سوالوں کا جواب ہاتف غیبی ہی دے سکتا ہے ۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ہاتف تشریف لایا اور اس نے مجھ کو ان کے جوابات تعلیم کر دیے ۔ جب پیر سالک نے مجھ سے جوابات سنے ، بولا "اگر یہ حال ہے تو مجھے دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے ، میرا اصل مقام عقبیٰ ہے ۔" یہ کہہ کر اٹھا اور جان دے دی ۔

مرا از خود همین معنی تمام است
مرا عقبیٰ باین معنی مقام است
قدم در راه بنهاد او و جان داد
بمعشوق حقیقی او روان داد

یہ قصہ عطار کے توبہ کرنے اور ان کے کوچۂ تصوف میں آنے کے قصے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور ممکن ہے کہ تذکرہ نگاروں نے الٹا سیدھا تراش کر اسی کو اور غرض سے استعمال کر لیا ہو ، یا یہ قصہ اس قصے کی بنیاد پر تراشا گیا ہو ۔

متعدد موقوں پر دشمنوں کے جور و تشدد ، ان کے مذہبی عناد وغیرہ کا ذکر آتا ہے ۔ حبّ مرتضیٰ کی بنا پر ظالموں نے ایک مرتبہ کامل سال بھر قید رکھا اور مکان لوٹ لیا ۔ آخر حضرت مرتضیٰ نے رحم کیا ، قید سے رہائی مل گئی اور جایداد بحال ہو گئی :

تو بر عطار کردی ظلم بسیار
کہ داری در دل خود حب کرّار

ز بهر این مرا یکسال در بند
بکردند آن لعینان در کمر بند (کذا)

ز بهر این تمام ملک و مالم
بغارت برد او یا خورد سالم

یقینم دان تمام بندگانم
کشیدند و نماند یکتای نانم

باخر مرتضی دریافت ما را
بکرد او دفع از ما این بلا را
بحق بود و بحق درخواست کرد او
همه طفل و معاشم راست کرد او
مرا بکشاد او از بند این قوم
ز تاریکی مرا او داد این یوم
مرا او داد جان نو درین دهر
بزد بر جان دشمن نوش خون زهر
(صفحہ ۳۰۶)

یہی شکایت دوسرے موقع پر یوں دہرائی ہے:
ای منافق! آنچہ بامن کردہ ای
کلبہ ما مثل گلخن کردہ ای
خان و مانم را بتاراج سگان
دادہ ای تا خاطرت گیرد امان
قصد کشتن نیز کردی لیک شاہ
داد اندر کوی خود ما را پناہ
رو سیہ گشتی بدستت ہیچ ماند
زان ترا شیطان ملعون خویش خواند
کردہ ای عطار را تو قصد خون
کردہ ای خود را تو از جنت برون
بہر حب مرتضی ما را کشی
در دو عالم خویش را رسوا کشی
(صفحہ ۳۳۶)

دشمنوں نے ایک بار ان کے قتل کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں اور ان کو مع فرزند کے گرفتار کیا۔ ایک لاکھ کی تعداد میں لوگ جمع ہوگئے جن میں فاضل شیوخ و قاضی و اکابر سے لے کر بازار کے دکان دار تک شامل تھے۔ ہر ایک ان کے خون کا پیاسا تھا۔

بالآخر دریا میں پھینک دیا ۔ اس بے بسی کے عالم میں انھوں نے خدا کی طرف رجوع کی ۔ الہام ہوا کہ "اے عطار! مطلق خوف نہ کر، تو دشمنوں کے پنجے سے رہا ہوجائے گا ۔" قدرت الٰہی ملاحظہ ہو کہ اس ہجوم میں سے شہباز کی طرح اڑتے ہوئے نکل گئے[1] ۔

تو ای ناپاک کردی جور بسیار
نہ می‌اندیشی تو از جور عطار

---

۱ ۔ میرزا محمد بن عبدالوھاب قزوینی نے لسان الغیب سے، جو اسی شاعر کی تصنیف ہے ، بعض ایسے ابیات نقل کیے ہیں جو اس واقعے پر مزید روشنی ڈالتے ہیں :

بر سر مسند عراق ترکمان
در چنین ظلمی کشادہ او زبان

بر سر من کردہ ترکان اتفاق
تا بریزد خون کہ دارد او نفاق

ای فقیہ این جا چہ پیچیدہ‌ای
فتوی در خون من بنوشتہ‌ای

قصد جان و مال و عرضم کردہ ای
پارۂ جانم ز من ببریدہ ای

در بدر از دست تو افتادہ ام
در توکل دل بجانان دادہ ام

گرد عالم گشتہ ام از دست تو
گفتہ ام بیدادیت را کوبکو

جمع گشتند خلق بہر قتل ما
جرم عطار است حب مرتضی

عاقبت ما را ز دست این سگان
حق خلاصی داد از وہم و گمان

بغض حیدر سود نبود ای فقیہ
آن زیان جانت باشد ای سفیہ

(مقدمہ تذکرۂ عطار ، صفحہ یا) ۔ (حاشیۂ مصنف)

چه حاصل کردی ازجور چنین تو
چه کردی بهر خون ما نگین تو
جزای تو خدا در حشر بدهاد
که خواهم کرد از تو پیش حق داد
ازین ظلمی که بر عطار کردی
علی را تو ز خود بیزار کردی
زبهر مرتضی کردی بما جور
جهودان فخر دارند بر تو ای کور
که حیدر را چرا تو دوست داری
ز بهر این بریزم خون بزاری
خلاصم کرد حیدر از بلایت
کشم از دوش صورت این روایت
قریب صد هزار آدم درین باب
فگندندت ترا عطار در آب
چو یونس حق ترا از بطن ماهی
نهاد و کرد آزاد از تباهی
تمام ملک از شیخان فاضل
ز قاضی و اکابر هم ز کامل
تمام خلق ، عام و خاص بازار
همه گشتند بر قتلم روادار
همه در قتل و خونم میل کردند
مرا با پور اندر خیل کردند
درین حالت لبایش در فتادم
در توبه برویم برکشادم
ز حق جستم خلاصی نیز خلقان
به بین از حق تعالی نص و برهان

بالہامم ندا در داد یزدان
کہ ای‌عطار ! تو خود را مترسان

خلاصی این زمان از دست ایشان
ازین معنی مکن خاطر پریشان

بالہام الہی ہمچو شہباز
پریدم از میان شان چشم کن باز (صفحہ ۳۰۱ـ۳۰۲)

مظہر العجائب[1] کے جلائے جانے کا اشارہ کئی موقعوں پر موجود ہے ۔ تعجب ہے کہ ابھی مظہر ختم بھی نہیں ہوئی ہے کہ دشمن اس کے جلانے کے منصوبے کر رہے ہیں ، حالانکہ شاعر اس کے چھپانے میں بہت کچھ اہتمام کرتا ہوگا :

---

۱ ۔ مظہر کے جلائے جانے کا ذکر لسان الغیب میں بھی ملتا ہے ۔ میں میرزا محمد کے مقدمے سے اشعار ذیل نقل کرتا ہوں :

زان بسوزی مظہرم کان اسم اوست
غافل از سرّ خدا و دید دوست

ای سمرقندی حذر از سوزشش
چون کنی ز آتش درین جا پوششش

لعنت حق باد بر سوزنده اش
چونکہ یزدان از در خود رانده اش

تو یزید عصر ثانی ای پلید
می کنی نفس حسین این جا شہید

ای سمرقندی مکن این کار تو
می‌فرستی خویش را در نار تو

مظہرم گویی بباید سوختن
چشم مظہر خوان بباید دوختن

در جہان خوانند مظہر را کسان
بر تو خواہند کرد لعنت بیکران

(مقدمۂ تذکرۂ عطار ، صفحہ یب) ۔ (حاشیۂ مصنف)

بسوزی مظہر عطار را تو
دگر نوری بگیری نار را تو
کلام و هم حدیث و اسم حق را
بسوزی و نداری هیچ پروا
تو سوزی اسم ایشان جسم سوزند
قبای ظلم و جور و مکر دوزند (صفحہ ۴۳۱)
بنادانی بسوزی مظہرم را
درو بینی چو نام حیدرم را (صفحہ ۴۰۰)

علی ہذا مختلف مقامات پر اپنے ناظرین کو ہدایت کرتا ہے کہ مظہر کو نااہلوں اور خارجیوں سے محفوظ رکھنا:

من نمایم جملہ اسرارت تمام
لیک این مظہر نہان باشد ز عام
کن ز نااہلان کتابم را نہان
زانکہ دیدم من درو حق را عیان
جوہر و مظہر بکنجی باز نہ
خود ورا سرپوش از اسرار نہ
تا نیفتد او بدست خارجی
منکر مظہر بباشد خارجی
بعد من گر خوانی این مظہر تمام
زینہارش تو نگہدار از عوام

اور مظہر کے خوش نصیب کاتب سے وعدہ کیا ہے کہ میں تجھے ساتھ لیے بغیر کبھی جنت میں قدم نہ رکھوں گا:

با خدا بستم بمعنی عہد نو
بی‌تو باشد خود بہشتم نا نکو
بی‌تو ای کاتب نہ باشم در بہشت
ز آنکہ این مظہر شدستم سر نوشت (صفحہ ۶۱۹)

اور ساتھ ہی اس کتاب میں اعتقاد نہ رکھنے والوں پر دوزخی

ہونے کا فتویٰ لگا دیا ہے :

ھر کہ شک آرد بمظہر دوزخیست
زانکہ این مظہر نشان جنتیست (صفحہ ۶۲۰)

مصنف مذہباً اپنے آپ کو اہل سنت و الجماعت کا ایک رکن بیان کرتا ہے ، اور ساتھ ہی گویا ہے کہ میں حضرت علی کو وصی مانتا ہوں اور شیعہ نہیں ہوں :

من بدین اہل سنت رفتہ ام
بر طریق اہل سنت بودہ ام

کہ عطار است سنی نیست شیعہ
نبودہ او بدین با مطیعہ (کذا)

منم سنی و اسرارم عیانست
جہان اندر جہان اندر جہالست

و لیکن پیر و میر ما علی است
از آن کو وارث علم نبی است

وگر او را وصی دانم بحکمش
نبودہ در جہان خود عدل و ظلمش (صفحہ ۴۳۱)

دیباچے میں اگرچہ شیخین کے لیے اس نے ایک شعر لکھا ہے :

از ظہور مصطفیٰ آگاہ شو
با ابوبکر و عمر ہمراہ شو

لیکن جو مذہبی ماحول اس کتاب میں پیدا کیا گیا ہے ، سنی معتقدات کے عین منافی ہے بلکہ یہ سنی ہیں جو اس کی سب و شتم کے آماج ہیں ۔ شاعر نے اپنی لعنت اور دشنام کے تمام تیر پوری طاقت کے ساتھ ان پر برسائے ہیں ۔ وہ سنیوں کو اپنی تمام بدقسمتی کا ذمہ دار سمجھتا ہے ۔ انھوں نے اسے قید کیا ، گھر لوٹ لیا اور قتل کرنا چاہا ۔ وہ تقلید اور چاروں مصلوں سے سخت بے زار ہے ، چاروں اماموں کی تضحیک کرتا ہے ، اس کے نزدیک چاروں مصلوں کو ماننے والے

مردود ہیں : ع

چار دیدن کارِ مردودان بود

اہل سنت کو ان کے دشمن ناصبی کہتے ہیں (جو در اصل خوارج کا نام تھا) مصنف بھی ان کو اسی نام سے پکارتا ہے ۔ لیکن جائے حیرت یہ امر ہے کہ وہ ان کو خارجی بھی کہتا ہے اور رافضی بھی ۔ مزید بران منافق ، مقلد ، پیروانِ معاویہ ، عباسی ، تقلیدی اور راویوں کے پیرو بھی کہتا ہے ۔ جو لوگ دین علی کے پیرو نہیں ہیں اور چار مذہب کے ماننے والے ہیں ، شاعر کے نزدیک وہی رافضی ہیں :

هر کہ در دین علی نبود درست
رافضی خوانم من او را از نخست

دیگر

ندانستی کہ رافض کیست ای سگ
بگویم تا شود خود خشک این رگ

روافض آن کہ دین شہ ندارد
بکوی مرتضیٰ این رہ ندارد

روافض آن کہ دین غیر دارد
بکوی غیر حیدر سیر دارد

روافض آن کہ از توحید دور است
بہ علم چار مذہب خود صبور است

ناصبی با دینکی بی‌دین شدہ
او ز سر تا پای خود سنگین شدہ

این جماعت دشمنان حیدرند
پیش ما لائق بہ تیغ و خنجرند

(صفحہ ۳۲۰)

چار مذہب :

خانہ[1] دین نبی کردند خراب
خون مومن ریختن دیدند صواب

---

۱ - اس نقلی عطار کے مقابلے میں اصلی عطار کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

جہان را ہم امام و ہم خلیفہ
کرا میدانی الا بوحنیفہ
جہان علم و دریای معانی
امام اول و لقمان ثانی
چراغ است آمد آن سرافراز
چراغی کہ عدو را می نہد کاز
قضا کردند بروی عرضہ ناگاہ
بہ نپذیرفت آنجان و دل آگاہ
نبی بنہاد گنجی جملہ رحمت
بحصہ بو حنیفہ کرد قسمت
گرت از مہر کوفی حاصلی نیست
چو کوفت جز خرابہ منزلی نیست
چرا چون چرخ مقلوبی تو داری
دگر مطلب چو مطلوبی تو داری
چو داری شافعی و بوحنیفہ
توی ہم سالک دین ہم خلیفہ
وگر این داری اما آن نداری
دلی داری ولیکن جان نداری
چو ایشانند ہر دو چشم دین را
بنہ سر این دو چشم راہ بین را

(خسرو نامہ قلمی)

مطبوعہ خسرو نامہ سے یہ اور منقبت اصحاب ثلاثہ کے اشعار اہل مطبع نے خارج کر دیے ہیں - میں نے پروفیسر آذر کے کلیات سے ان کو نقل کیا ہے - یہ بھی یاد رہے کہ شیخ عطار اپنی مثنویات میں آئمہ اربعہ کا نہایت احترام سے ذکر کرتے ہیں ، اور ان کی حکایات بھی نقل کرتے ہیں -

(حاشیہ مصنف)

چار مذهب بہر ایشان ساختند
دین ایشان را برون انداختند

بوحنیفہ گفت کین دین مہمل است
پیش من دین نبی خود مجمل است

من دھم احیای دین مصطفیٰ
زانکہ علم من ندارد خود فنا

شافعی گفتا کہ قول من حق است
پیش من گفتِ نبی خود مطلق است

ہرچہ گویم از روایت راست است
این معانی از دل من خاست است

احمدِ حنبل بگفتا قول من
بہتر است از قول دیگر در سخن

گفت من چون گفت پاکان روشن است
آن زمان نبود کہ بیرون از تن است

گفت مالک آن امام راست گوی
بودہ ام در علم شرعش راست روی

من بہ شرع مصطفیٰ در تاختم
ہم چو عیسیٰ[۴] در رہش خر یافتم

(صفحہ ۳۲۸)

مظہر، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اعزاز میں لکھی گئی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام کتاب اُن کے عشق و وجدان سے معمور ہے۔ شاعر نے ان کی تمجید اور تحمید میں ایسی مبالغہ آمیز زبان استعمال کی ہے جس سے خود رسول اللہ کے امتیاز یکتائی کو صدمہ پہنچنے کا خطرۂ عظیم ہے۔ حضرت علی کا مرتبہ تمام مقدس ہستیوں، فرشتوں اور انبیاؤں سے بالا مانا ہے۔ الوہیت کے اگرچہ تمام خطابات ان کو نہیں دیے گئے تاہم بعد از خدا بزرگ توئی میں تو کوئی گنجائشِ احتمال نہیں۔ یہ اشعار

ملاحظہ ہوں :

همی اسرار عرفان مرتضایست
همی در جان منصور او خدایست
خدا او را ولی‌الله خوانده
برفعت مصطفیٰ‌اش شاه خوانده
بهر قرنی برون آید بلونی[1]
ازو آباد میدان این دو کونی (صفحہ ۳۵۲)

گفت پیغمبر کہ شاهی زان تست
مظهر سر الٰهی جان تست
در همہ روی زمین او مقتداست
این همہ در شان شاه اولیاست
شاه عشق و شاه موسیٰ ، شاه طور
شاه سرور ، شاه اکبر ، شاه نور
شاه یوسف ، شاه یعقوبست و خضر
شاه الیاس است در دریای خزر
شاه اسماعیل و ابراهیم دان
یا چو اسحاق و چو هارونش بخوان
شاه بوده با جمیع انبیا
هم همو بوده بمعنی رهنما
شاه بوده با محمد در عیان
هم همو دیده همہ سرّ نهان

---

۱ ۔ اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف حلول کا معتقد ہے اور خود اس کو اعتراف ہے کہ اس پر اس قسم کے الزامات لگائے گئے ہیں :

”تانگویندت وجودی یا حلول
تانگویندت چو رافض بوالفضول
بعض گویند اتحادی بوده است
یا بکیش ملحدان هم رفتہ است“ (حاشیہ مصنف)

شاہ با عیسیٰ است و با روح اللہ است
رفتہ او بر عرش علیین در است
شاہ جبرائیل و میکائیل ہم
شاہ اسرافیل و عزرائیل ہم
زانکہ حیدر در درون یار گفت
ہمَ ابا منصور و ہم با دار گفت
ہم ازو یعقوب و ہم موسیٰ شنید
ہم ازو عطار و ہم کبریٰ شنید
ہم ازو جبریل و ہم آدم شنید
ہم ازو عیسیٰ بن مریم شنید
ہم ازو سید بمعراجش شنید
ہم ازو این جملۂ عالم شنید

شاعر کے نزدیک ولائے علی کے بغیر نجات ناممکن ہے :

گر ترا عمری دو صد باشد بسال
واندرین عمرت بخوانی علم قال
روزہ گر داری تو خود عمر دراز
ور بشب دائم گزاری تو نماز
بی ولای او نیابی ہیچ نور
روسیہ باشد ترا خود در حضور

اگرچہ بارہ اماموں کا قائل ہے اور ان کی مدح بھی دیباچے میں موجود ہے ، تاہم امام جعفر صادق کا زیادہ گرویدہ معلوم ہوتا ہے اور متعدد مقامات پر اپنے آپ کو جعفری[1] کہتا ہے :

---

۱ - شیعوں میں ایک فرقہ جعفری بھی ہے ، جو امام حسن عسکری کے بعد اُن کے بھائی جعفر کی امامت کا قائل ہے ، لیکن اثناعشری اس امام کو کذاب کہتے ہیں - (از مرآت المذاہب) بعض نے لکھا ہے کہ
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

من طریق جعفری دارم چو باب
خورده ام از ساقی کوثر شراب
مرد آنست کو بدین جعفر است
یا چو سلمان او بدین حیدر است
ای ترا نشناخته جز جعفری
این معانی را ز فہم ما بری
راہ حق چون راہ جعفر راست است
خارجی از من چہ حجت خواست است
این کتب دارد لباس جعفری
معرفت گفته باہل معنوی
ترا مظہر ز جعفر داد پیغام
ترا مظہر ز لطف اوست انعام

مظہر کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں کئی امور دامنگیرِ تامل ہیں جن کو مختصراً ذیل میں لکھا جاتا ہے :

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)
حسن عسکری لاولد فوت ہوئے اور نہ ان کا کوئی فرزند محمد نامی پیدا ہوا ، اس لیے جعفری امام مہدی کی ولادت کے منکر ہیں ۔ (مذاہب الاسلام، صفحہ ۴۴۰) ہمارا مصنف بہرحال امام حسن عسکری کے بعد (جن کو غلطی سے ابوالحسن عسکری ، شعر :
بو الحسن دان عسکری را در جہان
بو الحسن دان مہر او در جان جان
لکھتا ہے) غیبت امام مہدی کا قائل ہے ، چنانچہ :
یا الٰہی مہدیؑ از غیب آر
تا جہانی عدل گردد آشکار
اس لیے اس کا شمار اثنا عشریوں میں ہونا چاہیے جو اپنے مذہب کو حضرت امام جعفر کی طرف منسوب کرکے اپنے آپ کو جعفری بھی کہتے ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)

(۱) اس کی زبان ، جس کا میرزا محمد قزوینی[1] بھی دبی زبان سے اقرار کرتے ہیں ، عطار کے حقیقی کلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتی ۔ ان کا خیال ہے کہ طبیعت میں یہ اضمحلال بڑھاپے کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے ۔ لیکن میری سمجھ سے باہر ہے کہ ایک مشاق شاعر جو مدت العمر پُرگوئی کے لیے معروف ہو ، انحطاط و پیری کے دور میں اس قدر سٹھیا جائے کہ معمولی جملوں میں صرف و نحو کی غلطیوں کا ارتکاب کرے ۔ اس کی سیراب طبیعت کی تمام روانی اور طوفان خیزی بالکل مفقود ہو جائے اور معمولی ترکیب اور بندش کی لغزش ، جملوں کی بےربطی اور الفاظ کے بے محل استعمال کا مرتکب ہو ۔ وزن و قوافی کے معمولی قواعد کو بالائے طاق رکھ دے ۔ نظم میں اس قدر اختلال اور لغزش البتہ اختلال دماغ کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے ، نہ اضمحلال طبیعت کی طرف ۔ عطار کی یہ تصنیف بہت کچھ مولانا آزاد کے دور جنوں کی یادگار "جانورستان" اور "سپاک و نماک" سے مماثل ہے لیکن میں اس نظریے کا بھی معتقد نہیں ، کیونکہ شاعر اپنی تصنیف کی خامیوں سے با خبر ہے اور رفع اعتراض کی بے سود کوشش کرتا ہے ۔ اس کی صرف و نحو

---

۱ - میرزائے موصوف کے اصل الفاظ یہ ہیں :

"یکی از تالیف‌آخری عطار مظهرالعجایب است و در مقدمه این کتاب غالب کتب مصنفه‌اش را که از جمله تذکرة الاولیاست نام می‌برد و اشعار این کتاب بالنسبة بسایر اشعار عطار تفاوت واضح دارد در پستی و سستی و قدری رکاکت ۔ و هرکس منطق‌الطیر و الهی‌نامه و خسرو و گل و دیوان عطار را مطالعه کرده باشد ، برای او قدری مشکل است اعتقاد کند که صاحب مظهر العجایب با آنها یکی بوده است فظاهراً علت این انحطاط و خمود طبع است در سن کهولت ۔"

(مقدمهٔ تذکرهٔ عطار ، ص ط ۔ ی ، مرتبهٔ پروفیسر نکلسن)

(حاشیهٔ مصنف)

کے متعلق ایک بے باکانہ انداز میں کہتا ہے :

جوهر و مظهر باهل دل دهم
صرف و نحوش را باهل گل دهم

دوسرے موقع پر کہا ہے :

جوهر من نیست شرح نحو و صرف
زانکه او در نقطۂ گشتست حرف

گویا وہ اپنی ذات کو ان فنون کے ضوابط کی پابندی سے بالا سمجھتا ہے ۔ یہی نہیں ، ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ میں نے یہ کتاب عام زبان میں اس لیے لکھی ہے کہ عوام الناس اس سے مستفید ہوں ۔ میں اس کو نفیس عبارت میں لکھ سکتا تھا لیکن عامۂ الناس اس کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے :

من این مظهر بلفظ عام گفتم
گهی پخته و گاهی خام گفتم

که فهم خلق در وی خوش برآید
ز جهل و کبر خود بیرون برآید

وگرنه خود بالفاظ شریفش
همی گفتم که می‌آمد شریفش

ولی درویش ازو محروم می‌ماند
به پیش خادم مخدوم می ماند

اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ شخص کوئی بہروپیا ہے ، جس نے خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر شیخ عطار کا سوانگ بھر لیا ہے ۔ چونکہ اس کے پاس نہ عطار کا دماغ ہے ، نہ ان کی طبیعت اور نہ علمیت ، اس لیے یہ تمام اضمحلال ہے اور اسی لیے خیالات میں اس قدر ابتذال اور عبارت میں خامیاں ہیں ، جس کے پڑھنے سے طبیعت متنفر ہو جاتی ہے ۔ ایک شخص عطار کا تخلص اختیار کرنے اور اس تخلص کی رٹ لگانے سے (جیسا کہ مصنف ، اس تصنیف کے دوران میں دیکھا جاتا ہے) عطار نہیں بن سکتا ۔

(۲) تاریخی لحاظ سے نظر ڈالتے ہوئے متعدد خامیاں اور غلطیاں پائی جاتی ہیں ۔ مشاہیر کے زمانوں اور اُن کے سنین و سال سے بے خبر معلوم ہوتا ہے ۔ شیخ نوری کو عطار کا ہم عصر خیال کرکے ایک حکایت تراشتا ہے ، جس میں شیخ نوری ان کے گھر آتے ہیں اور حرب صفین و نہروان کی تاریخ سناتے ہیں :

خواجۂ نوری بما همخانه شد
از وجود ناقصان بیگانه شد

علم معنی از وجودش همچو نور
شعله می‌زد بر طریق کوه طور

یک شبی در پیش من آن بحر راز
از حکایات شهان می‌گفت باز

از معانی و مشایخ وز علوم
از احادیث نبی و از نجوم

گفت و گوی بود ما را خود بهم
از مقالات صحابه بیش و کم

گفتمش از حرب صفین گو سخن
وز مصاف نهروان هم یاد کن

حالانکہ شیخ نوری جنید کے ہم عصر ہیں اور سنہ ۲۹۳ ہجری یا سنہ ۲۹۵ ہجری میں وفات پاتے ہیں ۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ شاعر ان کو ایک حکایت میں شیخ شبلی کے وعظ میں بھی حاضر مانتا ہے ۔

حسین منصور کا اس نے نیا نام رکھا ہے ؛ یعنی منصور حسینی :

جام اسرار معانی نوش کن
همچو منصور حسینی جوش کن
از کمال حکمت او آگاه بود
همچو منصور حسینی شاه بود

عطار ، حسین بن منصور کے حالات ایک معقول پیرائے میں اپنے

تذکرے میں لکھ چکے ہیں ، جس میں انھوں نے حسین کے متعلق صوفیوں کی تمام روایات کو جمع کر دیا ہے ، لیکن عطار کا یہ مثنوی جو تذکرۃ الاولیا کی تصنیف کا مدعی بھی ہے ، تذکرے کے بیانات کے بالکل برعکس ایک طویل حکایت منصور سے متعلق لکھتا ہے جس میں شفیق بلخی جاکر خلیفہ ہارون الرشید کو سمجھاتے ہیں کہ تم نے چونکہ منصور کو قتل کرا دیا ہے ، اور وہ حضرت موسیٰ کاظم کا آدمی تھا ، اس لیے تمھیں چاہیے کہ اب جاکر حضرت امام سے اس قتل کی معافی مانگو ۔ ہارون الرشید پر شیخ کی نصیحت کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ سیدھا حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں پہنچتا ہے ، معذرت خواہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اب تک آپ کی طرف سے غافل رہنے کی معافی مانگتا ہوں ، آیندہ آپ جو حکم دیں گے ، بسر و چشم بجا لاؤں گا ۔ آپ حقیقت میں ہمارے پیشوا ہیں کیونکہ آپ ہی نقد خیر المرسلین ہیں اور میرا ملک در حقیقت آپ کی ملک ہے ، جس طرح منصور کے الفاظ آپ کے الفاظ تھے :

من ترا دانم کہ ملکم حق تست
گفتۂ منصور ہم از حق تست

دشمن آپ کی تاک میں تھے اور منصور کو بھی اس لیے لپیٹا گیا کہ وہ آپ کے محبت کیشوں میں تھا اور آپ کی درگاہ پر سجدے کیا کرتا تھا ۔ وہ برابر پانچ سال تک میرے کان بھرتے رہے کہ جب منصور امام کے آستانے پر پہنچتا ہے ، سینکڑوں سجدے[1] کرتا ہے :

۱ ۔ صفویوں نے ، جب وہ صاحب الزمان کے نائب مان لیے گئے ہیں ، سجدے کی رسم کو رواج دیا ۔ کوئی تعجب نہیں اگر اس قسم کے قصوں سے اس کی حرمت منوائی گئی ہو ۔ (حاشیۂ مصنف)

دیگر آن کہ چون برون آید ز پیش
سر نہد بر آستان صد بار پیش
روی و موی خود بمالد بر زمین
خود خدا را سجدہ باید این چنین

میں طرح دیتا رہا اور لوگوں سے کہتا رہا کہ اس میں کیا ہرج ہے ۔ خود شیخ با یزید بسطامی جب عیدین میں امام جعفرصادقؓ کے ہاں جاتے تو آستانے پر سجدہ کرتے ۔ معاملات کی ابھی یہی صورت تھی کہ منصور نے نعرہ ''انا الحق'' بلند کیا ۔ علماء نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا ، چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا ۔ میرا اگرچہ اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے لیکن التجا کرتا ہوں ، آپ میرے اس جرم سے درگزر کریں ۔ امام نے فرمایا : "اگرچہ باطن میں تم کو میرے ساتھ عداوت تھی ، مگر اس مرتبہ تم کو معاف کرتا ہوں کیونکہ تمھارا اعتراف گناہ اخلاص مندانہ ہے مگر آیندہ محتاط رہنا اور اہل دین کے ساتھ مخلصانہ پیش آنا ۔ ذرا ادھر کونے میں تو دیکھو کون کھڑا ہے ؟" خلیفہ نے کونے میں نگاہ ڈالی ، دیکھا تو منصور حلاج کھڑا تھا ۔ ہارون نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا ۔

اس قصے کی لغویت ناظرین میری مدد کے بغیر معلوم کرسکتے

---

۱ ۔ تذکرہ ، جلد اول ، صفحہ ۱۹۸ ، طبع یورپ ۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے لیے ، جو اس کتاب کے پہلے سیاح ہیں اور تذکرۂ عطار پر دیباچہ لکھ رہے ہیں ، یہ امر ناممکن تھا کہ ایسے قصے پڑھنے کے بعد بھی اس کتاب کی لغویت اور عطار کے نام پر افترا ہونے کے راز سے ناواقف رہتے ۔ تاہم انھوں نے اسے اور اسی مصنف کی دوسری خرافات لسان الغیب کو عطار کی تصنیف قبول کر لیا ۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہاں ان کی تاریخ دانی پر اُن کا مذہب غالب آ گیا ؟
(حاشیۂ مصنف)

ہیں کیوں کہ منصور حلاج اور ہارون الرشید کے زمانوں میں ایک صدی سے زیادہ کا فرق ہے ۔ خلیفہ ہارون الرشید ۱۹۳ ہجری میں وفات پاتا ہے ، اور منصور ۳۰۹ھ میں دار پر چڑھایا جاتا ہے ۔ شیخ شفیق بلخی متوفیٰ سنہ ۱۹۵ ہجری اور ہارون الرشید کی ملاقات کا ذکر خود شیخ عطار نے کیا ہے اور تمام گفتگو بھی درج کردی ہے جو زیادہ تر پند و موعظت پر شامل ہے ۔

(۳) سب سے اہم مصنف کے مذہبی عقائد ہیں[۱] ، جو عطار کے معتقدات سے مشرق و مغرب کا فرق رکھتے ہیں ۔ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں سنی معتقدات کے متبع ہیں ۔ اصحاب اربعہ و آئمہ اربعہ کے مداح و ثناخواں ہیں ۔ یہ شخص اس اقرار سے کہ سنی ہے ، شروع کرتا ہے ، لیکن ایسے جذبات اور معتقدات کا اظہار کرتا ہے جو شیعہ جماعت سے بالخصوص تعلق رکھتے ہیں ۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ہر ایسے عقیدے کی جو سنیوں کے نزدیک قابل احترام ہے ، تحقیر و تذلیل کرتا ہے ۔ سنیوں کو نئے نئے ناموں سے پکارتا ہے ، آئمہ اربعہ کی مذمت کرتا ہے ، اصحاب ثلاثہ کے لیے اس تصنیف کے دوران میں اس کا قلم خاموش ہے مگر یہ ایک ایسی فروگذاشت ہے جو اس نے کسی خاص مصلحت کے زیر اثر روا رکھی ہے ، جس کی تلافی اپنی دوسری تصنیف لسان الغیب میں کر دیتا ہے ، جہاں علی الاعلان اور بقول[۲] میرزا محمد بن عبدالوهاب

۱ - پروفیسر سعید نفیسی مثنوی مظهر العجایب اور اس کے مصنف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''این مثنوی نیز مانند لسان‌الغیب و جواهرالذات و بیسرنامه و هیلاج نامه و اشتر نامه و مواعظ یا ترجمهٔ احادیث و خیاط نامه و کنز الاسرار و کنز الحقایق اشعار بسیار سست دارد و گوینده آن شیعه است و بهمین جهت بهیچ وجه بفرید الدین عطار مربوط نیست ۔''

(صفحه ۱۳۶ ، احوال و آثار عطار) (مرتب)

۲ - میرزا کے الفاظ ہیں : ''و درین کتاب در اظهار تشیع خود بصراحت و بدون تقیه گوید ۔''(مقدمهٔ تذکرهٔ عطار ، صفحه یب) ۔ (حاشیهٔ مصنف)

قزوینی "بدون تقیہ" کہتا ہے:

شیعۂ پاکست عطار ای پسر
جنس این شیعہ بجان خود بخر
ما ز فاروق التجا برکندہ ایم
پی ز نورین شما ببریدہ ایم
بو حنیفہ را ز دست بگذار تو
خود برو اندر پیٔ کرار تو

(تذکرۂ عطار، مقدمہ میرزا محمد قزوینی، صفحہ یب)

میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ عطار تمام عمر سنی رہ کر بڑھاپے میں اپنا مذہب تبدیل کر سکتے تھے، لیکن ان کے لیے نئے شیعہ ہونے کی حیثیت سے اپنی تصنیف میں اس مذہب کی تمام روایات و معتقدات کا ماحول پیدا کرنا سخت دشوار تھا۔ یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جو ابتدا ہی سے اس مذہب کا پیرو ہو۔ اس کی تردید میں شاید یہ کہا جائے، جیسا میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے کہا ہے، کہ عطار نے تقیہ کر لیا تھا۔ اول تو یہ خیال کرنا کہ عطار عمر بھر تقیے کے پردے میں زندگی بسر کرتے رہے، نا ممکن معلوم ہوتا ہے، دوسرے میرزا محمد[1] معترف ہیں کہ یہ کتاب نجم الدین کبریٰ کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے، جو ۶۱۸ھ میں تاتاریوں کے ہاتھ سے شہید ہوتے ہیں۔ تاتاریوں کو اگرچہ ہم اپنے نقطۂ نظر سے وحشی کہنے کے عادی ہیں لیکن انتظامی قابلیت کا وصف ان میں بڑی حد تک موجود تھا۔ انھوں نے آتے ہی اپنی سیاسیات کو مدنظر رکھ کر سنیوں کی کثیر تعداد کے برخلاف شیعہ جماعت کی، جو قلیل تعداد میں تھی، مراعات اور تقویت شروع کر دی تھی، اس لیے میں نہیں سمجھ سکتا کہ چنگیزیوں کے عہد میں عطار کے لیے اصول تقیہ کی پابندی کی کیا ضرورت

---

۱ - تذکرہ، صفحہ یز۔ (حاشیۂ مصنف)

تھی - عطار ، جیسا کہ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے ، نیشاپور میں مقیم تھے اور نیشاپور تاتاریوں کے قبضے میں تھا - میں نہیں جان سکتا کہ تقیے کا انتساب ایک ایسے صوفی کی طرف ، جو ہمیں بے تعصبی اور روا داری کی تلقین کرتا ہے اور اپنی وسیع مشربی سے ہفتاد و دو فرقے کی نجات میں یقین رکھتا ہے ، کس قدر صحیح مانا جا سکتا ہے - ہمیں اسرار نامہ کے یہ اشعار[1] یاد رکھنے چاہئیں - جو تلقین ان میں ہے اس کی آج بھی ضرورت ہے :

الا ای در تعصب جانت رفتہ
گناہ خلق با دیوانت رفتہ

ز نادانی ولی پُر زرق و پُر مکر
گرفتار علیؓ گشتی و بوبکرؓ

گہی این یک بود نزد تو مقبول
گہی آن یک بود از کار معزول

گر این یک بہ گر آن دیگر ترا چہ
کہ تو چون حلقہ ای بر در ترا چہ

ہمہ عمرت درین محنت نشستی
ندانم تا خدا را کی پرستی

ترا چند از ہوا راہ خدا گیر
خدایت گر ازین پرسد مرا گیر

یقین دانم کہ فردا پیش حلقہ
یکی گردند ہفتاد و دو فرقہ

چگویم جملہ ار زشت ار نکویند
چو نیکو بنگری جویای اویند

خدایا نفس سرکش را زبون کن
فضولی از دماغ ما برون کن

---

۱ - گزشتہ صفحات میں بعض ایسے اشعار نقل کر آیا ہوں جن میں عطار نے متعصبین سے خطاب کیا ہے - اُن پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے - (حاشیہ مصنف)

دل ما را بخود مشغول گردان
تعصب دار را معزول گردان

(۴) ایک نہایت عجیب بات یہ ہے کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں کبھی کوئی لغو دعویٰ نہیں کرتے۔ نہ انھیں الہام ہوتا ہے، نہ کرامت کے مدعی ہیں، حتیٰ کہ اپنے مرشد کی طرف بھی کوئی کرامت منسوب نہیں کرتے۔ اگرچہ دیگر مصنفین کے نوشتہ ایسے قصے اپنے تذکرے اور دیگر تصنیفات میں ذکر کر جاتے ہیں۔ اس سے ہم اُن کی طبیعت کی متانت اور واقعیت پسندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر کوئی وصف انھوں نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، تو یہ ہے کہ "دنیا میں ذلیل ترین ہستی میں ہوں۔" شیعہ بن کر ان کی طبیعت مطلق بدل جاتی ہے اور اخلاق میں اس قدر ابتذال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کی غیر ذمہ دارانہ تعلیاں ابلہ فریبی کے لیے شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کا استاد ان کی تعظیم اس لیے کرتا ہے کہ رسول اللہ اس کو خواب میں آ کر ہدایت کر گئے ہیں۔ ایک لاکھ انسان ان کے قتل کے لیے جمع ہوجاتے ہیں لیکن یہ اپنی کرامت سے بازِ بلند پرواز کی طرح اڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور جائے حیرت یہ امر ہے کہ اتنے بڑے معجزے کے باوجود اُن کے دشمن اُن کے دشمن رہتے ہیں اور بدستور درپے آزار ہیں۔ ایک پیرِ سالک آ کر تیس سوال دریافت کرتا ہے، یہ اپنے آپ کو اُن کے جوابات کا نااہل پا کر بہت خفیف ہوتے ہیں۔ لیکن ہاتف غیبی عین وقت پر آ کر جوابات تعلیم کر دیتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا یہ لغویت عطار کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے؟

(۵) مصنف کی طبیعت پر بجائے صوفیانہ ترک و تجرید و فنا، مذہبی بلکہ فریقی جذبات زیادہ غالب ہیں۔ جس طرح عشقِ علی کرم اللہ وجہہ اس کے قلب میں موج زن ہے، بغضِ نواصب بھی اسی طرح جوش و خروش کے ساتھ لہریں مار رہا ہے۔ اس کی زبان اس قدر عامیانہ اور بازاری ہے کہ عطار جیسے فرشتہ صفت انسان کی

طرف منسوب کرنا من قبیل محالات ہے ، کیوں کہ یہ نقطۂ نظر صوفیانہ معتقدات و احساسات کے بالکل منافی ہے ۔

(۶) وہ مدعی ہے کہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں لیکن اپنی تصنیفات کی زائد سے زائد جو تعداد دی ہے ، سولہ ہے اور یہ وہی کتابیں ہیں جو اور ذرائع سے ہم کو معلوم ہیں ۔ ہر پھر کر کئی موقعوں پر انھی ناموں کو دہراتا ہے ۔ اب اگر یہ اصلی عطار ہوتا تو زیادہ نہیں ، کم از کم باقی کتابوں کے نام ہی بتا دیتا ۔ عطار کی تصنیفات سے اس کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ دیوان عطار سے ناواقف محض ہے ، وصلت نامۂ شیخ بہلول کو عطار کی تصنیف مانتا ہے ۔ تذکرۃ اولیاء اور شرح‌القلب کے متعلق اس کو یہ علم نہیں کہ وہ نثر میں ہیں یا نظم میں ، اس لیے ان کے اشعار کی تعداد اپنے مفروضہ شمار دو لاکھ دو ہزار اور ساٹھ میں شامل کرلیتا ہے ۔ لیکن دیوان کے اشعار کو داخل نہیں کرتا کیوں کہ اس کے وجود سے ناواقف ہے ۔ وہ ایک فرضی تصنیف معراج نامے کا ذکر کرتا ہے ، جس کے وجود سے کوئی شخص واقف نہیں ۔ جوہرالذات اور ہیلاج نامے کے تعلق سے مطلق بے خبر ہے ۔

(۷) اس کا دعویٰ ہے کہ جوہرالذات میری تصنیف ہے اور اس دعوے کی تصدیق کی غرض سے دونوں کتابوں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتا ہے لیکن جوہرالذات ہر گز ہرگز اس کی تصنیف نہیں ہوسکتی، کیوں کہ زبان و انداز کلام اور موضوع کے اختلاف کے علاوہ مصنف جوہر ، ہیلاج نامہ میں کہتا ہے کہ یہ میری آخری کتاب ہے :

کتاب آخر است این تا بدانی
اگر تو زهره داری این بخوانی

جوہر کا مصنف فنافی‌المنصور ہے ۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ہیلاج کے ختم ہونے کے بعد اس کی شہادت کے سوا کوئی مرحلہ باقی نہیں رہتا :

بگو هیلاج و آن گهه جان بر افشان
دل و جان بر رخ جانان بر افشان (صفحہ ۵۶۱)

اور خود منصور کا پیکر مثالی اس کو اسی قسم کی ہدایت دیتا ہے ، جو ہم جوہرالذات کے تبصرے میں آیندہ دیکھیں گے لیکن بعد میں یہ مثیلِ عطار منصور کا عاشق زار اور شہادت کا طلب گار ایک نیا سوانگ بھرتا ہے ؛ مظہر العجائب پر قلم اٹھاتا ہے ، لسان الغیب نظم کرتا ہے ، حب علی اور بغض ناصبی کا وعظ کہتا ہے ۔ عطار نہ ہوئے بھان متی کا تماشا ہوگیا ! مصنفِ جوہر ، جوشِ شہادت میں ، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے ، بے تاب ہے ، لیکن مصنف مظہر ، جب ایک لاکھ آدمی اس کے قتل کرنے پر مستعد ہوتے ہیں ، ایک معجزے کے ذریعے سے اپنی جان بچاتا ہے ، اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کتابوں کے مصنفین کو دو مختلف اشخاص تسلیم کیا جائے ۔

(۸) مظہر العجائب میں ایک دل چسپ لفظ ”تومن“ یا ”تومان“ ملتا ہے ۔ اس لفظ کی موجودگی دلالت کرتی ہے کہ یہ کتاب عطار کے عہد سے بہت بعد لکھی گئی ہے ، کیوں کہ لفظ تومان چنگیزیوں کے ساتھ ایران میں آتا ہے اور سب سے پہلے بحیثیت فوجی اصطلاح رواج پاتا ہے ۔ ”جہانکشای جوینی“ پہلی کتاب ہے ، جس میں یہ لفظ ملتا ہے ۔

”تمامت خلائق را ده ده کرده و از هر ده یک نفس را امیر نه دیگر کرده و از میان ده امیر یک کس را امیر صد نام نهاده و تمامت صد را در زیر فرمان او کرده و بدین نسبت تا هزار شود و بده هزار کشد امیری نصب کرده و او را امیر تومان خوانند ۔“ (جہانکشا ، صفحہ ۲۳ ، جلد اول)

”چنگیز خان توربای تقشی را با دو تومان لشکر مغول نامزد کرد تا از عقب او از آب سنده بگذشت ۔“

(جہانکشای جوینی ، صفحہ ۱۱۲)

بعد میں مالیات کی اصطلاح بھی بن گیا ، مثلاً :

”و حقوق دیوانی آن ولایت با آنچه داخل آن تومان است ،

پانزده تومانی و یک هزار پالصد دینار است ۔"
(نزہت‌القلوب، حمداللہ مستوفی ، صفحہ ۱۴۴ ، طبع ملک الکتاب)

عطار کا اس لفظ سے آشنا ہونا اول تو بعید ہے اور پھر اس کا اس طرح استعمال کرنا کہ گویا فارسی کا روزمرہ ہے ، اور بھی مشکل ہے ۔ امثال ذیل ملاحظہ ہوں :

صد تومان با تست این خود قیمتش
خود بکشتی و ببردی حرمتش (صفحہ ۱۴۳)
مال عالم داشت گویند صد تومن
لیک پوشش شان نبوده در بدن (صفحہ ۲۹۳)
در آن عصر او دو مہ میر تمن بود
بسالی او دو ساعت پیش زن بود
مرتضیٰ دیدی کہ سر ھا چون گرفت
صد تمن جان بدان افزون گرفت

(۹) شیخ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں اگرچہ انوری و خاقانی کا ذکر کرتے ہیں لیکن شیخ نظامی کے نام سے واقف نہیں ۔ تاہم مصنف مظہرالعجائب (جو اسم بامسمٰی مظہر العجائب ہے) ان کا ذکر کرتا ہے ، چنانچہ :

گہ نظامی را بیاری در سخن
گہ بنظامی بگویی من‌لدن
گہ همی گویی نظام دین منم
گہ فراز عرش علیین منم

بلکہ ایک موقع پر ایک بے معنی دعویٰ کیا ہے کہ نظامی نے مجھ سے روحانی استفادہ کیا ہے :

خود نظامی بود از من زایده
داده ام او را بمعنی فایده

کیا یہ بے حقیقت لاف نظامی کے شعر :

مرا خضر تعلیم گر بود دوش برازی که آمد پذیرای گوش
کی تشریح ہے ؟

(۱۰) ہمارا مصنف پیشین گوئیاں کرنے کا نہایت مشتاق ہے ۔ ترکوں کے متعلق اس کی ایک پیشین گوئی گزشتہ صفحات میں مرقوم ہوچکی ہے ، یعنی :

بعد من ترکان کنند عالم خراب بس دل مسکین که سازندش کباب

ظاہر ہے کہ شاعر اس بیت میں چنگیزی طوفان کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ چوں کہ اس عہد سے پہلے مغول دنیاے اسلام پر چھا چکے ہیں ، اس لیے اس بہروپیے نے یہ پیشین گوئی جڑ دی ۔

اسی طرح ناصر خسرو کی بد دعا سے شہر بغداد میں وبا کے پھیلنے ، خلیفہ اور اس کے لشکر کے تباہ ہونے کا ذکر کرتا ہے :

بعد ازان آن شاه با لشکر تمام جمله مردندو نماند ازخاص و عام
آن بلا بر جان اهل بغی بود زان که از خونش بدانرا سعی بود
(صفحہ ۸۳)

یہ وبا نہیں ہے بلکہ ہلاکو کے حملۂ بغداد کی طرف تلمیح ہے ۔

(۱۱) ایک اور پیشین گوئی کی ہے کہ میرے بعد ایک درویش روم میں ہوگا جو میرے عقائد کی شراب سے سرشار ہوگا اور میرا خرقہ پہنے گا ۔ تم کو چاہیے کہ اس کے ہاتھ سے جامِ وحدت نوش کرو :

شمهٔ از آن ز بعد من بروم عارفی گوید ز اصل هر علوم
گر تو اهل وحدتی زو گوش کن جام وحدت را ز دستش نوش کن
از همان جامی که من نوشیده ام وز همان خرقه که من پوشیده ام
او بنوشد او بپوشد شمس دین این معانی را بود سرپوش دین
(صفحہ ۶۰۲-۶۰۳)

مولانا جلال الدین رومی کی طرف اس سے زیادہ صاف اور صریح تلمیح ہو بھی نہیں سکتی ۔ شمس دین سے مراد شمس تبریز ہیں ۔

(۱۲) اگر اب بھی اس جعلی عطار کے متعلق شبہ ہے تو ذیل کے ابیات پر غور کرلیا جائے :

گر تو ای شاعر بہ بینی مظہرم
ور بخوانی یکزمانی جوہرم
آن زمان معلوم گردد شعر تو
خط و خالی خود نیابی اندرو
شعر حافظ خوان[1] و با قاسم نشین
زانکہ ایشانند با مـلا قرین
بعد من اسرار ایشان گوش کن
رو ز خنب عشق شان می‌نوش کن

یہ بھی ایک قسم کی پیشین[2] گوئی ہے۔ حافظ سے مراد خواجہ حافظ شیرازی متوفی سنہ ۷۹۲ھ ہیں اور قاسم سے مراد شاہ قاسم انوار ہیں، جو سنہ ۸۳۵ھ یا سنہ ۸۳۷ھ میں انتقال کرتے ہیں۔

جو شخص ماضی کے مشاہیر کے زمانوں اور اُن کے سنین و سال میں فاحش اور یاس انگیز اغلاط کا مرتکب ہو، وہ مستقبل کی تاریک لوح کے اسرار کیا پڑھ سکے گا۔ اس لیے ہمیں مصنفِ مظہر العجائب کے دعوئ غیب گوئی کو یک قلم ترک کرکے اصل حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہیے کہ یہ کتاب ایک افترائے عظیم ہے جو فرشتہ صفت عطار کے نام پر باندھی گئی ہے۔

---

۱ - تعجب ہے کہ ایسی صریح شہادت کو صرف نظر کر کے جو اس تصنیف کی مجعولیت کے حق میں موجود ہے، علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی دنیا کو عطار کے تشیع اور تقیہ اور خمود طبع کا افسانہ سنا رہے ہیں۔ (حاشیۂ مصنف)

۲ - پروفیسر سعید نفیسی اشعار بالا درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
"ہر چند کہ در این اشعار باز خواستہ است پیشگوئی کند و از حافظ و قاسم انوار خبر دہد ولی سخت پیدا است کہ حتماً وی پس از حافظ و قاسم انوار میزیستہ است۔ حافظ در ۷۹۱ درگذشتہ و قاسم انوار در سال ۸۳۷ رحلت کردہ است۔ پس تردیدی نیست کہ این عطار تونی در قرون نہم بودہ۔"
(احوال و آثار عطار، صفحہ ۱۵۵) (مرتب)

مولانا روم ، خواجہ حافظ اور شاہ قاسم انوار کے ذکر سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری کے منتصف اول کے خاتمے کے بعد کسی وقت لکھی گئی ہے ، بلکہ میں دسویں قرن کے ربع اول میں اس کا زمانہ ماننے کےلیے آمادہ ہوں اور میرے وجوہ یہ ہیں :

(۱) اس کے قلمی نسخے گیارھویں صدی سے پرانے نہیں ملتے[1] -

(۲) مصنف اپنے آپ کو ، نیز حسین منصور کو حسینی کہتا ہے - اس لفظ کا رواج نویں صدی میں کم لیکن دسویں صدی میں بہت زیادہ ہو جاتا ہے - خود صفوی اس کے استعمال کو فروغ دیتے ہیں -

(۳) سجدے کی رسم ، جس کا منصور کے قصے میں ذکر آتا ہے ، صفوی عہد میں غالباً رواج پاتی ہے -

(۴) سنیوں کے خلاف اس کتاب میں جو تشدد کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے ، ایسے زمانے میں ممکن ہے جب کہ ملک میں شیعہ حکومت بر سر اقتدار ہو -

الغرض شاہ اسماعیل صفوی (سنہ ۹۰۷-۹۳۰ ہجری) کا عہد[2] اس تصنیف کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتا ہے . جب کہ مذہبی لحاظ سے ایران نئی کروٹ لے رہا تھا ، جدید سیاسی انقلاب نے مذہب اثنا عشری کو صدر میں جگہ دے دی تھی - سنی بزور شمشیر شیعہ بنائے جا رہے تھے ، ان کے علما قتل کیے جا رہے تھے ، جس نے انکار کیا تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا - زندہ ایک طرف ، مردوں کی قبریں اکھڑوا کر پھنکوا دی گئیں اور ان کی ہڈیوں کو جلا دیا

---

۱ - نسخہ ای از مظہر العجائب آقای بدیع الزمان فروز انفر دارد که در ۹۱۲ نوشتہ شدہ است و آن نسخہ با نسخہ چاپ تہران اختلاف بسیار دارد -"

(صفحہ ۱۵۵ ، احوال و آثار عطار از سعید نفیسی) (مرتب)

۲ - پروفیسر سعید نفیسی ، مصنف "مظہر العجائب" کے زمانے پر بحث

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

گیا ، اصحاب ثلاثہ کے خلاف بغاوت کی آگ چار سو مشتعل تھی۔ حضرت فاروق اعظمؓ جن کی بدولت ایران نے نعمت دین اسلام حاصل کی تھی ، آج انھیں کے نام پر لعنت و نفرت کی آوازیں مسجد و منبر سے بلند ہو رہی تھیں ۔ شاید اسی موقع کے لیے شیخ عطار نے اپنی الہامی زبان میں اشعار ذیل لکھے تھے :

عجم ز اول جہود و گبر بودند
ازان گوی مسلمانی ربودند
کسی کاجدادش ایمان از عمر یافت
ز مہر او چرا امروز سر تافت

(خسرو نامۂ عطار)

جب زندہ سنیوں کو بزور شمشیر شیعی بنایا جا رہا تھا تو کوئی تعجب نہیں اگر مردہ سنی مشاہیر کو بزور قلم ذاتی اور مذہبی اغراض کی بنا پر اسی مذہب کے دائرے میں لانے کی کوشش کی

(صفحۂ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ)
کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
''در باب ولادت خود در مظہر العجایب گوید :

اندرین سالی کہ طبعم گشت یار
بود سال پانصد و ہشتاد و چار
سال عمر من ز صد بگذشتہ بود
جملہ اعضایم بدرد آغشتہ بود

ازین قرار در سال ۵۸۴ کہ این اشعار را گفتہ بیش از صد سال عمر او گذشتہ است و بنابرین در حدود ۴۸۴ ولادت یافتہ و این نکتہ از محالات بدیہی و از دروغہای بسیار بزرگیست کہ کسی بتواند دربارۂ خود بگوید زیرا محالست کسی کے در ۴۸۴ ولات یافتہ...... تا این درجہ شیعۂ مبتذل مانند شیعیانی کہ در اواخر دورۂ صفویہ می زیستہ اند بودہ باشد و قطعاً چنین افکاری در قرن ششم ہیچ وجہ در ہیچ جای ایران تاریخ نشان نمی دہد ۔''
(صفحہ ۹۳، احوال و آثار عطار) ۔ (مرتب)

گئی ہو ۔ چنانچہ مظہر العجائب[1] اور لسان‌الغیب اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہیں ۔

۱۴-۱۳ ۔ جوہر الذات[2] و ہیلاج نامہ :

اگرچہ مصنف ان کو علیحدہ علیحدہ کتابیں مانتا ہے لیکن میں اتحاد مضمون و زبان کی بنا پر دونوں کا تبصرہ ایک ہی ساتھ مناسب سمجھتا ہوں ۔ اشترنامہ ، جوہر الذات اور ہیلاج نامہ ایک ہی شخص کی تصنیف معلوم ہوتی ہیں ۔ دونوں مثنویوں سے اکثر تذکرہ نگار واقف ہیں اور فہرست نگار بالاتفاق عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ ان کے قدیم نسخے وہ ہیں جو نویں قرن[3] ہجری کے نوشتہ ہیں اور کئی کتب خانوں میں ملتے ہیں ۔

جوہر الذات ایک ضخیم مثنوی ہے جو نول کشور کے مطبوعہ کلیات کی پوری پہلی جلد پر محیط ہے ۔ اس کی دو جلدیں اور ۵۸۲ صفحات ہیں ۔ ہیلاج نامہ صفحہ ۵۸۳ سے شروع ہو کر ۷۷۰ پر

---

۱ ۔ ''پس تردیدی نیست کہ این عطار تونی در قرن نہم بودہ....چنانکہ عقاید تشیع او ہم ہمین زمان را میرساند واینکہ نام یکی از کتابہای خود را مظہرالعجایب گذاشتہ کہ یکی از القابیست کہ شیعہ بامام نخست دادہ اند خود دلیل دیگری برین نکتہ است زیرا این کلمۂ مظہرالعجایب درین مورد پیش از آن در زبان فارسی سابقہ نداشتہ است ۔''

(صفحہ ۱۵۵ ، احوال و آثار عطار) ۔ مرتب

۲ ۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کا نام زیر نظر مضمون میں ہر جگہ ''جوہرالذات'' ہی دیا ہے ۔ ایرانی نقاد اکثر ''جواہرالذات'' لکھتے ہیں ۔ خود شاعر نے کتاب کو مختلف اشعار میں ''جوہر'' اور ''جواہر'' دونوں ناموں سے موسوم کیا ہے ۔ (مرتب)

۳ ۔ سب سے پرانا نسخہ وہ ہے جو پروفیسر آذر کے کلیات نوشتہ سنہ ۸۵۷ ہجری میں شامل ہے ۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم میں آر (۳۵۳۰) ہے جو سنہ ۸۷۷ ہجری کا نوشتہ ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

ختم ہوتا ہے ، فی صفحہ بیالیس ابیات ہیں ۔ اس حساب سے دونوں مثنویوں کے اشعار کی تعداد بتیس ہزار کے قریب ہے ۔

جلد اول :

جوہر الذات کے بعض ممتاز عنوان یہ ہیں : تکریم بنی آدم ، امامت امیر المومنین علی ، حکایت پیر ، توحید صرف و بقای کل ، حکایت پدر و پسر و مقالات ایشان ، حکایت پیر، رو گردانیدن شیطان ، در مشقت کشیدن آدم از شیطان و شرف انسان ، اسرار قربت شیطان ، تخلیق آدم فی صورت الرحمٰن ، و ھو معکم اینما کنتم ، پیدا آوردن حوا از پہلوی آدم ، اسرار عیان کل ، رفتن ابلیس در بہشت بہ تلبیس در دہان مار، مناجات شیطان ، اسرار یافتن حضرت علی کرم اللہ وجہہ و در چاہ گفتن ، اسرار نی ، اسرار نفس مردم ، سوال امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ و جواب دادن نی در اسرارھا ، مکر شیطان با آدم ، وحدت صرف و یکتایی ذات و صفات ، سوال از منصور و جواب او ، تقریر شیخ ابو سعید مہنہ ، نگاہ کردن درویش در کواکب و جواب ہاتف ، در بی نشانی حسین منصور ، مناجات شیخ اکافی ، در التماس کردن فنای کل از شیخ حسین منصور ، در ستر نگاہ داشتن ، سوال از حسین منصور و جواب دادن او ، حکایت مرد پاکباز ، در اثبات ذات کل ، آگاہی دل در اسرار و از تقلید دور شدن ، صفت وصل و راز کل وغیرہ وغیرہ ۔

جلد دوم :

سوال از منصور در سر آدم ، صفات جان و دل ، صفات عناصر ، قصہ منصور و اعیان او ، صفات فیض و حکمت حکما ، عین ذات و صفات و قدرت و قوت اسرار الٰہی، در آگاہی دادن دل در عین منزل ، جوہر حقیقت ، صفت دنیا ، کشف اسرار حقیقت در نمود صور، در صفت حضرت محمد علیہ افضل الصلواۃ ،گنج جان و دل ، صفات حضرت پیر دانا ،

صفت معراج عین العیان ، صفت کنت کنزاً مخفیاً ، در عیان جام منصور ، سوال از منصور در عیان عشق و جواب او ، عیان در دنیا و راز منصور ، اسرار حسین منصور ، در تفسیر الله نور السموات و الارض ، در عیان دیدار صورت و معنی سر منصور ، سوال صاحب راز از منصور ، در واصل شدن سالک و اعیان منصور ، سوال از ابلیس و جواب دادن او ، سوال از حسین منصور در اسرار ابلیس ، حکایات ابلیس و اسرار وی وغیرہ وغیرہ ۔

هیلاج نامه :

در اسرار عشق بهر نوع ، نموداری هیلاج ، جواب منصور شیخ جنید را ، فنا و بقای کل ، جواب منصور در خطاب حق عز و جل ، عیان جان ، حقائق اسرار ، سلوک سالک ، نموداری عشق ، شریعت و طریقت و حقیقت جمله یکیست ، کشف حجاب ، نموداری یقین ، موتوا قبل ان تموتو، هدایت در ره شریعت ، اسرار دل و جان و تفسیر قرآن ، حکایت حقیقت منصور ، جواب منصور شبلی را ، سوال با یزید از منصور و جواب وی ، نموداری سر توحید ، گریستن بایزید بر حالت و بی خودی منصور ، اسرار گفتن منصور بر دار ، سخن گفتن شیخ جنید و شیخ کبیر در کار منصور ، نکوهش کردن جاهلی مغرور منصور را و جواب آن ، جواب شیخ جنید شیخ کبیر را ، عین الاعیان توحید ، سوال جنید از منصور در حقیقت شرع و جواب آن ، سخن گفتن منصور با شیخ کبیر ، اسرار گفتن منصور با شیخ کبیر ، راز گفتن جنید با شیخ کبیر از هوا داری منصور ، اسرار گفتن عبدالسلام در حضور منصور ، اسرار گفتن عبدالسلام با شیخ جنید ، در نموداری شیخ کبیر با منصور ، سخن گفتن شیخ کبیر با منصور از نموداری قصاص ، فریدالدین عطار در نموداری‌خود و اسرار منصور ۔

ان سرخیوں کو پڑھ کر ناظرین یہ خیال کریں گے کہ بڑے جلیل القدر اور اہم مباحث ان کے تحت مذکور ہوں گے ، لیکن ایک

عنوان کے ذیل میں آدمی دس صفحے پڑھ جائے اور پھر بھی یہ نہ کہہ سکے کہ اس نے کیا سیکھا ۔ اور بعض اوقات تو سرخیاں بالکل برائے بیت ہیں ۔

مصنف اپنا نام فریدالدین محمد بیان کرتا ہے :

حقیقت من محمد نام دارم
ازو پیدا حقیقت کام دارم
فرید الدین محمد هست نامم
محمد داده این جا جملہ کامم

(صفحہ ۳۷۰)

وہ اپنے تخلص "عطار" کے ذکر کرنے کا بے حد شائق ہے ۔ کتاب کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں تخلص مذکور نہ ہو ۔ جوهرالذات میں بیان کیا ہے کہ میں اشتر نامے میں بعض

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :

" این مرد تونی جعال مفتری شیاد پر گوئی نادان خوشبختانہ هیچ خود را چند جا باز کردہ است ۔ در نظر من چون آفتاب روشنست کہ مردی در قرن نهم بوده است از مردم تون کہ دلش می خواستہ بشاعری و پیشوایی فکری کارش در جهان بگیرد ۔ نخست تخلص خود را عطار و لقب خود را فریدالدین گذاشتہ و از فریدالدین عطار نیشابوری ، این مردی کہ زبان ملکوتی و بیان آسمانی او در جهان جان و دل حکمرانی خواهد کرد ، اسرار نامہ و الٰهی نامہ و مصیبت نامہ و مختار نامہ و تذکرة الاولیا و جواهر نامہ و شرح القلب را دزدیده و چون خسرو نامہ و پند نامہ و دیوان و منطق الطیر بسیار معروف بوده و همہ کس میدانستہ است از فرید الدین عطار نیشابوریست جرأت نکرده است آنها را هم بدزدد و برای اینکہ جامۂ دزدی را وصلۂ از خود بزند سیزده کتاب بی‌مغز پر از یاوه هم از خود ساختہ و درمیان آنها داخل کرده است ۔"

(صفحہ ۱۴۷، احوال و آثار عطار) ۔ (مرتب)

اسرار بیان کر آیا ہوں :

ز اشترنامہ سر کار دیدی
حقیقت دیدہ و دیدار دیدی (صفحہ ۳۰)

لیکن یہ کتاب اس سے افضل ہے :

ز اشترنامہ این بہتر نمودم
ز ھر دو عالم این برتر نمودم (صفحہ ۳۶)

اکثر مقامات پر وہ اپنے قتل اور منصور کی طرح دار پر چڑھائے جانے کی پیشین گوئی کرتا ہے :

جواھر ذات بر گو آشکارا
چو خواھد کرد یارت پارہ پارہ (صفحہ ۳۰)

دیگر

کہ می بینم کہ چون منصور عطار
بخواھد سر بریدن زود ناچار (صفحہ ۳۴)

دیگر

شدستم کشتہ چون منصور اسرار
مرا آویختن اندر سر دار (صفحہ ۳۰۶)

اس کا خیال ہے کہ جب جوھرالذات کو پورا کرکے ھیلاج نامہ ختم کر چکوں گا ، تب مجھ کو پارہ پارہ کیا جائے گا :

جواھر نامہ باقی چند ماند است
ز بہر این دلم در بند ماند است
رسانی این تمام آخر بپایان
دگر ھیلاج سر ذات جانان
بگوئی بعد جوھر آشکارا
کنندت آن زمان من پارا پارا (صفحہ ۳۲۵)

اس شہادت کی بشارت حضرت علی نے خواب میں آ کر مصنف کو دی ہے :

شبی دیدم جمال جان فدایش
شدم افتاده اندر خاک پایش

ازو پرسیدم احوال سراسر
مرا بر گفت اندر خواب حیدر

بگفتم رازها در خواب آن شاه
مرا از کشتن او کرد است آگاه

مرا گفتا کہ ای عطار مانده
ز سرّ عشق برخوردار مانده

بسی گفتی ز ما این جا حقیقت
ببردی نزد ما راه شریعت

حقیقت بر تو این در بر کشادیم
ترا گنج یقین در دل نهادیم

بکش رنج این زمان چون گنج داری
ز ما در عشق هان کن پای داری

ترا خواهند کشتن آخر کار
کہ کردی فاش این جاگاه اسرار

کسی کو راز ما گوید حقیقت
نبگذاریم او را در طبیعت

حقیقت گفت منصور آن چہ خود دید
درین جاگہ جفای نیک و بد دید

(صفحہ ۶۹۱)

مختصر یہ ہے کہ مصنف بے شمار موقعوں پر اپنے قتل و شہادت کی غیب گوئی کرتا ہے ۔ اس کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ مظہرِ منصور یا نمودارِ منصور ہے ۔ ھیلاج نامے کے دیباچے میں کہتا ہے کہ جب میں جواھر نامہ کو ختم کر چکا ، اس فکر میں مبتلا ہوا کہ دیکھیے اسرار ظاہر ہوں ۔ اسی فکر میں ایک روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں میری نگاہ ایک دیوانے پر پڑی ، جو چپ چاپ

آ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا اور پوچھنے لگا کہ اس قدر خاموش اور ملول کیوں ہے ؟ جس کا تو طالب تھا وہی مطلوب تیرے سامنے کھڑا ہے ۔ تو نے سب سے قطع تعلق کر لیا ہے اور تیری شہادت کے سوا اب کوئی مرحلہ باقی بھی نہیں رہا ، لہٰذا تجھے لازم ہے کہ کشف اسرار کرے اور حقیقت کے پردے اٹھا دے ۔ اس کتاب کو تو میرے نام پر لکھنا ۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہے ؟ اس نے جواب دیا : "میں منصور حلاج ہوں اور عالم میں ہیلاج کے نام سے معروف ہوں ، تیری جان میں میں ہی گویا ہوں اور میری ہی وجہ سے تجھ کو گویائی حاصل ہے ۔" یہ کہہ کر میرے قریب آیا ، میرے ہاتھ اور سر پر بوسے دیے اور میرے سر پر اسرار کا تاج رکھ دیا ۔ اس وقت میں نے آنکھ اٹھا کر ہیلاج کو دیکھنا چاہا لیکن وہ غائب ہوچکا تھا اور مجھ کو ایک نشانی دے گیا تھا یعنی میرے سر پر ایک کلاہ چھوڑ گیا تھا ۔ جب مجھے ایسی ٹوپی مل گئی ہے ، تو جس قدر فخر کروں بجا ہے ۔ اسرار حلاج کی یہ آخری کتاب ہے جو میں لکھ رہا ہوں ، اس میں معنے کے بےشمار خزانے ہیں[1] :

چو جوہر نامہ کردم فاش آخر
نمودم صورت نقاش آخر
بکنجی در نشستم زار ماندہ
ضعیف و ناتوان و خوار ماندہ
درین اندیشہ کہ از بادہ جوہر
چہ اسرار آید این جاگاہ ظاہر

۱ ۔ اس قصے میں غالباً وہ روایت جو نفحات الانس (ذکر عطار) میں ملتی ہے کہ نور منصور ڈیڑھ سو سال بعد عطار پر تجلی کرتا ہے ، تاسیس پاتی ہے یا یہ قصہ اس روایت کی بنا پر نشو و نما پاتا ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

نظر کردم یکی دیوانه دیدم
ز علم صورتی بیگانه دیدم
که آمد پیش من این عاشق زار
لب از هم بر کشاد و گفت اسرار
زمانی بود این جا ساکن و خوش
دگر آورد سر بیرون ز آتش
مرا گفتا چرا در غم نشستی
در معنی بروی خود ببستی
نه وقت آمد که دیگر راز جویی
دگر اسرار جانان باز جویی
تو این دم عاشقی و راز دیده
جمال دوست در خود باز دیده
طلب کردی و دیدی روی مطلوب
رسیدی این زمان در ذات محبوب
چرا فارغ نشینی زود برخیز
دگر در عشق و ذوق فقر آویز
چو کردستی ازین جا جملگی ترک
بجز کشتن نماندستت دگر برگ
کنون باید که گویی سرّ اسرار
حقیقت فاش گردانی دگر بار
بنام من کتابی نغز آری
دگر هوشی دگر با مغز آری
بنام من دهی بنیاد این جا
دهی امروز این جا داد ما را
خدایم این زمان من واقف خود
درون جان تو من واصف خود

بدو گفتم کہ ای جان چیست نامت
کہ حق داد است این جا گاہ کامت

جوابم داد من منصور حلاج
مرا نامست در آفاق هیلاج

کنون بنویس مر اسرار مارا
نگہ می‌دار مر گفتار مارا

درون جان تو مائیم گویا
توی از من شده در عشق گویا

بگفت این ، آن گہی نزدیکم آمد
چراغی در دل تاریکم آمد

بدادم بوسہ بر دست و بر سر
نہادم بر سر از اسرار افسر

نظر کردم پس آن گہ سوی بالا
کہ تا بینم مبارک روی هیلا

ندیدم هیچ صورت درمیانہ
مرا بخشیدش آن گہ یک نشانہ

کلاهی بد نشانی بر سر ما
کہ آن باشد بعالم افسر ما

بخود گفتم کہ هان برخیز و خوش باش
کہ بنمود است اینک روی نقاش

سر افرازی کن ای بی سر در آخر
کہ این جا نیستت هم سر در آخر

کتاب آخر است این تا بدانی
اگر تو زهره داری این بخوانی

(هیلاج نامۂ قلمی ، کلیات پروفیسر آذر)

یہ مثنویاں عطار کی دیگر تصنیفات مثلاً الٰہی نامہ ، اسرار نامہ ، منطق‌الطیر اور مصیبت نامہ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں ۔ عطار

اگرچہ پُر گو ہیں تاہم ان کے ہاں زبان کا لطف اور متانت کافی مقدار میں موجود ہے۔ ان کا قاعدہ ہے کہ جس مسئلے کو چھیڑتے ہیں، اسی کو پیش نظر رکھ کر اور غیر ضروری امور سے بچ کر ایک خوش مذاق کے ساتھ اپنے ضروری دلائل اور آراء بیان کر دیتے ہیں۔ صاحب جوهرالذات اس بارے میں عطار کے بالکل برعکس ہے۔ وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے لیکن نفس مضمون کو تشنہ چھوڑ جاتا ہے۔ پھر اس کے بیان کرنے کا ڈھنگ عجیب و غریب ہے۔ ہرمضمون کے متعلق ایک پراسرار فضا پیدا کر دیتا ہے۔ ہرچیز اس کے نزدیک ایک راز ہے، خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ وہ اس کے گرد اسی طرح گھومتا ہے، جس طرح ایک بلی کسی چوہے کے گرد دبوچنے کے بجائے چکر لگاتی رہے۔ جن اسرار کے انکشاف کا وہ دعویٰ کرتا ہے، بجائے اس کے کہ ان کا حل سوچے یا ان کے حل کی کوشش کرے، ان کا وظیفہ یا ورد شروع کر دیتا ہے۔ جو بات آسانی سے پانچ شعروں میں کہی جاسکتی ہے، ہمارا مصنف ان کو پچاس بیت میں ادا نہیں کرسکتا۔ اس کا ہر دوسرا مصرع برائے بیت ہوتا ہے۔

قدم قدم پر کشف حقیقت و اسرار کا مدعی ہے، لیکن اگر اسرار بیان کرنے کا یہی ڈھنگ ہے، جو اس نے اختیار کیا ہے، تو ایسے بیان کرنے سے ان کا بیان نہ کرنا بہتر ہے:

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیان سے
اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

لیکن پیشتر اس کے کہ میں اور امور کی طرف توجہ کروں، مجھ کو چند الفاظ اس کی زبان اور طرز کے متعلق کہنے ضروری ہیں:

خاص خاص روزمرے، محاورے، خیالات، الفاظ اور بندشیں مل کر بحیثیت مجموعی کسی مصنف کی شخصیت یا اس کے انداز تحریر کو قائم کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہمارا شاعر ایک طرز خاص کا مالک ہے، جو اس کو نہ صرف عطار سے بلکہ دیگر شعرا سے بھی تمیز کرتی ہے۔ اس کے ہاں حقائق و اسرار کے بیان کرنے کی

خاص خاص اصطلاحیں ہیں جو دیگر مصنفین نے کم استعمال کی ہیں ۔ مثلاً :

دید ، دید دید ، بود ، بود بود ، بود نبود ، واصل ، دیدار ، سر ، راز ، جان ، جان جاں ، کل ، لقا ، عیاں ، عکس عیاں ، عیان عیان ، عیاں در عیاں ، عیان عشق ، عین الیقین ، نمودار ، حقیقت (ذات مصطفوی) ، شریعت (قول و فعل او) ، یک رنگی ، بےنشانی ، نقش، نقاش ، نقش طبیعت ، جانان ، شاہ ، دارطبیعت ، عین طبیعت ، قربت لا ، دار ، اعیان ذرات ، عین تمام ، وصال کل ، عیان یار ، در وجود مردن ، عین پرگار ، مغز ، پوست ، عین طبیعت ، رمز مطلق ، دیدار دید ، دیدار اعیان ، کل دید ، نقطہ و پرگار ، کل لقا ، هیلاج جہاں ، عیان عقل وغیرہ ۔

'با' 'بر' اور 'بے' جیسے حروف اپنی قدیمی شکل یعنی 'ابا'، 'ابر' اور 'اے' کی صورت میں ملتے ہیں اور ہم کو حیرت ہے کہ یہ شاہ نامہ اور گرشاسپ نامہ کے دور کے یادگار جوهرالذات اور هیلاج نامہ میں کیسے نمودار ہوگئے ، حالاں کہ عطار کی اصلی مثنویات میں نظر نہیں آتے ۔ امثال :

منم الله و رحمٰن و رحیمم
ابی صورت یقین حد قدیمم (صفحہ ۲۹۹)
ابی غم شد هر آنکو برد فرمان
ترا ورنہ فتاد او سوی زندان (صفحہ ۳۳۷)
ره دور و عجب در پیش داری
ابا خود پیر پیش اندیش داری (صفحہ ۳۴۰)
دمی گوید منت دیدار دارم
ابا تو الدرین سرکار دارم (صفحہ ۳۴۱)
محمدؐ با علیؓ دارند بی شک
وجود لحمک لحمی ابر یک (صفحہ ۳۳

بسی گشتی ابر گرد کمر تو
کہ باز این جا بری بوی اگر تو (صفحہ ۲۵)

لفظ "حقیقت" بمعنی در حقیقت مصنف کا تکیہٗ کلام بن گیا ہے - امثال :

حقیقت پیر از خود رفت بیرون
کہ بیرون بود او از هفت گردون
نہ پردہ بود نی شاہ جہان تاب
حقیقت گم شدہ او اندرو یاب
ہمہ در پردہ گم دید و یقین دوست
حقیقت مغز گشت و در عیان پوست (صفحہ ۳۷)

یہ اشعار میں نے صرف ایک صفحے ہی سے نقل کر دیے ہیں - ان کے علاوہ حضرت علیؓ کی بشارت کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں -

دوسرا تکیہٗ کلام 'جاگہ'، 'جایگہ' اور 'جاگاہ' ہے، جو جوہر اور هیلاج کے طول و عرض میں ہر مقام پر موجود ہے - میں کہتا ہوں وہ صفحہ نہایت بدنصیب ہے جہاں یہ الفاظ نہ ہوں - امثال :

جمال من ندیدہ غافلا تو
درین جاگاہ ای بی‌حاصلا تو (صفحہ ۳۹۹)
شد این جاگاہ اندر آخرکار
اگرچہ برکشید او رنج و تیمار
در آخر گشت این جاگاہ واصل
شدش مقصود این جاگاہ حاصل (صفحہ ۱۹۸)
مرا این جایگہ او منفعل کرد
دمادم پیش خلقانم خجل کرد (صفحہ ۱۹۵)
ترا این گلشن این جاگہ خوش آمد
ازان اصلت ز باد و آتش آمد (صفحہ ۱۸۹)

ز تیر عشق این جاگه بدوزد
پس آنگه بودت این جاگه بسوزد (صفحہ ۱۷۳)

"می" جو ماضیِ ناتمام اور حال کی علامت ہے ، اصل فعل سے دور لایا جاتا ہے :

چرا خون می خوری در خاک فانی
ازان می ره نبردی و ندانی (صفحہ ۲۰۳)
درونت روشنایی دارد این جا
درونت می جدایی دارد این جا (صفحہ ۲۰۴)
نخواهی یافت آخر می رهایی
چرا بی‌چاره در قید هوایی (صفحہ ۳۴۳)
بجز خورشید می تابان نباشد
ندیدی این ترا تاوان نباشد (صفحہ ۳۴۸)
نمی دانی که می آخر چه بودت
ز بهر چیست این گفت و شنودت (صفحہ ۱۲۸)

'من' 'تو' اور 'ما' وغیرہ مفعولی معنوں میں لائے گئے ہیں :

تو دارم در جهان و کس نه دارم
که عمری سوی دیدت می‌گذارم (صفحہ ۲۱۶)
چو من دیدی منت بنمایم این راز
حجاب اندازم این دم آخرت باز (صفحہ ۳۳۹)
تمامت مست و حیرانند جانا
بروز و شب تو می‌خوانند جانا (صفحہ ۱۸۴)
تو مارا ذات مارا بین و ما جوی
هر آن رازیکه می داری بما گوی (صفحہ ۱۹۱)
زهی حسن تو داده ماه را نور
که در آفاق او دیدیم مشهور (صفحہ ۲۱۷)

'را' زائدہ کی مثالیں :

خبر دادم شما را از شما را
کہ خواهد بود تان آخر فنا را (صفحہ ۴۳۹)
گمان بردار ای بنمود خود را
فگندہ تہمتی در نیک و بد را (صفحہ ۳۳۹)
نمی دانی جوابی دادن او را
کہ باشد در خور جانان نکو را (صفحہ ۳۴۰)
ز بعد خالق کون و مکان را
ثنا بر خاتم پیغمبران را (صفحہ ۵۸۸)

حاصل بالمصدر "گفت و گو" وغیرہ کے ٹکڑے کر کے حرف جارہ وغیرہ درمیان میں لائے جاتے ہیں :

درم بکشادهٔ در گفت و در گوی
بگو اکنون دگر در جست و در جوی (صفحہ ٦٦٨)
بگوید آن زمان خاکستر او
اناالحق همچنان در گفت و درگوی (صفحہ ۷۵۸)
در اول لعنتم چون کردہ بد او
بهرزه دانم این جا گفت یا گو (صفحہ ۴۸۵)
ز عقل سفل چہ گفت و چہ گویست
نمود صورتست و جست و جویست (صفحہ ۱۱۷)
من از فتوی چنان کردم ابا او
کہ تا کوتہ شود این گفت وین گو (صفحہ ۷۵٦)

الف زائدہ :

ترا این جاست ابراهیم در تن
شود در عاقبت این جا بت اشکن (صفحہ ۵۰۲)

عربی الفاظ میں تصرفات :

عام کی جمع عوام ہے ، لیکن مصنف "اعوام" لایا ہے :

کنون ای شیخ این اعوام مسکین
بصورت اندرین شورند و در کین (صفحہ ۶۵ے)

دیگر

طلبگار تو اند اینجا نجومات
کجا دانند از سرّ علومات (صفحہ ۳۶۸)

معاینہ بروزن مفاعلہ ہے ، مصنف نے بروزن مفاعیلہ استعمال کیا ہے :

معائینہ جمال خود نمود است
کہ با عطار در گفت و شنود است
معائینہ مرا کرد است واصل
حقیقت بود او شد جان و ہم دل
معائینہ دل و جانم یکی کرد
ز دیدار خود و این جایگہ کرد (صفحہ ۵۱۲)

ان مثنویوں کی مرکزی شخصیت حسین بن منصور حلاج ہے ، جس کو مصنف ہمیشہ منصور کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ یہ مثنویاں گویا اس کے اقوال و افعال و کرامات کی داستانیں ہیں ۔ مخلوق خالق کے لیے اور عبد معبود کے لیے جس قدر احترام دکھا سکتا ہے ، وہ سب احترام منصور کے لیے دکھایا گیا ہے ۔ خود منصور اپنے لیے ایسی زبان استعمال کرتا ہے ، جو بشریت کی حدود سے گذر کر الوہیت کی فضا میں دم لیتی ہے اور بندے اور خدا میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ۔ حلاج کے جو قصے یہاں ملتے ہیں ، عام طور پر معلوم بھی نہیں ۔ منصور کی طفلی کی ایک حکایت کلیات میں صفحہ ۵۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۶۹ پر ختم ہوتی ہے ۔ میں اس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں :

مصنف کا بیان ہے کہ میں نے اپنے پیر سے سنا ہے کہ چین میں ایک تاجر تھا ، جو سفر کا بے حد شائق تھا ۔ اس بوڑھے تاجر کے ایک لڑکا تھا ، چندے آفتاب و چندے ماہتاب ۔ جس قدر

حسین و جمیل تھا اسی قدر متقی اور راست باز تھا ۔ خدا کے ذکر کے سوا کوئی چیز اس کو پسند نہ تھی ۔ ایک مرتبہ یہ لڑکا اپنے باپ کے ہمراہ سفر کو گیا ۔ راستے میں ایک دریا آیا ، جس کو عبور کرنے کے لیے انھیں کشتی میں بیٹھنا پڑا ۔ اتنے میں ملاح نے کہا کہ طوفان آ گیا ہے ۔ لڑکے نے اپنے باپ سے کہا : ”باوا جان ! یہ خوفناک مقام ہے ، آؤ کشتی چھوڑ دیں اور کہیں چل کر پناہ لیں کیوں کہ مجھے الہام ہوا ہے ۔“ باپ نے کشتی میں ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا اور کہا : ”اے فرزند ! نادانی نہ کر اور طفلی کی ضد سے باز آ ۔ اور بتا کہ یہ بات تجھ کو کس طرح معلوم ہوئی ؟“ اس نے جواب دیا کہ جب تمھارے پاس دولت کثیر ہے تو پھر کیوں دریا کے سفر سے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہو ۔ تاجر نے جواب دیا ”اے فرزند ! دنیا ایک عزیز مقام ہے اور انسان ایک روپے کے دس روپے کرنے کی غرض سے تمام خطروں کا مقابلہ کرتا ہے ۔ دیکھو اپنی اسی کشتی میں بڑے بڑے تاجر موجود ہیں اور سب اسی امید میں آئے ہیں کہ نفع کمائیں ۔“ لڑکے نے جواب دیا : ”اے پدر محترم ! اس سے کیا فائدہ ، دریا میں آنے اور فنا ہونے سے حاصل ؟ تمھیں ابدی نیک نامی کے استحصال کی کوشش کرنی چاہیے ۔ یہ سب لوگ روپیہ اور دولت بٹورنے والے ہیں ، اسی لیے امید و بیم کی دوعملی میں گرفتار ہیں ۔ محض دنیا کمانا جانتے ہیں اور عقبیٰ کا کوئی کام نہیں کرتے ۔ ان کے درمیان مجھ کو بٹھا کر تم نے خود مجھے اپنی نگاہوں میں ذلیل بنا دیا ۔ افسوس ! اس مقام سے میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا ۔“ تاجر نے کہا ”لڑکے ! خاموش رہ ، یہ بات تھی تو تو آیا نہ ہوتا اور اب آ گیا ہے تو جھگڑا نہ کر ۔ میرے لیے دنیا میں سب سے عزیز شے تُو ہے ، اور تیرے ہی لیے یہ تمام صعوبتیں برداشت کرتا ہوں ۔ تجھے ساتھ لانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ تو بھی کچھ تجربہ کار ہو جائے ۔“ لڑکے نے کہا : ”باوا جان ! میں دنیاداری کی باتیں سننا نہیں چاہتا ۔ مجھ سے اگر

کوئی ذکر کرو تو شریعت کا کرو ۔ میں سیمرغ بحر لامکاں ہوں اور نور شرع مصطفیٰ ہوں ۔ جس طرح دریا کے عجائبات لاتعداد ہیں ، میرے اسرار بھی غیر متناہی ہیں ۔" تاجر نے کہا : "فرزند ! یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ۔ اپنی حد سے قدم نہ بڑھا اور بے عقلی کی باتیں نہ بنا ، اس میں تیری سبکی ہے ۔ تو نے ایک بات پوچھی تھی ، میں نے اس کا جواب دے دیا ۔ بھلا حقیقت کہاں اور تو کہاں ۔ تو تو ابھی نادان لڑکا ہے ۔" لڑکے نے کہا : "باوا جان ! مجھ کو لڑکا نہ سمجھو ، مجھ میں نمود عشق ربانی ہے ۔ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں تو خیر ، مگر مجھ کو گمراہ کرنے کی کوشش مت کرو ، میں سب سے فارغ اور سب سے آزاد ہوں ۔ میری رہنما عین ذات ہے ۔ تم بے شک میرے پدر محترم ہو لیکن میری حقیقت سے واقف نہیں ۔ تم کشتی دیکھتے ہو اور میں دریا کو دیکھتا ہوں ۔ میں اس بحر میں گوہر الا دیکھتا ہوں ۔" اب تاجر کو خیال ہوا کہ لڑکا دیوانہ ہو گیا ہے ۔ کہنے لگا : "لڑکے ! یہ سودا تجھ کو کب سے ہوا ہے کہ تو اپنے آپ کو واصلین میں شمار کرنے لگا ؟ اگر اب خاموش نہ رہا تو میں تجھے دریا میں پھینک دوں گا ۔ میری عقل حیران ہے کہ تو حدود سے باہر نکلا جا رہا ہے ۔ تجھ کو لازم ہے کہ اعیان عقل سے کام لے ۔" لڑکے نے جواب دیا : "باوا جان ! تمھیں یہ خیال ہے کہ میں کوئی خبیث ہوں حالانکہ عالم جان میں سب عین جاناں ہیں ۔ اس کشتی میں میں ایک بحر اعظم ہوں ۔ اگرچہ تمھارے ساتھ بحر ہستی میں ہوں لیکن میں اپنی صدف کا در یگانہ ہوں ۔ میں یہ باتیں کیوں نہ کہوں جب جانتا ہوں کہ راست ہیں ۔ تم نے مجھ کو دریا میں پھینک دینے کی دھمکی دی ، میں کہتا ہوں کہ تم ضرور اسے پوری کرو ۔ میں اسرار حقیقت کا مالک ہوں اور انوار طریقت میرے دیکھے بھالے ہیں ۔ اگر تم نجات دارین حاصل کرنی چاہتے ہو تو مجھ کو اس بحر ہستی میں تنہا چھوڑ دو ۔ تقلید میری دامن گیر نہیں ہے ، میں اس دریا سے نکل جاؤں گا ۔ تمھارا خیال ہے کہ میں

غرق ہو جاؤں گا لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھ کو کون و مکاں سے باہر اڑ جانا چاہیے ۔ میں ذات ہوں ، پھر کس لیے کشتی صفات میں رہوں ۔ مجھ کو خدا کا حکم ہے کہ دفعتاً گم ہو جاؤں ۔ اس دریا میں میں منصور ہوں اور تمام عالم میں مشہور ہوں ۔ کونین میرے اسرار ہیں لیکن میں نامحرموں کی آنکھوں سے مخفی ہوں ۔ میں اسرار کا دریاے لاہوتی ہوں ، جو دریا میں ناپایدار ہو جائے گا ۔ علم و حکمت حق کا دریا ہوں ، راز مطلق کو افشا کروں گا ، دریاے علم اور بحر تنزیل ہوں اور صورت کو تبدیل کر دوں گا :

درین دریا منم با با الٰہی
گواهی می دهندم ماه و ماهی
درین دریا منم الله بنگر
نمود دید ''الا الله'' بنگر
منم بابا نمودار الا الله
درین دریا منم عین هو الله
منم منصور و بنایم ترا دید
که می گویی ابا من عین تقلید (صفحہ ۵۶ - ۵۷)

جب یہ جوش بھرے الفاظ کشتی والوں نے سنے ، سب دنگ رہ گئے ۔ آخر وہ قطبِ سرفراز جوہر احترام کا مستحق تھا ، اٹھا اور کہنے لگا :

''اب تمھارے ساتھ رہنے میں مجھ کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے رخصت ہوتا ہوں ، اے پدر محترم !

وداعت کردم و خواهم شدن زود
ز بهر شرع از من باد خوشنود (صفحہ ۵۷)

میں جاتا ہوں اور میرا راز اکسٹھ سال کے بعد بغداد میں ظاہر ہوگا ۔ کیا تم نے سورۂ طٰہٰ نہیں پڑھی :

درختی دید موسیٰ آن شب از دور
ز صد ساله ره آن جاگه پر از نور

بیک جذبہ بشد آن نیک بخت او
ز قربت تا سوی نور درخت او
همی زد آن درخت ''انی انا اللہ''
کہ گردد از نمود شاہ آگاہ
درختی یافتست این قربت دوست
کہ می داند کہ بود بودش از اوست
رواست ''انی انا اللہ'' از درختی
ز وصل این جا بگوید نیک بختی
رواست ''انی انالحق'' گر بگویی
بوقتی کز خودی خود لگویی
چو حق دیدم پدر در عین تحقیق
حقیقت حق شدم از سر توفیق

(صفحہ ۵۷ - ۵۸)

---

۱ - یہ ستدلال اگرچہ یہاں بے محل واقع ہوا ہے لیکن صوفیانہ نقطہ نظر سے اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں ، کیوں کہ شیخ عطار اپنے تذکرے میں (صفحہ ۱۳٦ ، جلد دوم) اس کو بیان کرتے ہیں : ''مرا عجب آمد از کسی کہ روا دارد کہ از درختی ''انا اللہ'' برآید و درخت درمیان نہ ، چرا روا نباشد کہ از حسین ''اناالحق'' بر آید و حسین درمیان نہ -'' پھر یہی شعر انھوں نے خسرو نامہ (طبع ثمر ہند) میں یوں لکھا ہے :

رواست ''انی انا اللہ'' از درختی
چرا نبود روا از نیک بختی

پروفیسر آذر کے کلیات میں بھی موجود ہے ، لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ یہی شعر بجنسہ مثنوی گلشن راز محمود چبستری میں بھی موجود ہے - صاحب جوہر الذات عطار کے اشعار کو اکثر مسخ کر دیا کرتا ہے ، چنانچہ اس شعر کے متن میں بھی اصلاح کر دی ہے -

(حاشیہ مصنف)

منصور اس کے بعد حقیقت اعیان و صفات کل اور دنیا سے قطع تعلق پر اپنے خیالات سناتا ہے ۔ اس کے بعد ایک بوڑھا ، جو واصلین میں سے تھا ، منصور سے سوالات کرتا ہے اور منصور ان کے جواب دیتا ہے ۔ بوڑھا آخر اس کا معتقد ہو جاتا ہے ۔ منصور زور دیتا ہے کہ جہانِ جان طلب کرو اور باقی سب قیل و قال چھوڑو ۔ اپنی خودی سے مر جاؤ اور برقعِ صورت کو اتار کر پھینک دو ۔ دریا سے جواہراتِ معنی رولنا چاہئیں ۔ کشتی کا کیا کرو گے ، وہ محض نمودِ خودی ہے ۔ اسی کشتی نے ہفتاد و دو ملت کو غرق کر دیا ۔ البتہ ایک اور کشتی ہے اور وہ کشتیِ حقیقت ہے ۔ اس میں محمد (صلعم) اور علی (کرم) مقیم ہیں ۔ تم ان کا دم بھرو اور گوہر مراد حاصل کرو[1] :

ز دریا جوی دریای معانی
ز کشتی جز نمود خود ندانی

درین کشتی بسی گشتند غرقہ
درین بودند هفتاد و دو فرقہ

یکی کشتی دیگر هست در یاب
دران کشتی حقیقت زود بشتاب

محمد با علی آن جا مقیم است
ازان ذرات کل با ترس و بیم است

دم ایشان زن و هر دو جهان شو
نمودار زمین و آسمان شو

جب منصور یہ باتیں کر چکا ، اٹھا اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہوگیا ، تماشائی حیران رہ گئے ۔ بوڑھے باپ نے ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہوگیا ۔ جب ہوش میں آیا ، سمندر میں کود پڑا اور

---

۱ ۔ پرانی روایات منصور کو شیعہ بیان کرتی ہیں ۔ مجالس المؤمنین میں بھی شیعہ تسلیم کیا گیا ہے ۔ (حاشیہ مصنف)

جان دے دی'۔

منصور سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ تم جو 'راز مطلق' بننے کا دعویٰ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ حق کو میں نے عین مطلق دیکھا ہے ، مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم کو غیب کے حالات کس طرح معلوم ہوگئے اور اپنے قتل کے متعلق تم نے کیسے اطلاع حاصل کرلی ؟ منصور نے جواب دیا کہ میں نے اپنے قتل کی 'نمود' کو دیکھ لیا ہے ، بغداد میں میرا سر برباد ہوگا ۔ یہ باتیں مجھ پر منکشف ہوگئی ہیں ۔ حج کے راستے میں منصور سے یہ سوال کیا گیا تھا ۔ سائل نے دوبارہ کہا : ''غیب کی بات خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لیے مجھ کو تمھاری بات پر یقین نہیں آتا ، البتہ اگر کوئی زبردست شہادت (نمود) دو اور کوئی راز دکھاؤ تو مانوں گا ۔'' منصور نے جب یہ بات سنی ، اپنی نگاہ اس پر جما دی اور کہا : ''تو میری 'دید دید' میں اچھی طرح سے دیکھ کیوں کہ میں وہی ہوں جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے ۔

نظر نیکو کن اندر دید دیدم
کہ من ہستم کہ جملہ آفریدم (صفحہ ۲۴۹)

اب جو سائل نے غور سے دیکھا تو اس کو آسمان ہفتم سے بھی بلند پایا ۔ حیرت و استعجاب سے اس پر محویت طاری ہوگئی اور مست لقا رہ گیا ۔ اہل قافلہ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ پوچھنے لگے کہ اے منصور ! تو نے اس پر کیا کردیا ہے ؟ منصور نے کہا ''میں نے اس کو نور دکھا دیا ہے ، وہ تمام باتوں سے بےخبر ہے اور دیدار مولائی میں مستغرق ہے ۔ اس وقت وہ جسم و جان سے صاف ہو کر دیدار عین العیان میں محو ہے ۔ جب ہوش میں آئے گا ، تب بولنے لگے گا ۔'' یہ کہہ کر اس نے اشارہ کیا اور کہا کہ اب ہوش میں آ جا ۔ وہ مرد ہوش میں آتے ہی اس کے قدموں میں

---

۱ ۔ منصور کی طفلی کی یہ حکایت کسی تذکرے میں نہیں ملتی ۔ (حاشیہ مصنف)

گر گیا اور رونے لگا ۔ بولا "مجھ پر تیرا عین العیان ظاہر ہو گیا ، میں تیرا غلام ہوں، تو سلطان آفاق ہے اور دنیا میں تیرا ہی شور ہے ۔" یہ کہتے کہتے اس نے ایک نعرہ مارا اور جان دے دی ۔ قافلے والوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ان میں جو صورت پرست تھے ، انھوں نے ایک شور مچا دیا کہ اس شخص نے جادو سے کام لیا ، اس لیے قتل کا مستوجب ہے ۔ منصور نے ان سے کہا : "اے گمراہو! میں دیدار الٰہی ہوں ، مجھ میں یہ طاقت موجود ہے کہ تمھارے شور و غوغا کو فرو کردوں لیکن اظہارِ راز کا یہ وقت نہیں کیوں کہ تمھارے درمیان ایک پیرِ واصل موجود ہے ، جو صاحبِ درد ہے ، مجھ کو اس کی خاطر منظور ہے ، لٰہذا تم کو معاف کرتا ہوں ۔" یہ الفاظ کہے اور قافلے والوں کی آنکھ سے غائب ہو گیا[1] ۔

(صفحہ ۲۴۹—۲۵۱)

جوہرالذات میں حکیم ناصر خسرو کا ذکر بھی احترام کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ سلسلۂ کلام یہ ہے کہ خون کی اصل کیا ہے ؟ کہتے ہیں کہ خون کی اصل حیوان اور نبات سے نہیں ہے بلکہ نبات کی اصل فیض ہے اور فیض کی اصل نور ذات ہے اور جان و دل کی اصل قطرۂ خون نہیں[2] ہے ؛ لیکن یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے ۔ تم یوں سمجھ لو کہ فیض نور سے نبات ظاہر ہوتی ہے اور حیوان کو زندگی دیتی ہے ، اس فیض نبات اور وجود حیوانی سے جسم انسانی پیدا ہوتا ہے ۔ حکماء نے اس بارے میں بہت کچھ بحثیں کی ہیں اور اس کی تشریح میں کتابیں بھر دی ہیں لیکن ناصر (خسرو) نے اس سرّ کو معلوم کیا ، یہ حکیم ایک سرّ پاک تھا :

ولیکن کرد ناصر سرّ اظہار
بباید می بسفتن آن بناچار (صفحہ ۳۱۹)

---

۱ - اس حکایت کے متعلق بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ - کیا عطار جیسے فاضل طبیب سے خون کی اصلیت پر اس قسم کی تحقیقات کی توقع کی جاسکتی ہے ؟ (حاشیۂ مصنف)

حکمت میں اس کا کمال عین الیقین کی حد تک تھا ، اس لیے وہ مخلوق سے پوشیدہ ہو گیا ۔ جس طرح حکمت میں سب پر غالب تھا اسی طرح اسرار میں پیش پیش تھا ۔ آخر میں اس نے عزلت اختیار کر لی اور عین ذات و قربت تک پہنچ گیا ۔ خدائے پاک نے اس کی حکمت میں اس قدر ترقی دی کہ اس کو خدائے بیچوں کا دیدار بھی میسر ہو گیا ۔ جب اسے جمال ربانی حاصل ہو گیا ، مخلوق سے متنفر ہو گیا ۔ اس نے دیدار خداوندی کیا اور عین اس کی ذات بن گیا ۔ خدا میں پنہاں ہو گیا اور اس پر تمام راز منکشف ہو گئے ۔ اس کا اکثر بیان عقل اور جان کے متعلق تھا کیوں کہ اس کی عقل اور جان عین العیان تھی ۔ وہ کوہِ قناعت کی طرف چلا گیا اور اس قربت میں پابندِ سلوک رہا اور چھپ گیا ۔ قاف قربت میں پہنچ کر اپنے اوپر دنیا کا دروازہ بند کر دیا اور فنا کا دروازہ کھول لیا ۔ اس قافِ قناعت میں اس قدر رہا کہ حد و برہان کو اس کے وجود سے راحت ملی ۔ دنیا کے اور حکیم اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں ۔ جو شخص قافِ قناعت میں مسکن بنا لیتا ہے ، تین باتیں اختیار کرلیتا ہے : کم آزاری ، کم خوری اور عبادت ۔ اصل مردانہ ہونی چاہیے، پھر تو آدمی ناصر خسرو کی طرح اپنے مطلوب تک پہنچ سکتا ہے :

هر آنکو اندرین قاف قناعت
گریزد پیش گیرد هر سه عادت
کم آزاری و کم خوردن حقیقت
پس آنکه طاعت از عین شریعت
بباید اصل اول همچو مردان
رسد چون ناصر خسرو بجانان (صفحہ ۳۱۹)

جوہرالذات میں منصور اگرچہ ہر وقت مصنف کے پیش نظر ہے ، تاہم اس مثنوی میں خارجی مضامین بھی کافی موجود ہیں لیکن یہ ہیلاج نامہ ہے جو تمام و کمال منصور کے ذکر اور اس کے کمالات و مقالات سے لبریز ہے ۔ اس کتاب میں بڑے بڑے صوفی مثلاً

جنید ، بایزید ، شبلی ، شیخ کبیر عبداللہ خفیف اور عبدالسلام ، منصور کے معتقد اور مداح کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں ۔ وہ باری باری منصور سے اسرار و حقائق پر سوال کرتے ہیں اور منصور اُن کے جواب دیتا ہے ۔ بعض اس کے متعلق متشکک بھی ہیں ، تاہم اس کے سامنے مجالِ دم زدن نہیں رکھتے ۔

شیخ کبیر عبداللہ خفیف شیراز میں رہتے ہیں اور ان کے اور منصور کے درمیان ایک راز ہے ۔ منصور کے تعلقات اُن سے قدیم ہیں اور یہ بھی اس کے سرگرم معتقد ہیں ۔

عبدالسلام ، یہ ایک غیر معروف بزرگ ہیں ، مگر منصور کے بے حد معتقد ۔ اپنے پیر کے کہنے سے منصور کے عقیدت مند ہیں ، اور پیر کو منصور کا راز حضرت خضر کی زبانی معلوم ہوتا ہے ۔

جنید کو منصور کے متعلق کچھ شکوک ہیں ۔ خود براہ راست منصور کے سامنے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور شیخ کبیر سے کہتے ہیں کہ دیکھیے ہمارے زمانے میں بے شمار اولیا ہیں اور ان سے پیشتر بھی گزرے ہیں ۔ وہ سب واصلین میں سے تھے اور خدا کے نزدیک ان کے بڑے درجے تھے ، لیکن کسی نے اناالحق نہیں کہا ۔ سب کے سب ھوالحق کہتے رہے ۔ خود رسول پاکؐ نے ایسا دعویٰ نہیں کیا ۔ رسولؐ نے لوگوں کو شریعت کی دعوت دی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حدود میں قائم رہے ۔ شریعت صرف اسی لیے ہے کہ نیک و بد اور حق و باطل میں تمیز کرے ۔ اب ذرا اس منصور کی کیفیت ملاحظہ کیجیے کہ یہ ہردم ”اناالحق“ کے نعرے لگا رہا ہے ، روشنی اس سے دور ہو گئی ہے کیوں کہ شرعِ محمدی سے بھٹک گیا ہے ۔ عوام الناس جاہل ہیں ، ان کو ہمارے قرب کی کیا خبر ، اس لیے ہر کس و ناکس کے سامنے اس راز کا افشا کرنا قرین مصلحت نہیں

منصورشیخ کبیرکو خطاب کرکے جواب دیتا ہے : ”شیخ کبیر ! تم نے سنا جو جنید نے شرع کے متعلق کہا ؟ مجھ کو بایزید نے مان لیا ،

لیکن یہ نہیں مانتے ، میں ان کو معذور سمجھتا ہوں ، بایزید کے پیر ہوئے تو کیا :

اگر چہ شیخ و پیر بایزید است
ولیکن پختہ و بس نارسید است (صفحہ ۷۳۳)

حالاں کہ تم نے میرے وہ تمام خوارق جو ، میں نے تری و خشکی پر کیے ہیں ، جب کہ ڈھائی سال تک میں اور تم ساتھ رہے ، بیان کردیے ہیں ، اور یہ سب باتیں واقعیت سے تعلق رکھتی ہیں ، لیکن جنید ہیں کہ شرع پیش کرتے اور مجھے دیوانہ قرار دیتے ہیں ۔ یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی 'عین منزل' پر پہنچ گیا ہوں اور تمام حجاب دور ہوچکے ہیں ۔ جب میں "نمودار خدا" ہوں تو انبیا اور اولیا سب کچھ میں ہوں ۔ خدا مجھ سے ہم کلام ہے ۔ کیا رسول اللہؐ سے صرف جنید ہی واقف ہیں ؟ بچہ بچہ جانتا ہے کہ محمد (صلعم) ہمارے ہادی ہیں لیکن حقیقت محمدیہ سے کون واقف ہے ؟ محمد (صلعم) مجھ میں ہیں ۔ در حقیقت وہی میرے رہنما ہیں اور یہ محمد (صلعم) ہیں جو "اناالحق" کہہ رہے ہیں :

محمدؐ می زند در ما اناالحق
همی گوید سراسر سرّ مطلق
وصال مصطفیٰؐ در جان منصور
چو خورشیداست کل نورعلیٰ نور (صفحہ ۷۳۴)

محمد (صلعم) نے جو یہ راز آشکارا نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو دعوت شریعت منظور تھی ۔ اس لیے حقیقت کو آشکارا نہیں کیا اور شریعت ہی بیان کرتے رہے ، حقیقت انھوں نے صرف علیؑ کو بتائی ۔ اگر جنید میرا عین الیقین حاصل کرلیں تو میں انھیں دکھا دوں کہ مصطفیٰؐ مع تمام انبیاء یہاں موجود ہیں :

اگر این جا جنید پاک دینم
بیابد یک زمان عین الیقینم

تمام مصطفیٰ او را درین دم
تمامت انبیاء با دید آدم (صفحہ ۴۳ے)

با یزید ، منصور کے اس قدر عقیدت مند ہیں کہ اپنے آپ اس کا غلام غلامان بیان کرتے ہیں :

تو دیدی آنچہ این جا کس ندید است
غلامی از غلامان بایزید است (صفحہ ۹۰ے)

خود منصور اپنے لیے ایسے دعوے کرتا ہے جو ولایت اور نبوت سے گزر کر ہیت کی حدود میں داخل ہیں :

تعالی اللہ منم منصور حلاج
ہمہ بر رحمت من گشتہ محتاج

تعالی اللہ منم خورشید و اختر
مرا گویند کل ''اللہ اکبر''

تعالی اللہ منم این جا خداوند
وجود خویش از من جملہ پیوند

الست اندر ازل گفتم ابد را
تمام چون نمودم نیک و بد را

خداوندی مرا زیبد کہ دانم
تمامت در یقین راز نہانم

ز صنع آفرینش جملہ پیداست
ز نور ذاتم این جاگہ ہویداست

یکی ذاتم منزہ در ہمہ من
فگندہ در تمامت دمدمہ من (صفحہ ۱۴ے)

بجز منصور این جا نیست اللہ
کہ از اسرار رحمٰن وی آگاہ
خدا منصور و منصور است خالق
وصال اینست این جا ای خلایق

خلائق من خدایم تا بہ بینند
نمودم می‌نمایم تا بہ بینند
خلایق من خدایم در نمودار
ز عشق خویش امروزم برین دار
خلایق من خدایم چند گویم
ہمہ خواہند تا پیولد جویم (صفحہ ٥٧٤)

خود مصنف منصور کے عشق میں اس قدر سرشار ہے کہ اس کا جذبہ محویت اور فنائیت کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں ، اسی کے اسرار بیان کرتا رہوں گا بلکہ یہ منصور ہی ہے جو میری جان میں بول رہا ہے :

بجز حلاج چیزی می‌ندانم
کہ با وی گویم و از وی بخوانم

زنم ہر لحظہ دم از عشق منصور
اگرچہ می‌نماید در دلم شور

مرا تا جان بود در دیر فانی
ہمہ گویم ازو سرّ معانی

ہمہ منصور می بیند درونم
ہمو خواہد بد آخر رہنمونم

حقیقت اوست این دم سرّ گفتار
کہ می‌گوید درون جان عطار (صفحہ ٦٨٨)

ایک نہایت عجیب امر یہ ہے کہ مصنف نے جہاں منصور کو پچاسوں مقام پر خدا کہا ہے، وہاں متعدد موقعوں پر رسول اللہ اور حضرت علیؑ کو بھی خدا کے نام سے یاد کیا ہے :

محمدؐ را شناس این جا خدا تو
وگرنہ اوفتی اندر بلا تو (صفحہ ٣١٠)

علیؑ با مصطفیٰ ہر دو خدایند
کہ دم‌دم راز در جان می‌نمایند (صفحہ ٦٩٣)

علیؑ با مصطفیٰ ؐ ہر دو خدایند
نمودند و دگر کل می‌نمایند (صفحہ ۳۵۰)

تمام مورخین کے بر خلاف مصنف حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا قائل ہونے کے باوجود حضرت اسحاقؑ کی شہادت میں بھی اعتقاد رکھتا ہے :

اگر کشتہ شوی مانند اسحاق
تو باشی بی شکی دیدار آفاق (صفحہ ۳۶۱)
اگر ہم بود اسحاق گزیدہ
ز عشق روی تو شد سربریدہ (صفحہ ۳۶۹)
گہی در کسوت اسحاق گردی
بریدہ سر بخود مشتاق گردی (صفحہ ۳۸۱)
چنان کن خویش را تسلیم مشتاق
کہ سر بریدہ اندر عشق اسحاق (صفحہ ۴۲۴)

جوہرالذات اور ہیلاج نامہ جس قدر مشہور ہیں ، معلوم ہوتا ہے اس قدر پڑھی نہیں گئیں ، ورنہ اُن کی شہرت اب تک ماند ہو جاتی ۔ کتابیں کیا ہیں ، دریاے اعظم ہیں ، جن کی گود میں تیس بتیس ہزار اشعار موجیں مار رہے ہیں ۔ فارسی ادبیات میں شاید اس قدر تھکا دینے والی ، غیردلچسپ ، کند اور دل اچاٹ کر دینے والی کوئی کتاب نہ ہوگی جیسی یہ کتابیں ، جو عطار کی طرف خدا جانے کس گناہ میں دنیا نے منسوب کی ہیں ۔ علمی و ذہنی لحاظ سے اُن کا شمار ادنٰی درجے کی تصنیفات میں ہونا چاہیے ۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود کوشش بلیغ ، میں ان مثنویوں کو پورا ختم نہ کر سکا ۔ نہ مجھ میں ، حالانکہ مجھ کو اقرار ہے کتابوں کے معاملے میں خاصہ تحمل ہے ، اس قدر تاب تھی کہ ان کو پورا پڑھ سکوں ۔ ممکن ہے کہ کوئی اور صاحبِ ذوق جن میں مجھ سے زیادہ استقلال ہے ، ان کے نشیب و فراز اور معلومات سے ہم کو اطلاع دیں ۔

ان مثنویوں میں خوارق ، اسرار اور کرامات کی فضا پیدا

کر دی گئی ہے ، جو بہت کچھ عطار کی واقعیت پسند طبیعت کے منافی ہے ۔ مصنف خواب دیکھنے اور بشارتیں سننے کا عادی ہے ۔ وہی مسائل جن کو شیخ اپنی عقل اور استدلال کے زور سے حل کر دیا کرتے ہیں ، ان مثنویات میں اسرار بن گئے ہیں ۔ معمولی سے معمولی مسئلہ ہمارے مصنف کے نزدیک ایک سرّ ہے اور یہ سرّ بغیر کسی انکشاف کی کوشش کے ایک طویل سمع خراشی کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ پھر کسی اور سرّ کی باری آتی ہے اور اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے ۔ ہر مضمون اس کی علمی اور دماغی استعداد کی بے بضاعتی کا راز الم نشرح کر رہا ہے ۔ عربی اس کو نہیں آتی ، مجھ کو اس کی فارسی دانی پر بھی شک ہے ۔ ہمارا ناظم صرف الفاظ کو وزن کا جامہ پہنانا جانتا ہے ، قافیے کا بھی چنداں پابند نہیں ، مل گیا تو خیر ، نہ ملا تو وزن ہی پر گزارا کر لیا ۔ سلسلۂ بیان غیر مستقل ، طویل اور بے ترتیب ہے ، جیسے کسی مجذوب کی بڑ یا کسی نیم مست کی ہذیان سرائی ۔ جو مطلب اس کو ادا کرنا ہوتا ہے ، اس کے لیے الفاظ نہیں ملتے اور جو الفاظ ملتے ہیں وہ مطلب ادا نہیں کرتے ۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعر اکثر مبہم اور مہمل بن کر رہ جاتا ہے ۔ شاعر کا ذخیرۂ الفاظ بے حد محدود ہے ۔ حالانکہ بتیس ہزار اشعار لکھے ہیں لیکن اس کثیر ذخیرے سے ہم چند نئے لغت بھی نہیں سیکھتے ۔ یہی حالت اس کی معلومات[1] کی ہے ۔ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں قدم قدم پر

---

۱ - ''آیا ممکنست شاعری کہ پیر می‌شود زبان او ہم تباہ می شود ؟ کلمات فصیح ما فراموش کند ، فکر او چنان پریشان و بی چارہ شود کہ در اطالۂ لاطائل این ہمہ داد پُر گوئی و تہی مغزی بدہد و......یک بیت را کہ ساخت کلمۂ اول آن بیت را گاہی در صد بیت دیگر مکرر بکند ؟ آیا معلومات او ہم از میان می‌رود و آن کسی کے در جوانی آن ہمہ اطلاعات از احوال

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جدید اطلاع دیتے ہیں اور ان کی مثنویاں تاریخی دل چسپی کا قابل قدر سامان بہم پہنچاتی ہیں ۔ لیکن اس بے مایہ شاعر کی جھولی میں جو لحظہ بلحظہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ میں عطار ہوں ، سوائے منصور کی چند حکایتوں کے ، جن کو نہ تاریخ جانتی ہے اور نہ روایت پہچانتی ہے ، جدید معلومات کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں ۔ جو مطلب ایک شعر میں کہا جا سکتا ہے ، شاعر اسی مطلب کو دس شعر میں ٹھٹک ٹھٹک کر اور رک رک کر بیان کرتا ہے ۔ اس طرح حشو و زوائد نے ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی ہے اور طوالت ان مثنویوں کا عام جوہر بن گئی ہے ۔ ان کتابوں کا بدترین پہلو ایک ہی خیال کی بار بار تکرار ہے ، جس سے قاری نہ صرف اکتا جائے گا بلکہ دق ہو جائے گا ۔ وہی ایک بات ایک دفعہ نہیں کہی گئی بلکہ دس مرتبہ ۔ اس پر بھی قناعت نہیں ، دس مرتبہ اور تکرار کی ، چند ورق لوٹیے تو بیس مرتبہ پھر وہی خیال دہرایا گیا ہے ۔ اشعار کیا ہیں ، پلٹنیں ہیں ، جو الگ الگ وردی پہنے کھڑی ہیں ، مثلاً :

ز شاگردان خود آگاہ می‌باش
و لیکن از درون با شاہ می باش

ز شاگردان نظر کن راز بیچون
کہ ایشانند نور هفت گردون

(صفحۂ گزشتہ کا بقیۂ حاشیہ)

بزرگان تاریخ و مردان تصوف در اسرار نامہ و مصیبت نامہ و الہی نامہ و منطق الطیر آوردہ است ، چنان یکسرہ اینها را فراموش میکند کہ یک کلمۂ از آنهم بمیان نیاورد ؟ آیا در هیچ روزگاری و در هیچ کشوری دیدہ شدہ است کہ پیر شدن این همہ درماندگی در بیان و اندیشہ کسی راہ دهد ؟ آیا پیری قافیۂ غلط و وزن نادرست و حشوهای بسیار قبیح زنندۂ کریہ را هم در ذهن شاعر وارد میکند ۔"

(صفحہ ۱۴۶ ، احوال و آثار عطار از پروفیسر سعید نفیسی) ۔ مرتب

ز شاگردان نظر کن خویش بنگر
ترا بنہادہ سر در پیش بنگر

ز شاگردان نظر کن تا بدانی
کہ از ایشان حقیقت باز دانی

ز شاگردان نظر کن راز بنگر
همی انجام و هم آغاز بنگر

ز شاگردان نظر کن هفت‌گردون
حقیقت بعد ازان سر راز بیچون

(صفحہ ۳۵۹)

میں اسی قدر نمونے پر اکتفا کرتا ہوں ، ورنہ "ز شاگردان نظر کن" کی پلٹن کے ابھی سترہ جوان اور باقی ہیں ۔ میں ناظرین سے استدعا کرتا ہوں کہ ان اشعار کے معنوں پر غور نہ کیا جائے ۔ اگر بالفرض ایسا کیا جائے تو غالب مرحوم کا یہ مصرع بھی یاد رہے : ع

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

کچھ ان اشعار پر حصر نہیں ، تمام کتاب اسی صنعت میں لکھی گئی ہے ۔ ذرا "ترا این جاست" کا رسالہ ملاحظہ ہو :

ترا این جاست زان زیشان ندیدی
تو از آنسان بجانان کل رسیدی

ترا این جاست وصل و روشنایی
حقیقت نور دیدار خدایی

ترا این جاست بود کل مسلم
کہ دیدستی ز خود دیدار آدم

ترا این جاست آدم آشکارہ
تو در او ، او بتو این جا نظارہ

ترا این جاست آدم یا کہ دیدی
کہ در دم دید آدم را بدیدی (صفحہ ۵۰۲)

اس رسالے میں اڑتیس سوار ہیں اور اس کے بعد "دل آگاہ"

کہ توپ خانہ ہے ، جس میں تین اوپر چالیس توپیں ہیں :

دل آگاہ می باید درین راز
کہ در یابد وصال این جایگہ باز
دل آگاہ می‌باید درین جا
کہ این در باز بکشاید درین جا
دل آگاہ می‌باید درین سرّ
کہ اسرارش ہمہ آمد بظاہر (صفحہ ۵۰۴)

اس کے عین بعد ''ہمہ وصلست'' کے بائیس اونچی کھڑے ہیں :

ہمہ وصلست ہجران رفت از پیش
ہمہ جانست مرجان رفت از پیش
ہمہ وصلست و دیدار است این جا
دلت جانان نہ پندار است این جا
ہمہ وصلست و دیدار است بیچون
و لیکن تو شدہ این جا دگر گون (صفحہ ۵۰۵)

الغرض کہاں تک لکھا جائے ، یہی ایک مہیب منظر ہے جس کو ان مثنویوں کا سیاح ہفت‌خوان رستم سے زیادہ دشوار گزار اور ناقابل عبور مانتا ہے ۔

جوہرالذات کی پہلی جلد میں (جو نسبتاً میرے مطالعے میں زیادہ آئی ہے) موقع موقع پر اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں ۔ اور میرے لیے یہ امر موجب حیرت تھا کہ وہی شخص جس کی دماغ سوزی بالعموم ایک مبتذل قسم کی 'تک بندی پیدا کرنے کی عادی ہے ، ایسے نفیس اور عمدہ اشعار لکھ سکے ؛ مثلاً :

الا ای جان و دل را درد و دارو
تو آن نوری کہ لم تمسسہ نارو
تو در مشکات تن مصباح نوری
ز نزدیکی کہ ہستی دور دوری

ز روزن های مشکات مشبّک
نشیمن کرده ای خاک مبارک
زجاجہ بشکن و زینت برون ریز
بنور کوکب دُرّی در آویز
ترا با مشرق و مغرب چہ کار ست
کہ نور آسمان گردت حصار ست
(ز بینایی مدان این فرد فرهنگ[1]
کہ کنجشکی بہ بیند بست فرسنگ)
(صفحہ ۲۹)

یا یہ اشعار :
مگر می‌گرد درویشی نگاهی
درین دریایی پر دُرّ الٰهی

---

۱ - خطوط ہلالی میں نے ڈالے ہیں ، کیونکہ یہ شعر اشعار گزشتہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا - لیکن جوهرالذات کے قلمی نسخوں میں اسی مقام پر ملتا ہے - اسرار نامہ میں شیخ عطار نے اس شعر کو مع اسی قسم کے دیگر اشعار کے حیوانات پر انسانی تفوق کے استدلال میں لکھا ہے ، چنانچہ :

باواز خوش خود سر میفراز
کہ در ابریشم و نی هست آواز
خوش آوازی بلبل از تو بیش است
کہ سرمست خود و آواز خویش است
ز شنوایی خود چندان مخروش
کہ بانگی بشنود ده میل خرگوش
ز بویایی خود رو قصہ کم گوی
کہ از یک میل موشی بشنود بوی
تو گر بیشی ازین جملہ ازانی
کہ بس گویا و بس پاکیزه جانی

(حاشیہ مصنف)

کواکب دید چون دُرّ شب افروز
که شب از نور ایشان بود چون روز
تو گفتی اختران استاده الدی
زبان خاکیان بکشاده الدی
که هان ای غافلان هشیار باشید
برین درگه شبی بیدار باشید
چرا چندین سر اندر خواب آرید
که تا روز قیامت خواب دارید
رخ درویش بیدل زان نظاره
ز چشمش در فشان شد چون ستاره
خوشش آمد سپهر کو ز رفتار
زبان بکشاد چون بلبل به گفتار
که یارب بام زندانت چنین است
که گویی چون نگارستان چین است
ندانم بام ایوانت چسانست
که زندان تو باری بوستانست (صفحہ ۱۹۰)

اب ان اشعار اور ان مہمل اشعار میں ، جو ٹھیک ان سے پہلے درج ہوئے ہیں ، رات دن اور زمین آسمان کا فرق ہے ۔ میں شروع ہی سے ان کو کالاے دزدیدہ مانے ہوئے تھا ۔ آخر اسرار نامۂ عطار میں ان کا سراغ مل گیا ۔ یہ ابیات اسرار نامۂ عطار ، طبع ایران کے صفحہ ۳۰ اور صفحہ ۱۱۱-۱۱۲ پر ملتے ہیں ۔ ان کے علاوہ متعدد مقامات[1] اور ہیں جہاں تین تین ، چار چار ، پانچ پانچ اشعار اسی اسرار نامہ

۱ - ذیل میں بعض ایسی اور مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں جن میں صرف شمار صفحات و اشعار پر قناعت کی جاتی ہے :
جوہر الذات ، صفحہ ۴۴ ، اشعار ۱،۲،۳،۴ -
،، صفحہ ۵۰ ، اشعار ۱۳،۱۴،۱۵ -

(بقیۂ حاشیۂ اگلے صفحے پر)

سے لیے گئے ہیں ۔ بخوف طوالت ان کی فہرست پیش کرنے سے گریز کرتا ہوں ۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان مثنویوں میں جو بہتر اشعار ہیں ، بیرونی ہیں اور اسرار نامہ کا تو اس قدر ناس کیا گیا ہے کہ نا گفتہ بہ ہے ۔

جب ہم ان کتابوں کا عطار کی دیگر تصنیفات سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں اس قدر نمایاں اور زبردست فرق دیکھتے ہیں کہ ہمیں اُن لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو انھیں عطار کی تصنیف مانتے ہیں ۔ 'ابا' 'ابر' اور 'ابے' عطار نے اپنی تصنیفات میں استعمال نہیں کیے ۔ 'جاگہ' 'حقیقت' وغیرہ عطار کے تکیہ کلام نہیں ۔ اسرار نامہ عطار نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھا ہے ۔ جوہرالذات اور ہیلاج نامہ اگر در حقیقت انھی کی یادگار ہیں تو اسرار نامہ کے بعد لکھے گئے ہوں گے ۔ اب ایک شصت سالہ پختہ کار شاعر جو ضرورت سے زیادہ پُر گو ہے اور جس کو مضامین اس افراط کے ساتھ سوجھتے ہیں کہ وہ اُن کی کثرتِ آمد سے نالاں ہے ، اس دور کی تصنیف میں اس قدر بدل جائے گا کہ بالکل نئی زبان اور نئی روش اختیار کر لے گا ، اس کی شاعری اس قدر پھسپھسی ، گھٹیل اور کوفت پیدا کرنے

(صفحہ گزشتہ کا بقیہ حاشیہ)

جوہرالذات صفحہ ۵۰ ، اشعار ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲ ۔
״ صفحہ ۱۷ ، اشعار ۲۲، ۲۳، ۲۵ ۔
״ صفحہ ۲۹ ، اشعار ۲۹، ۳۰، ۳۱ ۔
״ صفحہ ۱۸۰ ، اشعار ۱۷، ۱۸ ۔

اسرار نامہ ، طبع ایران ، صفحہ ۴۵ ، ابیات ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ ۔
״ ״ صفحہ ۱۴۸ ، ابیات ۱۳، ۱۴، ۱۷ ۔
״ ״ صفحہ ۸ ، ابیات ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴ ۔
״ ״ صفحہ ۸۰ ، ابیات ۶، ۷، ۸ ۔
״ ״ صفحہ ۱۲۳ ، ابیات ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۔
״ ״ صفحہ ۹۵ ، ابیات ۲، ۵ ۔

اس دزدی کا دائرہ ابھی اور وسیع ہے ، تلاش سے متعدد مقامات اور نکل آئیں گے ۔ (حاشیہ مصنف)

والی ہو جائے گی جس سے انسانوں کی طبیعت مکدر ہونے لگے۔ وہی شاعر جس کا خسرو نامہ ، نظامی کی "شیریں و خسرو" کے ہم پلہ مانا جا سکتا ہے ، بعد میں ایسی مبتذل شاعری اختیار کر سکتا ہے ، میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔

شیخ عطار، حسین بن منصور حلاج کے مبسوط حالات اپنے تذکرے میں لکھ چکے ہیں ۔ وہ اگرچہ حسین کو عبداللہ خفیف ، شبلی اور ابو القاسم کی شہادت پر کاملین میں شمار کرتے ہیں ، تاہم کوئی غیر معمولی عقیدت اس کی نسبت نہیں جتلاتے ۔ تذکرے کے علاوہ مثنویات میں بھی کئی موقعوں پر اس کی حکایات ملتی ہیں ، ان میں بھی حسین کو کوئی خاص احترام نہیں دیتے ۔ لیکن جوہرالذات اور ہیلاج نامے میں حسین کو ایک ایسے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس کے سامنے جنید اور شبلی جیسے درخشاں آفتاب ، شمعِ بے نور معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ اس طاقت ور ہستی سے ادنلی ادنلی سوالات پوچھتے ہیں اور آخر میں اس کے معتقد ہو جاتے ہیں ۔ منصور کو اپنے خوارق پر ناز ہے اور اس کے دعاوی اس قدر بلند ہیں کہ استغراق ، محو اور محویت کے خطِ حد بندی کو توڑ کر حلول اور اتحاد کی ارض ممنوعہ میں داخل مانے جا سکتے ہیں ، حالانکہ خود عطار ہمیں اطلاع دے چکے ہیں کہ زنادقہ کا ایک ایسا گروہ بھی ہوا ہے جو اتحادی اور حلولی ہیں اور جنھوں نے اپنے آپ کو "حلاجی" مشہور کیا ہے ۔ وہ اگرچہ اس کے اقوال کو سمجھے نہیں ، لیکن اس کے قتل اور جلائے جانے پر فخر کرتے ہیں ۔ چناں چہ بلخ میں دو شخصوں کا وہی حشر ہوا جو منصور کا ہوا ۔ میرا خیال ہے کہ عطار بحیثیت تذکرہ نگار اہل اللہ کے حالات اور زمانوں سے بخوبی واقف تھے ۔ یہ مان کر اگر وہ جوہرالذات اور ہیلاج نامہ لکھتے تو ظاہر تھا کہ ایسے صریح اغلاط مثلاً منصور اور بایزید کی گفتگو کے بے سرو پا واقعات نہیں لکھتے ، حالانکہ بایزید کی وفات کا واقعہ ۲٦۱ ہجری یا ۲٦۴ ہجری میں پیش آتا ہے ، اور منصور ۳۰۹ھ میں دار پر چڑھا۔

جاتا ہے ۔ پھر لطف یہ ہے کہ بایزید کو جنید کا مرید بتایا جاتا ہے ۔ ان دونوں بزرگوں میں بایزید اقدم ہیں اور شیخ عطار ہم کو اطلاع دیتے ہیں کہ جنید بایزید کے اس قدر معتقد تھے کہ کہا کرتے تھے : "بایزید کا ہماری جماعت میں وہی مرتبہ ہے ، جو حضرت جبرئیل کا ملائکہ میں ہے" ۔ یہ اور دوسری صریح غلط بیانیاں جو ان کتابوں کے اوراق میں نظر آتی ہیں ، عطار کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں ۔

حکیم ناصر خسرو اسماعیلیوں کا داعی ہونے کی بنا پر ، نیز سیاسی وجوہ سے اُن ایام کے خراسانیوں میں ، جو اکثر حنفی اور شافعی تھے ، نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ اس لیے بہت کم مصنفوں نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ محمد عوفی نے شاعر کی حیثیت سے بھی "لباب الالباب" میں اس کا ذکر نہیں کیا ، نہ شیخ عطار نے اپنی مثنویات میں اس کا ذکر آنے دیا ۔ لیکن جوہرالذات میں اس عظمت کے ساتھ اس کا ذکر آتا ہے کہ ایک طرف حکماء کا سرتاج اور دوسری طرف ولیِ کامل دکھایا گیا ہے ۔ دشمنوں کے خوف سے حکیم موصوف یمگان میں آ کر پناہ لیتا ہے ۔ اس واقعے کو حکیم کے ذوقِ سلوک اور گریز از خلق کے نام سے تعبیر کیا ہے :

در آخر حکمتش افزود بی چون
خدا را باز دید او بی چہ و چون

خدا را باز دید او آخر کار
گریزان شد ز خلق او کل بہ یک بار

خدا را باز دید و ذات او شد
کہ این معنی یقین ذات او بد

در آن قربت کہ بودش حد و امکان
سلوکی کرد و خود را کرد پنہان

بسوی قاف قربت رفت و بنشست
در از عالم بروی خود فروبست

(صفحہ ۳۱۹)

حکیم موصوف نے ان ایام میں جس قسم کا سلوک اختیار کیا تھا ، اس کی حقیقت اُن قصائد سے ظاہر ہوتی ہے ، جو اس نے عزلت نشینی کے زمانے میں لکھے ہیں اور بغضِ نواصب، و مدحِ مستنصر اسماعیلی کی آوازوں سے گونج رہے ہیں ۔ یہ قصیدے آج بھی موجود ہیں اور چھپ چکے ہیں ۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت میں ڈال دینے والا یہ امر ہے کہ جہاں عطار نے جنید کو با یزید کا پیر بنا دیا اور ناصر خسرو کو ولی کامل مان لیا ، وہاں وہ حسین بن منصور کا نام بھی بھول گئے اور اسی عام غلطی کے شکار بن گئے ، جس میں شعرائے ایران مولانا رومی کے زمانے سے مبتلا ہیں ۔ جوہرالذات اور هیلاج نامہ میں حلاج کا نام منصور بتایا گیا ہے ، جو بالکل غلط ہے ۔ اس کا نام حسین ہے اور منصور اس کے باپ کا نام ہے ۔ شیخ عطار اپنے تذکرے میں ہمیشہ اس کو حسین کے نام سے یاد کرتے ہیں یا بعض وقت حلاج کے خطاب سے پکارتے ہیں لیکن کبھی منصور کے لفظ سے یاد نہیں کرتے ۔ ان کی مثنویوں میں بھی منصور کی کئی حکایتیں ملتی ہیں ، مثلاً منطق الطیر :

چون شد آن حلاج بر دار آن زمان
جز انا الحق می نرفتش بر زبان

(الٰہی نامہ ، کلیات صفحہ ١١٠٥)

چو ببریدند ناگہ بر سر دار
سر و دو دست حلاج آن چنان زار

(الٰہی نامہ ، کلیات صفحہ ٨٢١)

پسر را گفت حلاج نکوکار
بہ چیزی نفس را مشغول می دار

(اسرار نامہ ، کلیات صفحہ ٩١١)

بشب حلاج را دیدند در خواب
بریدہ سر ، بکف در جام جلاب

(صفحہ ٣٥ ، طبع ایران)

یہاں ہر موقعے پر حلاج کے نام سے یاد کیا ہے ۔ قصہ مختصر یہ بعض وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں کتابوں کو عطار کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں ۔

مولانائے روم کے "سخنان" کے حوالے سے جامی نے ایک روایت لکھی ہے کہ نور منصور ڈیڑھ سو سال بعد شیخ عطار کی روح پر تجلی کر کے اُن کا مربی بن گیا ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس روایت کے زیر اثر مثنوی جوہرالذات وغیرہ تصنیف ہوتی ہیں اور یہ کوئی تنہا اقدام نہیں ہے ، بلکہ اشترنامہ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہے ۔ روایت بالا کی تصدیق دیباچۂ ہیلاج نامہ سے ہوتی ہے ، جہاں منصور کے پیکرِ مثالی کی آمد کا مفصل مذکور ملتا ہے ۔ چونکہ ان مثنویوں میں عطار کی شہادت کا علی التواتر ذکر آتا ہے بلکہ خود حضرت علی کرم‌اللہ وجہہ خواب میں آ کر شہادت کی بشارت دیتے ہیں کہ "منصور نے ہمارے اسرار کھولے ، سزا پائی ، جو منصور نے کیا وہی تم نے کیا ، اس لیے ہم تم کو جام شہادت پلائیں گے ۔" اس بنا پر ضروری ہوا کہ شیخ کی شہادت کے اثبات میں کوئی چیز لکھی جائے ۔ چناں چہ بے سر نامہ[۱] مرقوم ہوا ۔ یہ یاد رہے کہ جوہرالذات میں منصور کی طرح اہل ظاہر کے ہاتھوں شہید ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے :

بخواهم کشتنت مانند حلاج
نهم بر فرقت این جا هم چو او تاج (صفحہ ۶۹ب)
ز عشقت آگهم ای برتر از نور
که خواهم رفت بر دارت چو منصور (صفحہ ۳۲۶)

---

۱ - 'بے سر' سے مراد عطار ہیں ، چناں‌چہ ہیلاج نامہ میں بھی ایک موقعے پر اسی نام سے پکارا گیا ہے :

سر افرازی کن ای بی سر در آخر
که این جا نیستت هم سر در آخر (حاشیۂ مصنف)

اس لیے یہ سرنامہ اسی عقیدے کی صدائے باز گشت ہے ، لیکن موجب حیرت یہ امر ہے کہ اہل ظاہر نے یہ تہمت اپنے سر سے ہٹا کر تاتاری وحشیوں کے سر منڈھ دی ، جس سے اہل ظاہر و اہل باطن کی روایات کے اختلاف نے ہمارے نزدیک بہ الفاظ صاحب جوہرالذات ایک ''سر'' کی شکل اختیار کرلی ہے ، اور میں اکثر سوچتا رہا ہوں کہ اس فرضی عطار کی یہ آرزو :

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من جلوہ دھم بار دگر دار و رسن را

کبھی قوہ سے فعل میں بھی آئی یا نہیں ۔

شیخ فرید الدین عطار اگرچہ کسی نئے مذہب کے بانی نہیں اور نہ کسی جدید فرقے کے پیشوا ہیں ، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ان کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مختلف فرقوں نے ان کو اپنی اخوت کا رکن بنانے کی کوشش کی ہے ۔ جوہرالذات میں فنافی المنصور کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں ، مظہر العجائب میں ایک اثنا عشری شیعہ کے لباس میں پیش کیے گئے ہیں ، حیدر نامہ میں انہیں حیدری بنانے کی کوشش کی گئی ہے ، لیکن ان کی تصنیفات جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہیں ، یہ ہیں[1] :

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) پند نامہ (۴) دیوان (۵) تذکرۃ الاولیا (۶) خسرو نامہ (۷) شرح القلب (۸) منطق الطیر (۹) مصیبت نامہ (۱۰) مختار نامہ ۔

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی عطار کی تصنیفات کی بابت لکھتے ہیں :
''اسرار نامہ و الٰہی نامہ و پند نامہ و خسرو نامہ و دیوان قصاید و غزلیات و مختار نامہ و مصیبت نامہ و منطق الطیر و تذکرۃ الاولیا ازوست و سہ کتاب دیگر ہم داشتہ است بنام مظہرالصفات و جواہر نامہ و شرح القلب کہ معلوم نیست از میان رفتہ است یا نہ ۔''
(مقدمۂ احوال و آثار عطار از سعید نفیسی) (مرتب)

رہیں باقی پچیس کتابیں ، ان میں چودہ غیرِ عطار ثابت ہو چکی ہیں ، باقی کتابیں یہ ہیں :

(۱) اخوان الصفا (۲) اشتر نامہ (۳) بلبل نامہ (۴) حقائق‌الجواہر (۵) حیدر نامہ (۶) سیاہ نامہ (۷) لسان الغیب (۸) کنزالبحر (۹) نزہت الاحباب (۱۰) ولد نامہ (۱۱) ھفت وادی ۔

ان میں اشتر نامہ ، بلبل نامہ ، نزہت الاحباب اور ھفت وادی میری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان کا تبصرہ بعض وجوہ کی بنا پر سر دست ملتوی کرتا ہوں ۔ لسان الغیب اور حیدر نامہ اگرچہ میری نظر سے نہیں گزریں لیکن یہ دونوں کتابیں علی‌الاعلان مجعول مانی جا سکتی ہیں ۔ یہی کیفیت حقائق الجواہر کی ہے ۔ کنز البحر اور کنزالاسرار اصل میں ایک ہی کتاب ہے ۔

کمال اسماعیل

قولہ : ”ان کے والد جمال الدین عبد الرزاق مشہور شاعر تھے . . . .
ان کے دو بیٹے تھے : عبد الکریم اور اسماعیل ۔“

(شعر العجم ، صفحہ ۱۷ ، جلد دوم ، معارف پریس ، اعظم گڑھ)

لیکن خود کمال کے ایک قصیدے سے ، جو اس نے اپنے والد جمال الدین کی وفات کے وقت رکن الدین صاعد بن مسعود کی مدح میں لکھا ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ جمال نے چار بچے اپنے بعد چھوڑے ۔ چناں چہ :

سپہر قدرا اصغا کن از طریق کرم
حکایت من خستہ روان زیر و زبر

چہ شرح شاید داد از حقوق آن مرحوم
کہ ہست نزد تو چون آفتاب بل اظہر

دریغ الحق ازان گونہ داعی مخلص
کہ بی ہوای تو جان را نخواستی در بر

بر آستان تو کردہ سفید موی سیاہ
بداستان تو کردہ سیہ رخ دفتر

ہزار درّ یتیمند باز ماندہ ازو
کہ جز ز عقد مدیح تو نیست شان زیور

چو گرگ مرگ بناگہ شبان این رمہ برد
ز بہر این رمۂ بی شبان توی غمخور

بزرگ حتی اگر گوش باز خواهی داشت
بچشم لطف درین چار طفل خورد نگر

(صفحہ ۹۷ ، کلیات[1] اسماعیل ، طبع بمبئی)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار بچے کمال کے علاوہ ہیں جو بظاہر خلف اکبر ہیں ۔

قوله : ''اسماعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کیے تھے ، لیکن شاعری کا مذاق خاندانی تھا ، اس لیے اسی طرف توجہ کی اور اس میں کمال پیدا کیا ۔''

(شعر العجم ، جلد دوم ، صفحہ ۱۷ ، طبع معارف پریس)

ان کے بعض ابیات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار بھی علما میں تھا بلکہ اسی جرگے میں ملازم بھی تھے ، ایک قصیدے میں کہتے ہیں :

نیست پوشیدہ کہ در عہد صدور ماضی
رخت در مدرسہ آورد ز دکان پدرم
از کرم عذر چہ خواہی کہ در ایام تو من
از میان علماء رخت ببازار برم

(صفحہ ۱۰۵ ، ایضاً کلیات)

دیگر

عالم و شاعر و فقیہ و ادیب
از تو دارند راتب و ادرار
من کہ این ھر چہارم از تو چرا
خوف و تہدید دارم و آزار (صفحہ ۱۸۸)

قوله : ''بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوق گرجستان کو فتح کر کے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے :

---

۱ ۔ اوراق آیندہ میں جہاں کہیں صفحات کا حوالہ دیا ہے ، اسی کلیات طبع بمبئی سے دیا ہے ۔ (حاشیہ مصنف)

حجاب ظلم تو برداشتی ز چهرهٔ عدل
نقاب کفر تو بکشادی از رخ ایمان

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۷ ، جلد دوم ، معارف پریس)

سلطان سنجر سلجوقی کا زمانہ ۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ ہے جو کمال کے زمانے سے صریحاً اقدم ہے - نہ اس نے گرجستان کبھی فتح کیا - شعربالا کمال کے مشہور قصیدے سے ماخوذ ہے جس کا مطلع ہے :

بسیط روی زمین گشت باز آبادان
بہ یمن سایہ چتر خدایگان جہان

اور جلال‌الدین منکبرنی کی مدح میں ہے - چنانچہ

خدایگان سلاطین مشرق و مغرب
کہ آب باغچہ سلطنت دهد بہ‌سنان
جلال دنیا و دین منکبرنی آن شاهی
کہ ایزدش بہ سزا کرده در جهان سلطان

قصیدهٔ هذا ۲۲-۶۲۳ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا جب جلال‌الدین گرجستان کی فتح کے بعد اصفهان آتا ہے - شاعر نے اسی قصیدے میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جو جلال‌الدین کی تاریخ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں - مثلاً اس کا ہندوستان آنا ، ہندوستان سے ایران جانا ، تفلیس پہنچنا اور عیسائیوں سے محاربات وغیرہ -

براق عزم تو گامی کہ بر گرفت از هند
نهاد گام دگر بر اقاصی ایران

کہ بود جز تو ز شاهان روزگار کہ داد
قضیم اسپ ز تفلیس و آبش از عمان

تو عمر نوح بیابی ازانکہ در عالم
عمارت از تو پدید آمد از پس طوفان

تو داد منبر اسلام بستدی ز صلیب
تو برگرفتی ناقوس را ز جای اذان

اگر نبودی سعی تو حلقۂ کعبہ
چو نعل زیر سم خر بماندہ بود نہان
(صفحہ ۱۶ ، کلیات)

قولہ : ''بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہے ۔''
(شعرالعجم ، صفحہ ۱۸ ، جلد دوم : معارف اعظم گڑھ)

اس قصیدے کا مطلع ہے :

دلا بکوش کہ باقی عمر دریابی
کہ عمر باقی ازین عمر بر گذر یابی

میرے پیش نظر اس وقت کلیات کمال قلمی مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ہے ۔ جن اشعار میں شیخ شہاب الدین کا نام آتا ہے ، یہ ہیں :

ازین بزرگان امروز در زمانہ یکی ست
کہ مثل او نہ ہمانا بہ بحر و بر یابی
شہاب ابن عمر سہروردی آن رہ رو
کہ از مسالک او دیو بر حذر یابی
امام و قدوۂ آفاق ثالث العمرین
کہ خاک پایش بر جبہت قمر یابی

اگرچہ شاعر اپنی ارادت کا اظہار کر رہا ہے اور ان کی پیروی میں نجات کا طالب ہے ، تاہم چنداں جوش عقیدت محسوس نہیں کرتا جو ایک خالص الارادت مرید کو اپنے مرشد و ہادی کے ساتھ ہونا چاہیے ۔ کہتا ہے :

بآبروی چنین خواجۂ توسّل کن
مگر رہائی از آتش سقر یابی

مدد ز ہمت او خواہ در ریاضت نفس
چو جنگ دیوکنی یاری از عمر یابی

در بهشت بروی دل تو باز کنند
گر آستانهٔ عالیش مستقر یابی
اگر تو بیخ ارادت فروبری بدرش
ز شاخ تربیتش گونه گون ثمر یابی
ز دامن طلبش بر مدار دست طلب
که هرچه آرزوی تست سربسر یابی
ز خاک پایش تاجی بساز و بر سر نه
که تا ز خیل ملک گرد خود حشر یابی

کمال نہ کبھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، نہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ بغداد گئے ۔ قصیدہٴ ھذا ارادةً بھیج دیا ہے :

کلاه او نه به اندازهٔ سر چو تو نیست
تو جهد کن که بجای کله کمر یابی
چو این مساعدت از دولتت میسر نیست
که بر ملازمت خدمتش ظفر یابی
ز نظم خویش دعای بدان جناب فرست
ز گفتهٔ کرمش بهرهٔ مگر یابی
سعادت ابدی بر سرت نثار کنند
اگر قبولی ازان صدر نامور یابی

(کلیات کمال قلمی)

قولہ : "۶۳۵ھ میں جب اوکتائی قاآن اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا ۔ اس زمانے میں یہ گوشہ نشین ہو چکے تھے ، اور شہر کے باہر ایک زاویے میں رہتے تھے . . . . . گھر میں ایک کنواں تھا ، وہ آن امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا ۔ شہر کی غارت گری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا . . . کنویں میں اترا ۔ زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں ۔ سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہوں گے ، کمال اسمعیل کو پکڑا کہ پتا بتاؤ ، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی ، اس نے

غصے میں آ کر ان کا خاتمہ کر دیا ۔"

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۸ ، جلد دوم ، معارف پریس)

اوکتائی قاآن ۶۲۴ھ و ۶۳۹ھ اصفہان میں کسی وقت نہیں آیا اگرچہ اصفہان کا قتل عام اس کے زمانے میں ہوا ہے ۔ مولانا شبلی کمال کے حالات کے زیر عنوان اس کا سال وفات ۶۲۶ھ بتاتے ہیں ۔ اس موقع پر ۶۳۵ھ تحریر کرتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے ۔

قولہ : "متوسطین اور متاخرین دونوں اس کے معترف ہیں . . . عرفی کہتا ہے :

مرا ز نسبت همدردی کمال غم است
وگرنہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

(شعرالعجم ، صفحہ ۱۹ ، جلد دوم)

مشکل سے یقین آ سکتا ہے کہ عرفی جیسا خودستا اور خود فروش کمال کے کمال کا اعتراف کرے گا ۔ وہ جب کبھی متقدمین کا ذکر کرتا ہے ، اپنے اظہار کمال اور افضلیت کے تعلق میں کرتا ہے ، یا اپنے مقابلے میں ان کو گراتا ہے ۔ انوری اور ابوالفرج رونی کے حق میں کہتا ہے :

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز
بہر چہ غنیمت نہ شمارند عدم را

اور سعدی شیرازی کے واسطے لکھتا ہے :

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود
گر نبود آگہ کہ گردد مولد و ماوای من

اور خاقانی کے تعلق میں گویا ہے :

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ بر خیزد
بامداد صبا اینک فرستادم بہ شروانش

ان اساتذہ کے مقابلے میں بھلا کمال کو کیا خاطر میں لاتا ، بلکہ اسی قصیدے میں جس سے علامہ شبلی شعر بالا نقل فرماتے ہیں ،

عرفی کمال کی نسبت کہتا ہے کہ میرے کمال کی نمود پر کمال کی نظموں کی قبولیت کو بڑا نقصان پہنچا ۔ جب شیراز میں مجھ جیسا سرمہ ساز موجود ہے تو یقین ہے کہ عقل انسانی سرمۂ صفاہانی کو آنکھوں میں جگہ نہ دے گی :

بعہد جلوۂ حسن کلام من اندوخت
قبول شاھد نظم کمال نقصانی
کنون کہ یافت چومن سرمہ سازی در شیراز
خرد ز دیدہ کشد سرمۂ صفاھانی

اب ظاہر ہے کہ دونوں شعروں سے کمال کی بے قدری مقصود ہے ، نہ اس کی قدردانی ۔ لیکن مولانا کے نقل کردہ شعر سے عرفی کا مقصد اس مطلب سے ، جو مولانا اخذ کر رہے ہیں ، بالکل مختلف ہے ۔ اس کے لیے ہمیں ناظرین کی توجہ کمال کی زندگی کے ایک واقعے کی طرف ، جس کا عرفی نے اشارتاً ذکر کیا ہے ، مبذول کرنی چاہیے ۔ ایک قصیدے میں جو عرفی نے عبدالرحیم خانخاناں کی تعریف میں بہ فرمایش حکیم ابوالفتح لکھا ہے ، شعر زیر بحث سے قبل یہ شعر آتا ہے :

مدہ بہ راوی ناجنس نامہ ام کہ مرا
درین قصیدہ بروز کمال بنشانی

شاعر اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ میرا قصیدہ کسی غلط خواں راوی کے حوالے نہ کر دینا ورنہ کہیں میرا بھی وہی حشر ہو جو کمال کا ہوا تھا ۔ اس شعر کی شرح میں عرفی کے شارحین کہتے ہیں کہ کمال اسمعیل نے اپنا قصیدہ دربار میں پڑھنے کے واسطے کسی نالائق راوی کے حوالے کر دیا تھا ۔ پڑھتے وقت اس سے ایسی ادائیں سرزد ہوئیں کہ ممدوح نے خفا ہو کر شاعر کے قید کیے جانے کا حکم دے دیا ۔

کمال کے حالات میں اس واقعے کا ذکر نہیں آتا مگر اسی بحر و قافیہ میں اس کے ہاں ایک قصیدہ موجود ہے جس میں شعر ذیل آتا ہے :

اگرچہ شعر ہمان است لیک راوی بد
تبہ کند سخن نیک را ز نادانی

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفی کی تلمیح کسی اصلی بنیاد پر قائم ہے۔

اس پس منظر کے جاننے کے بعد ہمارے نزدیک شعر زیر بحث کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کمال فن کے ساتھ محبت ہونے کی بنا پر غلط شعر پڑھے جانے کی صورت میں رنج ہوتا ہے، ورنہ غلط خوانی سے شعر کا فی‌نفسہ کوئی نقصان نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کمال سے مراد کمال اسمعیل ہے، جیسا کہ علامہ شبلی سمجھے ہیں، تو یہ ترجمانی ہر حال میں مورد اعتراض ہے۔ کمال اسمعیل کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر صحیح شعر خوانی کی ضرورت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

قولہ: ''کسی نے کمال کو برا کہا تھا، اس کے جواب میں کہتے ہیں:

شخصی بد ما بخلق می گفت
ما از بد او نمی خراشیم
ما نیکی او بخلق گفتیم
تا ہر دو دورغ گفتہ باشیم

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ:

نظام بی‌نظام ار کافرم خواند
چراغ کذب را نبود فروغی
مسلمان خوانمش زیرا کہ نبود
سزاوار دروغی جز دروغی

(شعرالعجم، صفحہ ۱۹، انوارالمطابع)

اسی قطعے سے ماخوذ ہے۔''

مخدوم جہانیاں کی ملفوظات جامع‌الکلام مرتبہ ۸۰۱ھ میں، جس کو ان کے مرید محمد بن محمد حسینی ترتیب دیتے ہیں، آخری قطعہ مخدوم جہانیاں کی زبانی حضرت امیر خسرو کی طرف منسوب ہے۔ اس کتاب میں یہ قطعہ حسب ذیل ہے:

مرا سید اجل گر خواند کافر
چراغ کذب را نبود فروغی
مسلمان خواندمش بہر مکافات
دروغی را چہ آید جز دروغی

چوں کہ یہ شہادت اب سے چھ سو سال قبل کی ہے ، اس لیے زیادہ مستحقِ اعتبار ہے ۔

جلال الدین محمد مخدوم جہانیاں ۷۸۸ھ میں انتقال کرتے ہیں ۔

محقق طوسی شعر کے کوچے سے نابلد معلوم ہوتے ہیں ، اگرچہ ان کے مداحوں نے یہ وصف ان کی طرف منسوب کیا ہے ۔ خود محقق معیار الاشعار میں شعر سے اپنی بے ذوقی کے اعتراف میں لکھتے ہیں :

"اعتقاد من آنست کہ اگر کسی را در مبدء فطرت ذوق نباشد ، ممکن باشد کہ بملکۂ عروض او را اکتساب ذوق پیدا شود ۔ و این معانی در خویشتن مشاہدہ کردہ ام ۔"

(میزان الاشعار ، صفحہ ۷۷)

قولہ : "کمال اور محقق طوسی ہم عصر ہیں ۔ کمال کی بلند پایگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجے میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیارالاشعار میں کیا ہے ۔"

(صفحہ ۲۰ ، جلد دوم ، شعرالعجم ، معارف)

ان بزرگوں کی معاصرت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ کمال ۵۶۰ھ کے گرد و پیش میں پیدا ہوکر محقق طوسی کی ولادت کے وقت ، جو ۵۹۷ھ میں ہوتی ہے ، اپنی عمر کے سینتیس سال قریباً ختم کر چکا تھا اور بقول مولانا شبلی ۶۲۶ھ یا ۶۳۵ھ میں انتقال کرتا ہے ۔ محقق کمال کی وفات سے چھیالیس یا سینتیس سال بعد ۶۷۲ھ میں وفات پاتے ہیں ۔

علی ہذا محقق کی عظمت کے لہجے میں کمال کے ذکر کی اصلیت بس اتنی ہے کہ معیارالاشعار میں ایک موقعے پر قصیدے میں تغیرِ ردیف کی بدعت کی مثال میں کمال کا ذکر بدیں الفاظ آیا ہے :

"مثال تغیر ردیف بطریق بدعت آنست که کمال اصفہانی دریں روزگار در قصیدۂ کہ بعضی را ردیف "می آمد" کردہ است و بعضی را "می آید" آوردہ است و مطلع قصیدہ اینست ۔

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می‌آمد
نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آمد

و در موضع تغیر بہ این نوع گفتہ است :

ز بہر فال ز ماضی شدم بہ مستقبل
کہ این ابام[1] چنین خوش گوار می‌آید
ز ہی رسید بجای کہ پیش خاطر تو
ہمہ نہان سپہر آشکار می‌آید"

(صفحہ ۲۸۵ ، زر کامل عیار ، ترجمہ معیار الاشعار ، نول کشور ۱۲۸۹ھ)

اس عبارت سے تو کمال کے واسطے محقق کے احترام کا کوئی پتا نہیں چلتا ۔

یہاں بطور جملۂ معترضہ میں اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ صفحہ ۲۱-۲۲ پر شعرالعجم میں اس قصیدے کے جو سات شعر نقل ہوئے ہیں ، ان کی ردیف میں بجائے "می آید" کے "می آمد" چاہیے ورنہ کمال کے تغیر ردیف کا منصوبہ مہمل رہ جائے گا ۔ یہ ساتوں شعر تشبیب سے تعلق رکھتے ہیں ، جو بصیغۂ ماضی "می آمد" ردیف پر ختم ہوتے ہیں ۔ گریز کے وقت اس نے ردیف بدل دی ۔ بہ صیغۂ حال "می آید" لے آیا اور اشعار ذیل میں اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا :

ردیف شعر دگر کردم از پی مدحش
کہ آنم از پی چیزی بہ کار می‌آمد
ز بہر فال ز ماضی شدم بہ مستقل
کہ این ابام چنین خوش گوار می‌آید

---

۱ ۔ ابام میں میم مفعولی ہے ۔ (حاشیۂ مصنف)

چنانچہ اس کے بعد تمام اشعار میں ''می آید'' ردیف ہے ۔

قولہ : ''شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت ، جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے 'لچوں کی زبان بن گئی تھی ، کمال نے اس کو نہایت لطیف اور 'پر مزہ کر دیا ۔ اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بیہودہ صنف سرے سے اڑا دی جاتی لیکن ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا جس سے ان کے معاش کو تعلق تھا اس لیے وہ اس سے بالکل دست بردار نہیں ہو سکتے تھے ۔''

(شعر العجم ، صفحہ ۲۲-۲۳ ، جلد دوم ، معارف پریس)

اس سے پیشتر دو مختلف موقعوں پر حضرت علامہ انوری کی مہاجات کی دل کھول کر ثناخوانی کر چکے ہیں ۔ ایک موقعے پر ارشاد فرمایا کہ ''ہجو میں وہ نہایت دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا[1]'' دوسرے موقع پر فرمایا کہ ''اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا ۔ ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے ، نادر ، باریک اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں[2] ۔'' لیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہاں وہ اس عزت سے بھی محروم کر دیا گیا ۔ کہتے ہیں کہ ہجو اور ظرافت انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے 'لچوں کی زبان بن گئی تھی اور یہ کمال کا احسان ہے جس نے اس کو لطیف اور 'پر مزہ کر دیا ۔ ع

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

قرون ماضیہ کے اوضاع و اطوار کو چودھویں صدی کے اخلاق معیار سے جانچنے اور ایک کو دوسرے پر ایک قیاسی فضیلت دینے میں ہم سخت غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں ۔ مولانا کا یہ بلند معیار

---

۱ ۔ شعرالعجم ، جلد اول ، صفحہ ۲۶۸ ، معارف پریس اعظم گڑھ ۔
(حاشیہ مصنف)

۲ ۔ ایضاً ، جلد اول ، صفحہ ۲۸۱-۲۸۲ ۔ (حاشیہ مصنف)

غالباً ان کے مغربی دوستوں کی صحبت کا اثر ہے ۔ یاد رہے کہ مغربی مصنفین اس قسم کے اعتراض ہمارے ادبیات پر کرتے ہیں ۔ ان کو خود اپنی قوم کے ادب ماضی کا تجربہ نہیں ۔ عہد قدیم میں ہجو کی دست برد سے کوئی قوم محفوظ نہیں تھی ۔ یونانی اور لاطینی ادبیات میں ہجو نگاری کو پورا فروغ حاصل تھا ۔ خود انگریزی ادب ، اس بارے میں استثنا پیش نہیں کرتا ۔ پرانے شعرا کینیڈی اور ڈنبار ، متاخرین میں پوپ وغیرہم کے ہاں یہ صنف نظم موجود ہے ۔ جب اس حمام میں سب ہی ننگے نہاتے ہیں اور قرون ماضیہ کا مشرق و مغرب ایک ہی سطح اخلاقیات پر قائم ہے تو پھر انوری اور سوزنی کی تشہیر انصاف سے بعید ہے ۔

علامہ شبلی اگر کمال کا کلیات ذرا غور سے ملاحظہ فرماتے تو کمال کے متعلق ان کا حسن ظن زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوتا ۔ اس میں شک نہیں کہ دربار صاعدہ سے چالیس سال برابر تعلقات رہنے کی بنا پر جہاں بوجوہ منصب قضا ، مذہبی رنگ زیادہ غالب تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ زمرۂ علما میں اس کا شمار ہوتا تھا ، کمال نے اپنی ہجوگوئی کی استعداد کو واضح طور پر بے نقاب نہیں کیا ، تاہم کلیات میں کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے کہ ہجو کے میدان میں وہ اپنے کسی ہم ردیف سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا ۔ کمال کے ہاں قاضی کیرنگ بھی آتا ہے ۔ اس کا سوگند نامہ اگرچہ اس کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ مانا جا سکتا ہے ، فحش بیانی سے داغ دار ہے ۔ ضیاء الدین موش کی ہجو میں تو خوب ہی چھینٹے اڑائے ہیں ۔ ہمیں حیرت ہے کہ یہ حیاسوز نظمیں حضرت علامہ کی نگاہ سے کیوں کر اوجھل رہیں ۔ ذیل میں بعض ایسی ہجویں جو موجودہ مذاق پر گراں نہ گزریں گی ، بفحوائے ''خذ ما صفا و دع ما کدر'' درج کی جاتی ہیں :

خواجہ از کبر چون پلنگ آمد
کہ همی با وجود بستیزد

راتق و فاتقش یکی موش است
کز پلیدیش سگ بپرهیزد
هر کرا این بقصد زخمی زد
حالی آن دیگرش برومیزد
هر کجا موش گشت جفت پلنگ
ابله آنکس بود که نگریزد

(کلیات کمال ، قلمی ، مملوکۂ پروفیسر آذر)

دیگر

نکنی رای مردمی هرگز
ور کنی طبع تو به نگذارد
تو خری وز تو خر تر آن باشد
که ز تو مردمی طمع دارد

(ایضاً کلیات قلمی)

مذمت ریش :

تو چنان گشته ای نہان پس ریش
کز تو جز چشم ہیچ چشم ندید
بجز از ریش مردریک تو کس
سر گاؤ را ز پشم ندید

(ایضاً کلیات قلمی)

ایک نااہل سے خطاب :

این چنین دون و بدگہر که توئی
بمنت التفات چون باشد
مردمان سوی مردمی یازند
میل دونان به سوی دون باشد
عقل را جای در دماغ بود
تیز را رہگزار.........باشد

(ایضاً کلیات قلمی)

بخیل کی ہجو :

خواجہ در ماهتاب نان می خورد
در سرای کہ هیچ خلق نبود
سایۂ خویش را کسی پنداشت
کاسہ از پیش خویشتن بربود

بے فیض ممدوح کے نام :

هرچہ گفتم من از مدیح و غزل
بعضی از وی دروغ بد ناچار
هجو تو اختیار ازان کردم
کہ همہ راست باشدم گفتار

کسی افسر کی روانگی کے وقت :

بہ سفر می‌روی برو کہ شدند
از وجودت همہ صفاهان سیر
اجل و گرگ و چاه در راهند
رو ببین روی خویش و یاران سیر
کس ز پهلوی تو نخورد مگر
بخورد شیر در بیابان سیر (کلیات قلمی)

ایک بخیل کی مذمت :

ای ترا جمع گشتہ در رہ آز
همت کوتہ و امید دراز
همہ دندان ز حرص همچون سیر
همہ مغز تو پوست همچو پیاز
دست تو چون دهان گرسنگان
هرچہ در وی نہی نیابی باز
چون گلو می‌فرو بری همہ چیز
وز تو ناید برون مگر آواز

ہجو لکھنے کی دھمکی :

ای صدر روزگار تو دانی کہ مدتیست
تا انتظار خلعت خاص تو می‌کنم
دریاب پیش ازانکہ من ابکار فکر را
تعلیم قاف و دال حروف هجی کنم

کسی ممدوح کو تہدید :

بس کن ای مرد ناخوش احمق
چند و تاچند حیلہ و فن تو
پیش ازینم طمع چو می‌بودی
بعبای ز خز ادکن تو
می فتادم چو خاک و می دادم
بوسہ بر پای تو چو دامن تو
ببریدم طمع بہ یکبارہ
رستم از پارہ نامہ کردن تو
بر نشینم ازین سپس همہ جای
چون زہ پیرهن بگردن تو
هرچہ می خواستم بخواهم گفت
فارغم.........در........زن تو

قصیدہ در هجو ضیاء الدین :

تیزی کہ مغز چرخ ز بانگش فغان کند
تیزی کہ روزگار بدو امتحان کند
تیزی کہ بر بروت هر آنکس کہ بگذرد
خروار هاش حشو شکم در دهان کند
تیزی کہ گر خر نرش آواز بشنود
شرم آیدش کہ بار دگر عان و عان کند
تیزی چنین کہ گفتم و امثال آن هزار
در ریش آنکہ دشمنی شاعران کند

این اختیار کس نکند پس اگر کند
آن خرس روی خر صفت گاؤ بان کند
گرگ کہن ضیای مضل آنکہ چوبکش
اغراء گوسفند بہ خون شبان کند
خطش ز ریش گندہ تر و لفظش از بیان
پس قدح در ائمہ بسیار دان کند
الفاظ بستہ اش ز زبان شکستہ اش
باشد چو سندہ کو گذر از ناودان کند
الحق خوش آیدم کہ ریم در دہان او
خاصہ چو دعوی نسب و خاندان کند
ای بی حفاظ شرم نداری کہ چون توئی
بر اہل فضل بیشی در اصفہان کند
خروار کی دو جو بربودی ولی بہ بین
تا این ہجا کرای دو صد زعفران کند
آن جو خر دگر خورد و شعر من ترا
بر روی روزگار یکی داستان کند

میں نے اس قصیدے کے چند شعر نمونۃً نقل کیے ہیں ۔ اصل قصیدے میں چھہتر شعر ہیں جو اسی رنگ میں چل رہے ہیں ۔ جیسا کہ آخر میں شاعر نے اشارا کیا ہے ، سارا جھگڑا دو خروار جو کا ہے ۔

ایک قصیدے میں ایک مزدقانی کی ڈاڑھی پر طبع آزمائی کی گئی ہے ۔ چند شعر درج ہیں :

آن ریش فلان مزدقانی
ریشست عظیم پاستانی
بسیار چو حادثات گیتی
نا خوش چو بلای ناگہانی

درهم چو دلش ز تنگ عیشی
محکم چو کفش ز سوزیانی

انبوه وگران و زشت و ناخوش
مانندهٔ ابر مهرگانی

برسینهٔ او ز دور کوهی
بر خر نمدیست ترکمانی

از جملهٔ ریشهای گیتی
آن را شاید که ریش خوانی

بس لایق تست اینکه گویند
ریش تو ریم ز پاستانی

کان ریش چنین نمی پسندند
صاحب طبعان این زمانی

زیرا که بهیچ کار ناید
الا ز برای دمنه دانی

ایک مثنوی رئیس لنبان کی مذمت میں لکھی ہے ۔ اس کے ابتدائی اشعار ہیں :

تا زبانم به‌کام جنبان است
در هجای رئیس لنبان است

چه رئیس آن خسیس پر تلبیس
سایهٔ ظلم و سایهٔ ابلیس

آنکه نامش ز شرم پیدا نیست
در بدی و دویش همتا نیست

آن که او پیشوای دزدانست
سرو سرخیل زن بمزدانست

مردکی زشت روی گنده بغل
پای تا سر همه دروغ و دغل

ناحفاظ و گدای و قحبہ زنست
کیسہ پرداز و دزد و نقب زنست

طبع او لوم و شکل نا معلوم
صحبتش شوم و سیرتش مذموم

میں ان مثالوں سے دست کش ہو کر عرض کرتا ہوں کہ کمال کے نزدیک شاعر کے لیے ہجو گوئی ایک لازمی امر ہے جس سے اس کو کوئی چارہ نہیں ۔ اس کی اباحت میں وہ کہتا ہے :

هجا گفتن ارچہ پسندیده نبود
مبادا کسی کالت آن ندارد

هر آن شاعری کو نباشد هجاگو
چو شیری کہ چنگال و دندان ندارد

خداوند امساک را هست دردی
کہ الا هجا هیچ درمان ندارد

چو نفرین بود بولهب را ز ایزد
مرا هجو گفتن پشیمان ندارد

مر این غرزنان را کہ از بخل مفرط
کس امید چیزی ازیشان ندارد

اگر هجو گوئی تو در گردن من
کہ هرگز زبانی بایمان ندارد

قولہ : ”ایک رئیس سے صلے کا تقاضا کیا ہے اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے :

سہ شعر رسم بود شاعران طامع را
یکی مدیح ، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد ، سوم شکر ، ور نداد هجا
ازین سہ بیت ، دو گفتم ، دگر چہ فرمائی

یعنی شعرا پہلے مدح کہتے ہیں ، پھر صلے کی یاد دہانی کے لیے ایک نظم لکھتے ہیں ، اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو

شکریہ لکھتے ہیں ورنہ ہجو۔ میں ان تینوں نظموں سے دو لکھ چکا ہوں ، تیسری کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے۔"

(شعر العجم ، صفحہ ۲۵ ، جلد ۲)

قریباً انھی الفاظ میں یہ قطعہ انوری کی طرف منسوب ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

قولہ : "پہلے ایک شخص کی مدح لکھی ، پھر صلے کا تقاضا کیا ، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی ، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے :

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را
یکی مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد ، سوم شکر ، ورنہ داد ھجا
ازین سہ بیت ، دو گفتم ، دگر چہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہے کہ تین نظمیں لکھتے ہیں ، اول مدح ، پھر قطعۂ تقاضائی جس میں صلے کا تقاضا ہوتا ہے۔ اب ممدوح نے صلہ دیا تو شکریہ ورنہ ہجو۔ ان تین نظموں سے میں دو تو لکھ چکا ، فرمائیے اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔"

(صفحہ ۱۸ ، شعر العجم ، جلد اول ، معارف پریس)

مگر انوری پر حضرت مولانا نے جو ستم توڑا ہے ، یہ ہے کہ انوری کے ذکر میں اسی قطعے کو انوری کی "فحش سے خالی ہجو" کی مثال میں نقل کیا ہے ، اور کمال کے ہاں کمال کی ظرافت کی مثال میں۔ بالفاظ دیگر وہی چیز انوری کے ہاں ہجو ہے اور کمال کے ہاں ظرافت : ع

تا یار کرا خواهد و میلش بکہ باشد

قولہ : "غزل کی نسبت یہ مسلم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے ، جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے۔"

(صفحہ ۲۶ ، شعر العجم ، جلد دوم ، طبع معارف پریس)

یہ جملہ غالباً کمال کی عزت افزائی کے خیال سے لکھ دیا گیا ہے ورنہ اس سے قبل اسی مسئلے کے متعلق حضرت مولانا یوں ارشاد فرما چکے ہیں :

''غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے ، لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں ۔''

(صفحہ ۲۱۰ ، جلد اول ، شعر العجم ، معارف پریس اعظم گڑھ)

اس بیان سے عام غلط فہمی پھیل گئی ہے ۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کمال غزل کا موجد ہے ۔ خود مولانا سید سلیمان ندوی بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں ۔ اس کے متعلق آیندہ ضمیمے میں کسی قدر تفصیل سے بحث آتی ہے ۔ ناظرین اسے ملاحظہ کر لیں ۔

قولہ : ''رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی ، قدما اور متوسطین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ۔''

(صفحہ ۲۷ ، شعر العجم ، جلد دوم)

شعرالعجم کی پہلی جلد میں خیام کی رباعیوں پر انتیس صفحے لکھنے کے بعد حضرت مولانا کے قلم سے یہ جملہ نکلتا ہے ۔ اگر کمال واقعی رباعی میں اتنا با کمال ہے تو موجبِ حیرت ہے کہ اس کی رباعیوں کی اوصاف نگاری میں مولانا نے چند صفحے نہ سہی ، چند سطریں تک لکھنی گوارا نہ کیں ۔ قدما و متاخرین کے بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ اس کی شہرت صرف قصیدہ نگاری کی بنا پر ہے ، نہ رباعی گوئی کی وجہ سے ۔ تذکرہ نگاروں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو اس کی رباعیات کا معترف ہو ۔ یہ مولانا کی کمال نوازی ہے جو خیام ، عطار اورسحابی کے ہوتے ہوئے قدما و متوسطین میں اس کو بے نظیر مانتے ہیں ۔

کمال کے حالات

کمال کے متعلق مزید اطلاع جو اس کے کلیات اور دیگر ذرائع سے حاصل ہوئی ، سطور آیندہ میں درج ہے ۔ اس کا ظہور ایک ایسے

دور انقلاب میں ہوا ہے جب عراق کی سیاسیات کا مطالع غبار آلود تھا ۔ اصفہان اندرونی اور بیرونی شورش و ہیجان کا سکر تھا ، آئے دن نئے نئے فتنے وقوع پذیر ہوتے تھے ۔ خانگی فتنوں میں حنفی و شافعی مذاہب کی باہمی چپقلش تھی ، جس نے بعض اوقات خطرناک نتائج پیدا کیے ہیں ۔ اصفہان کی جامع مسجد ابتدا میں حنفیوں کی ملک تھی ۔ خواجہ نظام الملک نے جو شافعی المذہب تھے ، اپنے وقت میں اس پر شافعیوں کا قبضہ کرا دیا ۔ سلطان محمد نے اپنے عہد میں حنفیوں کو واپس قبضہ دلا دیا ، لیکن بڑی خونریزی کے بعد ۔ قاضی رکن الدین نے اس میں پہلا خطبہ پڑھا[1] ۔ شہر میں شافعی اور حنفی مساوی تعداد میں آباد تھے ، اس لیے ان کی عداوت نہایت آسانی سے ایک خوں ریز جنگ کی صورت اختیار کرسکتی تھی ،جس میں ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اترتے ۔

اصفہان اول اول سلجوقیوں کے زیر نگیں تھا ۔ ان کے زوال پر ان کے غلام اور افسر ہر طرف طاقت ور ہوگئے ۔ علاءالدین تکش نے آخر کار سلطان طغرل کو قتل کرکے عراق پر قبضہ کرلیا ۔ خوارزم شاہیوں کا یہ قبضہ نہ عراقیوں کو منظور تھا ، نہ بارگاہ خلافت کو ۔ اصفہان تکش نے قتلغ اینانج کو دے دیا[2] ۔ ۵۹۳ھ میں خلیفہ نے اپنے وزیر کو بغرض جنگ بھیجا ۔ جب مزدقان میں خوارزم شاہ سے مقابلہ ہوا ، وزیر باجل طبعی مرگیا ۔ فتح کے بعد تکش اصفہان میں آیا اور کچھ دنوں ٹھہرا ۔ اس موقع پر خاقانی نے وہ مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے :

مژدہ کہ خوارزم شاہ ملک سپاہان گرفت
ملک عراقین را ہمچو خراسان گرفت

تکش اپنے فرزند زادہ اریوز خاں بن تغان تغدی[3] کو ایالت

---

۱ ۔ راحت الصدور، مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال صفحہ ۱۸ ۔ (حاشیۂ مصنف)
۲ ۔ جہانکشائے جوینی ، جلد دوم ، صفحہ ۳۳ ۔ (حاشیۂ مصنف)
۳ ۔ جہانکشائے جوینی ، جلد دوم، صفحہ ۳۸ ۔ (حاشیۂ مصنف)

دے کر اور پیغو سپہ سالار سامانی کو اس کا اتابک بنا کر رخصت ہوتا ہے ۔ ۵۹۶ھ میں تکش اپنے فرزند تاج الدین علی شاہ کو عراق کا والی مقرر کرتا ہے اور اصفہان' اس کا مستقر بنتا ہے ۔

۶۱۳ھ میں سعد بن اتابک زنگی عراق کی تسخیر کے خیال سے آیا ۔ علاءالدین خوارزم شاہ سے اس کا مقابلہ ہوا ۔ اتابک اگرچہ بہادری سے لڑا مگر آخر میں گرفتار ہوا ۔ کچھ مدت قید رکھنے کے بعد علاءالدین نے معاہدہ کرکے اسے رہا کر دیا ۔ کمال کے اتابک سے تعلقات اس عہد سے قدیم ہیں ۔ اس اسیری کے زمانے میں اس کی تسلی کےخیال سے شاعر ایک قصیدے میں اتابک سے اس طرح خطاب کرتا ہے :

جہان پناہا معلوم رای انور تست
کہ خلق جز رہ تقدیر رفت نتواند
نگر ز نکبت ایام تنگ دل نشوی
کہ چرخ گہہ بدہد چیز و گاہ بستاند
حطام دلیلی فانی ندارد این مقدار
کہ یاد کردن آن خاطری بشوراند
بسا وظیفہ کہ در ضمن نامرادیہاست
خدای مصلحت کار بندہ بہ داند
ترا عنایت سلطان چو پای مزد بود
فلک ز چنبر حکم تو سر نہ‌پیچاند
اسیر خسرو عالم شدن زبونی نیست
کہ سیل چونکہ بدریا رسد فرو ماند
اگر مہابت سلطان عالمت بگرفت
همت عواطف او زین مضیق برهاند
سخاوت تو خلاص ترا ضمان کردہ است
کشادہ دست سخی پای بستہ کی ماند

---

۱ - جہانکشاے جوینی ، جلد دوم ، صفحہ ۸۵ ۔ (حاشیہ مصنف)

اساس جاہ تو الحمد للہ آن ستد است
کہ نفخ صور ہم از جاش برنجنباند
تن درست تو عذر شکست لشکر خواست
سلامت تو ہمہ نقصہا بپوشاند
ز شاد زی و بلطف خدای واثق باش
کہ کارہا بمراد تو زود گرداند
(کلیات ، صفحہ ۲۶ ، طبع بمبئی)

۶۱۷-۱۹ھ کے مابین سلطان رکن الدین اصفہان آتا ہے ۔ عراق اس کی ولایت تھی ۔ تمام فراری امرا اس کے گرد جمع ہوگئے ۔ قاضی اصفہان کو اس کا آنا ناگوار ہوا ۔ ”قاضی اصفہان نا ایمن گشت ۔ خویشتن کشیدہ کرد و احتیاط و احتراز می نمود ۔“ اس بے اعتمادی کی حالت میں رکن الدین نے شہر میں قیام مصلحت نہ سمجھ کر بیرون شہر خیمے لگا دیے ۔ اس کے سپاہی بہ ضرورت شہر میں آمد و رفت کرتے رہے ۔ قاضی کے اشارے سے شہریوں نے ان پر سنگ و تیر برسائے اور ایک ہزار کے قریب فوجی مقتول و مجروح ہوئے ۔ فوجیوں نے شہریوں سے بدلہ لیا ۔ بالآخر رکن الدین اٹھ کر رے[1] چلا گیا ۔

۶۲۰ھ میں جلال الدین منکبرنی پہلی مرتبہ اصفہان[2] پہنچتا ہے ۔ اس موقع پر کمال اسمعیل مع چند احباب کے اس کے منشی نورالدین سے ملاقات کرنے گیا ۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک سو رہا ہے ۔ نورالدین منشی شراب کا عادی تھا ۔ کمال نے یہ رباعی[3] لکھ کر بھیجی :

فضل تو و این بادہ پرستی باہم
مانند بلندیست و پستی باہم

۱ - جہانکشا ، جلد دوم ، صفحہ ۲۱۰ - (حاشیۂ مصنف)
۲ - جہانکشاے جوینی ، جلد دوم ، صفحہ ۱۵۲ - (حاشیۂ مصنف)
۳ - جہانکشا ، جلد دوم ، صفحہ ۱۵۳ - (حاشیۂ مصنف)

حال تو بہ چشم خوبرویان ماند
کانجاست ہمیشہ نور و مستی باہم

۶۲۲ھ میں جلال الدین منکبرنی دوبارہ اصفہان آتا ہے۔ کہال اپنا مشہور قصیدہ اس کی خدمت میں پیش کرتا ہے :

بسیط روی زمین گشت باز آبادان
بہ یُمن سایۂ چتر خدایگان جہان

سلطان پھر گرجستان چلا جاتا ہے ۔ جب تایماس اور تاینال افسران مغولی کے عراق پہنچنے کی خبر آتی ہے ، جلال الدین منکبرنی ایک مرتبہ اور اصفہان آتا ہے ۔ اسی مقام پر سلطان اور مغولوں میں جنگ ہوتی ہے ۔ عین معرکۂ جنگ میں غیاث الدین ، اس کا بھائی اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے ۔ اس وجہ سے جلال الدین کے لشکر میں بد دلی پھیل جاتی ہے ، تاہم بہادر سلطان نے اپنے جوہر شجاعت دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ۔ آخر اس کو شکست ہوئی ۔ جلال الدین میدان جنگ سے نکل گیا اور کسی کو اطلاع نہ تھی کہ کدھر گیا ۔ مغول اصفہان تک آ کر رے کو لوٹ گئے ۔ سلطان بعد میں اصفہان پہنچ گیا اور ۶۲۵ھ میں واپس گرجستان[1] چلا گیا ۔

یہ چند دھندلے خط و خال ہیں اُن پرآشوب واقعات کے جو اُس منحوس زمانے میں اصفہان پر گزر رہے تھے ۔ یہ خیال کہ کہال کی شاعری کا زمانہ ۵۸۰ھ کے قرب میں شروع ہوتا ہے ، ایک مستحکم اساس پر قائم ہے ۔ ۵۸۲ ہجری کے طوفانِ باد کی نسبت اس کے ہاں بھی صریح تلمیح موجود ہے اور انوری اور ظہیر کی طرح کہال بھی اُس کے وجود کا قائل نہیں ۔ تلمیح ان اشعار میں آتی ہے :

---

۱ ۔ جہانکشای جوینی ، جلد دوم ، صفحہ ۱۶۹ ، طبع یورپ ۔
(حاشیۂ مصنف)

سرفرازا ! منجمان بدروغ
تهمتی بر ستارگان بستند
اثر اندر حسود پیدا کرد
این سخنها که برقران بستند
برد آن را که بردنی بد باد
گرد طوفان برو گمان بستند

کمال کے والد جمال الدین عبدالرزاق ، خاقانی اور مجیر بیلقانی کے ہم عصر ہیں ۔ انھوں نے خاقانی سے قصائد بھی تبدیل کیے ہیں ۔ وہ اصفہان کے قاضیوں کے خاندان صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مدت العمر انھی کی مداحی کرتے رہے ۔ صاعدیہ کا مداح ہونے سے پیشتر ان کا پیشہ دکان داری تھا ۔ کمال کہتے ہیں :

نیست پوشیدہ کہ در عہد صدور ماضی
رخت زی مدرسہ آورد ز دکان پدرم

جمال الدین ایک خاموش اور قانع زندگی بسر کرنے کے بعد ۵۸۸[2] ہجری میں بوڑھے ہو کر وفات پا گئے۔ باپ کی وفات کے وقت کمال کی عمر آنیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن قصیدہ گوئی اس عہد سے قبل شروع کر دی ہے ۔ ابتدائی قصیدوں میں دو جگہ اپنی آنیس سال کی عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

---

۱ - کمال کے ایام میں صاعدیہ خاندان برائے نام سلطان طغرل سلجوق کا محکوم تھا ۔ شاعر قاضی ابوالعلا صاعد بن مسعود متوفی ۶۰۰ھ کو خطاب کر کے کہتا ہے :

پیوستہ باد ازین سال جاہ تو در ترقی
آسودہ دولت تو در ظل شاہ طغرل (حاشیۂ مصنف)

۲ - یہ سال وفات صرف تقی کاشی کے ہاں ملتا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں اگر انھوں نے اس سنہ سے چند سال قبل انتقال کیا ہو ۔ (حاشیۂ مصنف)

مراست ازلدب فضل هفده خصل و هنوز
میان نوزده و بیست می کنم تکرار
(صفحہ ۷۶ ، کلیات اسماعیل ، طبع بمبئی)

سالم ز بیست گرچہ فزون لیست می شود
گردون پیر از بن سی و دو چاکرم

والد کے بعد انہوں نے اپنا آبائی پیشہ یعنی مداحی سنبھالا اور برابر چالیس سال صاعدیہ کی ثناگستری کرتے رہے ۔ سال وفات کے متعلق اختلاف ہے ۔ دولت شاہ کے ہاں ۶۳۵ھ ، مرآت العالم میں ۶۳۹ھ اور خلاصۃ الافکار میں ۶۲۸ھ بیان ہوا ہے ۔ ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر آخری سال صحیح ثابت ہو ۔

کمال کے ہاں ۸۵(۵) ہجری کی ایک تلمیح قاضی رکن الدین کی مدح میں ملتی ہے :

بر تو میمون باد و فرخ کاوفتاد
در سن خمس و ثمالین غـرّۂ ماه صیام

۵۹۰ھ میں سلطان علاء الدین تکش اور سلطان طغرل سلجوق کے درمیان جنگ ہوتی ہے ، جس میں عراق ، خوارزم شاہی سلطنت سے الحاق پاتا ہے ۔ تکش کی مدح میں کمال قصیدہ لکھتے ہیں :

ای ز رایت ملک و دین در نازش و در پرورش
وی شہنشاہ فریدون فـرّ اسکندر منش

مورخین لکھتے ہیں کہ طغرل شراب سے بد مست بھاری گرز لیے شاہنامے کے اشعار پڑھتا ہوا میدان جنگ میں آیا ۔ مخموری اور نشۂ جنگ میں جھومتے ہوئے اس نے گرز اپنے ہی گھوڑے کے سر پر مار دیا ۔ گھوڑا گرا اور اس کے ساتھ ہی طغرل زمین پر آ رہا ۔ دشمنوں نے فوراً پہنچ کر اس کی گردن کاٹ لی ۔ کمال غالباً اسی واقعے کو ذہن میں رکھ کر قصیدۂ بالا میں کہتا ہے :

کرد بر دل خوش تطاولہای رخت خصم لیک
گہ گہش سخت آید از گرز گرانش سرزنش

۶۰۰ھ میں قاضی ابوالعلا رکن الدین صاعد بن مسعود کا واقعۂ وفات پیش آتا ہے ۔ شاعر اس کے فرزند رکن الدین مسعود بن صاعد کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے :

چو سال شش صد در طی انقضا افتاد
رسید دور بدین سرفراز عالی رای
جہان مکرمت و جود رکن دین مسعود
خدایگان شریعت امام راہ نمای

اسی قصیدے میں کمال اپنے متعلق کہتے ہیں :

بہ پیش سروریت نیک روشنست کہ نیست
چو تو مدیح نیوش و چو من مدیح سرای
ولی دو عیب بزرگست این دعاگو را
چہ باشد آن ؟ کہ صفاهانیست و نیست گدای

(صفحہ ۱۱۷ ، کلیات کمال ، طبع بمبئی)

کمال کے نزدیک صفاہانی ہونا گویا عیب میں داخل ہے ۔ اس بیان سے ہم کو ایک جدید اطلاع حاصل ہوتی ہے ، جو یہ ہے کہ اس عہد تک خراسان اور صرف خراسان فارسی زبان اور شاعری کا گہوارہ مانا جاتا تھا ۔ اس صوبے کی زبان ٹکسالی اور شستہ سمجھی جاتی تھی ، باقی علاقوں کی زبان قصباتی شمار ہوتی تھی ۔

قطران طبریزی کے متعلق ناصر خسرو کی رائے اس کے سفرنامے میں محفوظ ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ قطران فارسی میں عمدہ شعر کہتا تھا لیکن اس کو فارسی نہ آتی تھی ۔ کمال کے والد جمال الدین ایک قصیدے میں خاقانی کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ما و تو باری کئیم ز شاعران جہان
کہ خود کسی نام ما ز جمع ایشان برد
وہ کہ چہ خندہ زنند برمن و تو کودکان
گر کسی شعر ما سوی خراسان برد

گویا خاقانی کو اس کی تعلی پر ، جس میں خراسانیوں کی ہم چشمی کا

دعویٰ کیا تھا ، ملامت کی ہے ۔ خاقانی نے ایک موقع پر اپنی طباعی کی بنا پر عراق کو خراسان کے نام سے یاد کیا ہے :

عراقم جلوہ کرد امسال در لشکر گہِ سلطان
کہ بودش ز آفتاب خاطرم لاف خراسانی

خراسان کی آرزو میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس کا پہلا مصرع ہے : ع

بہ خراسان روم ان شاء اللہ

اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی خراسان کے متعلق اس کے ہاں اشارے موجود ہیں ۔

چوں کہ کمال اسماعیل خراسانی نہیں ہے بلکہ اصفہانی ، اپنے صفاہانی ہونے کو وہ عیب شمار کرتا ہے اور اپنی نا قدری کو مد نظر رکھ کر دوسری جگہ کہتا ہے :

بدین جزالت الفاظ و دقت معنی
دریغ و درد اگر بودمی خراسانی

کمال کے قصائد اور قطعے زیادہ تر اسی قاضی رکن الدین مسعود بن صاعد کی شان میں ہیں ۔ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر ، جن سے ہم تاریکی میں ہیں ، قاضی اصفہان چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ کمال رفاقت کرتے ہیں ۔ تین سال تک وطن آنا نصیب نہیں ہوتا ۔ غالباً اکثر یا کچھ زمانہ خوارزم میں بسر ہوتا ہے ۔ کمال نے یہاں کئی قصیدے خوارزمی امرا کی تعریف میں لکھے ۔ منجملہ ایک وہ ہے ، جس کی ردیف برف ہے ۔ لیکن واپسی پر ، جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی ، قاضی صاحب نے ہمارے شاعر کے حق میں کوئی مراعات نہ کی بلکہ الٹی حق تلفی کی ۔ ملازمت سے برطرف کر دیا اور دیگر امداد بھی موقوف کر دی :

زان پس کہ ھزار غصہ خوردم
در بندگیت سہ سال آزاد

گفتم شودم جزایت افزون
چون هر کس را زیادتی داد
افزون نشد این و آن که خود بود
یکبارگی از قلم بیفتاد
از صورت حال خود بدین شکل
دانی که چه آیدم همی یاد
خر رفت که آورد سر وی
ناورد سر و دو گوش بنهاد

دوسرے موقعے پر شکایت کرتے ہیں :

عجب که روی دلت نیست سوی حال رهی
چنین که روی جهان هست سوی ویرانی
تو فارغی ز من و من خود از تو موجودم
که ذره‌ام من و تو آفتاب رخشانی
روا مدار پراگندگی خاطر من
برای نظم معیشت ز فرط حیرانی

(کلیات ، صفحہ ۱۳۳)

اپنے عزل ، افلاس اور ناقدری کے متعلق لکھتے ہیں :

حقوق من همه بگزار چون منی شاید
که یار دوست بد امسال آشنا نبود
بریز خون من و آبروی من بمریز
بجان تو که مرا طاقت جفا نبود
ز بیخ بر مکن آن را که غرس دولت تست
که این ز روی کرم لایق شما نبود
مرا چو خرج فزون گشت دخل کم کردی
مکن کز اهل مروت چنین سزا نبود
عمل تو خرج کنی سیم دیگران ببرند
رسوم قطع فتد جای غصها نبود

برد تقدمہ باری اشارتی فرمای
کہ عزل و تقدمہ با یک دگر روا نبود

(کلیات ، صفحہ ۱۳۰)

یہ شکایت متعدد قصائد میں دیکھی جاتی ہے -

قاضی صاحب ایک مرتبہ اور کسی ناگہانی حادثے کی بنا پر اصفہان کو خیر باد کہتے ہیں - کمال اس مرتبہ ساتھ نہیں جاتے :

سرورا موکب عالیت کہ بادا منصور
دائم آسودہ بد از رحمت داعی این بار
اگر از جمع مہاجر نبد این بار رہی
پای بیرون لنہادست ز حد انصار

قاضی صاحب کی غیر حاضری میں اصفہان پر ایک دور قیامت گزرا - کمال :

ازان ہا کہ در غیبت خواجہ رفت
درین شہر خاصا بر اصحابنا

قتل و غارت شروع ہوئی ، امیروں کو لوٹا ، عورتوں کی عصمت دری ہوئی ، مساجد کی بے حرمتی کی ، مال داروں کو پکڑ کر چار میخ کیا ، شہر کی خندق میں زندوں کو پاٹ دیا - نہ بوڑھوں کو چھوڑا ، نہ بچوں پر رحم کیا - یہ سب مذہبی تعصب کی بنا پر ہوا - ایسی حرکات سے ابخازیوں کو بھی شرم آئے گی - ان اعمال کے باوجود دعویٰ ہے کہ ہم امت رسول اللہ ہیں :

تعصب چہ باشد کہ این رسم و راہ
ندارند ابخازیان ہم روا
چنین رسم و آئین و پس لاف زن
کہ ہستیم ما امت مصطفیٰ

(کلیات ، صفحہ ۱۴۰ ، طبع بمبئی)

اس زمانے میں قاضی صاحب نے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ پر پناہ لی ہے - ان کا فرزند قید ہو گیا تھا - باپ بیٹوں میں پھر

ملاقات ہوتی ہے۔ کمال :

یوسف ز حبس آمد و یعقوب از سفر
گشتند شادمانہ بدیدار یک دگر
آفاق شرع رونق دین دگر گرفت
تا برزد آفتاب لقایش ز کوہ سر
بر تیغ کوہ جای اگر کرد طرفہ نیست
آری عجب نباشد گوہر بہ تیغ بر
تا بندہ وار جای وی از شعب خود کند
بربستہ بود کوہ خود از ابتدا کمر

(کلیات ، صفحہ ۹۵ ، طبع بمبئی)

دیگر

گردن کش است و ثابت و سرسبز کوہ ازانک
روزی دو بود خواجۂ ما در کنار او

(کلیات ، صفحہ ۹۶)

متعدد قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی اپنے دشمنوں کے منصوبوں کو شکست دے کر دوبارہ اپنے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ واپسی پر اپنا محل و دیگر اسلاک کامل بربادی کی حالت میں دیکھتا ہے۔ شاعر اسے تسلی دیتا ہے :

بزرگوارا ! دل تنگ می‌نباید بود
ز نکبتی کہ برین دولت جوان آمد
اگر بکند عدو خاک درگہت چہ شود
کہ کان فضل و کرم در جہان ہمان آمد
چہ نقص ذات ترا از خرابیِ مسکن
خرابہ ہم وطن گنج شایگان آمد
دماغ بود حسود ترا جہان گیری
گرفتن تو مگر زانش در گمان آمد

(کلیات ، صفحہ ۹۳)

کمال کے تعلقات قاضی صاحب کے دربار میں بد سے بدتر ہوتے چلے گئے ۔ قاضی نے اس کے علم و فضیلت ، دنیاے شعر میں اس کی شہرت ، کبرسنی ، سفید ریش ، افلاس و تنگدستی ، کثیرالعیالی کی طرف سے آنکھ پر پٹی باندھ لی ۔ بار بار وہ رحم کی درخواست کرتا ہے ، معافیاں مانگتا ہے ، دشمنوں کی بدگوئی کی تردید کرتا ہے ، پشتینی تعلقات کے واسطے دیتا ہے ، قصیدے سناتا ہے ، قطعے پیش کرتا ہے ، لیکن ظالم قاضی آخر دم تک صاف نہ ہوا پر نہ ہوا ۔ میں بعض اقتباس یہاں درج کرتا ہوں :

زمانہ خود پی کار منست فارغ باش
همین بس است کہ از تو نیافت خط جواز

گرفتم آنکہ مرا نیست هیچ استحقاق
گرفتم آنکہ بدانش ز کس نیم ممتاز

ز من بصورت تمثیل نکتۂ بشنو
بہ لفظ مختصر اندر نہایت ایجاز

اگر ستوری بر آخور جوان مردی
رسد بنوبت پیری بہ روزگار دراز

برون نراندش از پایگاه خود بجفا
گرش ندارد چون دیگران بآلت و ساز

وگر نیاید ازو خدمت رکاب بشرط
ازو علوفۂ معہود هم نگیرد باز

گره ز ابرو بکشا و چشم خشم بہ بند
پس ار تو خواهی کارم بساز و خواه مساز

حقوق بنده بسی هست پیش چشم آور
عتاب و خشم ز حد رفت سوی پشت انداز

(کلیات ، صفحہ ۱۳۵)

دیگر

ششماه شد که بانگ تظلم همی زنم
دادم نمی دهند بمعشاری از عشیر
گیرم که آب و رونق فضل و هنر نماند
دیوار قصر شرع چرا شد چنین قصیر
بسیار خورده ام غم این دولت جوان
اکنون بخور تو هم غم این ناتوان پیر
در عهد نامرادی با زمرهٔ خواص
شبها سمیر بوده ام و روزها سفیر
واکنون که استقامت ایام دولت است
بر طبع تو ثقیلم و در چشم تو حقیر
پشتم دو تا شده چو کمانم بخویش کش
کو پا و پرکه دور بیندازیم چو تیر
بر مدح تو هزینه شدم عمر نازنین
بر درگهت چو شیر شدم موی همچو قیر
با من به نیک و بد دوسه روزی دگر بساز
کین جای عاریت نه بماند به مستعیر
(کلیات کمال ، صفحه ۱۵۹ ، طبع بمبئی)

آخر تعلق کا سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے - کمال کے زار نالے بے کار جاتے ہیں - قاضی بوڑھے شاعر کی دل آزاری کے لیے قرض کے بہانے روپیہ مانگتا ہے - یہ کہتے ہیں :

بر من خسته باز بی موجب
ترشی کرده ای و صفرا نیز
وین که امسال هم برین منوال
می کنی زین حدیث مبدا نیز
لاجرم نیست از سخات مرا
بهره چه زهرهٔ تمنا نیز

زحمت حضرت ارچہ کم کردہ است
هم دران خدمت است این جا نیز
گر تو از بندہ قرض می خواهی
بخطا یا نہ خود بعمدا نیز
هم عفا اللہ بلطف تو کاخر
در شماری گرفت ما را نیز
از تو تشریف بود عیب از ماست
کہ نداریم زر و کالا نیز
ورنہ از بندگان مفلس خویش
قرضی خواست حق تعالٰی نیز

وہ اپنی چہل سالہ خدمات اور اپنے کلیات کی ، جو قاضی اور اس کے والد کی ثناگستری میں تیار ہوا ہے ، یاد دلاتے ہیں ، مگر ہر التجا بے اثر ثابت ہوئی :

مگر کہ مدت دہ سال هست یا افزون
کہ از شماتت اعدا نخوردم آبی خوش
هزار بار مرا عفو کردہ ای و هنوز
نگشت طبع تو بامن ز هیچ بابی خوش
گرفتم آنکہ نہ من بودم آنکہ ساختہ ام
ز مدحت تو و اسلاف تو کتابی خوش
گرفتم آنکہ چہل سال آن نہ من بودم
کہ شب نکردم از اندیشۂ تو خوابی خوش

ہجوم یاس میں کمال اپنا لہجہ بدلتے ہیں اور قاضی کو بد دعا دیتے ہیں :

نگشتہ هیچ مرادی مرا ز تو حاصل
دریغ در سر کار تو رفت هر دو جهان
چنانکہ سعی من از خدمت تو ضائع شد
خدای سعی تو ضائع کناد در دو جهان

اگر قاضی کی ہجو نہیں لکھی تو یہ ان کا قصور نہیں ۔ اس کے حاشیہ نشینوں کو تو نہیں چھوڑا :

گشت یکبار حضرت خواجہ
مجمع ناکسان و بی هنران

روز بازار فضل بود و شد است
جای بازاریان و برزگران

خیمۂ او ز پار دم خر است
که درو حاضرند . . . . خران

نی غلط می‌کنم که حضرت او
با خطر شد ز جمع بی خطران

مصر جامع شد است زانکه درو
جمع گشتند جمله پیشه وران

قاضی کے اہل کاروں کے حق میں کہتے ہیں :

در نگر در صدر دیوان و ببین
خواجگان نو که صف دربسته اند

سربسر بازاریان مختلف
جمع گشته جمله در یک رسته اند

در خور بالش نیند اما هنوز
از پی هم . . . . شایسته اند

موی را نازرده اند الحق جز آنکه
از زنخدان خودش بگسسته اند

نی خطا گفتم جوانانی همه
شاهد و شایسته و بایسته اند

راست پنداری عروسان نوند
بس‌که چست و شاهد و برجسته اند

چهرها شان در قبای سرخ و سبز
همچو گل با غنچه در یک دسته اند

تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے - ہم اگرچہ تمام واقعات سے واقف نہیں ، تاہم کہا جا سکتا ہے کہ کمال بھی اس معاملے میں سراسر بے قصور نہیں تھے -

کمال کا پیری کا زمانہ بڑی تلخی کے ساتھ گزرا ہے ، جس کے لیے اس عہد کے حاکموں کی سختی اور جبر زیادہ ذمہ دار ہے - صاحب عادل شہاب الدین نے ، جس کی مدح میں کمال نے قصائد و قطعات بھی لکھے ہیں ، ان پر کچھ جرمانہ کر دیا ہے اور ضیاء الدین جو اس وزیر کا افسر ماتحت ہے ، اس جرمانے کی وصولی میں بے حد سرگرمی دکھاتا ہے - اس سلسلے میں کمال نے کئی قصیدے لکھے ، صدائے احتجاج بلند کی اور وصولی کے واسطے جو سپاہی (سرہنگ) ان کے گھر پر تعینات ہوئے تھے ، ان کے ہٹانے کی استدعا بھی کی اور ضیاء الدین کی تو (جسے موش کے نام سے یاد کیا ہے) ایسی خبر لی کہ عبید زاکانی کی سطح پر آ گئے - کہا ہے :

بخدائیکہ بر خزینۂ ملک
پاسبان کرد دولت بیدار
کانچہ گفتند حاسدان بغرض
در حق من ز اندک و بسیار
ہمہ کذب صریح و بہتان است
ورنہ از فضل و دانشم بیزار
مفسدان خود کنند تسویلات
تو بخود راہ شان مدہ زنہار
خود چہ کار خزینہ راست شود
از دوسہ کہنہ جبّہ و دستار
نام من در جریدۂ صلت است
در دواوین خواجگان کبار
چون نویسند الدرین دیوان
در وجوہ مصادرات و قرار

تو بزر می خری ثنا زانہا
کہ عیال مننید در اشعار
بخر از من برایگان باری
وین زیان را ز سود کم‌مشار
عوض زر ز من گہر بستان
قیمتی تر ز گوهر شہوار

شاعر نے اس کے بعد موش کی ہجو میں ابیات ذیل لکھے ہیں:

آمدم با حدیث موش کہ او
کرد خبث درون خود اظہار
خود بیندازم از بغل گربہ
کنم از ماجرای موش اظہار
گربہ روزہ دار بود آن موش
هم فریبندہ هم سبک طرار
موش چون منقلب شود شومست
شومی او اثر کند ناچار
ظلم آن بد کہ شیر مردان را
بشکنم پنجہ خرد در پیکار
در خیالم نبد کہ خیرہ مرا
قصد موشی چنین کند افگار
هر کجا موش اژدہا گردد
عندلیبان شوند بوتیمار
خود گرفتم کہ فارة‌المسک است
کہ ز غمازیش نیاید عار
هم بباید شگافتن شکمش
تا برون اوفتد ز او اسرار
بخدائیکہ او ز عطسہ خوک
موش را کرد در جہان دیدار

واجب القتل کرد موشان را
ور بود شان درون کعبه قرار
برسولی که فتوی شرعش
موش را کرد هم طویلهٔ مار
کانچه گفتند مفسدان بغرض
در ضمیر رهی نکرد گذار
بشنو از بنده نکتهٔ شیرین
که خلنده است در دلم چون خار
گرچه دندان موش بس تیز است
تیز تر زان زبان من صد بار
تو بحق نائب سلیمانی
حق هر یک بجای خود بگذار
کار موشان بر آسمان بردی
جانب بلبلان فرو مگذار (کلیات ، صفحه ۱۸۹)

اسی شہاب الدین کے نام ایک اور قصیدے میں کمال کے طاقتور قلم نے سرہنگوں کا خاکہ یوں کھینچا ہے :

جفتی عوان بخانهٔ من سر فرو کنند
هر صبح دم که باز کنم چشم خیر خیر
مریخ هیکلی دو که گر بر فلک شوند
حالی ز سهم شان بگریزد ز خانه تیر
جفتی زمین شگاف بدندان چو گاؤ یوغ
سرهنگ نام شان و لقب منکر و نکیر
فتان و ازرقان و غلیظان که وصف شان
آرد بروی اهل هنر گونهٔ زریر
سر هنگ هفت رنگ که اجرای ذات شان
زرنیخ و نیل باشد و شنگرف و نفت و قیر

ژوپین آبداده درخشان ز دست شان
زان سان که در سیاهی شب صبح مستنیر
گر در خیال دایه کند شکل شان گذر
کودک ز بیم شان نبرد لب بسوی شیر
چشمی چو آبگینه و پیشانی چو سنگ
قدی چو تیر کشتی و ریشی چو بادگیر
روی بسان آتش و موی بسان دود
رنگی چو رنگ طبرخون بوی چو بوی‌سیر
نقش نگین هر دو گران جان وزن بمزد
وصف جمال هر دو عبوس است و قمطریر
رفتار شان چو آتش وگفتار شان چو جنگ
دیدار شان عقوبت و آواز شان نفیر
با این چنین حریف همانا که بعد ازین
شاعر درین دیار نشاید زدن بتیر
(کلیات ، صفحه ۱۹۳)

کسی دوسرے قصیدے میں بھی آوازِ فغاں ایک نئے انداز میں بلند کی جاتی ہے ۔ مخاطب وہی شہاب الدین ہے :

چه دیده ای ز من بی‌نوا که هر ساعت
ز کوی لطف بسوی جفا کنی آهنگ
گہی به تیغ جفای تو عرض من مجروح
گہی بسنگ عتاب تو پای عذرم لنگ
گہی خورم ز خری پای پیل بر سینه
گہی رسد بدل من ز موش زخم پلنگ
چغانه ام که نسازی مرا جز از پی زخم
بهانه ام که نجوئی مرا جز از پی جنگ
چو حاضرم ندهی هرگزم بجز دشنام
چو غائبم لفرستی بمن بجز سرهنگ

چو حلقه بر در من زد یکی ز درگاهت
شود ز بیم رخ کودکان من بی زنگ
چنان که دیو ز زخم شهاب بگریزد
همی گریزم از نام تو بصد فرسنگ

ان کے سلسلۂ معاش کا اب تک ذکر نہیں ہوا۔ ایک ذریعہ تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جس کا ذکر ان شعروں میں کیا ہے:

دارم ز راه شغل و عمل مختصر دهی
از جور دور کاسۂ گردون شده خراب
در عهد دولت تو که بر سنگ می زند
لاله ز بیم معدلتت ساغر شراب
چندین شگفت نیست اگر این خراب را
آرد ظهور عدل تو در باب احتساب

اس گاؤں کا نام غالباً کرم آباد ہے۔ فرماتے ہیں:

حصۂ از کرم آباد که آن حق منست
خود دو سالست که از جور فلک ویرانست
لطف فرمائی بتجدیدش و امضا بنویس
که مرا خود بجهان رسم معیشت آنست

دیگر

بصد حیلت بخون دل بعمری کرده ام حاصل
محقر ملککی ویران وجوه نیم نانی را
ز جور یک دو نامعلوم اینک شد دو سال افزون
که تامن ز ارتفاع آن نکردم تر دهانی را

دوسرے، قاضی کے ہاں جماعت علما میں، جیسا کہ اس سے پہلے مذکور ہوا، ملازم بھی تھے۔ اس کے علاوہ سالانہ غلہ بھی ملا کرتا تھا۔ جوڑے دستار وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے اور اسی واجبی آمدنی اور انعام و اکرام پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ ایک سال گلا ہوا غلہ ان کے ہاں پہنچایا گیا۔ بہت بگڑے اور شکایت میں ایک قطعہ لکھا:

غلہ کامسال خواجہ داد مرا
گر نبد جملہ بود اکثر خاک

خاک مردم خورد ندانستم
کہ خورد مردم ای برادر خاک

کردم اندیشہ تا چرا فرمود
خواجہ با گندمم برابر خاک

آدمی را چو خاک سیر کند
کرد وجہ غذای من بر خاک

کمال کے ڈاڑھی نہیں تھی ۔ صرف ٹھوڑی پر کچھ بال تھے :

زنخم می بلرزد ارچہ مرا
هرچہ مویست بر زنخدان است

(کلیات ، صفحہ ۲۴۰)

جمال الدین کی طرح ان کے بھی چار اولادیں تھیں :

شاعری قانعم بخود مشغول
من و مشتی عیال و طفل چہار

(کلیات ، صفحہ ۱۸۷)

ان میں ایک کا نام علی تھا ، جو قاضی کے ہاں کسی خدمت پر ملازم تھا ۔ اس کے سالانہ مرسوم کی طلب میں قاضی کی خدمت میں لکھتے ہیں :

از جنایت کہ نیست خالی ازو
هرچہ رسم کمال می‌دارد
بندہ زادہ علی اسماعیل
طمع رسم سال می‌دارد

(صفحہ ۲۵۰ ، کلیات)

غالباً اسی فرزند کی سفارش میں اسے ملازم کراتے وقت لکھا ہے :

توقع است کہ این بندہ زادۂ خود را
کہ داغ بندگی از جد و از پدر دارد

بشرط تربیت از من قبول فرماید
بزبده خانهٔ خاصش ز لطف بسپارد

ایک فرزند ، جو کسی قافلے کے ساتھ سفر کو گیا تھا ، واپسی کے وقت اتفاقیہ کسی ندی میں ڈوب جاتا ہے ۔ اس کا مرثیہ کلیات میں موجود ہے :

شرط همراهی نبد کان سایه پرورد مرا
باز پس ماندند و خود با شور و شر باز آمدند

ناگهان در نیمه ره طفل جهان نادیده را
در خطر بگذاشتند و با بطر باز آمدند

گوهری کش جان بها بود اندر آب انداختند
وز برای حفظ رخت مختصر باز آمدند

قرة العین مرا تنها بجا بگذاشتند
در بیابانی و خود با یکدگر باز آمدند

دوستان و یارکان از بهر استقبال او
همچو من بر پای رفتند و بسر باز آمدند

آه ازان ساعت که همزادان او باچشم تر
بی برادر خون چکان پیش پدر باز آمدند

نازنین خویش را با بار و خر کردم براه
باز نامد نازنینم بار و خر باز آمدند

بر لب جوی فروبردند سروی را بخاک
مرغ و ماهی از برش زیر و زبر باز آمدند

چون بدیدند آن جوان را زیر آب و زیر خاک
پس بر ما غنچه آسا جامه در باز آمدند

لڑکوں کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں ۔ دوسری لڑکی کی پیدائش کے وقت بڑے رنج و ملال کی حالت میں لکھتے ہیں :

رسید دختر دیگر مرا و یکباره
ببرد رونق عیش و ببرد آب حیات

ایک قطعہ جوان بھائی کے مرثیے میں لکھا ہے :

بنوجوانی ببرید شاخ عمرش مرگ
اگرچہ رسم نبودست شاخ تر ببرید
اگرچہ منزل ما با سفر برابر بود
ولیک آنکہ جوان بود زود تر ببرید

کمال مدعی ہیں کہ ان کی ذات میں سترہ فضیلتیں جمع ہیں ۔ ہم تفصیل سے ناواقف ہیں ۔ ان کا بیان ہے : مصرع

مراست از ندب فضل ھفدہ خصل ھنوز

لیکن جن فضائل پر ان کو ناز ہے ، وہ عربی ، شعر و ادب ، فقہ و علوم ہیں ۔

گمان غالب ہے کہ وہ بعض دستکاریوں سے بھی واقف تھے ۔ ایک قطعے کے ذریعے کسی کو دندانِ ماہی کے دستے والی چھری بھیجی ہے :

فرستادم بخدمت کاردی خوب
کہ ارزد گوھر او ھرچہ خواھی
ببین بر دستہ تیغش گر بخواھی
زبان مار در دندان ماھی

ایک قطعہ مُظہر ہے کہ انھوں نے ایک صندوق ، جس پر ان کا بہت وقت لگا ہے ، تیار کیا ہے ۔ کہتے ہیں اور علاؤالدین سے خطاب کرتے ہیں :

صندوقکی لطیف مرا ھست و راستی
مثلش نساخت آنکہ ز اہل صناعتست
بسیار روزگار دران صرف کردہ ام
پنداشت صنعتش کہ چو صندوق ساعتست
فرمان صاحبست کہ بفرست و حکم او
ناچار در مقابل سمعاً و طاعتست

لیک ار همی فرستم چشمم قفای اوست
ور می‌کنی توقف جای شناعتست
در حضرتش زیان نکنم زانکه حضرتش
جای بضاعتست نه جای اضاعتست
دریاست دست خواجه وگر این بدو رسد
گویم مرا بدریا چیزی بضاعتست
دارم زجود تو طمع ده چهل ازانک
از بحر سود یک دو طریق قناعتست

ایک دفعه بیمار ہو گئے تھے۔ حکیم نجم‌الدین کے علاج سے اچھے ہو گئے - شکریے میں لکھتے ہیں :

چگونه عذر کرمهای او توام ساخت
که من توان تن ناتوان ازو دارم
ز من چه خدمت شایسته آید آنکس را
که بعد از ایزد خلاق جان ازو دارم

ضیاء الدین احمد بن ابوبکر بیابانکی کی مدح میں کمال نے ایک قصیده لکھا تھا جس کا مطلع ہے :

درست گشت همانا شکستگیِ منش
که نیک ازان بشکستست زلف پرشکنش

(کلیات ، صفحه ۱۷۹)

قصیده پڑھتے وقت کسی نے اعتراض کیا کہ یہ مطلع ظہیر فاریابی کے مطلع سے اڑایا گیا ہے - ظہیر کا مطلع ہے :

هزار توبه شکستست زلف پرشکنش
کجا بچشم در آید شکست حال منش

کمال نے اسی وقت ممدوح کو خطاب کر کے جواب میں فی‌البدیہ کہا :

بفرّ مدح تو شد گفته این قصیده که خواست
بامتحان ز من خسته جان ممتحنش

توارد‌ی مگر افتاده بوَد در مطلع
بدان سبب رقمی از قصور بر مزنش
ظهیر اگرچہ کہ صراف نقد اشعار است
گمان مبر کہ زند بندہ قلب بر سخنش

یہی معذرت ایک قطعے میں بھی ادا کی ہے ۔ فرماتے ہیں :

خدای داند اگر من ز شعر هیچ کسی
بقصد مظلمۂ کرده ام بادنٰی شی
مرا کہ چون بہ‌سخن خوان نظم آرایم
بود فواکہ او جدی و سفره ریزه جدی
چگونہ دل دهدم لقمۂ فرو بردن
کہ خاطری دگری کرده باشد آن راق
مگر توارد خاطر کہ در مجاری فکر
نہ ممکنست کہ کس محترز بود از وی
دو راه رو کہ براهی روند بز یک سمت
عجب نباشد اگر اوفتند پی بر پی

(کلیات قلمی ، مملوکۂ پروفیسر سراج‌الدین آذر)

کمال کے کلیات میں مفصلۂ ذیل اسما کی مدح میں قصائد ملتے ہیں :

(۱) علاؤالدین تکش ۵۸۹-۵۹۶ھ۔ (صفحہ ۱۶ ، کلیات)
(۲) جلال الدین منکبرنی ، ۶۱۷-۶۲۸ھ۔ (صفحہ ۱۶)
(۳) غیاث الدین محمد برادر جلال الدین مذکور ۔ (صفحہ ۱۹)
(۴) اتابک اعظم سعد بن زنگی ۵۹۹-۶۲۸ھ (صفحہ ۲۵)
(۵) اتابک اعظم مظفرالدین ابو بکر بن سعد زنگی؛ جب شہزادگی کے زمانے میں اصفہان آتا ہے ، کمال کہتے ہیں :

خسروا حال سپاهان وانچہ دروی میرود
از ستمها سمع اعلی را خبر باشد مگر
هست مارا بر تو حق خدمت و همسایگی
از برای این دو حق اندر حق ما کن نظر

لطف تو گر در نیابد کار این بیچارگان
در دو سہ ماهی دگر این جا نیابی جانور

(٦) شہزادۂ شرف الملک بن حسام الدولہ اردشیر ۔ اس خاندان سے ان کے قدیمی تعلقات ہیں ۔ جمال الدین بھی مداح رہے ہیں :

میراث یافتم ز پدر مدحت شما
والحق ازین شرف سر من باسمان رسید
نتوان بصد هزار زبان گفت شکر آن
تشریفها کہ مارا ازین خاندان رسید

(کلیات ، صفحہ ٣٦)

(٧) سلطان اتابک سلغر ۔ (٨) صاحب اعظم شرف الدین معین الاسلام علی بن فضل وزیر جلال الدین منکبرنی ۔ اس وزیر کی تعریف میں متعدد قصائد و قطعات موجود ہیں ۔ ان میں ایک قصیدہ ایک مدرسے کی تاسیس کے وقت ، جس کی بنیاد تباہی اصفہان کے بعد ڈالی جاتی ہے ، لکھا ہے ۔ یہ مدرسہ غالباً جلال الدین منکبرنی کے حکم سے کھولا جاتا ہے ۔ کہتے ہیں :

چو حق شہی را الہام داد و شاهی داد
کہ روی خیمہ دولت بدین مکان آرد
سرای علم فرازد اساس خیر نہد
درخت ظلم کند خوف را امان آرد
صلیب و خاج بسوزد کلیسیا بکند
بنای مدرسہ بر گنبد کیان آرد
ز خشت خام یکی جام جم بیاراید
ز آب و خاک یکی خلد ناگہان آرد
روا بود اگر از بہر اقتباس علوم
فرشتہ رخت بدین عالم آشیان آرد
اگرچہ حکم سلیمان روزگار کند
ولیک تخت سبا آصف زمان آرد

بہمت شرف الدین علی تمام شود
هر آنچہ خسرو آفاق در گمان آرد

(۹) ملک نصرت الدین ۔ (۱۰) صدر نظام الدین نظام الملک محمد ۔ (۱۱) فخر الدین ابن نظام الدین (صفحہ ۴۱) ۔ (۱۲) حاجب شمس (صفحہ ۴۳) ۔ (۱۳) شرف الملک تاج الدین علی وزیر (صفحہ ۴۴) ۔ (۱۴) قاضی القضاۃ رکن الدین ابوالعلا صاعد (صفحہ ۵۴) ۔ (۱۵) رکن الدین مسعود بن صاعد ۔ (۱۶) در صلح صدر الدین و قوام الدین (صفحہ ۱۶۵) ۔ (۱۷) صدر الدین عمر خجندی (صفحہ ۱۶۹) ۔ (۱۸) عضد الدین حسن (صفحہ ۱۷۳) ۔ (۱۹) عمید الدین آصف ثانی (صفحہ ۱۷۶) ۔ (۲۰) احمد بن ابوبکر بیابانکی (صفحہ ۱۸۰) ۔ (۲۱) بہاء الدین عیدوس ؟ (صفحہ ۱۸۳) ۔ (۲۲) صاحب اعظم شہاب الدین (صفحہ ۱۸۷) ۔ (۲۳) شمس الدین خوارزمی (صفحہ ۱۹۸) ۔ (۲۴) نور الدین (صفحہ ۱۹۹) ۔ (۲۵) رشید الدین وزیر (صفحہ ۲۰۰) ۔ (۲۶) قطب الدین (صفحہ ۲۰۲)۔ (۲۷) زین الدین علی السہروردی (صفحہ ۲۰۳)۔ (۲۸) عمید الدین پارسی (صفحہ ۲۴۵) ۔ (۲۹) صدر کبیر ضیاء لدین (صفحہ ۲۵۶) ۔ (۳۰) نجم الدین (صفحہ ۲۵۶) ۔ (۳۱) عزالدین (صفحہ ۲۵۷) ۔ (۳۲) کریم الدین (صفحہ ۱۶۱) ۔ (۳۳) اسفہسالار ملک عزالدین اصفہانی ۔ (۳۴) قوام الدین ابراہیم بنداری (صفحہ ۲۶۲)۔ (۳۵) ناصرالدین منگلی (صفحہ ۲۶۲) ۔

کمال نے بعض شعرائے عصر کے ساتھ قصائد و قطعات کا تبادلہ کیا ہے ۔ ان میں پہلا نام فخرالدین ہے ۔ اس کے قصیدے کے جواب میں وہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے :

خیر مقدم ز کجا پرسمت ای باد شمال
کش خرامیدی چونی و چہ داری احوال

دیر میں جواب دینے کی معذرت کے بعد اپنے پیشے کی کساد بازاری کا قصہ لے بیٹھے ہیں ۔ کہتے ہیں ان دولت مندوں کی کیا

شکایت کروں ، جنھوں نے فقیروں تک سے ان کا پیشہ (گدائی) چھین لیا - میں ان کے مدحیہ قصیدے لکھتا ہوں اور اپنی روٹی کھاتا ہوں - پھر بھی وہ مجھ سے وصولی کی توقع کرتے ہیں - اے بھائی ! جب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ مدح خریدنے والے ممدوح نہیں رہے تو آؤ ہم تم ایک دوسرے کی تعریف میں شعر لکھیں - کسی زمانے میں لوگ ہجو سے خوف کھاتے تھے ، اب تو وہ بھی بے اثر رہ گئی :

بکہ نالم ز کسانی کہ ز افراط طمع
بگدایان لگذارند گدائی و سوال

نان‌خود می خورم و مدحت شان می‌گویم
پس هم ایشان را از من طمع افتد بمنال

ای برادر چو فتادیم بدوری کہ درو
نیست ممدوحی کز ما بخرد مدح بمال

خود بیا تا پس ازین مدحت خود می‌گوئیم
چون ز ممدوح توقع نبود جود و نوال

هجو را نیز اگر وقتی تاثیری بود
این زمانش اثری نیست بجز وزر و وبال

دوسرے اثیرالدین (اومانی) ہیں ، جو اظہار عقیدت میں ایک قطعہ اس کی خدمت میں بھیجتے ہیں اور اسے پیغمبر سخن کہتے ہیں - اثیر کے قطعے کے پہلے دو شعر ہیں :

جہان فضل و معانی خدیو کشور فضل
کہ فخر جان و جہان شد ترا ثنا کردن

کمال ملت و دین آنکہ بر خرد فرض است
بہ نسبت سخن خوبت اقتدا کردن

جواب میں کمال لکھتے ہیں :

اثیر دین را رسمیست بر زبان قلم
پیام روح قدس دمبدم ادا کردن

تیسرا نام نورالدین ہے ، جس نے کمال کی تعریف میں اشعار

لکھے ہیں اور کلام کی درخواست کی ہے ۔ کمال اس وقت شعر و شاعری کا مشغلہ قریباً بند کر چکے ہیں ۔ جواب میں لکھتے ہیں :

نور دین ای ذات تو کان گہر
کان چہ باشد خود سراسر جوہر است

تا بدید آن طبع گوہر زای تو
از خجالت دامن دریا تر است

شعر میخواہی و خادم مدتیست
تا ز شعر و شاعری فارغ‌تر است

شعر را گر بود وقتی رونقی
این زمان باری عجب مستنکر است

بلبل طبعم نوا کم میزند
زانکہ شاخ جود بی برگ و بر است

زان چو سوسن خامشم کین قوم را
ہمچو نرگس چشم یکسر بر زر است

چون بدین صورت بود کار ہنر
وای آن مسکین کہ معنی پرور است

ہم فرستادم بخدمت چند بیت
تا بدانی کین رہی فرمان‌بر است

کمال نے اپنے عہد میں شعر و شاعری کی بےقدری کا جو بیان مذکورۂ بالا فخرالدین و نورالدین کے خطابیہ ابیات میں دیا ہے ، یہ کوئی تنہا بیان نہیں ہے بلکہ ایسے جذبات اس کے ہاں نہایت عام ہیں ۔ اس کو اپنی ناکام زندگی پر سخت افسوس ہے بلکہ بعض اوقات اس تاسف اور تلخی پر غصہ غالب آ جاتا ہے اور وہ نہایت سخت زبان استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا ۔ یہاں بعض صاف اشعار درج ہیں :

عقد گوهر کجا کنم عرضه
چون نه بینم همی خریداری
نیست در روزگار ممدوحی
که ازو نیست بر من انکاری

دیگر

همه در پای جور پست شدند
هر کجا در زمانه پر هنریست
با چنین نکبت هنرمندان
وای او کز هنر برو اثریست

دیگر

بقحط سالی افتادم از هنرمندان
که گر بیان کنم او را بشرح نتوانم
اگر بیابم آن را که شعر در باید
بدو دهم صلتی تا سخن بروخوانم

دیگر

دریغ روز جوانی که در محالاتش
بباد دادم و او نیز داد بربادم
ز عمر آنچه گزین بود رفت و من همه عمر
بکام خویش یکی روز نیست بر یادم
بعمر مانده اگر شادیست مردم را
من از زمانه بعمر گذشته بس شادم
ز فن شعر بیکبارگی شدم بیزار
که آبروی برد هر زمان به بیدادم

دیگر

مرا چه حاصل ازین خواجگان بی معنی
که هیچ کار مرا انتظام می‌ندهند

ندانم از کرم آخر چه در وجود آمد
که هیچ گونه بدستش زمام می‌ندهند
چه چشم دارم ازین منعمان که شاعر را
بصد شفیع جواب سلام می ندهند
کجا روم چه خورم من زباد شاید زیست
که قوت روز بروزم تمام می‌ندهند
زکات می ندهند و کرم نمی ورزند
کتاب می نخرند و بوام می‌ندهند
پناه سوی قناعت همی‌برم زین قوم
که اهل خانهٔ خود را طعام بمی‌ندهند
دلا بحکم ضرورت بساز با این ها
که هیچ جای نشان کرام می‌ندهند

دیگر

شکایتی که ز ابنای عهد هست مرا
بگویم و نکنم شرم می‌نیارم گفت
سزای یک یک شان آنچنانکه می دانم
کسی نداند گفتن ولی نیارم گفت
به ترک شعر بگفتم چرا ازان که دروغ
ز حد ببردم و یک راست می‌نیارم گفت
سخن چگونه توان گفت کاهل این ایام
سزای مدح نیند و هجی نیارم گفت

لیکن قطعهٔ ذیل ان کی انتہائی یاس کا آئینہ دار ہے :

چو عادتست که ابنای دهر در هر فن
کرم بلاف ز عهد گذشته وا گویند
بران گروه بباید گریست کز پس ما
حکایت کرمِ از روزگار ما گویند

ضمایم

فارسی شاعری اور اس کی قدامت

(از رسالہ سہیل، علی گڑھ، جنوری و اپریل ۱۹۲۶ء)

ایک مدت سے فارسی شاعری اور اس کی قدامت کا مسئلہ معرض بحث میں ہے اور اہل الرائے ہمیشہ اس کے متعلق مختلف اور متباین آراء پیش کرتے رہے ہیں۔ بعض اس کی قدامت کے قائل ہیں اور اغلباً یہی دبستان ہمارے ہاں مذہبِ منصور کا حکم رکھتا ہے۔ مستشرقین مغرب میں صرف چند ذی علم ایسے ہیں جو اس کی قدامت کے قائل نہیں ورنہ اکثر علماء نے زیادہ تر آریا پرستی کے اثرات میں اس کی قدامت کی روایات ہی کو تسلیم کیا ہے۔ اس قضیے کے متعلق مشرق و مغرب میں اس قدر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے کہ ایک مستقل تصنیف آسانی کے ساتھ تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن مضمون ھذا کی محدود گنجائش میں اس ذخیرے پر صرف اجمالی نظر ممکن ہے۔ مغربی مستشرقین اپنی تحقیقات کو 'اوستا' کے عہد تک پہنچا چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ خود 'اوستا' میں نظم جس کو شعرِ ہجائی کہنا مناسب ہوگا، موجود ہے۔ لیکن میرے خیال میں 'اوستا' کے عہد کو فارسی شاعری سے بالواسطہ کوئی تعلق نہیں، اس لیے میں اس قسم کی تحقیقات کو پس پشت ڈال کر صرف اُسی مواد اور ذخیرے سے بحث کروں گا، جس کا براہ راست فارسی سے تعلق ہے۔ سب سے مقدم وہ آراء ذکر کی جاتی ہیں جو فارسی شاعری کی قدامت کی قائل ہیں۔

ابوطاہر خاتونی کی روایت سے دولت شاہ لکھتا ہے کہ عضدالدولہ بویہ کے عہد میں قصرِ شیریں واقع خانقین پر فارسیِ قدیم

میں یہ شعر لکھا ہوا تھا :

هزبرا بگیهان انوشه بدی
جهان[1] را بدیدار توشه بدی

اس شعر کے استدلال پر دولت شاہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ساسانی عہد میں فارسی شاعری کا پتا چلتا ہے ، اور اضافہ کرتا ہے :

"لیکن جب سلطنتِ اکاسرہ اعراب کے قبضے میں آگئی ، چونکہ یہ قوم صرف دین اور شریعتِ محمدی کی اشاعت میں ساعی تھی اور عجمی رسوم اور طریقوں کو محو کر رہی تھی، اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے شعر کہنے کی بھی ممانعت کردی ہو ۔"

اور اپنی حجت کو زیادہ سنگین اور مضبوط کرنے کے لیے کتاب 'وامق و عذرا' کا حوالہ دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ :

"جب امیر عبداللہ بن طاہر . . . . امیرِ خراسان تھا ، نیشاپور میں ایک شخص اس کے پاس ایک کتاب لایا ۔ امیر نے دریافت کیا ، کیا ہے ؟ اس شخص نے جواب میں کہا : یہ 'وامق و عذرا' کا قصہ ہے اور امیر کی خدمت میں بطور تحفہ کے لایا ہوں ۔ یہ کتاب نوشیرواں کے حکم سے لکھی گئی تھی ۔ امیر عبداللہ نے جواب دیا کہ ہم قرآن خواں قوم ہیں ، ہمیں اس قسم کی کتابوں کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور چونکہ یہ کتاب مجوسیوں کی تصنیف ہے اس لیے ہمارے نزدیک مردود ہے ۔ چنانچہ اسی وقت حکم دیا کہ کتاب دریا برد کر دی جائے اور عام منادی کرا دی کہ جہاں کہیں عجمی کتابیں دست‌یاب ہوں ، جلا دی جائیں ۔ اس قسم کے احکامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل سامان کے عہد تک ایران میں شاعری کا چرچا نہیں ہوا ۔"

محمد صالح کنبوہ اپنی تصنیف 'بہار سخن' میں نہ صرف قدامتِ شعر بلکہ فنِ شعر اور تمام اقسامِ نظم کے وجود کے قائل ہیں ۔

---

۱ - جهان را نگهبان انوشه بدی

صاحب 'بہار سخن' کی رائے چوں کہ عام طور پر معلوم نہیں ہے اس لیے میں بجنسہ انھی کے الفاظ میں حوالۂ قلم کرتا ہوں :

"دور زمان پیشین پارسی دانان سخن سنج را از ہر مصرع و بیت و قصیدہ و رباعی و قطعہ و مثنوی و اقسام دیگر نامہا بودہ بپارسی و ہمچنین بحر و وزن و قافیہ و ردیف را الفاظ جداگانہ بودہ بعبارت دری ۔ چون نامہای ایشاں مندرس شد اسامی و القاب نیز اندراس یافت ، علی‌الخصوص در زمان خلفای عباسی کہ اسلامیان بر عجم استیلا یافتند چون بزبان پارسی آشنا نہ بودند ، عجمیان را بکفر منسوب می‌داشتند ۔ کتابہای این طائفہ را چہ نظم و نثر لختی در آب انداختند و پارۂ را بہ سوختند و ازین رہ گذر سخنان آبدار گلوسوز پاستان در آب و آتش افتاد ۔ چون در عہد آل طاہر بعضی از اہل طبع خواستند کہ بزبان پارسی شعر گویند و قدرت بر ایجاد قوانین و اختراع اسامی و القاب شعر و ما ینطق بہا نداشتند و نامہای پاستانی کہ پیشینان درین فن نگاشتہ بودند درمیان نماندہ و آئین شعر پارسی گفتن نیز بر افتادہ و ہیچ یکی را آن اسامی و القاب بر خاطر نہ بود ، ناچار اسامی و القاب کہ شعرای عرب قرار دادہ بودند استعمال نمودند و اکنون بآن معروف است ۔"

مولف 'مجمع‌الفصحا' کا قول ہے :

"ظاہرست کہ اشعار قدیم شعرای عجم بہ سبب غلبۂ عرب از میان رفتہ ، چنان‌کہ مشہور ست کہ تمام کتب و تواریخ عجمیان را عرب سوختند . . . . از کتب قدیم چیزی برجا نہ‌گذاشتند الا قلیلی کہ پنہان داشتند چون مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدۂ سخن فارسی و شعر متروک شد ۔"

یہی مصنف اپنی ایک اور تصنیف 'فرہنگ آرای ناصری' میں ایک سمرادی حکیم کے ذکر میں ، جس کا ظہور ضحاک کے عہدِ اساطیری میں بتایا جاتا ہے ، یوں لکھتا ہے :

"ازان جملہ یکی فرابرج نام داشت و از رؤسای سمرادیان بوده و شعر فارسی نیز می گفتہ این دو بیت هنوز از اشعار او درین سرای پاستانی باقی ماندہ است کہ گفتہ :

جہان دانی همہ سمراد باشد
ترا گر فرّ یزدان داد باشد
ز سمراد ست گفتن نام سمراد
همان سمراد هم سمراد باشد"

خان آرزو نے بحوالۂ "دبستان المذاهب" نقل کیا ہے کہ آبادیوں کے دور میں ایک پادشاہ تھا فرموش نام ۔ اس کے عہد میں سخن پیوند یعنی شعراً بے قیاس تھے ۔ ان میں سے سات شاعر ایسے تھے کہ ہفتے میں ایک ایک روز اس کے سامنے اشعار گزرانتے تھے ۔ چناں چہ یک شنبہ کے دن جب پادشاہ پرستش سے فارغ ہو کر گھر آیا ، شیدوس شاعر اس کے ہمراہ آیا ۔ بادشاہ کے سامنے اس روز خشکہ اور آرد کی مقشر دال کھانے پر آئی ۔ پادشاہ نے شیدوس کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ دال کی تعریف میں کچھ کہے ۔ شاعر نے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب کچھ اس قسم کا تھا کہ دال کفارۂ گناہ کے واسطے برہنہ ہوگئی ہے ۔ پادشاہ بہت خوش ہوا اور شاعر کا منہ جواہرات سے بھر دیا ۔ پادشاہ کی ملکہ جس کا نام شکر تھا ، شاعر کی اس شیوہ زبانی پر عاشق ہوگئی اور رات کو شاعر کے گھر پہنچ کر طالب وصل ہوئی ۔ شیدوس نے انکار کیا اور کہا کہ عورت کسی سے نہیں ڈرتی ، اس سے ڈرنا چاہیے ۔ تو فرموش جیسے بادشاہ ذی جاہ کو چھوڑ کر اس کے ادنٹی ملازم کی شیدا ہوئی ہے ! قصہ مختصر ملکہ مایوس ہوکر گھر لوٹی ۔ صبح کے وقت دربار میں بادشاہ نے ، جوکہ پوشیدہ ملکہ شکر کے پیچھے پیچھے جا کر اس کی اور شاعر کی تمام گفتگو سن آیا تھا ، شیدوس سے ماجرائے شب دریافت کیا ۔ شاعر نے جواب میں یہ شعر پڑھا :

زن شاہست در داوِر گردا
گوز گردد ندارد بیم از کس

پادشاہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا اور انعام میں ملکہ، شکر کو اس کے حوالے کردیا۔

محمد صالح اور رضا قلی خاں کے پیرو شمس العلماء محمد حسین آزاد مرحوم تھے۔ مرحوم 'سخندان پارس' میں لکھتے ہیں :

"میرا قیاس یہ کہتا تھا کہ جس طرح ہر ولایت میں اپنی اپنی طبیعت کے بموجب نظم اور نظم کی خوبی ہے ، اسی طرح فارس بھی اس فن سے بے بہرہ نہ ہوگا۔ انقلاب زمانہ نے جس طرح اس کے علوم و فنون کو فنا اور کتابوں کو برباد کیا ، نظم کی لڑیاں بھی توڑ ڈالیں اور دیوان درہم برہم کر دیے۔ پھر بھی خوش حالی یا بدحالی میں قوم قائم تھی۔ ٹوٹے پھوٹے شعر ، گیتوں کی آواز ، شادی کے سہاگ یا بچوں کی لوریوں میں مدت تک زبان بزبان چلے آئے ہوں گے۔"

آزاد مرحوم وہ اصطلاحات شاعری بھی بیان کرتے ہیں جن کا فارسیِ قدیم میں رواج تھا۔ وہ حسب ذیل ہیں :

پیوستہ = نظم	پراگندہ = نثر
سرواده = شعر	دم = وزنِ شعر
چامہ = غزل	چکامہ = قصیدہ
سرواد = قافیہ	پساوند = ردیف
داغ = تخلص	

اور فرماتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ ہر قوم کی زبان میں پہلے اشیا اور کام ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیے لفظ یعنی اسماء اور افعال ہوتے ہیں۔ اگر عہد باستانی میں اہل فارس کو شعر کہنا نہ آتا تھا تو الفاظ مذکور کیوں تھے۔

میرزا عباس خاں آشتیانی معروف بہ اقبال ، پروفیسر دارالفنون طہران کا بیان ہے کہ :

''شعر در دورۂ ساسانیان وجود داشتہ و بالنسبۃ وافیہ' آن ہم وسیع بودہ ، ولی از حیثیت وزن و سبک با اشعار امروزہ فرق داشتہ است ۔ چیزی کہ ہست حملہ' عرب اثری از آن باقی نگزاردہ و اشعار آن دورہ را مانند آثار دیگر محو و نابود ساخت ۔ از نکاتیکہ باعث انکار وجود شعر در عصر ساسانی شدہ و منکرین را جسور نمودہ باقی نماندن اسمای شعرای آندورہ است ۔ مدعیان گویند اگر شعر در دورۂ ساسانی وجود داشت البتہ نام یکی دو نفر از شعرای عصر مزبور بجا می‌ماند ۔ چنانچہ یکی دو سہ نفر از حکما و اطبا و چند نفر از موسیقی دانہا دلیل وجود حکمت و طب و موسیقی است و نماندن نام شاعر دلیل بر عدم وجود شعر ۔ لغات چامہ و چکامہ و سرواد و پساوند کہ یقیناً بعضی از آنہا باقی ماندۂ دورۂ ساسانی است برای اثبات ادعای ما درین مورد و شواہد دیگر می باشند ۔''

یہ آراء اُن اساتذہ کی ہیں جو فارسی شاعری کو اسلامی دور سے قدیم مانتے ہیں اور عربی اثرات میں اس کی ولادت اور نشو و نما سے بالکل منکر ہیں ۔ قصہ مختصر شاعری ان کے نزدیک ایران میں قدیم زمانے سے تھی اور ایرانی جملہ اقسام و فنون شعر سے واقف تھے ۔ ذیل میں ناظرین کی معیت میں ان اسناد کے دعاوی پر غور کیا جاتا ہے ۔

ابو طاہر خاتونی کے شعر کے متعلق یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشعار شاہ نامے میں دعائیہ موقعوں پر فردوسی اکثر لکھتا ہے ۔ چنانچہ شاپور اپنے باپ اردشیر بابکاں سے اپنے فرزند اورمزد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

بدو گفت شاپور انوشہ بدی
جہان را بدیدار توشہ بدی

اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ قصر شیریں کے شاعر کو فردوسی کے آخری مصرع سے بالکل توارد ہو گیا ہے ۔ دختر اردوان

سے جب اردشیر کے فرزند ہوتا ہے تو اس کا وزیر کہتا ہے :

بدو گفت شاها انوشہ بدی
روان را بفرہنگ توشہ بدی

یہ امر ظاہر ہے کہ فردوسی کے عہد کی زبان شیریں کے زمانے کے شعرا کی زبان نہیں ہو سکتی ، اس لیے قصر شیریں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کا سنگ بنیاد نہیں رکھا جاسکتا ۔

میں دولت شاہ کے اس عقیدے کی بھی تائید نہیں کرسکتا کہ جس طرح عربوں نے عجمیوں کے اور رسوم اور طریقے محو کیے ، اسی طرح ممکن ہے کہ شاعری کی بھی ممانعت کردی ہو ۔ دولت شاہ کی تاریخ دانی اسی ایک امر سے معلوم ہوسکتی ہے کہ اس کے نزدیک آل سامان کے زمانے میں شاعری دوبارہ رواج پاتی ہے ۔ داستان 'وامق و عذرا' کا ہم نہیں جان سکتے کہ فارسی شاعری سے کیا تعلق ہے ؟ وہ کوئی منظوم داستان نہیں تھی کیونکہ خود دولت شاہ اس کی منظومیت کا دعویٰ نہیں کرتا ۔ وامق و عذرا کی داستان کا ضائع ہونا کجا ، وہ تو آج بھی موجود ہے ۔ اس امر میں شک نہیں کہ افسانے کی کتابوں سے مسلمان حلقوں میں ، بالخصوص نو عمر اولاد کے واسطے ضرور تعصب رہا ہے ، اور وہ اس غرض سے تھا کہ مبادا وہ ان افسانوں میں مستغرق ہوکر ضروری باتوں سے غافل ہو جائیں ۔ اس قسم کی کتابوں کی ممانعت اسی بنا پر آج بھی مسلمان ماں باپ کرتے ہیں ۔ اور کون ایسا دل سوز باپ ہوگا جو اپنی کم عمر اولاد کو عشقیہ افسانوں ، ناولوں اور مخرب اخلاق کتابوں کے مطالعے کی اجازت دے گا ۔ اسی بنا پر 'بحرالفوائد' میں ، جو چھٹی صدی ہجری کی تصنیف ہے اور ابی سعد ارسلان آبہ بن آق سنقر کے لیے ملک شام میں فارسی میں تصنیف ہوئی تھی، مصنف نے تربیت اولاد کے فرائض بیان کرتے وقت والدین کو تاکید کی ہے کہ اس قسم کی کتابیں بچوں کے ہاتھ میں نہ آنے دیں ۔ مصنف کہتا ہے :

"نگاہ باید داشت ...... از خواندن کتب پارسی کہ نہ
بہ شریعت تعلق دارد مانند ویس و رامین و حکمت جاماسپ و
لہراسف و وامق و عذرا کہ خواندن این کتاب فسق است"

یہ بھی یاد رہے کہ مصنف مذہبی حلقے کا آدمی ہے جس نے قرآن اور شریعت کے سوا تمام چیزوں سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔ بہرحال اس قسم کی کتابوں سے مسلمان حلقوں میں احتراز کے یہ معنی نہیں لیے جاسکتے کہ جب کبھی مسلمان ایرانی تصانیف کے رو در رو آئے وہ نیست کردی گئیں۔

حکیم فرابرج کا قطعہ اکثر متاخر اساتذہ کے ہاں منقول ہے لیکن اس کا قدیم راوی صاحب 'دبستان المذاہب' ہے جس نے کابوی نامی ایک سمرادی سے ۱۰۴۸ھ میں شہر لاہور میں سنا تھا۔ یہ قطعہ اس حصہ فارسی ادبیات مجعول سے تعلق رکھتا ہے جو غالباً عہد اکبری میں کسی خاص تجویز کے زیر اثر تیار کیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں دساتیر وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے اور نہ اس قطعے کو اکبری دور سے پیشتر کا تصور کیا جاسکتا اور غالباً اس سے زیادہ اس کی تنقید کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

میں اسی نظر سے شیدوس کے شعر کو دیکھتا ہوں؛ اس کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں چند غیر مستعملہ اور نامعلوم الفاظ درج ہیں۔ اس کے جملوں کی ترکیب بالکل زمانۂ حال کی سی ہے اور تعجب نہیں اگر کسی بامذاق ایرانی یا پارسی نے ہم ہندی نژادوں کو فقروں میں اڑانا چاہا ہو۔ میں اس نمونے کو بھی دساتیری عہد کا مانتا ہوں۔

یہاں اُن اصطلاحات سے بحث کی جاتی ہے جو پروفیسر محمد حسین آزاد اور علامہ میرزا عباس خاں آشتیانی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں اس قدر معلوم کرنا ہے کہ آیا یہ اصطلاحات ساسانی دور کی یادگار ہیں یا عہد مابعد اسلام میں عربی اصطلاحات کے ترجمے کی غرض سے، جب کہ ان کی ضرورت محسوس

ہوئی ، وضع کی گئی ہیں ؟ میرا ایسا خیال ہے کہ شعر کے متعلق یہ اصطلاحات باستثنائے چند عہدِ ما بعدِ اسلام میں بغرض ترجمہ ایجاد ہوئی ہیں - مثال میں عربی لفظ 'نظم' پیش کیا جاتا ہے - فارسی میں اس کا مرادف پیوستن ہے - عربی میں قاعدہ ہے کہ مصدر بمعنی اسم مفعول آ جاتا ہے - اسی طرح لفظ نظم بحالت مفعولی بمعنی کلامِ منظوم آگیا - فارسی والوں نے اسی قاعدے کو مد نظر رکھ کر 'پیوستن' کے اسم مفعول 'پیوستہ' سے وہی معنی استخراج کیے- اور جب ہم ان کے معانی پر غور کرتے ہیں تو رہا سہا شبہ اور بھی رفع ہوجاتا ہے - عربی مصدر نظم کے معنی ملانا ، ترتیب دینا اور نظم کرنا ہیں - کیا یہ ضروری ہے کہ اس کا مرادف پیوستن اس کے تمام معنی پر حاوی ہو؟ یہی کیفیت بعینہ 'پراگندہ' اور 'نثر' کی ہے -

'نظم' کا ترجمہ بہ حیثیت اصطلاح 'پیوستہ' مان لیا گیا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ ساسانی دور کی یادگار ہے - لیکن خود فردوسی، جس کے عہد میں عربی زبان کا فارسی پراثر بہت کچھ دھندلا اور غیر نمایاں تھا ، اس اصطلاح کو تسلیم نہیں کرتا - اگرچہ وہ اس کے مصدر 'پیوستن' کو بصورت فعل بلاتامل قبول کرلیتا ہے ، مثلاً :

به پیوستم این نامه بر نام اوی
همه مهتری باد فرجام اوی

دیگر

به پیوستم این نامهٔ باستان
پسندیده از دفتر راستان

دیگر

به پیوندم و باغ بیخو کنم
سخنهای شاهنشهان نو کنم

دیگر

. . . .
نبردی به پیوند او کس گمان

لیکن بصورت اسم بمعنی اصطلاح وہ عربی ذخیرے سے لفظ 'نظم' مستعار لیتا ہے ۔ امثال :

نگہ کردم این نظم سست آمدم
ہمہ بیت نا تندرست آمدم

دیگر

پی افگندم از نظم کاخ بلند
کہ از باد و باران نیابد گزند

دیگر

ز گہ کیومرث تا یزدجرد
بنظم من آید پراگندہ گرد

دیگر

بنظم آرم این نامہ را گفت من
ازو شادمان شد دل انجمن

اس سے ظاہر ہے کہ فردوسی 'پیوستہ' کو بمعنی کلام منظوم تسلیم نہیں کرتا ۔ قریب قریب یہی حالت 'پراگندہ' کی ہے ۔ فردوسی کے ہاں اگرچہ یہ اصطلاح مل جاتی ہے لیکن وہ اس کا استعمال زیادہ تر بہ سبیل تشریح کرتا ہے ۔ ایک موقع پر اس کو 'حدیث پراگندہ' کہا ہے ۔ دوسرے موقعے پر اس کے ساتھ 'گویا' کا لفظ استعمال کیا ہے اور ایک مقام پر عربی لفظ 'منثور' لکھا ہے ۔ امثال :

حدیث پراگندہ بپراگند
چو پیوستہ شد مغز جان آگند

دیگر

بہ پیوست گویا پراگندہ را
بسفت این چنین درّ ناسفتہ را

دیگر

فسانہ کہن بود و منثور بود
طبائع ز پیوند او دور بود

اسی طرح لفظ 'پساوند' ہے جو اصل میں "پس ، آ ، وند" بترکیب خداوند و خویشاوند ہے اور حقیقت میں 'قافیہ' کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ اسدی نے لغتِ فارسی میں یہی معنی دیے ہیں ۔ لبیبی :

همه باده همه جام و همه شست
معانی یا حکایت یا پساوند

سروا ، سرواد اور سروادہ اصل میں ایک ہی لفظ معلوم ہوتا ہے اور جس طرح 'سرواد' کلام منظوم کے معنوں میں آتا ہے ، ان ہی معنوں میں 'چکامہ' اور 'چغامہ' بھی مستعمل ہوتا ہے ۔ پس وہ امتیاز جو شعر اور قصیدے میں پایا جاتا ہے ، ان کی ان فارسی مرادفات سے اٹھ جاتا ہے ۔ اور اس پر شعر و قصیدہ کا اطلاق غالباً عربی اتباع میں کیا گیا ہے ، اور اسدی نے اپنی لغت میں 'سرواد' کی تشریح میں صاف لکھ دیا ہے کہ وہ شعر کے معنوں میں آتا ہے جس کو 'چکامہ' اور 'چغامہ' بھی کہا جاتا ہے ۔

'داغ' اور 'دم' کی مثال کا کوئی شعر نہیں ملتا ۔ تخلص اور وزنِ شعر کے معنوں میں ان کا اطلاق برسبیل مجاز ہے ۔ لیکن ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ یہ مصطلحات ایرانی اور ایران‌زا ہیں لیکن خود اہل فارس نے ان کا استعمال رک رک کر کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرورۃً یہ الفاظ وضع کیے گئے ، لیکن قبول عام کا خلعت نہیں ملا ۔

'چامہ' کے معنی ہمارے لغات میں غزل کے دیے جاتے ہیں مگر 'شاہنامہ' میں وہ زیادہ تر گیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ چناں چہ فردوسی :

می آورد بر خوان و رامشگران
همی‌چامه بود از کران تا کران

(آمدن شنکل باهفت پادشاه نزد بهرام)

بہرحال شاعری اگر ایران میں قدیم تھی تو فردوسی ایسا شخص نہیں تھا جو اس کا ذکر نہ کرتا یا اس کے چھپانے کی کوشش کرتا ۔

اس ملک میں 'چامہ' کا دستور ہے اور اس کا ذکر شاہنامے میں کئی مقام پر آتا ہے ، مثلاً :

بہرام گور جب شیر مار کر بوڑھے مہیار کے گھر بہ تبدیلِ نام مہمان ہوتا ہے تو میزبان ، مہمان سے اپنی لڑکی کا تعارف کراتے وقت کہتا ہے کہ میری دختر میں کئی خوبیاں ہیں :

هم او می گسار است و هم چنگ زن
هم او چامه گوی است و انده شکن

لڑکی سامنے آ کر مہمان کا خیر مقدم کرتی ہے - بہرام چامہ کی فرمایش کرتا ہے :

بدو گفت بنشین و بردار چنگ
یکی چامه باید مرا بیدرنگ
شود پیر مهیار امشب جوان
گروگان کند پیش مهمان روان

لڑکی چنگ ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے اپنے باپ مہیار کا چامہ گاتی ہے - فردوسی اسے یوں بیان کرتا ہے :

بزد چامۀ باب خود ماهیار
تو گفتی بنالد همی چنگ زار

پدر را چنین گفت کای ماهیار
چو سرو سهی بر لب جویبار

چو کافور گرد گل سرخ موی
زبان گرم بودی دل آزرم جوی

همیشه بداندیشت آزرده باد
بدانش روان تو پرورده باد

توئی چون فریدون آزاده خوی
منم چون پرستار و نام آرزوی

اس موقعے پر ماهیار کا چامہ ختم ہو جاتا ہے اور مہمان کا چامہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

چو این گفته شد سوی مهمان گذشت
ابا چامه و چنگ نالان نذشت
به مهمان چنین گفت کای شاه فش
بلند اختر و یک دل و کینه کش
کسی کو ندیده است بهرام را
ستوده سوار و دل آرام را
نگه کرد باید بروی تو بس
جز او را نمانی ز لشکر بکس
میانت چو غروست و بالا چو سرو
خرامان شده سرو همچون تذرو
بدل نره شیری بتن ژنده پیل
بآورد خشت افگنی بر دو میل
رخانت به گلنار ماند درست
چگوئی همی برگ گل را که شست
دو بازو به کردار ران هیون
ز پا اندر آری کُهِ بیستون
به رنج آفریند فلک چون تو مرد
ندیدم بسان تو اندر نبرد
تن آرزو خاک پای تو باد
همه ساله زنده برای تو باد

دہقان برزین کے ہاں بھی بہرام گور ایک مرتبہ جا نکلتا ہے - برزین کی تین لڑکیاں تھیں جن میں ایک چامہ گو ہے، دوسری چنگ زن اور تیسری رقاصہ - برزین بہرام سے انھیں ملاتے وقت کہتا ہے :

چنان دان که این دختران منند
پسندیده و دلبران منند
یکی چامه گوی و دگر چنگ زن
سوم پای کوبد شکن بر شکن

ز چیزی مرا نیست شاها کمی
درم هست و دینار و باغ و زمی

سه دختر بکردار خرم بهار
بدینسان که بیند همی شهریار

اس کے بعد برزین اپنی لڑکیوں سے کہتا ہے کہ تیار ہو جاؤ اور پادشاہ کو اپنا کمال دکھاؤ :

بدان چامه زن گفت کای ماهروی
بپرداز دل چامهٔ شاه گوی

بتان چامه و چنگ بر ساختند
یکایک دل از غم بپرداختند

اور چامہ یوں شروع ہوتا ہے :

نخستین شهنشاه را چامه گوی
چنین گفت کای خسرو ماهروی

نمانی مگر بر فلک ماه را
نشائی مگر خسروی گاه را

بدیدار ماه و ببالای ساج
بنازد بتو تخت شاهی و تاج

خنک آن که شبگیر بیندت روی
خنک آنکه یابد ز موی تو بوی

میان تنگ چون ببر و بازو سطبر
همی فرّ تاجت بر آید بابر

بگلنار ماند همی چهر تو
ز شادی بخندد دل از مهر تو

دلت همچو دریا و دستت چو ابر
شکارت نه بینم همی جز هزبر

همی موی کافی به پیکان تیر
همی آب گردد ز داد تو شیر

سپاهی کہ بیند کمند ترا
همی بازوی زورمند ترا

بدرد دل و مغز جنگ آوران
اگر چند باشد سپاه گران

چو آن چامہ بشنید بہرام گور
بخورد آن گران سنگ جام بلور

چامے کی ان مثالوں سے، جو اوپر دی جا چکی ہیں ، ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ فردوسی کے نزدیک چامے کی نوعیت کیا ہے ۔ ابتداءً وہ ایک گیت ہے جو عموماً موسیقی ساز کے ساتھ گایا جاتا ہے اور چونکہ مہمان کی آمد کے وقت آسانی کے ساتھ بدیہہ بنایا جا سکتا ہے ، اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ فقراتِ موزوں کی شکل میں ہوتا ہوگا ۔ بہ لحاظ مضمون وہ غزل سے بالکل مختلف ہے ۔ فردوسی نے جو نمونے دیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چامہ اکثر تعریف میں ہوتا تھا ۔ اس لحاظ سے چامے پر اگر قصیدے کا اطلاق کیا جائے تو مناسبت سے خالی نہیں ۔ غزل میں اور چامے میں البتہ ایک بات عام ہے ، یعنی چامے کے خاتمے پر تخلص کی بجائے چامہ گوی کا نام ہوا کرتا تھا ۔

یہاں مجھ کو الفاظ 'شعر و شاعر' کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہیے ؛ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا فارسی میں کوئی مرادف نہیں ہے ۔ سخن بمعنی کلام منظوم فردوسی کے عہد کے بعد استعمال میں آتا ہے ۔

رہا لفظ شاعر ، اس کے متعلق یہ معلوم رہے کہ فارسی میں کوئی قدیم اور مخصوص لفظ اس کا قائم مقام موجود نہیں ، اگرچہ ترکیبی اسما کئی موجود ہیں ، مثلاً سخنور ، سخن پیوند ، سخن سرای ، سخن گوی ، سخن سنج ، چامہ گوی اور چامہ ساز اور نظم پیرای وغیرہ اور متاخرین ان کے واضع ہیں جن سے قدما کو کوئی سروکار نہیں ۔ فردوسی کے ہاں شاعر کا مترادف 'گوینده' ہے ۔ امثال :

تو نیز آفرین کن کہ گویندۂ
بدو نام جاوید جویندۂ

(دیباچہ شاہنامہ ، در ستایش سلطان محمود ، صفحہ ۴ ، طبع بمبئی)

چنان دید گوینده یک شب بخواب
کہ یک جام می داشتی چون گلاب

(افتتاحیۂ جلد سوم)

گرفتم بگوینده بر آفرین
کہ پیوند را راه داد اندرین

(جلد سوم ، صفحہ ۱۲ ، انجام شدن گفتار دقیقی)

کیا یہ امر قابل استعجاب نہیں کہ فارسی زبان ، جو بقول محمد صالح ، مولانا آزاد و میرزا عباس آشتیانی ، فن شعر کی تمام اصطلاحات کی مالک تھی ، شاعر کے لیے کوئی خاص لفظ نہیں بتاتی ۔ عرب تمام ایرانی کتابیں برباد کر سکتے تھے ، امیر عبداللہ اور خلفاے عباسیہ ان کے تمام دفتر تاراج کر سکتے تھے ، لیکن شاعر کا لفظ ، اگر فارسی زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ تھا ، تو نہ تباہ ہو سکتا تھا نہ برباد ۔

ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ خود ایرانی اس باب میں کیا کہتے ہیں ۔

فخری گرگانی قصۂ ویس و رامین کے ذکر میں کہتا ہے :

ندیدم زان نکوتر داستانی
نماند جز بخرّم بوستانی

ولیکن پہلوی باشد زبانش
نداند ہرکہ برخواند بیانش

نہ ہرکس آن زبان نیکو بخواند
وگر خواند ہمی معنی نداند

فراوان وصف چیزی بر شمارد
چو بر خوانی بسی معنی ندارد

که آنکه شاعری پیشه نبودست
حکیم چابک اندیشه نبودست

کجا اند آن حکیمان تا بہ بینند
کہ اکنون چون سخن می آفرینند

معانی را چگونه برکشادند
برو وزن و قوافی چون نهادند

فخری کے نزدیک پہلوی میں شاعری کا فن نہیں تھا اور نہ وہ ایسے اشعار کہتے تھے جن میں وزن و قافیہ کی قید ہو ۔

شیخ نظامی بہرام گور کے چینیوں کی فتح کے موقع پر یہ دو شعر لکھتے ہیں :

پہلوی خوان پارسی فرہنگ
پہلوی خواند بر نوازش چنگ
شاعران عرب چو در خوشاب
شعر خواندند بر نشید رباب (بہرام نامہ)

اس سے بھی زیادہ صاف بیان محمد عوفی کا ہے ۔ وہ کہتا ہے :

"در عہد پرویز نواء خسروانی کہ آن را باربد در صورت آوردہ است بسیار است ، فاما از وزن شعر و قافیت و مراعات نظایر آن دور است ، بدان سبب تعرض بیان آن کردہ نیامد ۔ تا نوبت بدور آخر زمان رسید و آفتاب ملت حنیفی و دین محمدی سایہ بر دیار عجم انداخت و لطیف طبعان فرس را با فضلاء عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از انوار فضایل ایشان اقتباسی کردند و بر اسالیب لغات عرب وقوف گرفتند و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند و بہ غور آن فرو رفتند و بر دقائق بحور و دوایر آن اطلاع یافتند و تقطیع و قافیہ و ردف و روی و ایطا و سناد و ارکان و فواصل بیاموختند ، و ہم بر آن منوال نسایج فضایلی کہ نتایج طبع ایشان بود بافتن گرفتند ۔"

محمد عوفی کو اعتراف ہے کہ شاعری ایرانیوں نے عرب سے

سیکھی ہے ۔ ناصر خسرو کہتا ہے :

سواران تازنده را نیک بنگر
درین پہن میدان ز تازی و دهقان
عرب بر ره شعر دارد سواری
پزشکی گزیدند مردان یونان
ره هندوان سوی نیرنگ و افسون
ره رومیان زی حسابست و الحان
مصور بکار است مر چینیان را
چو بغدادیان را صناعات ایوان

الوری کہتا ہے :

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکه بود
اول شان امراء القیس آخر شان بونواس

منوچہری کا اعتقاد ہے :

شاعری عباس کرد و حمزه کرد و طلحه کرد
جعفر و سعد و سعید و سید ام‌القریٰ

ایرانیوں کے علاوہ خود عرب مورخین کے بیانات بھی اسی عقیدے کے موید ہیں ۔ مثلاً جاحظ (کتاب الحیوان ، جلد اول ، صفحہ ۳۶) فضیلتِ شعر کے بیان میں کہتا ہے کہ :

"هر ملتی در پایدار کردن آثار و مناقب خود بیک شکل و راه دیگر متوسل شده ؛ مثلاً عربها در جاهلیت این کار را بشعر موزون و کلام مقفیٰ انجام می‌دادند و ایرانیان با بناها مآثر خود را ثبت می‌نمودند مانند گرد بیداء و بنای اردشیر بیدای اصطخر . بعد عرب ها خواستند که با عجم درکار بنای ابنیه مشارکت کرده در باب شعر منفرد شوند ، پس غمدان و کعبه نجران و قصر مآرب . . . . را بنا کردند ۔"

اسی تصنیف کے صفحہ ۳۷ پر کہتا ہے :

"و فضیلت شعر منحصرست بعرب و بر آنانکه بعربی متکلم اند
و شعرقابل ترجمه نیست و نمی‌توان آن را نقل بزبان دیگر کرد
ورنه نظم آن گسسته می‌شود و وزنش باطل گردد و حسنش
می رود ۔"

یہی جاحظ اپنی ایک اور تصنیف 'کتاب البیان و التبیین' (طبع مصر جلد اول ، صفحہ ۱۴۵) میں عجم پر عرب کی مفاخرت کے ذکر میں کہتا ہے :

"و چیست فرق بین اشعار عرب و آن کلامی که آن را ایرانیان
و رومیان شعر می نامند ۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایران میں جو تصنیف از قسم نغمات شائع تھی ، عربوں کی نگاہ میں شعر کے لقب کی مستحق نہیں تھی ۔

فرخی جب شاعری کے میدان میں ایرانی مشاہیر کا ذکر کرتا ہے تو شہید بلخی اور رودکی اور بوطلب کے سوا کوئی قدیمی نام پیش نہ کر سکا ، چنانچہ :

از دلآویزی و تازی چون غزلهای شہید
وز غم انجامی و خوشی چون ترانہ بوطلب

دیگر

شاعرانت چو رودکی و شہید
مطربانت چو سرکش و سرکب

ساسانی عہد میں شعر کے اصلی نمونوں کی غیر حاضری اور جملہ مورخینِ ایران کی اس بارے میں خاموشی دلیل ہے اس امر کی کہ ساسانی ایرانی اس فن سے واقف نہیں تھے ، البتہ نوائے خسروانی یا نوائے باربدی مشہور ہیں جو زیادہ تر گیت اور نغموں کے مشابہ ہیں اور ان میں وزن و قافیہ کی قید نہیں ہے ، اس لیے عوفی کہتا ہے کہ میں ان کے ذکر سے احتراز کرتا ہوں ۔ صاحب المعجم کا بیان ہے کہ باربد جہرمی نے اپنی خسروانی کی بنا نثر پر قائم کی ہے اور اس میں کلام منظوم نہیں آتا ہے ، اگرچہ مضمون کے لحاظ سے یہ

خسرو پرویز کی مدح ہے ۔ یہ غالباً اسی قسم کی چیز ہے جس کو فردوسی چامہ کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ محقق طوسی اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے اوزان میں مناسبت تامہ نہیں ہوتی ۔ صاحبِ تاریخِ سیستان کہتے ہیں کہ خسروانی کو رود کے ساتھ گایا جاتا تھا ۔

جب اسلام کے ساتھ عربی زبان ایران میں شائع ہوئی اور ایرانی اسلام لا کر عربی علوم و فنون سیکھنے لگے ، اس وقت قومیت کے لحاظ سے وہ ایران ساسانی ایران نہیں رہا تھا ۔ عرب قبائل ایران میں آباد ہو کر ایرانی بن گئے تھے ۔ عرب و عجم اور ترک کے اختلاط نے ایران کو ایک نئی قوم دے دی تھی ، جس کے لیے وطن پرست فردوسی حقارت کے لہجے میں کہتا ہے :

از ایران و از ترک و از تازیان
نژادی پدید آید اندر میان
نہ دھقان نہ ترک و نہ تازی بود
سخنہا بکردار بازی بود

اس میں شک نہیں کہ عربیت ان کی مدنیت اور معاشرت کی ہر صنف ہر پیوست ہو گئی تھی ۔ عربی زبان ان کی مذہبی ، علمی اور سیاسی زبان بن گئی تھی ۔ عربی تقلید میں ایرانیوں میں بھی شاعری کا شوق ہو چلا ۔ اچھے اچھے ایرانی نژاد شاعر پیدا ہونے لگے جو عربی میں شعر کہہ سکتے تھے ۔ اب فارسی زبان میں اس جدید طرز شاعری کا رواج دینا کیا مشکل تھا ۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے ہاں فنون و اشیا کے آغاز و ابتدا کے متعلق ایک عجمب قسم کا نظریہ قائم کر لیا گیا ہے ؛ جو یہ ہے کہ ہر شے اور چیز کا موجد کوئی نہ کوئی خاص شخص ہوا ہے ۔ ہم ایک چیز کے اتفاقیہ ظہور میں آنے اور تدریجی ارتقا کے ذریعے سے اس کے کمال پانے کی تمام تحسین ایک ذاتِ واحد کے سر تھوپ دیتے ہیں ۔ چناں چہ حضرت آدم[ؑ] صفی اللہ کو سریانی کا اور یعرب ابن قحطان کو عربی کا پہلا شاعر فرض کر لیا گیا ہے ۔ اور فارسی میدان میں بہرام گور کے نام پر اول

شاعر ہونے کا قرعۂ فال ڈالا گیا ہے ۔ میں بہرام کی روایت کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتا جس میں فارسی شاعری کی قدامت کی روایات کو شامل کر چکا ہوں ۔ لیکن اس کی عام مقبولیت اور اس کی قدامت اور عام مورخین کا اس پر اجماع قابل تامل ملحوظات ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی اساس پر قائم ہے ۔ صرف دولت شاہ ہی اس کا راوی نہیں ہے بلکہ اس سے مقدم محمد عوفی اس کا ناقل ہے ۔ عوفی کے ہاں بہرام گور کا شعر یوں منقول ہے :

منم آن شیر گلہ منم آن پیل یلہ
نام من بہرام گور و کنیت من بوجبلہ

شمس الدین محمد بن قیس نے المعجم میں یوں لکھا ہے :

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ
نام من بہرام گور کنیتم بو جبلہ

(المعجم فی معاییر اشعار العجم ، صفحہ ١٦٩)

غرر ملوک الفرس ثعالبی میں یوں ملتا ہے :

منم آن شیر شلہ منم آن ببر یلہ
منم آن بہرام گور منم آن بوجبلہ

مسعودی نے بھی 'مروج الذهب' ٣٣٦ھ میں بہرام گور کے عربی و فارسی اشعار کا ذکر کیا ہے ، اگرچہ کوئی شعر اپنی تصنیف میں نقل نہیں کیا ۔ ابن خردادبہ نے اپنی تصنیف 'کتاب المسالک و الممالک' حدود ٢٣٠ھ (چھاپ لیڈن ، صفحہ ١١٨) میں اسی شعر کو نقل کیا ہے جہاں وہ اس کو نثر مسجع بہرام گور لکھتا ہے ۔ چناں چہ :

منم شیر شلنبہ و منم ببر یلہ

کتاب 'هفت قلزم' (بحر سوم ، قلزم هفتم) میں اسی شعر کو قاسم بن سلام بغدادی (متوفی ١٥٠ ، ٢٢٤ھ) کی سند پر اس طرح لکھا ہے :

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ
نام بہرام مرا و پدرم بو جبلہ

جب اس قدر مورخین اس کا ذکر کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی اصلیت کچھ نہ کچھ ضرور ہے ۔ لیکن کئی امور اس کے متعلق قابل لحاظ ہیں ۔ بہرام گور ۴۲۰ع و ۴۳۸ع میں بر سر تخت تھا ۔ کیا اس عہد میں عربی شاعری وجود میں آ چکی تھی ؟ اس میں بھی شک نہیں کہ بہرام نے نعمان بن منذر کے ہاں پرورش پائی تھی ، عربی زبان سے واقف تھا لیکن روایت انھی ماخذ سے آ رہی ہے جس میں یعرب بن قحطان کو عربی کا اور حضرت آدمؑ کو سریانی کا پہلا شاعر مانا گیا ہے ۔

عوفی نے عباس مروزی ۱۹۳ھ کو فارسی کا پہلا شاعر مانا ہے، جس نے ،کہا جاتا ہے ، خلیفہ مامون‌الرشید کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا ، جس کے اول اور آخر کے دو بیت عوفی نے نقل کیے ہیں ۔

بعض اسناد نے حکیم ابو حفص سغدی کو پہلا فارسی شاعر مانا ہے ۔ اس کا شعر یہ ہے :

آهوی کوهی در دشت چگونه دودا
یار ندارد بی یار چگونه رودا

ایک جدید نظریہ وہ ہے جو میرزا عباس خان آشتیانی نے پیش کیا ہے ۔ ایک نامعلوم تاریخ سیستان کے حوالے سے جو منتصف قرن سابع ہجری میں تصنیف ہوئی تھی ، میرزائے موصوف محمد وصیف سجزی کو ، جو ابو یوسف یعقوب بن لیث صفار کا دبیر تھا ، فارسی کا پہلا شاعر مانتے ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ جب یعقوب بن لیث نے ۲۵۳ھ میں ہرات پر قبضہ کر لیا اور امیر محمد طاہری کو مغلوب کر کے اور سیستان ، کابل ، کرمان و فارس کی ریاست اپنے نام لکھوا کر واپس سیستان لوٹا ، تو سیستانیوں نے بڑے جوش اور اہتمام کے ساتھ اس کا استقبال کیا ۔ امام ابو احمد عثمان بن عفان سجزی نے (متوفی ۲۵۵ھ) نماز جمعہ میں اس کا خطبہ پڑھا ۔ شعرا نے مبارک باد میں قصائد لکھے ۔ یہ قصائد عربی زبان میں تھے ۔ یعقوب عربی زبان سے آمی تھا ۔ یہاں سے میں مصنف کی عبارت نقل کرتا ہوں :

"پس یعقوب گفت چیزی کہ من اندر نیابم چرا باید گفت ۔
محمد بن وصیف پس شعر فارسی گفتن گرفت و اول اندر عجم او
گفت پیش ازو کسی نہ گفتہ بود کہ تا پارسیان بودند سخن پیش
ایشان برود باز گفتندی بطریق خسروانی و چون عجم برکندہ
شدند و عرب آمدند شعر میان ایشان بتازی بود و همگنان را
علم و معرفت شعر تازی بود و اندر عجم کسی بر نیامد کہ
او را بزرگی آن بود پیش از یعقوب کہ اندر او شعر گفتندی مگر
حمزہ بن عبداللہ الخارجی (الشاری) و او عالم بود و تازی
دانست شعرای او تازی گفتند و سپاہ او بیشتر از عرب بودند و
تازیان بودند ۔ چون یعقوب زنبیل و عمار خارجی را بکشت و
ہری بگرفت و سیستان و کرمان و فارس او را دادند محمد وصیف
این شعر بگفت :

ای امیری کہ امیران جہان خاصہ و عام
بندہ و چاکر و مولای و سگ بند و غلام
ازلی خطی در لوح کہ ملکی بدہید
بہ ابی یوسف یعقوب بن اللیث ہمام
بلتام آمد زنبیل و لتی خورد پلنگ
لترہ شد لشکر زنبیل و ہبا گشت کنام
لمن الملک بخواندی تو امیرا بیقین
با قلیل الفہ کت داد در آن لشکر کام
عمر عمار ترا خواست وزو گشت بری
تیغ تو کرد میانجی بمیان دد و دام
عمر او نزد تو آمد کہ تو چون نوح بزی
در آکار تن او سرا و باب طعام"

محمد بن وصیف قرن سوم کے اختتام تک معلوم ہوتا ہے شعر
کہتا رہا ہے ۔ چناں چہ صفاریوں کے زوال پر ۲۹۶ھ میں قطعہ ذیل
لکھتا ہے :

مملکتی بود شده بی قیاس
عمرو بر آن ملک شد، بود راس

از حد هند تا بحد چین و ترک
از حد زنگ تا بحد روم و کاس

راس ذلب گشت و بشد مملکت
زر زده شد ز نحوست نحاس

دولت یعقوب دریغا برفت
ماند عقوبت یعقب بر حواس

عمر عمرو رفت و زو ماند باز
مذهب روباه بنس و نواس ؟

ای چه غما آمد و شادی گذشت
بود دلم دایم ازین پر هراس

هر چه بکردیم بخواهیم دید
سود ندارد ز قضا احتراس

ناس شدند نسناس آنکه همه
وز همه نسناس بگشتند ناس

دور فلک گردان چون آسیا
لاجرم این رس همه کرد آس

ملک ابا هزل نکرد انتساب
نور ز ظلمت نکند اقتباس

جهد و جد یعقوب باید همی
تاکه ز جدة بدر آید ایاس (منقول از 'کاوہ')

محمد بن وصیف اور اس کی شاعری اگرچہ فارسی ادبیات کا ایک فراموش شدہ ورق مانے جا سکتے ہیں ، لیکن نہ محمد وصیف اس زبان کا پہلا شاعر ہے اور نہ اُس کی نظمیں فارسی کی اولین نظمیں مانی جا سکتی ہیں ۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ سیستان میں وہ پہلا شاعر ہو۔ بات یہ ہے کہ اس کی شاعری ایسے دور کی یادگار ہے جب کہ

فارسی عروض نے عربی اوزان کے اتباع سے آزادی حاصل کر کے اپنے لیے مختلف شاہراہ اختیار کر لی ہیں -

میری رائے میں ایسی کوشش جس کے ذریعے سے ہم کسی خاص شخص کو شعر کی اوّلیت کی عزت دیں ، بے سود ہے - ہمارے لیے مفید تر یہ امر ہے کہ ہم یہ دریافت کرنے کی سعی کریں کہ شاعری کی ابتدا کس عہد سے ہوئی ہے ، نیز یہ کہ اُس کے قدیمی نمونے کس قسم کے تھے -

میرا ایسا اعتقاد ہے کہ جب عرب فاتحین ایران میں آباد ہوگئے ہیں اور اُن کی بستیاں مختلف مقامات پر قائم ہوگئی ہیں ، تو یہ نوآبادکار اپنے وطنی نغمے یعنی شعر کو نہیں بھولے ، اور جب کچھ مدت کے بعد انھوں نے نئے وطن کی زبان سیکھ لی تو تفنن طبع کی خاطر اپنے قدیمی وطن کے نغمات کو اس زبان میں بھی منتقل کرنے لگے - اس لیے یہ عرب ہیں جو فارسی میں شاعری کو رواج دیتے ہیں - اس سلسلے میں ابن مفرغ کا قصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے -

ابن قتیبہ (طبقات الشعرا ، طبع لیڈن ، صفحہ ۲۱۰) و طبری (تاریخ کبیر ، سلسلہ ۲ ، صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۳) اور ابوالفرج اصفہانی (کتاب الاغانی ، جلد ۱۷ ، صفحہ ۵۶) ذکر کرتے ہیں کہ :

جب عباد بن زیاد برادر عبیداللہ بن زیاد (خلافت یزید بن امیر معاویہ) حکومت سیستان پر مقرر ہوا تو یزید بن مفرغ شاعر نے بھی ارادہ کیا کہ اُس کی مصاحبت میں سیستان چلا جائے - روانگی کے وقت ابن زیاد یعنی عبیداللہ نے شاعر کو خلوت میں بلا کر کہا کہ میں اس بات سے خوش نہیں ہوں کہ تو میرے بھائی کے ہمراہ سیستان جائے ، اس لیے کہ میرا بھائی وہاں جا کر تدابیر جنگ و تحصیلِ خراج کے معاملات میں مصروف ہو جائے گا - ان مشاغل کی بنا پر ممکن ہے کہ تیری طرف سے غفلت برتے ، اور اگر اُس نے تیری منشا کے مطابق تیری آؤ بھگت نہیں کی تو مجھ کو اندیشہ ہے کہ تو اپنے اشعار کے ذریعے سے ہمارے خاندان کو بدنام کر دے گا - ابن مفرغ

نے عرض کی "اے امیر! آپ کی یہ بدگمانی درست نہیں ، آپ کے بھائی کے احسانات مجھ پر اس قدر ہیں کہ میں کسی حالت میں ان کو فراموش نہیں کر سکتا ہوں ۔" ابن زیاد نے کہا کہ اگر واقعی تو جانا چاہتا ہے تو مجھ سے عہد کر جا کہ اگر کسی وقت میرا بھائی تجھ سے تغافل کرے تو تُو اس صورت میں جلد بازی سے کام نہ لے اور قبل از وقت مجھ کو اطلاع دے ۔ ابن مفرغ نے کہا کہ بے شک میں اس معاہدے کا پابند رہوں گا ۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب یہ لوگ سیستان پہنچے، عباد امور ریاست میں اس قدر مصروف رہا کہ اس کو شاعری کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ابن مفرغ ملول رہنے لگا ۔ آخر اس قدر تنگ ہوا کہ ابن زیاد کے ساتھ اپنا عہد و پیمان فراموش کر کے عباد کی مذمت پر قلم اٹھایا ۔ ابن مفرغ ایک روز عباد کے ہم رکاب چل رہا تھا ۔ ایک اور شخص بھی ہمراہ تھا ۔ عباد کی ڈاڑھی ، جو گھاس کے پولے کی طرح لمبی تھی ، ہوا سے پریشان ہو کر ہر طرف حرکت کرنے لگی ۔ ابن مفرغ اس پر مسکرایا اور اپنے ہمراہی سے کہنے لگا :

الا ليت اللحى كانت حشيشا
فنعلفها خيول المسلمينا

یعنی کاش ڈاڑھیاں گھاس ہوا کرتیں تا کہ مسلمانوں کے گھوڑوں کا چارہ بنتیں ۔

اس شخص نے یہ شعر عباد کو سنا دیا ۔ وہ بہت برہم ہوا لیکن ابن مفرغ سے کچھ نہیں کہا ۔ ایک روز عباد گھوڑ دوڑ میں اول رہا ۔ شاعر نے اس کارنامے کو اس طرح شہرت دی :

سبق عباد و صلت لحيته

یعنی عباد اول رہا اور اس کی ڈاڑھی دوسرے نمبر پر رہی ۔

بالآخر عباد نے اس کی ہجووں سے تنگ آ کر بے مروتی سے کام لیا اور لوگوں سے اس پر دعوے کرا دیے ۔ جب وہ اپنے قرضے کی ادائگی سے عاجز آ گیا ، قید خانے میں بھیج دیا گیا ۔ اس کے غلام

اور کنیز، جن سے اس کو بے حد محبت تھی، جبراً فروخت کر دیے گئے۔ ابن مفرغ قید سے بھاگ کر بصرے پہنچ گیا۔ وہاں سے شام اور پھر شہر بہ شہر بھاگتا پھرا۔ آل زیاد کی ہجو، ان کے نسب میں طعن و طنز، زیاد کی ماں سمیہ کی بدکاری اور اس کے ناجائز تعلقات کے قصوں کی اپنی نظموں میں برابر اشاعت کرتا رہا۔ آخرکار بہ دشواریِ تمام ابن زیاد نے اس کو گرفتار کیا اور بصرے میں قید کر دیا اور یزید سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ یزید نے لکھا کہ اس کو جس قدر دل چاہے اذیت دو لیکن خبردار اس کے قتل کا ارادہ نہ کرنا، کیوں کہ اس کی قوم و قبائل بہت ہیں اور سب میری فوج میں ملازم ہیں۔ اگر تم نے اس کو قتل کر ڈالا تو وہ سب کے سب بالاتفاق تمھارے خون کے طالب ہوں گے۔ جب ابن زیاد کے پاس یہ حکم پہنچا، اس نے مفرغ کی آزار رسانی کے خیال سے اس کے ساتھ ایک بلی، ایک سؤر اور ایک کتا باندھ دیے اور نبیذ شیریں شبرم میں ملوا کر اس کو پلوا دی جس سے اس کی طبیعت میں سرور اور روانی پیدا ہوگئی۔ اس حال سے شہر کے کوچہ و بازار میں اس کی تشہیر کی گئی۔ لڑکوں کا غول اس کے پیچھے تھا۔ وہ شور مچاتے تھے اور تماشائی فارسی زبان میں پوچھتے تھے کہ "این چیست" ابن مفرغ، جو فارسی زبان سے واقف تھا، فارسی نظم میں جواب دیتا تھا:

آب ست نبیذ ست عصارات زبیب است
سمیہ رو سپیذ ست

آخرالامر قید کی سختیوں سے شاعر کی صحت برباد ہونے لگی، ابن زیاد کو اس کے مر جانے کا اندیشہ ہو گیا، اس لیے سیستان اس کو مقید روانہ کر دیا۔ اس وقت قبائلِ یمن کو، جو شام میں مقیم تھے، اس کی اطلاع پہنچی۔ ان کے رؤسا یزید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاعر کی رہائی کی درخواست کی۔ جب ان کی التجا نے تہدید کا رنگ اختیار کر لیا، یزید نے درخواست منظور

کر لی اور ابن مفرغ کو قید سے آزادی دلوا کر موصل میں جگہ دے دی - (از رسالۂ 'کاوہ')

یہ واقعہ یزید بن معاویہ (۶۰ و ۶۴ھ) کے عہد میں ظہور پزیر ہوتا ہے ، اس لیے ظاہر ہے کہ ابن مفرغ کی یہ نظم فارسی نظم کی مثالوں میں قدیم ترین نمونہ مانا جا سکتا ہے - اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وزن اور قافیہ موجود ہے اور عربی اوزان سے اس کا تعلق ہے - علاوہ بریں اس کا قائل ایک عرب شاعر ہے اس لیے اس کو فارسی کے قدیم ہجائی طرز کے نمونوں سے کوئی مناسبت نہیں ہے - اس کا وزن ہے :

آبست = مفعول ، نبیذست = مفاعیل

عصارات = مفاعیل ، زبیب ست = مفاعیل

سمیہ رو = مفاعان ، سپیذست = مفاعیل

یہاں پہلے شعر کے صدر و ابتدا میں موفور اور اخرب جمع ہو گئے ہیں جو قدما کے نزدیک بالکل جائز تھا -

طبری کی تاریخ کبیر میں ۱۰۸ھ کے وقائع کے ذیل میں ایک اور تاریخی واقعہ ، جو ہماری تلاش پر کسی قدر روشنی ڈالتا ہے ، نظر افروز ہوتا ہے ، جس کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے - وہ کہتا ہے کہ :

اس سال ابو منذر اسد بن عبداللہ القسری والیِ بلخ نے ختلان پر لشکر کشی کی اور خاقانِ ترک کے ساتھ مصروفِ کارزار ہوا - خاقان نے اس کو شکست فاش دی - اسد بن عبداللہ بحالت تباہ واپس بلخ آ گیا - بلخیوں نے ، جن کے جذبات ہمدردی صریحاً خاقان کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں ، اپنے والی کی اس ہزیمت کو فارسی اشعار میں شہرت دی اور لڑکے کوچہ و بازار میں یہ نظم گاتے پھرتے تھے :

ز ختلان آمدیہ   برو تباہ آمدیہ

ابار باز آمدہ   خشک نزار آمدیہ

یہ بحر هزج مربع مخبون ہے -

کتاب المسالک و الممالک ابن خردادبہ (حدود ۲۳۰ھ، صفحہ ۲۶۰، طبع لیڈن) میں ابوالینبغی العباس بن طرخان کے شہر سمرقند کے متعلق یہ اشعار ملتے ہیں جو مثنوی کی طرز میں ہیں :

سمرقند کند مند　　بذینت کی فکند

از شاش تہ بہی　　ہمیشہ تہ خہی

ابوالینبغی عباس کے حالات[1] معلوم نہیں کہ کس زمانے سے اس کا تعلق ہے؟ اور عربی کاتبوں نے ان اشعار کا اس قدر ستیاناس کر دیا ہے کہ وزن کا سراغ لگانا بجائے خود ایک دشوار کام ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، عربی طرز میں فارسی نظموں کا رواج غالباً عربوں سے شروع ہوتا ہے۔ ابن المفرغ کے علاوہ ایک اور شاعر محمد بن البعیث بن جلیس متوفیٰ ۲۳۵ھ ہے جس کے لیے طبری (سلسلہ ۳، صفحہ ۱۳۸۸) کہتا ہے :

"حکایت کرد مرا کہ در مراغہ جمعی از پیران آنجا اشعار فارسی از ابن البعیث برای او خواندند۔"

ابوالاشعث قمی کے فارسی ابیات کا ذکر 'معجم الادبا' (طبع لیڈن، جلد ۹، صفحہ ۱۲۴) میں آتا ہے، جہاں لکھا گیا ہے کہ ابومسلم محمد بن بحر اصفہانی نے (صفحہ ۲۵۴ و ۳۵۴) ان اشعار کے متعلق چند بیت لکھے تھے۔

ارتقاے عروض :

اس سلسلے میں ہمیں علم عروض کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ہمارے تفتیش طلب سوال پر یہ علم بھی کسی قدر روشنی ڈالتا ہے۔ بدقسمتی سے عروض کی تاریخ کی غیرحاضری نے ہمارے کام کو بے حد دشوار بنا دیا ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہے کہ فارسی

۱ - ابوالینبغی عباس کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو آقاے عباس اقبال آشتیانی کا مضمون، شائع شدہ رسالہ 'مہر' شمارہ ۱۰، سال اول - (مرتب)

عروض بہ تتبع ِ عروض ِ عرب ایجاد ہوئی ، لیکن وہ ہستیاں جنھوں نے اس کی ترویج میں محنت کی، اور وہ ہاتھ جنھوں نے اس کی تعمیر کی بنیاد ڈالی ، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج ہم ان کی حقیقت ِ حال سے بے خبر ہیں ۔ ابتدائی حالات کی کڑیاں ، جو دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں ، سب برباد ہوگئی ہیں ۔ پانچویں قرن میں اس پر مستقل تصنیفات معتدبہ مقدار میں لکھی جاچکی ہیں لیکن عنصرالمعالی کیکاؤس کے مختصر بیان کے سوا سب کچھ مفقود ہے ۔

قرن ہفتم کی عروضی تصنیفات میں دو نہایت ضروری کتابیں ہم تک پہنچی ہیں ؛ پہلی ''المعجم فی معاییر اشعار العجم'' ، تالیف شمس الدین محمد بن قیس الرازی، جو اس قرن کے ربع اول میں تصنیف ہوئی ۔ دوسری ''معیار الاشعار'' خواجہ نصیر الدین طوسی ، جو اسی صدی کے ربع سوم میں لکھی گئی ہے ۔ میں ان بزرگوں کے مختلف بیانات و اشارات و دیگر مصنفین کے اقوال کی روشنی میں عروض کی تعمیری تاریخ کے مطالعے کی کوشش کرتا ہوں ۔

فارسی عروض کے ابوالبشر مولانا یوسف عروضی نیشاپوری ہیں ۔ جو تعلق خلیل بن احمد بصری کو عربی عروض کے ساتھ ہے ، وہی علاقہ ان کو فارسی کے ساتھ ہے ۔ ان[1] کے عہد کے متعلق ہم کو اسی قدر علم ہے کہ خلیل سے تقریباً دو صدی بعد گویا قرن چہارم میں گزرے ہیں ۔ عروض میں وہ صاحب ِ تصنیف تھے ۔ 'تنقید الدرر'[2] میں صاف تلمیح ہے ۔ بحر قریب ان ہی کی ایجاد مانی

۱ ۔ 'معیار الاشعار و میزان الافکار' صفحہ ۹۱ ، سنہ ۱۲۶۴ھ ، مطبع علوی ۔ (حاشیہ ٔ مصنف)

۲ ۔ 'تنقید الدرر' پایندہ محمد المتخلص بقضائی ۔ یہ تالیف 'معیار الاشعار' اور 'المعجم' کے بعد خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ اگرچہ ۹۹۹ھ کی تصنیف ہے اور عبداللہ خاں اوزبک والی ِ توران کے لیے لکھی گئی ہے ، لیکن اس میں بعض مفید تاریخی اشارات ملتے ہیں ۔ (حاشیہ ٔ مصنف)

جاتی ہے ۔ لغت فرس اسدی ، فرہنگ جہانگیری و رشیدی میں ان کے اشعار ملتے ہیں ۔

مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ عروض کی تدوین مولانا یوسف عروضی کے ہاتھوں سے ہوئی ہے ، عروض فارسی یقیناً اُن کے عہد سے پیش تر عربی عروض سے علیحدہ ہو چکی تھی ۔ چنانچہ حنظلہ بادغیسی ۲۱۹ ھ اور محمد بن وصیف سجزی کے اشعار میں ، جو یعقوب بن لیث صفار کے عہد کا ادیب ہے ، اور رودکی کی نظموں میں ، جو ۳۲۹ھ میں وفات پاتا ہے ، ایسے اوزان ملتے ہیں جو فارسی طرزِ عروض کے رنگ میں ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے قرن میں فارسی عروض اپنے مدارجِ ارتقا میں بہت کچھ ترقی کر چکی تھی ۔

فرالاوی نے ، جو رودکی کا معاصر ہے ، بحر مقلوب طویل ایجاد کی[1] ۔ عبداللہ فوشی نے دائرہ منعکسہ ایجاد کیا[2] ۔ قرن پنجم میں فرخی شاعر نے ترجمان البلاغت[3] ، احمد بن محمد المنشوری السمرقندی نے صفت تلون میں 'کنز الغرائب' تصنیف کی ۔ ابوالحسن علی

۱ ۔ معیار الاشعار ، صفحہ ۴۰ ، بحوالہ بہرامی سرخسی ۔ (حاشیہ مصنف)

۲ ۔ 'المعجم فی معاییر اشعار العجم' بحوالہ 'غایۃ العروضیین' بہرامی سرخسی ۔ (حاشیہ مصنف)

۳ ۔ 'ترجمان البلاغت' کے فرخی کی تصنیف ہونے کی روایت بڑی قدیم ہے اور یاقوت کی معجم الادبا تک پہنچتی ہے ۔ اتفاق سے کتب خانہ فاتح استنبول سے 'ترجمان البلاغت' کا ایک ایسا نسخہ دستیاب ہوا جو ۵۰۷ ہجری کا مخطوطہ تھا ، یعنی 'معجم الادبا' سے تقریباً ایک صدی پہلے کا ۔ اس نسخے سے یہ انکشاف ہوا کہ 'ترجمان البلاغت' ، فرخی نہیں بلکہ محمد بن عمر الرادویانی کی تصنیف ہے ، البتہ قرن پنجم ہجری سے ضرور تعلق رکھتی ہے ۔

'ترجمان البلاغت' کا مذکورہ بالا نسخہ استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر احمد آتش نے سنہ ۱۹۴۹ع میں شائع کرا دیا ہے ۔ (مرتب)

البہرامی سرخسی نے 'غایۃ العروضین' 'کنز القافیہ' اور 'خجستہ نامہ' تالیف کیں۔

ہمارے نقطۂ نظر سے غایۃ العروضین نہایت اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ ایک مدت دراز تک فارسی اور عربی عروضیوں کے لیے مستند ماخذ کا کام دیتی رہی ہے۔ بہرامی کے حوالے جہاں محقق طوسی اور شمس الدین محمد بن قیس کے ہاں ملتے ہیں، اسی قدر اعتبار سے اس کے حوالے جار اللہ زمخشری وغیرہ کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ اسی عہد میں امیر ابو منصور وسیم بن ابراہیم القائنی المعروف بہ ابوزر جمہر نے بحر جدید[1] دریافت کی۔ اسی ابوزر جمہر اور بہرامی مذکور نے اکیس نئی بحریں یعنی: ۱ - صریم - ۲ - کبیر - ۳ - بدیل - ۴ - قلیب - ۵ - حمید - ۶ - صغیر - ۷ - اصم - ۸ - سلیم - ۹ - حمیم - ۱۰ - مصنوع - ۱۱ - مستعمل - ۱۲ - اخرس - ۱۳ - مبہم - ۱۴ - معکوس - ۱۵ - مہمل - ۱۶ - قطع - ۱۷ - مشترک - ۱۸ - معمم - ۱۹ - مستر - ۲۰ - معین اور - ۲۱ - باعث، وضع کیں[2]۔ ان میں پہلی نو بحریں دائرۂ منعکسہ سے تعلق رکھتی ہیں، جس کے موجد عبداللہ قوشی ہیں۔ بعد کی چھ دائرۂ منعلقہ سے اور آخری چھ دائرۂ منغلطہ سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اسی قرن میں وزن رمل مثمن مشکول دریافت ہوتا ہے جس کو محقق طوسی متاخرین کی ایجاد بیان[3] کرتے ہیں یہ وزن سب سے پیش تر خواجہ مسعود بن سعد بن سلمان کے ہاں ملتا ہے، چنانچہ مثال:

ملکا جہان بعدل تو بنوبہار ماند
کف راد تو بدین ابر زمین نگار ماند

---

۱ - تنقید الدرر۔

۲ - المعجم فی معاییر اشعار العجم، صفحہ ۱۰۱۔

۳ - معیار الاشعار، صفحہ ۵۸۔

قطان ، معاصر رشید الدین وطواط ، واضع شجرۂ اخرم و اخرب ہیں ۔ رشیدی سمرقندی نے اسی قرن میں 'زینت نامہ' اور رشید الدین وطواط نے 'حدائق السحر' تصنیف کیں ۔ اس سلسلے میں ہمیں نظامی عروضی سمرقندی کا بھی ذکر کر دینا چاہیے ۔ اگرچہ معلوم نہیں کہ اس نے فن عروض کی کیا خدمت کی مگر عروضی کا خطاب اس کے نام کے ساتھ آج تک وابستہ ہے ۔

اوزانِ ذیل اسی قرن کی یادگار ہیں :

(۱) رجز مطوی : اس کے متعلق محقق طوسی کہتے ہیں کہ متاخرین نے خبن اور طی کی تکرار سے (یعنی مفاعلن مفتعلن یا بالعکس مفتعلن مفاعلن) خوش گوار وزن استخراج کیے ہیں[۱] ۔ مثال مخبون مطوی :

ز نیکوان لطف و کرم سزا تر از جور و ستم
مدار ازین بیش بہ غم دل مرا ماہ رخا

مثال مطوی مخبون ۔ خاقانی :

چشمۂ خضر ساز آب از لب جام کوثری
کز ظلمات بحر جست آئینۂ سکندری

آخری وزن انوری کے ہاں نہیں ملتا اور سب سے بیشتر خاقانی کے قصائد میں ملتا ہے ۔ محقق فرماتے ہیں کہ فارسی میں رکن شمالی بھی پایا جاتا ہے جو دو وتد اور ایک سببِ خفیف کی ترکیب سے بنا ہے بروزن 'مفاعلاتن' اور اس کے مربع میں میں نے ایک شعر سنا تھا جو اب یاد نہیں آتا لیکن وزن یہ ہے[۲] :

اگر بدانی کہ بی تو چونم
مرا درین غم روا نداری

اس کے ضمن میں امیر خسرو کی ایک غزل جس کی کوئی قدیم سند

۱ ۔ معیار الاشعار : صفحہ ۵۳ ۔
۲ ۔ معیار الاشعار : صفحہ ۷۱ ۔

مجھ کو معلوم نہیں ، ہمارے ہاں مشہور ہے :

ز حال مسکیں مکن تغافل درآی نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ھجران ندارم ای جان نہ لیو کاہے لگائے چھتیاں

فارسی میں بہرحال عصمت بخاری نے اس میں شعر لکھے ہیں :

زهی دو چشمت بخون مردم کشاده تیر و کشیده خنجر
رخ چو ماهت صباح دولت خط سیاهت شب معنبر

اوزان ذیل متاخرین کی کوششوں کے نتیجے ہیں ۔ حافظ شیرازی :

گر تیغ بارد در کوی آن ماه
گردن نهادیم الحمدلله

امیر خسرو دہلوی :

چست کن قبا بر تن تند کن فرس بر من
گہ بسینہ جولان زن گہ بدیدہ میدان کن

امیر خسرو دہلوی :

رای پتھورا پوری داشت
پور نگویم حوری داشت

مولانا جامی :

سرو گلعذار منی فصل نوبہار منی
من اگرچہ ننگ تو ام عز و افتخار منی

ایضاً :

زلف معنبر بر مہ رویت تیرہ شب ست و آتش موسیٰ
جامۂ صبرم در کف عشقت دامن یوسف دست زلیخا

بیدل :

چہ بود سروکار غلط سبقان در علم و عمل بفسانہ زدن
بہ قبول دلائل بی خبری ہمہ تیر خطا بہ نشانہ زدن

ایضاً :

صنما خیالت را چہ شد کہ بما ندارد الفتی
خجلم ز داغت کز وفا بسرم گذارد منتی

اس مختصر بیان سے کم از کم اس قدر ضرور واضح ہوتا ہے کہ عروض فارسی غزنوی دور سے پیشتر ہی تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور ایجاد و دریافت کا دروازہ ہر وقت کھلا رہا ہے۔ ذیل میں امیر عنصر المعالی کیکاؤس صاحب 'قابوس نامہ' کے بیانات دیے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے :

"و دوائرہا کہ اندر عروض پارسیان ست بشناس و نام ہر یک نیکو بدان و نام بحر ہا کہ از دائرہہا برخیزد چون ہزج و رمل و ہزج منسوب و رجز اخرب و رجز مطوی و رمل مخبون و منسوخ و خفیف و مضارع اخرب و مقتضب و مجتث و متقارب و سریع و قریب اخرب و منسرح کبیر ۔ و وزن ہای تازیان چون بسیط و مدید و کامل و وافر و طویل و مانند آن و آن پنجاہ و سہ عروض و ہشتاد و دو ضرب کہ درین ہفدہ دائرہ بیاید جملہ معلوم خویش گردان ۔"

عنصرالمعالی کے عہد میں عربی و فارسی بحور کی تفریق ایک مسلمہ واقعہ تھا ۔ اس کے ہاں صرف سترہ بحور کا ذکر ہے ۔ بحر متشاکل و بحر جدید (غریب) ان میں شامل نہیں ہیں ؛ حالانکہ موخرالذکر غزنوی دور کی یادگار ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر بحر متشاکل بھی اسی دور میں دریافت ہوئی ہو ۔

جب کہ طویل و بسیط و مدید و کامل و وافر عربی بحور ہیں ، قریب و جدید و متشاکل خالص فارسی الاصل ہیں ۔ باقی گیارہ بحریں یعنی ہزج ، رجز ، رمل ، منسرح ، مضارع ، مقتضب ، مجتث ، سریع ، خفیف ، متدارک و متقارب فارسی و عربی میں عام ہیں ۔

اب غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ عربی بحریں طویل و بسیط و مدید و وافر و کامل فارسی میں مقبول کیوں نہیں ہوئیں ۔ اس کا جواب میرے خیال میں زیادہ تر ایران و عرب کی آب و ہوا کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے ۔ جس طرح ایک ملک کی آب و ہوا اس کی مدنیت و معاشرت ، رسم و رواج پر اثر ڈالتی ہے ، اُسی طرح ملک کی

زبان پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ عرب جو جیم فارسی ، زاے فارسی اور کاف فارسی کے تلفظ کے عادی نہیں ، اور عجمی جو صاد سعفص و ثاے ثخذ کے ادا کرنے سے قاصر ہیں ، اس کا جواب آب و ہوا کی مغایرت میں موجود ہے۔ یہ بھی آب و ہوا کا تقاضا ہے کہ ہم ایک زبان میں توالیِ حرکات ، دوسری میں توالیِ سکنات دیکھتے ہیں ۔ عربی میں توالیِ حرکات کثرت کے ساتھ مشاہدہ کی جاتی ہے ، مثلاً طَیَران، جَوَالان ، حَدَثان ، عَطَشان ، سَفرجل ، قذ عمل ، کہ ان خماسی الفاظ میں صرف ایک حرف ساکن ہے، یا فَتَرس ، کَتَف، عُنُق ، عَضُد ، جن میں تمام حروف متحرک ہیں۔ ایرانیوں کے لیے یہ توالیِ حرکت سخت ناگوار تھی اس لیے انھوں نے اپنی زبان میں استعمال کے وقت ان کی حرکات کو معتدل کردیا جس سے ان کے قاعدۂ تفریس کی بنیاد پڑتی ہے۔

برخلاف اس کے فارسی زبان کے الفاظ کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ کثرتِ حرکات کی برداشت نہیں کرسکتی ۔ اس میں زیادہ تر مختلس حرکات یا یوں کہو توالیِ سکنات ملاحظہ کی جاتی ہیں ، مثلاً دوست ، گوشت ، پوست ، پارس ، خواست وغیرہ میں تین تین حروف غیر متحرک ہیں اور صرف ایک ایک حرف متحرک ہے۔ بلکہ 'خواست' کی حالت نہایت عجیب ہے۔ گشتاسپ ، گرشاسپ ارجاسپ جیسے اسماء میں پھر چار چار حرف[1] ساکن ہیں ۔ اس روشنی

۱ ۔ عربی اوزان کو اپنی زبان میں رواج دینے کی خاطر ایرانی اس قسم کے الفاظ پر حرکت منتقل کر دینے کے لیے مجبور ہوئے ، چنانچہ عروضیوں نے یہ قاعدہ ایجاد کیا کہ نظم میں جہاں تین ساکن حرف جمع ہو جائیں ان کے درمیانی حرف کو متحرک کر لیا جائے۔ مثال دقیقی :

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت
فرود آمد از تخت و ہیکل بہ بست

اگر دو ساکن ہوں تو آخر کو متحرک کر لیا جائے۔ یہ قاعدہ فارسی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

میں دیکھا جاتا ہے کہ ایران میں عربی بحریں مثلاً وافر و کامل ، جن کے سباعی ارکان میں پانچ حرف متحرک ہیں اور دو حرف ساکن ، ہرگز ہرگز قبولیتِ عام کا خلعت نہیں پاسکتی تھیں ۔

اس اساسی اختلاف نے عرب و عجم کے مذاق و موسیقی و عروض میں بے حد تباین بلکہ بعد المشرقین پیدا کردیا ۔ چنانچہ یہ بات ہر شخص کو کھٹکتی ہے ۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں :

”جب ہم فارسی نظم کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہیں اور عربی کی نظموں کو دیکھتے ہیں تو ایک کا سایہ بھی دوسرے سے نہیں ملتا ۔“

اب میں عرب و عجم کے مذاق کے اختلاف کو لیتا ہوں اور مثال میں وزن بحر ہزج اخرب مقبوض کا ذکر کرتا ہوں ۔ یہ وزن ہمارے ہاں نیز ایران میں ، جو اس کی ولادت گاہ ہے ، بہت مقبول ہے ۔ نسیم نے اپنی مشہور مثنوی اسی وزن میں لکھی ہے ۔ عرب میں مولدین متاخرین نے بہ تتبعِ عجم اس میں اشعار لکھے۔ سب سے پہلے بہاء ابن زہیر نے طبع آزمائی کی ۔ اس کی تقلید میں مالک بن مالقی اور حاتم بن ابدل نے قلم اٹھایا ۔ اگرچہ ایسے اساتذہ اس وزن کے حامی تھے لیکن عربی میں اس کو فروغ نہیں ملا ۔ حتٰی کہ اسنوی نے آ کر اعلان کردیا کہ وہ غیر موزوں ہے ۔ یہ ایک روشن مثال ہے عرب کے مذاق کی ۔

ایرانی مذاق کی طرفگی کی ایک اچھی مثال وزن رجز مخبون ہے ۔ یہ وزن عربی میں عام ہے اور عجمی عروضیوں نے بہ تقلیدِ عرب ضرورۃً اس کا ذکر کیا ہے لیکن عجمی شعرا نے کبھی اس پر التفات تک نہیں کیا ، حتٰی کہ فن عروض کے کامل ایک ہزار سال بعد قاآنی نے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

شاعری کی قدامت کے معتقدین کے تمام نظریوں کو متزلزل کرنے کے لیے کافی ہے کیوں کہ اگر عروض ان میں مختلف ہوتی تو اصول بھی مختلف ہوتے ، نہ ایسے اصول جن سے خود فارسی الفاظ کی صورت مسخ ہو جائے ۔ (حاشیۂ مصنف)

آ کر اس کی شگفتگی و خوش‌نوائی کا سکہ ہمارے قلوب پر جما دیا ۔ وہ کہتا ہے :

بنفشہ رستہ از زمین بطرف مرغزارہا
و یا گسستہ حور عین ز زلف خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدہ‌ای چسان جہد شرارہا
ببرگ ہای لالہ بین میان لالہ‌زارہا
کہ چون شرار می‌جہد ز سنگ کوہسارہا

قاآنی کی تقلید میں ہمارے ملک میں بھی اس کا رواج ہونے لگا ہے ۔

بحرِ کامل : اس کی مربع شکل عربی میں نہایت عام ہے لیکن ایرانی مذاق کی بوالعجبی دیکھیے کہ کبھی بھول کر بھی اس کی طرف اعتنا نہیں کی ۔ آخر بیدل نے فارسی میں اور ان کی تقلید میں ظفر نے اردو میں اور قرۃالعین نے فارسی میں اس پر غزلیں لکھیں ۔ یہاں ظفر کے ایک شعر پر کفایت کی جاتی ہے :

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

عرب اور عجم کے مذاق کی بے تعلقی نے علیحدہ علیحدہ راستے پیدا کردیے ہیں ۔ ان زبانوں کے اوزان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اپنے لیے اوزان تلاش کرنے میں ایک خاص اصول پر کاربند ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ عرب ماہرین بوجہ ثقالتِ الفاظ و کثرتِ حرکات اپنے اوزان کو ، جب کہ مسدسات اور مربعات کے دائرے میں محدود رکھتے ہیں، ایرانیوں نے عام طور پر اپنے اوزان کو مثمنات کا پابند کردیا ہے اور یہی وہ امتیازی اصول ہے جس نے آخر کار عربی و فارسی عروض میں اساسی تفریق پیدا کر دی ۔ دائرۂ مجتلبہ کی بحریں عربی میں مسدس الارکان ہیں ۔ ایرانیوں نے ان کو مثمن مانا ہے ۔ اس طرح دائرۂ مشتبہ کی بحور منسرح ، مضارع ، مقتضب و مجتث کو مثمن قرار دیا ۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ ان کی زبان میں مختلسہ حرکات پائی جاتی ہیں ۔ اسی بنا پر تطویلِ وزن کی متحمل ہوسکتی ہے ۔ لیکن یہ انقلاب

فارسی شاعری میں کس وقت کارفرما ہوا؟ آیا وہ اتفاق اور شخصی دریافت کا نتیجہ تھا یا تدریجی اور ارتقائی؟ ہماری موجودہ معلومات اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں ۔ ایرانیوں میں غالبا خلیل کے عروض کے روشناس ہونے کے ایک عرصے بعد اس اصول کا رواج ہوتا ہے ۔ اس سے پیشتر ایرانی اپنی نظمیں بہ تقلید عرب مربعات و مسدسات میں لکھتے تھے ۔ مگر یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس اصول کے ابتدائی دریافت کرنے والے عرب ہیں ۔ چنانچہ دائرۂ مختلفہ و دائرۂ متفقہ عربی میں بھی مثمن الاصل ہیں ۔ اوزانِ متقارب مثمن سالم و محذوف و مقصور کو اہل ایران 'راہِ اعشٰی' کہتے ہیں ۔ محقق کا بیان ہے :

''این سہ وزن را پارسی گویان راہِ اعشٰی خوانند از جہت آنکہ ابیات اعشٰی بزین وزن ست[1]۔''

بحر ہزج اگرچہ عربی میں مسدس الارکان ہے لیکن یزید بن امیر معاویہ نے اس کی وافی میں اشعار لکھے ہیں ۔ چنانچہ یہ شعر :

انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق
ادر کاساً و ناولہا الا یا ایہا الساق

ایک اور نمایاں فرق جو فارسی شاعری کو عربی شاعری سے ممتاز کرتا ہے ، اس کے اصول عروض کی پابندی ہے ، جس نے اس کے اشعار میں بے مثل موزونیت و موسیقیت پیدا کر دی ہے ۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ فارسی زبان کی نوعیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کے اشعار میں موزونیتِ تامہ موجود ہو ۔ ان میں خفیف سا خفیف تغیر بھی ناگوار گزرتا ہے اور طبیعت کو مکدر کرتا ہے ۔ خلیل کے عروض کے تتبع نے اس بارے میں ان کو بے حد کامیاب کر دیا ۔ اس کے مقابلے میں عربی شاعری اپنے زحافات کے بے موقع استعمال ، قواعد سے عدمِ اعتنا اور قلتِ اوزان کے لیے رسوا ہے ، کیونکہ شعرائے جاہلیت کے سامنے اپنے اشعار کہتے وقت طبعی

---

۱ ۔ معیار الاشعار : صفحہ ٦٩ ۔

موزونیت کے سوا کسی قسم کا عروضی ضابطہ موجود نہیں تھا اور زبان نے مصرعوں میں اختلاف اور تغیر کی گنجائش کو ممکن ہی کردیا تھا ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زحافات کی کثرت سے ان کے اکثر اشعار فگار ہوتے ہیں ۔ قصیدہ بھر میں مشکل سے دو چار شعر ایسے نکلیں گے جو زحافات کے عملِ جراحی سے سلامت ہوں ۔ میں متنبی کا ایک صاف سا شعر نقل کرتا ہوں :

انما بدر بن عمار سحاب
هطل فیه ثواب و عقاب

اس کا وزن ہے :

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن
فعلاتن فعلاتن فعلاتن

یعنی پہلا مصرع سالم ہے اور دوسرا مصرع مخبون ۔ اب ایسا اندھیر فارسی زبان میں ناممکن ہے ۔ اصل یہ ہے کہ علم عروض اگرچہ عربوں نے ایجاد کیا لیکن اس کا فائدہ ایرانیوں نے اٹھایا ، جس نے ان کی شاعری کو چارچاند لگا دیے ۔ عروض کی رہنمائی کے اثرات میں ایرانی اذواق صحیح موزونیت کے اس قدر شیفتہ ہو گئے تھے کہ اوزان میں ادنلی سے ادنئی اختلاف بھی ، جو قواعد عروض اور استادوں کے کلام کی رو سے جائز مانا گیا تھا ، قابل اعتراض سمجھا جانے لگا تھا ۔ شمس الدین محمد بن قیس کا بیان ہے کہ ایک صاحب نے انوری کے ایک شعر پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ کم سے کم ایسے زحاف میں اپنے اشعار میں روشناس نہیں کرتا اور وہ شعر یہ ہے :

تو آن کریمی کافراط اصطناع کفت
بدان کشید کہ کان همچو بحر نالہ کند

اس شعر کا وزن ہے :

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن (دوبار)

انوری پہلے مصرع میں از روئے تسکین 'فعلاتن' کے بجائے 'مفعولن'

لے آیا ہے ۔ حالانکہ فارسی نظموں میں شاذ و نادر ہی ایسے موقعے ہوتے ہیں جہاں اس قسم کا اختلاف نظر آتا ہے ۔ فترتِ مغول کے بعد یہ رواج قریب قریب معدوم ہو گیا لیکن دیکھا جاتا ہے کہ فی زماننا ملت پرست ایرانی فرخی اور منوچہری کی تقلید کے موثرات میں ان فراموش شدہ اغلاط کا اعادہ کر رہے ہیں ۔

ذیل میں ان اوزان سے بحث کی جاتی ہے جو غالباً سب سے پیشتر ایران میں رائج ہوئے۔ مولانا آزاد مرحوم ایک موقعے پر فرماتے ہیں :

"بہت خوب ! مان لیا کہ فارسی نے نظم کی کھجوریں عرب ہی کے ہاتھ سے لیں ، تب ضرور تھا کہ ابتدائی حال میں جو کچھ کہا تھا وہ عرب کی اصلی بحروں میں ہوتا ۔ بلکہ مدت دراز تک اسی انداز میں کہتے رہتے ، ایک عرصے کے بعد تراش و ترمیم اس منزل تک پہنچاتی ۔ ساتھ اس کے جس طرح دوسری تیسری صدی کی اور تصنیفیں ہیں اسی طرح نظم کے نمونے بھی جدا جدا امتیاز کے ساتھ موجود ہوتے ، لیکن ہم دیکھتے ہیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیکھتے ہیں کہ کوئی مثنوی ، قصیدہ ، غزل اس عہد کی یادگار ہو مگر نمونے کو بھی ہاتھ نہیں آتی ۔"

اس میں شک نہیں کہ ایرانی شاعری کے پہلے ورق پر پردہ پڑا ہوا ہے کیونکہ تمام ابتدائی نمونے برباد ہو گئے ہیں ۔ تاہم گزشتہ بیانات کی روشنی میں اس قدر قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ فارسی شاعری عربی ماحول میں اپنی آنکھ کھولتی ہے ۔ ان کے ابتدائی نمونے جس قدر ہوں گے ان سے ایرانیوں کی اندھی تقلید کا راز کھلتا ہوگا ۔ کتبِ عروض کی طرف رجوع کرنے سے بہت کچھ ایسا ذخیرہ دریافت ہو سکتا ہے جو قدما کے ہاں رائج تھا اور متاخرین کے ہاں مہجور الاستعمال ہے ۔ اگرچہ تاریخ کی غیرحاضری میں قطعی طور پر یہ بتایا نہیں جا سکتا کہ اس متروک ذخیرے کا کس عہد میں رواج تھا ، تاہم سامانی دور کی شاعری کے تفحص سے ، جس کے نمونے گو قلیل

مقدار میں ہم تک پہنچے ہیں ، یہ نکتہ آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے کہ ان ایام میں اس ذخیرے کے اوزان سکۂ غیر رائج کا حکم رکھتے ہیں ۔ جب اس عہد میں ان کا رواج اٹھ گیا تھا تو ظاہر ہے اس عہد سے پیشتر استعمال میں آتے ہوں گے اور وہ قدیم اور ابتدائی زمانوں کے سوا ہو نہیں سکتا ۔

ان نمونوں اور ان کے پیش رو عربی نمونوں میں بعض خصوصیات عام ہیں ۔ اول تو وہ اکثر مربعات میں ہیں ، دوسرے ایک ہی بیت کے مصرعوں میں ایسے صریح تغیرات ہیں جو کسی صورت سے مروجہ ایرانی مذاق سلیم کے مطابق نہیں ۔ ذیل میں ان غیر رائج سکّوں کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

ھزج اگرچہ عربی میں مسدس ہے لیکن عام طور پر مجزو زیادہ مستعمل ہے ۔ ایرانی اسی تقلید میں اپنے ہاں اس کو مربع لاتے رہے ۔ چنانچہ رودکی :

بیار آن می کہ پنداری   روان   یاقوت نابستی
وبا چون برکشیدہ   تیغ   پیش   آفتابستی

شمس طوسی نے چونکہ ان اشعار کو مربع کی مثال میں درج کیا ہے اس لیے اتفاقیہ ہم کو معلوم ہو گیا کہ در حقیقت شاعر نے یہ ابیات وزن مربع میں لکھے تھے ، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ متاخرین نے ان کو مثمنات میں داخل کر لیا ہے جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قطعہ ذو مطلع بن گیا ہے ۔ چنانچہ آج ہم اس کو اسی شکل میں لکھتے اور پڑھتے ہیں :

بیار آن می کہ پنداری روان یاقوت نابستی
و یا چون برکشیدہ تیغ پیش آفتابستی
بپاکی گوئی اندر جام مانند گلابستی
بخوشی گوئی اندر دیدۂ بیخواب خوابستی
سحابستی قدح گوئی و می قطرہ سحابستی
طرب گوئی کہ اندر دل دعای مستجابستی

اگر می نیستی یکسر همه دلها خرابستی
دگر در کالبد جان را بدیلستی شرابستی
اگر این می بابر اندر بچنگال عقابستی
ازان تا ناکسان هرگز نخوردندی صوابستی

ہزج کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو :

چندین چکنی تنبل   مارا چه فریبی

اس کا وزن ہے : مفعول مفاعیلن مفعول فعول ۔ پہلے مصرع میں گویا سببِ خفیف زائد ہے ۔ اسی قسم کا ہزج کا یہ شعر ہے :

من بی تو چنین زار   تو از دور همی خند
(وزنہ) مفعول مفاعیل   مفاعیل   مفاعیل

اب یہ وزن قدما میں مقبول تھا لیکن جب اتفاقیہ مثمن ہوگیا اور اس سے خوش گوار وزن نکل آیا ، متاخرین میں متروک ہو گیا ۔ مثال مثمن :

خطی ست که بر عارض آن ماه تنیلست
یا دست فلک غالیه بر ماه کشیلست

علٰی ھذا مضارع کا یہ مربع شعر :

آمد بہار خرم   وقت گل اندر آمد

(وزنہ) مفعول فاعلاتن دوبار ۔ متاخرین نے اس پورے شعر کو مثمن مصرع قرار دیا ۔ دقیقی :

تاویل کرد موبد از مذهب نغوشا
کز زردهشت گفت ست استاد پیش دارا

اسی بحر کا ایک اور وزن مربع :

ای یار دل ربای   یکی با زهی بساز
(وزنہ) مفعول   فاعلات   مفاعیل   فاعلات

متاخرین نے اسی مربع شعر کو مثمن قرار دیا اور یہ خوش آیند وزن دریافت ہو گیا ۔ یوسف عروضی :

گر پارسا زنی شنود شعر پارسیش
و آندست بیندیش که بدانسان لوازنست
آن زن ز بی‌نوائی چندان نوا زند
تا هر کسیش گوید کین بی‌نوا زنست

مجتث کا وزن مربع :

بحق خوبی رویت کم از غمان برهانی
(وزنہ) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن

ایرانیوں نے اس کو ترک کرکے مثمن بنا لیا ۔ دقیقی :

شب سیاہ بدان زلفگان تو مالد
سپید روز بپاکی رخان تو مالد

بحر خفیف ، عربی تقلید میں فارسی زبان میں بھی مسدس آتی ہے۔ یعنی فاعلاتن مفاعلن فعلاتن دوبار :

صنما طاقت فراق ندارم
جز بوصل تو اتفاق ندارم

رودکی شاعر نے اس کو بھی مثمن لکھا ۔ مثال :

گر کند یاری مرا بغم عشق آن صنم
بتواند زدود زین دل غمخوارہ زنگ غم

اس کے لیے صاحبِ المعجم لکھتے ہیں :

”و رودکی قطعہ مثمن گفتہ است ہیچ ذوق ندارد ۔“

اس لیے گیارھویں قرن ہجری کے منتصف تک اس کا رواج نہ ہوسکا ۔ آخر بیدل نے اس کی موزونیت کو واضح طور پر ثابت کر دیا ۔ بیدل :

بہ ہوای تبسمی بفسون تکلمی
شکری را قوام دہ نمکی را گداز کن

بحر مقتضب دونوں زبانوں میں مربع آتی ہے اور فترتِ مغول تک مربع آتی رہی لیکن متاخرین نے اس پر اصولِ مثمنات کو جاری کرکے دو اہم وزن دریافت کیے :

(۱) فاعلات مفتعلن چار بار ۔ مثال مطوی :

بگذر ای نسیم صبا صبحدم بطرف چمن
نکہتی بیار ازان گلعذار غنچہ دہن

اور مطوی مقطوع :

وقت را غنیمت دان آن قدر کہ بتوانی
حاصل‌از حیات ای جان یک‌دم ست تا دانی

یہ اوزان المعجم اور معیار الاشعار سے غیرحاضر ہیں ۔ وزن آخر امیر خسرو کے ہاں ملتا ہے ۔ اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ ان اوزان کے موجد متاخرین ہیں ۔

بحر منسرح ایرانیوں میں بھی مسدس آتی رہی ہے ۔ چنانچہ :

عشق بہ محنت صبور دید مرا
رفت و بر آتش بخواہنید مرا

(وزنہ) مفتعلن فاعلات مفتعلن ۔ مگر متاخرین نے اس کی مثمن شکل کو زیادہ فروغ دیا ۔ مثال انوری :

ای ملکی کز ملوک ہر کہ ز تو سر بتافت
سختی دیوار دہر عاقبتش سر شکست

بحر رمل میں صرف دو قسم کے اوزان زیادہ دلچسپ ہیں ؛ یعنی مثمن سالم محذوف یا مقصور اور مثمن مخبون محذوف یا مقصور ۔ اب پہلا وزن ایرانیوں نے اس بحر کے عربی مربعات سے لیا ہے ۔ مثلاً بعض اوقات عربی میں یہ وزن یوں آتا ہے 'فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن'۔ ایرانیوں نے اس مربع شعر کو لے کر اپنے ہاں مثمن مصرع قرار دے لیا ہے ۔

خبن کا عمل عربی میں زیادہ باقاعدہ نہیں ہوتا ، یعنی وہ تمام ارکان پر شامل نہیں ۔ ایرانیوں نے صدر و ابتدا اور ضرب و عروض کے علاوہ ہر رکن میں پابندی کے ساتھ اس کا استعمال کیا ہے ، تاہم عربی میں ایسی مثالیں موجود ہیں :

و اذا غایتہ مجد رفعت
نہض الصلت الیہا فحواہا

در حقیقت اگر ایرانیوں کے سر کسی ایجاد کا سہرا ہے تو یہی ہے کہ مربعات کو مضاعف کر کے مثمنات میں داخل کر لیا ہے۔ مثمنات کی موجودگی میں ظاہر ہے مربعات اور مسدسات ناخوش آیند اور بے لطف معلوم ہوتے ہیں، اسی لیے متاخرین نے قریب قریب ان کو ترک کر دیا۔ رجز کے پندرہ اوزان میں سے چودہ، مجتث کے تیرہ اوزان میں سے آٹھ جن میں اکثر مربعات و مسدسات شامل ہیں، متقارب کے پانچ مسدسات و مربعات، مضارع اخرب کے سترہ اوزان میں سے پندرہ، مضارع موفور سریع کے اکثر اوزان اور بحر قریب کو محقق متروک بتاتے ہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ یہ اور اسی قسم کے اور اوزان غالباً ابتدائی دور شاعری میں مستعمل تھے اور رفتہ رفتہ جب لطیف اور اعلیٰ اوزان دریافت ہوئے، ان کو ترک کر دیا گیا۔ اور چونکہ خارج مان لیے گئے تھے، اس لیے کسی نے ان کے اشعار محفوظ رکھنے کا خیال نہیں کیا۔ اب جب کہ فارسی اوزان کے بہترین نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں، ہم خیال کرتے ہیں کہ ایرانی قدیم ہی سے جدت پسند اور صاحب ذوق سلیم تھے، نیز یہ کہ فارسی اور عربی بحریں بالکل مختلف ہیں اور ایران میں شاعری قدیم سے تھی۔

یہاں اس ذخیرے کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو در حقیقت ایرانی اور ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ اس میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ مواد ہے جو رباعی سے تعلق رکھتا ہے۔ بقول دولت شاہ، ترانہ تیسری صدی ہجری میں اور بقول صاحبِ المعجم چوتھی صدی میں دریافت ہوتا ہے۔ بوطلب شاعر اپنے ترانے کے لیے مشہور ہے۔ سامانی دور کے اس کے نمونے بہت کم یاب ہیں۔ لے دے کر ابوشکور کی ایک رباعی ملتی ہے۔ اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ آن ہی ایام میں ایجاد ہوئی ہوگی۔ چنانچہ المعجم میں اس کو رودکی کی ایجاد بتایا گیا ہے۔ ترانہ اپنی قدیم شکل میں مربع ہوتا تھا اور چہار بیتی کہلاتا تھا، کیونکہ فی الحقیقت اس میں چار شعر

ہوتے تھے اور ہر شعر کے آخر میں قافیہ ہوتا تھا ۔ اس طرح اس کے اڑتالیس وزن ہوئے ۔ لیکن متاخرین نے اس پر بھی اصول مثمنات کا استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم چاربیتی کا ہر ایک شعر ایک مصرع بنا لیا گیا ۔ اس لیے چار بیت کے قدرتاً دو شعر رہ گئے ۔ چنانچہ اس کو دوبیتی کہنے لگے اور اڑتالیس کے چوبیس اوزان بن گئے اور تیسرے مصرع میں قافیے کی ضرورت نہ رہی ۔

بحر جدید (غریب) و قریب و متشاکل خالص بحورِ ایران ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اول تو ان کے اوزان میں زیادہ گنجائش نہیں ہے ۔ دوسرے خود ایران میں ان پر کوئی زیادہ التفات نہیں کیا گیا ہے ۔ بحر قریب کے ایک دو وزن اگرچہ سلجوقی دور تک کسی قدر مقبول رہے ، تاہم محقق اس کو متروک قرار دیتے ہیں ۔ عروضیوں نے البتہ قدما کے تبرک کے طور پر ان کو اپنی تصنیفات میں جگہ دے دی ہے ۔

ایرانیوں کی نو ایجاد اکیس بحریں جو دوائر منعکسہ ، منعلقہ اور منغلطہ سے تعلق رکھتی ہیں ، کچھ ایسی منحوس گھڑی میں ایجاد ہوئی تھیں کہ ان کو ابھی دنیا کی ہوا بھی نہ لگنے پائی تھی کہ پیغامِ اجل آ پہنچا ۔ خود ایران میں جو ان کی ولادت گاہ ہے ، ان کو عزت نہیں ملی تو باہر والے کیا قدر کرتے ۔ عروضی حلقوں میں البتہ تاریخی دلچسپی کے اعتبار سے کبھی کبھی ان کا ذکر آ جاتا ہے ۔

علاوہ بریں بعض فہلویات ہیں جو غیر تعلیم یافتہ فرقوں میں رائج تھیں ۔ ان میں اکثر مغالطہ کیا جاتا ہے اور ہزج اور متشاکل کے اوزان کو خبط کر دیا جاتا ہے ، جس سے وہ بے لطف ہو جاتی ہیں ۔ تعلیم یافتہ فرقے نے بعض اوقات ان پر اشعار لکھے ہیں ، مثلاً پندار رازی وغیرہ ۔

جادوراہ جو زیادہ تر مسمطات یا کڑی کی شکل کی ہوتی تھی ، پہلے تین شعروں میں ایک قسم کا قافیہ اور چوتھے میں مختلف قافیہ ہوا کرتا تھا ۔ وہ تین رکن کا ایک شعر معقد ہوتا تھا اور چار شعر

مل کر ایک خانہ یا بند بنتے تھے ۔ مطلع کے بند کے چاروں شعر ہم قافیہ ہوا کرتے تھے اور دوسرے بند کے پہلے تین شعر ہم قافیہ اور چوتھا شعر مختلف القافیہ ۔ آیندہ بندوں کا ہر چوتھا شعر دوسرے بند کے چوتھے شعر کے ہم قافیہ ہونا چاہیے ۔ محقق طوسی نے مثال میں صرف ایک شعر معقد دیا ہے ، وہ یہ ہے :

دل از یار سنگدل بگسل

قدر نے اس پر مصرع لگا کر یوں لکھا ہے :

دلت گرچہ مبتلا بکند
گیسویت در بلا بکند
اگر با تو یک جفا بکند
دل از یار سنگدل بگسل

یہ شعر مثلث ہم وزن ہیں اور سب مل کر ایک بند بنتے ہیں ۔ دوسرے بندوں کا اسی پر قیاس کرنا چاہیے ، لیکن چوتھے شعر کا قافیہ 'بگسل' کے مطابق ہوگا ۔ اس کو پارسی باربد بھی کہتے ہیں ۔

جب ہم ایرانی جدت اور قوت اختراع کے ایسے بے وزن اور حقیر نمونے دیکھتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے ان بزرگوں پر جو اپنے زعم میں ایران کو اس کی داستانی تاریخ ، سلسلہ' سلاطین اور ان کی شان و شکوہ ملک کی سدا بہار اور گلزار زمین ، خدا داد حسن اور سامان تفریح اور اسی قسم کے دیگر موثرات کی بنا پر قدیم سے شعر و شاعری کا گہوارہ مانتے ہیں ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب سے ایرانی عربیت کے ماحول میں آئے ہیں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ملکی مذاق کو ، اگر کوئی ان میں اس وقت موجود تھا ، ہدیہ' طاقِ نسیاں کرکے عربوں کی تقلید لغویت کی حد تک اختیار کرلی تھی ۔ چنانچہ عربوں کے ناگوار اور غیرمطبوع زحافات تک فارسی شعرا اپنی زبان میں منتقل کرتے رہے ہیں ۔ حالانکہ فن عروض خلیل بن احمد بصری نے شعرائے عرب کے کلام کے مختلف اوزان کو احاطہ کرنے کے لیے وضع کیا تھا ۔ اس لیے جہاں اس کو کوئی

بے قاعدگی نظر آئی ، اس کے لیے زحاف تراش لیا - اور خلیل کے لیے یہ ایک مجبوری کی صورت تھی - علاوہ بریں صرفیانہ اثرات میں خلیل نے اوزان کے تعلقات ایک دوسرے سے قائم کرنے کی مصلحت سے زحافات تراشے، جن سے علم عروض اس قدر پیچیدہ اور غیرمقبول ہوگیا کہ اچھے اچھے طباع اور صاحبِ ذوق اصحاب اس سے گھبراتے ہیں - صرفیوں کا اصولِ تعلیل اور عروضیوں کا اصولِ زحاف ، میں نہیں جانتا ان میں کون سا اصول قابل ترجیح ہے - صرف میں ممکن ہے کہ تعلیل سے طالب علم کو امداد ملتی ہو لیکن زحاف ایک بے معنی ہفتخواں ہے جس کا نہ جاننا اس کے جاننے سے اچھا ہے - اگر ایرانی چاہتے تو ذرا سی تبدیلی کے اختیار کرلینے سے ہمیشہ کے لیے ان لغو اور ناقابل برداشت زحافات کی عالمگیر اذیت سے نجات پا سکتے تھے ، لیکن انھوں نے عربی نقلید کے جوش میں نہ صرف ضروری بلکہ غیر ضروری عیوب اور اتفاقی نقائص کو بھی فارسی میں منتقل کر لیا -

سب سے پہلے میں اشعار معقد کا ذکر کرتا ہوں ؛ عام طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ فارسی میں بھی ان کا رواج تھا - معقد اشعار میں پہلے مصرعے کا ایک دو حرف بہ ضرورت تقطیع دوسرے مصرع میں شامل ماننا پڑتا ہے - عربی میں یہ طریقہ عام ہے - میں فارسی کی مثالیں دیتا ہوں - مثلاً رودکی کا یہ شعر ہزج مربع :

و یا چون برکشیدہ تیغ پیش آفتا بستی

اس میں تیغ کا غین دوسرے مصرعے میں شامل ہے - دوسری مثال :

رہ شادیم بہ بستی

یہ دو رکنی شعر ہے جس کی تقطیع ہے :

رہ شادی فعلاتن م بہ بستی فعلاتن

یعنی میم ضمیر متکلم شاملِ مصرع دوم ہے -

اسی طرح خزم کا استعمال ہے - یہ ایک ایسا زحاف ہے جس کی رو سے شعرائے عرب ایک حرف یا زیادہ کسی شعر کے صدر یا

ابتدا میں داخل کر دیتے ہیں جو وزن میں شمار نہیں ہوتا ۔ یہ زحاف نہایت ثقیل اور گراں مانا جاتا ہے ۔ مثال رودکی :

جعد ہمچون نورد آب بباد
گوئیا آنچنان شکستستی
میانکش نازکک چو سایہ موی
گوئی از یک دگر گسستستی

ان اشعار کا وزن ہے فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلات ، لیکن میانکش کا میم اس سے باہر ہے اور تقطیع میں شمار نہیں ہوتا ۔ مثال دیگر ۔ مرادی :

از حشم و گنج چہ فریاد سود
کہ مرگ کند بر تن تو تاختن

مصرع دوم میں 'کاف' داخل خزم ہے اور تقطیع سے باہر ہے ۔

عربی میں ثلم بھی آیا کرتا ہے جو متقارب کے رکن مفعولن سے پہلے حرف کے اسقاط کا نام ہے ۔ تنہا صدر یا ابتدا میں اس کا استعمال ناگوار ہے ۔ چنانچہ رودکی :

بہارست هر لحظہ در روزنم
منکر فراوان و معروف کم

علی ھذا القیاس موفور اور اخرب کا آمیز کر دینا ۔ رودکی :

جوانی گسست و چیرہ زبانی
طبعم گرفت نیز گرانی

یہاں صدر و ابتدا میں فرق ہے ۔ مثال دیگر ، رودکی :

دل آزاد کن از درد ، تن آزاد کن از رنج
جام آورد رود آورد می آورد شطرنج

مثال دیگر ، رودکی :

نشیب تو با فراز و فراز تو با نشیب
فرزند آدمی بتواند نشیب و شیب

ضمیمہ متعلق رباعی
(بجواب مولانا سید سلیمان ندوی)

تنقید شعرالعجم کی پہلی قسط میں ، جو اکتوبر ۱۹۲۲ع کے رسالہ 'اردو' اورنگ آباد میں شائع ہوئی تھی ، میں نے رباعی کے سلسلے میں جو بیان دیا تھا ؛ اس پر ہمارے ملک کے فاضل بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی قابل قدر تصنیف "خیام" میں ، جو ۱۹۳۳ع میں طبع ہوتی ہے ، کئی اعتراض کیے ہیں۔ مثلاً میں نے معیار الاشعار کو خواجہ نصیرالدین طوسی کی تصنیف بیان کیا تھا ، سید صاحب نے اس سے انکار کردیا ۔ میں نے لکھا تھا کہ رباعی ایرانی الاصل ہے ، یعنی اس کے اوزان ایران زا اور مقامی ہیں ، سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ رباعی کہنے والے "قدماء عربی کے شاعر تھے ۔" میں نے کہا تھا کہ رباعی ابتدائی مدارج میں چار بیتی کی شکل میں لکھی جاتی تھی ، جس کے چاروں شعر ہم قافیہ ہوتے تھے ، سید صاحب اس کو ایک بے سند دعویٰ بیان کرتے ہیں ۔ میں نے لکھا تھا ، سب سے قدیم رباعی اس وقت ابوشکور بلخی کی ملتی ہے ، سید صاحب کا ارشاد ہے کہ ایسی قدیم رباعیاں دس بارہ سے زیادہ موجود ہیں ۔ میں نے فرخی کا ایک شعر اس کے دیوان سے ابوطلب ترانہ گو سے متعلق نقل کیا تھا ، سید صاحب نے بدانستِ خود اس کی تصحیح کر کے اس کے وزن کو بدل دیا ۔

اس کے علاوہ سید صاحب بعض جدید امور یا نئی تحقیقات بروے کار لائے ہیں ؛ ایک یہ کہ قدما قول ، غزل اور رباعی میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے ، بہ‌الفاظ دیگر قول و غزل کی اصطلاح کا

اطلاق رباعی پر کیا کرتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ ابودلف عجلی اور ابوطلب ترانہ گو ایک ہی شخص ہیں ۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ فارسی میں بھی اشعار معقد لکھے جاتے تھے ۔ قدیم رباعی گویوں میں شیخ بابزید بسطامی ، ابونصرفارابی اور بوعلی سینا کا نام لیا گیا ہے ، وغیرہ وغیرہ ۔

اب وقت آگیا ہے کہ سید صاحب کے اعتراضات کا جواب دوں ، اور ان کے بیانات کو ، جو کئی امور میں ہماری فنی روایات سے منحرف ہیں ، نقد و نظر کی کسوٹی پر جانچ لوں ۔ سب سے پہلے میں ان کے اعتراضات کو لیتا ہوں ۔

معیار الاشعار خواجہ نصیرالدین طوسی کے متعلق فرماتے ہیں :

”تنقید شعرالعجم کے فاضل مولف پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون کے پہلے نمبر میں اس کو کسی تذبذب کے بغیر محقق طوسی کی تالیف بتایا ہے ۔ معلوم نہیں ان کے سامنے اس کی کیا سند ہے ، درآنحالیکہ مشرق و مغرب کے فضلا اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں ۔ چنانچہ علامہ عبدالوہاب قزوینی (کذا) نے معجم کے دیباچے میں (ه) تصریح کی ہے کہ :

’کتاب مرغوب معیار الاشعار است در علم عروض و قوافی کہ در ۶۴۹ھ تالیف شد و مصنف آن معلوم نیست . . . . . . وی (مفتی سعداللہ مراد آبادی شارح المتوفی ۱۲۹۴ھ) تالیف این کتاب را بخواجہ نصیرالدین طوسی معروف متوفی ۶۷۳ھ نسبت دادہ است ، ولی معلوم نیست از روی چہ ماخذی ۔‘

ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لائبریری کی فارسی کتابوں کی فہرست ۵۲۵ میں بعینہ یہی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ محقق طوسی کی تصانیف کی فہرست میں یہ نام نہیں ۔“

(خیام ، حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

میں عرض کرتا ہوں کہ ریو فہرست نگار مخطوطات فارسی برٹش میوزیم اور اس کے مقلد مرزا محمد بن عبدالوہاب کے دو نام گنا کر

سید صاحب نے حکم لگا دیا کہ فضلاے مشرق و مغرب اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں ۔ گویا ان دو ناموں پر مشرق و مغرب کے فضلا کی فہرست ختم ہوگئی ۔ سید صاحب سمجھ رہے ہیں کہ صرف مفتی سعداللہ کی یہ رائے ہے ۔ مگر اس بارے میں ان کو سخت سہو ہوا ہے ۔ اکثر و بیشتر عروضی یہ رائے رکھتے ہیں کہ معیار الاشعار خواجہ نصیرالدین طوسی کی تصنیف ہے ، مثلاً کچھ نام عرض ہیں :

(۱) منشی مظفر علی خان اسیر ، جو ''زر کامل عیار'' ترجمۂ معیار الاشعار (طبع اول ۱۲۸۹ھ نول کشور) کے مالک ہیں ، اپنے ترجمے کے پہلے صفحے پر لکھتے ہیں :

''صحیفۂ رشیقہ اعنی کتاب معیار الاشعار تصنیف عالم کامل فخرِ اماجد و اماثل رئیس الحکماء استاد الکملا محقق طوسی علیہ‌الرحمۃ'' الخ ۔

(۲) مرزا محمد جعفر اوج اردو میں ''مقیاس الاشعار'' کے مصنف ہیں ۔ اس تالیف میں صفحہ ۴۵ پر یہ عبارت درج ہے :

'' محقق علیہ الرحمۃ نے معبار الاشعار میں چونتیس زحاف لکھے ہیں ۔''

اور صفحہ ۱۹۰ پر یہ عبارت ملتی ہے :

''من خواجہ نصیرالدبن طوسی علیہ الرحمۃ مفاعلتن مفاعلتن دوبار :

بدی چکنی بجای کسی
کہ او نکند بجا تو بد''

ہم سید صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ شعر ''معیار الاشعار'' میں بذیل بحر وافر صفحہ ۲۴ پر موجود ہے اور ''زر کامل عیار'' میں صفحہ ۱۲۹ پر ۔ (لول کشور ۱۹۰۳ع)

(۳) غلام حسنین قدر بلگرامی کی قواعد العروض میں تو کثرت کے ساتھ ''معیار'' اور ''محقق'' کا ذکر بار بار آ رہا ہے ۔ معیار کی اکثر

و بیشتر امثال اس تصنیف میں موجود ہیں ۔ میں صرف چند صفحوں کے حوالے دیتا ہوں ۔ صفحہ ۱۴۳ ، صفحہ ۱۵۰ ، صفحہ ۱۵۱ ، صفحہ ۱۵۲ ، صفحہ ۱۵۸ ، صفحہ ۱۶۹ ۔

(۴) واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ارشاد خاقانی (حکم اختر) تالیف ۱۲۶۹ھ میں صفحہ ۱۰۰ پر رقم طراز ہیں :

''اور خواجہ نصیرالدین طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے معیار الاشعار میں کہا ہے ۔''

(۵) روضات الجنات میں (طبع ایران ۱۳۰۶ ہجری) ، جو محمد باقر خوانساری نے ۱۲۸۷ھ میں تالیف کی ہے ، صفحہ ۶۰۶ پر محقق طوسی کی تصنیفات کے ذکر میں معیار الاشعار کی طرف بھی اشارہ موجود ہے ۔

ممکن ہے کہ سید صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ مصنفین تو مفتی سعد اللہ کے مقلد اور متبع ہیں ، ان کی سند چنداں مضبوط نہیں مانی جاسکتی ۔ اس لیے ہم بطور دفع دخل مقدر اپنی تحقیقات کو مفتی صاحب سے سابق تر زمانوں میں لے جاتے ہیں ۔

(۶) شمس الدین فقیر بارھویں صدی ہجری کے ایک اعلیٰ شاعر اور مشہور مصنف ہیں ۔ ان کی تالیف حدائق البلاغت ہمیشہ درس میں شامل رہی اور آج بھی شامل ہے ۔ موصوف اس تالیف میں حدیقۃالرابعہ کے شعبۂ اول میں ''در بیان حرف قافیہ و ردف زائد'' کی تشریح کے موقعے پر لکھتے ہیں :

''بعضی حرف بعد از ردف را داخل ردف شمردہ اند و آن را ردف زائد نام کردہ و خواجہ نصیرالدین طوسی رحمۃ اللہ علیہ در رسالۂ معیار الاشعار حرف مذکور را دخل روی شمردہ و آن را روی مضاعف خواندہ ۔''

(۷) گیارھویں صدی ہجری میں ہمیں امیر ابوالحسن فراہانی شارح انوری کا نام ملتا ہے ، جو قافیۂ شایگان کے ذکر میں لکھتے ہیں :

''استاد المحققین خواجہ نصیر الدین محمد طوسی در رسالۂ عروض و

قافیہ مسمیٰ بمعیار الاشعار آوردہ ۔"

(۸) عبداللہ خاں اوزبک والیِ توران جلال الدین اکبر کا معاصر ہے ۔ اس کے دربار میں ایک زبردست عروضی باینده محمد بن محمد بن شیخ محمد موجود تھے ، قضائی تخلص کرتے تھے ۔ ۹۹۹ھ میں فن عروض پر ایک تالیف ان کے قلم سے نکلتی ہے ، جس کا نام ، جو تاریخی بھی ہے ، تنقید الدرر ہے ۔ اس تالیف کا ایک قریب العہد مخطوطہ نوشتہ ۱۰۰۶ھ راقم کے عروضی مجموعے کی زینت ہے ۔ اس اہم تالیف میں کئی موقعوں پر معیار الاشعار کے حوالے آتے ہیں ، چنانچہ :

"و خواجہ نصیر طوسی در "معیار الاشعار" فاصلہ را ازین ارکان رکنی علیحدہ نشمردہ بلکہ فاصلۂ صغریٰ را مرکب از سببین ثقیل و خفیف و فاصلۂ کبریٰ را مرکب از سبب ثقیل و وتد مجموع داشتہ ۔" (ورق ۳۷)

دیگر :

"و شیخ نصیر طوسی کہ صاحب "معیار الاشعار" است ، پس از روی بیش از یک حرف را از حروف قافیہ اعتبار نکردہ است ۔" (ورق ۷۶)

(۹) صنائع الحسن ایک اور عروضی تالیف ہے ، جو دسویں صدی ہجری میں مشہور فخری مصنف تذکرۂ جواهرالعجائب کے قلم کی یادگار ہے ۔ یہ تالیف فخری اپنے سرپرست شاہ حسن (حسین ؟) (سنہ ۹۲۸ و ۹۶۲ ہجری ، مطابق سنہ ۱۵۲۲ و ۱۵۵۲ عیسوی) والیِ سندھ کے لیے لکھتا ہے ۔ یہ مخطوطہ بانکی پور لائبریری میں محفوظ ہے ۔ اس کتب خانے کے فہرست نگار خان بہادر عبدالمقتدر خاں کہتے ہیں کہ ورق ۵ پر مصنف نے معیارالاشعار کو خواجہ نصیرالدین طوسی کی تصنیف بیان کیا ہے ، ملاحظہ ہو جلد نہم فارسی مخطوطات ، ۸۴۲ ۔

(۱۰) سلطان حسین بایقرا کے عہد میں دیگر علوم کے علاوہ عروض و قافیہ اور معما کا بہت رواج رہا ہے ۔ مولانا جامی نے اپنی

مصروفیتوں کے باوجود عروض و قافیہ پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں ۔ جامی کے شاگرد میر عطاءاللہ الحسینی مشہدی ہیں جو کتاب تکمیل الصناعتہ میں قافیے پر ایک رسالہ شامل کرتے ہیں ۔ رسالۂ ھذا میں میر عطاء اللہ متعدد موقعوں پر معیارالاشعار کا نام لیتے ہیں ۔ ان میں سے ایک مثال یہاں عرض کرتا ہوں :

''چنانکہ درین بیت کہ در معیار الاشعار خواجہ نصیرالدین طوسی آوردہ ۔ بیت :

صنم من ز بر من بنروی
دلک من بزی بنشنوی"

(۱۱) جامی کے رسالۂ قافیہ کا نام ''مختصر وافی فی علم القوافی" ہے ۔ اس پر ان کے ایک شاگرد نے ، جس کے نام سے میں ناواقف ہوں ، ایک شرح لکھی ہے ۔ میرے عروضی مجموعے میں اس کا ایک مخطوطہ ۱۱۰۹ ہجری کا نوشتہ ہے ، جس پر رسالے کا نام بدیں الفاظ درج ہے : "رسالۂ عروضیہ مسمیٰ بشرح مختصر وافی فی علم قوافی بر متن حضرت مولوی جامی ۔" رسالۂ ھذا میں کئی جگہ معیار لاشعار کے حوالے نظر آتے ہیں ۔ ان میں سے ایک یہاں نقل کیا جاتا ہے :

''و خواجہ نصیرالدین طوسی در کتاب معیار الاشعار حرف مقدم بر روی را منحصر در ردف داشتہ ۔''

(۱۲) فخر الدین محمد ابن شاکر الکتبی متوفی ۷۶۴ھ نے اپنی تصنیف "فوات الوفیات" کے جز ثانی میں صفحہ ۳۹ پر محقق طوسی کی تالیفات کے ذکر میں معیار الاشعار کو بالفاظ ''العروض بالفارسیہ" یاد کیا ہے ۔

(۱۳) صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی متوفی ۷۶۴ھ کی 'الوافی بالوفیات' کے جزو اول میں صفحہ ۱۸۱ پر محقق کی تصنیفات کے ضمن میں "العروض بالفارسیہ" یعنی معیار الاشعار کا پھر ذکر آیا ہے ۔

جب گزشتہ صدی سے لے کر آٹھویں صدی تک کے علماء معیار الاشعار کو محقق کی تصنیف مانتے آئے ہیں ، تو میرا کیا قصور

ہے ، اگر میں نے اسے خواجہ نصیر کی تالیف مان لیا ۔

ایک موقعے پر سید صاحب نے فرمایا ہے :

''سلسلۂ شعرالعجم کے وسیع النظر ناقد پروفیسر شیرانی نے تنقید کے پہلے نمبر (رسالۂ اردو اورنگ آباد دکن) میں رباعی کی بحث پر دو صفحے لکھے ہیں اور معیار الاشعار کی مذکورۂ بالا عبارت کے لفظ ''قدما'' سے اتنی وسعت پیدا کر لی کہ یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم ، جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا ، رائج تھی - اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں ۔ حالانکہ ان میں سے ہر دعویٰ ثبوت کا محتاج ہے - اہل عروض و اہل موسیقی کی روایات (قابوس نامہ کا حوالہ آتا ہے) کا جہاں تک تعلق ہے ، یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ارباب فن کے یہاں یہ چیز نو پیدا تھی اور اسلام کے بعد اہل فن کے استعمال میں آئی ہے -''

(خیام ، صفحہ ۲۲۲)

میں سرِ داستان ہی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ محترم سید اپنے اعتراض میں ایسے فقرات کے استعمال سے کہ 'لفظ قدما سے اتنی وسعت پیدا کر لی ہے' ، 'ارباب فن کے یہاں یہ چیز نو پیدا تھی' اور 'اسلام کے بعد استعمال میں آئی' وغیرہ میرے خلاف مدعا یہ امر ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ میں رباعی کو اسلامؐ سے قبل کی پیداوار مانتا ہوں ۔ حالانکہ میرے زیر نظر شعرالعجم تھی جو خالصۃً فارسی شاعری بعد از اسلام کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور جو عربی شاعری کی تقلید میں شروع ہوتی ہے - فارسی شاعری اور رباعی تو ایسی فضا ہے جس میں ایامِ ظہورِ اسلام سے قبل کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا - یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم الفاظ 'قدیم ، قدما ، قدیم الایام' ، زمانۂ مابعد اسلام کے لیے استعمال نہیں کر سکتے ؟ ان الفاظ سے میرا مقصد وہی ہے جو دنیا لیتی ہے - قدیم ، جدید

کے مقابلے میں ، قدما ، متاخرین کے مقابلے میں اور قدیم الایام ، زمانۂ حال کے مقابلے میں آتا ہے ۔

اب مجھے دو باتیں ثابت کرنی ہیں ؛ ایک تو یہ کہ عہد قدیم میں ایران میں چہاربیتی کا رواج تھا ، دوسرے یہ کہ چہاربیتی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں بلکہ ایران زا اور مقامی ہیں ۔

پہلی شق کے لیے محقق طوسی کا بیان ، جو میں مع ترجمہ اپنی تنقید میں نقل کر آیا ہوں ، دھیان میں رکھنا نہایت ضروری ہے ، لیکن معیارالاشعار پر سید صاحب کا اضطراری اعتماد محقق طوسی کے بیانات کی اصل وقعت و اہمیت کے احساس سے انھیں باز رکھتا ہے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے قدیم چاربیتی کی جو ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی ۔ ان ایام میں صدور و ابتدا میں اخرب و مکفوف ، اخرب و موفور کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعے میں کارفرما ہے ، جس کی بنا پر پہلے مصرع کے شروع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرعے کے شروع میں مفاعیل یا مفاعیلن آ جاتا ہے ۔ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے ۔ جب عربی عروض فارسی میں اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتدا میں اشعار ہزج کے مربع لکھے جاتے ہوں ۔ چنانچہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی ۔ چونکہ اس میں چار شعر ہوا کرتے تھے اس بنا پر اس کا نام چہاربیتی رکھا گیا ۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد جب اصولِ مثمنات کی دریافت نے اہل ایران کو زیادہ خوش آیند اور شگفتہ اوزان سے آشنا کر دیا ، مربعات ترک کر دیے گئے اور مثمنات کو اختیار کر لیا گیا ۔ اور ترانہ جو چار بیتِ مربع پر شامل تھا دو بیتِ مثمن کے قالب میں ڈھل گیا اور دوبیتی کہلایا ۔ یہی اصول یعنی مربع کا مثمن کر دینا نہ صرف رباعی میں بلکہ دیگر اوزان میں بھی کام کر رہا ہے ، مثال میں ہزج مربع کا یہ شعر عرض ہے :

من بی تو چنین زار
تو از دور همی خند

اس کا وزن ہے مفعول مفاعیل مصرع اول ، مفاعیل مفاعیل مصرع دوم ۔ یہ رباعی کا وزن نہیں ہے ۔ یہاں ابتدا میں صدر کے مقابلے میں مفاعیل بجائے مفعول لایا گیا ہے ۔ ایران کی بعد کی خوش مذاق کے دیکھتے ہوئے ایسا اختلاف ناقابل معافی ہے ، مگرجب اسی وزن مربع کو مثمن بنا لیا یعنی پورے شعر کا مصرع کر لیا بروزن مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیل تو ایک نہایت خوش آیند وزن حاصل ہو گیا ۔ چنانچہ :

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

ایک اور مثال دی جاتی ہے :

ای یار دل ربای   یکی بار هی بساز

جو بحر مضارع مربع اخرب موفور مقصور ہے ، یعنی مفعول فاعلات مصرع اول اور مفاعیل فاعلات مصرع دوم ۔ یہاں صدر و ابتدا میں اخرب و موفور کا اجتماع ہے ، لیکن ان دونوں مصرعوں کو ایک مثمن مصرع مان لینے سے ایک نیا شگفتہ وزن ہاتھ آ گیا ۔ مثال :

گر مرد همتی ز مروت نشان مخواه
صد جا شهید شو دیت از دشمنان مخواه

تعجب ہے کہ ہمارے سلیمان اعظم نے جہاں رباعی کے مختلف ناموں کی فہرست دی ، مثلاً ترانہ ، دوبیتی ، قول ، غزل ، بیت وغیرہ اس میں انھوں نے اس کے سب سے قدیم نام چہار بیتی کو شامل نہیں کیا اور محقق طوسی کا بیان بھی در خور اعتنا نہیں سمجھا ۔ حالانکہ عروضی چہار بیتی کا برابر ذکر کرتے ہیں ۔

مقیاس الاشعار میں مرزا اوج کہتے ہیں :

''ترانے کو قدما نے چار بیت قیاس کیا ہے ، اور اس کو 'چہار بیتی' کہا ہے ، یعنی اس میں ہرمصرع ایک بیت ہے، اور

تازی میں اس کو رباعی کہتے ہیں ۔ اور چاروں مصرعوں میں قافیہ لانا واجب جانتے ہیں ، لیکن نزدیک متاخرین جو مربعات اس وزن اخرب کے مستعمل نہیں ، یہ وزن بھی متروک ہے ۔''
(صفحہ ۲۱۷ ، مقیاس الاشعار)

غلام حسنین قدر بلگرامی کا قول ہے :

''اور اس کو اسی وجہ سے چہار بیتی اور رباعی کہنے لگے ، لیکن متاخرین نے چار مصرعوں کو دو شعر فرض کیا اور اس کا نام دوبیتی رکھا ۔''

''قدمای فارس ترانہ را کہ از ہزج مربع اختراع کردہ اند ، چہاربیتی و رباعی می گفتند و ہر دور چہار رکنی را قافیہ لازم می شمردند ۔ اما متاخرین شان چون ابیات مربع و ہزج نزد ایشان متروک است ترانہ از مثمن قرار می دہند و ہر دور چہار رکنی را مصراعی می شمرند و مجموع را دوبیتی ۔''
(صفحہ ٦٥ ، رسالہ کیفیت ایجاد رباعی ، از مفتی سعد اللہ)

شقِ دوم :

یہ کہ چہار بیتی یا رباعی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زا اور مقامی ہیں ۔ میں حیران ہوں کہ سید صاحب کو ایسے بدیہی واقعے کا ثبوت مانگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ ہم عروض کی جس قدیم و جدید کتاب کو اٹھا کر دیکھتے ہیں ، ہر مصنف یہی راگ الاپ رہا ہے کہ رباعی فارسی الاصل ہے ۔ میں بعض عروضیوں کے بیان یہاں نقل کرتا ہوں :

(۱) ''بدانکہ وزن رباعی کہ آن را دو بیتی و ترانہ نیز گویند ، از بحر ہزج بیرون می آید و آن را عجم پیدا کردہ اند و بر بیست و چہار نوع آوردہ ۔''
(عروض سیفی ، تالیف ۸۹٦ھ ، صفحہ ۸۹٦ ، طبع ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۲ع) ۔

(۲) ''باید دانست کہ وزن دوبیتی را کہ رباعی و ترانہ نیز

می گویند آن را شعرای عجم از وزن اخرم و اخرب هزج مثمن برآورده اند۔"

(صفحہ ۵۳، تنقید الدرر ، از قضائی ، تالیف ۹۹۹ھ)

(۳) "بباید دانست کہ رباعی را شعرای عجم اختراع نموده اند و آن را ترانہ و دوبیتی نیز نامند۔"

(صفحہ ۱۶ ، حدائق البلاغت ، مطبع کریمی، لاہور ، ۱۹۲۰ع)

(۴) کرامت علی ابن رحمت علی حسینی جونپوری ، مسٹر شلز فرانسیسی کے لیے اپنے قیامِ تبریز کے زمانے میں ایک "رسالۂ قواعدِ عروض و قوافیِ پارسی" لکھتا ہے ، جس میں مرزا ابوالقاسم قائم مقام کی طرف بھی خطاب ہے ۔ اس کا ایک نسخہ ٹائپ میں طبع شدہ میرے پاس ہے جس پر تاریخ طباعت درج نہیں ۔ اس رسالے کے صفحہ ۸۲ پر عبارت ذیلِ ملتی ہے :

"فصل شانزدهم در بحر رباعی و آنرا دوبیتی و ترانہ نیز گویند و آن پیدا کردۂ عجم است ۔"

(۵) "و اوزان رباعی کہ آنرا دوبیتی و ترانہ گویند ، اهل عجم از بحرِ هزج برآورده اند ۔"

(مخزن الفوائد ، صفحہ ۱۶۶ ، ۱۸۸۴ع مطبع انجمن پنجاب)

(۶) "وزن ترانہ کے مخترع شعرائے عجم ہیں ۔"

(قواعد العروض از قدر بلگرامی)

(۷) "اور یہ زحاف کہ اس وزن میں مستعملِ شعرائے عجم ہیں ، اشعار عرب میں نہیں اور یہ وزن رباعی اشعار عرب میں نہ تھا ۔" (صفحہ ۲۱۷ ، مقیاس الاشعار ، ۱۲۹۲ھ)

(۸) "اور جان تو کہ رباعی نکالی ہوئی فصحائے عجم کی ہے اور بحر ہزج سے خصوصیت رکھتی ہے ۔"

(تقویت الشعرا از امام الدین طالب ، سلطان المطابع لکھنؤ)

(۹) "و رباعی از مخترعات اهل عجم است و بہ بحر هزج اختصاص دارد ۔"

(صفحہ ۵۶، شجرۃ العروض از منشی مظفرعلی اسیر ، نول کشور ۱۸۷۳ع) ۔

یہاں ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر رباعی ایرانی الاصل نہیں ہے ، تو پھر اس کی توضیع کرنے والے قصے جن میں ایرانی حصہ لیتے نظر آتے ہیں ، اور جنھیں سید صاحب نے اپنی معزز تالیف میں بھی نقل کیا ہے ، کیوں شہرت پاتے ؟ مثلاً رودکی کا ایک طفلِ جوز باز کو غزنین کے مرغزار میں جوشِ مسرت میں مصرعِ آیندہ پڑھتے سننا یا بقولِ دولت شاہ یعقوب بن لیث کے فرزند کا جوز کھیلتے ہوئے ایک نشاط آمیز لہجے میں کہنا کہ :

غلطان غلطان همی رود تا بن گو

''خیام'' کے صفحہ ۲۲۳ پر سید صاحب نے گزشتہ اعتراض سے ملتا جلتا یہ اعتراض کیا ہے :

''ناقدِ شعرالعجم نے اپنے اسی پہلے سلسلے میں یہ بے سند دعویٰ کیا ہے ، جس کا مدار ساتویں صدی کی معیار الاشعار پر ہے ، کہ قدما (کس عہد تک کے قدما ؟) تمام تر چہار بیتی کہتے تھے ، جس کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے تھے'' اور اس سے نادر تر دعویٰ یہ کہ چہار بیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی، حالانکہ ایسی رباعیاں ، جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں ، عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں اور بعد کے شعرا کے یہاں ایسی رباعیاں ملتی ہیں ۔''

میں سید صاحب کی خدمت میں بہ صد ادب عرض کرتا ہوں کہ جب ان کو یہ تسلیم ہے کہ میرے دعوے کا مدار ساتویں صدی کی معیار الاشعار پر ہے تو پھر میرا دعویٰ بےسند کیوں گردانا گیا ؟ سید صاحب مجھ پر سخت ظلم کر رہے ہیں کہ معیار الاشعار جیسی کتاب کی سند کے باوجود میرے دعوے کو بے سند کہتے ہیں ۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ عروضی لٹریچر میں یہ تالیف آج بھی زبردست اہمیت کی مالک ہے ۔ گزشتہ سات صدیوں میں جس قدر کتابیں

اس فن پر لکھی گئی ہیں ، ان سب پر اس کتاب کی افادی وقعت و افضلیت مسلم ہے ۔ ہر عہد میں اہل عروض اس کو مستند سمجھتے رہے ہیں ، اور اس کے حوالے دیتے آئے ہیں ۔ اس کی شرح تیار ہوئی ہے ، ترجمہ کیا گیا ہے ، مختصر یہ کہ عروضی مسائل پر قول ِ فیصل مانی جاتی ہے ۔ اور یہ فن سے ہماری بیگانگی کا ثبوت ہوتا اگر ہم اس تصنیف کو قرار واقعی عزت نہ دیں ۔

اس کے بعد سوال کیا ہے (کس عہد تک کے قدما) تمام تر چہار بیتی کہتے تھے ، جس کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے تھے ؟ یہاں بیت کی جگہ مصرع لکھنا سید صاحب کا سہو قلم ہے ۔ عہد کا تعین کرنا ذرا مشکل ہے ۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب اصول ِ مثمنات کا عام رواج ہوگیا اور مربعات متروک ہو گئے ، چہار بیتی کو خیر باد کہہ دیا گیا اور دوبیتی نے اس کی جگہ لے لی ۔ میں قدما کے متعلق اس سے قبل کچھ اشارہ کر آیا ہوں ۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ ان قدما کا زمانہ بھی وہی ہے جو آن قدما کا ہے جن کا ذکر خود سید صاحب نے اپنی تالیف میں کیا ہے ، جب فرمایا ہے :

(۱) ''عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں'' وغیرہ (خیام ، صفحہ ۲۲۳ ، حاشیہ) ۔

(۲) ''یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدما عربی کے شاعر تھے ۔'' الخ (خیام ، صفحہ ۲۲۲) ۔

(۳) ''قدما کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ ساتھ آتا ہے'' (خیام صفحہ ۲۲۷) ۔

آگے بڑھ کر سید صاحب ارشاد کرتے ہیں :

''اور اس سے نادر تر دعویٰ یہ ہے کہ چہار بیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی ، حالانکہ ایسی رباعیاں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں ، عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں ۔''

مجھے افسوس ہے کہ سید صاحب میرا مطلب بالکل نہیں سمجھے اور نہ انھوں نے محقق طوسی کے بیان پر ، جو میرے دعوے کی سند ہے ، غور کیا ۔ جن چار مصرعوں والی رباعیوں کو سید صاحب چار بیتیاں کہتے ہیں ، وہ تو دو بیتیاں ہیں ، کیونکہ دو مثمن شعروں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں ، بحالیکہ چار بیتی ، چار مربع شعروں کی صورت میں لکھی جاتی تھی ، جس طرح کہ میں نے تنقید شعرالعجم میں سمجھانے کے واسطے ابوشکور کی رباعی کو لکھا ہے ، یا جس طرح خود سید صاحب نے میری تقلید میں صفحہ ۲۲۲ پر رودکی کی مفروضہ رباعی کو اور صفحہ ۲۰۳ تا ۲۲۵ پر عربی رباعیوں کو نقل کیا ہے ۔ یہ ہے صحیح شکل چہار بیتی کی ، اور جب چہار بیتیاں اس طرح لکھی ہوئی نہیں ملتیں تو میں نے کیا غلط کہا جب یہ کہا کہ قدیم چہار بیتی کے اصلی نمونے ہم تک نہیں پہنچے ۔ چار قافیوں والی رباعیاں مصرّع[1] دو بیتیاں ہیں ، جس طرح تین قافیوں والی خصّی رباعیاں ہیں ۔

سید صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ چاروں مصرعوں میں قافیوں والی رباعیاں لباب الالباب میں قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں ۔ میں نے بھی قدما کے ذکر ہی میں کہا تھا کہ سب سے قدیم رباعی مجھ کو ابوشکور بلخی کی ملی ہے ۔ لباب الالباب موجود ہے اور میں سید صاحب کو دعوت دیتا ہوں اگر وہ اس میں سے دس بارہ درکنار ، ایک رباعی بھی ابوشکور کے عہد سے قبل کی نکال کر بتا دیں گے ۔ مگر دشواری یہ ہے کہ ہمارے محترم ہر چار مصرعوں کو ، عام اس سے کہ وہ رباعی کے وزن میں ہوں یا نہ ہوں ،

---

۱ - مصرّع بیتی را گویند کہ در ہر دو مصراع قافیت نگاہ داشتہ چنانک ابیات سرہائی قصیدہ بود ۔ خصی دو بیتی را گویند کہ مصراع سوم او را قافیت نہ باشد ۔''

(صفحہ ۸۵ ، حدائق السحر ، رشید الدین وطواط ، مرتبہ عباس اقبال)
(حاشیہ مصنف)

رباعی کے خطاب سے یاد کرتے ہیں ۔ ایسی رباعیاں دس بارہ کیا درجنوں نکل آئیں گی ، لیکن ادبی و عروضی نقطہ نظر سے بلکہ رواجاً بھی رباعی وہی ہے جو بحر ہزج کے اخرب و اخرم شجروں کے چوبیس اوزانِ مقررہ میں سے ہو ۔ مگر سید صاحب جو خیام کی رباعیوں پر مقدمہ لکھ رہے ہیں ، اپنی اس فروگذاشت کا مطلق احساس نہیں کرتے ۔ ایک موقع پر رقم پرداز ہیں :

''لباب الالباب عوفی میں حنظلہ بادغیسی کی حسب ذیل دو بیتیں ملتی ہیں ، جو رباعی کے وزن پر ہیں :

یارم سپند اگرچہ بر آتش همی فکند
از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و آتش نآید همی بکار
بار وی همچو آتش و با خال چو(ن)[۱] سپند''

(خیام ، صفحہ ۲۳۰)

ان دو شعروں کو خود عوفی دو بیتی نہیں مانتا ۔ چنانچہ اس نے ''این دو بیت'' (صفحہ ۲ ، جلد ۲ ، لباب الالباب) لکھا تھا ۔ سید صاحب نے دو بیتیں تو عوفی کی تقلید میں لکھ دیا لیکن الفاظ ''جو رباعی کے وزن پر ہیں'' اپنی طرف سے اضافہ کر دیے ، حالانکہ یہ شعر رباعی کے وزن پر ہرگز ہرگز نہیں ۔ رباعی کے اوزان بحر ہزج سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ابیات بحر مضارع میں واقع ہوئے ہیں ۔ ان کا وزن ہے :

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ۔ یعنی مضارع اخرب مکفوف مقصور ، جو رباعی کے وزن سے کوسوں دور ہے ۔

سید صاحب کی جلدبازی ملاحظہ ہو کہ حنظلہ کی اس مفروضہ رباعی کو دیکھ کر فوراً یہ نظریہ پیش کر دیا : ''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعی کی تاریخ رودکی بلکہ ابودلف اور ابن الکعب سے بھی

۱ - قلابوں میں 'نون' میرا اضافہ ہے ۔ اس کے بغیر وزن غلط ہو جاتا ہے ۔ (حاشیہ مصنف)

پہلے شروع ہوتی ہے ، اور سامانی بلکہ صفاری کے بجائے طاہری دربار کو اس کی اولیت کا فخر پہنچتا ہے ۔" (صفحہ ۲۲۳ ، خیام)

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ حنظلہ کی رباعی سچی رباعی نہیں ، تو یہ اولیت کا فخر کس دربار کی طرف منتقل کیا جائے گا ؟ سلیمان اعظم ارشاد فرمائیں ۔

"تنقید شعر العجم" میں ایک موقع پر میں نے فرخی کا ایک شعر بوطلب شاعر کی شہرت بحیثیت رباعی گو دکھانے کے لیے نقل کر دیا تھا ، جو حسب ذیل تھا :

از دلآرامی و نغزی چون غزلہای شہید
وز دلاویزی و خوبی چون ترانہ بوطلب

اس کے تعلق میں سید صاحب ارشاد کرتے ہیں :

"پروفیسر شیرانی نے "تنقید شعر العجم" کے پہلے نمبر میں اس شعر کو کہیں سے نقل کیا ہے ، مگر اپنے متن کا ماخذ نہیں بتایا ہے ، جو اسدی کے متن سے بہت کچھ مختلف ہے ۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں :

از دلاویزی و نغزی چون غزلہای شہید
وز دلاویزی و خوبی چون ترانہ بوطلب

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے کسی متاخر ماخذ کو سامنے رکھا ہے ، جس نے فرخی کے قدیم الفاظ میں متاخرین کے محاوروں کے مطابق تصرف کر دیا ہے ۔" (خیام ، صفحہ ۲۲۹)

کسی شاعر کا شعر نقل کرتے وقت ہمارے ہاں یہی دستور رہا ہے کہ شعر نقل کرنے سے قبل اس شاعر کا نام دے دیا جائے ، چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور شاعر کا نام فرخی دے دیا ۔ سید صاحب کو اعتراض ہے کہ اس شعر کو کہیں سے نقل کر دیا ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کہیں سے تو کیا نقل کیا ہوگا ، شاعر کے دیوان ہی سے نقل کیا ہوگا ، اور دیوان سے بہتر ماخذ ہوگا بھی کیا ۔ متاخرین کے محاوروں کے مطابق اگر کوئی تصرف ہوا تو خود

سید صاحب اس کے ذمہ دار ہیں ، میرے ہاں جہاں پہلے مصرع میں "دلآراسی" تھا ، سید صاحب نے اس کی جگہ "دلآویزی" بنا دیا ۔ یہ تصرف کیوں کیا گیا ؟ مجھے معلوم نہیں ، مگر یہ تصرف ہر حال میں صحیح نہیں ۔ کیونکہ دونوں مصرعوں میں 'دلآویزی' مکرر ہو جاتا ہے ۔

سید صاحب نے حسبِ روایتِ "لغت فرس" اس شعر کو یوں لکھا ہے :

ز دلاویزی و تری چو غزلهای شهید
وز غم‌انجامی و خوشی چو ترانهٔ بوطلب

میرا نقل کردہ شعر اگر اسدی کے متن سے نہیں ملتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے ۔ میرے لیے ضروری نہیں کہ فرخی کے شعر کے لیے اسدی کے لغت کی ورق گردانی کروں ، جس حال میں کہ دیوان موجود ہے اور چھپ چکا ہے ۔

اصل یہ ہے کہ جس شعر کو سید صاحب صحیح اور مستند سمجھ رہے ہیں ، وہ یقیناً غلط ہے ، اس غلطی کے ذمہ دار خواہ ہمارے سید ہوں یا پال ہورن ، لغت فرس کا مرتب یا خود اسدی لغت فرس کا مصنف ۔ شعر ھذا کوئی تنہا شعر نہیں ہے بلکہ فرخی[1] کے قصیدے میں آیا ہے ۔ یہ قصیدہ بحر رمل مثمن محذوف میں ہے ، جس کا وزن ہے : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ، اور مطلع ہے :

دوست دارم کودک سیمین بر بیجادہ لب
ہر کجا زیشان یکی بینی مرا آنجا طلب

فرخی کا منقولۂ بالا شعر بھی ضرور ہے کہ اسی وزن میں ہو ۔ چنانچہ تقطیع :

۱ - دیوان فرخی مرتبۂ عبدالرسولی ، ۱۳۱۱ ہجری مطبوعہ مجلس (ایران) صفحہ ۶/۱ و دیوان حکیم فرخی صفحہ ۶/۱۰ طبع بمبئی (حاشیۂ مصنف)

ازدلآرا	:	فاعلاتن
می ی نغزی	:	فاعلاتن
چوں غزلہای	:	فاعلاتن
ای شہید	:	فاعلات
وز دلآوی	:	فاعلاتن
زیٔ ی خوبی	:	فاعلاتن
چو ترانا	:	فاعلاتن
بو طلب	:	فاعلن

یعنی وہی رمل مثمن یا محذوف ۔ اب سید صاحب کے روایت کردہ شعر کی تقطیع ملاحظہ ہو:

ز دلاوی	:	فعلاتن
زی و تروی	:	فعلاتن
چ غزلہا	:	فعلاتن
ی شہید	:	فعلات
وز غمنجا	:	فاعلاتن
م ی خوشی	:	فعلاتن
چ ترانہ	:	فعلاتن
بوطلب	:	فعلات

اور وزن ہے بحر رمل مثمن مخبون مقصور ۔ بالفاظ دیگر وزن ہی بدل گیا ہے ، یعنی سالم سے مخبون ہوگیا ہے ۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ حشویات تمام قصیدے میں ، جس کے پچاس سے زیادہ شعر ہیں ، سالم آئیں اور ایک شعر میں مخبون ہو جائیں ، لہذا میں تو سید صاحب کے روایت کردہ شعر کو غلط اور بے سند کہوں گا ۔

قولہ : ''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ چوں کہ یہ چار مصرعوں سے مرکب ہوتی ہے ، اس لیے اس کو رباعی کہتے ہیں . . . . لیکن محمد بن قیس رازی نے . . . . رباعی کی ایجاد و پیدائش کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اہل عرب اس کو رباعی اس لیے کہتے

ہیں کہ بحر ہزج ، جس میں رباعی کہی جاتی ہے ، چار اجزا سے مرکب ہوتی ہے اور اس لیے اس وزن کا ایک مصرع عربی میں دو جز کا ایک شعر ہو جاتا ہے ، اور اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر ہو جاتے ہیں ۔ رازی کے اس بیان کی تائید معیارالاشعار فارسی عروض کی ایک قدیم کتاب ۶۴۹ھ سے ہوتی ہے ۔"

(صفحہ ۲۲۲ ، خیام)

اس موقع پر دیکھنا چاہیے کہ محمد بن قیس کا کیا بیان ہے ۔ وہ کہتا ہے :

"و مستعربہ آن را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمدہ است ، پس ہر بیت ازین وزن دو بیت عربی باشد ۔" (صفحہ ۹۰ ، المعجم)

اس کا ترجمہ : اور عربی خواں اسے رباعی کہتے ہیں ، کیونکہ بحر ہزج عربی اشعار میں مربع الاجزا (مربع الارکان) آتی ہے ۔ پس ہر بیت اس وزن (رباعی فارسی) کا عربی کے دو بیت کے برابر ہوگا ۔

رازی کا یہ بیان سید صاحب کے بیان سے بالکل مختلف ہے ، اس کا مدعا تو یہ ہے کہ چونکہ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہے ، اس لیے اس کا نام رباعی رکھ دیا ۔

لیکن میں یہ توجیہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ چوں کہ ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہے اس بنا پر اس کو رباعی کہنے لگے ۔ ہزج دائرے میں مسدس ہے ، اگرچہ بنا میں مجزو ہے ۔ دوسرے عربی میں ایک یہی بحر تو ہے نہیں جو مربع آتی ہے ۔ اس میں تو اکثر بحریں مربع استعمال ہوتی ہیں ، پھر ہزج کی کیا خصوصیت رہی ۔ اس کے علاوہ رباعی کی ابتدا فارسی سے ہوتی ہے ، نہ عربی سے ۔ اس لیے اس کا نام رباعی رکھنے میں عربی خوانوں نے چہار بیتی کی تقلید کی ہے ۔

محقق طوسی کی تالیف معیار الاشعار سید صاحب کے خیال کی تائید نہیں کرتی ۔ اس میں مذکور ہے :

"ترانہ را قدما چہار بیت می گرفتہ اند و آنرا چہار بیتی خواندہ

و بتازی رباعی ۔"

یعنی قدما کے نزدیک رباعی چار بیتوں پر شامل تھی اس لیے اس کا نام چہار بیتی رکھ دیا اور عربی میں رباعی ، لہٰذا سید صاحب کا یہ بیان کہ رباعی کا نام رباعی چار مصرعوں کی وجہ سے نہیں ہے ، بلکہ چہار مصرعوں کے چار شعر ہوجانے کی وجہ سے ، بالکل بے بنیاد ہے ۔ صحیح وہی ہے جو محقق طوسی کے بیان سے مستنبط ہوتا ہے ؛ یعنی ایرانیوں نے اس کا نام چہار بیتی رکھا اور عربی والوں نے تقلیداً رباعی کہا ۔

قولہ : "سوال یہ ہے کہ دو دو جز کا اس طرح ایک ایک شعر ہو جانا آیا فارسی میں تھا اور اس لیے اس کو کبھی چہار بیتی کہتے تھے ؟ یا عربی میں اور اس لیے اس کو رباعی کہتے تھے ؟ مولف معیار الاشعار نے صرف قدما یعنی پہلے لوگ لکھا ہے جس سے فارسی و عربی کی تخصیص نہیں نکلتی ۔"

(خیام ، صفحہ ۲۲۲)

مولف معیار الاشعار کے بیانات تو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک ، راست بلا کم و کاست ، مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں لیکن سید صاحب کی اس کتاب کے ساتھ عدم واقفیت نے بے شک انھیں غیر حقیقی الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے ۔ محقق طوسی کی یہ تالیف فارسی کے ساتھ ساتھ عربی عروض کی بھی جداگانہ توضیح کر رہی ہے ۔ چنانچہ دیباچے کی عبارت ہے :

"این مختصریست در علم عروض ، شعر تازی و فارسی کہ بالتماس بعضی دوستان مرتب کردہ شد ۔"

مصنف کا قاعدہ ہے کہ پہلے ہر بحر کے عربی ضوابط و اوزان و امثال بیان کرتا ہے ، اس کے بعد فارسی اوزان اور امثال دیتا ہے ۔ سید صاحب اس کو محض فارسی عروض کی کتاب (صفحہ ۲۲۱ ، خیام) بیان کرتے ہیں ، اس لیے سیدِ والا مرتبت کا یہ قول ہے کہ "مولف معیارالاشعار نے صرف قدما یعنی پہلے لوگ لکھا ہے ، جس سے فارسی اور

عربی کی تخصیص نہیں نکلتی ۔" فاضل موصوف اس سے زیادہ اور کیا تخصیص کرتے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھا دیا ہے ۔ ہزج کے عربی اوزان میں انھوں نے رباعی کا مطلق ذکر نہیں کیا اور فارسی کے ذکر میں لکھا جس سے پڑھنے والے پر صاف روشن ہے کہ رباعی فارسی الاصل ہے اور عربی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ۔ سید صاحب اس سے زیادہ اور کیا تخصیص چاہتے ہیں ۔

قولہ : "مگر محمد ابن قیس رازی نے تصریح کی ہے کہ یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدما عربی کے شاعر تھے کیونکہ اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عربی کی طرح فارسی اہل عروض بھی ایک لفظ کے حرفوں کو توڑ کر کبھی دو مصرعوں میں بانٹتے تھے ۔"

(خیام ، صفحہ ۲۲۲)

عروض کے میدان میں یوں تو کئی چیزیں عجمیوں کی دماغی پیداوار اور ذہنی یادگار کی حیثیت سے شمار کی جا سکتی ہیں ، مثلاً بحور قریب و جدید و متشاکل ، نیز ان کی نوایجاد اکیس بحریں جو دوائر منعکسہ و منعلقہ و منغلطہ سے تعلق رکھتی ہیں ۔ لیکن ان کی افادی وقعت قابل ذکر نہیں ۔ لے دے کر دوئی کام کی چیز جو ایرانی اضافے کے طور پر تسلیم کی جا سکتی ہے ، مثنوی اور رباعی ہے ، مگر دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے سید والا شان نے بیک جنبش قلم رباعی کی ایجاد کی عزت سے انھیں محروم کر دیا اور یہ ارشاد کردیا کہ رباعی کہنے والے قدماء عربی کے شاعر تھے ۔ خوش قسمتی سے سید صاحب اس عقیدے میں بالکل تنہا ہیں ، حتیٰ کہ محمد بن قیس بھی جس کی مبیّنہ تصریح پر سید صاحب یہ رائے قائم کرتے ہیں ، ان کے بالکل برخلاف ہے ۔ ذیل میں مصنف موصوف کے تین مختلف بیان ، جن میں ہر ایک سید صاحب کے مزعومہ دعوے کے مخالف ہے ، نقل کیے جاتے ہیں :

"لیکن بحکم آنکہ زحافی کہ درین وزن مستعمل است در اشعار عرب نبودہ است در قدیم برین وزن شعر تازی نگفتہ اند و اکنون محدثان ارباب طبع بران اقبالی تمام کردہ اند و رباعیات تازی

در همه بلاد عرب شائع و متداول گشته است ۔"

(صفحہ ۹۰ ، المعجم فی معاییر اشعارالعجم)

اس کا ترجمہ : لیکن چونکہ ایسے زحاف جو اس وزن (رباعی) میں استعمال ہوتے ہیں ، اشعارِ عرب میں نہیں آتے ، عہدِ قدیم میں تازی گویوں نے اس وزن میں اشعار نہیں لکھے ۔ البتہ عہدِ حاضر کے اربابِ ذوق نے اس کی طرف اقدام کیا ہے ۔ چنانچہ عربی رباعیاں تمام ممالکِ عرب میں رائج اور مشتہر ہو گئیں ۔

ایسے صاف اور صریح بیان کے باوجود سید صاحب کس طرح یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ رباعی گو قدماء عربی کے شاعر تھے ۔

شمس قیس کا دوسرا بیان یہ ہے :

"و بحقیقت هیچ وزن از اوزان مبتدع و اشعار مخترع کہ بعد از خلیل احداث کردہ اند ، بہ دل نزدیک تر و در طبع آویزندہ تر ازین نیست ۔" (صفحہ ۹۰ ، المعجم)

یہ بیان بھی سید صاحب کے دعوے کے خلاف ہے ۔

شمس قیس کا تیسرا بیان رباعی کی ایجاد مشہور شاعر رودکی کی طرف منسوب کرتا ہے ، جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے :

"و یکی از متقدمان شعرای عجم و پندارم رودکی واللہ اعلم از نوع اخرم و اخرب این بحر وزنی تخریج کردہ است کہ آن را وزن رباعی خوانند ۔" (صفحہ ۱۸۸ ، المعجم)

جب رباعی کی ایجاد بروایت شمس قیس ، رودکی کی طرف منسوب ہے تو پھر ہمارے سید محترم کس طرح قدمائے عربی کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ اور لطف یہ ہے کہ خود محمد بن قیس کو اپنے بے سند دعوے کا مدار علیہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد ابن قیس رازی نے تصریح کی ہے کہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدمائے عربی کے شاعر تھے ۔ اگر رازی نے کوئی ایسی تصریح کی تھی تو سید صاحب کو چاہیے تھا کہ اس کی اصل عبارت نقل کر دیتے ۔

عربی کی طرح فارسی اہل عروض بھی ایک لفظ کے ٹکڑوں کو

توڑ کر کبھی دو مصرعوں میں بانٹتے تھے ۔ اس سے میں سمجھتا ہوں سید صاحب کا مطلب اشعارِ معقد سے ہے ۔ ایسے اشعار عربی کی تقلید میں قدمائے فارسی میں رائج تھے ، زیادہ تر انھی ایام میں جب شعر گوئی کا مدار اکثر و بیشتر مربعات پر تھا ۔ اشعارِ معقد میں مصرع اول مصرع دوم سے لفظاً و معناً وابستہ ہوتا ہے ۔ ہر مصرع مرکب غیر مفید کا حکم رکھتا ہے ۔ جب تک دوسرا مصرع ساتھ نہ پڑھا جائے بات نا تمام رہتی ہے ۔ اس لیے کئی موقعوں پر ضروری ہے کہ دونوں مصرعوں کو ساتھ ملا کر مثل ایک مصرعِ مثمن کے پڑھیں ۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار معقد ہیں جو فارسی میں اصول مثمنات کی دریافت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ۔ جب مثمنات کی دریافت نے فارسی عروض میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ، اوزانِ مربع کا رواج متروک ہوگیا ۔ ان کے ساتھ ہی اشعار معقد بھی ، جو مثنٰی و مربع و مثلث ہوتے تھے ، غائب ہوگئے ۔ محقق طوسی نے ان کی بعض مثالیں اپنی تالیف میں محفوظ رکھی ہیں جن میں سے کچھ اس سے پیشتر اسی مضمون میں نقل ہوچکی ہیں ، بعض یہاں درج کی جاتی ہیں ۔

مثال ہزج مربع سالم :

بیار آن می کہ پنداری   روان یاقوت نابستی

و یا چون برکشیدہ تیغ   پیش آفتابستی

آخری شعر میں تیغ کا 'غین' وزن کی رو سے دوسرے مصرع میں شامل ہے ۔ رودکی کا یہ قطعہ بالعموم مثمن شکل میں لکھا جاتا ہے ، جس سے تمام قطعہ مصرّع ہوگیا ہے ، حتٰی کہ 'حدایق السحر' میں بھی اس کو مثمن ہی درج کیا ہے ۔ لیکن محقق طوسی نے مذکورۂ بالا شعر مربع کی مثال میں نقل کیے ہیں ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعہ اصل میں مربع تھا اور مثمنات کے رواج کے بعد اس کو بھی مثمن بنا لیا گیا ۔

مثال دیگر :

رہ شادیم بہ بستی

یہ دو رکنی شعر ہے جس کی تقطیع ہے : رہ شادی فعلاتن ، م ب
بستی فعلاتن ، یعنی میم ضمیر متکلم شامل مصرع دوم ہے ۔
مثال دیگر :

ہر کہ بد خواند ترا
از مردمی ہست او بری

اس شعر میں 'از' بغرض تقطیع شاملِ مصرعِ اول ہے ۔
مثال شعر مثلث :

نوشد جہان زین نوبہار و سال نو

یہ تین رکن کا پورا شعر ہے جس کا نصف معین نہیں۔ عربی تقلید میں
بدیع بلخی نے یہ قصیدہ لکھا تھا ۔

قولہ : "چوتھی پانچویں صدی کے شعرائے فارسی پہلے ، دوسرے
اور چوتھے مصرعوں کے ساتھ تیسرے کو بھی اکثر ہم قافیہ
لایا کرتے تھے مگر اس کا قطعی لزوم ان کے ہاں بھی نہ تھا ۔
چنانچہ رودکی ، فردوسی ، عنصری وغیرہ کی رباعیوں میں کبھی
تیسرے مصرع میں قافیہ ہے اور کبھی نہیں ہے ۔"

اس بارے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پروفیسر فارسی پنجاب
یونیورسٹی کی رائے میرے خیال میں زیادہ وزنی ہے ۔ ان کا بیان
ہے کہ ایک رباعی جتنی زیادہ قدیم ہوگی ، گمان اغلب ہے کہ وہ
مصرّع ہوگی ، جتنی متاخر ہوگی ، اتنی ہی خصّی ہوگی ۔ میں غیر
خصّی کو مصرّع اور خصّی کو غیر مصرّع کہوں گا ۔ چوتھی اور
پانچویں صدی میں بالعموم مصرّع رباعیاں رائج تھیں ۔ مثلاً شعرائے
عہدِ غزنہ کے دواوین سے عنصری کی ۳۶ رباعیوں میں سے ۳۴ ،
فرخی کی ۳۷ میں سے ۳۶ ، ناصر خسرو کے ہاں ایک میں سے ایک ،
ابوالفرج رونی کے ہاں ۵۷ میں سے ۵۱ ، قطران تبریزی کے ہاں
۱۵ میں سے ۱۱ اور مسعود سعد سلمان کے ہاں ۲۲۷ میں سے ۲۱۹
رباعیاں مصرّع ہیں ۔ اس سے ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ چوتھی
اور پانچویں صدی میں مصرّع رباعیاں کہنے کا دستور لزوم کی حد تک

عام تھا ۔ ان میں غیر مصرّع رباعیوں کا شمول خالی از اشتباہ نہیں ۔ جلد دوم لباب الالباب میں شعرائے آل سامان و شعرائے آل ناصر کی رباعیاں جو بہ تفصیل ذیل ہیں ، سب کی سب بلااستثنا مصرّع ہیں ۔ چنانچہ :

ابو شکور بلخی ، یک (صفحہ ۲۱) ۔ عنصری ، یک (صفحہ ۳۲) ۔ ابو عبداللہ محمد المعروف برورده البلخی کے ہاں پانچ مختلف مصرّع شعر بر وزن رباعی (صفحہ ۴۷) ۔ فرخی ، ۲ (صفحہ ۵) ۔ ابو عبد اللہ عبدالرحمن بن محمد العطاردی ، ۲ (صفحہ ۵۷) ۔ ابوالحرث حرب بن محمد الحقوری الہروی ، یک (صفحہ ۶۱) ۔ ابو منصور عبدالرشید بن احمد بن ابی یوسف الہروی ، یک (صفحہ ۶۱) ۔ مسعود الرازی ، یک (صفحہ ۶۳) ۔ ناصر لغوی ، یک (صفحہ ۶۶) ۔ یہ رباعی ۱۲۴ھ میں امیر محمد بن محمود کے قید کیے جانے کے موقع پر لکھی گئی ہے ۔ محسن قزوینی ، یک (صفحہ ۶۷) ۔ . . . بن احمد البدری الغزنوی ، یک (صفحہ ۶۷) ۔

لغت فرس میں تین رباعیاں میری نظر سے گزریں اور تینوں مصرّع ہیں ۔ پہلی 'لست' کی شرح میں صفحہ ۴۶ پر لبیبی کی ۔ دوسری 'زوشیدن' کی تشریح میں صفحہ ۵۳ پر عسجدی کی اور تیسری ابوالموید کی 'نلک' کی تشریح میں جو حسب ذیل ہے :

صفرای مرا سود ندارد نلکا
درد سر من کجا شناسد علکا
سوکند خورم بہرچہ ہستم ملکا
کز عشق تو بگداختہ ام چوکاکا (صفحہ ۶۸

لغت فرس میں تو یہ رباعی سب سے قدیم مانی جا سکتی ہے ۔

رباعی کے وزن پر بعض شعر بھی اسی فرہنگ میں ملتے ہیں ؛ مثلاً 'شبغازہ' کے ذکر میں صفحہ ۳۷ پر عمارہ کا شعر مصرّع اور صفحہ ۳۸ پر 'چغز' کے بیان میں ابوالفتح بستی کا مصرّع بیت :

هر چند کہ درویش پسر فغ زاید

درچشم توانگران ہمہ چغز آید

اور صفحہ ۸۰ پر 'مالہ' کے ذکر میں عمارہ کا شعر، لیکن دقیقی کا ایک شعر، جو اگرچہ وزن رباعی میں ہے، غیر مصرّع ہے جو صفحہ ۱۰۸ پر 'سخون' کی تشریح میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ:

ترسم کان وهم تیز خیزت روزی

وهم همه هندوان بسوزد بسخون

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شعر کسی رباعی سے لیا گیا ہے بلکہ فردیات سے تعلق رکھتا ہے۔ اوزان رباعی میں منفرد اشعار بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ میں ایک مثال رودکی کے ہاں سے دیتا ہوں:

اندر عجم ز جان ستان گز چو توی

جان بستد و از جمال تو شرم نداشت[1]

گلستان سعدی میں ایسے فردیات کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

علی هذا دمیتہ القصر میں باخرزی نے، جو عربی اور فارسی رباعیاں درج کی ہیں، تمام وکمال مصرّع ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات: ۱۷۴، ۱۷۵، ۲۰۲، ۲۶۱ و ۲۶۹۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ رودکی و فردوسی و عنصری وغیرہ کے ہاں غیر مصرّع رباعیوں کا موجود ہونا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ان شعرا کی اصلی رباعیاں نہیں بلکہ متاخرین نے سہواً ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ رودکی کی جس قدر رباعیاں سید صاحب نے نقل کی ہیں، یقیناً مشتبہ ہیں اور یہ انھیں خود بھی تسلیم ہے۔ اسی قسم کی ایک رباعی شمس قیس نے المعجم میں حسب ذیل دی ہے:

۱۔ احوال و اسعار ابو عبداللہ جعفر بن محمد رودکی، جلد دوم، صفحہ ۶۰۳، از سعید نفیسی، طہران ۱۳۱۰ھ۔ (حاشیہ مصنف)

فرخی نے ایک قصیدہ وزن رباعی میں لکھا ہے۔ اس کا پہلا مصرع ہے: غ

سروی کر سرو ماہ دارد بر سر (حاشیہ مصنف)

واجب نبود بکس بر افضال و کرم
واجب باشد هر آئینہ شکر نعم
تقصیر نہ کرد خواجہ در ناواجب
من در واجب چگونہ تقصیر کنم

(المعجم ، صفحہ ۳۰۳)

مگر یہ رباعی غیر مصرّع ہونے کے علاوہ پچاس فیصدی عربی الفاظ پر شامل ہے جو یقیناً رودکی کے عہد کی زبان نہیں ۔ جلد دوم احوال و اشعار رودکی میں سعید نفیسی نے رودکی کی ہجویات کی مثال میں یہ رباعی نقل کی ہے ، جو شبہے سے خالی نہیں :

آن خر پدرت بدشت خاشاک زدی
مامات دف و دو رویہ چالاک زدی
آن بر سر گور ها تبارک خوالدی
وین بر در خانہا بتوراک زدی

۳۵۲ھ میں امیر ابوجعفر والیِ سیستان کی وفات پر صانع بلخی یہ رباعی لکھتا ہے :

خان غم تو پست شده ویران باد
خان طربت همیشہ آبادان باد
همواره سرکار تو با نیکان باد
تو میر شهید و دشمنت ماکان باد[1]

قولہ : ''عربی کی رباعیوں میں چاروں مصرعوں کا ہم قافیہ لانا اس لیے ضروری تھا کہ اس کا ہر مصرع شعر ہوتا تھا ۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض جدت پسندوں نے قافیہ کے ساتھ ردیف کی بھی شرط کرلی تھی ۔'' (صفحہ ۲۲۳ ، خیام)

رباعی کے معاملے میں عربی والے ہمیشہ فارسی کے مقلد رہے اس لیے جب رباعی چار شعروں کی صورت میں لکھی جاتی تھی یا

۱ ۔ صفحہ ۳۲۳ ، تاریخ سیستان ، از حدود سال ۲۵ ۔ ۷۲۵ ، مصحح ملک الشعراء بہار، طہران ۱۳۱۴ شمسی ۔ (حاشیہ مصنف)

جب دو شعروں کی صورت میں مرقوم ہوتی تھی، عربی خواں ہر حال میں تقلیدِ شعرائے فارسی کرتے رہے ہیں - یہی کیفیت ردیف کی ہے جو فارسی‌الاصل ہے اور عربی والوں نے تقلیداً اختیار کرلی ہے - محقق طوسی کتاب معیار الاشعار میں رقم طراز ہیں :

”و ردیف در اصل خاص بود بزبان پارسی و متاخرین شعرای عرب از پارسی گویان فرا گرفته اند و بکار می‌دارند -“

(معیار الاشعار و میزان الافکار ، ۱۲۶۴ھ ، مطبع علوی)

قوله :” ابوالحسن باخرزی المتوفّی ۴۶۷ھ نے اپنی کتاب دمیۃالقصر میں ذکر کیا ہے کہ میں نے اس سے پہلے اس طریقے پر رباعی نہیں سنی تھی : ’لم اکن سمعت هذه الطریقة‘ یہاں تک کہ میرے والد نے ابوالعباس باخرزی کی چند رباعیاں اسی طرز کی سنائیں -“ (صفحہ ۲۲۴ ، خیام)

”لم اکن سمعت هذه الطریقة“ کا ترجمہ سید محترم نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ : ”میں نے اس سے پہلےاس طریقے پر رباعی نہیں سنی تھی -“ لیکن یہ ترجمہ درست نہیں معلوم ہوتا - عربی عبارت میں رباعی کا لفظ مذکور نہیں - میرے نزدیک اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ ”میں نے اب تک اس قسم کی نظم نہیں سنی تھی “ ، اور مصنف کا مقصد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے عربی میں رباعی سننے کا عمر میں یہ پہلا موقع تھا ، جب اس کے والد نے ابوالعباس باخرزی کی اس طرح کی رباعیاں سنائیں - باخرزی کی عبارت ہے :

”ولم اکن سمعت هذه الطریقة حتیٰ انشدنی والدی لابی‌العباس الباخرزی رباعیات علیٰ هذا النمط -“ (صفحہ ۱۷۴)

اگر میرا یہ اختلافی ترجمہ قابل قبول ہے تو ظاہر ہے کہ رباعی کا تعارف اگرچہ عربی میں ہو چکا تھا مگر اس کا علم خواص تک محدود تھا اور عام رواج میں نہیں آئی تھی - کیونکہ باخرزی جیسا فاضل شخص اس کے وجود سے بے خبر تھا - باخرزی کا یہ بیان

بجائے سید صاحب کی تائید کے ان کے اس قول کی کہ رباعی کہنے والے قدماے عربی کے شاعر تھے ، واضح تردید کرتا ہے ، بلکہ دمیۃ القصر میں اور موقعوں پر بھی فارسی کے ساتھ رباعی کے مربوط ہونے کی نسبت اشارے موجود ہیں ۔ چنانچہ ابولصر تمیم بن احمد الغزنوی کے حالات میں مذکور ہے کہ :

''والغالب علیہ لسان العجم و رباعیۃ ۔'' (صفحہ ۱۷۸)

محمد بن ابی نصر کے ذکر میں مرقوم ہے :

''ولہ رباعیات فی الفارسیہ رقیقۃ و اختراعات فیہا دقیقۃ''(۲۶۵) ۔

اسی طرح صفحات : ۲۰۲ ، ۲۶۱ ، ۲۶۲ ، ۲۶۵ ، ۲۹۶ پر فارسی کی متعدد رباعیاں اور ان کے عربی ترجمے منقول ہیں ۔

اس کے بعد فاضل سید دمیۃ القصر سے عربی کی پانچ مصرّع رباعیاں نقل کرکے فرماتے ہیں :

''آپ دیکھیں کہ ان سب رباعیات کے چاروں مصرعوں میں قافیے ہیں ، حالانکہ اسی عہد کی بلکہ اس سے پیش تر کی فارسی رباعیوں میں اس کی پابندی مطلق نہیں ہے ۔ عمارہ مروزی ، جو چوتھی صدی کے اواسط میں تھا ، کہ اس نے سامانی و غزنوی دونوں درباروں میں رسوخ پایا تھا ، کہتا ہے :

آن می بدست آن بت سیمین من نگر
گوئی کہ آفتاب بہ پیوست با قمر
وان ساغری کہ سایہ بیفگند می برو
برگ گل سپید است گوئی بلالہ بر

تیسرا مصرع قافیے سے خالی ہے ۔'' (صفحہ ۲۲۵ ، خیام)

چاروں مصرعوں میں قافیہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں بہ تقلید چہاربیتی ، دو بیتی یا مصرّع رباعیاں کہنے کا دستور تھا ۔ فارسی شعرا بھی اپنی دو بیتیوں میں چار قافیے ہی لاتے تھے ۔ جیسا کہ اس سے قبل گزارش ہو چکا ہے ، سید صاحب کے ذہن میں جو تین قافیوں والی غیر مصرّع رباعیاں ہیں ، وہ در حقیقت زمانۂ مابعد

کی پیداوار ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ وہ اوزانِ غیررباعی کو اوزانِ رباعی کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں ۔ چنانچہ عمارہ مروزی کے تین قافیوں والے اشعارِ بالا کو رباعی تصور کر رہے ہیں ، حالانکہ رباعی کو ان سے کوئی واسطہ نہیں ۔ اصل میں بحرِ ہزج کے بارہ اخرب اور بارہ اخرم اوزان جن کی میزان چوبیس ہوتی ہے ، اوزان رباعی کہلاتے ہیں اور رباعی کا اطلاق انھی اوزان پر محدود ہے ۔ عمارہ مروزی کے اشعار بحرِ مضارع میں ہیں ۔ ان کی تقطیع یہ ہے :

آن می ب = مفعول ، دست آن ب = فاعلات ، ت سیہ یں = مفاعیل ، = من نگر = فاعلن ، گویی ک = مفعول ، آفتاب = فاعلات ، ب پیوست = مفاعیل ، باقمر = فاعلن ، اور وزن مضارع مثمن مکفوف و محذوف ہے ۔

رباعی کے مختلف ناموں کے ذکر میں ہمارے سیدِ والا شان قابوس نامۂ عنصر المعالی امیر کیکاؤس سے مثالیں دے کر غزل و ترانہ کو ایک ہی اصطلاح منوانے کی کوشش میں مصروف ہیں ۔ چنانچہ :

قولہ : "باب سی و پنجم اندر آئین و رسم شاعری" میں مختلف اصناف

سخن کے سلسلے میں غزل و ترانہ کہا ہے ۔ "اگر غزل و
ترانہ گوئی سہل و لطیف تر گوئی و بقوافی معروف گوئی ۔"
پھر آگے چل کر ہے "و غزل و ترانہ تر و آبدار گوئی ۔"

(صفحہ ۱۴۴ ، بمبئی)

ع : یہ ایسی دھری ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی

میں کسی حالت میں بھی سید صاحب کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا کہ امیر کیکاؤس نے ان فقروں میں غزل کو ترانہ کا مترادف سمجھا ہے ۔ غزل و ترانہ میں خبط کر دینا اور یہ سمجھنا کہ چونکہ دونوں معطوف و معطوف علیہ ہیں ، اس لیے معنوں میں مشترک ہیں، صریح مسلمات سے انکار کرنا ہے ۔ غزل و ترانہ سے عنصر المعالی کی مراد یہی مشہور دو اقسام نظم ہیں جو غزل اور رباعی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں ۔ یہاں سید صاحب ایک شدید قسم کی

غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ اسی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

قولہ : ”محمد بن قیس رازی نے معجم (۶۱۴ھ - ۶۳۰ھ) میں ذرا ذرا سے فرق سے اس کے (یعنی رباعی کے) حسب ذیل نام بتائے ہیں :

قول : ہر چہ ازان جنس بر ابیات تازی (عربی) سازند آن‌را قول گویند ۔

غزل : و ہرچہ بر مقطعات پارسی باشد آنرا غزل خوانند ۔

ترانہ : اهل دانش ملحونات این وزن را ترانہ نام کردند ۔

دوبیتی : و شعر مجرد آنرا دوبیتی خوانند برای آنک بنای آن بر دو بیت بیش نیست ۔

رباعی : و مستعربہ آن را رباعی خوانند از بہر آنک بحر هزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمدہ است ، پس هر بیت ازین وزن دوبیت عربی باشد ۔ (صفحہ ۹۰)

قدماء کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ ساتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک غزل کی موجودہ اصطلاح پختہ نہیں ہوئی تھی ۔“ (صفحہ ۲۲۷ ، خیام)

سید صاحب قول و غزل و ترانہ کو مرادف شمار کر رہے ہیں ، حالانکہ ایسی غلط فہمی نہ قدماء میں تھی ، نہ متاخرین میں ۔ یہ اصطلاحیں ہمیشہ جدا جدا مانی گئی ہیں ، مانی جاتی ہیں اور مانی جاتی رہیں گی ۔ ہمیں یقین ہے کہ سیدِ والا مناقب کو ایک شخص بھی آن کی رائے کا موید نہیں ملے گا ۔ اسی طرح میرے مخدوم شمس قیس کا اصل مطلب سمجھنے میں قاصر رہے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان اصطلاحات میں شمس قیس نے ذرا ذرا سے فرق سے رباعی کے نام دیے ہیں ، حالانکہ شمس قیس کی مراد بالکل مختلف ہے ۔ مصنفِ موصوف رباعی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”درحقیقت ان تمام نو ایجاد اوزان میں سے ، جو خلیل کے بعد ایجاد ہوئے ہیں ، کوئی وزن رباعی سے زیادہ دل آویز اور مرغوبِ طبعِ عوام نہیں ، کیونکہ موسیقی کے فن کاروں نے اس

وزن میں نفیس نفیس لحنیں اور لطیف لطیف راہیں بٹھائی ہیں ۔
(اس کے بعد بطور جملۂ معترضہ کہتے ہیں) اور دستور یوں
چلا آیا ہے کہ اس جنس (لحنوں) سے جو کچھ عربی اشعار میں
بٹھایا جائے ، اسے قول کہتے ہیں ۔"

گویا مصنف کے نزدیک قول اس راگ یا سرود کا نام ہے جو عربی اشعار میں بٹھایا جاتا ہے ۔ اس بارے میں اہل لغت بھی مصنف کے ساتھ متفق ہیں ۔ ان کے نزدیک قول ایسا سرود ہے جس میں عربی عبارت شامل ہوتی ہے :

"و در اصطلاح موسیقیان نوعی از سرود کہ دران عبارت عربی
نیز داخل باشد ۔"

اسی لیے گانے والا قوّال کہلاتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ قول ہمارے مصنف کے نزدیک ترانہ یا رباعی سے بالکل مختلف چیز ہے ۔

آگے شمس قیس کا بیان ہے کہ جو "لحنیں فارسی مقطعات یعنی اشعار میں بٹھائی جائیں انھیں غزل کہتے ہیں ۔" اس سے مطلب شعرا کی غزل نہیں بلکہ موسیقی کی ۔ اس جملے میں مقطعات کی اصطلاح تشریح طلب ہے ۔ فارسی لغات کا بیان ہے : "مقطعات شعر ہای سبک وزن و اشعار بحر رجز ۔" اس کے جاننے کے بعد مصنف کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ فارسی کے سبک اوزان اشعار میں لکھا جاتا ہے ، اسے غزل کہتے ہیں ۔ شیخ بہاء الدین برناوی متوفّٰی ۱۰۳۸ھ جو موسیقی میں امیر خسرو کے بعد امام فن کا رتبہ رکھتے ہیں ، غزل کی تشریح یوں کرتے ہیں : غزل وہ قسم ہے ، جس میں ایک غزل یا اس کے انتخابی ابیات سادہ راگ اور تال میں بغیر تانا ننی کے باندھ دیں ۔ اس قسم میں پردۂ ولایتی مغلوب کر دیتے ہیں بلکہ بعض اقسام میں نہیں لاتے ، اس کو جکری اور بشنپد سے زیادہ مشابہت ہے ۔"

(صفحہ ۷۷ ، اورینٹل کالج میگزین ، مئی ۱۹۲۷ع)

اس کے بعد مصنفِ ممدوح کہتے ہیں کہ :

"اہلِ دانش نے اس وزن یعنی وزنِ رباعی کی لحنوں کا نام ترانہ

رکھا ہے ، جسے بہ مناسبتِ شعرِ فارسی دو بیتی کہتے ہیں اور عربی خوان رباعی ۔"

بالفاظ دیگر رباعی بحیثیت موسیقی ترانہ کہلاتی ہے ۔ اس سے پیشتر مصنف نے قول ، غزل اور ترانے کا فرق موسیقی کے اعتبار سے دکھایا تھا ۔ یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے مرادف ہیں ۔ اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ شمس قیس نے اپنی اسی تصنیف میں کسی دوسرے مقام پر غزل و رباعی کی، جنھیں سید صاحب ایک سمجھ رہے ہیں ، جدا جدا صراحت کی ہے ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف مذکور کے نزدیک غزل و رباعی نظم کی دو مختلف اقسام ہیں ۔ غزل کے متعلق لکھتے ہیں :

"و غزل در اصل لغت حدیث زنان و صفت عشقبازی با ایشان و تہالک در دوستی ایشان است و مغازلت عشقبازی و ملاعبت است با زنان . . . . و بیشتر شعرای مفلق ذکر جمال معشوق و وصف احوال عشق و تصابی را غزال خوانند . . . . و بحکم آنکہ مقصود از غزل ترویج خاطر و خوش آمد نفس است باید کہ بنای آن بر وزنی خوش مطبوع و الفاظی عذب سلس و معانی رائق مروق نہند و در نظم آن از کلمات مستکرہ و سخنان خشن محترز باشند ۔" (صفحہ ۳۸۷ ، المعجم)

اور رباعی کے متعلق کہتے ہیں :

''ہم چنین رباعی کہ پیش ازین در قسم عروض شرح آن گفتہ آمدہ است بحکم آنکہ بنای آن بر دو بیت بیش نیست ، باید کہ ترکیب اجزای آن درست و قوافی متمکن و الفاظ عذب و معانی لطیف باشد و از کلمات حشو و تجنیسات متکرر و تقدیم و تاخیرات ناخوش خالی بود و اگر بآن چیزی از صناعات مستحسن و مستبدعات مطبوع چون مطابقۂ لطیف و تشبیہی درست و استعارتی لطیف و تقابلی موزون و ایہامی شیرین یار بود نیکو تر آید ۔"

(صفحہ ۳۸۸ ، المعجم)

ابو طلب رباعی گو کی نسبت ، جس کا ذکر فرخی کے مسبوق الذکر شعر میں آتا ہے ، سید صاحب رقم طراز ہیں :

قولہ : ''ابو طلب نام کسی شاعر کا پتا ہم کو نہیں چلتا ۔ فرخی جس کا یہ شعر ہے ، اس نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی ہے ۔ اس لیے ابوطلب ترانہ‌گو کا زمانہ اس سے تو بہر حال پہلے تھا ۔ ایک خیال ہوتا ہے کہ ابوطلب ابودلف تو نہیں مگر یہ امر سراپا تحقیق طلب ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو ترانہ گوئی کا زمانہ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں پہنچ جائے گا ۔''

(صفحہ ۲۲۹ ، خیام)

سبحان اللہ! ابھی تحقیقات شروع بھی نہیں ہوئی لیکن سید والامنزلات نے پہلے ہی یہ حکم لگا دیا کہ 'اگر یہ صحیح ہے تو ترانہ گوئی کا زمانہ تیسری صدی ہجری میں پہنچ جائے گا ۔' اچھا اگر یہ غلط ثابت ہوا تو پھر کون سی صدی میں پہنچ جائے گا ؟ یہاں ہم سید صاحب کی تحقیقات سے اعراض کر کے اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ جیسا اس سے قبل بیان ہو چکا ہے ، شعر بالا میں جس ابوطلب کا نام مذکور ہے ، فرخی کے بائیہ قصیدے سے تعلق رکھتا ہے ، جس میں بے 'روی' اور قافیہ غضب ، رجب ، عجب ، ادب ، نسب وغیرہ ہے ۔ ان مراتب کو جانتے ہوئے بوطلب کی جگہ بودلف کو قبول کرنے میں جس کے سید صاحب محرک ہیں ، ہمیں بے شمار مشکلات سے سابقہ پڑے گا ' کیونکہ نہ صرف بوطلب کو بودلف میں تبدیل کرنا کفایت کرے گا بلکہ قصیدے کے تمام قافیوں کی 'بے' کو جن کی تعداد پچاس ہے ، 'فے' کے ساتھ تبدیل کرنا پڑے گا ، جس سے نہایت مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جائے گی اور وہی معاملہ پیش آئے گا جو سعدی کے مصرع : ''شاید کہ پلنگ 'خفتہ' باشد'' کو خفیہ پڑھنے سے پیش آیا تھا ، یعنی اس کے پہلے شعر :

تا مرد سخن نگفتہ باشد

عیب و ہنرش نہفتہ باشد

کے قافیوں گفتہ و نہفتہ کو نئی ترمیم کی خاطر گفیہ و نہفیہ پڑھنے پر مجبور ہونا پڑا تھا ۔ یہ ابوطلب کا بدل ابودلف جو بقول دولت شاہ یعقوب صفار متوفی ۲۶۵ھ کے دربار میں ابن الکعب ایک اور شاعر کے ساتھ رباعی کا موجد مانا گیا ہے ، اور موجودہ تحقیقات جس کا پتا نشان نہیں دیتی ، ہمیں تو صرف دولت شاہ کے تخیل کی ایک مخلوق معلوم ہوتا ہے ۔ مگر ہمارے محترم نے اس غیر حقیقی شخصیت کو حقیقی شخصیت دینے کے لیے مامون و معتصم کے عہد کے ایک امیر ابو دلف عجلی متوفی ۲۲۶ھ کے ساتھ شناخت کر لیا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

قولہ : دولت شاہ نے اپنی روایت میں یعقوب صفار کے دربار کے جن دو شاعروں کے نام لیے ہیں ، ان میں سے ابن الکعب سے تو ہم واقف نہیں البتہ رابعہ بنت الکعب (دختر کعب) کا ذکر ملتا ہے ، جو عہد سلاطین غزنین (پانچویں صدی) میں تھی (عوفی ۲-۶۱) ۔ دوسرے شاعر ابودلف عجلی کا تذکرہ سیاسی و ادبی کتابوں میں ملتا ہے ۔ یہ شخص نسلاً عرب اور مامون و معتصم کے عہد میں ایران کا سپہ سالار تھا ۔ قاسم بن عیسلی نام تھا ۔ ابن خلکان نے اسی نام کے تحت میں اس کا پورا حال لکھا ہے ۔ ۲۲۶ھ میں اس نے وفات پائی ۔" وغیرہ وغیرہ ۔ اور آخر میں اضافہ ہوا ہے :"اس کا زمانہ یعقوب صفار سے پہلے تھا ۔ یعقوب صفار کے عہد میں اس کے بیٹے عبدالعزیز بن ابی دلف کا نام اصفہان کی سیاسیات کے سلسلے میں آتا ہے ۔"

(صفحہ ۳۰-۲۳۱ ، خیام)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت مولانا نے ان دونوں اشخاص میں اسمی اشتراک کے سوا کیا وجہ مماثلت دیکھی کہ ان دونوں کو ایک مان لیا ۔ گویا امیر ابودلف عجلی ۲۲۶ھ میں وفات پا کر

بروے تناسخ دوبارہ جنم لے کر یعقوب بن لیث کے دربار میں بحیثیت شاعر نمودار ہوتا ہے ، اگرچہ مولانا ابودلف کو یعقوب صفار سے اقدم بھی مان رہے ہیں ۔ ایک لطف یہ ہے کہ جب جنابِ سید کو دولت شاہ کا مبیّنہ ابن الکعب نہ مل سکا تو بنت الکعب پر قناعت کر لی ، جس کا زمانہ عہد آل غزنہ بیان کرتے ہیں ۔

سید صاحب کا خیال ہے کہ رودکی کے زمانے میں غزنی کوئی آباد شہر نہ تھا ۔ اسی بنا پر شمس قیس کا روایت کردہ قصہ ، جو رباعی کی ایجاد پر روشنی ڈالتا ہے اور جس میں رودکی شاعر ، غزنین کے مرغزار میں عید کے روز سیر و گشت میں مصروف دکھایا گیا ہے ، ان کے نزدیک ناقابل قبول ہے کیونکہ جب شہر ہی آباد نہ تھا تو شاعر وہاں کیوں جاتا ۔ (دیکھو صفحہ ۲۳۰ ، خیام)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غزنین قدیم شہروں میں ہے ۔ بروایت تاریخ کامل عبدالرحمٰن بن سمرہ بخلافت حضرت عثمان غزنی کو فتح کرتا ہے (جلد ۳ ، صفحہ ۵۰) تاریخ سیستان میں مذکور ہے :

"و غزنین یعقوب بن اللیث ملک الدنیا کرد[1]" (صفحہ ۲۴) ۔

۲۸۶ھ کے قریب یعقوب کے بھائی عمرو لیث کے زمانے میں ناسد ہندی و آلہان ہندی متحد ہو کر غزنین پر چڑھ آتے ہیں ، اور عمرو کے عامل برد عالی کو شکست دیتے ہیں (صفحہ ۲۵۵ ، تاریخ سیستان) ۔ اسی خاندان کے ایک اور فرد لیث بن علی کے عہد میں اس کا سالار معدل ۲۹۶-۷ھ میں غالب کو قید کر کے لیث کے پاس سیستان بھیجتا ہے اور پور غزنین پہنچ کر سنحجک کو قتل کرتا ہے ۔ سنحجک کی فوج معدل کی تلاش کرتی ہے لیکن معدل غزنین میں نہیں ملتا (صفحہ ۲۸۷ ، تاریخ سیستان) - ۲۹۸ھ کی ذیل میں آتا ہے :

"و خطبہ بسیستان و بست و کابل و غزنین محمد بن علی اللیث را همی کردند ۔" (صفحہ ۲۹۰)

---

۱ - یعنی آباد کرد ۔ (حاشیۂ مصنف)

امیر نصر بن احمد سامانی ۳۳۱ھ کے سال جلوس کے ذکر میں یہ عبارت ملتی ہے :

"و عبید اللہ بن احمد بن جیہانی در بست در خج بود و سعید طالقانی را بگرفت و بہ بغداد فرستاد و فضل و خالد بر غزنہ و بست دست یافتند ۔"

(صفحہ ۴۰۰ ، احوال و اشعار رودکی ، جلد اول)

ان مثالوں سے تو غزنین رودکی کے زمانے میں ایک اہم اور آباد شہر معلوم ہوتا ہے ۔ ایک امر دل چسپی کا موجب یہ ہے کہ بنت الکعب ، جسے ہمارے سید بروایت عوفی آل غزنہ کے زمانے میں جگہ دیتے ہیں ، شیخ فریدالدین عطار ، جو عوفی سے بھی اقدم ہیں ، رودکی کی معاصر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے رودکی کے ساتھ مشاعرے کیے ہیں ۔ جن دنوں رودکی اس شاعرہ کے وطن میں آیا تھا ، وہ اس کا نام زین‌العرب بتاتے ہیں[1] ۔

میں نے ابو شکور بلخی کی ایک رباعی کو ، جس کا آفرین نامہ ۳۳۳ھ میں ختم ہوتا ہے ، سب سے قدیم رباعی بتایا تھا ۔ اس پر سید صاحب نے اعتراض کیا اور کہا کہ ایسی رباعیاں عوفی کے ہاں دس بارہ سے زیادہ ہیں ۔ یہاں میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ سید صاحب کے نزدیک سب سے قدیم رباعی کون سی ہے ۔ انھوں نے سرفہرست حنظلہ بادغیسی متوفی ۲۱۹ھ کی رباعی کو جگہ دی ہے ، مگر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں ، وہ رباعی دو بیت ہیں اور دوبیتی نہیں ہے ۔ آگے سید صاحب نے بایزید بسطامی متوفی۲۳۴ھ کے نام پر تین غیرمتصرع رباعیاں دی ہیں ، اور زبان کی صفائی اور والہ داغستانی کی تائید مزید کی بنا پر ان رباعیوں کو بایزیدی ٹکسال کا نہیں مانا ۔ زاں بعد رودکی کا نمبر آتا ہے جس کی سات رباعیاں درج کی ہیں اور آخر میں اضافہ کیا ہے کہ :

۱ ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زیر نظر جلد کا ضمیمہ ۶ ، بہ عنوان : "رابعہ بنت الکعب القزداری ۔" (مرتب)

"ان رباعیوں پر بھی یقین نہیں کہ وہ واقعی اسی کی ہیں ۔"

فاضل سید نے فارابی کا تو اس انداز سے اعلان کیا ہے جس سے گمان گزرتا ہے کہ رباعی گوئی مدت العمر اُس کا پیشہ رہا ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"رباعی گو حکیموں میں پہلا نام اور مطلق رباعی گویوں میں تیسرا نام معلم ثانی ابونصر فارابی المتوفی ۳۳۹ ہجری کا ملتا ہے ۔" (صفحہ ۲۳۴، خیام)

تین غیر مصرّع رباعیاں اس کے نام پر نقل کی ہیں جو اوروں کی طرف بھی منسوب ہیں ۔ سید صاحب کے نزدیک فارابی کی رباعی گوئی کے یہ قرائن ہیں کہ گو نسلاً وہ ترک تھا مگر اس زمانے میں عجم و ترکستان کی عام زبان فارسی ہی تھی ۔ اس کے علاوہ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھا ، اس لیے اس کی طرف فارسی رباعیات کا انتساب غیرمتوقع نہیں ہے ۔ شہرزوری کی تاریخ الحکما میں ہے "اصلہ فارسی" ۔ میں کہتا ہوں ایسے غیر متعلق قرائن ، تین رباعی تو بہت ہوتی ہیں ، فارابی کے حصے میں ایک رباعی دینے کو بھی ہمیں آمادہ نہیں کرسکتے ۔ آگے جا کر خود ہمارے مخدوم یقین اور بے یقینی کے سیلاب میں بہہ گئے ہیں ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"مگر ان قرائن کے باوجود کوئی قدیم اور غیر مشکوک دلیل اس کے رباعی گو شاعر ہونے پر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے ، بجز اس کے کہ شہرزوری نے تاریخ الحکما میں اس کے حال میں لکھا ہے 'ولہ اشعار حسنۃ حکمیۃ' اور اس کے اچھے حکیمانہ اشعار ہیں، اور اس کے عربی حکیمانہ اشعار دو صفحوں میں نقل کیے ہیں ۔"

یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے کہ ان دو صفحے عربی اشعار کی بنا پر ہم کیا فارابی کو فارسی کے میدان میں رباعی گو شاعر اور رباعی گو حکیم کہنے میں الفاظ کا بے جا اور بے معنی استعمال نہیں کر رہے ہیں ؟

ایک موقعے پر ہمارے مکرم ، شیخ احمد بدیلی سبزواری ، جو

۵۸۲ھ میں موجود تھے، اور شیخ فریدالدین عطار المتوفیٰ ۶۲۷ھ کے ذکر کے بعد رقم طراز ہیں :

''اس وقت تک شاعری کے جو اصناف رواج پذیر تھے ، وہ قصیدہ ، مثنوی اور قطعہ تھے ۔'' (صفحہ ۲۴۹)

پھر فرماتے ہیں :

''اور غزل بحیثیت ایک مستقل صنف سخن کے اب تک پیدا نہیں ہوئی تھی ، جس میں معنی کے لحاظ سے ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے ۔ کمال اسمٰعیل متوفیٰ ۶۳۵ ہجری نے اس طرز کا آغاز کیا اور شیخ سعدی المتوفیٰ ۶۹۱ ہجری نے اس کو کمال کو پہنچایا ۔ اس لیے فلسفہ و حکمت کے مختصر متفرق خیالات کے لیے رباعی کے سوا کوئی چیز اس وقت موجود نہ تھی ۔'' (صفحہ ۲۵۰ ، خیام)

اس عہد سے پیشتر قول و غزل و ترانہ ، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں ، شعری تثلیث بنے ہوئے تھے ۔ مگر کمال اسمٰعیل کے دور میں غزل قوام میں آ کر پختہ ہوگئی ۔ معلوم نہیں سید والا جاہ ان لوگوں کو کیا کہیں گے جو غزل کے علیحدہ وجود کے رودکی کے عہد سے قائل ہیں ؛ مثلاً محمود کے دربار کا ملک الشعرا عنصری ، رودکی کی غزلیات پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں رودکی کی طرح غزلیں نہیں لکھ سکتا :

غزل رودکی وار نیکو بود
غزلہای من رودکی وار نیست

میں یہاں رودکی کی غزل کا ایک مطلع بھی درج کردیتا ہوں :

کس فرستاد بشب آن بت عیار مرا
کہ مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا

دقیقی کی دو غزلیں تو لباب الالباب عوفی میں موجود ہیں ۔ میں صرف ان کے مطلعوں پر قناعت کرتا ہوں :

کاشکی اندر جهان شب نیستی
تا مرا هجران آن لب نیستی

اور :

ای ابر بهمنی نه بچشم من اندری
دم زن زمانکی و بر آسای و کم گری

شمس قیس ، دقیقی کی ایک اور غزل نقل کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں :

"و دقیقی غزل مشکول[1] گفته است و بعلت بی‌انتظامئ ارکان و اختلاف اجزا در قبول طبع بدین بیت نسبتی ندارد و غزل این ست" :

شب سیاه بدان زلفکان تو ماند
سپید روز بپاکی رخان تو ماند

عقیق را چو بسایند نیک سوده گران
که آبدار بود با لبان تو ماند

بنوستان ملوکان هزار گشتم بیش
گل شکفته برخسارگان تو ماند

دو چشم آهو و دو نرگس شکفته بیار
درست و راست بدان چشمکان تو ماند

کمان بابلیان دیدم و طرازی تیر
که برکشیده شود بابروان تو ماند

ترا بسروین بالا قیاس نتوان کرد
که سرو را قد و بالا بذان تو ماند

(صفحه ۱۳۰ ، المعجم)

۱ - اس وزن کو مشکول کہنا سراسر تکلف ہے - اگر مخبون مان لیا جائے تو بے انتظامی ارکان کی شکایت خود بخود رفع ہو جاتی ہے -
(حاشیۂ مصنف)

رابعہ بنت الکعب القزداری کی غزل کی نسبت عوفی رقم کرتا ہے :

"و این غزل از کعب الغزال در حلاوت زیادہ است ۔"

(صفحہ ٦٦ ، لباب)

میں صرف مطلع درج کرتا ہوں :

مرا بعشق همی محتمل کنی بحیل
چه حجت آری پیش خدای عزوجل

شعرائے غزنہ میں سے عنصری اور فرخی کی غزلیات ان شاعروں کے دیوانوں میں موجود ہیں ۔ عسجدی کی غزل کے نمونے عوفی نے لباب الالباب میں صفحہ ۵۲ پر اور ابواللیث طبری کے صفحہ ٦٦ پر ، امیر معزی کے صفحہ ۷۰-۷۵ پر ، عبدالواسع جبلی کے صفحہ ۱۰۷ - ۱۰۸ پر مرقوم کیے ہیں ۔ انوری و خاقانی کے تو مستقل دیوان موجود ہیں جو ان کے کلیات میں شامل ہیں بلکہ سنائی المتوفٰی ۵۴۵ھ کے ہاں غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے ۔ مقطع میں تخلص کا استعمال باقاعدہ شروع ہوجاتا ہے ، واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انھی سے شروع ہوتا ہے اور صومعہ کو خیرباد کہہ کر خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے ۔ عطار اور مولانا روم ، سنائی کی بنیادوں پر قصر و ایوان کھڑے کرتے ہیں ۔

سامانیوں ، غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں غزل کے وجود سے انکار کرنا تاریخ کے مسلمہ واقعات کو نظر انداز کردینا ہے ۔

یہاں میں اس بحث کو ختم کرکے عرض کرتا ہوں کہ سید صاحب ممدوح کی آراء رباعی کی قدامت اور دیگر امور متعلقہ کی بابت نہ صرف ہماری فنی روایات سے متباین و متفاوت ہیں بلکہ ان سے عام غلط فہمی پیدا ہونے کا بھی احتمال ہے ۔ اسی لیے مجھے ان بیانات کی تردید کی جرأت ہوئی ۔

مجھے شکایت ہے کہ سید صاحب نے باوجودیکہ کئی موقعوں پر مجھے اپنی قابلِ قدر تالیف ''خیام'' میں ملزم ٹھہرایا ہے لیکن اس کا

کوئی نسخہ میری اطلاع کے واسطے حسبِ رواجِ زمانہ مجھے نہیں بھیجا اور مجھ کو بے خبر رکھ کر لائقِ تعزیر قرار دیا ۔ میں اس ایک طرفہ کارروائی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں ۔ یہ خفیہ تیراندازی نامناسب ہے :

لاف آن بہتر کہ در میدان سربازان زنیم
شرط دعوی نیست تنہا گوی و چوگان باختن

حال ہی میں جب میں نے رباعی کی تقطیع کے آسان طریقے پر قلم اٹھانا چاہا ، اس کی تاریخ کے سلسلے میں مخدومی پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال نے سید صاحب کی تالیف کا بھی ذکر کیا ، جس میں رباعی پر ایک طویل الذیل مضمون موجود ہے ۔ اس طرح سید صاحب کے اعتراضات سے مجھے دیر میں اطلاع ملی اور یہ میرا قصور نہیں اگر جواب دیر میں دیا گیا ۔

دقیقی

(از "مخزن" بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ع)

پیشتر اس کے کہ ہم دقیقی کے متعلق کوئی بحث چھیڑیں، ہمیں ان بیانات پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینا چاہیے جو اس شاعر کے باب میں دیے گئے ہیں۔

عوفی کا بیان ہے کہ وہ امرائے چغانی کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ امیر ابوسعید محمد مظفر چغانی، امیر سعید بو صالح منصور نصر احمد السامانی (۳۵۰-۳۶۵ھ) اور امیر رضی ابوالقاسم نوح بن منصور بن نوح بن نصر رضی (۳۶۵-۳۸۶ھ) کا مداح ہے۔ چنانچہ تینوں امرا کے مدحیہ اشعار لباب الالباب میں درج ہیں۔ علاوہ ازیں عوفی یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ دقیقی امیر ابوالحسن علی بن الیاس الاغاچی کا معاصر تھا۔ دقیقی شاعرِ مادح اور آغاچی امیرِ ممدوح تھا۔ شاہنامے کی بنیاد دقیقی نے ڈالی۔ بیس ہزار شعر اس نے لکھے اور باقی ساٹھ ہزار فردوسی نے لکھے۔

تاریخ گزیدہ میں دقیقی کو امیر نوح سامانی کا ہم عصر مانا گیا ہے اور داستان گشتاسپ سے تین ہزار اشعار اس کے منظوم بتائے گئے ہیں جن کو فردوسی نے براہ قدردانی شاہنامے میں داخل کر لیا۔

بہارستان جامی میں منقول ہے کہ دقیقی رحمۃاللہ علیہ شعرائے ماتقدم سے ہے۔ عہد آل سامان اس کا زمانہ ہے۔ کم و بیش بیس ہزار ابیات داستان گشتاسپ سے اس نے نظم کیے۔ باقی کو فردوسی نے تمام کیا۔

محمد امین رازی صاحبِ 'ہفت اقلیم' کا قول ہے کہ دقیقی بخارا

کا رہنے والا ہے ۔ آل سامان جب توران اور خراسان کے بادشاہ ہوئے تو ان کی یہ خواہش ہوئی کہ شاہان عجم کے حالات نظم کرائیں ۔ چوں کہ اس وقت تک فن شعر نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی تھی ، اس لیے یہ تمنا بر نہ آئی ۔ جب امیر نوح بن منصور کا زمانہ آیا ، اس نے اپنی تمام توجہ اس مقصد کی سرانجام دہی کے لیے مبذول کی ۔ اور دقیقی کو شعرائے عصر میں بہتر جان کر یہ خدمت اس کے سپرد کی ۔ اس نے بقول اقل بیس ہزار اور بقول اکثر ہزار بیت داستانِ گشتاسپ سے نظم کیے ۔

صاحبِ آتشکدہ لکھتے ہیں کہ اس کا نام منصور بن احمد ہے ۔ اس کے وطن میں اختلاف ہے ۔ بعض طوسی ، بعض بخاری اور چند اس کو سمر قندی کہتے ہیں ۔ آل سامان اور آل غزنہ کے زمانے میں اس کا ظہور ہوا ۔

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں دقیقی نے شاہنامے کی ابتدا کی ۔ کم و بیش ایک ہزار شعر لکھے ، باقی فردوسی نے تمام کیے ۔

شعرالعجم میں مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ :

"نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشیں ہوا تو پایۂ تخت ، یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے ۔ ان میں سے دقیقی خاص پایۂ تخت کا رہنے والا تھا ۔ اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے ۔ ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی ۔ لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامے کی تصنیف کی خدمت سپرد کر دی ۔

دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا اس لیے یہ خدمت قبول کی اور کم و بیش بیس ہزار شعر لکھے ۔ بعضوں کا بیان ہے کہ صرف ایک ہزار شعر تھے جو آج شاہنامے میں شامل ہیں ۔

سخندان پارس میں مولانا آزاد رقم طراز ہیں :

''معلوم ہوتا ہے کہ سبکتگین کے گھرانے میں شاہان عجم کی تاریخ کی مدت سے فرمائش تھی کیوں کہ دقیقی نے امیر نصر کی فرمائش سے اس نظم پر کمر باندھی تھی مگر مسلسل نہیں ، مختلف بادشاہوں کے حالات نظم کیے تھے کہ بد عملی نے دفعتہً نیک عمل سے محروم کردیا اور ایک غلام کے ہاتھ سے مارا گیا - ۳۴۱ھ -"

یہاں وہ تمام اسناد درج کر دیے گئے ہیں جو دقیقی کے حالات سے علاقہ رکھتے ہیں - ان میں سب سے اہم عوفی کے بیانات ہیں - وہ اس کا وطن طوس بتاتا ہے اور نام ابومنصور محمد - شاہنامے میں دقیقی کے اشعار کی تعداد بیس ہزار بیان کرتا ہے ، لیکن یہاں وہ غلط ہے اس لیے کہ فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف ایک ہزار اشعار لکھے تھے - چنانچہ :

ز ارجاسپ و گشتاسپ بیتی هزار
بگفت و سرآمد ورا روزگار

یہی بیان فردوسی نے داستان گشتاسپ کی تمہید میں دہرایا ہے - جو اسناد دقیقی کے ابیات کی تعداد ایک ہزار بیان کرتے ہیں ، وہ فردوسی کے قول کی پیروی کرتے ہیں اور یہ کہنا عبث معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہزار بیت آج بھی شاہنامہ میں موجود ہیں -

دقیقی کا زمانہ دریافت کرنے میں ہم کئی مشکلات سے دو چار ہوتے ہیں - باستثنائے چند ، قریب قریب تمام اسناد متفق ہیں کہ دقیقی نوح بن منصور (۳٦۵-۳۸۷ھ) کے زمانے کا شاعر ہے - یہ عقیدہ غالباً العتبی سے ماخوذ ہے - مصنفینِ ہفت اقلیم و شعرالعجم ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں - وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں ، جس میں مجمع الفصحا بھی شامل ہے کہ دقیقی نے شاہنامہ خاص نوح بن منصور کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا تھا - اس روایت کا صاحبِ ہفت اقلیم کے عہد سے آگے سراغ نہیں چلتا - لیکن اس عقیدے کی تردید کے لیے فردوسی کے بیانات میرے خیال میں کافی ہیں - وہ کہتا ہے :

"دفتر پاستان کی یہ داستانیں قصہ خواں، عوام میں سناتے پھرتے تھے ۔ تمام دنیا ان قصوں کی شیدائی تھی ، حتیٰ کہ دانش ور اور نیک لوگ بھی اس مذاق میں شریک تھے ۔ یہ ہر دلعزیزی معلوم کرکے ایک خوش طبع نوجوان شاعر نے کہا ۔ "میں ان کو نظم کر دوں گا ۔" اس خیال نے سب کو محظوظ اور خوش حال کیا ۔ یہ نوجوان شاعر دقیقی تھا ۔ اس پر تمام اساتذہ متفق ہیں ۔"

ظاہر ہے کہ اگر نوح بن منصور کے ایما سے شاہنامے کی نظم کی بنیاد ڈالی جاتی تو فردوسی ضرور اس کا ذکر کرتا ۔ دقیقی کے زمانے کے متعلق ہمارا اپنا عقیدہ ہے کہ وہ نوح بن منصور کے پیشتر زمانے سے تعلق رکھتا ہے ۔

اس امر پر سب متفق ہیں کہ فردوسی نے سنہ ۴۰۰ھ میں اپنا شاہنامہ پینتیس سال کی محنت کے بعد ختم کیا ۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے :

سی و پنج سال از سرای سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج

اس بنا پر شاہنامے کی تصنیف کا سال آغاز ۳٦۵ھ ہے جو نوح بن منصور کی تخت نشینی کا سال ہے ۔ اس صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ دقیقی کو اپنے شاہنامے کی ابتدا کا موقع نہیں ملتا کیونکہ اس سنہ میں فردوسی اس کام پر مامور تھا ۔ اگر فردوسی کے اس شعر پر اعتبار کیا جائے :

بسی رنج بردم درین سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی

تو دقیقی کو صرف پانچ سال کی مہلت اپنے شاہنامے کے لیے ملتی ہے ۔ یہ وقت نوح کی تخت نشینی ، اس کے شوقِ تاریخِ شاہانِ عجم کی نشو و نما ، دربار میں دقیقی کی آمد ، ہزار بیت لکھنے اور غلام کے ہاتھ سے مارے جانے کے لیے ناکافی ہے ۔ ظاہر ہے کہ دقیقی کو

صرف شاہنامے کے لیے ذخیرہ تلاش کرنے اور جمع کرنے میں کئی سال لگ گئے ہوں گے ۔ علاوہ ازیں جب ہم مانتے ہیں کہ دقیقی کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے جانشین فردوسی نے شاہنامے کی خدمت اپنے ذمے لے لی تو کیا وجہ ہے کہ وہ بیس سال تک اپنے گھر پڑا رہا ۔ جب کہ فردوسی خود سلطان کی مدح میں کہتا ہے :

سخن را نگہداشتم سال بیست
بدان تا سزاوار این گنج کیست

اور جب سلطان محمود تخت نشین ہوا ، تب اس کے دربار میں آیا ۔ کیا وجہ ہے کہ جب نوح بن منصور کو تاریخ عجم سے اس قدر ذوق تھا تو فردوسی اس کے دربار میں نہیں گیا ؟ حقیقت میں اگر نوح کو شاہنامے سے کوئی دلچسپی ہوتی اور دقیقی کو اگر وہ اس کی نظم پر مامور کرتا ، تو ضرور تھا کہ فردوسی یہ بیس سال کس مپرسی اور گمنامی میں نہیں گنواتا ، بلکہ طوس سے سیدھا بخارا کا رخ کرتا جہاں نوح جیسا طاقتور بادشاہ اس کا خبر گیراں ہوتا ۔ فردوسی کے ایک شعر سے واضح ہوتا ہے کہ دقیقی کا اصل مسودہ اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا ، بلکہ ایک نقل جو بھی غلط تھی ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :

بنقل اندرون سست گشتش سخن
ازو نو نشد روزگار کہن

نقل در نقل کیے جانے کی وجہ سے اس کے کلام میں بہت غلطیاں واقع ہو گئی تھیں ۔ اس سے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دونوں شاعروں کے زمانے میں برسوں کا تفاوت ہوگا ۔

میرے دوست میرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی مولف چہارمقالہ اپنے تعلیقات میں دقیقی اور فرخی کو معاصر یا ایک ممدوح کا مادح مانتے ہیں ۔ اس کا پورا نام وہ فخر الدولہ ابوالمظفر احمد بن محمد والی چغانیاں بتلاتے ہیں ۔ اگرچہ وہ اس کا زمانہ تعین کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں ، لیکن اس مشاہدے میں میرزا سے کچھ غلطی

سرزد ہو گئی ہے ، اس لیے کہ فرخی کا ممدوح یہ فخرالدولہ ابوالمظفر نہیں ہے بلکہ کوئی اور ابوالمظفر ۔ چنانچہ خود فرخی اپنے مشہور قصیدے میں جس کا ذکر نظامی عروضی کرتا ہے اور جس کا مطلع ہے :

با کاروان حلّہ برفتم ز سیستان
با حلۂ تنیدہ ز دل بافتہ ز جان

اس کا ذکر یوں کرتا ہے :

تا نقش کرد برسرہر نقش بر نوشت
مدح ابوالمظفر شاہ چغانیان
بن احمد محمد شاہ جہان پناہ
آن شہریارکشور گیروجہان ستان

یعنی اس امیر کا نام ابوالمظفر بن احمد بن محمد چغانی ہے ۔

لیکن جن اشعار کی بنا پر میرزا موصوف دقیقی اور فرخی کو اس ابوالمظفر کا مادح یقین کرتے ہیں، وہ اشعار یہ ہیں جو فرخی کے مشہور داغ گاہ والے قصیدے میں واقع ہوتے ہیں :

تا طرازندہ مدیح تو دقیقی برگزشت
ز آفرین تو دل آگندہ چنان کز دانہ نار
تا بوقت این زمانہ مر ورا مدت نماند
زین سبب گر بنگری امروز تا روز شمار
ہر نباتی کز سر گور دقیقی بر دمد
گر بپرسی ز آفرین تو سخن گوید ہزار

ان کا ترجمہ مختصراً درج ہے :

جب سے تیرا مدیح طراز دقیقی فوت ہو گیا ، جس کا دل تیری مدح سے ایسا بھرا ہوا تھا جیسے دانوں سے انار ، اس زمانے تک اس کو (زندگی کی) مہلت نہیں ملی ۔ اس بنا پر آج سے قیامت تک جو سبزہ دقیقی کی قبر سے سر نکالےگا ، تیری مدح میں ہزار سخن کہے گا ۔

ان اشعار پر جب پہلی مرتبہ میری نظر پڑی تو میں بہت چونکا ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ ان اشعار کو اس طرح پڑھنے میں کوئی شاعرانہ خوبی پیدا نہیں ہوتی ۔ دقیقی اپنے ممدوح کی مدح کرکے مرا ہے ۔ پھر فرخی کیسے کہتا ہے کہ وہ مدح کا ارمان دل میں لیے چل بسا جس کی بنا پر دقیقی کی گور کا سبزہ ہی ، اگر دریافت کیا جائے ، ابوالمظفر کی مدح میں زمزمہ سنج ہوگا ۔ علاوہ ازیں فرخی کے یہ اشعار دقیقی کے اپنے اشعار کے خلاف ہیں ، جن کا ذکر آیندہ آئے گا ۔

اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ جس میں شعرا اکثر اساتذۂ ماسبق کی یاد اچھے الفاظ میں کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ خود دقیقی ، رودکی اور شہید کو یاد کرکے کہتا ہے :

استاد شہید زندہ بایستی
و آن شاعر تیرہ چشم باطن بین
تا شاہ مرا مدیح گفتندی
ز الفاظ خوش و معانی رنگین

فرخی بھی اسی قسم کی مردہ پرستی کا اظہار کر رہا ہے ۔ وہ دقیقی کا معتقد ہے اور اس اعتقاد کو ابوالمظفر کی مدح کے اس پیرایے میں ادا کر رہا ہے کہ دقیقی ہمارے عہد تک زندہ نہ رہا اور تیری مدح کا ارمان لیے دنیا سے چل بسا ۔ اس لیے اس کی قبر سے جو سبزہ سر نکالے گا (اے ممدوح) تیری مدح میں زمزمہ سرا ہوگا ۔

اس غرض کے لیے ضرور ہے کہ ہم فرخی کے پہلے مصرع میں کچھ تبدیلی کریں اور "تا طرازندہ" کو "نا طرازندہ" یا "نا طرازیدہ" پڑھیں ۔ یعنی : "ناطرازندہ مدیح تو دقیقی برگزشت ۔" فرق صرف ایک نقطے کا ہے اور ایسی غلطی اکثر اوقات کاتب سے ہو جایا کرتی ہے ۔ اب ان اشعار کا مطلب صاف صاف یہ ہے :

دقیقی تیری مدح سرائی کیے بغیر چل بسا جس کا دل تیری مدح کے ارمان سے ایسا ہی بھرا تھا جیسے انار ، دانوں سے بھرا ہو ۔

اس عہد تک اس کو زندہ رہنے کی مہلت نہیں ملی لہذا آج سے قیامت تک جو سبزہ دقیقی کی قبر سے آگے گا ، تیری مدح میں ہزار بات کہے گا ۔ اب صاف ثابت ہے کہ دقیقی فرخی کا ہم عصر نہیں۔

میں ایک عام اور مقبول عقیدے کی تردید میں ، جو دقیقی کے زمانے کے متعلق یقین کیا جاتا ہے ، کسی حد تک کامیاب ہو گیا ۔ لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ، تاوقتیکہ کوئی اور زمانہ تعین نہ کیا جائے۔

دیباچۂ قدیم شاہنامہ اس عنوان پر ہم سے یوں کہتا ہے کہ نصر بن احمد اور ابوالفضل بلعمی کے زمانے میں دقیقی شاعر نے شاہنامہ اپنے آقا کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا ۔ اس کو غلاموں کا بہت شوق تھا ۔ ابھی شاہنامے سے کچھ ہی نظم کرنی پایا تھا کہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک ترک غلام کے ساتھ ، جس کو خریدے دو تین روز گزرے تھے ، مذاق کر رہا تھا ۔ غلام نے اس کے پیٹ میں چھری گھونپ دی اور وہ ہلاک ہوگیا ۔ دیباچے کے الفاظ یہ ہیں :

”و این شاهنامه بروزگار نصر بن احمد و ابوالفضل بلعمی که شاعر او بود فرموده بود که بنظم آورد (کذا) و دقیقی مردی بود که غلامان را دوست میداشت ۔ چون از شاهنامه یک چندی نظم آورد ، اتفاق چنان افتاد که غلامی ترک دران دو سه روز خریده بود ، با وی لابه میکرد و آن غلام کاردی بر شکم دقیقی زد و بدان زخم او را هلاک کرد ۔“

یہ کسی اور موقعے پر ثابت کر دیا گیا ہے کہ دیباچۂ قدیم کا زمانہ چہار مقالۂ نظامی سے زیادہ قدیم ہے اور شاہنامے کے بعد دیباچہ ہمارے پاس سب سے قدیم سند ہے ۔ ماسوا اس کے ہم کو دقیقی کے ان اشعار پر غور کرنا ضروری ہے :

کرا رودکی گفته باشد مدیح
امام فنون سخن بود ، ور

دقیقی مدیح آورد نزد او
چو خرما بود برده سوی هجر

اردو میں یہ معنے ہوئے کہ جس شخص کی تعریف رودکی نے کی ہو، جو فن سخن کا امام ہے، دقیقی اپنی مدح اس کے پاس لے جائے، یہ ایسا ہے جیسے ہجر میں خرما لے جانا یا کرمان میں زیرہ۔

اب ظاہر ہے کہ یہ نامعلوم شخص رودکی اور دقیقی دونوں کا ممدوح رہ چکا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ رودکی اور دقیقی یا معاصر ہوں یا ان میں چند سال کا تفاوت ہو۔ چونکہ رودکی چوتھی صدی کے تیسرے عشر کے اختتام پر وفات پاتا ہے، اس لیے دقیقی کا زمانہ چوتھے عشر میں مان لیں تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نوح اس زمانے میں بھی سامانی تخت پر جلوہ گر ہے۔ نوح بن نصر ۳۳۱ھ سے لے کر ۳۴۳ھ تک حکمران رہا ہے۔ اب صاف روشن ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں سے صرف اس قدر غلطی سرزد ہوئی کہ وہ نوح اول کو نوح ثانی سمجھا کیے۔ بدقسمت نوح ثانی جس کی زندگی ہزار نوع کے طوفانوں، شورشوں اور فسادوں میں کٹی، ایک معاملے میں ضرور خوش قسمت ہے کہ مرنے کے بعد اخلاف نے اس کے اجداد کے اکثر کارنامے اس کی طرف منتقل کر دیے ہیں۔

آزاد، دقیقی کا سال وفات ۳۴۱ھ دیتے ہیں۔ نہیں معلوم یہ تاریخ وہ کہاں سے لائے ہیں لیکن غالباً صحیح معلوم ہوتی ہے۔ صاحبِ 'صبح صادق' کی ایک اور تصنیف ہے جس کا نام 'شاہد صادق' ہے۔ اس کتاب میں دقیقی کے مارے جانے کی تاریخ ۳۲۸ دی ہے اور یہ پیشتر ایما ہو چکا ہے کہ یہ ہجری سنہ نہیں ہے بلکہ غالباً ہجری شمسی۔ چونکہ اسی سال منصور فاطمی صاحبِ مغرب وفات پاتا ہے، جو ۳۴۱ ہجری میں فوت ہوتا ہے، دقیقی نے بھی اسی سال انتقال کیا ہوگا۔

قابوس نامہ

یہ مضمون پانچ قسطوں میں رسالہ "مخزن" کے ماہ مئی ، جون ، جولائی ، اگست اور ستمبر سنہ ۱۹۲۰ع کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

شاہی تصنیفات کی فہرست میں ، فارسی زبان میں ہم چند کتابیں ایسی دیکھتے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ادبی دنیا میں اہمیت رکھتی ہیں۔ سلطان حسین کی مجالس العشاق[1] ، جہانگیر کی تزک ، عالم گیر کی انشاء ، اپنی اپنی نوعیت میں لاثانی یادگاریں ہیں۔ ان تصانیف کی فہرست میں ایک اور زبردست تصنیف ہے جو خواہ بلحاظ تقدم زمان ، خواہ باعتبار سلاست زبان ، ان سب پر اولیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ کتاب 'قابوس نامہ' ہے۔ اس کا شمار اُن لازوال تصانیف میں ہونا چاہیے ، جو انسانی طبقات کی تمدنی ، معاشرتی ، سیاسی اور دماغی تعلیم کے لیے ضروری اور دائمی ادب آموز رہیں گی۔ اس کا مصنف عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر دیالمہ آل زیار طبرستان[2] کا ساتواں فرماں روا اور مشہور و معروف ادیب

۱ - میں نے مرزبان نامہ اور بابر نامہ کو اس فہرست میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ ابتدا میں پہلی کتاب زبان دیلم اور دوسری ترکی میں لکھی گئی تھی۔ (حاشیہ مصنف)

۲ - شمالی ایران کا وہ کوہستانی علاقہ جو دریائے خزر پر واقع ہے ، طبرستان ماژندران کہلاتا ہے۔ اس کے بڑے شہر دہستان ، جرجان ، استر آباد ، آمل ، ساری وغیرہ ہیں۔ حدود دامغان سے لے کر کوہستان رے تک سب طبرستان کہلاتا ہے۔ لیکن وسیع معنی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کا پوتا اور سلطان محمود غزنوی کا داماد ہے۔

آل زیار اپنے خاندان کے لیے ایسی قدامت کے مدعی ہیں، جو ہم کو ایرانی معلوم تاریخی دور کو بہت جلد عبور کر کے نامعلوم قرون مظلمہ کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے۔ آن کا دعویٰ ہے کہ ارغش فرهادوند (جو کیخسرو کے زمانے میں شاہِ گیلان تھا) ہمارا مورث اعلیٰ ہے۔ کیکاؤس کا بیان ہے کہ "ارغش فرهادوند ایک تاریخی شخص ہے اور ابوالموید بلخی نے اپنے شاہ نامے میں اس کا ذکر کیا ہے۔" بدقسمتی سے یہ شاہ نامہ آج مفقود ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ آن زمانوں میں یہ تصنیف موجود تھی۔ بلعمی کے ترجمۂ تاریخ طبری میں کئی مقام پر ابوالموید کے شاہ نامۂ بزرگ کے متعلق حوالے دیے جاتے ہیں۔

بہرحال تاریخ اسلام میں اس خاندان کا ظہور ۳۲۰ھ سے ہوتا ہے، جب کہ اسفار بن شیرویہ، ماکان بن کاکی کو شکست دے کر ولایت دیلم پر قبضہ کر لیتا ہے۔ قرامطہ کے ہاتھوں مقتول ہونے کے بعد مرداویج اس خاندان کا سربرست ہوتا ہے، جو اپنے مقبوضات کو متواتر فتوحات سے بہت توسیع دے دیتا ہے۔ طالقان، رستمدار مسخر ہونے کے بعد رے، ماژندران، قزوین، ابہر، زنجان اور طارمین اس کے قبضے میں آ جاتے ہیں۔ آدھر اصفہان اور عراق شاملِ سلطنت ہو جاتے ہیں۔ نوجوان مرداویج ایک سال ہی حکومت کرنے پاتا ہے کہ سنہ ۳۲۳ ہجری میں اپنے غلاموں کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

میں اس کا اطلاق دارالمرز یعنی گیلان، ماژندران، دیلمان، رستمدار اور جرجان پر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس ملک کا خاص اسلحۂ جنگ تبر تھا، اس لیے تبرستان کہلایا۔ عربی شکل میں وہ طبرستان لکھا جاتا ہے۔

(حاشیۂ مصنف)

ہاتھ سے مارا جاتا ہے ۔ ہم آل زیار کی ملکی فتوحات سے منہ موڑ کر اُن کی ادبی فتوحات کا ، جو ہمارے مضمون کے صفحات کے لیے زیادہ موزوں ہے ، ذکر کرتے ہیں ۔

قابوس

چوتھی صدی ہجری کے منتصفِ دوم میں قابوس بن وشمگیر دنیاے ادب مین ایک غیر معمولی اور زبردست شخصیت ہو گزرا ہے ۔ اہل علم و ہنر کی سرپرستی اور اصحابِ کمال کی قدر دانی اُس دور کے اسلامی فرماں رواؤں کا ایک ممتاز آئین تھا ، جس کی نظیر تاریخ کے اور قرون میں نہیں پائی جاتی ۔ صاحب اسمٰعیل ابن عباد اصفہان میں ، مامون خوارزم شاہ خوارزم میں ، آل سامان بخارا میں ، شمس المعالی (قابوس) طبرستان میں ، عضدالدولہ عراق میں ، یہ وہ مقدس نام ہیں ، جو ہمارے فضلیات کی تاریخ میں ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ ذکر کیے جانے کے مستحق ہیں ۔ انھی بڑے دماغوں کی توجہ اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ہم بو علی سینا ، ابو ریحان البیرونی ، بدیع الزمان ہمدانی اور صابی کا نام فخر کے ساتھ پیش کرنے کے قابل ہیں ۔ عتبی اور امام ثعالبی کے اوراق میں ہم قابوس کی حقیقی بزرگی کے قصے پڑھ سکتے ہیں ۔ سنائی ایک صدی گزرنے کے بعد بھی اس کا ادب سے ذکر کرتا ہے ۔

وہ زبردست ادیب اور اول درجے کا خطاط تھا ۔ صاحب اسمٰعیل ابن عباد کی نظر سے جب کبھی اُس کا خط گزرتا تو وہ کہتا : ”ھذا خط قابوس ام جناح طاؤس ۔“ امام ابوالحسن بن محمد یزدادی نے اس کے ترسلات کو کتابی صورت میں جمع کرکے اس کا نام ”قرائن شمس المعالی“ یا ”کمال البلاغہ“ رکھا ہے ۔ عربی زبان میں اس کی عجیب و غریب مہارت کے تمام ادیب افسانہ خواں ہیں ۔ اس کے اقوال اور ضرب المثال کی شہرت عام تھی ۔ نجوم اور فلسفہ اور ہیئت میں وہ اپنے زمانے میں بے مثال تھا ۔ اس کے رسالۂ اصطرلاب کی

صابی نے بڑی تعریف کی ہے ۔ ابونصر العتبی ، جس کی قابوس کے وزیر ابوالعباس غنائمی سے ہمیشہ خط وکتابت ہوتی رہی ہے ، قابوس کی ایک تصنیف کا ، جو اس نے صحابۂ کرام کی تاریخ میں لکھی ہے ، بہت ثناخواں ہے ۔ ابو ریحان نے اپنی تصنیف "آثار الباقیہ" اور ثعالبی نے "المبہج" اور "التمثیل و المحاضرۃ" قابوس کے نام معنون کی ہیں ۔ بوعلی سینا نے جو رسالہ اپنے حالات میں لکھا ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم موصوف کا ارادہ ۴۰۳ھ ہجری کے قرب و جوار میں جرجان ، قابوس کے پاس جانے کا تھا لیکن قابوس کی ناگہانی قید اور قتل نے اس کی یہ تمنا نہ بر آنے دی ۔ قابوس کی تخت نشینی کے چار سال بعد فخر الدولہ دیلمی نے اُس کے پاس آ کر پناہ لی ہے ۔ اُستاد ابوبکر خوارزمی سے اس کے مشاعرات یتیمۃ الدھر میں محفوظ ہیں ۔ کہا جاتا ہے ایک مرتبہ قابوس کے دو سردار باغی ہو گئے ۔ اس نے دبیر کو حکم دیا کہ باغیوں کو ایک نصیحت آمیز فرمان لکھے تاکہ اطاعت منظور کر لیں ۔ دبیر ہاتھ میں قلم لے کر دیر تک سوچتا رہا لیکن کچھ نہ سوجھا کہ ابتدا کیسے کرے ۔ بادشاہ (قابوس) جو اپنے سامنے ہی لکھانا چاہتا تھا ، دبیر کی اس تاخیر پر بہت جھنجھلایا ۔ آخر اُس کے ہاتھ سے قلم لے کر یہ بیت فرمان کے عنوان پر لکھ دیا :

لاتعصین شمس العلی (کذا) قابوس
فمن عصیٰ قابوس یلقی ابوس

نام کی تجنیس نے شعر میں ایک ملاحت پیدا کر دی ہے ۔ قابوس نامہ میں اس کا یہ لطیفہ درج ہے : ''من لایودبہ ابوان رد بہ الملوان ۔'' قابوس فارسی زبان میں بھی بے نظیر شاعر تھا ۔ عوفی نے اپنی تصنیف میں اس کے حالات سے دو صفحے لکھے ہیں ۔ وہاں سے یہ قطعہ تبرکاً ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے :

کار جہان سراسر آز ست یا نیاز
من پیش دل نیارم آز و نیاز را

من بیست چیز را ز جہان برگزیدہ ام
تا ہم بدان گذارم عمر دراز را
شعر و سرود و رود و میٔ خوشگوار را
شطرنج و نرد و صیدگہ و یوز و باز را
میدان و گوی و بارگہ و رزم و بزم را
اسپ و سلاح و جود و عطا و نماز را

اس قطعے میں کل اٹھارہ چیزیں شمار کی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری شعر کاتب کی غلطی سے رہ گیا ہے۔

قابوس کا انجام دردناک ہے۔ اس کے امرا نے باغی ہوکر قابوس کے بیٹے منوچہر کو دھمکی دی کہ اگر تم باپ کی مخالفت کرکے تخت نہیں قبول کروگے تو ہم کسی اور کو سلطنت دے دیں گے۔ اپنے گھرانے میں سلطنت بحال رکھنے کے لیے منوچہر مجبور ہو گیا اور قابوس ۴۰۳ھ میں قید ہوکر قتل کر دیا گیا۔

مصنف کے مختصر حالات

اب ہم قابوس نامے کے مصنف امیر عنصر المعالی کیکاؤس کے مختصر حالات ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے تاریخ نے اس کے حالات قلم بند کرنے میں زیادہ اعتنا نہیں کی ہے۔ کیکاؤس کے حالات تواریخ میں ایک فراموش شدہ ورق ہے، جس کی تلافی ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں بالکل نا ممکن ہے۔ اس لیے ذیل میں انھی متفرق مگر مختصر بیانات پر اکتفا کی جائے گی جو خود مصنف نے اتفاقیہ قابوس نامے میں بیان کر دیے ہیں۔

لباب الالباب اس کو شمس المعالی کا فرزند کہتی ہے لیکن یہ غلط ہے۔ وہ سکندر بن قابوس کا بیٹا ہے، جیسا کہ اور تاریخوں اور قابوس نامے سے ظاہر ہے۔ رضا قلی خاں دیباچۂ قابوس نامہ میں لکھتے ہیں: اس کے دادا کا نام قابوس بن وشمگیر بن مرداویج[1]

۱۔ ہدایت کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ قابوس کا باپ وشمگیر،
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بن زیار دیلمی ہے۔ یہ طبقہ آل دیالمہ زیار کے نام سے منسوب ہے۔ آل قابوس میں گیارہ اشخاص نے گرگان، گیلان اور دارالمرز میں ایک سو ساٹھ سال تک حکومت کی ہے۔ ساسانی بادشاہوں سے ان کی نژاد ہے۔ خلیفہ عباسی نے صاحبِ قابوس نامہ کو عنصرالمعالی کا لقب دیا ہے اور یہ کتاب عنصر المعالی نے اپنے فرزند گیلان شاہ کی نصیحت میں لکھی ہے۔ اس کا انتقال ۴۶۲ھ میں ہوا اور اکیس سال حکومت کی اور اس کے بیٹے نے سات سال حکومت کی۔

ابو ریحان البیرونی آثار الباقیہ میں آل زیار کی نژاد ساسانی شاہی خاندان سے ظاہر کرتا ہے اور سلسلۂ نسب نوشیروان عادل کے باپ شاہ قباد سے ملاتا ہے۔ قابوس نامہ اس کے متعلق اس قدر تصریح کرتا ہے کہ باپ کی طرف سے وہ ارغش فرہادوند کی اولاد ہیں اور مصنف کی جدۂ مادری مرزبان بن رستم صاحبِ مرزبان نامہ کی دختر ہے۔ مرزبان کا تیرھواں باپ کیکاؤس بن قباد برادر نوشیروان ہے۔ کیکاؤس کی ولادت ۴۱۲ ہجری میں ہوئی ہوگی۔ دس سال کی عمر میں فنونِ فروسیت مثلاً سواری، چوگان بازی، اور فنونِ رجولیت مثلاً نیزہ بازی، ژوپین اندازی، طاب طاب اندازی، کمند افگنی وغیرہ وغیرہ تحصیل کر لیے تھے۔ ان فنون میں اس کے استاد بامنظر (کذا) حاجب اور ریحان خادم تھے۔

مہربان باپ نے بیٹے کا ان ہنروں میں امتحان لے کر خاص طور پر پیراکی سیکھنے کی ہدایت کی۔ بحر خزر سے دو ملاح بلوائے گئے اور ان کی زیر تعلیم اس فن میں بھی کیکاؤس نے بہت جلد کمال پیدا کر لیا۔

علوم میں اس کی تعلیم کہاں تک تھی؟ اگرچہ اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں، لیکن اس کی تصنیف اور نیز خاتمے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مرداویج کا بیٹا نہیں ہے بلکہ بھائی۔ یعنی وشمگیر اور مرداویج دونوں زیار کے لڑکے ہیں۔ (مرتب)

کے ایک فقرے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت
ایک ایسے وسیع پیمانے پر ہوئی ہے جس کی نظیر ہمارے زمانے میں
باوجودِ تلاش نہیں ملے گی ۔ فقہ ، حدیث اور قرآنی علوم کے علاوہ
طب ، نجوم ، ہندسے اور فلسفے سے وہ بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے ۔
زبانوں میں عربی ، فارسی اور پہلوی جانتا تھا ۔ وہ بہت اچھا کاتب ،
شاعر اور موسیقی میں ماہر تھا ۔ فنون سلحشوری کے ساتھ وہ اکثر
ایسے پیشوں سے واقف معلوم ہوتا ہے ، جن کا سیکھنا آج کل ایک
اعلٰی تربیت یافتہ اپنے طبقے کے لیے نہایت مذموم سمجھے گا ۔ عمر
کے بیسویں سال سے اس کا قیام سلطان مودود غزنوی کے عہد سلطنت
(سنہ ۴۳۲ھ و ۴۴۱ھ) میں آٹھ سال تک برابر غزنی میں رہا ہے ۔
یہاں وہ سلطان کی منادمت سے ممتاز تھا اور غزوات ہند میں اکثر
حصہ لیا ہے ۔ غالباً اسی زمانے میں صبیہؑ سلطان محمود غزنوی سے
اس کی شادی ہوتی ہے ۔ سلطان مودود کی وفات پر وہ غزنی سے
رخصت ہوتا ہے ۔ غزنی ترک کرنے کے بعد خلیفہ قائم باللہ کے
عہدِ خلافت میں ادائے فریضہؑ حج کے ارادے سے موصل پہنچتا ہے ۔
موصل کے قرب و جوار میں عرب قزاق قافلے پر آ گرتے ہیں ۔
چونکہ اعراب کی کثرت تھی اور قافلے والوں کی تعداد قلیل ، اس
لیے مقابلہ یک طرفی ہوتا ہے اور قافلہ بالکل لوٹ لیا جاتا ہے ۔
حتٰی کہ بدن کے کپڑے تک اتار لیے جاتے ہیں اور امیر کاؤس
برہنہ موصل پہنچتا ہے ۔ یہاں سے کشتی میں بیٹھ کر بغداد کا رخ
کرتا ہے ۔ عبکرہ ، دجلہ میں ایک خوفناک مقام ہے ۔ یہاں کشتی ،
اگر ہوشیار ملاح نہ ہو ، گرداب میں پھنس کر ڈوب جایا کرتی ہے ۔
شومیِ قسمت سے ملاح کی نادانی کے طفیل کشتی بھنور میں پڑ گئی
اور ڈوبنے لگی ۔ مسافروں کی تعداد پچیس تھی ، سب ڈوب گئے ۔
خوش قسمت بچنے والے کُل تین تھے ؛ پہلا ایک بصری بوڑھا
شخص ،دوسرا امیر کیکاؤس ، تیسرا امیر کا غلام کاوی ۔ تیرنا جاننے
کی بدولت آن کی جانیں بچیں اور بغداد پہنچے ۔ کچھ دنوں بغداد میں

قیام رہا اور وہاں سے مکۂ معظمہ پہنچ کر فریضۂ حج ادا کیا گیا ۔

اب غزواتِ روم میں شریک ہونے کے اشتیاق میں ہمارا مصنف امیر ابو السواد شادر بن الفضل کے پاس گنجہ[1] چلا جاتا ہے ۔

ابو السواد بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کرتا ہے ۔ کیکاؤس جو طبعاً اور تعلیماً عمدہ ندیم ہونے کے علاوہ خوش طبع ، خوش تقریر اور ظریف بھی واقع ہوا تھا ، تاریخ میں اس کی مہارت اور عام معلومات پر اس کا غیر معمولی عبور ، مزید براں ایسے اوصاف تھے ، جنھوں نے ہمارے مصنف کی قابلیت کا ابو السواد کے دل پر بڑا گہرا اثر ڈالا ۔ اس نے اس کی خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور قسم قسم کی مہربانیوں کا اظہار کرتا رہا ۔ نشست و برخاست ، کھانا پینا سب ایک ساتھ رہا ۔ امیر ابوالسواد کے اس شریفانہ سلوک سے ، معلوم ہوتا ہے کیکاؤس اس قدر متأثر ہوا کہ کئی سال تک گنجہ میں مقیم رہا ۔

ان خوشگوار تعلقات کی رو میں کیکاؤس کی ایک راست دروغ نمائی کی بدولت کچھ عرصے کے لیے بدمزگی پیدا ہوگئی ۔ اس شکر رنجی کے اسباب حسب ذیل ہیں :

ایک روز ابوالسواد کیکاؤس سے طبرستان کے حالات دریافت کر رہا تھا ۔ وہاں کے عجائبات کا ذکر کرتے ہوئے کیکاؤس نے کہا کہ گرگان کے نواح میں ایک گاؤں ہے ، جس سے ذرا فاصلے پر پانی کا ایک چشمہ ہے ۔ گاؤں والے اس چشمے کا پانی پیتے ہیں ۔ جب عورتیں سروں پر پانی کے مٹکے بھر کر چشمے سے لوٹتی ہیں تو ایک عورت بغیر کسی مٹکے کے آگے آگے چلتی ہے ، جو نہایت احتیاط سے راستے کو دیکھتی بھالتی جاتی ہے ، کیونکہ وہاں ایک سبز قسم کا کیڑا ہوتا ہے ۔ اس عورت کا یہ کام ہوتا ہے کہ اس کیڑے

---

۱ ۔ یہ وہ ملک ہے جس کو ہم آج کل گرجستان اور انگریز جارجیا کہتے ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)

کو راستے سے ہٹا کر دور ڈال دے تا کہ پانی لانے والیوں کا پاؤں اُس کیڑے پر نہ پڑے ۔ اگر اتفاقیہ کسی مٹکے والی کا پاؤں اس پر پڑ جائے تو اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مٹکے کا پانی فوراً سخت بدبو دینے لگتا ہے اور کسی کام کا نہیں رہتا ۔ اس لیے اس کو پھینک دیا جاتا ہے اور دوبارہ چشمے پر جا کر پانی بھرنا ہوتا ہے ۔

کیکاؤس کی زبان سے یہ عجیب حکایت سن کر معقول پسند ابو السواد ترش رو ہو گیا اور منہ پھیر لیا اور کئی روز تک ناراض رہا ۔ پیروزان دیلم ، کیکاؤس کے پیش خدمت نے ایک روز آ کر کہا کہ امیر آپ کی شکایت کر رہا تھا اور کہتا تھا کہ کم سے کم اس کو میرے سامنے تو ایسا لغو قصہ نہیں بیان کرنا چاہیے تھا ، جس سے صرف بچوں کو خوش کرنا مقصود ہو ۔ کیکاؤس نے یہ ماجرا سن کر فوراً ایک قاصد گرگان بھیجا ، جس نے وہاں پہنچ کر اس قصے کے متعلق ایک محضر نامہ تیار کر لیا ، جس پر گرگان کے رئیس ، قاضی ، خطیب ، علما ، اشراف اور دیگر معززین کی شہادت تھی اور دو سو شرعی اشخاص کے نام تھے ۔ قاصد کو آنے جانے میں چار مہینے لگے ۔ جب کیکاؤس کے پاس یہ محضرنامہ پہنچا ، اُس نے لے جا کر امیر ابو السواد کے آگے پیش کیا ۔ امیر موصوف نے محضر نامے کو غور سے پڑھا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا : ”یہ تو مجھے معلوم تھا کہ تم میرے سامنے ایسی غلط بیانی نہیں کرو گے ، لیکن سوچو تو کہ ایسی راست گوئی کس مصرف کی جس کی تصدیق کے لیے چار مہینے کا عرصہ اور دو سو شرعی گواہوں کی شہادت درکار ہو اور تب تمھارے بیانات سچ مانے جائیں ۔

گنجہ سے اس کی واپسی کے زمانے سے ہم ناواقف ہیں لیکن قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ اس کی واپسی غالباً اُس وقت ہوئی ہے ، جب کہ طبرستان کا تخت اُس کے چچا زاد بھائی شرف المعالی کے وجود سے خالی ہو چکا ہے ۔ 'شاہد صادق' سے معلوم ہوتا ہے کہ شرف المعالی سنہ ۴۴۴ھ میں انتقال کرتا ہے اور کیکاؤس تخت پر

جلوہ افروز ہوتا ہے لیکن یہ تاریخ غالباً غلط معلوم ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ اُس زمانے میں وہ غزنی چھوڑ کو حج کو اور پھر گنجہ چلا گیا ہے ۔ بفرض محال اگر اس تاریخ کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے قیامِ گنجہ کے لیے (جہاں وہ خود ہم سے گویا ہے ، کئی سال رہا ہے) وقت نہیں ملتا اور یہ خیال بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخت نشینی کے بعد گنجہ رہا ہو ۔ سنہ ۴۶۲ھ میں جب کہ اس کا دورِ عمر پچاس سال طے کر چکا تھا ، کیکاؤس نے شراب خوری سے توبہ کی اور سنہ ۴۷۵ھ میں قابوس نامہ کی تصنیف کی بنیاد ڈالی[1]۔ تاریخیں ہم سے گویا ہیں کہ کیکاؤس اکیس سال سلطنت کرکے ۴۶۱ ہجری میں (بقول رضا قلی خان) یا ۴۶۲ ہجری میں بقول 'شاہد صادق' وفات پاتا ہے ۔ لیکن یہ ایک غیر موقر بیان ہے ۔ بہر حال اس کی وفات ۴۷۵ ہجری کے بعد واقع ہوئی ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری دور میں کیکاؤس تصوف میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا ۔ اس رنگ میں اُس کی بعض رباعیاں نظر آتی ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر اس میدان میں اُس نے کوئی کتاب تصنیف کی ہو ۔ ذیل میں اس کی چند رباعیات جو قابوس نامہ اور دیگر کتب سے انتخاب کی ہیں ، پیش کی جاتی ہیں :

رباعیات

گر یار مرا نخواند و با خود ننشاند
وز درویشی مرا چنین خار بماند
معذور است او کہ خالق ہر دو جہان
درویشان را بخانۂ خویش نخواند

(قابوس نامہ ، باب چہارم)

۱ - پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :
''مولف این کتاب در سال ۴۱۲ بجہان آمدہ و تا سال ۴۷۵ کہ این کتاب را بپایان رسانیدہ ازو خبر داریم ۔''
(صفحہ ۶ ، منتخب قابوس نامہ ، مرتبہ سعید نفیسی) ۔ مرتب

دیگر

مارا صنما همی بدی پیش آری
از ما تو چرا امید نیکی داری
رو جانا رو همی غلط پنداری
گندم نتوان درود چون جو کاری (باب ششم)

دیگر

گفتم که در سرات زنجیری کن
بامن بنشین و با دلم[1] سیری کن
گفتا که سپیدهات را قیری کن
مردی[2] چه کنی پیر شدی پیری کن (باب نهم)

دیگر

گر بر سر ماه بر نهی پایهٔ تخت
ورهمچوسلیمان شوی ازدولت و بخت
میوه چو شد پخته بیفتد ز درخت
چون عمرتو پختهگشت بربندی رخت (باب نهم)

دیگر

بی سیم بدم بر من ازان آمد درد
وز بی سیمی بماندم از روی تو فرد
دارم مثلی بحال خویش اندر خورد
بی سیم ز بازار تهی آید مرد

دیگر

گر شیر شود عدو چه پیدا چه نهفت
با شیر بشمشیر سخن خواهم گفت
کانرا که بگور خفت باید بی جفت
با جفت بجان خویش نتواند خفت (باب بیستم)

---

۱ - پروفیسر نفیسی کے ہاں ''بر دلم میری کن ۔'' (مرتب)
۲ - پروفیسر نفیسی کے ہاں ''سودا چه پزی ۔'' (مرتب)

دیگر

گر مرگ بر آورد ز بدخواه تودود
زان دود چنین شاد چرا گشتی زود
چون مرگ ترا نیز بخواهد فرسود
بر مرگ کسی چه شادمان باید بود

(باب بیست و نهم)

دیگر

از دل صنما مهر تو بیرون کردم
وان کوه غم ترا بهامون کردم
امروز نگویمت که چون خواهم کرد
فردا دانی که گویمت چون کردم

(باب بیست و نهم)

دیگر

گر من روزی ز خدمتت گشتم فرد
صد بار دلم ازان پشیمانی خورد
جانا بیکی گناه از بنده مگرد
من آدمیم گنه نخست آدم کرد (باب سی‌ام)

دیگر

ای در دل من فکنده عشق تو فروغ
بر گردن من نهاده تیمار تو یوغ
عشق تو بجان و دل خریدستم من
دانی بخریده بر نگویند دروغ

(باب سی و دوم)

دیگر

گفتم که اگر دور شوم من ز برش
دیگر نه کشد مگر دلم درد سرش

تا گشتم دور دورم از خواب و خورش
بسیار زیان باشد اندر نگرش

(باب سی و دوم)

دیگر

تا دورشدی شدستم ای روی چو ماہ
اندیشہ فزون و صبر کم ، حال تباہ
تن چون نی و برچو نیل رخسارہ چو کاہ
انگشت بلب ، گوش بدر، دیدہ براہ

(لباب الالباب)

قابوس نامہ ایک کتاب ہے ، جو پند و نصائح کا مجموعہ ہے ، جس میں مذہبی ، اخلاق ، تمدنی اور سیاسی مسائل پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ کتاب وہی شخص لکھ سکتا ہے جو اکثر علوم و فنون پر عبور رکھنے کے علاوہ دنیا کے نشیب و فراز اور زندگی کے طوفانی مد و جزر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا ہو ۔ بادشاہوں کی منادمت ، داناؤں کی مجالست اور دراز سفروں کے تجارب نے اس کے (کیکاؤس) خیالات میں بلندی اور مشاہدے میں وسعت دے دی ہے ۔ اس نے نسخۂ حیاتِ انسانی کی دو رخی تصویر شادی و غم ، بلندی و پستی، اقبال و ادبار کا نہ صرف سرسری اور سطحی بلکہ غور سے اور دیر تک مطالعہ کیا ہے ۔ امیر کیکاؤس کی تعلیم ایک ایسا نصب العین پیش کرتی ہے ، جو عملی نقطۂ نظر سے ہر شخص کی طاقت گیرائی میں ہے ۔ اس کے مواعظ پیغمبرانہ اور فقیہانہ نہیں ہیں بلکہ حکیمانہ اور دانش مندانہ ہیں ۔ قابوس نامہ ایک ایساگراں بہا تحفہ ہے جو ایک ارسطو سکندر کو ، ایک بزرجمہر نوشیرواں کو اور ایک نظام الملک ملک شاہ کو اپنی یادگار میں دیتا ۔ یہ اگر مبالغہ ہے تو واقعیت اس سے کچھ کم نہیں ہے ، کیوں کہ قابوس نامہ ایک روحانی میراث ہے ، جو کیکاؤس نے اپنے فرزند گیلان شاہ کو ، یا ایک مہربان اور بوڑھے باپ نے اپنے ہونہار مگر جوان فرزند کے لیے چھوڑی ہے ۔

مصنف نے اس کو چوالیس بابوں میں تقسیم کیا ہے ، جن کی فہرستِ مضامین حسب ذیل ہے :

(۱) در شناختن ایزد تعالیٰ
(۲) آفرینش وستایش پیغمبران
(۳) سپاس خداوند نعمت
(۴) طاعت
(۵) شناختن حقِ مادر و پدر
(۶) هنر آموختن
(۷) سخندانی
(۸) پندهای نوشیروان
(۹) پیری و جوانی
(۱۰) تربیت طعام خوردن
(۱۱) شراب خوردن
(۱۲) مهمانی کردن و مهمان شدن
(۱۳) مزاح و شطرنج
(۱۴) عشق ورزیدن
(۱۵) تمتع کردن
(۱۶) گرمابه رفتن
(۱۷) خفتن و آسودن
(۱۸) شکار کردن
(۱۹) چوگان زدن
(۲۰) کار زار کردن
(۲۱) جمع کردن دولت
(۲۲) امانت نگاه داشتن
(۲۳) بنده خریدن
(۲۴) خانه و عقار خریدن
(۲۵) چهارپای خریدن
(۲۶) زن خواستن
(۲۷) تربیت فرزند
(۲۸) دوست گزیدن
(۲۹) اندیشه کردن از دشمن
(۳۰) عفو و عقوبت کردن
(۳۱) طالب علمی و مدرسی
(۳۲) تجارت کردن
(۳۳) طب
(۳۴) نجوم و هندسه
(۳۵) شاعری
(۳۶) خنیا گری
(۳۷) خدمت پادشاه
(۳۸) منادمت
(۳۹) کتابت
(۴۰) وزارت
(۴۱) سپه سالاری
(۴۲) پادشاهی
(۴۳) دهقانی
(۴۴) جوانمردی

قابوس نامے کی عبارت بالکل سادہ اور سلیس ہے ۔ البتہ آیاتِ قرآنی ، احادیثِ نبوی اور اقوالِ حکماء سے موقعے موقعے پر کتاب کو آراستہ کیا گیا ہے ۔ زبان میں عربی الفاظ کا استعمال بھی ثقاہت کے

ساتھ کیا ہے ۔ علیٰ هذا اس قدیم زمانے کو دیکھتے ہوئے نامانوس اور مندرس فارسی الفاظ سے کتاب کو بھاری نہیں کیا ہے ۔ طرز تحریر پُر مغز اور مختصر ہے ۔ لفاظی ، شان و شکوہ اور زبان آرائی سے دانستہ احتراز کیا گیا ہے ۔ اس کی تمہید ہے :

"ان نصائحؒ کا جمع کرنے والا امیر عنصرالمعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر مولیٰ امیرالمؤمنین اپنے فرزند گیلان شاہ سے کہتا ہے :

اے فرزند ! میں بوڑھا ہوگیا ہوں ۔ ضعف اور ناتوانی نے مجھ پرخاب لیا ہے ۔ سپید بالوں نے میرے چہرے پر عزل زندگی کی ایسی تحریر پیدا کر دی ہے ، جس کو کسی چارہ ساز کا ہاتھ نہیں مٹا سکتا ۔ قبل اس کے کہ میری برخاستگی کا نامہ پہنچے، میں نے یہ مناسب جانا کہ زمانے کی مذمت ، نیک نامی اور برتری کی تائید میں ایک ایسا نامہ لکھ دوں جس سے تجھ کو نصیحت ہو اور میں فریضۂ مہر پدری سے سبک‌دوش ہو جاؤں ، تاکہ قبل اس کے کہ زمانے کا ہاتھ تجھ کو نرم کرے ، تو خود میرے نصائحؒ سے فائدہ اٹھا کر دونوں جہان میں نیک نامی حاصل کرے ؛ اگرچہ مجھ کو معلوم ہے کہ کسی فرزند نے باپ کی نصیحت نہیں مانی ہے ۔ اے فرزند ! من انسان کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں محنت کر کے جو کچھ اندوختہ حاصل کرے وہ اپنےعزیز کو جا کر سونپ دیتا ہے ، اسباب دنیاوی سے مجھے نصیحت ملی ہے اور تو میرا عزیز ہے ۔ جب میں نے کوچ کی ٹھہرا لی تو جو کچھ میرا اندوختہ تھا ، میں نے تجھ کو بھجوا دیا ، تاکہ تو خود غرض نہ رہے ، ناشائستہ امور سے پرہیز کرے اور اپنی زندگی اس طرح بسر کرے ، جو تیرے تخمۂ پاک کے لائق ہو ۔ یاد رکھ کہ تو ایک عالی خاندان کا ممبر ہے ۔ تیری اصل دونوں طرف سے نجیب ہے ۔ تیرا دادا شمس‌المعالی قابوس ، ارغش

فرہادوند کا پڑوتا ہے جو کیخسرو کے زمانے میں گیلان کا بادشاہ تھا ۔ ابوالمؤید بلخی نے شاہنامے میں ارغش فرہادوند کا ذکر کیا ہے اور ملک گیلان تیرے اسلاف کو اس سے یادگار ملا ہے ۔ میری پرنانی مرزبان بن رستم بن شروین مصنف مرزبان نامہ کی بیٹی ہے ۔ اس کا تیرھواں باپ کیکاؤس بن قباد نوشیروان عادل کا بھائی تھا ۔ تیری ماں سلطان محمود غزنوی بن سلطان ناصر الدین کی دختر ہے اور میری دادی حسن فیروزان شاہ دیلمان کی بیٹی ہے ۔ اے پسر ! اس لیے ہوشیار ہو اور اپنی نژاد کی پوری قدر کر ۔

اے فرزند ! میری رخصت کا زمانہ قریب آگیا ہے اور تو بہت جلد میرے متعاقب آنے والا ہے ۔ اس لیے آج جب کہ تیرا قیام اس سرائے میں ہے ، توشۂ عمل حاصل کر ۔ سرائے جاودانی اس سپنجی سرائے سے بہتر ہے لیکن اس کا زاد راہ یہاں حاصل کرنا چاہیے ۔ یہ دنیا ایک کشت زار ہے ، جس میں بیج ڈالو اور پھل کاٹو ۔ کوئی آدمی اپنا درودہ کھیت میں نہیں کھایا کرتا ۔ نیک آدمی شیر کے مانند ہے اور برا آدمی کتے کی طرح ۔ کتا جہاں شکار کرتا ہے وہیں کھانے لگتا ہے اور شیر جہاں شکار مارتا ہے ، وہاں نہیں کھاتا بلکہ دوسری جگہ لے جا کر ۔

اے فرزند ! یہ جہان تیری شکار گاہ ہے اور دانش تیری نخچیر ۔ اس لیے شکار یہاں مار اور سرائے باقی میں لے جا کر کھا ۔"

اب ہم نفس کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ ذات باری کے واسطے وہ کہتا ہے :

"کائنات اور عدم میں ایسی کوئی شے نہیں ہے ، جس کی ماہیت کو انسان نہ شناخت کر سکے لیکن خداوند عالم ایسی ذات پاک ہے جس کی کنہ کو ہم پہچان نہیں سکتے ۔ اس لیے تو مصنوعات سے صانع کو اور ساز سے سازندے کو تلاش کر ۔ ہم

بندے ہیں اور ہمارا طریقہ خدا کی پرستش اور اطاعت ہونا چاہیے۔ جو شخص اللہ پاک کی اطاعت کا طلب گار ہے ، اس کی مثال آگ سے دی جاسکتی ہے کہ ہرچند اس کو سر نگوں کریں لیکن وہ بلندی تلاش کرتی ہے ۔ جو شخص خدا سے گمراہ ہے وہ پانی کے مانند ہے کہ اس کو ہرچند بلندی پر لے جائیں لیکن وہ پستی کی طرف مائل ہوتا ہے ۔"

آدم سے لے کر محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیا گزرے ہیں ، اُن کے پاک ماننے کی وہ ہم کو ہدایت کرتا ہے ۔ اسلامی پانچوں ارکان کی تعمیل کی سختی کے ساتھ تائید کرتا ہے ۔ دینی احکام کی بجا آوری کے علاوہ اُن میں دنیاوی منافع بھی گنا رہا ہے ۔ اس معاملے میں ہم کو چون و چرا ، شک و شبہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا ، کہتا ہے :

"کیا ضرور ہے کہ جو بات تمھاری سمجھ میں نہ آئے ، اس میں کوئی خوبی نہ ہو ۔ تم خدا کے احکام کی پابندی کرو ۔ تم کو لم اور لما سے کیا بحث ۔"

مذہبی معاملات میں تنگ دلی اور تنگ چشمی کے مخالف ہے ۔ دوسروں کے مذہب کی عزت کرنا سکھاتا ہے ، کہتا ہے :

"مذہب میں تعصب کی بنا پر کسی کو کافر مت کہو کیوں کہ کافری دین کے خلاف ہے ، مذہب کے خلاف نہیں ۔ نئی کتاب یا علم سے انکار نہ کرو ۔ کیا یہ ضروری ہے ، جو تم نہ جانو وہ کفر ہو ؟"

علماء کو نصیحت کرتا ہے کہ :

"تم ایسے فتوے نہ دو جن کا انجام سوگند یا طلاق ہو ۔"

علٰی ھذا وہ قتل کے مخالف ہے اور کہتا ہے :

"کسی کے قتل کا فتویٰ نہ دو ، اگرچہ وہ مستوجبِ قتل ہو ۔" (باب ۴۴)

امیر کیکاؤس میں قوتِ مشاہدہ اور طاقتِ فیصلہ بہت بڑھی

ہوئی ہوگی ۔ وہ اپنے ذاتی مشاہدوں اور تجربوں پر اعتماد کرکے اپنی زندگی کے دستور العمل کے اوامر اور نواہی منضبط کررہا ہے ۔ اس کی تعلیم کا اکثر حصہ اس کے ذاتی تجربوں پر بنیاد پاتا ہے یا اس کے قریب العصر لوگوں کے مشاہدات پر ۔

دنیاوی معاملات میں جو کچھ مشورہ اور نصیحت وہ ہم کو دیتا ہے ، مدبرانہ اور عملی ہے ۔ اس کا کوئی مشورہ عملی نوعیت اور حکمت سے خالی نہیں ۔ وہ ہم کو نیکی اور خوبی کا تودہ بنانا نہیں چاہتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم ایمان‌دار ، قانون کے پابند اور پکے دنیادار بنیں ۔ اس کو اس امر کی پروا نہیں کہ ہم زندگی کے کون سے طبقے میں رہیں اور کیا پیشہ اختیار کریں ۔ ہم بادشاہ ہوں یا دہقان ، وزیر ہوں یا مطرب لیکن زندگی اس طرح بسر کریں کہ اپنے اور بعد میں اوروں کے لیے مفید ہوں اور ہر حال میں پاک ذہنی ، پاک زادی ، پاک خیالی ، پاک گفتاری اور پاک رفتاری کو اپنا شعار بنائیں ۔ قصہ مختصر پاک زندگی اس کے مواعظ کا نعرۂ تکبیر ہے ۔

ایک ایرانی اور ایک مشہور شاہی خاندان کا ممبر ہونے کے باوجود عنصرالمعالی کمالِ ذاتی کو شرفِ ذاتی پر ترجیح دیتا ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے :

”گوہر تن از گوہر اصل بہتر است ۔“

بے ہنر آدمی اس کے نزدیک بے سود ہے اور گویا ہے کہ :

”وہ ایک خاردار درخت ہے ، جس کے جسم ہے لیکن سایہ نہیں ۔ نہ وہ اپنے حق میں مفید ہے اور نہ دوسروں کو نفع رساں ۔ اس کے مقابلے میں اصیل آدمی اگرچہ بے ہنر ہے لیکن خاندانی شرافت کی وجہ سے قابلِ احترام ہے ۔ سب سے بدتر آدمی وہ ہے جس میں نہ ہنر ہے اور نہ نسب ۔“

کسبِ کمال کے خیال کو ایک اور مقام پر ان الفاظ میں ادا کیا ہے :

”جو نام کہ ماں باپ رکھیں وہ تمہارا اصلی نام نہیں ہے بلکہ

اصلی نام وہ ہے جو تم خود کوئی کمال پیدا کرکے اپنے آپ رکھوانے کی کوشش کرو کہ دنیا تمھارے ایسے نام، مثلاً احمد، محمد، جعفر وغیرہ بھول جائے اور استاد، فاضل، علامہ، حکیم کے ناموں سے تمھیں یاد کرے۔"

"الحیاء من الایمان" حدیث نبوی ہے اور کیکاؤس اس کا معتقد ہے لیکن وہ اس قدر اضافہ کرتا ہے کہ:

"جس طرح ایمان، حیا کا باعث ہے، حیا افلاس کا باعث بھی ہے۔ اس لیے تم شرم کی جگہ شرم اور بے شرمی کی جگہ بے شرمی اختیار کرو۔"

اور پھر تاکیداً گویا ہے:

"شرم سب میں بہتر لباس ہے لیکن اتنے شرمیلے نہ بنو کہ تمھارے کاموں میں ہرج واقع ہو۔"

عشق کے متعلق کہتا ہے:

"لطیف الطبع لوگ اکثر عشق پیشہ ہوتے ہیں۔ چونکہ جوان بوڑھوں کے مقابلے میں زیادہ لطیف طبع ہوتے ہیں اس لیے اس مرض میں جوان زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ تم خواہ لطیف طبع ہو یا گراں طبع، کوشش کرو کہ محبت کے دام میں نہ پھنسو، بالخصوص جب کہ افلاس میں مبتلا ہو۔ تمھاری عشق بازی کا جوانی میں کچھ نہ کچھ عذر ہو سکتا ہے لیکن بڑھاپے میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا۔ محبت ایسے شخص سے کرو جو اس کے قابل ہو۔ یہ ضرور نہیں کہ معشوق بطلیموس اور افلاطون ہو لیکن اس میں کچھ تو عقل ہو۔ نہ یہ ضروری ہے کہ وہ حسن میں یوسف ابن یعقوب ہو لیکن کچھ تو اس میں ملاحت یا صباحت ہو تاکہ لوگوں کے نزدیک تمھارے واسطے کچھ عذر ہو۔"

عنصر المعالی ان اشخاص میں سے نہیں ہے جو محض اخلاقِ حسنہ کی تعلیم پر تمام معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ نہیں، وہ طبیعت

انسانی کا گہرا استاد ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ ''الناس حریص علی ما منع'' ۔'' انسانی کمزور سرشت، جو نیکی اور بدی کی دو عملی میں مقیم ہے ، اپنی ذاتی کمزوری سے یا صحبتِ بد کے اثر سے جوانی کے عالم میں بعض اوقات ممنوعات کے حدود میں پہنچ جاتی ہے ، لیکن ممنوعات کے میدان میں ہمارے پاس کوئی دستور العمل نہیں ہے ، اس لیے مجبوری اور ضرورت اس کو کشاں کشاں اس میدان میں لے آتی ہے ۔ اس عالم میں بھی وہ کچھ نہ کچھ ہدایات ہم کو ہمارے نفع کی امید میں دے رہا ہے : ع

عیب کرنے کو ہنر چاہیے

قابوس نامے کا باب یازدہم ہمارے زیر نظر ہے اور بوڑھا کیکاؤس یوں گویا ہے :

''میں یہ نہیں کہتا کہ شراب پیو اور نہ یہ کہتا ہوں کہ مت پیو کیونکہ جوان لوگ کسی کے کہنے سننے سے افعالِ جوانی سے کب باز آنے والے ہیں ۔ مجھ کو بھی نصیحت کی جاتی تھی لیکن میں نے نہیں مانا ۔ یہاں تک کہ خدا نے اپنے فضل سے پچاس برس کی عمر میں مجھ کو توبہ کی توفیق دی ۔ اگر تم شراب نہ پیو گے تو دونوں جہان کا فائدہ ہے ، خدا تم سے راضی ہوگا اور دنیا کی ملامت سے بچوگے ۔ ایک فعلِ دیوانگی سے نجات پاؤ گے اور تمھارے دنیاوی معاملات پھولیں پھلیں گے ۔ اگر تم نہ پیوگے تو میں پسند کروں گا لیکن جانتا ہوں کہ بری صحبت تم کو کب بچنے دے گی ۔ خیر اگر پیو تو توبہ کے لیے دل کھلا رکھو اور خدا سے توبہ کی توفیق مانگتے رہو اور اپنے افعال پر پشیمان رہو ۔ شاید خدا تم کو توفیق دے اور توبۃ النصوح ارزانی کرے ۔ یاد رکھو شراب خواری کا ثمرہ دو باتیں ہیں : یا بیماری یا دیوانگی ، کیونکہ شراب خوار یا مست ہوگا یا مخمور ۔ اگر مست ہے تو دیوانہ ہے ، اگر مخمور ہے تو بیمار ۔ پس انسان ایسے کام پر کیوں حریص

ہو جس کا ثمرہ بیماری یا دیوانگی ہو ۔
میں جانتا ہوں تم میری ان باتوں سے شراب سے کب باز آنے والے ہو ۔ خیر اگر پیو تو صبوحی ہرگز مت کرو ۔ صبوحی کے عادی ہونے میں پہلی بد قسمتی یہ ہوگی کہ تمھاری نماز فوت ہو جائے گی اور ابھی رات کی شراب کے بخارات دماغ سے نکلنے نہیں پائیں گے کہ صبح کے بخارات ان سے جاملیں گے ۔ اس کا نتیجہ مالیخولیا کے سوا کچھ نہیں ہوگا ۔ کم سے کم جمعہ کی شب نہ پیا کرو ، اگرچہ شب شنبہ بھی وہ اسی قدر حرام ہے جس قدر کہ شبِ آدینہ ۔" (باب ۱۲)
ایک اور مقام پر گویا ہے :
"تم جانتے ہو شراب پینا گناہ ہے اور جب گناہ کرنے پر آمادہ ہو گئے ہو تو گناہ بے لذت کیوں کرو ۔ اس لیے تم جو شراب پیو ، عمدہ پیو ۔" (باب ۱۲)

تربیتِ فرزند

"بچے کو سب سے پہلے قرآن شریف سکھاؤ ۔ حافظ قرآن ہونے کے بعد اگر تم رعیت میں سے ہو تو اس کو کوئی مفید ہنر سکھاؤ اور اگر فوجیوں سے ہو تو فنونِ حرب سکھاؤ ۔ پھر پیراکی کی تعلیم دو ۔ اس کے بعد فضل و ہنر میں سے اس کو ہر ایک ضروری تعلیم دو ، کیونکہ حوادثِ آسمانی سے کوئی شخص واقف نہیں ہے اور کس کو معلوم ہے کہ کل کیا ہوگا اور کون سا علم اس کے کام آئے گا اس لیے علم و فن سکھلانے میں بخل نہ کرو ۔"
سعدی کی طرح عنصر المعالی بھی بچوں کی مار پیٹ کا حامی ہے اور کہتا ہے :
"تم خود اپنے ہاتھ سے بچوں کو سزا نہ دو بلکہ استاد سے دلواؤ تاکہ ان کے دل میں تم سے نفرت پیدا نہ ہو ۔ جیب خرچ

وغیرہ اپنی حیثیت کے مطابق ان کو دیتے رہو تاکہ پیسہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے تمھاری موت کے طالب نہ ہوں ۔ فرزند کو ادب اور فرہنگ سکھانا سب سے بہتر میراث چھوڑنا ہے ۔ خواص کے لیے ادب اور فرہنگ اور عوام کے لیے ہنر سب سے بہتر پدری ترکہ ہے ۔ اگرچہ پیشہ سیکھنا طبقۂ امرا کے نزدیک معیوب ہے لیکن حقیقت میں میرے نزدیک پیشہ سب سے بہتر ہنر ہے ، اور اگر امیر سو پیشے جانیں تو عیب نہیں بلکہ ہنر ہے ۔ پھر ہنر کسی نہ کسی دن کام آئے گا ۔ ایران میں گشتاسپ کے بعد یہ قاعدہ جاری ہوگیا تھا کہ خواص اپنی اولاد کو کوئی نہ کوئی ہنر ضرور سکھلاتے تھے ۔"

شادی کے متعلق اس کے خیالات یہ ہیں :

جب فرزند بالغ ہوجائے اور اس میں بیوی رکھنے کی صلاحیت ہوتو اس کی شادی کردو ۔ اپنی قوم میں شادی نہ کرو کیونکہ اُن میں چاہے بیٹا دو یا نہ دو ، وہ تمھارے عزیز ہیں اور رہیں گے ۔ تم کو چاہیے کہ غیر قوم میں شادی کرو تاکہ دو مختلف قوموں میں یگانگت بڑھے ۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ غیر تمھارے اپنے بن جائیں گے اور پہلے اگر تمھاری طاقت ایک تھی تو اب دو ہو جائے گی ۔ لیکن اگر تمھارے فرزند میں خانہ داری کی صلاحیت نہیں ہے یا وہ صالح نہیں ہے تو ایک مسلمان لڑکی کو اُس کے پلے باندھ کر عذاب میں نہ ڈالو ۔ اس کو اپنے حال پر رہنے دو ۔

اب میں کیکاؤس کے اقوال بلالحاظِ مضامین لکھ دیتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ کس دل و دماغ کا آدمی ہے ۔ اس کے مقولے اگرچہ دانش مندانہ ہیں لیکن بعض شرافت کا پہلو بھی لیے ہوئے ہیں :

جس کی زبان شیریں ہے ، اُس کے گاہک بہت :

جس طرح اچھی بات کہنے میں بخل نہیں کرتے ہو ، مال دینے میں بھی امساک نہ کرو ۔ دنیا بات سے زیادہ مال پر فریفتہ ہے ۔ نیکی کرنے والا اور نیکی کی ترغیب دینے والا دو بھائی ہیں، جن کا زمانہ پیوند نہیں توڑ سکتا ۔ سیکھنے مین شرم مت کرو ۔ ہنر دو طرح سے آتا ہے ؛ یا تو ایسی چیز پر عمل کرنے سے جس کو تم جانتے ہو ، یا اس چیز کے سیکھنے سے جس کو تم نہیں جانتے ۔

نیک آدمی کی صحبت میں بیٹھو تاکہ نیک نام رہو ۔ تیل اگرچہ تلوں سے نکلتا ہے ، جب کچھ دن پھولوں کی صحبت میں رہتا ہے ، گلِ روغن کہلاتا ہے ۔

اگر انسان خوبصورت ہے تو اس کو سیرت بھی نیک رکھنا چاہیے کیوں کہ خوبصورت سے زشتی بری معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن اگر بدصورت ہے تو اس کے لیے نیک سیرت ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ زشتی بالائے زشتی سخت مذموم ہے ۔

طبیب جب بیمار ہوتا ہے تو معالجے کے لیے دوسرے طبیب سے رجوع ہوتا ہے ۔

راستِ کذب نما سے کذبِ راست نما بہتر ہے ۔ انسان طبیعت سے بدگمان واقع ہوا ہے ۔ خود سر نہ بنو کیونکہ تمھاری شہادت تمھارے حق میں کوئی نہ مانے گا ۔ بوڑھوں پر ترس کھاؤ کیونکہ بڑھاپا ایسی بیماری ہے جس کی عیادت کو کوئی نہیں آتا اور نہ کوئی طبیب اس کا علاج کرتا ہے ۔

بڑھاپے میں سفر کرنا منافیِ عقل ہے ۔ خصوصاً اس شخص کے لیے جو مفلس ہے ، اس لیے کہ بڑھاپا انسان کا دشمن ہے اور افلاس بھی دشمن ہے ۔ پس دو دشمنوں کے ہمراہ سفر کرنا دانائی نہیں ہے ۔

وطن اگرچہ مادرِ ثانی کہا جاتا ہے لیکن تمھارا بہترین وطن وہ ہے جہاں تم کو فلاح ملے ۔ آدمی اپنے گھر کی چار دیواری میں ایک بادشاہ کے مشابہ ہے ، جو اپنے ملک میں ہو ۔ ہمارے ہاں گیلان میں ایک نہایت اچھی رسم ہے کہ جب کوئی مہمان آتا ہے تو کھانا اور پانی خوان میں رکھ کر اُس کے سامنے رکھ دیتے ہیں ۔ پھر میزبان اور اُس کے اقارب وہاں سے ہٹ جاتے ہیں ۔ ضرورتاً ایک آدمی اس کے پاس آ جا سکتا ہے ۔ مہمان تنہائی میں بغیر کسی مداخلت کے آرام سے کھانا کھا لیتا ہے ۔

دن اور رات کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں ۔ اس کُل کا دو تہائی حصہ بیداری میں اور ایک حصہ سونے میں گزارو ۔

دن کو سونے کی عادت نہ ڈالو ، اس لیے کہ اپنے دن کو رات بنانا دانائی نہیں ہے ۔ کوتاہ شمشیر ، بہادر آدمی کے ہاتھ میں دراز ہو جاتی ہے ۔ مال کا رکھنا مال جمع کرنے سے مشکل ہے ۔

افلاس صرف غریبوں ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ اُس گھر میں بھی جہاں آمدنی ایک روپے کی ہے اور خرچ ایک روپے ایک پیسے کا ۔

قناعت دوم بے نیازی ہے ۔

عوام الناس دولت مندوں کو پسند کرتے ہیں ، اگرچہ اُن کی ذات سے کوئی فائدہ نہ پہنچے اور غریبوں کو ناپسند کرتے ہیں ، گو اُن کی ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو ۔

محض فضول خرچی اسراف نہیں ہے بلکہ اس کی اور بہت سی صورتیں ہیں ؛ سونے ، کھانے پینے اور دوسری باتوں میں بھی اسراف موجود ہے ۔ اسراف سے جسم کمزور ، روح غمگین اور عقل بیگانہ ہو جاتی ہے ۔ کیا نہیں دیکھتے تیل چراغ کی زندگی کا باعث ہے لیکن اگر اس میں روغن اس قدر بھر دیا جائے ،

جو بتی ہر سے گزر جائے تو چراغ گل ہو جائے گا ، یعنی وہی روغن جو چراغ کی حیات کا باعث تھا ، اسراف کی وجہ سے اس کی موت کا باعث بن گیا ۔ پس ثابت ہوا کہ تنہا روغن سے چراغ زندہ نہیں تھا بلکہ اعتدالِ روغن سے بھی ۔ سب کو چور سمجھ تاکہ چور سے تیرا مال محفوظ رہے ۔ حتی الامکان جھوٹی یا سچی بات پر قسم نہ کھاؤ ۔ دوست بہت اور دشمن کم رکھو ، بلکہ ہزار دوست کے بھروسے پر بھی ایک شخص کی دشمنی مت مول لو ۔ ممکن ہے وہ ہزار دوست تمھاری حفاظت سے غافل ہو جائیں اور وہ ایک دشمن تمھاری ایذا رسانی کی فکر سے غافل نہ رہے ۔

دشمن کی موت پر اُس وقت خوشی کرو جب تم کو یہ یقین ہو جائے کہ تم نہیں مرو گے ۔ حامیانِ انصاف کا قول ہے کہ گناہ کی سزا میں عقوبت ضروری ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ جب گناہ کے پاداش میں سزا دی گئی تو رحم اور کرم ، جو صفات انسانی ہیں ، کس دن کام آئیں گے ؟ اس لیے ایسا کرو کہ ایک درم گناہ کے لیے نصف درم سزا دو تا کہ سیاست کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور شرائط کرم کی بھی پابندی ہو جائے ۔ وعظ میں سامعین کو خوف و امید میں رکھو ، نہ بالکل مخلوق کو خدا سے مایوس کر دو اور نہ کسی پر بغیر اطاعت کے بہشت کے دروازے کھول دو ۔

تجارت کی اصل جہل پر مبنی ہے اور اس کی فرع عقل پر ۔ اپنی جنس کو مجمع میں رکھو اور ہتھیار بندوں سے دور رہو ، کیونکہ قزاق سب سے پہلے ہتھیار بند پر حملہ کرتے ہیں ۔ ایک نقد کنجشک ادھار کے طاؤس سے بہتر ہے ۔ خرچ گھٹا دینا ایسا ہی ہے جیسے آمدنی بڑھا دینا ۔ زائچہ بتاتے وقت بچے کی ولادت کا وقت حساب میں نہیں لانا چاہیے بلکہ وہ وقت جب کہ نطفے نے رحمِ مادر میں قرار پایا ہے ۔ گیلے ہاتھوں سے

بڑوں کے سامنے جانا بے ادبی ہے۔
تمھارے شعر دقیق نہ ہوں بلکہ سہل ِ ممتنع ، کیونکہ شعر اپنے لیے نہیں کہا جاتا بلکہ دوسروں کے لیے ۔ وہ آدمی جس نے عمر بھر چُھرا تک نہیں باندھا ، اُس کو یہ کہنا کہ تُو تلوار سے شیر مار ڈالتا ہے ، نیزے سے بیستون اٹھا لیتا ہے اور تیر سے بال کو چیر ڈالتا ہے ، بالکل بے کار ہے ۔ جو غریب کبھی گدھے تک پر سوار نہ ہو اُس کے گھوڑے کو براق ، دلدُل، رخش اور شبدیز سے مثال دینا کیا ضرور ہے ۔ ہجو گوئی کی عادت مت ڈالو ، کیونکہ مٹکا ہمیشہ دریا سے سالم نہیں آیا کرتا ۔ جو کچھ لکھو اپنی طبیعت سے لکھو ۔ مردوں کا حال مت ٹٹولو ۔ تم خواہ بازاری شاعر ہو یا مادح ، ہر حال میں خوش مزاج اور ہنس مکھ رہو ۔ قصے ، چٹکلے اور لطیفے بہت یاد رکھو کیونکہ بازار اور ممدوح دونوں جگہ ان چیزوں کی قدر ہے ۔ خالص فارسی لکھنا بُرا ہے ، بالخصوص مادری فارسی جو نامعروف ہے ، اس کو ہرگز نہ لکھنا چاہیے ۔ عربی میں سجع ہنر ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن فارسی زبان میں سجع ناخوش معلوم ہوتا ہے ۔ تم جو کچھ لکھو با مذاق ، شیریں اور مختصر لکھو ۔ بادشاہ کی خدمت میں اگرچہ تم مال دار بن جاؤ لیکن ظاہر میں غریب بنے رہو ، اور یاد رکھو جب تک بکری دبلی ہے ، حلال کیے جانے سے محفوظ ہے اور جب فربہ ہوگی ہر شخص اس کے کھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ جب تم محتشم ہو تو نہ چاہیے کہ درخت بے ثمر بنے رہو ۔ جب تک اپنے اوپر کہتروں کا رنج نہ گوارا کرو گے مہتروں کی آسائش نصیب نہیں ہو سکتی ۔ تیل جب تک سڑایا نہیں جاتا ، تیل نہیں بنتا ۔ ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہو سکتے ہیں ۔ جب کوئلہ آگ سے بچاؤ گے ، تمھارا کباب کچا رہ جائے گا ۔ دانتوں کا گوشت ، جو خلال سے تم

نے نکالا ہے ، تمھارا پیٹ نہیں بھر سکتا ۔ بادشاہ اگر کم سن ہے تو بھی اس سے ڈرتے رہو ۔ مرغابی کا بچہ تیرنا کسی سے نہیں سیکھتا ۔ یہ بہت بری بات ہے کہ پاسبان کے لیے پاسبان رکھا جائے ۔ لشکر سے تم مال دریغ نہ کرو ، اگر چاہتے ہو کہ وہ تم سے جان دریغ نہ کرے ۔ اپنے وزیر کے رشتہ داروں کو کوئی کام مت دو ۔ ایک دم ساری چربی بانٹ دینا کودے دینا برا ہے ۔ اگر گلہ بان اپنے گلے کا درد نہ کرے اور درندوں کے ہاتھ میں سونپ دے تو گلہ بہت جلد ضائع ہو جائے گا ۔ نوکر کو وہی کام دینا چاہیے ، جس کے وہ لائق ہو ۔ فراش کو شراب دار اور شراب دار کو خازن بنا دینا درست نہیں ۔ بادشاہ اور رعیت میں یہی فرق ہے کہ ایک فرمان دہ ہے اور ایک فرماں بردار ، اس لیے دیکھو کہ تمھارے فرمان کی ذلت نہ کی جائے ۔ جس طرح مصالحِ لشکر پر تمھاری نظر ہے ، رعیت کی بہبودی پر بھی نظر رکھو ۔ بادشاہ ایک آفتاب ہے اور یہ زیبا نہیں کہ آفتاب ایک پر چمکے اور ایک پر نہ چمکے ۔ سلطان شہید مسعود غزنوی طریقِ شجاعت اور مردانگی سے خوب واقف تھا لیکن اس کو بادشاہی کرنا نہیں آیا ۔

جوان مردی از کارہا پیشہ کن
جوان مردی و راستی پیشہ کن
ازین مرد دانندہ بشنو سخن
ہمہ نیکوئی اندر اندیشہ کن"

آخر میں اب قابوس نامے کے آخری باب "جوان مرد پیشگی" پر کچھ کہنا مناسب سمجھتا ہوں ۔

جوان مردی از کارہا بہتر است
جوان مردی از خوی پیغمبر است
دو گیتی شود بر جوان مرد راست
جوان مرد باش و دوگیتی تراست

جواں مردی ایک مجہول سی اصطلاح ہے ، جس کو ہم کبھی فیاضی ، کبھی بہادری کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں ۔ مصنف کے نزدیک جواں مرد پیشگی کوئی صفات انسانی میں سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک پیشہ ہے ۔ تمہید میں وہ گویا ہے کہ تین صفات انسانی ایسے ہیں جن کی نسبت ہر شخص اپنے زعم میں یہی دعویٰ کرتا ہے کہ مجھ میں وہ موجود ہیں ۔ دانا اور نادان سب خدا سے ان کے بارے میں خوشنود ہیں ، اگرچہ مشکل سے وہ کسی میں پائی جاتی ہیں ۔ ان کے نام یہ ہیں : عقل ، راستی ، مردمی ۔ اب ایک دراز فلسفیانہ مسئلے کی تشریح کے بعد ، جس کا یہاں دہرانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ، مصنف کہتا ہے کہ جب فیض علوی کا منفذِ روحانی مسدود ہو جاتا ہے تو نتیجہ محض دعویٰ ہے اور معنی ہیچ ۔ اس لیے دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے ، جو مردمی کا مدعی نہیں ۔ اس لیے تم کوشش کرو کہ تعلیم و تفہیم کے ذریعے سے فیضِ علوی کا منفذ کشادہ رکھو تا کہ تمھارا دعویٰ با معنی ہو ۔ جواں مردی تن ہے ، دانش حواس اور معانی صفا ہے ۔ بعض مخلوق کو مبدء فیاض سے تن عطا ہوا ہے ، اور کچھ نہیں ملا ۔ ایک گروہ کو تن اور جان ، ایک گروہ کو تن اور جان اور حواس اور ایک گروہ کو تن ، جان ، حواس اور معانی ۔ جس قوم کو تن ملا ہے ، وہ عیار اور سپاہی ہیں ۔ جن کو تن اور جان ملے ، اصحابِ معرفتِ ظاہری ۔ جن کو تن ، جان اور حواس ملے ان میں حکما ، انبیاؑ اور اوصیا ہیں ۔ ان کی مردمی کا نام دانش ہے ۔ جس گروہ کو تن ، جان ، حواس اور معانی ملے ، وہ روحانی راہبر اور پیغامبر ہیں ۔ پس جس شخص میں جس قسم کی جواں مردی ہو ، اس کی اصل سے اس کو واقفیت پیدا کر لینا چاہیے ۔ جواں مردی کا اصل الاصول تین باتیں ہیں : پہلی جو کچھ کہو کرو ، دوسری راستی کے خلاف کوئی کام نہ کرو ، تیسری صبر و شکیب پر عمل کرو ۔ اسی مقصد کو زیادہ واضح اور روشن کرنے کی غرض سے مصنف گویا ہے :

جواں مردی سے یہ مفہوم مراد ہے کہ آدمی میں چند ہنر ہوں یعنی وہ دلیر اور مردانہ ہو اور ہر کام میں شکیبا ہو ۔ وعدے کا سچا ، پاک طینت اور صاف دل ہو ۔ اپنے نفع کی خاطر دوسروں کا نقصان نہ کرے ۔ اپنا نقصان دوسروں کے نفع کے خیال سے منظور کر لے ۔ اسیروں پر ہاتھ نہ اٹھائے ، مظلوموں کی دستگیری کرے ، بدوں کی بدی نیکوں سے دور کر دے ، سچ بات سنے اور کہے ۔ جس دستر خوان پر کھائے ، اس کی برائی نہ کرے ۔ نیکی کا بدلہ بدی سے نہ دے ۔ زبان پاک رکھے اور مصیبت کو راحت جانے ۔ اور حقیقت میں اگر دیکھا جائے گا تو یہ صفات ان ہی تینوں صفات کی آوازِ بازگشت ہیں ۔ مندرجہ بالا سپاہیانہ جواں مردی ہے ، جس کو عیار پیشگی بھی کہا جاتا ہے ۔ کرم ، مہمان داری ، سخاوت ، حق شناسی ، پاک جامگی اور مدارا سپاہی میں زیادہ ہونا چاہیے بہ نسبت زیاں دوستی اور خویشتن دوستی کے ۔ عجز و انکسار سپاہی میں ہنر ہے لیکن عیاری میں عیب ہے ۔

حکایت :

ایک روز قہستان میں کچھ عیار جمع تھے ۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور بولا کہ میں عیاروں کا قاصد ہوں اور تم سے تین باتیں پوچھنے آیا ہوں ۔ اگر جواب با صواب دیا تو ہماری جماعت کے عیار تمھاری مہتری کے قائل ہو جائیں گے ورنہ تم کو ہماری افضلیت ماننی ہوگی ۔ قہستانیوں نے پوچھا ''وہ مسئلے کیا ہیں ؟ بیان کرو'' اس نے کہا ''پہلا سوال یہ ہے کہ جواں مردی کیا ہے ؟ دوسرا جواں مردی اور ناجواں مردی کے درمیان کیا ہے ؟ تیسرا اگر کوئی عیار راستے پر بیٹھا ہو اور کوئی آدمی گزرے ، اس کے کچھ دیر بعد اسی آدمی کے تعاقب میں ایک شخص شمشیرِ برہنہ لیے ہوئے اس کے قتل کے لیے آ رہا ہو اور اس سے پوچھے کہ کیا فلاں آدمی ادھر سے گزرا ہے تو کیا جواب دیا جائے ؟ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ گزرا ہے تو ایک شخص کو رسوا کیا جاتا

ہے ، اگر یہ کہا جاتا ہے نہیں گزرا ، دروغ گوئی ہوتی ہے ۔ اور تم جانتے ہو ، ان دونوں باتوں کی عیاری میں اجازت نہیں ہے ۔"

قہستانی عیار یہ سوال سن کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ۔ ان میں ایک شخص فضل اللہ نامی ہمدانی تھا ۔ اُس نے کہا "میں جواب دیتا ہوں ؛ پہلے سوال کا جواب ہے کہ جو کچھ کہو کرو ۔ دوسرے کا جواب ہے ، جواں مردی اور نا جواں مردی کے درمیان صبر ہے ۔ تیسرے کا جواب یہ ہے کہ عیار اُس مقام سے ہٹ کر کہے کہ جب سے میں یہاں بیٹھا ہوں ، ادھر سے کوئی نہیں گزرا تا کہ سچ بولے ۔"

اب ہم دیکھتے ہیں کہ عیار و عیار پیشہ سے مصنف ایک خاص اصطلاح مراد لیتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک جنگی فرقہ تھا جو چند خاص اصول اور فرائض کا پابند تھا ۔ ہمارے ادبیات میں اس فرقے یا اخوت کا ذکر بہت کم ملتا ہے ۔ افسانے کی کتب مثلاً داستان امیر حمزہ وغیرہ میں عیاروں کے متعلق ایک بالکل غیر تاریخی اور مختلف بیان ملتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح درویشوں اور صوفیوں کا ایک علیحدہ فرقہ ہے اور جس کو ہم اپنے زمانے میں بھی دیکھتے ہیں ، اسی طرح عیاروں کا فرقہ[1] اپنے مرکز میں

---

۱ - پروفیسر سعید نفیسی فرماتے ہیں :

"اینجا عیار بمعنی گروهیست کہ در قدیم در شهرها و مخصوصاً در سیستان و بغداد از مردم طبقۂ پست و دلیر و سلاحشور و جوان مرد و پُر دل بوده اند و در هنگامہ ها خود نمائی می‌کرده اند و جماعتی تشکیل می‌داده و سرکردگانی داشتہ اند کہ از آنها پیروی می کرده اند و مانند طبقۂ شوالیه ها در قرون وسطی در اروپا بوده اند و در ضمن آنکہ راهزنی می‌کرده و ازین راه گذران می کرده اند مردمی غیرت مند و جوان مرد بوده اند کہ از بیچارگان پشتیبانی میکرده و ناتوانان را می‌نواختہ اند ۔" (از حواشی باب بیست و نهم ، منتخب قابوس نامہ) ۔ (مرتب)

علیحدہ تھا ، جو شاید خروجِ مغول کے دور میں یا اُس کے بعد مفقود ہو گیا ۔

یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے جنگی طبقات (ملیٹری آرڈرس) اور مغربی (شولری) جواں مردی ، عیاروں کی جماعت سے بہت ملتے جلتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ مصنف نے اس جماعت کے جو چند اور مختصر خط و خال دیے ہیں ، اس کی پوری نوعیت کی تصویر نہیں اتارتے ، لیکن یوروپین جواں مردی سے مقابلے کے لیے کافی ہیں ۔

جواں مردی کے ضروری صفات انگریزی مورخ گبن کے نزدیک یہ ہیں : خدا اور عورات کا حامی ہونے کی حیثیت سے سچ بولنا ، حق کی حمایت کرنا ، مظلوموں کی حفاظت کرنا ، خوش خلقی سے کام لینا ، کافروں کا (مسلمانوں کا) تعاقب کرنا ، عیش و آرام کی دل کشی کو حقارت سے دیکھنا اور مہالک میں پڑ کر اپنی وضعداری کی شان قائم رکھنا وغیرہ ایک جواں مرد کا پیشہ ہے ۔

ایک اور انگریزی مورخ ہیلم کے نزدیک دلیر ، صادق الوعدہ ، خوش خلق اور فیاض ہونا جواں مردی کے لیے ضروری ہے ۔ اس کے علاوہ انصاف کا عملی درک ، حق تلفی کے خلاف تندی ، غضب ، جوش ، دلاورانہ عزم ، اس کے بہترین انجام کے لیے نقصان کا امتناع یا اس کی تلافی ، ان صفات پر اور اضافہ ہونا چاہئیں ۔

جواں مردی کی مشرقی اور مغربی تصویر علیحدہ علیحدہ دکھا دی گئی ہے ۔ اس کے اکثر خط و خال دونوں میں عام ہیں ؛ مثلاً دلیری ، ایفائے عہد ، مظلوموں کی حق رسی ، راستی ، فیاضی ، آرام کی زندگی پر واقعہ طلبی کی زندگی کو ترجیح دینا ۔ اب ظاہر ہے کہ ایک اصل ہے اور دوسری نقل اور یہ کہ مشرق کے اتباع میں مغرب نے یہ پیشہ اختیار کیا ۔ اس کا ثبوت بہم پہنچانا چنداں مشکل نہیں ہے ۔ چنانچہ خود مورخ ہیلم کہتا ہے :

”جواں مردی کی مخصوص صفات اُن اوصاف سے بہت کچھ مماثلتِ قریبہ رکھتی ہیں جن کے اُن زمانوں کے مشرقی مصنف بہت

ثناخواں معلوم ہوتے ہیں ۔ میں کسی قدر بہ گمان کرنے کے لیے مائل ہوں کہ یورپ نے اس بارۂ خاص میں ایشیا کی تقلید میں کچھ ترقی حاصل کی ہے ۔ اگرچہ حروب صلیبی کافروں (مسلمانوں) کی منافرت میں آغاز پاتی ہیں لیکن ان کے اختتام سے پیشتر یہ جذبہ کسی حد تک مفقود ہو چلا تھا ، اور باقاعدہ تجارتی معاملات ، اور بعض اوقات عیسائی فلسطین اور مسلمانوں میں اتحاد نے تعصب کو کسی قدر دور کر دیا ہوگا ۔ جنگ میں ان کے دشمنوں کی بہادری اور فیاضی کا مشاہدہ ان بہادر سورماؤں کے دل سے باقی ماندہ عصبیت دور کرنے میں کامیاب ہوا ہوگا ۔ باستثنائے تعشقِ عورات جو ان کے ہاں رسماً و عرفاً ممنوع ہے ، اسلامی رؤسا مغربی جواں مردی کے فرائض ضرورت سے زیادہ انجام دینے کے قابل تھے ۔"

عیارانہ جواں مردی سے افضل وہ صنف ہے جو طبقۂ علماء و صلحا میں پائی جاتی ہے ۔ وہ گویا ہے کہ اس طبقے کو جان اور تن دونوں ملے ہیں ۔ راستی جان ہے ، اس لیے ان کے افعال اور اقوال پسندیدہ اور باورع ہونا ضروری ہیں ۔ دین میں مضبوط اور ریا سے بری ہوں ۔ دین کے سوا کسی معاملے میں غصے کا اظہار نہ کریں ، کسی کی پردہ دری نہ کریں ، ایسے فتوے نہ دیں جو سوگند اور طلاق میں انجام پائیں ، دین کو دنیا کے عوض فروخت نہ کریں ، نمایش نہ کریں ، مجمع میں فاسق کو بھی ملامت نہ کریں ، کسی کے قتل کا فتویٰ نہ دیں ، اگرچہ وہ مستوجبِ قتل ہو ۔ مذہب میں بہ وجہ تعصب کسی کو کافر نہ کہیں ، کیوں کہ کفر دین کے خلاف ہے ، مذہب کے خلاف نہیں ۔ جدید علم یا کتاب سے انکار نہ کریں ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جو تم نہ جانو وہ کفر ہو ؟ خدا کے رحم سے مایوس اور گناہ پر دلیر نہ ہوں ۔ اہل تصوف کی جواں مردی کے شرائط اور فرائض وہ علیحدہ بیان کرتا ہے ۔ ضمناً وہ تصوف کے آغاز پر بھی کچھ روشنی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طریقے کی بنیاد

حضرت عزیز نے ڈالی تھی ۔ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں بارہ مرقع پوش اشخاص تھے ۔ رسول ان سے محبت کرتے تھے اور اکثر خلوت میں ان سے مجالست رکھتے تھے ۔ موجودہ صوفی گری کے لیے عنصرالمعالی گویا ہے کہ وہ پارس میں وجود میں آئے ۔ تصوف کے اصول اکثر صوفیوں نے لکھے ہیں ۔ ان میں ابوالقاسم کے رسالۂ آداب التصوف ، شیخ ابوالحسن القدسی کی بیان الصفا، ابومنصور دمشقی کی کتاب عظمت اللہ اور علی واحدی کی کتاب البیان فی کشف العیان ماذکر (کذا) کا ذکر کرتا ہے ۔

پیشتر اس کے کہ میں قابوس نامے کو بند کروں ، اس کی تاریخی حیثیت پر بھی چند الفاظ اضافہ کرنا چاہتا ہوں ۔ مصنف حدیقۃ الاقالیم اور مصنف شاہد صادق اور دولت شاہ اس سے بخوبی واقف ہیں ۔ ان لوگوں نے اس کتاب کے اکثر بیانات سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ فرشتہ ، حمداللہ مستوفی اور صاحبِ نگارستان یا تو براہ راست قابوس نامے سے مستفید ہوئے ہیں یا اس کے بعض بیانات کسی اور ذریعے سے ان تک پہنچے ہیں ، کیوں کہ کئی تاریخی روایات کے لیے یہ کتاب اور صرف یہ کتاب سند ہے ۔ یہاں میں بعض کا بالاجمال ذکر کرتا ہوں ۔

(۱) قابوس کے آخری ایام ، اس کے قید اور قتل کے واقعے سے تاریخ بالکل بے خبر تھی ۔ تذکرۂ دولت شاہ اور حبیب السیر میں البتہ ہم یہ ذکر پڑھتے ہیں ، لیکن ان کی سند یہی قابوس نامہ ہے ۔

(۲) سلطان محمود غزنوی کا تہدید آمیز خط خلیفہ قائم باللہ کے نام اور خلیفہ کا جواب میں ''الم'' لکھ بھیجنا ، یہ قصہ جہاں کہیں گیا ہے ، قابوس نامے سے گیا ہوگا ۔ لیکن تاریخ میں اس قصے کے متعلق کئی گروہ ہیں ۔ ایک گروہ کا بیان ہے کہ خلیفہ نے چونکہ فردوسی کو پناہ دی تھی اور سلطان کے پاس بھیجنے سے انکار کیا تھا ، اس لیے یہ خط لکھا گیا ۔ اس میں تاریخ گزیدہ ، دیباچۂ بایسنغری اور نگارستان شریک ہیں ۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ خط خلیفۂ بغداد

کے نام نہیں تھا بلکہ اسپہبد شہریار بن شروین والیِ طبرستان کے نام تھا ۔ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ خط اگرچہ خلیفۂ بغداد ہی کے نام تھا لیکن بنائے فساد ملکِ ترکستان تھا ۔ سلطان اس ملک کو اپنے قلمرو میں شامل کرنا چاہتا تھا اور خلیفہ نے اس کی مخالفت کی تھی ۔ اس خیال کا مدعی ابوالقاسم فرشتہ ہے ۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قابوس نامے کے بیانات ، جو تاریخ گزیدہ سے قریباً ڈھائی سو برس پرانے ہیں ، قولِ فیصل ٹھہرتے اور فرشتہ کے بیانات کی من و عن تائید کرتے ہیں ۔

(۳) سیدہ مادرِ مجدالدولہ کا سلطان محمود غزنوی کے حملے سے ایک خط کے ذریعے سے اپنے ملک کو بچا لینا ، یہ قصہ نگارستان میں درج ہے لیکن اس کی سندِ اولین یہی قابوس نامہ ہے ۔

(۴) میرابوالسواد شاہ ابن الفضل اور اس کے بزرگ امیر فضلون والیانِ گنجہ کے ناموں تک سے آج ہم واقف نہ ہوتے ، اگر مصنف اتفاقیہ ان کا ذکر نہ کر دیتا ۔

(۵) سلطان مودود غزنوی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے : میں آٹھ سال تک غزنیں میں سلطان مودود کا ندیم رہا لیکن ہمیشہ ان تین باتوں کا اس کو پابند پایا : (۱) جب کبھی کسی کو وہ انعام دیتا ، کبھی زبان پر نہ لاتا بلکہ پرچے کے ذریعے دلواتا ۔ (۲) کبھی اتنا نہ ہنستا کہ اس کے دانت نظر آجائیں ۔ (۳) کتنا ہی غضب میں کیوں نہ ہو ، گالی کے واسطے 'بے حمیت' کے سوائے اور لفظ استعمال نہ کرتا ۔ نمبر اول کا ذکر تاریخ 'شاہد صادق' میں ہے لیکن محمد صادق اس کو سلطان محمود کے نام سے منسوب کرتا ہے ۔

(۶) ابوالعباس روبانی قاضی طبرستان اور درخت کی شہادت پر اس کا فیصلہ ۔ شاہد صادق میں اس کا نام ایاس بن معاویہ قاضی ہے ۔

(۷) سلطان محمود اور ابوالفرح سعی عاملان کا قصہ ، صاحب اسمٰعیل ابن عباد اور خاقان کا شغر کے متعلق اس کی اندیش ناکی ،

صاحب اسمٰعیل اور ربیع بن مظہر القصری وغیرہ ، تمام قصے شاہد صادق میں ملتے ہیں ، لیکن یہی قابوس نامہ اس کی سند معلوم ہوتی ہے -

جوانمردی از کارها بهتر است   جوانمردی از خوی پیغمبر است
دو گیتی شود بر جوانمرد راست   جوانمرد باش و دو گیتی تراست

شیخ فرید الدین عطار اور حکایات
سلطان محمود

(از اورینٹل کالج میگزین بابت فروری سنہ ۱۹۲۵ع)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ اگرچہ پہلی صدی ہجری سے شروع ہو گیا ہے اور غزنوی دور سے پیشتر آن کی ریاستیں سندھ و ملتان میں قائم ہو جاتی ہیں ، لیکن محمود کے عہد تک ان کا قیام اس سرزمین میں عارضی اور بے ثبات تھا ۔ محمود کی آمد نے مسلمانوں کے تعلقات اس ملک کے ساتھ ایک محکم اور استوار اساس پر قائم کر دیے ۔ اس بادشاہ کے دور میں فارسی ادب و تاریخ نے کافی ترقی کی ، بالخصوص شاعری اس کی مدائح کے مہد میں پروان چڑھی ۔ چنانچہ اس کے عہد کا مرقع مشہور شعرا ، ادیب اور مورخین کے اسماء سے مالامال ہے ۔ لیکن ان باکمالوں کی باقیات الصالحات بہت قلیل مقدار میں ہم تک پہنچی ہیں ۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس کے دربار میں چار سو شاعر وظیفہ خوار موجود تھے، جن کا ادبی اندوختہ قصائدِ فرخی و چند قصائدِ عنصری اور بعض دیگر مشاہیر کے نام و نمونۂ کلام کے سوا آج بالکل مفقود ہے۔ تاریخ میں بھی یہی حالت ہے ۔ اگرچہ اس عہد میں متعدد مورخین نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی تصنیفات میں سلطان محمود کے مآثر اور اس کے عہد کے واقعات کا مرقع کھینچا ہے لیکن ان تالیفات کا اکثر حصہ ہم تک نہیں پہنچا ۔ خواجہ ابوالفضل بیہقی کی تیس مجلدات میں سے صرف چار کے قریب ہمارے زمانے تک باقی رہی ہیں ۔

"تاج الفتوح"[1] جس کا ذکر عنصری، اپنے قصیدے میں کرتا ہے ، ابتدا ہی سے گویا نابود ہے - یہی حالت 'مقامات ابو نصر مشکانی' 'تاریخ ملا محمد غزنوی' اور 'تاریخ محمود وراق' کی ہے -

البتہ عربی کی ایک تصنیف 'تاریخ یمینی' ہم تک پہنچی ہے جس میں مصنف نے زیادہ تر محمود کے زمانے کے برہنہ سیاسی واقعات کا خاکہ لے کر ایک رنگین پیرایے میں پیش کیا ہے - محمود کی صرف یہی ایک نیم رخی تصویر باقی رہ گئی ہے ورنہ اس کے عہد کے معاشی اور اجتماعی پہلو کے تمام واقعات بالکل ظلمت میں ہیں - نہ خود محمود کے ذاتی حالات ، عادات و اخلاق اور خیالات پر روشنی ڈالنے والا بظاہر باقی رہا ہے - زمانے کی دست برد نے سب کو مٹا دیا ہے -

مشرق کی الم خیز سر زمین میں ہر شاہی خاندان اپنی عبرت بھری خونیں داستان رکھتا ہے - انقلاب و حوادث کا قانون سب پر نافذ تھا اور محمود کا قانون بھی اس زبردست قانون کے سامنے کوئی استثنا پیش نہیں کرتا - چنانچہ غزنوی دور کے ادبیات کی بربادی کے ذمہ دار کچھ اسی قسم کے انقلاب اور سیاسی حوادث تھے - غزنین کی تباہی ، جس نے علاء الدین غوری کو 'جہاں سوز' کے خطاب سے سرفراز کیا ہے ، اس عہد کے اکثر حصہ' ادب کی غیر حاضری کا جواب دے سکتی ہے - علاء الدین اپنے بھائی کے انتقام کے لیے خاندان غزنہ کے استیصال کی سعی میں شاید حق بجانب ہو ، لیکن غزنین کی

---

۱ - عنصری کا شعر یہ ہے :

حکایت سفر مولتان همی دانی
وگر ندانی تاج الفتوح پیش آور

یہ ایک منظوم کتاب تھی - چنانچہ عنصری :

ور استوار نداری بخوان تو تاج فتوح
کہ بیت‌هاست چو عقد است و شعرهاش درر

(حاشیہ' مصنف)

تباہی ، رعیت کا قتلِ عام اور آتش زنی جیسے وحشیانہ افعال میں کوئی شخص بھی اس کو حق بجانب تصور نہیں کر سکتا ۔ عام خوں ریزی کے ساتھ ساتھ سات روز تک شہر جلایا گیا ۔ دن کو دھواں اور رات کو شعلے نظر آتے تھے ، جس کی فضا کو مقتولوں کی چیخوں اور بے رحم قاتلوں کے نعروں نے جہنم کا نمونہ بنا دیا تھا ۔ غزنی کے لیے یہ وقت قیامت کبریٰ تھا ۔ قصر فیروزہ اور عماراتِ محمودی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ۔ عماراتِ مسعودی و ابراہیمی کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا گیا ۔ قصرِ عدل آباد ، جس میں مسعود ثالث جشن منایا کرتا تھا اور جس کو اس کے دربار کے شاعر ابوالفرج رونی[1] نے اپنے اشعار میں زندۂ جاوید کر دیا ہے ، نہایت بے دردی کے ساتھ خاک کے برابر پست کر دیا گیا ۔ علاء الدین کے شیاطین کے ہاتھوں بچوں ، عورتوں اور بوڑھوں تک کی جانیں نہ بچیں[2] ۔ شاہی مقابر برباد کر دیے گئے ۔ صرف محمود ، اس کے فرزند مسعود اور اس کے فرزند ابرہیم کی قبور اس بے حرمتی سے محفوظ رہیں ۔ آٹھویں دن جب غزنی کی بربادی اپنی آخری منزل تک پہنچ گئی ، علاءالدین نے اس خونیں انتقام کے آتشیں منظر کو بند کرتے وقت اپنی کامیابی

---

۱ ۔ ابو الفرج رونی کے بعض اشعار یہ ہیں :

خسروا ! گیتی بعدل آباد کن
وز فراموشان عالم یاد کن
جام می بر کاخ عدل آباد نوش
خرمی بر کاخ عدل آباد کن
رسم نوشروان عادل تازہ دار
جان نوشروان عادل شاد کن

(حاشیۂ مصنف)

۲ ۔ طبقات ناصری میں صاف لکھا ہے کہ اس قتل عام میں بوڑھے ، بچے اور عورتیں تک شامل نہیں ۔ لیکن علاءالدین کے شعر مرقومۂ متن سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ مستثنیٰ نہیے ۔ (حاشیۂ مصنف)

اور بقیۃ السیف کی معافی دیے جانے کے واقعات کو ایک غزل کی شکل میں ، جو فوراً مطربوں کے سپرد کر دی گئی تھی، بیان کیا ہے ، جس کے بعض اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں :

برآن بودم کہ از اوباش غزنین
چو رودِ نیل جوی خون برانم
ولیکن گندہ پیرانند و طفلان
شفاعت می‌کند بخت جوانم
بہ بخشیدم بدیشان جان ایشان
کہ بادا جان شان پیوند جانم

اس آتش زنی اور قتلِ عام کے دور میں کس قدر بے بہا ادبی ذخیرے جو محمودی دور کی یادگار تھے ، تلف ہوئے اور کتنے نایاب کتب خانے تباہ ہوئے ، کوئی قیاس نہیں کر سکتا ۔

غزنین کی تباہی کے بہت جلد بعد خراسان کے اکثر شہر ، جن میں مرو اور نیشا پور قابلِ ذکر ہیں ، سنجر کے بعض امرا کی بدتدبیری سے غز ترکمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں ۔ تیسری قیامتِ کبریٰ خروجِ چنگیز خاں ہے ، جس میں خراسان ، خوارزم اور ترکستان بالکل بے چراغ کر دیے گئے ۔ بعض بلاد ایسے تباہ ہوئے کہ دوبارہ آباد نہ ہو سکے ۔ ان واقعات نے فارسی ادب و شعر کا بے حد نقصان کیا ۔ ہزاروں کتابیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں ۔ فترتِ مغول میں جو نقصان ہوا ہے ، آج اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے ناممکن ہے ۔ گویا خوارزم شاہی دور اور مغولی عہد کے مابین ایک طوفان آیا تھا ، جس میں قدما کے علم و فضل کا اکثر حصہ صفحۂ دہر سے محو ہو گیا ۔ پرانی روایات قطعاً تلف ہو گئیں اور تصانیف ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں ۔ زمانۂ مغول ایک حدِ فاصل مانا جا سکتا ہے قدیم و جدید ادبیات میں ۔ اگر آج یہ چاہیں کہ کسی روایت کو اس کے اصلی عہد تک واپس پہنچا دیں تو اکثر صورتوں میں ہم اس کوشش میں ناکام رہیں گے ، کیوں کہ ان کا قدیمی سلسلہ

برباد ہو چکا ہے ۔ اسی بنا پر دیکھا جاتا ہے کہ فارسی میں مشاہیر قدما کے حالات و واقعات بلکہ خود اُن کے زمانوں میں بےحد اختلاف ہے ۔

سلجوقی دور کی تصنیفات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد میں سلطان محمود کے متعلق کافی روایات موجود تھیں ۔ قابوس نامہ و سیاست نامہ سے لے کر سنائی غزنوی ، نظامی عروضی اور عطار کے عہد تک مختلف تالیفات میں ہم اس عظیم الشان سلطان کی حکایات سے دو چار ہوتے ہیں ۔ ان میں بعض حکایتیں اس کے ذاتی حالات، خیالات و جذبات پر روشنی ڈالتی ہیں ، اور اگر کوئی شخص اس تمام ذخیرے سے کام لےتو سلطان کی زندگی کا دوسرا رخ ، جس کو مورخین نے قطعاً فراموش کر دیا ہے ، ایک حد تک طرح کیا جا سکتا ہے ۔ ان حکایات میں ہم اس کی سطوت و جبروت اور شان و شکوہِ شاہی اور جدید فتوحات کی جوغ سے دوچار نہیں ہوتے بلکہ وہ صدائے بازگشت ہیں اُن اوصاف کی جو اُس کی خدا ترسی ، انسانی شفقت ، رحم دلی اور ہم دردی جیسے رقیق جذبات سے علاقہ رکھتی ہیں ۔ چونکہ یہ حکایات سلجوقی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں ، اس لیے ان پر زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے ؛ مثلاً قابوس نامے میں جو محمود کے قصے ہیں ، خود محمود کے زمانے تک آسانی کے ساتھ پہنچائے جا سکتے ہیں ، کیوں کہ اس تصنیف کا مالک امیر عنصر المعالی کیکاؤس ، سلطان مودود (۴۳۲ھ و ۴۴۰ھ) کے عہد میں بذات خود دربار غزنہ میں مقیم تھا ۔ باقی مصنفین مثلاً نظام الملک طوسیؒ اور حکیم سنائی کے لیے ممکن تھا کہ محمود کے دیکھنے والوں یا ان کے دیکھنے والوں سے مل سکیں ، لیکن اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ محمود کے متعلق کوئی تالیف ضرور موجود تھی جو آج مفقود ہے اور جس سے بعد کے مصنفین اپنی روایات اخذ کرتے رہے ہیں ؛ مثلاً شیخ فریدالدین عطار کے ہاں محمود کی بابت بیسیوں حکایات ملتی ہیں اور آج اگر کوئی شخص محنت کر کے

عطار کی تمام تصانیف سے ان کو ایک جگہ جمع کر دے تو محمود کے واقعاتِ زندگی میں ایک جدید باب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

عطار کے اوراق میں محمود کے جس قدر واقعات ہیں، کسی ایسے ماخذ سے، جو اب بالکل معدوم ہے، لیے گئے ہیں کیوں کہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اور موقعوں پر بھی شیخ کے ہاں تمام روایات، تاریخی اشخاص اور ان کی سرگزشت سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ محمود کی حکایات بھی کسی تالیف سے منقول ہوں۔

ان قصوں کی رو سے محمود خدا ترس، درویش دوست، دل‌سوز، جفاکشی کا عادی اور خوش طبعی کا شائق معلوم ہوتا ہے، جو اکثر اوقات اپنی حشمتِ خسروی کو بالاے طاق رکھ کر عام انسانوں کے ساتھ سطحِ مساوات پر ملتا ہے۔ وہ اپنے ابناے جنس کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور ان کے ساتھ رحم و شفقت کا سلوک رکھنے کا خواہش مند ہے۔ اس کا سینہ شریف جذبات سے لبریز ہے۔ مختصر یہ کہ ان حکایات میں سلطان محمود ایک جنگ آزما، بت خانوں کا دشمن اور بت شکن محمود نہیں ہے، جس کے نام سے جےپال ہندوستان میں اور ایلک خان ترکستان میں تھرا اٹھتے ہیں، جو ہندوستان کی متفل دولت کو سمیٹ کر غزنیں کی آراستگی میں صرف کرتا ہے اور جو بعض روایات کی رو سے حریص ہونے کے علاوہ بخیل بھی مان لیا گیا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے ان قصص کی سند پر درحقیقت وہ فیاض، سیرچشم اور جواں مرد مانا جا سکتا ہے۔ مزید برآں طبیعت کا نہایت سادہ ہے۔ ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے آمادہ اور ہر قسم کی غذا کھانے کے لیے تیار ہے۔ قدم قدم پر خدا کا خوف اس کے دل پر غالب ہے اور اس کے کان نصیحت سننے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ اپنی رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے کے ساتھ بھی غرور کا روادار نہیں۔ ان سے بے تکلف ہو کر ملتا ہے، ان کی تکلیف اور مصیبت کا اس کے دل میں احساس ہے اور ہر طرح کی امداد کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ بہرام گور کی طرح شکار کا بے حد شائق ہے

اور جنگلوں میں شکار کے پیچھے اپنے لشکر سے جدا ہو کر اکثر آوارہ ہو جاتا ہے اور اجنبیوں کا ناخواندہ مہمان بنتا ہے ۔ کبھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی بوڑھے خارکش کی امداد کے لیے ، جو سنسان صحرا میں اپنے گدھے پر کانٹے لادنے کے لیے دوسرے انسان کی مدد کا منتظر ہے ، گھوڑے سے اترتا ہے ، کانٹوں میں ہاتھ ڈالتا ہے اور شگفتہ روئی کے ساتھ ان کو لدوا دیتا ہے ۔ کبھی دیکھا جاتا ہے کہ کسی ضعیف بوڑھی عورت کی وزنی گٹھڑی کو راستے میں اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے گھوڑے پر رکھ لیتا ہے ۔ پھر جذبۂ ظرافت کی تحریک پر غریب بڑھیا کے چھیڑنے کے لیے اپنا گھوڑا تیز کر دیتا ہے ۔ بڑھیا ساتھ نہیں نبھ سکتی ، چیختی ہے اور اس کو قیامت کی یاد دلاتی ہے ، جہاں تیز رو سست اور سست رو تیز ہو جائیں گے ۔ کبھی کسی ماہی گیر کے لڑکے کے ساتھ مل کر شکار کھیلتا ہے اور دوسرے روز اس کو بلوا کر اپنی حکومت میں شریک کرتا ہے ۔ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملنے کے لیے جاتا ہے اور ان کے ساتھی بھی شوخیوں سے باز نہیں آتا ۔

یہ قصے ، اس میں شک نہیں ، ہمیں الف لیلہ کے ہارون الرشید کی بار بار یاد دلاتے ہیں ، اور جب کہ الف لیلہ میں ہارون الرشید کی تصویر زیادہ تر قیاسی اور فرضی مانی جاسکتی ہے ، عطار کے ہاں یہ قصے حقیقی واقعات کی یادگار ہیں ۔ افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ حکایات محمود کے تمام خط و خال شیخ عطار کے ہاں محفوظ نہیں رکھے گئے ہیں ، کیوں کہ شیخ کا اصلی مقصد ان قصوں سے محمود کی سرگزشت بیان کرنا نہیں تھا بلکہ اصول تصوف کی تعلیم دینا ۔ اس لیے شیخ نے قصے کے انھی اجزا کو برقرار رکھا جو ان کے مقصد کی توضیح کے لیے مناسب تھے ۔ باقی اجزاء جو غیر متعلق تھے ، ترک کر دیے گئے ، اس لیے یہ حکایات ایک مجروح اور ناقص حالت میں پائی جاتی ہیں ، تاہم ان کی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں ۔ ان سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمود کی تلوار نہیں تھی جس کے کارناموں نے

آیندہ نسلوں کی نگاہ میں اس کو محبوب بنا دیا تھا بلکہ اس کے یہی خسروانہ افعال تھے جنھوں نے عرصے تک اس کے ہم‌وطنوں کے دلوں میں اس کی یاد کو تازہ اور اس کے نام کو بڑا بنا دیا تھا ۔ ان الفاظ کے ساتھ میں بعض حکایات کو ذیل میں درج کرتا ہوں ۔

سلطان محمود نے ایاز سے وعدہ کیا تھا کہ کسی روز میں تجھ کو اپنا لباس پہنا کر تیرے سر پر برہنہ شمشیر لیے غلاموں کی طرح کھڑا رہوں گا ۔ جب سلطان شیخ ابوالحسن خرقانی کی زیارت کے لیے آیا ، ایک قاصد شیخ کی خدمت میں اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ شیخ سے کہنا پادشاہ تم سے ملنے کے لیے غزنیں سے چل کر آیا ہے ، پس تم کو لازم ہے کہ تکلیف کر کے شاہی خیمے میں تشریف لاؤ اور ملاقات کرو ۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر شیخ آنے سے انکار کرے تو یہ آیت سنا دینا : "اطیعواللہ و اطیعوالرسول و اولی الامر منکم"۔ قاصد نے شیخ کی خدمت میں پہنچ کر سلطان کا پیغام ادا کر دیا ۔ شیخ نے آنے سے معذرت چاہی ۔ قاصد نے اتمام حجت کی غرض سے وہی آیت پڑھی کہ "اطیعواللہ واطیعوالرسول و اولی‌الامر منکم" ۔ شیخ نے جواب دیا "محمود سے کہنا کہ میں اطیعواللہ میں اس قدر مشغول ہوں کہ اطیعوالرسول سے سخت شرمندہ ہوں ، اولی الامر کا تو ذکر ہی کیا ۔" قاصد نے لوٹ کر سلطان کی خدمت میں شیخ کا جواب بیان کردیا ۔ محمود یہ جواب سن کر متاثر ہوا ۔ کہنے لگا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اس قماش کا انسان نہیں ہے ، جیسا میں نے تصور کیا ہے ۔ آخر خود ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے کا عازم ہوا ۔ اس نے ایاز کو اپنا شاہی لباس پہنا دیا اور دس کنیزوں کو مردانہ لباس پہنا کر اور خود ایاز کا سلاح دار بن کر ساتھ ہو لیا ۔ یہ جماعت شیخ کے صومعے میں پہنچ گئی ۔ سلام کیا ، شیخ نے جواب سلام دیا لیکن ایاز کی طرف دیکھا اور نہ تعظیم دی ۔ بعد میں حسب ذیل گفتگو شروع ہوئی :

سلطان : اے شیخ ! تم نے پادشاہ کی تعظیم نہیں کی ۔ معلوم ہوتا ہے

کہ تم نے ابلہ فریبی کا دام پھیلا رکھا ہے۔

شیخ : بے شک یہ دام ہے لیکن تم اس کے مرغ نہیں ہو۔ (محمود کا ہاتھ پکڑ کر کہا) ذرا آگے آؤ، جب تم کو اس قدر اعزاز دیا گیا ہے۔

سلطان : (آگے بڑھ کر) کیا ارشاد ہے؟

شیخ : ان مستورات کو رخصت کر دیجیے (چنانچہ کنیزیں پادشاہ کا اشارہ پاتے ہی رخصت ہوگئیں)۔

سلطان : اے شیخ! مجھ کو بایزید کی کوئی بات سنائیے۔

شیخ : بایزید نے فرمایا ہے کہ جس نے مجھ کو دیکھا، شقاوت سے بچ گیا۔

سلطان : کیا بایزید کا رتبہ پیغمبر سے بھی بڑھ گیا ہے جن کو ابوجہل، ابولہب اور بےشمار کافروں نے دیکھا لیکن وہ سب شقی ہیں۔

شیخ : اے محمود! گستاخ نہ ہو اور حد ادب سے نہ بڑھ۔ رسول اللہ کو اُن کے چار یار کے سوا کس نے دیکھا؟ اور میری دلیل یہ آیت ہے: "و تراھم ینظرون الیک و ھم لایبصرون۔"
یہ جواب سلطان کو پسند آیا اور کہنے لگا۔

سلطان : اے شیخ! مجھ کو کوئی نصیحت کر۔

شیخ : سنو اور یہ چار باتیں یاد رکھو:
(۱) گناہوں سے احتراز کرنا۔
(۲) نماز با جماعت پڑھنا۔
(۳) سخاوت کرنا۔
(۴) خدا کی مخلوق پر شفقت رکھنا۔

سلطان : میرے حق میں کوئی دعا فرمائیے۔

شیخ : اللّٰھم اغفر للمومنین والمومنات۔

سلطان : نہیں، کوئی خاص دعا فرمائیے۔

شیخ : تمھاری عاقبت محمود ہو۔

اس پر سلطان نے دیناروں کی تھیلی شیخ کی خدمت میں

پیش کی اور شیخ نے جو کی روٹی نکال کر دی اور بولا :
''اسے کھاؤ ۔'' محمود نے نوالہ منہ میں لیا اور چبایا لیکن
نوالہ گلے میں اٹک گیا ۔

شیخ : اے محمود ! کیا میری روٹی تیرے گلے میں پھنس گئی ؟

سلطان : ہاں اے شیخ !

شیخ : اے سلطان ! اسی طرح تیرے دیناروں کا بدرہ میرے گلے میں اٹکتا ہے ، اٹھالے اور لے جا ، میں اس کو تین طلاق دے چکا ہوں ۔

سلطان : تو پھر کسی کارخیر میں صرف کر دینا ۔

شیخ : نہیں ، میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا ۔

سلطان : اچھا تو پھر اپنی کوئی چیز مجھ کو یادگار دیجیے ۔

شیخ نے اپنا پیراہن دیا ۔ رخصت ہوتے وقت محمود نے کہا ۔

سلطان : اے شیخ ! تمھارا صومعہ کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے ۔

شیخ : (مسکرا کر) تمھارے پاس اتنا کچھ تو خدا کا دیا ہے ۔ کیا اس پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہو ؟

جاتے وقت شیخ نے سرو قد اٹھ کر سلطان کی تعظیم کی ۔

سلطان : جب میں آیا تھا ، اس وقت تم نے میری طرف مطلق توجہ نہیں کی ۔ اب کیوں میری تعظیم کی تکلیف روا رکھتے ہو؟

شیخ : اے پادشاہ ! تو اس وقت نخوتِ شاہی سے معمور ، میرے امتحان کے ارادے سے آیا تھا ۔ اب اس کی بجائے درویشی کا آفتاب تیرے سر پر چمک رہا ہے ۔ پہلے میں تیرے شاہی غرور کا خیال کر کے نہ اٹھا ، اب تیری درویشی کا خیال کر کے کھڑا ہوا ہوں[1] ۔

(از تذکرۂ اولیاے شیخ عطار)

---

۱ ۔ الٰہی نامہ میں بھی شیخ نے یہی حکایت نقل کی ہے لیکن اس کے اکثر واقعات حذف کر دیے ہیں ۔ (حاشیۂ مصنف)

سلطان محمود تیزی کے ساتھ اپنی فوج کے ہمراہ کہیں جا رہا تھا ۔ راستے میں ایک بڑھیا عصا ٹیکتی ہوئی اسے ملی ، جو مظلوم معلوم ہوتی تھی اور سلطان سے انصاف کی طالب تھی ۔ سلطان چونکہ جلدی میں تھا، بڑھیا کو دیکھتا ہوا نکل گیا اور اس کے شور و فریاد کی طرف مطلق توجہ نہیں کی ۔ رات کو خواب میں سلطان نے دیکھا کہ میں ایک کنویں میں گر پڑا ہوں اور وہی پیر زال کنویں پر جھک کر اور اپنا عصا کنویں میں لٹکا کر اس سے کہتی ہے کہ اے نیک پادشاہ ! اس لاٹھی کو تھام کر اوپر چڑھ آ ۔ چنانچہ محمود نے عصا پکڑ لیا اور آسانی سے کنویں سے نکل آیا اس خواب نے سلطان پر بڑا اثر کیا ۔ دوسرے دن جب دربار ہو رہا تھا اور سلطان تخت شاہی پر جلوہ گر تھا ، اس نے دیکھا کہ وہی پیر زال دادخواہوں کی صف میں کھڑی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں ۔ سلطان پہچانتے ہی تخت سے اتر کر اس کی طرف جھپٹا اور ہاتھوں ہاتھ لا کر اس نے بڑھیا کو تخت پر اپنے برابر بٹھا لیا اور پھر رات کے خواب کا واقعہ بیان کیا ، اور کہنے لگا کہ اگر رات کو یہ ضعیفہ اپنی ہمت مردانہ سے کام لے کر مجھ کو نہ نکالتی تو یقین کرو کہ میں اسی کنویں میں پڑا رہتا اور ہرگز نجات نہ پاتا ۔ بعد میں اپنے درباریوں سے خطاب کر کے کہنے لگا : "اگر تم بھی نجات کے طالب ہو تو اس ضعیفہ کے عصا سے متمسک ہو ۔ جوق در جوق درباری آنے لگے اور عصائے پیرزن کو چھونے لگے ۔ پھر محمود نے ضعیفہ سے کہا "یہ لوگ تعداد میں اس قدر ہیں ، تمھارا عصا کس کس کی یاوری کر سکتا ہے ؟" ضعیفہ نے جواب دیا : "اے سلطان ! جس شخص نے محمود کو کنویں سے نکال لیا ہے ، اس کے لیے ان لوگوں کا نکالنا کیا مشکل ہے ۔ جب ہاتھی نکال لیا گیا تو پشے بھلا کیا مال ہیں ۔"

(از الٰہی نامۂ عطار)

سلطان محمود ایک مرتبہ شکار کو گیا اور لشکر سے جدا ہو کر کسی طرف نکل گیا ۔ اس کو ایک بوڑھا گدھے والا خارکش نظر آیا جو نہایت حیران پریشان کھڑا تھا ۔ کانٹے ، جو اس نے گدھے پر لادے تھے ، اس کی پشت سے گر چکے تھے ، جن کو دوبارہ لادنے کے لیےوہ کسی دوسرے شخص کی امداد کا متوقع تھا ۔ سلطان سمجھ گیا ، اس کی طرف بڑھا اور قریب جاکر دریافت کیا ”کیا تم کو مدد کی ضرورت ہے ؟“ خارکش نے جواب میں کہا ”اگر مدد کرو تو کیا کہنے ۔ میں اسی لیے دیر سے حیران کھڑا ہوں ۔ تم صورت شکل سے تو بہت مہربان معلوم ہوتے ہو ، اس لیے اس خفیف سی مہربانی کی تم سے التجا کرنا بے سود نہیں ہوگا ۔“ سلطان اچھا کہہ کر اپنے گھوڑے سے اترا ، کانٹوں میں ہاتھ ڈالے اور بوڑھے کے ساتھ مل کر کانٹوں کو اٹھا کر دوبارہ گدھے کی پشت پر لاد دیا ۔ اس کے بعد سلطان سوار ہو کر گھوڑا اڑاتا اپنے لشکر سے جا ملا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ میرے عقب میں ایک گدھے والا خارکش کانٹے لیے چلا آ رہا ہے ، اس کو روک دینا اور جب تک میں اس کو نہ دیکھ لوں جانے نہ دینا ۔ کچھ عرصے کے بعد بوڑھا بھی نمودار ہوا ۔ فوجیوں نے دیکھتے ہی اس کو گھیر لیا اور روک دیا ۔ بوڑھا حیران رہ گیا ۔ دل میں کہنے لگا ”دیکھیے ان ظالم فوجیوں سے خدا کیوں کر نجات دلاتا ہے ۔“ وہ خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا ۔ اتنے میں ایک طرف چترِ سلطانی نظر آیا ۔ بوڑھے کو جرأت ہوئی اور اسی طرح بغرض فریاد گدھا ہنکارتا ہوا جھپٹا ۔ جب محمود کے چہرے پر اس نے نگاہ ڈالی تو فوراً پہچان گیا کہ یہ تو وہی مہربان شخص ہے جس نے کچھ دیر پہلے کانٹے لدوانے میں میری مدد کی تھی ۔ غل مچانے لگا کہ الٰہی الٰہی یہ حماقت کس کے سامنے جاکر بیان کروں کہ خود میں نے بادشاہ کو اپنا حمال بنایا ۔ الٰہی توبہ الٰہی توبہ ۔ سلطان نے کہا ”بڑے میاں ! میرے پاس کیسے آنا ہوا؟“ بوڑھے نے جرأت کر کے کہا ”بھلا اتنے تجاہل کی کیا ضرورت ہے ، کیوں انجان

بنتے ہو ۔ دیکھتے نہیں کہ میں بوڑھا ہوں ، خارکش ہوں ، دن رات کانٹے لادتا اور لے جاتا ہوں جن کو فروخت کرکے اپنی روٹی کماتا ہوں ۔ اے سلطان ! تیرے لیے میری معاش کا انتظام کر دینا بڑی آسان بات ہے ۔" سلطان نے کہا "تم اپنے کانٹوں کا مول کہو ، میں خریدنے کے لیے تیار ہوں ۔" بوڑھے نے جواب دیا "میں ان کانٹوں کو سستا نہیں بیچوں گا ۔ ان کی قیمت دیناروں کی دس تھیلیاں ہیں" ۔ سلطان مسکرایا اور لشکریوں نے کہا "بے وقوف بوڑھے ! یہ کانٹے دو کوڑی کے بھی نہیں اور تم ان کو اس قدر گراں بیچنا چاہتے ہو ؟" بوڑھے نے جواب دیا "بے شک میرے کانٹے کم قیمت ہیں ، لیکن جب سے سلطان نے ان کے ہاتھ لگا دیا ہے ، بیش قیمت ہو گئے ہیں ۔ اب یہ کانٹے نہیں ہیں گلزار ہیں ۔ خرید و فروخت میں رضامندی شرط ہے ۔ میں فی خار ایک دینار مانگتا ہوں ، مرضی ہو تو لیجیے ، میں زبردستی نہیں کرتا ۔ میرے کانٹے کچھ قیمت نہیں رکھتے تھے لیکن سلطانی ہاتھوں نے انہیں انمول بنا دیا ہے ۔" پادشاہ بوڑھے کی یہ باتیں سن کر بہت محظوظ ہوا ، اس کو انعام دیا اور ایک ہزار دینار میں ان کانٹوں کو خرید لیا ۔ امرا نے سلطان کی تقلید میں بوڑھے کو بہت کچھ دیا ۔ اس طرح بوڑھے کو ایک لاکھ درم کل رقم ملی ۔ بوڑھے خارکش کے ساتھ سلطان کی فیاضی کی یہ حکایت یادگار رہ گئی ۔

(منطق الطیر)

محمود ایک روز اتفاقاً اپنے لشکر سے جدا ہوکر دریا کے کنارے کنارے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا ۔ کسی مقام پر اس نے ایک لڑکے کو مچھلی کے شکار میں مشغول دیکھا ، جس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بے حد مغموم ہے ۔ سلطان اس کی طرف بڑھا اور قریب آ کر دریافت کیا : "میاں لڑکے! تم اس قدر مغموم کیوں ہو ؟" لڑکے نے جواب دیا "جناب ! ہم چار یتیم بھائی ہیں اور ایک اپاہج ماں ہے ۔ ہم لوگ نہایت مفلس ہیں ۔ میں ہر روز یہاں آ کر اور مچھلیاں پکڑ کر

لے جاتا ہوں ، جن پر ہماری گزر اوقات ہوتی ہے ۔ لیکن آج صبح سے ڈور ڈالے بیٹھا ہوں ، یہ وقت ہونے آیا اور ایک مچھلی بھی نہیں پھنسی ۔ پس آج ہم سب فاقے سے رہیں گے ، اسی لیے میں مغموم ہوں ۔ سلطان نے اس کی تسلی کی اور امید بندھائی ۔ پھر کہنے لگا ''اگر تم مانو تو میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں ؛ وہ یہ ہے کہ ہم تم دونوں مل کر شکار کھیلیں اور شام تک جس قدر مچھنیاں پکڑیں ان کو نصف نصف تقسیم کرلیں ۔'' لڑکے نے جواب دیا ''مجھ کو یہ تجویز منظور ہے ۔'' سلطان نے اس کے بعد لڑکے کے ہاتھ سے ڈور لے کر دریا میں پھینکی ۔ اب یہ حالت ہوئی کہ مچھلیاں پھنسنے لگیں ۔ شام تک چھوٹی بڑی سو مچھلیاں پکڑی گئیں ۔ اب لڑکے کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ وہ کہتا تھا ''دیکھو جی ! آج قسمت کیسی کھلی !'' شکار ختم کر کے سلطان گھوڑے پر سوار ہوکر جانے لگا ۔ لڑکے نے کہا ''جناب ! آپ اپنا حصہ تو لیتے جائیں ۔'' پادشاہ نے جواب دیا ''میاں لڑکے آج کا حصہ تو تم ہی رکھو، اس کے عوض میں کل جو شکار ہاتھ لگے گا ، وہ میں لے جاؤں گا ۔'' سلطان یہ کہتا ہوا روانہ ہوا اور بہت جلد اپنے محل میں پہنچ گیا ۔ دوسرے دن اس کو گزشتہ واقعات کے ساتھ اپنا شریک بھی یاد آیا ۔ اسی وقت آدمی بھیج کر لڑکے کو بلوا لیا اور اپنے برابر مسند پر بٹھا لیا ۔ ارکان دولت حیران رہ گئے ۔ کہنے لگے ''بادشاہ کے لیے زیبا نہیں ہے کہ ایک مفلس لڑکے کو اپنے برابر مسند پر بٹھائے ۔'' سلطان نے کہا ''تمھیں کیا معلوم ۔ کل وہ میرا شریک تھا ۔ کل میں سب دن اس کے برابر بیٹھ کر شکار کھیلتا رہا ہوں ، پھر کیا وجہ ہے کہ آج وہ میرے برابر نہ بیٹھے ۔ میں نے اس کو اپنا شریک بنا لیا ہے ۔ اب میں اس سے بدل نہیں سکتا ۔'' قصہ مختصر یہ کہ پادشاہ اپنے شریک کی ہمیشہ عزت کرتا رہا اور آخر میں اس کو کسی ولایت کا حاکم بنا کر بھیج دیا ۔ (منطق الطیر)

سلطان ایک روز علی الصباح کسی طرف جا رہا تھا ۔ راستے میں ایک فریادی نے گستاخ وار آ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اپنے شور و فریاد سے سلطان کو دق کرنے لگا ۔ پادشاہ نے تنگ آ کر اس کے ہاتھ پر چابک مارا ۔ فریادی نے باگ چھوڑ دی اور تکلیف سے چیخنے لگا ۔ سلطان نے جب اس کو زیادہ بے تاب دیکھا، تھم گیا ۔ ہمراہیوں میں سے ایک امیر نے عرض کی ''اے شاہجہاں ! جب اس مظلوم نے سلطانی گھوڑے کی لگام پکڑ لی ، سلطان نے اس کے چابک مارا ، اور جب چھوڑ دی تو جہاں پناہ سفر جاری رکھنے کی بجائے تھم گئے ۔ سلطان نے فرمایا ۔ ''میں اس وقت نشۂ غرور میں مست تھا ۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ اس مظلوم کا رواں رواں ایک ہاتھ بن گیا ہے اور میرے گھوڑے کی لگام پکڑ لی ہے ۔ جب اتنے ہاتھوں نے میرے عنان کو جکڑ لیا ہو، کیسے ممکن ہے کہ میں آگے بڑھ سکوں ۔'' (الٰہی نامہ)

سلطان ایک دن کہیں جا رہا تھا ۔ اسی راستے سے ایک عیار[1]

---

۱ ۔ پانچویں صدی ہجری میں عیار جوان مرد کے معنوں میں مستعمل تھا ۔ یہ ایک قسم کا پیشہ یا برادری تھی جس کے افراد عیار کہلاتے تھے اور ان کا نظام عیاری ۔ یہ فرقہ خاص خاص اصول اور قوانین کے ماتحت کام کرتا تھا ۔ مثلاً خدا پرستی ، راست گوئی ، وفاداری ، نمک حلالی ، حرمت مذہب اور زبردستوں کے مقابلے میں کمزوروں کی حمایت ۔ عیار لوگ زیادہ تر فوجی حلقوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ تجارت پیشہ لوگوں کی عیاری مختلف تھی اور صوفیوں کی مختلف ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُن ایام میں ۔ ۔ مسلم جماعتوں نے اپنے آپ کو عیاری کے مختلف نظاموں میں منقسم کر رکھا تھا ، جن میں سے ہمارے دور تک صرف صوفیوں کا نظام پہنچا ہے ۔ اور باقی نظام برباد ہو گئے ۔ قرون وسطیٰ میں یہی نظام مغرب کی عیسائی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(راہزن) بھی جا رہا تھا ۔ سلطان نے ایک جگہ تھم کر اسے کہا "میاں عیارا! آؤ ہم تم ذرا یہاں ٹھہرجائیں ۔ میں تم سے عیاری کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں ۔" دوال باز نے ہنس کر کہا "اے شاہ جہاں! تم اس پیشے کو سیکھ کر کیا کرو گے ۔ وہ تم کو نہیں آ سکتا ۔" سلطان نے پوچھا "کیوں ؟" عیار نے جواب دیا کہ عیاری کے ساتھ کوس و علم شاہی جمع نہیں ہو سکتے ۔ سلطان کو چاہیے کہ پہلے ان اشیا سے قطع تعلق کرے اور پھر عیاری سیکھے ورنہ اس کا خیال تک دل میں نہ لائے ۔

سلطان محمود اپنی فوج سے بچھڑ کر ایک روز تنہا رہ گیا ۔ راستے میں اس کو ایک ضعیف بڑھیا نظر آئی جو ایک وزنی انبان اپنی گردن میں ڈالے آہستہ آہستہ ایک پن چکی کی طرف جا رہی تھی ۔ بادشاہ کو ترس آیا ۔ کہنے لگا "بڑی بی ! تم بہت کمزور معلوم ہوتی ہو اور تمھاری زنبیل وزنی بہت ہے ۔ لاؤ میں اسے گھوڑے پر رکھ لوں تاکہ تمھارا بوجھ ہلکا ہو جائے ۔" بڑھیا دعائیں دینے لگی اور انبان سلطان کے گھوڑے پر رکھ دی گئی ۔ سلطان کو مذاق سوجھا ، گھوڑا تیز کر دیا ۔ بڑھیا پیچھے رہ گئی ۔ خفا ہوئی اور للکار کر

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)

قوموں میں پہنچ جاتا ہے اور ایک عرصے تک قائم رہتا ہے ۔ مغرب میں اس کا نام Chivalry اور اس کے متبعین کو Chivalrous کہا جاتا تھا ۔ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اس مشرقی نظام نے اُس عہد کی عیسائی قوموں کو حروب صلیبیہ میں ، جب کہ بے حد امداد دی ہے ، اس کے اصلی وطن مشرق میں عیار جیسی شریف برادری کی نوعیت محض ایک رہزن کے معنوں میں ، جیسا کہ ہم عطار کے ہاں دیکھتے ہیں ، مسخ ہو جاتی ہے ۔ بعد میں یہی لفظ نئے معنے پیدا کر لیتا ہے ۔ جن لوگوں نے داستان امیر حمزہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ عیار سے کیا مراد لی گئی ہے ۔ تفصیل کے لیے دیکھو 'قابوس نامہ' تالیف عنصرالمعالی امیر کیکاؤس ۔ (حاشیۂ مصنف)

کہنے لگی ''اے محمود ! اگر تو آج مجھ ضعیفہ کا ساتھ نہیں دیتا تو یاد رکھ کہ کل قیامت کے دن میں بھی تیرا ساتھ نہیں دوں گی ۔ آج تُو اپنا گھوڑا اس قدر تیز چلا رہا ہے کہ میں تیری گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتی ، لیکن وہ وقت یاد رکھ جب تو اپنا گھوڑا خواہ کتنا ہی تیز کیوں نہ چلائے، میری گرد تک بھی نہیں پہنچ سکے گا ۔ اے محمود ! اگر آج تو تعجیل نہیں کرے گا تو کل میں بھی تعجیل نہیں کروں گی اور تیرا ساتھ دوں گی ۔ پیر زال کے یہ ڈرانے والے جملے سن کر سلطان تھم گیا اور باقی راستہ اس کے ساتھ ساتھ طے کیا ۔ (الٰہی نامہ)

محمود ایک دن اپنی فوج کے ساتھ جا رہا تھا ۔ راہ میں سامنے سے ایک درویش آ رہا تھا ۔ جب برابر آیا : سلطان نے اس کو سلام کیا ۔ درویش سلام کا جواب دے کر بغیر کوئی بات کیے گزر گیا ۔ سلطان کو برا معلوم ہوا ۔ اپنے آدمیوں سے کہنے لگا : ''ذرا اس گدا کو دیکھنا ، کس قدر متکبر ہے ۔'' درویش نے بھی سلطان کے الفاظ سن لیے ، کہنے لگا ''اے سلطان ! تو ہی انصاف کر ۔ ہم دونوں میں گدا کون ہے اور متکبر کون ہے ؟ میں کم از کم ایک سو دس شہروں میں پھر چکا ہوں ۔ جہاں جہاں گیا ، تیرے گدا موجود دیکھے جو ہر گھر سے کوڑی کوڑی تیرے لیے وصول کر رہے تھے ۔ میں نے کوئی ایسا بازار اور دوکان نہیں دیکھی ، جہاں تیرے مظالم کا چرچا نہ ہو ۔ اب اگر چشمِ انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے گدا کون ہے[1] ۔ (الٰہی نامہ)

---

۱ ۔ اوحد الدین انوری غالباً اسی حکایت کے اثرات میں اپنا قطعہ مشہور لکھتا ہے ، جس کا پہلا شعر ہے :

آن شنیدستی کہ روزی زیرکی با ابلہی
گفت کین والی شہر ما گدای بی‌حیاست

(حاشیہ مصنف)

سلطان محمود ایک روز شکار کو گیا۔ جنگل میں اپنی فوج سے جدا ہو گیا اور بھٹک گیا۔ دیر تک پریشان پھرنے کے بعد اس کو ایک طرف اسی سی دھواں اٹھتا نظر آیا۔ آبادی کے خیال سے اسی طرف گھوڑا بڑھایا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک مقام پر آگ جل رہی ہے اور آگ کے پاس ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ سلطان وہاں پہنچ گیا اور بڑھیا سے بولا: ”بڑی بی! تمھارے ہاں پادشاہ مہمان آیا ہے۔ کہو یہ آگ کیوں جلا رکھی ہے؟“ بڑھیا نے کہا ”میں اپنے واسطے مونگ (ملک[۱]) ابال رہی ہوں۔“ سلطان نے کہا ”بڑی بی مجھے بھی تھوڑے سے مونگ دو۔“ بڑھیا نے کہا ”ہرگز نہیں۔ یہ مونگ میں نے اپنے لیے ابالے ہیں، نہ تیرے لیے۔ اگر تو اپنا ملک بھی میرے ملک (مونگ) کے عوض میں دے تو میں قبول نہیں کروں گی۔ اے محمود! جان لے، میرا ملک تیرے ملک سے ہزار درجے بہتر ہے۔ تیرے ملک کے ہزاروں دشمن ہیں لیکن میرے ملک کا کوئی بھی دشمن نہیں۔“ آخر میں بڑھیا نے کچھ مونگ اسے دیے۔ جب سلطان نے وہ مونگ کھائے تو وہ مونگ اس کو اپنے ملک سے زیادہ لذیذ معلوم ہوئے۔ رخصت ہوتے وقت سلطان ایک تھیلی دینار کی بڑھیا کو دیتا گیا۔

(الٰہی نامہ)

غزنین سے ایک مرتبہ سلطان ہندوستان کی جنگ کو گیا۔ اس دفعہ ہندو فوجوں کی کثرت تھی، جس سے محمود کو اپنی کامیابی کے متعلق بہت کچھ تذبذب پیدا ہو گیا۔ عین میدان جنگ میں اس نے نذر مانی کہ اگر اس جنگ میں کامیاب ہو گیا تو جس قدر مال غنیمت ہاتھ لگے گا، سب کا سب درویشوں، مسکینوں اور

۱۔ ملک بضم اول و ثانی زدہ نوعی از غلہ باشد کہ بہندی مونگ گویند۔ (حاشیۂ مصنف)

مستحقین کو خدا کی راہ میں دے دوں گا ۔ جب فتح ہو گئی تو مال غنیمت بے حد ہاتھ لگا ۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام مال درویشوں میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ میں نے نذر مانی ہے ۔ امرا نے عرض کی ''یہ دولتِ کثیر کیوں مفت میں درویشوں میں دی جاتی ہے ۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا ۔ بہتر یہ ہے کہ یا تو اسے سپاہ پر تقسیم کر دیا جائے یا سلطانی خزانے میں رکھا جائے تا کہ ضرورت کے وقت کام آ سکے ۔'' بادشاہ ان کے اصرار سے سراسیمہ ہو گیا ۔ اس عالم پریشانی میں ابوالحسن دیوانہ جو اُدھر سے گزر رہا تھا ، اس کو نظر آ گیا ۔ سلطان نے کہا ''اس دیوانے کو بلاؤ ، دیکھیں اس مقدمے میں اس کی کیا رائے ہے ۔ چونکہ شاہ و سپاہ دونوں سے الگ ہے اس لیے جو رائے دے گا ، بے غرض دے گا ۔'' ابوالحسن آیا اور سلطان نے تمام ماجرا اس کو سنایا ۔ دیوانے نے کہا ''جب خدا نے اپنی مدد دے کر تم کو فتح دلوا دی ہے تو اب پس و پیش کیا ۔ وہ تو اُسی کا کام ہے اور اُس نے کیا ہے ۔'' آخر سلطان نے وہ تمام مال خدا کی راہ میں خیرات کر دیا ۔

(منطق الطیر)

ایک شب محمود اپنی سپاہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا ۔ راہ میں اس نے ایک نیاریے کو دیکھا جس نے خاک چھان چھان کر مٹی کے تودے لگا دیے تھے ۔ سلطان نے اُس کی محنت اور افلاس سے متاثر ہو کر بازو سے جڑاؤ بازو بند کھولا اور خاک کے انبار پر پھینک کر گزر گیا ۔ دوسری رات اتفاقاً سلطان اُسی راہ سے دوبارہ گزرا ۔ کیا دیکھتا ہے کہ نیاریا حسب دستور اپنے کام میں مشغول ہے ۔ سلطان نے متعجب ہو کر اُس سے دریافت کیا ''کل جو چیز تم کو ملی ہے وہ ایک ملک کے خراج کے برابر قیمتی ہے ۔ کیا تم اس پر بھی قانع نہیں ہوتے ؟ میرا خیال تھا کہ تم امیرانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرو گے ۔'' نیاریے نے جواب دیا ''مجھ کو جو کچھ ملا ہے ، اسی خاک

سے ملا ہے اور جب میرا ستارہ اس خاک کے ذریعے سے چمکا ہے تو جب تک دم میں دم ہے مجھ کو اس خاک سے منہ موڑنا نہیں چاہیے ۔
(منطق الطیر)

سلطان محمود ایک روز کہیں سفر کر رہا تھا ۔ راستے میں اس نے کسی دھوبی کو کپڑے کی گٹھڑی سر پر لیے جاتے دیکھا ۔ بر سبیل مزاح پوچھنے لگا ''اس گانٹھ میں کتنے گز کپڑا ہے ؟'' دھوبی نے جواب دیا ''تمام گٹھڑی کا کپڑا پوچھنے سے حاصل ؟ تم کو اس میں سے صرف دس گز کپڑے کی ضرورت ہو گی ، اور جب یہ مقدار کفن کے لیے کافی ہے تو سارے کپڑے کی مقدار معلوم کرنا بے فائدہ ہے ۔'' یہ جواب سن کر سلطان پر رقت طاری ہوئی ۔ آگے بڑھا ، ایک خشت پز کو دیکھا جس کا چہرہ ہر وقت دھوپ میں کام کرنے سے بالکل سیاہ ہو گیا تھا اور جس نے اپنی محنت سے تمام میدان کو اینٹوں سے بھر دیا تھا ۔ سلطان نے اس سے بھی وہی سوال دہرایا اور کہا کہ یہ تمام اینٹیں کتنی ہیں؟ خشت پز نے کہا ''اے سلطان! تمام اینٹوں کا شمارہ دریافت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ تیرے لیے صرف دس اینٹیں کفایت کریں گی ۔ جب اس قدر درکار ہیں تو سب کی تعداد دریافت کرنے کی زحمت کیوں اٹھاتا ہے ۔ دس گز کفن اور دس اینٹوں کے سوا باقی سب وبال ہے ۔ دنیا سے تجھ کو انہیں اشیا کی ضرورت ہے ، باقی طمطراق ہے ۔ اے بادشاہ ! اپنے نفس کی باتوں پر عمل نہ کر ۔ دنیا فانی ہے ، موجودہ وقت غنیمت ہے بلکہ یہ سمجھ کہ ہاتھ سے گیا ۔'' بادشاہ یہ نصیحتیں سن کر بہت متاثر ہوا ۔ گھوڑے سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا ۔ جب طبیعت یکسو ہوئی ، اس نے ان دونوں شخصوں کو بہت انعام دیا ۔
(الٰہی نامہ)

سلطان محمود پچاس سواروں کے ساتھ شکار سے واپس آ رہا تھا ۔

راہ میں ایک مقام پر پڑاؤ کیا اور خیمہ نصب کر دیا گیا ۔ ملازم شکار کا گوشت بھوننے کی تیاری میں مصروف ہو گئے ۔ سلطان نے راستے پر ایک ضعیف بوڑھے ہیزم کش کو جاتے دیکھا جو پشت پر لکڑیوں کے وزن کی وجہ سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا ۔ محمود کو رحم آیا ، لپک کر اس کے پاس گیا ، پوچھا ”بڑے میاں ! ان لکڑیوں کی بھاری کی کیا قیمت ہے ؟“ بوڑھا اس معاملے سے بےخبر تھا کہ سوال کرنے والا خود سلطان محمود ہے ۔ بولا ”اے امیر! ان کی قیمت دو جو[1] (سیم) ہے اور اسی مول پر تمھیں دینے کے لیے تیار ہوں ۔“ بادشاہ نے ایک تھیلی ، جس میں سو دینار تھے نکالی ، جس میں ہر ریزگاری دو جو کی قیمت سے زیادہ کی تھی ۔ سلطان نے تھیلی کھول لی اور بوڑھے کے سامنے بیٹھ گیا ۔ ایک ریزگاری نکالی اور اس کے ہاتھ میں دی۔ پوچھا ”کیا یہ دو جو کے برابر ہے؟ اگر ہے تو لے لے ۔“ بوڑھے نے کہا ”یہ تو دو جو سے زیادہ ہے ۔ اگر ترازو ہوتی تو تول لیتے ۔“ پادشاہ نے دوسرا ٹکڑا نکال کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھا اور کہا ”اچھا یہ تو دو جو کے برابر ہوگا ۔“ بوڑھے نے جواب دیا ”صاف ظاہر ہے، یہ بھی زیادہ ہے ۔“ سلطان نے ایک اور ٹکڑا اٹھا کر دیا اور دریافت کیا ”اچھا اس کے لیے تمھاری کیا رائے ہے؟“ بوڑھے نے کہا ”یہ بھی بڑا ہے ۔“ قصہ مختصر، ایک ایک کر کے تھیلی کے تمام سکے سلطان نے اس کو دے دیے ، جب تھیلی خالی ہو گئی ، وہ بھی اسی کو دے دی اور بولا ”تم یہ سب شہر کو لے جاؤ ، وہاں ترازو مل جائے گی تو تول لینا ، اپنے دو جو لے لینا اور باقی نقدی سلطان کے حاجب کے پاس پہنچا دینا ۔“ بوڑھا مانتا نہیں تھا لیکن جب سلطان

---

۱ ۔ ’دو جو‘ یعنی اتنی چاندی جو وزن میں دو جو کے برابر ہو ۔ اس سے کم قیمت شے مراد لی جاتی ہے :

جملہ گیتی ز کہن تا بنو
چون گذرانست نیرزد دو جو (حاشیۂ مصنف)

تھیلی پھینک کر اٹھ آیا ، مجبوراً اس نے تھیلی اٹھائی اور چلا گیا ۔ دوسرے دن جب دربار لگ رہا تھا ، بوڑھا حاجب کی تلاش میں دربار میں آ گیا ۔ جب اس نے سلطان کو تخت پر بیٹھے دیکھا ، رعب سے کانپنے لگا ۔ پہچان گیا کہ کل جس نے مجھ سے لکڑیاں خریدی تھیں ، خود سلطان تھا ۔ جب محمود کی نگاہ بوڑھے پر پڑی ، اسے اپنے پاس بلوایا اور سامنے کرسی پر بٹھا لیا اور پوچھا ''کہو تم نے کل کا معاملہ طے کر لیا ہے؟'' بوڑھے نے شکایت کی ''اے سلطان ! گزشتہ شب میں بالکل بھوکا سویا ۔'' سلطان نے پوچھا ''کیوں؟'' بوڑھے نے جواب دیا ''اے سلطان ! تو نے اپنی بیع کل ختم نہیں کی تھی ۔ کیا تو نے مجھے بھی اپنی طرح مال دار سمجھا تھا جو مفت بھوکے مارا؟'' سلطان مسکرایا اور معافی مانگ کر بولا ''اچھا یہ تھیلی تم ہی لے لو ۔'' بوڑھے نے کہا ''اے پادشاہ ! جب یہ روپیہ مجھے ہی دینا منظور تھا تو کیا کل نہیں دیا جا سکتا تھا ، جب ایک ایک کر کے ساری رقم میرے ہاتھ پر دھری جا رہی تھی ؟'' سلطان نے کہا ''اے بوڑھے ! یاد نہیں کل تو مجھے امیر کے خطاب سے یاد کر رہا تھا ۔ تجھے کیا معلوم تھا کہ میں پادشاہ ہوں ۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ تجھ کو کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ میں پادشاہ ہوں ۔ آج یہ بات تجھے معلوم ہو گئی ، اب تو جو چاہے ، تیری حاجت روا کرنے کے لیے تیار ہوں ۔''

رابعہ بنت الکعب القزداری

(بعض شعرائے فارسی کے متعلق شیخ عطار کے بیانات)

(از اورینٹل کالج میگزین بابت مئی سنہ ۱۹۲۵ع)

عطار کی مثنویات کی حکایات ، جیسا کہ میں اسی میگزین کی ایک گذشتہ اشاعت میں اشارہ کر چکا ہوں ، زیادہ تر تاریخی واقعات پر اساس پذیر ہیں ۔ ان میں اتفاقیہ بعض شعرا کے حالات پر بھی جدید روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اگرچہ میرا مطالعہ تمام مثنویاتِ عطار پر محیط نہیں ہے اور نہ شیخ کا سارا کلام میری نظر سے گزرا ہے ، تاہم جو چند واقعات شعرا کے حالات کے متعلق آن کی بعض مثنویوں میں دامن گیرِ نظر ہوئے ہیں ، ذیل میں حوالۂ قرطاس کیے جاتے ہیں ۔ ان کی ضرورت اس لحاظ سے کم نہیں مانی جا سکتی کہ یہ حالات ہمیں اور ذرائع سے بھی معلوم ہیں ۔ یہ اگرچہ صحیح ہے لیکن ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اور مآخذ جو ہمارے پاس ہیں ، بہت بعد کے زمانے سے علاقہ رکھتے ہیں ، جب کہ عطار کے یہ بیانات عہد مغول سے اقدم دور میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔ صرف ایک یہی واقعہ ان کی اہمیت کو بے حد قابل قدر بنا دیتا ہے ۔

سب سے پیشتر میں دختر کعب کے حالات کو لیتا ہوں ؛ اس شاعرہ کے بہت کم حالات سے ہم واقف ہیں اور ان کی نسبت بھی مورخین میں سخت اختلاف ہے ۔ صوفیائے کرام جب کہ اس کے اعلیٰ اخلاقی معیار اور معنویت کے قائل ہیں ، غیر صوفی حلقوں میں اس کو ایک شاہد باز عورت تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح اس کے زمانے میں بھی اختلاف ہے ۔ اہل تصوف اس کو آدم الشعرا

استاد رودکی کی معاصر مانتے ہیں لیکن محمد عوفی نے 'لباب الالباب' میں آل سبکتگین کے دور کی شاعرہ بیان کیا ہے - اسی طرح مقدم الذکر اس کے قتل کو شہادت کا درجہ دینے کے لیے تیار ہیں اور موخرالذکر اس قتل کو جائز کہتے ہیں - میں یہاں محمد عوفی اور مولانا جامی کے بیانات بالمقابل درج کیے دیتا ہوں ، جس سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ دونوں روایات میں کس قدر حقیقی بُعد ہے :

"رابعہ بنت کعب القزداری

دختر کعب اگرچہ زن بود اما بفضل بر مردمان جہان بخندیدی ، فارسِ ہر دو میدان و والیِ ہر دو بیان ، بر نظم تازی قادر و در شعر پارسی بغایت ماہر و با غایت ذکاء خاطر و حدت طبع پیوستہ عشق باختی و شاہد بازی کردی و او را مگس روئین[1] خواندی و سبب این نیز آن بود کہ وقتی شعری گفتہ بود :

خبر دہند کہ بارید بر سر ایوب
ز آسمان ملخان و سر ہمہ زرین

---

۱ - "عربوں میں عام دستور تھا کہ شعرا کو بعض الفاظ کی بنا پر ، جو ان کے اشعار میں آئے ہوں ، ایک لقب دے دیا جائے ، مثلاً متلمس کو یہ نام یوں ملا کہ اس نے ایک شعر میں کہہ دیا تھا :

و هذا اوان العرض حی ذبابہ
زنابیرہ والازرق المتلمس

اسی طرح شعرائے ذیل ملقب ہوئے :

المرقش ، مزرد ، المستوغر ، المثقب ، الممزق ، جران العود ، مدرج الریح ، صریع الغوانی - مگس روئین کا لقب رابعہ کو بھی اسی عربی سنت کی تقلید میں ملا -"

(یہ حاشیہ مولوی محمد شفیع مرحوم کا لکھا ہوا ہے جو اس مضمون کی اشاعت کے وقت اورینٹل کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے - مرتب)

اگر ببارد زرین ملخ برو از صبر
سزد کہ بارد بر من یکی¹ مگس روئین"
(لباب‌الالباب ، محمد عوفی ، صفحہ ۶۱ ، طبع یورپ)

"دختر کعب رحمہااللہ تعالیٰ

شیخ ابو سعید ابو الخیر قدس اللہ تعالیٰ سرہ گوید کہ دختر کعب عاشق بود بر آن غلام ، اما پیران ہمہ اتفاق کردند کہ این سخن کہ او میگوید نہ آن سخن باشد کہ بر مخلوق توان گفت ۔ او را جدٗ دیگر کار افتادہ بود ، روزی آن غلام دختر را دریافت سر آستین وی بگرفت ، دختر بانگ بر غلام زد و گفت ترا این بس نیست کہ من با خداوندم و آنجا مبتلایم بر تو بیرون دادم کہ طمع میکنی ۔ شیخ ابو سعید گفت ، سخنی کہ او گفتہ است نہ چنانست کہ کسی را در مخلوق افتادہ باشد ۔"
(نفحات الانس ، مولانا جامی ، از نسخہٗ قلمی)

اب شیخ عطار نے اپنی تصنیف 'الٰہی نامہ' میں اس شاعرہ کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں ، جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت حسین و جمیل عورت تھی ۔ حسنِ ظاہری کے ساتھ ساتھ جمالِ معنوی سے بھی متصف تھی ۔ بدیہہ گوئی میں ممتاز اور اپنے عہد کے مشاہیر شعرا میں شمار ہوتی تھی ۔ اس نے فن شعر کو اپنے عشقیہ جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا ۔ شعر میں اس کا درجہ اس قدر بلند تھا کہ اس نے کامیابی کے ساتھ استاد رودکی کے ساتھ مشاعرے کیے ہیں ۔ خود رودکی اس کے کلام کی بابت نہایت اعلیٰ رائے رکھتا تھا ۔ حسن اور شاعری کے اوصاف کے علاوہ نقاشی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا ۔ ایک اور ممتاز خصوصیت ، جس نے اس کو اپنی جنس پر نمایاں تفوق بخشا

---

۱ - مجمع الفصحا (۱ : ۲۲۲) ن بسی ۔ (حاشیہٗ مصنف)

تھا ، یہ تھی کہ وہ مردانہ شجاعت اور فنون سپہ گری سے بدرجۂ کمال آراستہ تھی - وہ خود جنگوں میں شریک ہوئی ہے اور دشمنوں میں گھس کر ان کی صفیں توڑ دی ہیں اور رجزیہ اشعار سے اپنی فوجوں کا دل بڑھا کر فتح و نصرت کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے - صرف اسی معرکے میں جس کا ذکر عطار نے کیا ہے ، اس نے دس آدمی اپنے ہاتھ سے قتل کیے ہیں - ہمیں تو تعجب ہوتا ہے کہ ایسے نسوانی اور مردانہ اوصاف والی شخصیت اس قدر نامعلوم ہو اور اس کے واقعات و حالات پر گم‌نامی کا پردہ پڑا رہے - زین عرب (عطار اس کا یہی نام بتاتے ہیں) یقیناً اس سے بہتر قسمت کی مستحق تھی لیکن مشرق اپنے جماعتی ضوابط اور مراسم کی پابندی میں ہمیشہ سخت رہا ہے - اس کے نزدیک عورت کا عشق مرد کے حق میں ، خواہ روحالیت کا پہلو ہی کیوں نہ لیے ہوئے ہو ، بے حد معیوب ہے اور زین عرب اس جماعتی تعصب کی قربان گاہ پر ایک قربانی بنائی گئی ہے - اس کا نام اس کے بھائی حارث بن کعب کے ایک غلام بکتاش کے عشق کے لیے رسوا ہے ، حتیٰ کہ اس کا قتل بھی اس گناہ کا کفارہ تسلیم نہیں کیا گیا - بیدرد مشرق اس بارے میں اپنے مقولۂ ''من عشق و عف و کتم و مات فمات شہیداً'' کو بھی فراموش کر گیا - چنانچہ عوفی کے بیانات محض صدائے باز گشت ہیں اس رائے کی جو اس کے ہم‌وطنوں نے اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی نہیں بدلی -

زین عرب کے زمانے کے متعلق اس قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ عوفی کے اثرات میں میرا اب تک بھی خیال تھا کہ وہ آل ناصر کے عہد کی شاعرہ ہے لیکن عطار کے بیانات اس عقیدے کی بابت کوئی شبہ باقی نہیں چھوڑتے کہ اس کا شمار رودکی کے معاصرین میں ہونا چاہیے - کعب ، جس کو عوفی قزدار کے ساتھ

وابستہ کرتا ہے ، غالباً کوئی عرب[1] رئیس تھا جو آل سامان کے عہد میں ہوا ہے ، کیونکہ آل غزنہ کے عہد میں قزدار کے ذکر میں اس کے رئیس کعب اور اس کے جانشین حارث کا کہیں ذکر نہیں آتا ، جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس عہد سے اقدم ہے۔ شاہ بخارا سے شیخ عطار کی مراد غالباً سامانی پادشاہ نصر بن احمد ثانی المتوفیٰ ۳۳۱ھ سے ہے ، جس کے ماتحت یہ قزداری رئیس تھا اور اسی بنا پر امیر بخارا اس کی امداد کے لیے فوج بھیجتا ہے۔ رودکی المتوفیٰ ۳۲۹ھ کی شخصیت کے متعلق ، جس کو عطار نے ایک جگہ استاد بھی لکھا ہے ، کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق نصر بن احمد کے دربار سے ، جس کا پایۂ تخت بخارا ہے ، ظاہر ہے۔ عطار کے بیان میں قدم قدم پر واقعیت کا رنگ جھلک رہا ہے اور قصے کے تار و پود میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس کو غیر معمولی یا خلاف قیاس کہا جا سکے۔ واقعات کی ساری کڑیاں قدرتی طور پر کچھ اس طرح سے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ خواہ مخواہ طبیعت ان پر یقین لانے کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔ قصہ مختصر ، یہ سب باتیں اس امر کی دلالت کرتی ہیں کہ شیخ عطار نے زین عرب کے حالات کسی تاریخی ماخذ سے حاصل کیے ہیں ، جو ہمارے عہد تک محفوظ نہیں رہا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک موقعے پر انھوں نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کی روایت بیان کی ہے ، جو جامی کے ہاں بھی موجود ہے۔ اس کے بعد اصل حکایت بہ سبیل اختصار ذیل میں حوالۂ قلم کی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ اصل حکایت بہت لمبی ہے اور میں نے صرف ایسے اشعار پر قناعت کی ہے جو قصے کے خط و خال ظاہر کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ حدودِ بلخ میں کعب نام ایک رئیس تھا ،

---

۱ - صاحب مجمع الفصحا ، جلد ۱ ، صفحہ ۲۲۲ پر کعب کی نسبت کہتا ہے کہ وہ ''در اصل از اعراب بودہ در بلخ و قزدار و بست و حوالی قندہار و سیستان و حوالی بلخ کامرانیہا نمودہ۔'' (حاشیۂ مصنف)

جس کے ایک فرزند تھا ۔ اس کا نام حارث تھا :

امیری سخت عالی رای بودی
کہ اندر حد بلخش جای بودی
بعدل و داد امیری پاک دین بود
کہ جد او ملک زاد زمین بود[1]
بمردی و بہ لشکر صعب بودی
بنام آن کعبۂ دین کعب بودی

امیر نیک دل را یک پسر بود
کہ در عالم بخوبی در سمر بود
نہادہ نام حارث شاہ او را
کمر بستہ چو جوزا ماہ او را

اس امیر کی ایک دختر بھی تھی جس کا نام زین عرب تھا ، جو بے حد حسین اور باپ کی لاڈلی تھی ۔ اس کے حسن و جمال کا چرچا دور دور پھیلا ہوا تھا ۔ ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھی ۔ جو بات سنتی اس کو معاً رشتۂ نظم میں لے آتی :

یکی دختر بہ پردہ بود نیزش
کہ چون جان بود شیرین و عزیزش
بنام آن سیم بر زین عرب بود
دل آشوبی و دلبندی عجب بود
خرد در عشق او دیوانہ بودی
بخوبی در جہان افسانہ بودی

---

۱ ۔ الٰہی نامہ طبع استنبول ، سنہ ۱۹۴۰ع میں ''حکایت امیر بلخ و عاشق شدن دختر او'' صفحہ ۳۳۰ - ۳۵۲ پر موجود ہے ۔ اس اشاعت میں یہ مصرع یوں درج ہے :

''کہ حد او فلک را در زمین بود''. (مرتب)

مہ نو گر بدیدی ز آسمانش
زدی چون چنگ زانو ہر زمانش

چو تیر غمزۂ او سر بزہ کرد
دل عشاق را آماجگہ کرد

لب لعلش کہ جام گوہری بود
شرابش از زلال کوثری بود

جمالش را صفت کردن محالست
کہ از من آن صفت کردن خیالست

بلطف طبع او مردم نبودی
کہ ہر چیزی کہ از مردم شنودی

ہمہ در نظم آوردی بیک دم
کہ پیوستی چو مروارید برہم

چنان در شعر گفتن خوش زبان بود
کہ گوئی از لبش طعمی در آن بود

پدر پیوستہ دل بر کار او داشت
بدلداری بسی تیمار او داشت

جب کعب کی وفات کا زمانہ قریب آیا ، اس نے حارث کو اپنے پاس بلا کر وصیت کی کہ میں اپنی اس قرۃالعین کو تیرے سپرد کرتا ہوں ۔ تجھ کو چاہیے کہ ہمیشہ اس کی دل‌جوئی میں مصروف رہے اور اس کی خوشنودی کا جویا رہے ۔ جلیل‌القدر رؤسا اور سلاطین نے مجھے اس کے ہاتھ کے لیے درخواست کی لیکن مجھ کو یہ لڑکی اس قدر عزیز تھی کہ ہمیشہ انکار کردیا ۔ لیکن میرے بعد اگر کوئی اس کے پایے کا بر ملے تو اس کی شادی کر دینا ۔ اس کو تکلیف دے کر میری روح کو مت کلپانا ۔ میرے اور تیرے درمیان خدا ہے :

بدو بسپرد دختر را کہ زنہار
زمن بپذیرش و تیمار می دار

ز هر وجهی که باید ساخت کارش
بساز و تازه گردان روزگارش
که از من خواستندش نامداران
بسی گردن کشان و شهریاران
ندادم من بکس، گر تو توانی
که شائسته کسی یابی تو دانی
گواه این سخن کردم خدا را
بشولیده مگر دان جان مارا

اس وصیت کے بعد کعب کا انتقال ہوگیا اور حارث اس کا جانشین بن گیا ۔ اس نے اپنی رعیت اور لشکر کو بہت خوش رکھا اور باپ کی وصیت پر عامل ہوکر بہن کی خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا :

بخوبی و بناز و نیک نامی
چو جان میداشت خواهر را گرامی

حارث کے ایک نہایت خوب صورت غلام تھا ۔ اس کا نام بکتاش تھا ۔ متعدد اشعار میں بکتاش کے حسن و جمال کا ذکر ہے ، جن کو میں ترک کرتا ہوں ۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ حارث اپنے محل کے پیش باغ میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا ۔ غلام صف بستہ اس کے گرد کھڑے تھے ۔ ندیم اور وضیع و شریف حسب مراتب استادہ تھے اور دربار ہو رہا تھا ۔ زین کسی ضرورت سے کوٹھے پر چڑھی اور چاروں طرف دیکھنے لگی ۔ اتنے میں اس کی نظر بکتاش پر پڑی اور ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگئی ۔

مگر بر بام آمد دختر کعب
شکوه حسن در چشمش بسی صعب[1]

---

۱ ۔ اشاعت استنبول میں :
''شکوه چشن در چشم آمدش صعب'' (مرتب)

چو لختی کرد هر سوی نظاره
بدیدش آن غلام ماه پاره[1]
چو روی و عارض بکتاش دید او
چو سروی در قبا بالاش دید او
جهان حسن وقف چهرهٔ او
همه خوبی، چو یوسف بهرهٔ او
ز مستی روی چون گلنار کرده
مژه در چشم عاشق خار کرده
شکر از چشمهٔ نوشین فشانده
عرق از ماه بر پروین فشانده
بدان خوبی چو دختر روی او دید
دل خود وقف یک یک موی او دید
در آمد آتشی از عشق زودش
بغارت برد کلی هرچه بودش
چنان آن آتشش در جان اثر کرد
که آن آتش تنش را بی خبر کرد
دلش آتش شد و جان متهم گشت
ز سر تا پا وجود او عدم گشت

زین، بکتاش کے عشق میں اس قدر بے تاب ہوئی کہ آخر بیمار پڑ گئی - طبیب آیا، علاج ہونے لگا لیکن بے سود - آخر دایہ نے اس پُر اسرار بیماری کے متعلق اس سے سوالات کیے - پہلے تو چھپاتی رہی، آخر میں اقرار کیا کہ اسے بکتاش سے محبت ہے :

درون پردہ دختر دایہ ای داشت
کہ در حیلہ‌گری سرمایہ ای داشت

---

۱ - طبع استنبول میں :
''بدید آخر رخ آن ماہ پارہ'' (مرتب)

بصد حیلہ ازان مہ روی درخواست
که ای دختر چہ افتادت بگو راست
نمی آمد مقر البتہ آن ماہ
مقر آمد زبان بکشاد آن گاہ[1]
که من بکتاش را دیدم فلان روز
بزلف و چہرہ جان سوز و دل افروز
چنان عشقش مرا بی خویش آورد
که صد سالہ غمم در پیش آورد

بالآخر یہ قرارداد ٹھہری کہ دایہ میانجی گری کرے اور زین کا خط بکتاش کے پاس پہنچا دے ۔ چنانچہ خط لکھا گیا جس کو قلم انداز کیا جاتا ہے ۔ خط کے ساتھ ہی زین نے اپنی ایک تصویر ، جوخود اس نے اپنے ہاتھ سے اتاری تھی ، روانہ کی ۔ جب یہ خط اور تصویر بکتاش کے پاس پہنچے، اس نے وہ شور انگیز اشعار پڑھے اور تصویر دیکھی ، دنگ رہ گیا اور تیغ عشق کا گھائل ہوگیا :

نوشت این نامہ و بنگاشت آنگاہ
یکی صورت ز نقش خویش چون ماہ

بدایہ داد تا دایہ روان شد
بر آن ماہروی مہربان شد

چو نقش او بدید و شعر بر خواند
ز لطف طبع و نقش او عجب ماند

بیک ساعت دل از دستش برون شد
چوعشق آمد دل خوش داشت خون شد[2]

بکتاش نے دایہ سے کہا کہ میری طرف سے عرض کر دینا کہ

---

۱ ۔ اشاعت استنبول میں :
''بآخر هم زبان بکشاد ناگاہ'' (مرتب)

۲ ۔ الٰہی نامہ طبع استنبول میں : ''دل او بحر خون شد'' (مرتب)

اب مجھے تمھارے بغیر تاب ضبط نہیں ۔ اگر دیدار دکھا دو ، احسان ہوگا ورنہ آپ جانیں ۔ دایہ یہ پیغام لے کر واپس آئی اور زین سے کہنے لگی :

کہ او از تو بسی عاشق تر افتاد
کہ از گرمیِ دل آتش در افتاد

زین بہت خوش ہوئی اور اب رات دن عشقیہ نظمیں لکھنے میں مصروف رہتی اور جو کچھ لکھتی بکتاش کے پاس بھیج دیتی :

دل دختر بغایت شادمان شد
ز شادی اشک بر رویش روان شد
نمی دانست کاری آن دل افروز
بجز بیت و غزل گفتن شب و روز
روان می کرد شعر و می فرستاد
نہادہ بود خود را این بر استاد[1]

اس مشغلے میں ایک مدت گزر گئی ۔ ایک روز زین عرب محل کی دہلیز تک آئی ۔ بکتاش چوں کہ تصویر کے ذریعے اس کی صورت سے واقف تھا اس لیے صورت دیکھتے ہی پہچان لیا ، جھپٹا اور دامن پکڑ لیا ۔ زین برہم ہوئی ۔ کہنے لگی : "اے بے ادب! تیری یہ مجال ہے کہ میرے دامن کے ہاتھ لگائے ؟ تیرے تو سایے تک کو بھی میرے قریب نہیں آنا چاہیے :

بدین چون مدتی بگذشت ، یک روز
بدہلیزی برون شد آن دل افروز
بدیدش ناگہی بکتاش و بشناخت
کہ عمری عشق با نقش رخش باخت
گرفتش دامن و دختر بر آشفت
بر افشاند آستین آنکہ بدو گفت

---

۱ ۔ اشاعت استنبول میں :
"بخواندہ بود ، گفتی ، آن بر استاد"۔ (مرتب)

که هان ای بی ادب این چه دلیریست
تو روباهی ، ترا چه جای شیریست
که باشی تو که گیری دامن من
که نرسد سایه ات پیراهن من

غلام نے ملتجیانہ لہجے میں عرض کی کہ جب مجھ پر نامہربانی ہے اور چہرہ دکھانا مقصود نہیں ہے تو آخر اس تصویر اور اشعار بھیجنے اور مجھ کو دیوانہ بنانے کا کیا مقصد تھا ؟ زین نے جواب دیا کہ اس راز کو تو کیا جانے۔ میرے دل کا ایک معاملہ ہے جو تجھ پر ظاہر کر دیا ہے - پس تیرے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ اس سلسلے میں تو ایک بہانہ بنا لیا گیا ہے :

غلامش گفت ای من خاک کویت
چه میکردی از من پوشیده رویت
چرا شعرم فرستادی شب و روز
دلم بردی بدان نقش دل افروز
چو در اول مرا دیوانه کردی
چرا در آخرم بیگانه کردی
جوابش داد آن سیمین بر آنگاه
که یک ذره نه ای تو زین سر آگاه
مرا در سینه کاری اوفتاده است
و لیکن بر تو آن کارم کشاده است
چنین کارم چه جای صد غلام است
بتو دادم برون آنم تمام است
ترا آن بس نباشد در زمانه
که تو این کار را باشی بهانه؟
بکفت این و از پیش او بدر شد
بصدق دل غلامش فتنه تر شد

---

۱ - ''چو می‌داری'' (مرتب)

شیخ عطار فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ابو سعید مہنہ کے ملفوظات میں دیکھا ہے ؛ وہ لکھتے ہیں کہ میں ان حدود میں گیا اور دختر کعب کے حالات کے متعلق استفسار کیا کہ آیا اس کا عشق حقیقی تھا یا مجازی ؟ میری تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اشعار اس نے لکھے ہیں وہ عشق مجازی کے موثرات میں نہیں لکھے جاسکتے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مخلوق سے ان اشعار کو کوئی علاقہ نہیں تھا بلکہ عشق حقیقی ان کا مقصود تھا ۔ معنویت میں دختر کعب کو کمال تھا اور وہ غلام محض ایک بہانہ تھا :

ز لفظ بو سعید مہنہ دیدم
کہ او گفتہ است من آنجا رسیدم

بپرسیدم ز حال دختر کعب
کہ عارف بود او یا عاشق صعب

چنین گفت او کہ معلومم چنان شد
کہ آن شعری کہ از طبعش روان شد

ز سوز عشق معشوق مجازی
نہ بکشاید چنان شعری ببازی

نداشت آن شعر با مخلوق کاری
کہ او را بود با حق روزگاری

کمالی بود در معنی تمامش
بہانہ آمدہ در رہ غلامش

قصہ مختصر زین عرب آہ و زاری کرتی اور دل گداز اشعار پڑھا کرتی :

بآخر دختر عاشق در آن سوز
بزاری شعر میگفتی شب و روز

ایک دن وہ باغ میں ٹہل رہی تھی اور اشعار ذیل پڑھ رہی تھی :

الا ای باد شبگیری گذر کن
ز من آن ترک یغما را خبر کن

بگو کز تشنگی آیم تو بردی
چو تشنہ کردیم آیم بہ بردی[1] (کذا)

شدنی امر ، اس کا بھائی حارث بھی باغ میں موجود تھا اور فاصلے پر چمن میں پھر رہا تھا ۔ اس نے بہن کو اشعار پڑھتے سنا ۔ برہم ہو کر کہنے لگا "بہن! کیا واہیات بک رہی ہو۔" زین نے جب دیکھا کہ یہ اشعار بھائی کے گوش گزار ہو گئے ہیں ، فوراً بات بنائی اور کہنے لگی "بھلا بھائی جان ! ان اشعار کے پڑھنے میں کیا خرابی ہے ۔ ذرا پھر سنو ۔" یہ کہا اور ضروری تبدیلی روشناس کر کے اس طرح پڑھا :

الا ای باد شبگیری گذر کن
ز من آن سرخ سقا را خبر کن
بگو کز تشنگی آبم تو بردی
ببردی آبم و آبم تو بردی (کذا)

ان کے ہاں ایک سقا تھا جو "سرخ سقا" کے نام سے مشہور تھا اور دن بھر پانی بھرتا رہتا تھا ۔ حارث نے جب اس تغیر کے ساتھ یہ ابیات سنے تو کوئی اعتراض نہیں کیا ۔ سمجھا کہ مجھی کو غلط فہمی ہوئی تھی ۔ خیر یہ معاملہ اس طرح ختم ہو گیا ۔ اس واقعے کے ایک ماہ بعد ایک غنیم حارث پر چڑھ آیا ۔ حارث اپنی فوجیں لے کر مقابلے کے لیے نکلا اور لڑائی زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ۔ ایک طرف حارث ، دوسری طرف بکتاش داد شجاعت دے رہے تھے ۔ آخر ایک تیر بکتاش کے سر پر آ کر لگا ۔ وہ تیورایا اور قریب تھا کہ دشمن اسے گرفتار کر لیں :

وزان سوی دگر بکتاش مہروی
دو دستہ تیغ میزد از ہمہ سوی

---

[1] ۔ الٰہی نامہ طبع استنبول میں یہ مصرع یوں درج ہے ، جو درست معلوم ہوتا ہے :
"ببردی آبم و خوابم ببردی"
(مرتب)

باخر چشم زخمی کارگر شد
سرش از زخم تیری سخت در شد
همی نزدیک شد کان سرو رفتار
بدست دشمنان گردد گرفتار

ادھر زین عرب بھیس بدلے اور منہ چھپائے مسلح ہوکر میدان میں آئی - آتے ہی اپنی فوج کو للکارا کہ کیا کاہلی کے ساتھ جنگ کر رہے ہو اور رجزیہ اشعار پڑھ کر اُن کے دلوں کو گرما دیا - پھر آپ آگے بڑھی اور دشمنوں پر حملہ کر دیا - اُن کے دس آدمی زین نے اپنے ہاتھ سے قتل کیے - اتنے میں اُس کی نظر زخمی بکتاش پر پڑی - اپنے عشق کے موضوع کو گھائل دیکھا ، بے تاب ہو گئی - دشمنوں کے نرغے میں سے اسے اٹھایا اور اپنی صفوں میں پہنچا کر آپ غائب ہوگئی - سارا لشکر حیران تھا کہ یہ روپوش بہادر سپاہی کون تھا جو دشمن کی صفوں میں تہلکہ ڈال کر یکایک غائب ہوگیا :

در آن صف بود دختر روی بسته
سلاحی داشت و اسپی تنگ بستہ[1]

بہ پیش صف درآمد همچو کوهی
وزو افتاد در هر دل شکوهی

نمی دانست کس کان سیم بر کیست
زبان بکشاد و گفت ، این کاهلی چیست

اگر شمشیر بر آن برکشم من
جگر از شیر غرّان برکشم من

چو مرغ تیر من از زه بر آید
ز حلق مرغ گردون زه برآید

چو مار رمح را در کف بہ پیچم
نیاید هیچ کس در صف بہ هیچم

---

۱ - ”بر اسپی نشستہ -“ (مرتب)

بکفت این و چو مردان درشت او
ازان مردان تن ده را بکشت او
بر بکتاش آمد تیغ در کف
بر آنجا بر گرفتش برد در صف
نهادش پس نہان شد از میانہ
کسش نشناخت از خلق زمانہ

اتنے میں شاہ بخارا کی امدادی فوج بھی آ گئی ، جسے دیکھ کر دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور حارث کی فوجیں ظفریاب ہوگئیں ۔ جب حارث شہر میں واپس آیا تو اس نے اس نامعلوم سوار کو تلاش کروایا جو اس قدر بہادری سے لڑ کر غائب ہوگیا تھا ، لیکن اس کا سراغ نہ چل سکا :

چو حارث را مدد گشت آشکارا
بسی خلق از بر شاہ بخارا
درآمد لشکری از کوہ و از دشت
کزان کثرت سر افلاک پُر گشت
چو حارث آن مدد در حال دریافت
سپاہ حارث و حارث ظفر یافت
چو شہ با شہر آمد شاہ پیروز
طلب کرد آن سوار چست آن روز
نداد از وی نشانی ہیچ مردم
ہمہ گفتند شد ہمچو پری گم

رات کو زین نے اپنی دایہ کے ہاتھ بکتاش کے نام ایک خط بھیجا ۔ بکتاش کو اس خط کے آنے سے بے حد خوشی ہوئی ۔ جب کچھ روز بعد بکتاش اچھا ہونے پر آیا :

چو زاغ شب در آمد آن دلارام
دل دختر چو مرغی بود در دام

دل از زخم غلامش آن چنان سوخت
که در یک چشم زخمش سر جان سوخت
کجا می شد دل او آرمیده
یکی نامه نوشت از خون دیده
روان شد دایه و این نامه هم برد
بسر شد، راه بر سر چون قلم برد
سر بکتاش با چندین جراحت
ز سر نامه مرهم یافت و راحت
ز چشمش گشت سیل خون روانه
بسی پیغام دادش عاشقانه
چو روزی چند آن بکتاش دمساز
ز مجروحی بجای خویش شد باز

ایک دن استاد رودکی کا ادھر گزر ہوا ۔ جب استاد نے زین کی شاعری کی شہرت سنی ، امتحاناً اس کو شعر لکھ کر بھیجے اور زین نے ان کا جواب اعلیٰ اشعار سے دیا ۔ رودکی اس کی جودت طبع کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ اسی سلسلے میں استاد کو اس واقعے کی بھی اطلاع دی گئی کہ وہ ایک غلام پر عاشق ہے :

براهی رودکی می رفت یک روز
نشسته بود آن دختر دل افروز
اگر بیتی چو آب زر بگفتی
بسی بهتر ازان، دختر بگفتی
بسی اشعار گفت آن روز استاد
که آن دختر مجاباتش فرستاد
ز لطف طبع آن دلدار و دمساز
تعجب ماند آنجا رودکی باز
ز عشق آن سمن بر گشت آگاه
نهاد آنگه از آنجا پای در راه

جب رودکی بخارا پہنچا ، شاہی دربار میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ اس جشن میں حارث بھی شریک تھا جو امدادی فوج کے شکریے کے لیے بذات خود دربار میں حاضر ہوا تھا ۔ مجلس میں شراب کا دور چل رہا تھا ، لوگ نیم مست سے ہونے لگے تھے ۔ جب رودکی سے شعر پڑھنے کی درخواست کی گئی ، نشے کی کیفیت میں استاد نے زین عرب کے اشعار پڑھنے شروع کر دیے ۔ مجلس میں بڑی تعریف ہوئی ۔ امیر بخارا نے دریافت کیا کہ استاد ! یہ کس کے اشعار ہیں ؟ رودکی نے مستی کے عالم میں ، حالیکہ حارث کی موجودگی کا اس کو علم نہ تھا ، کہہ دیا کہ یہ دخترِ کعب کا کلام ہے ۔ وہ ایک غلام پر عاشق ہے ۔ جو کچھ لکھتی ہے اسی کے عشق میں لکھتی ہے اور اسی کو بھیج دیتی ہے ۔ حارث نے رودکی کی یہ تمام گفتگو اپنے کانوں سے سنی لیکن مجلس میں مصلحتاً اپنے آپ کو مست و مدہوش ظاہر کیا :

چو شد بر رودکی راز آشکارا
از آنجا رفت تا شہر بخارا

بخدمت شد دوتا تا پیش آن شاہ
کہ حارث را مدد او کرد آنگاہ

رسیدہ بود پیش شاہ عالی
برای عذر حارث نیز حالی

یکی شاہانہ جشنی بود آن روز
چہ میگویم بہشتی بد دل افروز

مگر از رودکی شہ شعر درخواست
زبان بکشاد آن استاد برخاست

کہ بودش یاد شعر دختر کعب
ہمہ بر خواند و مجلس گرم شد صعب

شہش گفتا بگو تا این کہ گفت ست ؟
کہ مروارید را ماند کہ سفت ست

ز حارث رودکی آگاه کی بود
کہ او خود مست شعر و مست می بود
چو سرمستی زبان بکشاد آنگاه
کہ شعر دختر کعب است ای شاه
بصد دل عاشق است او بر غلامی
در افتاد است چون مرغی بدامی
زمانی خوردن و خفتن نداند
بجز بیت و غزل گفتن نداند
اگر صد شعر گوید پُر معانی
بر او می فرستد در نہانی
چو حارث این سخن بشنید بشکست
و لیکن ساخت خود را آن زمان مست

حارث جب اپنے وطن پہنچا ، اُس کو بے حد صدمہ تھا ، لیکن زین سے اُس نے کچھ نہ کہا ۔ اس پر جاسوس مقرر کر دیے اور اس تاک میں رہا کہ بہن پر کسی طرح جرم ثابت کر دے اور پھر اس کی جان لے :

چو القصہ بشہر خویش شد باز
ز خواہر در نہان میداشت آن راز
ولی از غصہ می جوشید جانش
نگہ میداشت پنہان ہر زمانش
کہ تا بر وی فرو گیرد گناہی
بریزد خون او بر جایگاہی

جو اشعار زین نے بکتاش کو بھیجے تھے ، وہ ایک ڈبے میں بند رہا کرتے تھے ۔ بکتاش کا ایک دوست تھا ۔ اس نے اس خیال سے کہ ڈبے میں موتی ملیں گے ، اُسے کھولا ۔ لیکن جب زین کے خطوط نظر آئے ، وہ ڈبہ لے کر سیدھا حارث کے پاس پہنچا ۔ بہن کے گناہ کا بدیہی ثبوت پا کر حارث نے اس کے قتل کا مصمم

ارادہ کر لیا :

هر آن شعری که گفته بود آن ماه
فرستاده بر یکتاش آن گاه
نهاده بود در دُرجی باعزاز
سرش بسته که نتوان کرد سر باز
رفیقی داشت یکتاش سمن بر
چنان پنداشت کان دُرجست گوهر
سرش بگشاد و آن سرها فرو خواند
به پیش حارث آورد و برو خواند
دل حارث پُر آتش گشت ازان راز
هلاک خواهر خود کرد آغاز

حارث نے سب سے پیشتر اس غلام کو ایک تاریک کنویں میں قید کر دیا ۔ اس کے بعد ایک حمام گرم کروایا اور فصّاد کو بلا کر حکم دیا کہ غریب زین کے دونوں ہاتھوں کی فصد کھول دے اور جب خون بہنا جاری ہو گیا ، اسی حالت میں اس کو حمام میں بھجوا دیا ۔ حمام کے تمام دروازے اینٹ اور چونے سے بند کر دیے گئے :

در اول آن غلام خاص را شاه
به بند اندر فگند و کرد در چاه
دو آخر گفت تا یک خانه حمام
بتابند از پی آن سیم اندام
شه آنگه گفت تا از هر دو دستش
بزد فصّاد رگ اما نه بستش
در آن گرمابه کرد آنگاه شاهش
فروبست از گچ و از خشت راهش

بدنصیب زین کو اس کے عشق کی یہ سزا ملی لیکن اس حسن اور شاعری کے پھول نے اپنی زندگی کی چند باقی‌ساعات کو بھی اپنی

معنی پرستی کے ساتھ وفاداری میں صرف کر دیا ۔ وہ اپنے قدیم جذبۂ شعر کو نہیں بھولی ۔ اس کے دونوں ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اس خون سے اپنی انگلیوں کے ساتھ دیوار پر برابر شعر لکھ رہی تھی ۔ حتٰی کہ اس نے تمام دیواروں کو اپنے خونیں نقوش سے رنگین بنا دیا اور خون کی آخری بوند تک صرف ہو گئی ۔ اور جب اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی ، وہ ایک نعش بے جان بن کر فرش پر گر پڑی :

سر انگشت در خون میزد آن ماہ
بسی اشعار خود بنوشت آنگاہ

ز خون خود ہمہ دیوار بنوشت
ز خون دل بسی اشعار بنوشت

چو در گرمابہ دیواری نماندش
ز خون ہم نیز بسیاری نماندش

ہمہ دیوار چون پُر کرد ز اشعار
فرو افتادہ چون یک پارہ دیوار

شیخ عطار ، زین کی وفات پر اظہار حزن اور اس کی ثابت قدمی پر آفرین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

چنیں قصہ کہ دارد یاد ہرگز
چنین کاری کرا افتاد ہرگز

بدین زاری ، بدین درد و بدین سوز
کہ ہرگز درجہان بودہ است یک روز

بیا ، گر عاشقی ، تا درد بینی
طریق عاشقان مرد بینی

جب دوسرے دن حمام توڑا گیا ، بدقسمت زین کی لاش خون میں نہائی پڑی تھی ۔ جب دیوار پر نظر ڈالی تو اس کا آخری پیغام یہ تھا :

نگارا بی تو چشمم چشمہ سار است
ہمہ رویم بخون دل نگار است

ز مژگانم بسیلابم سپردی
غلط کردم همه آبم به بردی

چو در دل آمدی بیرون نیابی
غلط کردم که تو در خون نیابی

منم چون ماهیی بر تابه آخر
نمی آیی بدین گرمابه آخر

نصیب عشق این آمد ز درگاه
که در دوزخ کنندش زنده آنگاه

که تا در دوزخ اسراری که دارد
میان سوز و آتش خون نگارد

کجا دانی که چون باید نوشتن
چنین قصه بخون باید نوشتن

ازین آتش که من دارم درین سوز
تمام هفت دوزخ را که چون سوز

ازین اشکم که طوفانیست خونبار
دهم تعلیم باران را که چون بار

ازین خونم که دریاییست گویی
در آموزم شفق را سرخرویی

بجز نقش خیال دل فروزم
بدین آتش همه نقشی بسوزم

کنون در آتش و در اشک و در خون
برفتم زین جهان خفته[1] بیرون

مرا بی تو سر آمد زندگانی
منت رفتم تو جاویدان بمانی

بکتاش موقع پا کر قید سے آزاد ہو گیا اور ایک صبح جا کر اس

---

۱ - ''جیفہ'' - (مرتب)

نے حارث کو قتل کر ڈالا ۔ اس کے بعد وہ زین کی قبر کی طرف بڑھا ۔ ایک خنجر اُس کے ہاتھ میں تھا ۔ جب قبر پر پہنچ گیا ، وہی خنجر اپنے سینے میں مار لیا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا :

بآخر فرصتی می‌جست بکتاش
کہ تا از زیر چاہ آمد ببالاش[1]

دوان رفت و سر حارث سحر گاہ
ببّرید و روان شد تا سر راہ[2]

بخاک دختر آمد جامہ برزد
یکی دشنہ گرفت و بر جگر زد

ازین دنیای فانی رخت برداشت
دل از زندان و بند سخت برداشت

زین عرب کی ناشاد زندگی کی یہ کہانی ہے ۔ اس کا عشق ایک معنویت محض تھا اور بکتاش اس کے جذبات حقیقی کے لیے ایک پردۂ مجاز تھا ۔ ایک مصور اپنے جذبات کو رنگ و روغن کا لباس دینے کے لیے ایک منظر اور ایک معمول کی تلاش کرتا ہے ۔ زین نے اپنی استعدادِ شاعری کو فیضان بخشنے کی خاطر اس غلام کو اپنی نظموں کا موضوع بنا لیا تھا ۔ لیکن ہم ، جو گناہ اور نفسانی خواہشات کے آسان شکار ہیں ، ممکن ہے کہ آج بھی اُس کی سیرت اور اُس کے اعلیٰ معیار کا غلط توازن کریں اور بشریت کے قالب خاکی میں ملکوتی صفات اور حقیقی روحانیت کے انوار کے وجود کو اپنی صورت پرستی کے اثرات میں تسلیم نہ کریں ، لیکن یہ مسائل ہمیشہ مختلف فیہ رہے ہیں ۔ جائے شکر ہے کہ ہمارے ہاں ایک ایسا گروہ بھی ہے جس نے زین

---

۱ - اشاعت استنبول میں :
’کہ بخت از زیر چاہ آورد بالاش‘ (مرتب)

۲ - طبع استنبول میں یہ شعر اس طرح درج ہے :
’نہان رفت و سر حارث شبانگہ
ببرید و روانہ شد ہم آن گاہ‘ (مرتب)

کے نام کو رسوائی کی سیاہ فہرست سے خارج کر کے عفاف و مستوری کے صحیفے میں آب زر سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔

زین عرب ایک بوالعجب ہستی ہے۔ اس کی نظیر ممکن ہے کہ دنیا کی اور قوموں اور ملکوں میں موجود ہو، لیکن اس کے خط و خال سے ملتی جلتی ایک اور تصویر، جو اس وقت ہمارے ذہن میں پھر رہی ہے، وہ ہے جو خود زین کے شاداب وطن نے گذشتہ صدی میں پیدا کی ہے۔ اس سے ہماری مراد قرۃ العین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زین عرب اپنی متاخر ہم وطن قرۃ العین کے ساتھ کئی امور میں مماثلت قریبہ رکھتی ہے؛ حسن و جمال، شاعری اور حرارت قلبی کے اوصاف دونوں میں عام ہیں۔ دونوں کا انجام الم انگیز ہے اور دونوں کے متعلق ان کے اہل وطن میں اختلاف آرا موجود رہا ہے۔ بابی جب کہ قرۃ العین کی اعلیٰ روحانیت کے قائل ہیں، غیر بابی طبقوں میں اس کی نسبت قریب قریب وہی رائے ہے جو محمد عوفی نے دختر کعب کے لیے دی ہے۔ در حقیقت سپہر مستوفی اور محمد عوفی کے بیانات میں کوئی نمایاں تفاوت نہیں ہے۔ مذہبی سرگرمی، جب کہ قرۃ العین کی شاعری کا موضوع ہے، عشق محض باضافۂ درد پرستی زین کی شاعری کا امتیازی جوہر ہے۔ بدقسمتی سے زین کی شاعری کے بہت کم نمونے ہم تک پہنچے ہیں، مگر شیخ عطار کے بیانات میں، اس قدر مفہوم ہونے کے لیے ضرورت سے زیادہ مواد ہے کہ اس کی شاعری شور انگیز اور درد خیز ضرور تھی۔ اس کے ساز سے خونی نالے اور درد کے زمزمے بلند ہوتے تھے۔ عوفی نے جو اس کے کلام کے نمونے دیے ہیں، نہایت بلند پایہ ہیں اور یہاں درج کیے جاتے ہیں:

غزل

مرا بعشق همی متهمل[1] کنی بحیل
چه حجت آری پیش خدای عز و جل

---

۱ - مجمع الفصحا (۱ : ۲۲۲) متہم - (حاشیہ مصنف)

بعشقت اندر عاصی همی نیارم شد
بدینم اندر طاغی همی شوم بمثل
نعیم بی تو نخواهم جحیم با تو رواست
که بی‌توشکر زهراست‌وباتو زهرعسل
بروی نیکو تکیه مکن که تا یک‌چند
بسنبل اندر پنهان کنند نجم زحل
هرآئینه نه دروغ است آنچه گفت کلیم
فمن تکبر یوماً فبعد عز ذل

دیگر

دعوت من بر تو آن شد کایزدت عاشق کناد
بر یکی سنگین دلی نا مهربان چون خویشتن
تا بدانی درد عشق و داغ مهر[1] و غم خوری
تا به هجر اندر به پیچی و بدانی قدر من

دیگر

شاقنی[2] ناجغ من الاطیار
هاج سقمی و هاج لی تذکاری
دوش بر شاخک درخت آن[3] مرغ
نوحه میکرد و می گریست بزاری
قلت للطیر لم تنوح و تبکی
فی دجی اللیل و النجوم دراری
من جدایم ز یار ازان[4] می‌نالم
تو چه نالی که با مساعد[5] یاری

---

۱ - مجمع الفصحا ، هجر و غم کشی - (حاشیهٔ مصنف)
۲ - ایضاً ، ناح لی - (حاشیهٔ مصنف)
۳ - ایضاً ، یکی مرغ - (حاشیهٔ مصنف)
۴ - ایضاً ، خویش و تنالم - (حاشیهٔ مصنف)
۵ - ایضاً ، سعادت - (حاشیهٔ مصنف)

من نگویم چو خون دیده ببارم
تو چه گوئی چو خون دیده نباری

مولانا جامی نے ذیل کی غزل بنت کعب کے نام پر رقم کی ہے -

عشق او باز اندر آوردم به بند
کوشش بسیار نامد سودمند
عشق دریای کرانه نا پدید
کی توان کردن شنا ای هوشمند
عشق را خواهی که تا پایان بری
بس که بپسندید باید نا پسند
زشت باید دید و انگارید خوب
زهر باید خورد و انگارید[1] قند
توسنی کردم ندانستم همی
کز کشیدن تندتر گردد کمند

صاحبِ مجمع الفصحا[2] نے اشعار ذیل بھی رابعہ کے بتائے ہیں :

فشاند از سوسن و گل سیم و زر باد
زهی بادی که رحمت باد بر باد
بداد از نقش آذر صد نشان آب
نمود از سحر مانی صد اثر باد

---

۱ - مجمع الفصحا ، پنداريد - (حاشیہ مصنف)

۲ - خود ہدایت نے 'بکتاش نامہ' یا 'گلستان ارم' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں ساری حکایت رابعہ کی نظم کی ہے - اس کا انتخاب مجمع ، جلد دوم کے صفحات ۶۵۳ تا ۶۸۵ پر دیا ہے -

(محمد شفیع)

عمر خیام

ذیل کا مضمون میری درخواست پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے لکھا تھا - چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۳ع کے رسالہ "اردو" میں انھی کے نام سے چھپا تھا - مضمون میں بقول ان کے اس وقت بھی خامیاں تھیں اور اب جب کہ بیس سال کا زمانہ گزر چکا اور اس عرصے میں خیام پر سینکڑوں مقالات اور بیسیوں کتابیں لکھی گئیں ، نئے نظریے قائم ہوئے اور نئی حقیقتیں منکشف ہوئیں ، ضرورت تھی کہ مضمون پر نظر ثانی کی جاتی - علاوہ اس کے ، چوں کہ وہ اس کے لہجے اور انداز بیان پر بھی مطمئن نہ تھے ، میں نے ان سے دوبارہ درخواست کی کہ مضمون کو از سر نو لکھ دیں - لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ ادھر تو کتابت ہو چکی تھی اور ادھر انھیں فرصت نہ تھی، اس لیے افسوس ہے کہ ان ناگزیر حالات میں مضمون کو اسی ناقص شکل میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے -

اس دوران میں خیام پر جو نہایت اہم کتابیں تالیف ہوئیں ، وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) "رباعیات خیام کا تنقیدی مطالعہ" از پروفیسر کرسٹن سین (کوپن ہاگن ۱۹۲۷ع) -

(۲) "خیام" از سید سلیمان ندوی (اعظم گڈھ ۱۹۳۳ع)

(۳) "عمر خیام" از ڈاکٹر ریمپس (جرمنی ۱۹۳۵ع) -

(۴) "عمر خیام اور اس کی رباعیاں" از ڈاکٹر ریمپس (۱۹۳۵ع) -

(۵) "رباعیات حکیم عمر خیام" مع مقدمہ از ڈاکٹر روزن (طہران ۱۳۰۴ ہجری شمسی) ۔
(٦) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں عمر خیام پر مضمون ۔ از پروفیسر منورسکی ۔
(۷) " دی نکٹار آف گریس " از سوامی گووند تیرتھا ۔ (الہ آباد ۱۹۴۱ع) ۔

محمود شیرانی

اسلامی دنیا کے تمام گزشتہ شاعروں اور ادیبوں میں خیام کی ہستی بالکل یکتا ہے ۔ ایران کے اس شاعر فیلسوف کو جو شہرت آج حاصل ہے اور جتنا لٹریچر اس کی شخصیت ، اس کے ذاتی حالات ، اس کے مذہبی ، اخلاق اور فلسفی خیالات پر گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جا چکا ہے ، اس کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب خانہ بن سکتا ہے ۔

لیکن اب تک جو کچھ ہوا ، سب اہل مغرب کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے ۔ مسلمان بلکہ خود اہل ایران ، جن کے لیے خیام کے کمالات مایہٗ ناز ہو سکتے تھے ، شروع ہی سے اس کی شخصیت کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں ۔ فارسی یا عربی تذکرہ نویسوں نے مستقل طور سے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ۔ مورخوں نے اس کو بالکل پس پشت ڈالا ۔ اس کی رباعیات کا کوئی ایسا نسخہ ، جس پر ذرا سا بھی اعتبار کیا جا سکے ، محفوظ نہیں رکھا گیا ۔ اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ اب بھی ، جب کہ یورپ خیام کو ہم سے روشناس کرا چکا ہے اور اس کی خوبیوں کو تمام و کمال ہمارے ذہن نشین کرا چکا ہے ، ہماری بے توجہی بدستور چلی جا رہی ہے ۔ ہر چند یہ ہمارے لیے شرم کی بات ہے کہ ہماری اپنی زبان اور اپنے ملک کی ادبیات کی تنقید میں اجنبی

لوگ ہمارے مذاق کی رہنمائی کریں ۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر شرم ناک امر یہ ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوں اور اس سے فائدہ نہ اٹھائیں ۔ اپنی ذاتی تحقیق کا قدم آگے بڑھنا اور اپنے پیش رو محققوں کی غلطیوں کی تصحیح کرنا یا اُن کے ذخیرۂ انکشافات میں اضافہ کرنا ہر صاحبِ تصنیف کا فرض ہے ۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس درجہ قابل الزام نہیں ، جتنا کہ یہ امر قابلِ اعتراض ہے کہ اُن معلومات کو ، جو پہلے سے مہیا کی جا چکی ہوں ، نظر انداز کیا جائے ۔

یہی وہ اعتراض ہے جس کے مورد مولانا شبلی اپنی مشہور کتاب ”شعرالعجم“ میں خیام کے حالات لکھنے میں ہوئے ہیں ۔ مولانا شبلی اردو ادیبوں میں واحد شخص ہیں جنھوں نے اسلام کی تاریخ اور خصوصاً عجم کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ۔ ان کے فضل و کمال سے ہم کو توقع تھی کہ خیام جیسے بے نظیر صاحبِ کمال کے بارے میں ، جس کی شخصیت کے بارے میں علمی دنیا اس قدر گہری دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے ، ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے اور اپنی فاضلانہ تنقید سے اُن شکوک کو رفع کریں گے اور اُن غلط روایتوں کی تردید کریں گے جو خیام پرستوں کے اعتقادات میں شامل ہیں ۔ لیکن شعرالعجم کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ جو تفاصیل خیام کے حالات میں ہم کو اس میں ملتی ہیں ، وہ اس کی رباعیات کے ہر معمولی دیباچہ نویس نے لکھی ہیں بلکہ کچھ زیادہ ، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ۔

خیام کے حالات میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے وہ مشہور قصہ لکھا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن بن صباح ، نظام‌الملک وزیر اور خیام ، تینوں ایک ہی مکتب میں ہم سبق تھے اور انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جو ترقی پا کر کسی بڑے منصب پر پہنچے ، وہ اپنے ساتھیوں کی

دست‌گیری کرے ۔ مولانا نے محض ایک مقبولِ عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی ۔ حالانکہ یہ قصہ معاً اس قدر عجیب اور اس درجہ موردِ شکوک ہے کہ ایک علمی تصنیف میں اس پر بہت لمبی چوڑی تنقید ہونی چاہیے ۔

یہ قصہ تاریخ اور تذکرے کی متعدد کتابوں میں منقول ہے ؛ مثلاً تاریخ گزیدہ ، روضۃ الصفا ، حبیب السیر اور تذکرۂ دولت‌شاہ سمرقندی وغیرہ میں ۔ لیکن قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے اس کو صاحبِ جامع التواریخ نے (جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف ہوئی) لکھا ہے ۔ اگرچہ جامع التواریخ ایک مستند کتاب ہے اور اس کے مصنف کی ثقاہت مسلمہ ہے ، تاہم یہ قصہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ ہم اس کو محض ایک مصنف کی ثقاہت کی وجہ سے قبول کر لیں ۔ اس کے متعلق یورپ کے تمام مشہور فضلا نے ، جو فارسی زبان کے ماہر ہیں ، تنقید کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے ۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ وقعت وہ تنقید ہے جو چہار مقالۂ نظامی عروضی کے شارح مرزا محمد قزوینی نے کتابِ مذکور کے حاشیوں میں لکھی ہے ۔ چونکہ مرزا صاحب علاوہ عالم و ماہر ہونے کے اہل زبان اور خیام کے ہم وطن ہونے کا فخر بھی رکھتے ہیں ، اس لیے ان کی رائے اس بارے میں ہر طرح قابل اعتماد ہے ۔ ہم ان کی عبارت کا ملخص یہاں درج کرتے ہیں :

”رشید الدین فضل اللہ صاحبِ جامع التواریخ نے ، جو کہ ۷۱۸ھ میں مقتول ہوا ، اپنی کتاب میں عمر خیام ، حسن بن صباح اور نظام الملک کی رفاقت اور ہم مکتبی کے زمانے میں عہدِ وفا باندھنے کی حکایت بیان کی ہے ۔ یہ حکایت رشیدالدین کے اپنے بیان کے مطابق اس نے کتاب ”سرگزشت سیّدنا“ سے اخذ کی ہے جو کہ حسن بن صباح کے حالات میں لکھی گئی تھی اور جو اسماعیلی فرقے کے مشہور قلعے ’الموت‘ کے

کتاب خانے میں تھی ۔ ہلاکو خاں تاتاری نے جب اس قلعے کو سر کیا تو علاؤالدین عطا ملک جوینی صاحبِ تاریخ جہاں کشا کو مامور کیا کہ وہ قلعے کے اندر جا کر کتاب خانے کا ملاحظہ کرے اور جس کتاب کو وہ اپنی دانست میں محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے ، رکھے ، باقی کو جلا دے ۔ من جملہ ان کتابوں کے جو علاؤالدین نے محفوظ کر لیں ، یہ کتاب بھی تھی ۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود علاؤالدین نے ، جس نے کہ اپنی تاریخ جہاں کشا کا ایک مستقل حصہ اسماعیلیوں اور قلعۂ الموت کی تاریخ میں لکھا ہے ، اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا ۔

تینوں ہم سبقوں کے عہد کرنے کی یہ داستان یورپ کے اکثر علما کے نزدیک جعلی ہے ۔ نظام الملک کی تاریخِ ولادت باتفاقِ مورخین ۴۰۸ھ ہے اور تاریخ وفات ۴۸۵ھ ۔ عمر خیام اور حسن بن صباح کی پیدایش تو معلوم نہیں ، لیکن ان کی وفات کی تاریخ ۵۱۷ھ اور ۵۱۸ھ ہے ۔ پس اگر خیام اور حسن ، نظام الملک کے ہم سن یا متقارب‌السن تھے ، جیسا کہ اس حکایت کا مقتضا ہے ، تو پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں کی مدتِ عمر سو سو سال سے بھی زیادہ ہوئی ، اور گو یہ عادتاً محال نہیں ، تاہم مستبعد ضرور ہے ۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک کی عمر اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی ، تو چنداں بعیدالوقوع بات نہ تھی ، تعجب اس بات پر ہے کہ دونوں کے دونوں نے معاً اس قدر فوق العادت عمریں پائیں اور پھر ایک ساتھ مرے ۔ علاوہ اس کے کہیں کسی کتاب میں بھی تصریحاً یا اشارتاً ان دو نامور اشخاص میں سے کسی ایک کا غیر معمولی عمر تک پہنچنا ثابت نہیں ہوتا[1] ۔“

---

۱ - چہار مقالہ ، طبع یورپ ، صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷ ۔

نظامی عروضی مصنفِ چہار مقالہ ، جو خود خیام کا معاصر تھا اور جس کو متعدد دفعہ اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا ہے ، خیام کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ۵۰۸ھ میں بادشاہِ وقت نے پیغام بھجوایا کہ ہم شکار کو جانا چاہتے ہیں ، تم اپنی نجوم دانی کے ذریعے سے کوئی ایسی تاریخ مقرر کرو جو برف باری سے محفوظ ہو۔ چنانچہ اس نے حساب لگا کر ایک تاریخ تجویز کر دی۔ سردی کا موسم تھا ، ابھی تھوڑی دور نکلے ہوں گے کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور سرد ہوا چلنے لگی۔ خیام ساتھ تھا ، بادشاہ نے اس کو سخت زجر و توبیخ کی۔ اس نے کہا "آپ ذرا صبر کریں ، ابھی مطلع صاف ہوا جاتا ہے اور پانچ دن تک بادل دکھائی بھی نہ دے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس حکایت کو خود مولانا شبلی نے 'شعرالعجم' میں نقل کیا ہے[1]۔ اگر ہم خیام کو نظام الملک کا ہم سن مانیں تو ۵۰۸ھ میں اس کی عمر سو برس کی ہونی چاہیے۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ ایک سو برس کے بڈھے پھوس کے لیے اعمالِ نجوم کے ذریعے سے پیشین گوئیاں کرنا اور پھر جاڑے اور برف باری کے عالم میں بادشاہ کی ہمراہی میں شکار کو نکلنا کہاں تک قرین قیاس ہے ؟

اگر یہ مانا جائے کہ نظام الملک اپنے دوسرے ہم مکتبوں سے عمر میں بڑا تھا ، تو ہم کو اس کی عمر کی بڑائی کم از کم بقدر تیس برس کے ماننی ہو گی۔ اگر خیام اور حسن بن صباح نے اسی اسی پچاسی پچاسی برس کی بھی عمر پائی ، تو ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۴۳۵ھ کے قریب قریب ہونی چاہیے۔ اس صورت میں نظام الملک ان دونوں سے قریباً ستائیس برس بڑا ٹھہرا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک چالیس برس کا سن رسیدہ آدمی بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کے بچوں کا ہم سبق ہو ؟ جب کہ دوسری طرف ہم کو معلوم

---

۱ ۔ دیکھو کتاب مذکور ، جلد ۱ ، صفحہ ۲۳۰ ۔

ہے کہ نظام الملک نے نوجوانی ہی میں ابو علی شاذان گورنر بلخ کے ہاں بہ حیثیت کاتب کے ملازمت اختیار کر لی تھی[1] ۔

اگرچہ یورپ میں کتاب 'چہار مقالہ' 'شعرالعجم' کے بعد شائع ہوئی لیکن اوپر کی عبارت میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں ، ان میں سے اکثر پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کی دوسری جلد (صفحہ ۹۰-۱۹۲) میں درج کیے ہیں اور پھر قریب قریب ان ہی مطالب کو ون فیلڈ صاحب نے دیباچہ' رباعیاتِ عمر خیام (طبع لندن ۱۹۰۱ع) میں تحریر کیا ہے ۔ رباعیات کے اس ایڈیشن کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب مذکور سے بخوبی واقف تھے ۔ مولانا اگر انگریزی سے نابلد تھے تو کم از کم فرانسیسی اچھی طرح جانتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد دفعہ اس کا اعتراف کیا ہے ۔ پروفیسر ہوتسما نے عمادالدین الکاتب الاصفہانی کی مشہور تاریخ 'زبدۃ النصرۃ' (طبع لندن ۱۸۸۹ع) کے فرانسیسی دیباچے میں قریب قریب یہی باتیں دہرائی ہیں[2] اور ساتھ ہی ایک دلچسپ حقیقت کو منکشف کیا ہے جو قابلِ تسلیم ہے ۔ وہ یہ کہ در اصل خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب نظام‌الملک نہ تھا بلکہ انوشیروان بن خالد تھا جو کہ منصبِ وزارت میں نظام الملک کے جانشینوں میں سے تھا ۔ چنانچہ خود انوشیروان نے واضح طور سے اس کو لکھا ہے[3] ۔

عموماً تاریخی روایتوں میں اور خصوصاً ایران کی تاریخی روایتوں میں ایسا اکثر ہوا کہ غیر مشہور لوگوں کے کارناموں کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے ۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ یہاں بھی انوشیروان بن خالد کے حالاتِ زندگی نظام الملک کی طرف منتقل کر دیے گئے ہیں ۔

---

۱ ۔ دیکھو تاریخ ابن خلکان ترجمہ' نظام‌الملک ۔

۲ ۔ دیباچہ' مذکور ، صفحہ ید و یہ ۔ ۳ ۔ زبدۃ النصرۃ ، صفحہ ۶۶ ۔

اگر تحقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو اسی حکایت کی تنقید کے لیے اس قدر مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ ایک مستقل تصنیف کی صورت بن سکتی ہے ۔ لیکن تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے فاضل ادیب نے ایسے اہم مسئلے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا ۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کے حالات جن کتابوں سے اخذ کیے ہیں ، وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ۔
(۲) نزہۃ الارواح شہرزوری جس کو وہ تاریخ الحکما شہرزوری کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔
(۳) تاریخ الکامل لابن الاثیر ۔
(۴) تاریخ الحکما ، قفطی ۔
(۵) چہار مقالۂ نظامی عروضی ۔

ان پانچ کتابوں میں سے جو حالات اخذ کیے جا سکتے تھے ، وہ بے شک انھوں نے اخذ کر لیے ہیں لیکن ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی اور ادبی کتابیں ہیں جن میں ضمناً خیام کا ذکر آ گیا ہے جس کو اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرنا تذکرہ نویس کا فرض ہے ۔ ہر فارسی داں اس بات کو جانتا ہے کہ ایران کے جتنے نامور شاعر گزرے ہیں، مثلاً فردوسی ، انوری ، حافظ ، عطار ، خیام وغیرہ ، ان سب کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں ، اور جتنی کسی کی شہرت زیادہ ہے اتنا ہی اس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ کم ہے ، حتیٰ کہ حافظ اور فردوسی جیسے مایۂ ناز شعرا کی تاریخ ولادت و وفات تک محفوظ نہیں رکھی گئی ۔ ایسی حالت میں جب کہ ان اہل کمال کے حالات زندگی اس درجہ کم یاب ہوں تو ان کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ، جو اتفاقیہ طور سے تاریخی کتابوں سے ہاتھ لگ جائیں ، ترک کر دینا یا ان کی طرف سے بے پروائی برتنا بہت بڑے ادبی نقصان کا موجب ہو سکتا ہے ۔

مولانا شبلی نے خیام کے ذخیرۂ حالات میں سے جو ان کو بغیر کسی تلاش اور کاوش کے مہیا مل سکتا تھا ، نصف کے قریب بالکل چھوڑ دیا ہے جس سے اس کے سوانح عمری میں بہت بڑی کمی رہ گئی ہے ۔ خیام کے متعلق پروفیسر ژوکوفسکی کا وہ فاضلانہ مضمون ، جو انھوں نے ۱۸۹۷ع میں روسی زبان میں لکھا تھا اور جس کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر راس نے ۱۸۹۸ع میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں شائع کیا تھا ، اس کا علم مولانا کو ضرور تھا کیونکہ انھوں نے خود خیام کے تذکرے کے اخیر میں اس مضمون کا اور اس کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن شاید وہ اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکے کہ اس کو منگوا کر ایک نظر دیکھ لیتے ، ورنہ اتنی بڑی فروگزاشت ان سے مرزد نہ ہوتی ۔ اس مضمون میں پروفیسر ژوکوفسکی نے آن تمام کتابوں کو ، جن میں خیام کے حالات تھوڑے یا بہت مل سکتے تھے ، باعتبار قدامت یکے بعد دیگرے ترتیب دے کر ذکر کیا ہے ۔ اور جو حالات ہر ایک کتاب میں سے میسر آئے ہیں ، ان کو بھی جمع کیا ہے ۔ اس مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ علاوہ آن پانچ ماخذوں کے جن کا استعمال مولانا نے کیا ہے اور جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے ، پانچ کتابیں اور ہیں جن میں خیام کے حالات ملتے ہیں اور جو باعتبار ثقاہت کے کچھ کم قابل وقعت نہیں ہیں ۔ ان میں سے ایک تو "مرصاد العباد" تالیف شیخ نجم‌الدین ابوبکر رازی معروف بہ "دایہ" ہے جو ۶۲۰ھ میں لکھی گئی ۔ دوسری "آثار البلاد" قزوینی ہے جو ۶۷۴ھ کی تصنیف ہے ۔ تیسری "جامع التواریخ" ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ۔ چوتھی "فردوس التواریخ" مصنفۂ مولانا خسرو ابر قوہی ، جو ۸۰۸ھ میں لکھی گئی اور پانچویں "تاریخ الفی" جو اکبر کے عہد کی مشہور تصنیف ہے ۔

ان پانچ کتابوں میں سے خیام کے متعلق جو حالات اخذ کیے گئے ہیں ، ان کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں دہرانا نہیں چاہتے ۔

جس کو اشتیاق ہو ، وہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون کا انگریزی ترجمہ یا کتاب چہار مقالہ (طبع یورپ) کے حواشی میں دیکھ لے ۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کی رباعیات پر بلحاظ مضامین کے مفصل ریویو کیا ہے اور اس کی شاعری کے محاسن دکھلائے ہیں ۔ لیکن تنقیدی حیثیت سے یہاں بھی مولانا ایک بہت بڑی فروگزاشت کے مرتکب ہوئے ہیں ؛ خیام کی رباعیات کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے بڑی دقت جو پیش آتی ہے ، وہ یہ ہے کہ رباعیات کا صحیح نسخہ ، جو قابل اعتماد ہو سکے ، ہمارے زمانے تک محفوظ نہیں رہا ۔ قلمی نسخے ، جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں ، ان میں رباعیات کی تعداد اور ترتیب اس قدر متفاوت ہے کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مشترک رباعیوں کی ایک قابل اعتبار تعداد کو نکالنا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں ۔ ان مختلف نسخوں میں رباعیات کی تعداد پندرہ سے آٹھ سو تک ہے اور بعض مطبوعہ نسخوں میں ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے ۔

خیام کی اپنی رباعیات کو متعین کرنا تو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ کوئی قدیم اور صحیح نسخہ دستیاب نہ ہو ، جو اعتماد کے قابل ہو ۔ زبان کا معیار اس بارے میں کارآمد نہیں کیونکہ اول تو خیام کے اپنے صحیح انداز کا نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں ، اور اگر ہو بھی تو بہت سے دوسرے اساتذہ مثلاً مولانا روم ، عطار ، حافظ ، سنائی ، انوری ، بو علی سینا وغیرہ کی جو رباعیاں خیام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں ، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہے اور سب کے مضامین متحد اور مشابہ ہیں ، لہٰذا ان میں تمیز کرنا اور صرف انداز بیان سے مصنف کا پتا لگانا محال ہے ۔ پروفیسر ژوکوفسکی نے اپنے مضمون میں ، جس کا اوپر ذکر ہوا ، نہایت محنت اور تلاش سے خیام کی بیاسی رباعیوں کا کھوج لگا کر بتایا ہے کہ یہ رباعیاں دوسرے شعرا کے دیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں ۔

نیز ان شاعروں کی فہرست دی ہے جن کی تعداد چالس سے زائد ہے ۔ اور اسی فہرست کو پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد (صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷) میں نقل کیا ہے ۔ ڈاکٹر نکلسن ماہر فارسی ، رباعیات خیام (طبع لندن ، ۱۹۰۹ء) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون لکھنے کے بعد سے اب تک یعنی (۱۸۹۷ع سے ۱۹۰۹ع تک) اس قسم کی رباعیوں کی تعداد بیاسی سے تجاوز کر کے ایک سو ایک تک پہنچ چکی ہے ۔ اور اگر تلاش جاری رکھی جائے تو اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے ۔

غرض یہ ہے کہ حالات موجودہ میں خیام کی رباعیات کا متعین کرنا دشوار ہے ۔ مولانا شبلی نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کیا ہے اور ان امور پر بالکل کوئی بحث نہیں کی کہ مثلاً وہ کون سی رباعیاں ہیں جو ممکن طور سے خیام کی اپنی کہی جا سکتی ہیں ؟ اس کی رباعیوں کی شناخت ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ اگر ہو سکتی ہے تو کیونکر ؟ کون سا مطبوعہ یا غیرمطبوعہ نسخہ زیادہ قابلِ اعتبار ہے ؟ مذاقِ سلیم کو اس میں کہاں تک دخل ہو سکتا ہے ؟ خیام کی رباعیات کا دوسروں کی رباعیات کے ساتھ مخلوط ہونے کا باعث کیا ہے ؟ اور کیا وجہ ہے کہ اس کا کلام محفوظ نہیں رہا ؟ وغیرہ وغیرہ ۔

اس بحث کو حسب ضرورت طول دیا جا سکتا ہے اور رباعیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے حد سے زیادہ دلچسپ ہو سکتا ہے ۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ ان کے لیے بے حد ضروری ہے کیونکہ جب تک محنت اور تحقیق کے ساتھ خیام کی اپنی رباعیاں متعین نہ ہو سکیں گی ، اس کی شخصیت شکوک اور قیاسات کے غبار میں ملفوف رہے گی ۔

مولانا شبلی نے اتنا بھی بیان نہیں کیا کہ رباعیات خیام کا کون سا نسخہ ان کے پیش نظر ہے جس میں سے وہ تنقید کے لیے رباعیات کا انتخاب کر رہے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے

یہ فرض کر لیا ہے کہ ساری دنیا میں فقط ایک ہی نسخہ ، جس کا متن متحد ہے ، دستیاب ہو سکتا ہے جس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں للہذا پتا نشان بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لیے انتخاب کی ہیں ، ان میں سے دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژوکوفسکی کی آن بیاسی رباعیوں میں سے ہیں جن کو انھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کا پہلا مصرع ناظرین کی دلچسپی کے لیے لکھ دیا جاتا ہے[1]:

(۱) من بندۂ عاصیم رضای تو کجاست
(۲) آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو
(۳) ای چرخ ز گردشِ تو خرسند نیم
(۴) گویند کہ فردوس برین خواهد بود
(۵) جمعی متفکرند در مذهب و دین
(۶) گر از پیٔ شہوت و هوا خواهی رفت
(۷) ایزد چو نخواست آنچہ من خواستہ ام
(۸) دریاب کہ از روح جدا خواهی رفت
(۹) در دهر هر آنکہ نیم نانی دارد
(۱۰) با این دو سہ نادان کہ چنان می دانند

خیام کی تصنیفات کے ذکر میں مولانا شبلی فرماتے ہیں :

”تصنیفات بہت کم ہیں ۔ زیچ جو تیار کی تھی ، اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے ۔“

(شعرالعجم ، صفحہ ۲۳۰)

---

۱ ۔ افسوس ہے کہ ژوکوفسکی کا اصلی مضمون ، جو انھوں نے روسی زبان میں لکھا تھا ، دست یاب نہیں ہو سکتا ورنہ ہم یہ بھی بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک رباعی کس کی طرف منسوب ہے ۔ مضمون کے انگریزی ترجمے میں صرف رباعیاں بتائی گئی ہیں ، شعرا کا نام نہیں دیا ۔

خیام کی کوئی زیچ آج تک یورپ میں شائع نہیں ہوئی ۔ رباعیات کے علاوہ جو کتاب یورپ نے شائع کی ہے ، وہ دراصل اس کا الجبرا ہے ، جس کا عربی متن مع فرانسیسی ترجمے کے بمقام پیرس ۱۸۵۱ع میں چھاپا گیا ہے ۔ یہ الجبرا اور اس کے ساتھ تین تصنیفیں خیام کی اور ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا ، اور لطف یہ ہے کہ ان تین میں سے دو اس وقت قلمی نسخوں کی صورت میں موجود پائی جاتی ہیں ۔ ایک کا نام "رسالۃ فی شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس کا ایک نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں ہے ۔ دوسرے "رسالۃ فی الاحتیال لمعرفۃ مقداری الذھب و الفضۃ فی جسم مرکب منھما" جس کا نسخہ مقام گوتھا (جرمنی) کی لائبریری میں موجود ہے ۔ اور تیسرے "لوازم الامکنہ در فصول و علت اختلاف ہوای بلاد و اقلیم[1] ۔"

ایک دوسری جگہ مولانا نے لکھا ہے :

"خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا ۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلے کو اپنی کتاب "عرائس النفائس" میں بہ تفصیل لکھ چکا ہوں"....الخ (صفحہ ۲۲۹ - ۲۳۰) ۔

کتاب 'عرائس النفائس' ، جس کو مولانا نے خیام کی تصنیف بتا دیا ہے ، اس کے لیےانھوں نے کوئی سند نہیں دی ۔ شہرزوری کی اصل عبارت میں ، جس کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اور جو بعینہ حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۲۱۲) میں نقل کی گئی ہے ، "عرائس النفائس" کا کہیں ذکر نہیں ۔ ظاہراً اتنی بات انھوں نے اپنی طرف سے بڑھا دی ہے ۔

جو مطالب اس مضمون میں بیان کیے گئے ہیں ، ان کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی

---

۱ ۔ دیکھو حواشی چہار مقالہ ، صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱ ۔

گئی ۔ فارسی زبان کے ماننے والے جو بواسطۂ انگریزی تاریخ ایران کا مطالعہ کرتے ہیں ، ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں ۔ البتہ اردو میں شاید ابھی تک ان مطالب کی ترجمانی نہیں ہوئی اور یہی خیال اس مضمون کے لکھے جانے کا باعث ہوا ۔ جب کہ شعرالعجم جیسی بلند پایہ کتاب میں ان باتوں کو ترک کر دیا گیا ہے ، تو یہ فرض کر لینا کہ چھوٹے درجے کی تصانیف میں یہ مباحث لکھے جا چکے ہیں ، بعید از قیاس ہے ۔

اشاریه

اشخاص

(الف)

(پ)

(ت)

خ

د

ڈ

ذ

ر

ز

ژ

س

ش

ص

غ

ف

گ

ل

اسماء الکتب

ب

پ

ت

خ

د

گ

ل

م

ن

و

ه

ی

اصطلاحات

ب

پ

ت

د

ذ

ر

ز

س

ش

غ

ف

ق

ن

و

ہ

ی

مقامات

پ

ت

ج

چ

ح

خ

ط

ع

غ

ق

ک